مطالعہ قرآن حکیم کا

مُنتخب نِصاب

جلد دوم

مدرس

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

جلد دوم

مدرس

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

حافظ عاکف سعید مدظلہ

حافظ خالد محمود خضر مدظلہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

نام کتاب	:	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب (جلد دوم)
مدرس	:	ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرتب	:	حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ
	:	حافظ خالد محمود خضر حفظہ اللہ
ناشر	:	ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
		(شعبۂ مطبوعات) K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔
		فون: 3-042-35869501 فیکس: 042-35834000
		ای میل: publications@tanzeem.org
		ویب سائٹ: www.tanzeem.org
مقام اشاعت	:	شعبۂ مطبوعات، انجمن خدام القرآن سندھ کراچی
		قرآن اکیڈمی یٰسین آباد، شارع قرآن اکیڈمی،
		بلاک 9، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔
		فون: 021-36806561 فیکس: 021-36337346
		ای میل: publications@quranacademy.com
		ویب سائٹ: www.quranacademy.com
طبع اول	:	جون 2010ء بمطابق رجب المرجب 1431ھ
تعداد	:	
ہدیہ	:	

دیگر مکتبہ جات

KARACHI:
Phones : (+92-21) 3534 00 22, 3534 00 23
ISLAMABAD :
Phones : (+92-51) 443 44 38, 443 54 30
PESHAWAR :
Phones : (+92-91) 221 44 95, 226 29 02
QUETTA :
Phone : (+92-81) 284 29 69
HYDERABAD :
Phone : (+92-22) 265 29 57
GUJRANWALA :
Phones : (+92-55) 301 55 19, 389 16 95

LAHORE:
Phones : (+92-42) 3584 50 90, 3636 66 38
FAISALABAD :
Phone : (+92-41) 262 42 90
MULTAN :
Phones : (+92-61) 52 10 70, 814 92 12
JHANG :
Phone : (+92-47) 762 83 61
SUKKUR :
Phone : (+92-71) 563 10 74
HAROONABAD :
Phone : (+92-63) 225 11 04

ترتیب

حصہ پنجم............ **مباحثِ تواصی بالصبر**

یعنی مباحث صبر ومصابرت

حصہ ششم............ **جامع سبق**

مشتمل بر سورۂ حدید کامل[1]

(۱) جس طرح کہ مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کا آغاز قرآن حکیم کی جامع ترین سورت، سورۃ العصر سے ہوا تھا اسی طرح اس کا اختتام بھی مدنی قرآن کی جامع ترین سورت اور قرآن کے ذروۂ سنام یعنی سورۃ الحدید پر ہوتا ہے۔ (مرتب)

تمّت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین محترم ــــــــــــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ !

رواں صدی کے معروف ترین داعی و مدرس قرآن حضرت ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روح پرور محفل درس قرآن میں ایک بار پھر خوش آمدید!!

مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب جلد اول کے بعد اب جلد دوئم فی الحقیقت استاذ محترم (مرحوم ومغفور) کی اُن ہی شہرۂ آفاق محافلِ دروسِ قرآنی کا تسلسل ہیں جو اُن کی حیات میں خوب جما کرتی تھیں۔ دور ونزدیک سے طالبانِ علوم قرآنی اور تشنگانِ فیض ربانی ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہوکر گھنٹوں ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس قرآن سنا کرتے تھے۔ معلوم تو یوں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی ''عوامی درس قرآن'' کے انعقاد کی ''آرزو'' کو جب صورتِ وجود بخشا تو وہ ایک صدی کے فصل سے محترم ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عوامی دروسِ قرآن کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ اور کیوں نہ ہوتی؟ اصحاب معرفت جانتے ہیں کہ اہل اللہ کی ''آرزو'' حکمتِ ایزدی کا ظہور ہوتی ہے ۔ ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا''۔

جلد دوئم کی اشاعت پر ــــ الحمدللہ ــــ منتخب نصاب کے اِن مختصر دروس کی اشاعت کا کام مکمل ہوگیا ہے۔ جلد دوئم میں شامل پہلے دو حصوں یعنی مباحثِ تواصی بالحق اور مباحثِ تواصی بالصبر کی ترتیب تو محترم حافظ عاکف سعید صاحب (امیر تنظیم اسلامی) ہی نے فرمائی تھی البتہ آخری حصہ یعنی ''حصہ ششم جامع سبق''، جو کل کا کل سورۂ حدید کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس حصہ کی ترتیب کی سعادت جناب حافظ خالد محمود خضر صاحب (مدیر شعبۂ مطبوعات، لاہور) کے حصہ میں آئی۔

منتخب نصاب کے اِن مختصر دروس کی اشاعت کے بعد آئندہ منتخب نصاب کے مفصل دروس کی ترتیب واشاعت کا منصوبہ پیشِ نظر ہے۔ دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ شانہ توفیق وتیسیر ارزانی فرمائے۔ (آمین)

ناظم مکتبہ
انجمن خدام القرآن

۱۳/رجب المرجب ۱۴۳۱ھ

حصہ چہارم
مباحثِ تواصی بالحق
درس 15 تا درس 19
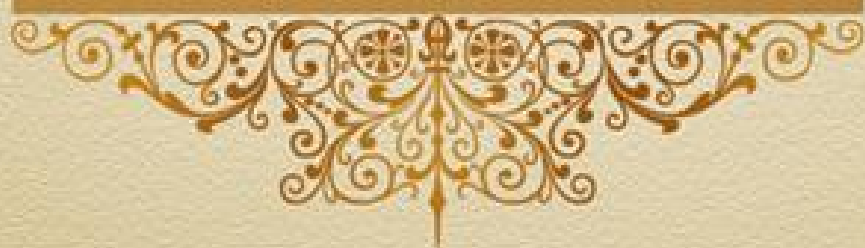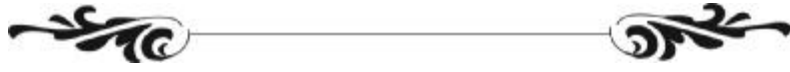
درس 15

تواصی بالحق کا
ذروہ سنام
جہاد و قتال فی سبیل اللہ

سُوْرَةُ التَّوْبَة اور سُوْرَةُ الْحُجُرٰت کی روشنی میں

درس ۱۵

تواصی بالحق کا ذروۂ سنام
جہاد و قتال فی سبیل اللہ

سورۃ التوبہ اور سورۃ الحجرات کی روشنی میں

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ۔ اَمَّا بَعْدُ:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ (الحُجُرات)

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾ (التوبۃ)

الحمدللہ کہ ہم اِس وقت مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے حصّہ چہارم کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ حصّہ ''سورۃ العصر'' میں وارد شدہ لوازمِ فوز وفلاح یا آسان الفاظ میں شرائطِ نجات میں سے تیسری شرط یعنی تواصی بالحق کی مزید تشریح اور تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں ہمارے اس منتخب نصاب میں مختلف مواقع پر جو مباحث آ چکے ہیں' آگے بڑھنے سے قبل ان پر ذرا ایک نگاہِ بازگشت ڈال لینا مفید ہوگا۔ سب سے پہلے تو ''تَوَاصِيْ بِالْحَقِّ'' کی اصطلاح ہی پر دوبارہ غور کر لیجیے۔ لفظ ''تواصی'' وصیت سے بنا ہے اور وصیت میں تاکید کا مفہوم بھی شامل ہے۔ کوئی بات ناصحانہ انداز میں' خیر خواہی کے جذبے کے تحت' انتہائی شد ومد کے ساتھ کہی جائے تو عربی زبان میں اسے وصیت سے تعبیر کیا جائے گا۔ پھر جب یہ لفظ بابِ تفاعل سے آیا' یعنی ''تواصی'' تو اس میں مبالغے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ یعنی یہ عمل بڑے اہتمام اور پوری شدت وتاکید کے ساتھ مطلوب ہے۔ دوسری طرف مزید توجہ دلا دی

گئی کہ کسی بھی صحت منداجتماعیت کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کے شرکاء ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہیں اور ایک دوسرے کو خیر و بھلائی کی بات کہتے رہیں۔ اسی طرح لفظ ''حق'' بھی بہت جامع ہے۔

جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' کہ ہر وہ چیز جو عقلاً مسلّم ہو' اخلاقاً واجب ہو' با مقصد اور نتیجہ خیز ہو' جو صرف وہمی و خیالی نہ ہو بلکہ واقعی ہو ''حق'' ہے۔ اس اعتبار سے ''تواصی بالحق'' کا مفہوم انتہائی وسعت اختیار کر جاتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی حقیقتوں اور چھوٹے سے چھوٹے حقوق سے لے کر اس سلسلۂ کون و مکان کی عظیم ترین حقیقت یعنی ''**لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ**'' اور ''**اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ**'' ان سب کی تبلیغ' نشر و اشاعت اور اعلان و اعتراف تواصی بالحق کے مفہوم میں شامل ہے۔

اس کے بعد ہمارے اس منتخب نصاب کے حصّہ اوّل میں دوسرا جامع سبق آیۂ بر پر مشتمل تھا۔ اس کے آخر میں واضح کر دیا گیا کہ یہ تواصی بالحق اس شان کے ساتھ مطلوب ہے کہ خواہ اس کے ضمن میں انسان کو فقر و فاقہ سے دوچار ہونا پڑے' خواہ جسمانی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں' خواہ اس کا تقاضا ہو کہ انسان نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے اور اپنی جان کا ہدیہ اس راہِ حق میں پیش کر دے' اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے۔ یہ انسان کے فی الواقع متقی' نیک اور صالح ہونے کے لیے ناگزیر ہے۔

تیسرے سبق میں تواصی بالحق کے ضمن میں ایک نئی اصطلاح ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' سامنے آئی تھی۔ وہاں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ معروف اور منکر کے الفاظ میں جس قدر وسعت اور ہمہ گیریت پائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے گویا مفہوم یہ ہوگا کہ ہر خیر' ہر نیکی' ہر بھلائی' ہر حقیقت اور ہر صداقت کی تبلیغ و تلقین' دعوت و نصیحت' تشہیر و اشاعت اور اعلان و اعتراف حتیٰ کہ ترویج و تنفیذ ہو اور اس راہ کی ہر تکلیف کو صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ اس لیے کہ وہاں فرما دیا گیا تھا:

﴿**يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ**O﴾ (لقمٰن)

اسی طرح ہر بدی اور برائی کی ردّ و قدح' تنقید و احتساب' انکار و ملامت' حتیٰ کہ انسداد و استیصال کی ہر ممکن سعی و کوشش لازم اور ضروری ہے۔

پھر چوتھے سبق میں ''دعوت الی اللہ'' کی اصطلاح وارد ہوئی اور اس طرح تواصی بالحق کی بلند

ترین منزل کی نشاندہی کر دی گئی۔ اس لیے کہ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ مجسم اور کامل حق صرف ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اور ؎

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق

کے مصداق اسی کی اطاعت وعبادت کا التزام' اسی کی شہادت علی رؤس الاشہاد اور اسی کی اساس پر انفرادی و اجتماعی زندگی کو استوار کرنے کی سعی و جہد تواصی بالحق کا ذروۂ سنام (climax) یا نقطۂ عروج ہے۔

اور آخر میں سورۃ الحجرات زیر درس آئی' جس میں حد درجہ جامع آیت حقیقی ایمان کی تعریف کے ضمن میں وارد ہوئی:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿١٥﴾﴾

''یقیناً مؤمن تو وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر پھر وہ شک میں نہیں پڑے اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ' یہی لوگ درحقیقت سچے ہیں۔''

گویا ایمان حقیقی کے دو ارکان کا بیان اس آیت مبارکہ میں ہو گیا ـــــ اوّلاً وہ ایمان جو ایک یقین کی صورت اختیار کر کے قلب میں جاگزیں ہو جائے اور ثانیاً اس کا وہ مظہر جو انسان کے عمل میں' اس کی عملی روش میں' اُس کے رویے میں نظر آنا چاہیے۔ اسے تعبیر کیا گیا ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے عنوان سے!

یہ ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہمارے منتخب نصاب کے چوتھے حصے کے لیے اب ایک عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس اصطلاح نے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر دونوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں ہر مؤمن کے لیے ایک ترازو فراہم کر دی گئی ہے کہ وہ اسے اپنے باطن میں نصب کر کے اپنے آپ کو تولے' اپنے آپ کو جانچے اور پرکھے کہ وہ ایمان کے اعتبار سے حقیقتاً کس مقام پر کھڑا ہے۔ فرمایا گیا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا ......﴾ (التوبۃ: ٢٤)

''(اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں تمہارے باپ' اور تمہارے بیٹے' اور تمہارے بھائی' اور تمہاری بیویاں' اور تمہارے کنبے اور وہ مال جو تم نے جمع کیے ہیں اور وہ کاروبار (جو تم نے بڑی محنت سے جمائے ہیں اور) جن کی کساد بازاری کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے' اور وہ مکان (اور جائیدادیں جو بڑے اہتمام سے بنائی گئی ہیں اور جن کی تزئین و آرائش پر بہت کچھ صرف کیا گیا ہے) جنہیں تم بہت پسند کرتے ہو (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ' اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے تو جاؤ انتظار کرو......''

یعنی پانچ علائق دُنیوی اور تین مال و اسبابِ دُنیوی کی صورتیں اس ترازو کے ایک پلڑے میں ڈال دو اور دوسرے پلڑے میں ڈالو اللہ کی محبت' اس کے رسولؐ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت' اور پھر دیکھو کہ کہیں علائق دُنیوی اور مال و اسبابِ دُنیوی والا پلڑا جھک تو نہیں رہا۔ اگر ایسا ہے تو جاؤ انتظار کرو...... بلکہ بامحاورہ ترجمے میں اس کا صحیح مفہوم اس طرح ادا ہوگا کہ ''جاؤ دفع ہو جاؤ'' ﴿حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ ''یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ سنا دے''۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿٢٤﴾﴾ ''اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

''جہاد فی سبیل اللہ'' کی اصل حقیقت

قرآنی آیات کے حوالے سے آج ہم اس بات پر غور کریں گے کہ جہاد فی سبیل اللہ ہے کیا' اس لفظ کے لغوی معنی کیا ہیں' اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے' ہمارے دین میں اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے' اس جہاد کی کیا کیا شکلیں ہیں' اس کے مقاصد کیا ہیں' اس کا نقطۂ آغاز کیا ہے' اس کی پہلی منزل کیا ہے اور اس کی آخری منزلِ مقصود کون سی ہے!! یہ بنیادی باتیں حقیقتِ جہاد کے بارے میں آج کی گفتگو کا موضوع ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات عرض کر دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ جس طرح ہمارے تمام دینی تصورات ایک طویل انحطاط کی بدولت نہ صرف یہ کہ محدود (limited) بلکہ مسخ (perverted) ہو چکے ہیں' اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ جہاد کا لفظ بھی ہمارے ہاں بہت ہی محدود معنی میں استعمال ہو رہا ہے' بلکہ اکثر و بیشتر بہت غلط معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک مغالطہ تو یہ ہوا کہ جہاد کو جنگ کے ہم معنی بنا دیا گیا' حالانکہ جہاد کے معنی ہرگز جنگ کے نہیں ہیں۔ جنگ کے لیے قرآن مجید کی اپنی اصطلاح ''قتال'' ہے جو قرآن میں بکثرت استعمال ہوئی ہے۔ یہ اصل میں جہاد کی ایک آخری صورت اور آخری منزل ہے' لیکن جہاد اور قتال کو بالکل مترادف بنا دینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب جہاد کی وسعت

اور ہمہ گیری پیش نظر نہیں رہی۔ اس ایک مغالطے کے بعد ستم بالائے ستم اور ظلم بالائے ظلم یہ ہوا کہ مسلمان کی ہر جنگ کو جہاد قرار دے دیا گیا‘ خواہ وہ خیر کے لیے ہو یا شر کے لیے۔ کوئی ظالم و جابر مسلم حکمران اپنی نفسانیت کے لیے‘ اپنی ہوسِ ملک گیری کے لیے کہیں خون ریزی کر رہا ہو تو اس کا یہ عمل بھی جہاد قرار پایا اور اس طرح اس مقدس اصطلاح کی حرمت کو بٹہ لگایا گیا ہے۔ ذرا تفصیل کے ساتھ اور بنظر غائر یہ جائزہ لینا ہوگا کہ قرآن مجید کے نزدیک جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے!!

اس منتخب نصاب کے دروس کے دوران اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان بڑی سائنٹیفک زبان ہے۔ اس کے ننانوے فیصد سے زیادہ الفاظ وہ ہیں جن کا ایک سہ حرفی مادہ (root) ہوتا ہے اور اس کے تمام مشتقات کا دار و مدار اسی مادے یا ''جڑ'' پر ہوتا ہے اور اس کا مفہوم اس سے نکلنے والے تمام الفاظ میں موجود رہتا ہے۔ گویا یہ ''جڑ'' تو ﴿اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِى السَّمَآءِ ۝۲۴﴾ (ابرٰھیم) کے انداز میں اپنی جگہ مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے‘ لیکن مختلف سانچوں میں ڈھل کر وہ مادہ کچھ اضافی مفہوم اپنے اندر جمع کرتا چلا جاتا ہے۔

لفظ جہاد کا سہ حرفی مادہ ''ج ۔ ھ ۔ د'' ہے اور یہ لفظ اردو بولنے اور اردو لکھنے والوں کے لیے کسی درجہ میں بھی نامانوس نہیں ہے۔ جہد مسلسل‘ جد و جہد‘ یہ الفاظ اردو زبان میں مستعمل ہیں۔ جہد کے معنی ہیں کوشش کرنا —— انگریزی میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں ادا ہوگا: ''to exert ones utmost''‘ یعنی کسی بھی مقصد کے لیے‘ کسی بھی معین ہدف کے لیے محنت کرنا‘ کوشش کرنا‘ مشقت کرنا‘ جد و جہد کرنا اصلاً ''جہد'' ہے۔ لیکن عربی زبان میں یہی مادہ جب مختلف سانچوں میں ڈھلے گا‘ مختلف ابواب سے اس کے مصادر بنیں گے تو ان میں اضافی مفہوم شامل ہو جائے گا۔ ''مفاعلہ'' ثلاثی مزید فیہ کا ایک باب ہے۔ اس باب میں جو الفاظ آتے ہیں اور جو مصادر اس وزن پر ڈھلتے ہیں۔ ان میں دو مفہوم اضافی طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس باب میں دو فریقوں یا ایک سے زائد فریقوں کی شرکت و مشارکت کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے۔ (اب یہ ''مشارکت'' خود بھی ''مفاعلہ'' کے وزن پر ہے) اور دوسرے یہ کہ ہر ایک فریق کا دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش اور بازی لے جانے کی سعی کا مفہوم بھی اس میں خود شامل ہو جائے گا۔ جیسے ''مباحثہ'' دو افراد یا دو فریقوں یا دو گروہوں کے مابین بحث کا نام ہے‘ جن میں سے ہر فریق کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی حقانیت کو دلائل دے کر ثابت کرے اور فریقِ مخالف کے نقطۂ نظر کا ابطال کرے اور اس کی غلطی کو ثابت کرنے کی کوشش

کرے۔ ''مناظرہ'' اسی سے بنا ہے۔ اسی طرح دو فریق آمنے سامنے آئیں اور ان میں سے ہر فریق کی کوشش یہ ہو کہ وہ دوسرے کو زیر کرے اور خود بالا دستی حاصل کرے تو یہ ''مقابلہ'' ہے۔ اسی طرح بے شمار الفاظ بنتے چلے جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ ''مشاعرہ'' میں بہت سے شعراء کسی ایک دیے ہوئے مصرعے پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مشاعرہ لوٹ لے جائے۔ تو اس وزن پر آنے والے ان تمام الفاظ میں یہ دو مفہوم لازماً پیدا ہو جائیں گے کہ کسی عمل میں مشارکت اور اس مشارکت میں اس بات کی کوشش کہ ہر فریق دوسرے فریق کو زیر کرنے اور نیچا دکھانے کی کوشش کرے۔

اب اسی وزن پر لفظ ''مجاہدہ'' بنا ہے اور اسی طرح سے ''مقاتلہ'' بنا ہے۔ ''قتل'' اور ''مقاتلہ'' میں فرق یہ ہوگا کہ قتل ایک یک طرفہ فعل ہے۔ ایک شخص نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ جبکہ مقاتلہ یہ ہے کہ دو افراد ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے آمنے سامنے آ کھڑے ہوں، وہ اسے قتل کرنے کے درپے ہو اور یہ اُسے قتل کرنے کے درپے ہو۔ اسی طرح لفظ ''جہد'' میں یک طرفہ کوشش کا تصور سامنے آتا ہے، یعنی کسی ہدف اور مقصود کے لیے محنت کی جا رہی ہے، مشقت ہو رہی ہے، جبکہ مجاہدہ میں ایک اضافی تصور سامنے آئے گا کہ کوشش میں مختلف فریق شریک ہیں۔ ہر ایک کا اپنا کوئی مقصد اور اپنا کوئی نقطۂ نظر ہے اور ہر ایک اس کوشش میں ہے کہ اپنے مقصد کو حاصل کرے اور اپنے خیال یا اپنے نظریے کو دنیا میں سربلند کرنے کی کوشش کرے۔ ''جہاد فی سبیل اللہ'' درحقیقت قرآن مجید کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ جہاد اور مجاہدہ دونوں بابِ مفاعلہ سے مصدر ہیں۔ انگریزی میں اب اس کو یوں ادا کیا جائے گا: ''to struggle hard'' اس لیے کہ struggle میں کشمکش اور کشاکش کا مفہوم شامل ہے۔ جہد صرف کوشش ہے جبکہ جہاد یا مجاہدہ کشمکش اور کشاکش ہے اور انگریزی کے اس لفظ struggle میں بھی وہ تصور موجود ہے کہ مخالفتوں اور موانع کے علی الرغم اپنے مقصدِ معین کی طرف پیش قدمی کرتے چلے جانا۔

اب ظاہر بات ہے کہ مجاہدہ خواہ کسی مقصد کے لیے ہو اِس میں انسان کی صلاحیتیں، قوتیں اور توانائیاں بھی صرف ہوں گی اور مالی وسائل و ذرائع بھی صرف ہوں گے۔ ان دو کے بغیر دنیا میں کوئی کوشش ممکن نہیں ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ ابتدائی سطح پر کسی بھی مقصد کے لیے، کسی بھی نصب العین کے لیے، کسی بھی خیال کی ترویج و اشاعت کے لیے انسان کو کچھ مالی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے، جن سے وہ اپنے نصب العین اور آئیڈیا کو project کر سکے، اس کی تشہیر و اشاعت ہو اور اسے وسیع حلقے

میں پھیلایا جائے۔ لہٰذا قرآن مجید میں بھی آپ دیکھیں گے کہ اس مجاہدے کے ساتھ دو الفاظ آپ کو ہر جگہ ملیں گے: ﴿بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ﴾ یعنی اس مجاہدے‘ اس جدوجہد اور اس کی کوشش میں اپنے مال بھی کھپاؤ اور اپنی جانیں بھی کھپاؤ‘ جیسے کہ سورۃ الحجرات کی آیت میں ارشاد ہوا: ﴿وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ''۔

اس جہاد کے لیے ایک تیسری چیز جو ضروری ہے وہ کسی ہدف کا معین ہونا ہے۔ کوئی مقصودِ معین ہو‘ کوئی نصب العین ہو‘ کوئی آدرش ہو‘ جس کے لیے وہ محنت و مشقت کی جائے۔ اسی کی نظریاتی سطح پر نشر و اشاعت ہوگی‘ اسی کے لیے پھر محنتیں ہوں گی‘ اسی کی سربلندی کے لیے کوششیں ہوں گی۔ تو گویا کہ اس جہاد کے لیے اس ہدف کا تعین ضروری ہے۔ اب فرض کیجیے کہ ایک شخص اپنی برتری کے لیے‘ اپنی بالادستی کے لیے‘ اپنے اقتدار کے لیے اور اپنے مفادات کے لیے محنتیں کر رہا ہے‘ اس کا یہ ہدف معین ہے‘ تو یہ بھی مجاہدہ ہے۔ اس لیے کہ ظاہر بات ہے کہ یہاں مختلف مقابل قوتیں موجود ہیں‘ ہر شے کے لیے مسابقت (competition) ہے‘ لہٰذا اس کے لیے اسے struggle کرنا ہوگی‘ محنت کرنا ہوگی‘ اسے دوسروں سے آگے بڑھنا ہوگا‘ اسے محنت و مشقت میں اپنے حریف یا مخالف سے بازی لے جانا ہوگی۔ اس کے بغیر اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے‘ اپنی ذاتی سربلندی کے لیے یا اپنی ذات کے لیے دُنیوی آسائشوں کو زیادہ سے زیادہ جمع کر لینے کے مقصد میں بھی کامیابی حاصل کر سکے۔ اس کو آپ یوں کہیں کہ یہ ''مجاہدہ فی سبیل النفس'' ہے۔ اپنی ذات کے لیے‘ اپنے نفس کے تقاضوں کے لیے مجاہدہ ہو رہا ہے۔ اور یہ بات کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ مجاہدہ ہر آن ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ Struggle for existance ہے۔ ہر ایک بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کر رہا ہے اور اس کوشش میں ہے کہ وہ دوسرے سے آگے نکل جائے۔ جیسے کہا گیا: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ (البقرۃ:۱۴۸) ''ہر ایک کے لیے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے''۔ ہر ایک نے اپنا ایک ہدف معین کیا ہوا ہے اور ایک دوڑ لگی ہوئی ہے‘ ایک مسابقت جاری ہے۔

اسی طرح فرض کیجیے کہ کوئی شخص اپنا ہدف معین کرتا ہے اپنی قوم کی سربلندی‘ اپنے وطن کی عزت‘ اس کے وقار اور دنیا میں اپنی قوم کے نام کو روشن کرنے کے لیے۔ اس قوم پرستانہ اور وطن پرستانہ جدوجہد اور محنت و کوشش کا بھی قوموں اور ملکوں کے مابین مقابلہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں جو شخص

بھی اپنی قوتوں‘ توانائیوں اور اپنی صلاحیتوں کو صرف کرتا ہے وہ مجاہد ہے فی سبیل القوم‘ یا مجاہد ہے فی سبیل الوطن۔ اسی طرح کوئی شخص کسی نظریے (Ideology) کو اختیار کرتا ہے‘ وہ کسی نظریۂ حیات‘ کسی نظامِ زندگی کا قائل ہو گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ انسان کے لیے وہ ایک بہتر طرزِ زندگی ہے‘ اس میں انسانی مسائل کا ایک بہتر‘ متوازن‘ زیادہ معتدل اور زیادہ منصفانہ حل ہے۔ اگر کسی طرح بھی اسے اس بات کا یقین حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اپنی قوتیں صرف کر رہا ہے‘ محنتیں کھپا رہا ہے‘ اوقات لگا رہا ہے‘ جسم و جان کی توانائیاں اس میں صرف کر رہا ہے کہ وہ نظریہ دنیا میں پھیلے‘ اس نظریے کو بالادستی حاصل ہو‘ اس کا نظام دنیا میں عملاً قائم ہو تو اس کے لیے جو محنت ہو رہی ہے یہ اس نظریے کے لیے جہاد اور مجاہدہ ہے۔ اس لیے کہ اس سطح پر بھی کوئی خلا موجود نہیں ہے۔ مختلف نظریات ہیں جو باہم متصادم ہیں۔ ہر ایک اپنی بالادستی اور supremacy کے لیے کوشاں ہے اور ان کے ماننے والے اس کے لیے تن من دھن لگا رہے ہیں۔ اب جو شخص کسی نظریے کو اختیار کر کے اس کے لیے محنت و مشقت کرتا ہے وہ اس نظریے کا مجاہد ہے۔ گویا اس اعتبار سے ہم اس جدوجہد کو مجاہدہ فی سبیل الاشتراکیہ‘ مجاہدہ فی سبیل الوطن یا مجاہدہ فی سبیل الدیموکراتیہ کہہ سکتے ہیں۔ تو یہ ’’فی سبیل......‘‘ جو ہے جس کو انگریزی میں آپ ’’in the cause of‘‘ سے تعبیر کریں گے‘ اس کا تعین بھی اس مجاہدے کے لیے لازم ہے۔

اب آپ دیکھئے کہ متذکرہ بالا دونوں آیات میں ’’مجاہدہ فی سبیل اللہ‘‘ کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا: ﴿وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اور کھپائی اس میں اپنی جان بھی اور اپنے اموال بھی‘‘۔ اسی طرح سورۃ البراءۃ (التوبۃ) میں فرمایا گیا: ﴿وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾ ’’اور اللہ کی راہ میں جہاد‘‘۔ اس سے پہلے بھی ہمارے اس منتخب نصاب میں یہی لفظ ’’جہاد‘‘ استعمال ہو چکا ہے۔ تیسرے سبق میں سورۂ لقمٰن کے دوسرے رکوع میں بیان ہوا کہ مشرک والدین اپنی اولاد کو اگر شرک پر مجبور کریں تو یہ ان کا مجاہدہ ہے۔ ایک مؤمن مجاہد فی سبیل التوحید ہے‘ مجاہد فی سبیل اللہ ہے اور اس کے مشرک والدین بھی مجاہدہ کر رہے ہیں‘ وہ بھی کوشش کر رہے ہیں‘ وہ اپنی اولاد پر دباؤ ڈال رہے ہیں بالفاظِ قرآنی: ﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ (آیت ۱۵) ’’اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو اُن کی بات ہرگز نہ مان‘‘۔ یعنی اگر وہ دونوں تجھ سے جہاد کریں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی

علمی دلیل نہیں، نہ عقل میں اس کے لیے کوئی بنیاد ہے، نہ انسان کی فطرت اس کی تائید کرتی ہے، نہ کوئی اور علمی استدلال اس کے حق میں موجود ہے، نہ خدا کی اتاری ہوئی کسی کتاب میں اس کے لیے کوئی سند پائی جاتی ہے، تو اگر وہ تم سے مجاہدہ کریں تو تم ان کا کہنا نہ مانو!

معلوم ہوا کہ یوں نہیں سمجھنا چاہیے کہ جہاد صرف ایک بندۂ مؤمن ہی کرتا ہے، بلکہ جہاد تو اس دنیا کا اصول ہے۔ یہ دنیا قائم ہی جہاد پر ہے۔ وہ لوگ جو مُردہ ہوں، جن میں سیرت و کردار نام کی کوئی شے موجود نہ ہو، جن میں درحقیقت کوئی خیال یا نظریے کی بلندی اور پختگی پیدا ہی نہ ہوئی ہو، جو حیوانی سطح پر صرف حیوانی جبلتوں کے تحت زندگی بسر کر رہے ہوں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ زندگی بسر نہ کر رہے ہوں بلکہ زندگی انہیں بسر کر رہی ہو، اُن کا معاملہ مختلف ہے۔ لیکن اگر فی الواقع کسی شخص کا اپنا کوئی خیال اور نظریہ ہے، کسی بات کی حقانیت تک اسے رسائی حاصل ہوتی ہے، کسی چیز کی صحت پر اس کے دل نے (صحیح یا غلط) گواہی دی ہے، اس کی عقل نے اسے قبول کیا ہے، اس شخص میں اگر سیرت و کردار نام کی کوئی شے ہے، character کی کوئی قوت ہے، اگر وہ بامروّت انسان ہے تو اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنے اس نظریے اور خیال کے لیے، جس کی حقانیت پر اس کے دل نے گواہی دی ہے اور جس کی صداقت کو اس کے ذہن اور دماغ نے قبول کیا ہے، اس میں مجاہدے کی کیفیت پیدا ہو، وہ اس کی نشر و اشاعت کے لیے اپنی امکانی سعی بروئے کار لائے، اس کے اعلان و اعتراف میں کسی بھی چیز سے خائف نہ ہو، یہاں تک کہ اگر جان دینے کا مرحلہ آئے تو اس کی خاطر جان قربان کر دے۔ یہ درحقیقت کسی بھی انسان کے صاحبِ کردار ہونے کے لیے شرطِ لازم ہے۔

اس سے پہلے یہ بات عرض کی گئی تھی کہ سورۃ العصر میں جو چار چیزیں بیان ہوئی ہیں وہ منطقی اعتبار سے انتہائی مربوط ہیں۔ عقل و منطق کے اعتبار سے ہر انسان کا طرزِ عمل کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی لازماً یہ ہونا چاہیے کہ پہلے وہ یہ دیکھے کہ حق کیا ہے، صحیح بات کیا ہے، انصاف کا نقطۂ نظر کون سا ہے! یہ تلاش اور تحقیق و تفتیش اس کے لیے لازم ہے۔ اور جب اسے حق و صداقت معلوم ہو جائے تو اب وہ اگر صاحبِ کردار انسان ہے تو اسے قبول کرنا اس کے لیے لازم ہے۔ پھر اس حق اور صداقت کی تعلیم و تبلیغ، اس کا اعلان اور اس کے لیے اگر کوئی تکلیف اور مصیبت آتی ہے تو اسے برداشت کرنا، لوگوں کی ناراضگی مول لینی پڑے تو اس کے لیے آمادہ رہنا، یہاں تک کہ اگر جان پر کھیل جانا پڑے تو اس سے گریز نہ کرنا اس کے صاحبِ کردار ہونے کا تقاضا ہے۔ آخر سقراط نے زہر کا

پیالہ کیوں پی لیا تھا؟ اس لیے کہ اس پر کچھ حقیقتیں اور صداقتیں منکشف ہوئی تھیں — اور جب اس کے سامنے دو متبادل (alternatives) آئے کہ یا تو اِن صداقتوں سے اعلانِ براءت کرو یا زہر کا پیالہ پی جاؤ تو اس نے زہر کا پیالہ پی جانے کو ترجیح دی اور حقائق سے مُنہ موڑ لینے کو گوارا نہ کیا۔ یہ بالکل دو اور دو چار کی طرح کی بات ہے کہ جس شے کی حقانیت پر انسان کے دل و دماغ نے گواہی دے دی اور جس صداقت پر اسے یقین ہو گیا' اب اس کی غیرت وحمیت اور شرافت کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی نشر واشاعت' اس کے اعلان واعتراف اور اس کو دنیا میں غالب اور بالفعل رائج اور نافذ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے اور اس کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہو کر گزرے۔ اگر وہ یہ کرتا ہے تو وہ واقعتاً ایک صاحبِ کردار انسان ہے۔

دین کے اعتبار سے یہ تمام کیفیات جمع کر لی جائیں تو ان کے لیے جامع عنوان ہوگا ''جہاد فی سبیل اللہ'' یا ''مجاہدہ فی سبیل اللہ''۔ جس نے اس کائنات کی اصل حقیقت کو پہچان لیا' اللہ کو جان لیا' اس کو مان لیا' اب اللہ کے لیے اپنی جان اور مال کا کھپانا اس پر لازم ہے۔ ایک انسان اگر کسی چھوٹی سی حقیقت کا سراغ لگانے کے بعد اس حقیقت کے بیان میں اور اس کے اعلان واعتراف میں اپنی جان دینا گوارا کر سکتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ ایک بندۂ مؤمن اللہ کو ماننے کے بعد اپنے گھر میں پاؤں پھیلا کر سوتا رہے اور اسے اس بات کی فکر نہ ہو کہ اللہ کا دین غالب ہے یا مغلوب!

لفظ جہاد کے لغوی مفہوم کے معین ہو جانے اور اس بات کو اصولی طور پر سمجھ لینے کے بعد کہ کسی بھی صاحبِ کردار اور صاحب سیرت انسان کے لیے کسی نظریے کو قبول کرنے کے بعد اس نظریے کے لیے اپنی جان و مال کا کھپانا ناگزیر ہو جاتا ہے' اب آیئے ہم یہ دیکھیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز کیا ہے' اس کی اوّلین منزل کیا ہے اور اس کی آخری منزلِ مقصود کون سی ہے۔ یہ تین باتیں جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں بہت اہم ہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز: مجاہدہ مع النفس

ایک بندۂ مؤمن کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز خود اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ ہے۔ اس لیے کہ ایمان کا حاصل تو یہی ہے کہ انسان نے اللہ کو مانا' اللہ کے رسولؐ کو مانا' اللہ کی کتاب کو مانا' آخرت کو مانا' بعث بعد الموت' حساب کتاب اور جزاء وسزا کو مانا۔ اگر یہ ماننا صرف اِقْـرَارٌ بِـاللِّسَانِ کے درجے میں نہیں ہے' محض ایک Dogma یا ایک متوارث عقیدہ (Recial Creed) نہیں

ہے' بلکہ فی الواقع ان حقائق پر انسان کا ذہن مطمئن ہو چکا ہے' دل میں یقین جاگزیں ہوگیا ہے اور اس سے اس کا باطن منور ہو گیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اپنے اندر ایک کشاکش پیدا ہوگی' ایک تصادم اس کی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں برپا ہو جائے گا۔ ایک طرف نفس کے تقاضے اور انسان کا وہ نفس امّارہ (Baser Self) ہے جسے قرآن کہتا ہے: ﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً نفس تو برائی پر اکساتا ہی ہے''۔ یا جسے جدید محققین مثلاً فرائڈ نے ''ID'' یا ''LIBIDO'' سے تعبیر کیا ہے۔

انسان کے یہ حیوانی داعیات اور جبلی تقاضے (animal instincts) بڑے مُنہ زور ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرائڈ کا مشاہدہ اگر اسے اس طرف لے گیا کہ جنس کا جذبہ انسان میں ایک بڑا قوی محرک ہے تو یہ بات کلیتاً غلط نہیں ہے۔ فی الواقع یہ سارا تمدن کا ہنگامہ اور یہاں کی چہل پہل اسی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسی طرح اگر کسی اور مفکر نے اس حقیقت کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا کہ پیٹ انسان کے اندر ایک بہت بڑا عامل اور محرک ہے اور انسان کی معاشی ضروریات اس کے لیے بہت بڑے محرک کی حیثیت رکھتی ہیں' تو واقعتاً اس میں ہرگز کوئی شک نہیں' یہ بڑے مُنہ زور داعیات ہیں۔ انسان کے اندر سے ابھرنے والے یہ داعیات اپنے طور پر کسی صحیح اور غلط' حلال اور حرام یا جائز و ناجائز کی تمیز کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ جذبات اندھے اور بہرے ہیں۔ انہیں صرف اپنے تقاضے کی تسکین سے غرض ہے۔ اگر بھوک لگی ہے تو پیٹ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کے جہنم کو بھر دیا جائے۔ اگر شہوت کا جذبہ اُبھرا ہے تو اسے صرف اپنی تسکین سے غرض ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے' جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے۔ لیکن اگر اللہ کو مانا ہے' اللہ کے رسول ﷺ کو مانا ہے تو ان کی طرف سے عائد کردہ حلال اور حرام کی قیود کی پابندی کرنی ہوگی۔ جیسے سورۃ التغابن میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ ایمان کا لازمی نتیجہ اطاعت ہے: ﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ﴾ (آیت ۱۲) ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی''۔ یعنی اب تمہارے وجود اور تمہارے اعضاء و جوارح سے ایسی کوئی حرکت صادر نہیں ہونی چاہیے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو توڑنے والی ہو۔ تمہارے تمام اعضاء و جوارح سے جو اعمال صادر ہوں وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ یا جیسے کہ سورۃ الحجرات میں وارد ہے: ﴿لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ﴾ (آیت ۱) ''اللہ اور اس کے رسولؐ سے آگے مت بڑھو''۔ مؤمن

کی آزادی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے تشبیہاً بیان فرمایا کہ مؤمن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ جس قدر رسّی دراز ہے اسی قدر وہ کھونٹے کے گرد گھوم پھر سکتا ہے' اس سے زائد نہیں۔ یہ حدودُ اللہ ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۸۷) ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' ان کے قریب مت جاؤ''۔ اور کہیں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾﴾ (البقرۃ) ''اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو وہی ظالم ہے''۔

تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کشمکش اور کشاکش ہے جو ایمان کے نتیجے میں انسان کی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں شروع ہو جاتی ہے۔ اس کشاکش کا آغاز اُسی لمحے ہو جاتا ہے جیسے ہی ایمان دل میں داخل ہوتا ہے۔ البتہ جب تک یہ ایمان نوکِ زبان پر رہتا ہے کوئی کشاکش نہیں ہوتی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ صرف قول ہی تو ہے' کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ' جیسے کہ آئندہ سورۃ الصّف کے درس میں یہ مضمون آنے والا ہے: ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾﴾ ''کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟'' قول اور فعل کا تضاد تو دنیا کی ایک عام مشاہدے کی چیز ہے کہ زبانی اقرار کسی اور بات کا ہے اور عمل کسی اور چیز پر ہو رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی خیال یا کوئی نظریہ انسان کے باطن میں اتنا گہرا اتر جائے کہ وہ یقین بن کر دل میں بیٹھ جائے تو اب اس کا نتیجہ تصادم اور کشاکش کی صورت میں برآمد ہو کر رہے گا۔ اب ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خواہ تمہاری بھوک ہو یا شہوت ہو' یا کوئی اور فطری جذبہ اور تقاضا تمہارے باطن میں سے ابھر رہا ہو' اس کی تسکین اب حلال اور حرام کی قیود اور حدود کے اندر اندر کرنی ہوگی' مادر پدر آزاد ہو کر اب کوئی کام نہیں ہوگا۔ یہیں سے اس کشاکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ''اے اللہ کے رسولؐ! سب سے اعلیٰ اور افضل جہاد کون سا ہے؟'' جواباً آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ)) ''کہ تو اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کرے اور اسے اللہ کی اطاعت کا عادی اور خوگر بنائے''۔ یہ نقطۂ آغاز ہے جہاد کا۔ جیسے کہ ایک اور مقام پر آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))[1]

''تم میں سے کوئی شخص حقیقی معنی میں مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفس (اس کی

(۱) صحیح البخاری کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لأخیه مایحب لنفسه

خواہش نفس) تابع نہ ہو جائے اس کے جو میں لے کر آیا ہوں''۔

یہ بات حقیقتِ شرک کے ضمن میں عرض کی جا چکی ہے کہ شرک کی ایک ابتدائی اور بڑی بنیادی کیفیت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو اپنا معبود بنا لے۔ سورۃ الفرقان کی آیت ۴۳ میں فرمایا گیا: ﴿اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰٮهُ ؕ﴾ ''کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالیا؟''۔ مولانا رومؒ نے بھی فرمایا تھا:

نفس ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیک او را عون ایں را عون نیست

یعنی میرا یہ نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے' یہ خدا کے حکم سے سرتابی کرتا ہے' اس کے حکم کے مقابلے میں اپنی چاہت اور اپنی پسند کا تقاضا کرتا ہے کہ اُسے مقدم رکھا جائے' اسے بالاتری اور بالادستی حاصل ہونی چاہیے۔ یہ کشاکش درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز ہے۔

اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ جو لوگ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے اس باطنی میدانِ کارزار میں کوئی فتح اور بالادستی حاصل کیے بغیر باہر کے دشمنوں سے لڑائی لڑنا شروع کر دیتے ہیں وہ دراصل خود فریبی کا شکار ہیں ـــــ باہر کے دشمنوں سے نبردآزمائی اور مجاہدہ و مقاتلہ سے پہلے اپنے نفس سے کشاکش اور اسے احکامِ الٰہی کا پابند بنانے کی جدوجہد لازم اور ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ جہاد و مجاہدہ کا صحیح اور فطری طریقہ یہی ہے کہ مجاہدے کا آغاز خود اپنی ذات سے ہو۔ جس طرح ایک پودا زمین میں سے نکلے' پھوٹے اور پھر پروان چڑھے تو وہ ایک مضبوط و تناور درخت بن سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿......اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾﴾ (ابرٰھیم) ''اس (شجرِ طیبہ) کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔'' اسی طرح مجاہدہ مع النفس وہ جڑ ہے جو انسانی شخصیت کے باطن میں اگر گہری نہ اتر گئی ہو اور صرف اوپر ہی اوپر زمین میں اٹکی ہوئی ہو تو پھر یہ کسی بھی سیلاب اور کسی بھی نوع کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا مرحلہ

یہ مجاہدہ مع النفس جب انسان کے باطن سے پھوٹتا ہے تو یہ اللہ کے دشمنوں سے اور اللہ کے دین کے دشمنوں سے مجاہدہ' کشاکش اور جدوجہد کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کی اوّلین منزل دعوت اور تبلیغ و تلقین ہے۔ یہ درحقیقت اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا خارج میں پہلا ہدف ہے کہ جو بات آپ نے

حق مانی ہے اس کی حقانیت کا اعلان کیجیے' اس کی حقانیت کو دنیا کے سامنے پیش کیجیے۔ یہ آپ کی شرافتِ نفس کا تقاضا بھی ہے۔ نبی اکرمﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے کہ:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۱)

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے''۔

اگر آپ نے ایک حق کو حق جان کر اور اسے اپنے لیے ایک دولت اور نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کیا ہے' تو اب آپ کی شرافت و مروّت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے بھائیوں تک بھی اس دولت کو پہنچایئے۔ اگر فی الواقع آپ ان کے خیر خواہ ہیں تو ان کو اس دولت سے محروم دیکھنے پر آپ کا دل کڑھنا چاہیے۔ اسی طرح غیرت وحمیت کا تقاضا بھی ہے کہ اس حق کو دنیا میں پھیلایا جائے اور عام کیا جائے۔

پہلا ہدف: دعوت وتبلیغ

دعوت وتبلیغ کو آپ یوں کہہ لیجیے کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ اس میں تلقین اور نصیحت بھی شامل ہے اور حق کی نشر و اشاعت اور اس کا ابلاغ بھی۔ اس ابلاغ کے لیے ظاہر بات ہے کہ ہر دَور میں جو بھی ذرائع میسر ہوں گے وہ بھرپور طریقے پر استعمال کیے جائیں گے۔ نبی اکرمﷺ نے اپنے زمانے میں جو ذرائع بھی ممکن تھے' ان سب کو استعمال کیا ہے۔ آپؐ کوہِ صفا پر کھڑے ہوتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہیں: ''وَاصَبَاحَا!'' ''ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے!'' یہ اُس زمانے کا رواج تھا کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ کوئی دشمن حملہ کرنے والا ہے تو وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے اپنے کپڑے اتار کر اور بالکل عریاں ہو کر کسی بلند مقام پر کھڑا ہو جاتا تھا تاکہ سب لوگ اسے دیکھ سکیں' اور پھر نعرہ لگاتا تھا: وَاصَبَاحَا! یعنی ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے۔ لوگ سمجھ جاتے تھے کہ کوئی بڑی اہم بات ہے۔ چنانچہ سب اس کی طرف لپکتے تھے۔ اور پھر وہ اپنی خبر یا اطلاع لوگوں تک پہنچاتا تھا۔ رسول اللہﷺ کے بارے میں اس کا ہرگز کوئی سوال یا امکان نہیں تھا کہ آپﷺ عریاں ہو جاتے' لیکن باقی آپؐ نے وہ پورا طرزِ عمل اختیار کیا۔ کوہِ صفا پر بلند مقام پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا' لوگ جمع ہوئے' آپﷺ نے دعوت پیش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ پورے مجمع میں سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور آپﷺ کے سب سے قریبی رشتہ دار ابولہب

(۱) صحیح البخاری کتاب الایمان ، باب من الایمان ان یحب لأخیه مایحب لنفسه

نے یہ زہر آلود الفاظ کہے: ''تَبًّا لَكَ، اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟'' (آپ کے ہاتھ ٹوٹ جائیں' کیا آپؐ نے اس کام کے لیے ہمیں جمع کیا تھا؟) نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ! ۔ بہرحال اس وقت یہ بتانا مقصود تھا کہ اس ابلاغ، تبلیغ اور نشر واشاعت کے لیے جو بھی وسائل ممکن ہوں اختیار کیے جانے چاہئیں ۔ سیرت میں ہمیں نظر آتا ہے کہ انفرادی ملاقاتیں بھی تھیں' آپؐ گلیوں میں بھی تبلیغ فرماتے تھے' جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی قافلہ ٹھہرا ہوا ہے وہاں پہنچ کر اپنی دعوت پیش فرماتے تھے ۔ حج کے ایام میں آپؐ کی یہ دعوتی سرگرمی پورے عروج کو پہنچ جاتی تھی ۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ آئے ہوتے تھے' آپؐ مختلف وادیوں میں گھومتے اور جہاں کہیں کسی قبیلے کا پڑاؤ دیکھتے وہاں جا کر اپنی دعوت پیش کرتے ۔ گویا وہ نقشہ ہوتا جو حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا میں نظر آتا ہے:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝﴾ (نوح)

''کہا اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قسم کے لوگوں کو شب و روز پکارا' مگر میری پکار نے ان کے فرار میں ہی اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے' انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا''۔

یعنی اے میرے ربّ! اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اس قوم کو فرداً فرداً بھی پکارا' عام مجمعوں میں بھی انہیں دعوت دی' میں تنہائی میں بھی ان سے ملا' میں نے علی الاعلان بھی یہ بات کہی ہے' میں نے رات کی تاریکیوں میں بھی پیغام پہنچایا ہے اور دن کی روشنی میں بھی اس پیغام کی نشر واشاعت کی ہے۔

یہ ہے درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین مرحلہ۔ اسے تبلیغ کہیے' دعوت کہیے یا نشر واشاعت کہیے۔ اس میں محنت ومشقت ہوگی' اوقات صرف ہوں گے' صلاحیتیں کھپیں گی۔ ضرورت اس بات کی ہوگی کہ باصلاحیت لوگ آئیں اور اپنی صلاحیتوں کو اس راہ میں صرف کریں' ذہین اور فطین نوجوان آئیں اور وہ اس کام میں اپنے آپ کو جھونک دیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پھر اپنے کاروبار میں منہمک نہیں ہوئے' بلکہ آپؓ اسی کشاکش' اسی کوشش اور اسی

جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہو گئے' اور چند سال کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ عشرہ مبشرہ (رضی اللہ عنہم) میں سے چھ اصحاب کو لا کر انہوں نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی جھولی میں ڈال دیا۔ یہ ہے اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کی پہلی منزل!

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جنگ اور قتال کا مرحلہ تو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کہیں پندرہ برس کے بعد آیا۔ مکہ مکرمہ کے تیرہ برسوں میں اور پھر قیامِ مدینہ کے ابتدائی دو برسوں میں مجاہدہ جاری رہا۔ یہ جدوجہد اور کشاکش نظریاتی سطح پر تھی۔ یہ عقائد کا تصادم تھا جو جاری تھا اور اس میں لوگ تکالیف اور مصیبتیں بھی جھیل رہے تھے۔ جن لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور نیا عقیدہ اختیار کیا ان کی اپنے گھروں اور اپنی برادریوں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ اپنے ماحول کے ساتھ ان کا تصادم پوری شدت کے ساتھ شروع ہو گیا۔ وہ ستائے گئے' ان کو ایذائیں دی گئیں' جس کا نقشہ ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی اس آیت میں دیکھ چکے ہیں کہ: ﴿فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا......﴾ (آیت:۱۹۵) ''پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میرے راستے میں ستائے گئے اور انہوں نے قتال کیا اور مارے گئے......'' یہ قتال کا مرحلہ یعنی غزوۂ بدر کا واقعہ تو کہیں ۲ھ کا ہے' لیکن پہلے پندرہ برس یہ کشاکش اور تصادم جاری تھا۔ پھر جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا ان کی تربیت کرنا اور ان کو ایک منظّم جماعت کی شکل دینا بھی تو مجاہدے ہی کی ایک شکل تھی۔

دعوت وتبلیغ کی غرض وغایت: اتمامِ حجت

مجاہدہ فی سبیل اللہ کا اوّلین ہدف یہ ہے کہ خلقِ خدا پر خدا کی طرف سے دعوت وتبلیغ کے ذریعے حجت قائم کر دی جائے' تاکہ روزِ قیامت انسان یہ عذر نہ پیش کر سکے کہ اے ربّ! ہمیں معلوم نہ تھا کہ تیرا دین کیا ہے۔ یہ بات ہمارے آئندہ درس (سورۃ الحج کی آخری آیات) میں وضاحت کے ساتھ آئے گی کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی بعثت کی ایک بہت بڑی غرض ''شہادت علی الناس'' قرار دی گئی ہے۔ یہ گواہی اور شہادت قولاً بھی دی جاتی ہے اور عملاً بھی' تاکہ خلقِ خدا پر حجت قائم ہو جائے اور اس کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کام میں محنتیں بھی لگیں گی اور صلاحیتوں کا صرف بھی ہوگا' تب ہی تو کوئی داعیٔ حق خلقِ خدا پر حجت قائم کر سکے گا کہ جو حق میرے پاس تھا میں نے تمہارے سامنے رکھ دیا ہے' تم یہ نہ کہہ سکو گے کہ میں نے اس کے بیان میں کتمان سے یا اخفا سے کام لیا ہے۔ اب آپ اسے قطع

عذر کہہ لیں یا اتمامِ حجت‘ بہر کیف یہ جان لیجیے کہ مجاہدہ فی سبیل اللہ کی اوّلین منزل یہی ہے۔

مجاہدہ فی سبیل اللہ کا آخری ہدف

اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا آخری ہدف اور اس کی غایت قصویٰ کیا ہے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس کائنات کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اُسی کا حکم نافذ ہونا چاہیے۔ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ وَالْحُکْمُ لِلّٰہِ ۔زمین بھی اللہ کی ہے اور حکم بھی اللہ کا ہے۔ بالفاظ قرآنی: ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ﴾ (یوسف:٦٧) حکم (اور فیصلے) کا اختیار سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں‘‘۔ گویا تمام حقائق میں سب سے فائق حق یہی ہے کہ اللہ کی زمین پر اُسی کے اختیار کو عملاً نافذ و غالب ہونا چاہیے‘ جبکہ بالفعل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ اس حق کو بالفعل دنیا میں نافذ کرنے کے لیے اب ایک مزید محنت درکار ہو گی‘ مزید جدوجہد کی ضرورت ہو گی۔ دعوت و تبلیغ کے لیے محنتیں اور کوششیں اپنی جگہ اہم ہیں‘ لیکن یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اگر کسی بے ضرر قسم کی بات کی تبلیغ کی جا رہی ہو‘ جس میں کسی پر کوئی تنقید نہ ہو اور جس میں کسی کے مفادات پر کوئی آنچ نہ آتی ہو تو کوئی تصادم نہیں ہوگا‘ کوئی ٹکراؤ نہیں ہوگا‘ بلکہ بالعموم ایسے واعظین کو ہار پہنائے جاتے ہیں اور ان کی خدمت کی جاتی ہے۔ لیکن اگر تبلیغ ہو صحیح معنی میں کہ جس میں حقیقت ہی کو سامنے لایا جائے اور حق بات کے کہنے سے دریغ نہ کیا جائے‘ خواہ اس سے لوگوں کے مفادات پر آنچ آ رہی ہو‘ یا ان کے غلط نظریات اس سے مجروح ہو رہے ہوں‘ تو ظاہر بات ہے کہ تصادم اور کشمکش کا مرحلہ آ کر رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصادم اور کشمکش مکی دَور میں بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے آگے مرحلہ آتا ہے جب داعیٔ حق یہ کہتا ہے کہ ہم صرف مبلغ نہیں ہیں‘ ہم صرف داعی نہیں ہیں‘ بلکہ ہم تو حق کو قائم اور غالب کرنے کے لیے اٹھے ہیں‘ ہم عدل و انصاف کا صرف وعظ کہنے کے لیے نہیں آئے‘ بلکہ ہم عدل و انصاف کو بالفعل نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہے جو سورۃ الشوریٰ میں نبی کریم ﷺ سے کہلوائی گئی کہ اے نبی! ان سے کہہ دیجیے: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ؕ﴾ (آیت:۱۵) ’’اور کہ مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل کروں‘‘۔ ظاہر بات ہے کہ جب دعوت یہ ہوگی کہ اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدل قائم کیا جائے‘ اسے نافذ اور رائج کیا جائے تو یہ صرف تبلیغ و تلقین اور وعظ و نصیحت کا مرحلہ نہیں ہے‘ بلکہ اقامت دین کا مرحلہ ہے۔ یہ صرف کسی نظام کی برکات کو علمی سطح پر پیش کر دینے کا مرحلہ نہیں بلکہ اس نظام کو فی الواقع قائم اور نافذ کر دینے کا مرحلہ ہے۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ یہاں تصادم اب مزید شدت اختیار کرے گا۔ جن کے مفادات پر آنچ

آئے گی وہ اسے کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کریں گے۔ وہ اپنی پوری قوتوں کو اور اپنے تمام وسائل و ذرائع کو مجتمع کر کے مزاحمت کریں گے اور اس دعوت کی راہ روکنے اور اسے کچلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ اس مرحلے پر یہ کشاکش اور تصادم انتہائی شدید اور ہولناک صورت اختیار کرے گا۔

جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل: قتال فی سبیل اللہ

تو اقامت دین اور غلبۂ دین حق کی اس جدوجہد میں' جس کے لیے قرآن مجید کی ایک اصطلاح ''اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ '' کی بھی ہے' واقعہ یہ ہے کہ کوئی خواہ کتنا ہی ناپسند کرے تصادم کی یہ آخری منزل آ کر رہے گی' آگ اور خون کی ندیوں کو بہر حال عبور کرنا ہو گا' اپنے خون کا نذرانہ بہر کیف پیش کرنا ہو گا۔ اس لیے کہ یہ نظام کو بدلنے کا معاملہ ہے' وعظ اور نصیحت سے آگے بڑھ کر عدل اور انصاف کو بالفعل رائج کرنے کا معاملہ ہے۔ یہاں وہ تصادم انتہائی شدت پکڑ لیتا ہے' اور جہاد بالفعل ''قتال'' کی شکل اختیار کرتا ہے۔

یہ ہے گویا اُس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا نقطۂ عروج' جس کا نقطۂ آغاز ہے ''مجاہدہ مع النفس''۔ نفسِ انسانی سے یہ مجاہدہ جب خارج کی طرف آتا ہے تو یہ تبلیغ دین' دعوتِ دین' احقاقِ حق' ابطالِ باطل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دنیا میں حق کی نشر و اشاعت اور بدی کے سدّ باب کے لیے وعظ و نصیحت' تلقین و تبلیغ اور افہام و تفہیم کی تمام قوتوں کو بروئے کار لانا اور ابلاغ کے ممکنہ ذرائع کو استعمال کرنا اس جدوجہد کا اوّلین مرحلہ ہے اور اس سے اصل مقصود یہ ہے کہ خلقِ خدا پر خدا کی جانب سے حجت قائم کر دی جائے ـــــ اور اس کی بلند ترین منزل ہے ''اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ '' کہ پورے کے پورے دین اور پورے نظامِ زندگی پر اللہ کے دین کو غالب کر دیا جائے۔

قرآن مجید اس حقیقت کو کہیں یوں بیان کرتا ہے: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: ۳۹) ''اور (اے مسلمانو!) ان کے ساتھ جنگ کرو (اور تمہاری یہ جنگ جاری رہنی چاہیے) یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے''۔

اس زمین پر اللہ کا حق ہے کہ اسی کی حکومت قائم ہو۔ لیکن اگر یہاں کسی اور نے اپنی حکمرانی کا تخت بچھایا ہوا ہے اور کسی فرعون یا نمرود کی مرضی یہاں رائج ہے تو یہی درحقیقت قرآن حکیم کی اصطلاح میں فتنہ ہے۔ یہ فساد فی الارض کی بدترین شکل ہے۔ اس فتنے کو ختم کرنا اور اس بغاوت کو فرو کرنا ایک بندۂ مؤمن کا مقصدِ حیات بن جانا چاہیے۔ اگر وہ واقعتاً اللہ کو ماننے والا ہے اور اگر اس نے واقعتاً دین کو

قلب اور ذہن کی متفقہ شہادت کے ساتھ قبول کیا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ پھر وہ ایسے ہر نظام کو جس میں خدا کی مرضی اور خدا کے حکم کو فائنل اتھارٹی کی حیثیت سے قبول نہ کیا جائے' فتنہ اور بغاوت سمجھے گا' چاہے وہاں بظاہر بڑا امن وامان ہو اور وہاں ہر طرح سے زندگی کا کاروبار سکون سے جاری ہو۔ قرآن کی رو سے غیر اللہ کی حکومت اور غیر اللہ کا نظام مجسم فتنہ' مجسم فساد اور مجسم بغاوت ہے' لہٰذا اس کے خلاف سینہ سپر ہو جانا اور اپنے جان و مال کو دین کی حمایت میں کھپا دینا ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ ایمانِ حقیقی کا رکن لازم ہے۔

ہمارے اس دورِ انحطاط میں' جیسا کہ آغاز میں عرض کیا گیا' جہاد فی سبیل اللہ پر دو ظلم روا رکھے گئے۔ ایک یہ کہ اس کو جنگ کے مترادف قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ اس کی وسعت' اس کی ہمہ گیری' اس کا نقطۂ آغاز' اس کے وہ سارے مراحل جن میں دعوت و تبلیغ بھی ہے' نشر و اشاعت بھی ہے' پھر جو لوگ اس حق کو قبول کر لیں ان کو ایک نظم میں پرو کر ایک منظم قوت کی شکل دینا اور انہیں آئندہ کے مراحل کے لیے مناسب تربیت دینا بھی شامل ہے' یہ سب ذہن سے بالکل خارج ہو گئے۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہر جنگ کو بہر حال اور بہر نوع جہاد قرار دے دیا گیا۔ اس طرح ''جہاد'' کے لفظ کو ہم نے انتہائی بدنام کر دیا اور اس کے مقدس تصور کو بہت بری طرح مجروح کیا گیا۔ اور تیسرا ظلم اس پر یہ ڈھایا گیا کہ جہاد کو فرائض دینی کی فہرست سے خارج کر دیا گیا کہ یہ فرضِ عین نہیں ہے' بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ یہ درحقیقت مسلمانوں کے اندر سے جذبۂ جہاد کو ختم کرنے کی سازش کا حصہ ہے۔ کہیں یہ سازش بڑے ہی گھناؤنے انداز میں ہوئی' جیسے کہ غلام احمد قادیانی (علیہ ما علیہ) نے جہاد اور قتال کو اس دور میں بالکل منسوخ قرار دے دیا کہ ع ''دیں کے لیے حرام ہے اب دوستو قتال!'' یہ تو خیر انتہائی گمراہی کا معاملہ تھا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود ہمارے تصوراتِ دینی میں اب یہ جہاد فی سبیل اللہ کسی فرض کی حیثیت سے موجود نہیں ہے۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے' ہمیں یہ معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے' ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زکوٰۃ ہر صاحبِ نصاب پر فرض ہے اور ہمیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ حج ہر صاحبِ استطاعت پر فرض ہے' لیکن یہ بات بالکل ذہن سے نکل چکی ہے کہ جہاد بھی فرضِ عین ہے' یہ بھی دین کی طرف سے عائد شدہ کوئی ضروری فریضہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس تصور کو عام کیا جائے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جہاد کا شمار ''ارکانِ اسلام'' میں نہیں ہوتا۔ اسلامی ریاست کے شہری ہونے کے لیے اور ایک مسلمان معاشرے میں ایک فرد کی حیثیت سے کسی کے قبول کیے جانے

کے لیے جو کم سے کم لوازم ہیں' ان میں واقعتاً جہاد کا نام نہیں ہے۔ بخاری و مسلم سے مروی حدیث نبویؐ کے الفاظ واضح ہیں:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ' وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

''اسلام کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: اس بات کی گواہی کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں' اور نماز قائم کرنا' اور زکوٰۃ دینا اور (بیت اللہ کا) حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

ارکان اسلام میں یہی پانچ چیزیں ہیں' لیکن وہ ایمانِ حقیقی' جس کی بنیاد پر آخرت میں معاملات طے ہوں گے' جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کسی کو آخرت میں مؤمن قرار دے گا' اس ایمانِ حقیقی کے ارکان دو ہیں: ایک یقین' جو قلب میں جاگزیں ہو گیا ہو اور دوسرا جہاد' جو انسان کے عمل میں یقین قلبی کا اوّلین اور نمایاں ترین مظہر ہے۔ اور یہ وہ کشاکش اور تصادم ہے' اس راہ میں جان اور مال کا کھپانا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز ہے خود اپنے نفس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا پابند بنانے کے لیے اس کے ساتھ مجاہدہ۔ اور اس کے لیے پھر ابتدائی مرحلہ یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ' نشر و اشاعت اور تمام ممکنہ ذرائع ابلاغ کو کام میں لا کر حق کی دعوت کو پھیلایا جائے۔ اور اس کی آخری منزل یہ ہے کہ جس طریق سے اس شخص نے اپنے وجود پر اللہ کے دین کو قائم اور اللہ کی مرضی کو نافذ کیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کو اس پر بالفعل قائم کر دیا ہے' اسی طرح پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کو عملاً نافذ اور غالب کرنے کے لیے جان اور مال لگائے۔ اس کے لیے تن من دھن سے کوشش کرے اور اگر ضرورت داعی ہو تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ توفیق دے تو مرتبۂ شہادت حاصل کرے۔ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت ' نہ کشور کشائی!

یہ ہے اسلام میں جہاد کا وہ تصور جواب ہمارے آئندہ دروس میں مزید وضاحت کے ساتھ سامنے آئے گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ oo

(۱) صحیح البخاری کتاب الایمان باب قول النبیؐ نبی الاسلام علی خمس
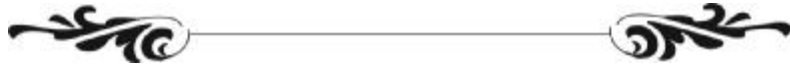
درس 16

جہاد فی سبیل اللہ
کی غایتِ اولیٰ
شہادت علی الناس

سُوْرَۃُ الْحَجّ کے آخری رکوع کی روشنی میں!

درس ۱۶

جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ

شہادت علی الناس

سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں

''طالب ومطلوب'' کی نسبت کے حوالے سے

فلسفۂ دین کی اہم بحث

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

حقیقتِ جہاد سے متعلق بعض بنیادی باتوں کی وضاحت پچھلے سبق میں ہو چکی ہے۔ اب ہمیں مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے چوتھے حصے کے پہلے باقاعدہ درس کا آغاز کرنا ہے جو سورۃ الحج کے آخری رکوع پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ہمارے اس منتخب نصاب کے اس مرحلے پر جو مضمون زیر بحث ہے اس سے اصلاً اس رکوع کی صرف آخری آیت ہی متعلق ہے' لیکن یہ پورا رکوع' جو چھ آیات پر مشتمل ہے' قرآن مجید کے انتہائی جامع مقامات میں سے ہے۔ اور اس مرحلے پر کوشش یہ ہوگی کہ اختصار کے ساتھ اس پورے رکوع کے مفہوم کو کسی درجے میں بیان کر دیا جائے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہمارے اس منتخب نصاب میں اب تک جتنے مضامین آئے ہیں ان کا ایک مختلف انداز اور اسلوب میں اجمالی اعادہ ہو جائے گا۔

دو تمہیدی باتیں

اس سے پہلے کہ اس رکوع کی آیات کا مطالعہ کیا جائے' دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری

ہے۔ ان کا مستحضر رکھنا قرآن حکیم سے ایک ذہنی مناسبت پیدا کرنے کے لیے بہت مفید ہوگا۔ ایک بات تو اجمالاً پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتوں کی ابتدائی اور اختتامی آیات نہایت جامع ہوتی ہیں۔ یہ ویسے بھی ایک عام قاعدہ ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کسی غزل کا مطلع اور مقطع خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ قصیدے کا ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی خطبے کا اگر آغاز ایسا ہو کہ خطیب اپنے سامعین کی توجہ کو جذب کرے اور اختتام ایسا ہو کہ وہ اپنے سامعین پر کوئی دائمی تاثر چھوڑ جائے تو وہ خطبہ کامیاب ہوگا۔ قرآن مجید اصلاً خطبے کے اسلوب پر نازل ہوا ہے اور اس کی اکثر سورتوں کی حیثیت خطبوں کی سی ہے۔ چنانچہ ان کے آغاز میں آنے والی آیات اور جن آیات پر ان سورتوں کا اختتام ہوتا ہے' بالعموم بہت جامع' بہت مؤثر اور توجہ کو جذب کر لینے والی ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی چند آیات پڑھ چکے ہیں۔ ان آیات کے حوالے سے بھی یہ حقیقت سامنے آئی تھی' لیکن سورۃ الحج کے اس آخری رکوع کے حوالے سے یہ حقیقت مزید مبرہن ہو جائے گی۔

اس رکوع کی چھ آیات میں جامعیت کا جو عالم ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کیجیے کہ پہلی چار آیات میں خطاب ''یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ '' (اے لوگو!) سے ہے۔ اور ان میں گویا کہ قرآن مجید کی وہ دعوتِ عام ہے جو وہ ہر فرد نوعِ بشر کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان آیات میں ان اصولوں کا خلاصہ آ گیا ہے جن کو ماننے کی وہ دعوت دیتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ وہی اصولِ ثلاثہ ہیں: (۱) توحید (۲) معاد (۳) رسالت۔ اسلام کا پورا قصر انہی تین بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔ لہٰذا پہلی چار آیات میں ''یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ '' سے خطاب کا آغاز کر کے ان تینوں باتوں کا ایک ایسا جامع ملخص پیش کر دیا گیا ہے کہ واقعتاً قرآن مجید کے اعجاز کے سامنے گردنیں جھک جاتی ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیات میں خطاب ہے: ''یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا '' کے الفاظ سے۔ یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے' جنہوں نے باتوں کو مان لیا۔ اب اگلی دعوت جو ہے وہ دعوتِ عمل ہے۔ گویا کہ پہلی چار آیات میں دعوتِ ایمان دی گئی اور اب ماننے والوں پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور ان کے جو تقاضے ہیں انہیں بیان کر دیا گیا۔ اور بڑی منطقی بات ہے کہ جنہوں نے مانا ہی نہیں ان سے کسی عمل کا مطالبہ نہیں ہے۔ ان کے سامنے کسی عملی تقاضے کا پیش کیا جانا بے معنی ہے۔ جنہوں نے خدا کو' یا رسول کو' یا آخرت کو نہیں مانا' اب ان سے کیا کہا جائے کہ نماز پڑھو یا دین کے لیے

محنت اور جد و جہد کرو۔ یہ سارے تقاضے دعوتِ عمل کے ہیں۔ یہاں ان کو دو آیات میں سمو لیا گیا۔ اس پہلو سے جب آپ اس پر مزید غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت مزید واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ یہ مقام اس اعتبار سے قرآن مجید کا جامع ترین مقام ہے۔

دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل معجزہ قرآن مجید ہے' اور ''وجوہِ اعجاز القرآن'' پر بھی بہت بڑی بڑی محنتیں ہوئی ہیں' ان موضوع پر بڑی ضخیم تصانیف موجود ہیں' اور میرے نزدیک اعجازِ قرآن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وجوہِ اعجازِ قرآن کا احاطہ بھی ناممکن ہے۔ یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا احاطہ کیا جائے کہ قرآن کن کن اعتبارات سے معجزہ ہے۔ لیکن یہاں ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے۔ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوئی۔ اس کے اوّلین مخاطب ایک خاص قوم کے افراد اور ایک خاص معاشرہ میں بسنے والے لوگ تھے۔ ان کے کچھ نظریات وعقائد تھے' کچھ مذہبی رسوم تھیں' اپنے خاص حالات اور معاملات تھے۔ قرآن حکیم کی گفتگو کے پس منظر میں حالات کے اس تانے بانے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر قرآن ان سے صرف اصولی باتیں کہتا اور بڑے منطقیانہ اور فلسفیانہ انداز میں اونچی اونچی عقلی باتیں ان کے سامنے رکھتا تو شاید وہ انہیں اپنے سے اتنی زیادہ متعلق معلوم نہ ہوتیں۔ قرآن جس پس منظر میں اور جن ظروف و احوال میں نازل ہوا ہے اس کا عکس قرآن کے اسلوب میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن انہی سے مخاطب ہے' ساری بات انہی سے ہو رہی ہے۔ اسی ماحول اور environment سے اپنی گفتگو اور تمام دلائل کے لیے بنیاد فراہم کی جا رہی ہے' لیکن دوسری طرف یہی کتاب ایک ابدی ہدایت نامہ ہے۔ چنانچہ بڑے سے بڑے فلسفی' بڑے سے بڑے سائنسدان اور بڑے سے بڑے حکیم و دانا انسان کی علمی تشفی' اس کی علمی پیاس کی سیری اور اس کی عقل اور ذہن و فکر کی رہنمائی تا قیامِ قیامت اسی کتاب کو کرنی ہے۔

اب آپ غور کیجیے کہ یہ کس قدر کٹھن مسئلہ ہے۔ چودہ سو برس پہلے کے زمانے میں نازل ہونے والی ایک کتاب جو ایک طرف ایک ان پڑھ قوم کو اپنے مخاطبینِ اوّل کی حیثیت سے اس طرح خطاب کرتی ہے کہ وہ قوم بھی یہ محسوس نہ کرے کہ اس کی کوئی بات ہمارے سروں کے اوپر ہی سے گزرتی چلی جا رہی ہے اور ہم سے متعلق نہیں ہے' دوسری طرف چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی کے کسی نابغہ فرد کو' کسی علامہ اقبال کو اس درجہ possess کرتی ہے کہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ مجھے اگر کہیں

کوئی تشفی میسر آئی ہے‘ میری علمی پیاس کے لیے اگر کوئی تسکین کا سامان میسر آیا ہے تو صرف قرآن مجید میں! یہ قرآن کا عظیم اعجاز ہے کہ وہ بات کرتا ہے تو اس انداز میں کہ جو قوم اس کی اوّلین مخاطب تھی گویا اسی سے بات ہو رہی ہے‘ لیکن اسی کے بین السطور میں اس طرح کی چیزیں موجود ہیں جو بڑے سے بڑے فلسفی اور بڑے سے بڑے فہیم و دانا انسان کی عقلی اور فکری رہنمائی کے لیے اپنے اندر پورا سامان لیے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے اس رکوع کے بعض پہلوؤں کی طرف بعد میں توجہ دلائی جائے گی۔

نوعِ انسانی کے لیے ایمان کی دعوت

اس تمہید کے بعد اب آیئے پہلے اس کی ابتدائی چار آیات‘ جن کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دعوتِ ایمان پر مشتمل ہیں‘ غور کریں۔ فرمایا:

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۷۵﴾ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾﴾

’’اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے توجہ سے سنو! یقیناً وہ ہستیاں کہ جنہیں تم پکارتے ہو اللہ کے سوا اس پر قادر نہیں ہیں کہ کسی مکھی تک کو تخلیق کر سکیں‘ خواہ وہ اس کے لیے مل جل کر کوشش کریں۔ اور اگر کوئی مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو وہ تو اس سے اس کو واپس لینے پر بھی قادر نہیں۔ کتنا ضعیف‘ کتنا لاچار ہے وہ جو طالب ہے‘ جو چاہ رہا ہے‘ اور کتنا کمزور اور بے بس ہے وہ جسے چاہا جا رہا ہے‘ جو مطلوب ہے۔ انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا۔ یقیناً اللہ قوی ہے‘ زبردست ہے۔ اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی۔ اللہ تعالیٰ سننے والا‘ دیکھنے والا ہے۔ جانتا ہے جو کچھ کہ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ کہ ان کے پیچھے ہے‘ اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹا دیے جائیں گے‘‘۔

یہ ہیں وہ چار آیات جن میں سے پہلی دو آیات میں توحید اور اس کے مقابل کی گمراہی یعنی شرک کا بیان ہے۔ احقاقِ توحید اور ابطالِ شرک کے بعد ایک آیت میں نبوت و رسالت سے متعلق ایک

نہایت اہم بحث وارد ہوئی ہے۔ اور آخری آیات معاد سے متعلق ہے' یعنی جزا وسزائے آخرت۔

اب یہاں دیکھئے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو بُت پرست ہیں' اصنام پرستی ان کا دین و مذہب ہے' پتھر کی مورتیوں کے سامنے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں' سجدے کر رہے ہیں' گڑگڑا گڑگڑا کر ان سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے کہا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ﴾ ''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے''۔ یہ وہی لفظ ہے جو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ہمارے ہاں ''ضرب المثل'' کے نام سے مستعمل ہے۔ ﴿فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ﴾ تو اسے توجہ سے سنو۔ ''سَمِعَ یَسْمَعُ'' کے معنی ہوتے ہیں سننا اور ''اِسْتَمَعَ یَسْتَمِعُ'' کے معنی ہوں گے توجہ سے سننا' کان لگا کر سننا' دھیان سے سننا۔ چنانچہ یہی لفظ آیا ہے سورۃ الاعراف کی اس آیت میں: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ یعنی جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو پوری توجہ سے سنو اور دھیان کے ساتھ اسے سنو اور خاموش رہو۔ تو یہاں فرمایا: ذرا توجہ سے سنو' ایک مثال بیان کی جاتی ہے اُس عمل کی جو تم کر رہے ہو۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ''بے شک یہ جنہیں تم پکار رہے ہو اللہ کو چھوڑ کر''۔ جن سے دعائیں کر رہے ہو' جن کے سامنے نذریں پیش کر رہے ہو' جن کے لیے چڑھاوے چڑھا رہے ہو۔ ﴿لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ﴾ ''یہ اس پر بھی قادر نہیں ہیں کہ ایک مکھی تک کی تخلیق کر سکیں' اگرچہ یہ سب جمع ہو جائیں''۔ ﴿وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ﴾ ''اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ وہ چیز اُس سے چھڑا نہیں سکتے''۔ یعنی تخلیق تو کیا کریں گے' اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اس سے چھڑانے پر قادر نہیں ہیں۔ ان حلووں مانڈوں پر اور ان چڑھاووں پر کہ جو تم نے ان کے سامنے رکھے ہیں' اگر مکھیاں بھنبھنانے لگیں تو یہ ان کو اڑانے پر بھی قادر نہیں ہیں۔ ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾﴾ ''کمزور ہے چاہنے والا اور جسے چاہا جاتا ہے''۔ یعنی کیا ہی ضعیف و لاچار اور بے بس ہے وہ جسے چاہا جا رہا ہے' جو مطلوب ہے۔ اور اسی سے اندازہ کرو کہ کتنا لاچار اور بے بس ہے وہ جو اسے چاہ رہا ہے' جو ایسے مطلوب کا طالب بنا ہے۔

معبودانِ باطل کی بے بسی

اب پہلے ذرا اس پر توجہ کیجیے کہ اس مثال سے اگرچہ بظاہر ایک خیال پیدا ہوتا ہے کہ جتنے اہتمام کے ساتھ بات شروع کی گئی تھی کوئی ویسی بڑی بات تو سامنے نہیں آئی' یہ تو آنکھوں کے سامنے کی بات

تھی' وہ بھی جانتے تھے کہ یہ بُت جو ہیں یہ ہاتھ نہیں ہلا سکتے' یہ بُت مکھیوں کو اڑانے پر بھی قادر نہیں ہیں' پھر ادھر توجہ دلانا چہ معنی دارد؟ واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اصنام پرستی یا بُت پرستی کو ایک فلسفہ بنا کر پیش کیا ہے' ان کے نظریات کا معاملہ کچھ اور ہے' لیکن عوام الناس میں جو بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے وہ یہی ہے کہ یہی ہیں ہمارے معبود' یہی ہیں ہماری دعاؤں کے سننے والے اور یہی ہیں ہماری مشکل کشائی اور حاجت روائی پر قادر۔ یہ مثال عوام کے اس خیال کو توڑنے کے لیے دی گئی ہے۔ اسی غرض کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک عملی تدبیر اختیار کی تھی کہ بُت کدے میں گھس کر تمام بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور ایک بڑے بت کے کاندھے پر وہ تیشہ لٹکا دیا کہ جس سے ان تمام چھوٹے بتوں کو توڑا تھا۔ جب لوگوں کو خبر ہوئی تو ایک زلزلہ آ گیا' ایک طوفان برپا ہو گیا کہ کس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا؟ اور جب یہ کہا گیا کہ ہاں' ایک سر پھرا نوجوان ہے' ابراہیم' وہ ان کی توہین کیا کرتا ہے' ان کے بارے میں کچھ ایسی ویسی باتیں کرتا رہتا ہے تو انہیں پکڑ کر لایا گیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ تم نے کیا ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سے پوچھو جس کے کاندھے پر تیشہ موجود ہے' اس نے کیا ہوگا۔ واقعاتی شہادت (circumstantial evidence) تو اسی کے خلاف جاتی تھی۔ جب انہوں نے کہا کہ تم جانتے ہو وہ نہ بول سکتے ہیں' نہ حرکت کر سکتے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ چوٹ لگائی: ﴿أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ﴾ ''تف ہے تم پر اور ان پر کہ جنہیں تم پوجتے ہو''۔ جن کے بارے میں تمہیں معلوم ہے کہ ہاتھ نہیں ہلا سکتے' کچھ سنتے نہیں' کچھ بولتے نہیں' انہیں پوج رہے ہو! اس پر ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سے ایک دم پردہ سا ہٹ گیا۔ قرآن مجید ان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچ رہا ہے: ﴿فَرَجَعُوْا اِلٰی اَنْفُسِهِمْ﴾ انہوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکا۔ یہ حقیقت ایک لحظہ کے لیے ان کے سامنے منکشف ہوئی کہ سچ بات وہی ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے کہی' ہم ہی مغالطے میں ہیں' ہم کسی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں' لیکن پھر انہوں نے اپنی اُس قومی حمیت' اُس عصبیت جاہلیہ کو مجتمع کیا اور اپنی پوری قوتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف بروئے کار لے آئے۔ یہاں بھی اسی طرح کا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ ذرا سوچو' غور کرو' یہ ہاتھ ہلانے پر قادر نہیں' یہ سب مل جل کر بھی چاہیں تو ایک مکھی تک تخلیق نہیں کر سکتے۔ ان کو پوج رہے ہو' ان سے مرادیں مانگ رہے ہو' ان کے سامنے گڑگڑا رہے ہو؟

فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

یہ تو ہوا اس شرک کا ابطال جو اُس وقت معاشرے میں بالفعل موجود تھا۔ اب جو ٹکڑا آیا ہے: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾﴾ واقعہ یہ ہے کہ یہ حکمتِ قرآنی کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تین الفاظ کی ترکیب سے قرآن مجید نے نوعِ انسانی کے لیے ایک بہت بڑی بنیادی رہنمائی فراہم کر دی ہے۔ غور کیجیے کہ وہ ہدایت و رہنمائی کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند باتیں نمبروار اپنے ذہن میں رکھنا مفید رہے گا۔

سب سے پہلی بات یہ کہ درحقیقت انسان کہلانے کا مستحق وہی انسان ہے جس کا کوئی نہ کوئی ہدف، کوئی نہ کوئی نصب العین، کوئی نہ کوئی آدرش، کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہے۔ اگر انسان بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے زندگی بسر کر رہا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ انسان نما حیوان ہے اور حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ حیوان کا کوئی مقصدِ زندگی نہیں۔ زندگی برائے زندگی کا نظریہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ صورت بالفعل حیوانات کے لیے ہے۔ وہ اپنے حیوانی داعیات کے تحت زندہ ہے۔ انسان ان سے مقصد برآری کرتا ہے، انہیں اپنے کام میں لاتا ہے، لیکن ان کا اپنا کوئی مقصدِ حیات نہیں۔ انسانوں میں سے بھی جو اس سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں وہ قرآن مجید کے الفاظ میں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ ''وہ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے''۔ انسان وہی قرار پائے گا جس کا کوئی مقصد اور نصب العین معین ہو، جس کے لیے وہ محنت اور جدوجہد کر رہا ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ اگر مقصد اور نصب العین اعلیٰ ہے تو اس کے لیے جدوجہد کر کے انسان خود بھی ایک بلندتر اور اعلیٰ شخصیت کی تعمیر کر سکے گا۔ کسی رفیع الشان اور بلند نصب العین کے لیے جدوجہد کر کے اسے خود بھی ترفع حاصل ہو گا۔ لیکن اگر مقصد پست ہے، آئیڈیل پست ہے تو انسان خود بھی پستی کا مکین رہے گا۔ اس کی اپنی شخصیت بھی پستی ہی کی جانب مائل رہے گی۔ اس کی اپنی سیرت و کردار کی کسی اعلیٰ سطح پر تعمیر ممکن نہ ہو گی۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ جیسے کسی اونچی فصیل پر چڑھنے کے لیے آپ کو ایک کمند دے دی جائے تو آپ کو پہلے وہ کمند پھینکنا ہو گی۔ اس کمند کے پھینکنے کا دارومدار آپ کی قوتِ بازو پر ہے۔ آپ اسے جتنا اونچا پھینک سکیں گے اتنا ہی اونچا پھر آپ چڑھ بھی سکیں گے۔ اگرچہ پھر بھی چڑھنا آپ کو اپنی محنت سے ہو گا، لیکن اس کمند کو اونچا پھینک کر آپ نے اپنے اونچا چڑھنے کا امکان پیدا کر لیا۔ اور اگر کمند ہی کہیں نیچے اٹک کر رہ گئی تو ظاہر ہے کہ آپ اگر اس پر چڑھیں گے بھی

تو صرف اتنی ہی بلندی تک پہنچ سکیں گے جہاں تک کہ وہ کمند جا سکی۔ چنانچہ اگر آپ کا آدرش' آپ کا نصب العین ارفع و بلند ہے تو آپ خود بھی رفعت اور بلندی تک رسائی حاصل کر سکیں گے اور اگر آدرش اور نصب العین ہی پست ہے تو اس سے ایک پست شخصیت اور پست سیرت و کردار ہی وجود میں آئے گا۔

فرض کیجیے کہ ایک شخص نے صرف اپنی ذات ہی کو اپنا مقصود بنا لیا ہے' بقول جگر مراد آبادی ع ''اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں!'' وہ اپنے ہی حریمِ ذات کے گرد چکر لگا رہا ہے تو یہ شخص انتہائی خودغرض اور کٹھور دل ہوگا۔ اس شخص کے اندر سے تمام محاسنِ اخلاق نکلتے چلے جائیں گے۔ اس سے بلند تر نصب العین ہوگا اس شخص کا جو اپنی قوم کو یا اپنے وطن کو اپنا آئیڈیل بنائے' اس کے لیے محنتیں کرے' اس کے لیے جدوجہد کرے۔ ظاہر بات ہے کہ اس نسبتاً بلند تر نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے والا شخص خود بھی نسبتاً ایک بہتر شخصیت کا مالک ہوگا۔ اس میں اپنی قوم کے لیے ایثار اور قربانی کا مادہ ہوگا۔ وہ اپنی قوم کو اپنی ذات سے مقدم رکھے گا۔ اس کے سینے میں ایک وسعت ہوگی اور اس کی سوچ کے اندر بھی ایک وسعت پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک بلند تر شخصیت ہے جو اس پہلے نصب العین یعنی صرف اپنی ذات یا شخص پرستی یا خود پرستی کے مقابلے میں قوم پرستی یا وطن پرستی کے نصب العین سے وجود میں آئے گی۔ اس سے بلند تر نصب العین انسان دوستی کا نصب العین ہے۔ یعنی قوم وطن کے امتیاز کے بغیر انسان کی خدمت' انسان سے محبت۔ یہ یقیناً پہلے دو سے اعلیٰ تر اور بلند تر نصب العین ہے۔ اس کی بنا پر ایک اعلیٰ تر اور عمدہ تر شخصیت وجود میں آئے گی۔

یزداں بکمند آور......

لیکن تمام آدرشوں' تمام نصب العینوں اور تمام آئیڈیلز میں بلند ترین نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔ اس کو علامہ اقبال کہتے ہیں ع ''منزل ما کبریاست'' میری منزل مقصود اللہ کی ذات سے کم کہیں نہیں ہے۔ اسی کو علامہ نے تشبیہہ کے انداز میں وہی لفظ کمند استعمال کر کے یوں کہا ہے ع ''یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!'' انسان کے نصب العین اور ہدف ہونے کا مقام و مرتبہ سوائے خدا کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ وہی انسان کا مقصود ہو' وہی مطلوب ہو' وہی محبوب ہو۔ اب یہ بلند ترین نصب العین' بلند ترین آئیڈیل' بلند ترین آدرش اختیار کرنے کے نتیجے میں ایک اعلیٰ ترین شخصیت وجود میں آئے گی۔ جس کا آدرش خدا پرستی ہو' جس کا نصب العین رضائے الٰہی ہو' جس کا مطلوب و محبوب خود اللہ ہو اس کی اپنی شخصیت بتمام وکمال کیا ہوگی۔ اس کے لیے آپ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی

سیرتِ مطہرہ کا نقشہ ذہن میں لائیے۔ اس نصب العین سے سینہ اتنا کشادہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کی کل مخلوق کے لیے جس کے اندر وسعت اور گنجائش ہو' نہ صرف انسان بلکہ حیوانات تک کے لیے شفقت ومحبت ہو۔ **رحمة للعالمین** ہونے کی کیفیت درحقیقت اس شخص ہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو صحیح معنی میں خدا کا پرستار ہو' جس نے خدا کی بندگی کا حق ادا کر دیا ہو' خدا ہی اس کا مطلوب ومحبوب ہو گیا ہو۔ وہ الفاظ یاد کیجیے کہ جو آنحضور ﷺ کی زبانِ مبارک پر اس دنیا سے رحلت کے وقت بار بار آئے: ''**اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی**[1] '' یعنی بس ایک اللہ ہی مطلوب ومقصود ہے اور اب اُسی کی طرف مراجعت کے لیے طبیعت بے چین ہے۔ مطلوب کمزور اور ضعیف ہے تو طالب بھی کمزور اور ضعیف ہوگا۔ مطلوب کا مقام و مرتبہ اعلیٰ اور بلند ہو تو اس کے طالب کو بھی ترفع حاصل ہوتا چلا جائے گا۔

شرک: اللہ کی قدر کے فقدان کا نتیجہ

فرمایا: ﴿**مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ**﴾ ''انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا''۔ ایک عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے کہ انسان کی یہ کمندان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں الجھ کر کیوں رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ انسان خدا کے جمال وجلال کا کوئی اندازہ نہ کر پایا جیسا کہ اُسے کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ اللہ کے حسن و جمال کی کوئی جھلک دیکھ پاتا' اس کے مرتبہ کمال کا کہیں کسی انداز میں عُشرِ عشیر ہی کوئی تصور کر پاتا تو یہ دنیا و مافیہا اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو گئی ہوتی۔ وہ نہ صرف یہ کہ ان میں سے کسی کو اپنا مقصود اور آئیڈیل نہ بناتا بلکہ واقعتاً اس کا مطلوبِ حقیقی' اس کا مقصودِ اصلی صرف ذاتِ باری تعالیٰ بن جاتی۔ یہ اگر ہوا ہے تو اس لیے ہوا ہے کہ انسان کی نگاہیں دنیا میں الجھی ہوئی ہیں۔ علامہ اقبال نے جو مکالمہ لکھا ہے عقاب اور چیونٹی کے درمیان اور اس میں عقاب سے یہ کہلوایا ہے کہ ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں!
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!

اس کے مصداق انسان کی توجہات پستی کی طرف ہیں۔ انسان جو پستی کا مکین ہے اس نے ان پست اشیاء ہی کو اپنا مطلوب ومقصود بنا لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ خدا کے جلال و جمال' اس کے کمال' اس کے حسن کا کوئی تصور نہ کر سکا۔ اس نے اللہ کی قدر نہ پہچانی جیسا کہ اس کا حق تھا۔ ﴿**اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾**﴾ اللہ بذاتہٖ قوی ہے' اللہ بذاتہٖ عزیز ہے۔ وہ القوی ہے اور العزیز ہے۔ اصل میں اشارہ کیا جا رہا ہے کہ شرک

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب دعا النبیؐ او کتاب المغازی، باب مرض النبیؐ

جب بھی ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے فقدان یا اس کی کمی کے باعث ہوگا۔ اگر اللہ کو پہچان لیا جائے جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے تو شرک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کون ہے جو گھٹیا کو اعلیٰ کے مقابلے میں قبول کرے گا۔ چونکہ وہ اعلیٰ اس کے سامنے آیا نہیں' اس کا وہ کوئی تصور کر نہیں پایا' اُس کی کوئی جھلک اس نے دیکھی نہیں ہے' اس لیے وہ عاشق بنا پھرتا ہے اس ادنیٰ کا۔ اگر کہیں اُس اعلیٰ کی جھلک اُس نے دیکھ لی ہوتی تو یہ دنیا و مافیہا اس کے لیے ہیچ ہو جاتی۔

اب آپ ذرا اس کا تجزیہ کیجیے۔ جاہلیت قدیمہ کا شرک یہ تھا کہ خدا کے تصور اور خدا کی معرفت کی کمی کی وجہ سے انسان نے خدا کو اپنے ذہن کے پیمانوں سے ناپا۔ اس نے سمجھا کہ خدا ایک بڑا بادشاہ ہے' تو بادشاہ کے لیے بھی تو شہزادے شہزادیاں ہونی چاہئیں۔ بادشاہ کو بھی تو اولاد کی طلب ہوتی ہے کہ کوئی اس کا وارث ہو۔ لہٰذا اس کے لیے بیٹے یا بیٹیاں تجویز کر دیے گئے۔ پھر یہ کہ بڑے سے بڑے بادشاہ کے بھی آخر کچھ اعیانِ مملکت اور نائبین سلطنت ہوتے ہیں' اس کی حکومت کا تخت انہی کے بل پر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے لیے بھی انہوں نے کچھ نائبینِ سلطنت تجویز کر لیے اور ان کو بھی کچھ اختیارات دے دیے گئے کہ یہ فلاں کا دیوتا ہے اور یہ فلاں کی دیوی ہے۔ یہ آگ کا دیوتا ہے' یہ پانی کا دیوتا ہے اور یہ دولت کی دیوی ہے۔ اس طور سے خدائی اختیارات کی تقسیم کر دی گئی۔ یا یہ کہ بڑے سے بڑے انسان اور بڑے سے بڑے بادشاہ کے بھی کچھ ایسے مقربین بارگاہ اور مصاحبینِ خاص ہوتے ہیں جن کی بات وہ ٹالا نہیں کرتا۔ لہٰذا اللہ کے بھی کچھ ایسے دوست ہیں کہ ان کی بات وہ نہیں ٹال سکتا۔ اگر وہ سفارش کر دیں تو بس بیڑا پار ہو جائے گا۔ یہ تصورات ہیں جو انسان نے خود کو اپنے پیمانوں پر ناپ کر قائم کر لیے ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندِ دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

وہ جو ایک مکالمہ علامہ اقبال نے ایک بُت تراش اور اس کے تراشے ہوئے بُت کے مابین پیش کیا ہے' اس میں بُت یہ کہتا ہے کہ تُو تو مجھے خدا بنانے چلا تھا اور بنایا کیا ہے؟ اپنے دو ہاتھ دیکھے تو میرے بھی دو ہاتھ بنا دیئے۔ تو نے مجھے اپنی ہی صورت پر' اپنی ہی شکل پر' ڈھال دیا ہے ؎

مرا بر صورتِ خویش آفریدی!
برونِ خویش تن آخر چہ دیدی؟

تو نے اپنے سے باہر بھی کچھ دیکھا؟ تیرے سامنے تو اپنا ہی وجود ہے۔ تو خدا کو جب انسان اپنے پیمانوں اور اپنے وجود کے مطابق ڈھال کر دیکھتا ہے تو اس کے نتیجے میں شرک کا ایک انبار اور طومار وجود میں آتا ہے۔

اس وقت کا شرک بھی درحقیقت خدا کی معرفت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ خدا پرستی کی بجائے وطن پرستی، قوم پرستی، خود پرستی، مفاد پرستی —— یہ ساری چیزیں کیوں ہیں؟ اس لیے کہ انسان اپنے خول سے باہر نکل کر اللہ کے حسن و جمال کا کوئی مشاہدہ نہ کر پایا۔ اگر کہیں انسان اس کی کوئی جھلک دیکھ پاتا تو یہ تمام چیزیں ہیچ ہو جاتیں اور ان میں سے کسی کو اس کے مطلوب و مقصود ہونے کی حیثیت حاصل نہ رہتی اور ''منزلِ ما کبریاست'' کے مصداق ذاتِ باری تعالیٰ ہی اس کا مطلوب و محبوب اور منتہائے مقصود ہوتی۔ اب اس کا علاج اگر کوئی ہے تو وہ یہی کہ اللہ کی معرفت کی روشنی کو عام کیا جائے، خدا کی پہچان لوگوں میں عام کی جائے۔ اگر انسان خدا کو پہچان لے اور اللہ کی قدر کسی درجے میں کر سکے جیسا کہ اس کی قدر کا حق ہے، اور اگر اس کی قوتوں، اس کی توانائیوں، اس کے اختیارات، اس کے صفاتِ کمال اور اس کے حسن و جمال کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی کر پائے تو ممکن نہیں ہے کہ پھر وہ اس کے مقابلے میں کسی اور کی طرف متوجہ ہو اور کسی اور کو اپنے قلب کے سنگھاسن پر محبوب و مطلوب کا درجہ دے کر بٹھائے۔ تو یہ ہے شرک کا اصل سبب اور یہ ہے اس کے سدباب کی واحد کوشش۔ یہ ہے وہ توحید اور شرک کا فلسفہ کہ جو ان دو آیات میں انتہائی جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔

نبوت و رسالت سے متعلق ایک اہم حقیقت کا بیان

سورۃ الحج کے آخری رکوع کے جزوِ اوّل کی تیسری آیت میں نبوت و رسالت سے متعلق ایک نہایت اہم حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ﴾ لفظ ''اِصْطَفٰى'' صفی سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں چن لینا، پسند کر لینا، to choose۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ چن لیتا ہے، پسند فرما لیتا ہے۔ آگے چلیے! رُسل جمع ہے رسول کی۔ اور اَرْسَلَ . يُرْسِلُ . اِرْسَالًا کے معنی ہیں بھیجنا۔ تو رسول کے معنی ہوئے بھیجا ہوا، فرستادہ، پیغامبر، سفیر، ایلچی۔ پوری آیت کا ترجمہ یوں ہو گا ''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی!'' یہ درحقیقت سلسلۂ رسالت یا سلسلۂ وحی کی دو کڑیاں ہیں کہ جن کو یہاں بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

نبوت ورسالت کی اصل غرض وغایت

ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ نبوت ورسالت یا وحی کی اصل غرض وغایت کیا ہے! یہی کہ نوعِ انسانی تک اللہ کا پیغامِ ہدایت پہنچ جائے۔ انسان روزِ قیامت یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو چاہتا کیا ہے؟ تجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے؟ ان کی اس دلیل کو ختم کرنے اور اللہ کی طرف سے حجت قائم کرنے کے لیے رسول بھیجے گئے اور وحی ورسالت کا سلسلہ جاری فرمایا گیا۔ اس ضمن میں یہ دو الفاظ اپنے ذہن میں ٹانک لیجیے: قطع عذر اور اتمامِ حجت۔ یہ ہے مقصد نبوت کا' رسالت کا' وحی کا اور انزالِ کتب کا۔ اس مضمون کے بیان میں سورۃ النساء کی یہ آیت بہت اہم ہے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ ''رسولوں کو ہم نے بھیجا مبشر اور نذیر بنا کر' تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل باقی نہ رہے''۔ ان کے پاس اپنی غلط روی کے لیے کوئی عذر نہ رہے۔ آپ غور کیجیے ایک طرف اللہ کی ذات وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اتنی لطیف ہے کہ لفظ ''لطیف'' بھی کسی درجے میں کثافت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ ادھر انسان ہے پستیوں کا مکین' اسفل سافلین' ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ۝﴾ چنانچہ اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لیے حکمتِ خداوندی نے یہ طریقہ تجویز فرمایا کہ درمیان میں دو کڑیاں (links) اختیار کی گئیں۔ پہلا لنک' پہلی کڑی ہے رسولِ مَلک' یعنی فرشتوں میں سے ایک ایلچی اور پیغامبر کا انتخاب عمل میں آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتہ نورانی مخلوق ہے۔ اپنی اس نورانیت کی وجہ سے یہ مخلوقِ خدا سے منجملہ ایک قرب رکھتی ہے۔ فرشتہ کلام اللہ کی تلقی کرتا ہے اللہ سے۔ وہ پیغام حاصل کرتا ہے اللہ سے اور اسے جا پہنچاتا ہے انسانوں میں سے ایک منتخب مَرد کو' ایک چنے ہوئے فرد کو جو اخلاق اور سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانیت کی معراج پر فائز ہوتا ہے۔ مخلوق ہونے کے اعتبار سے فرشتہ اور انسان دونوں ایک دوسرے سے قرب رکھتے ہیں اور اس بناء پر ان کے مابین ایک اتصال ممکن ہے۔ چنانچہ رسولِ مَلک نے وہ پیغام اللہ سے حاصل کر کے رسولِ بشر تک پہنچایا اور اب رسولِ بشر کی یہ ذمہ داری ہوئی کہ وہ پہنچائے اس پیغام کو اپنے ابنائے نوع تک۔ اس کا پہنچانا قولاً بھی ہوگا اور عملاً بھی ہوگا۔ وہ زبان سے بھی اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے گا' انہیں اس کے قبول کرنے کی دعوت دے گا اور عمل سے اِس کا نمونہ بھی پیش کر کے حجت قائم کر دے گا کہ یہ دعوت اور یہ پیغام محض کوئی نظری یا خیالی (theoretical) شے نہیں ہے' یہ کوئی ناقابلِ عمل

پیغام نہیں ہے' بلکہ اس کا ایک عملی نمونہ بھی موجود ہے۔ اسی لیے قرآن مجید اس نکتے پر خصوصی زور دیتا ہے کہ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾۔ انبیاء ورسل کی پوری شخصیت نوعِ انسانی کے لیے ایک اُسوہ اور نمونہ ہوتی ہے کہ اپنے تمام بشری تقاضوں کے باوصف وہ وحی الٰہی کی اس تعلیم پر عمل کر کے دکھا دیں اور اس کا ایک عملی نمونہ پیش کر دیں' تاکہ لوگوں کے پاس اپنی بے عملی اور غلط روی کے لیے کوئی دلیل اور کوئی عذر باقی نہ رہے۔ یہ ہے نبوت ورسالت کی اصل غرض وغایت!

ایمان بالملائکہ کی خصوصی اہمیت

اس آیت کے حوالے سے یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ ایمان بالملائکہ کی اہمیت کیا ہے! ورنہ بظاہر تو اس بات پر ایک تعجب سا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایمان بالملائکہ پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے۔ آیۂ بر میں' جو ہمارے اس منتخب نصاب کا دوسرا سبق تھا' ملائکہ پر ایمان کا ذکر موجود تھا: ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾ اسی طرح حدیث جبریل کو ذہن میں لائیے۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ ''اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ'' تو نبی اکرم ﷺ کی جانب سے جواب سے یہی جواب دیا گیا کہ ((اَنْ [1] تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ...... الی الاخر)) معلوم ہوا کہ ایمان بالملائکہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کے بغیر وحی کی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے کچھ فلاسفۂ قدیم نے اور انہی کے اتباع میں بہت سے دانشورانِ جدید نے بھی۔ اس دور میں سرسید احمد خاں کو اس طبقۂ فکر کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے ملائکہ کے وجود کا صریح انکار کیا کہ ملائکہ کا کوئی صاحبِ تشخص وجود نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وحی کی توجیہہ کیا ہے! بالآخر انہیں کہنا پڑا کہ وحی کا چشمہ تو قلبِ نبی ﷺ سے ہی پھوٹتا ہے۔ وحی کو نبی تک لانے والی خارج میں کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ وحی کو لانے والے خارجی عناصر کے اس انکارِ مطلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کا مسئلہ ایک چیستاں بن گیا۔ وحی کی اصل حقیقت پھر کیا ہے؟ سرسید احمد خاں نے ایک شعر میں اپنے اس گمراہ کن خیال کو بڑے شدّ ومد کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الایمان والاسلام والاحسان

اگرچہ مصرع ثانی میں معشوق کا لفظ دو معنی دے رہا ہے' یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق سے ان کی مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ بہرحال یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو انہوں نے بیک بنی و دو گوش اس معاملے سے نکال باہر کیا۔ قرآن مجید کا یہ مقام اس معاملے کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔

ذہن میں رکھیے کہ یہ مضمون سورۃ التکویر میں بھی آیا ہے اور اس کا اعادہ سورۃ النجم میں بھی ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصل ملکی حالت میں دو بار دیکھا ہے۔ اس ملاقات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ کسی روایت میں اگر راویوں کی کڑیاں متصل نہ ہوں' ان کی ملاقات ثابت نہ ہو تو وہ روایت ناقابلِ اعتماد ہو جائے گی۔ قرآن بھی ایک روایت ہے' یہ اللہ کی حدیث ہے جو بروایت جبریل علیہ السلام پہنچی محمد ﷺ تک اور پھر نبی اکرم ﷺ نے اسے پہنچایا انسانوں تک۔ اس اہم اور نازک معاملے میں روایت کی ان کڑیوں کا اتصال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سورۃ التکویر میں حضور ﷺ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا ہے: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿٢٣﴾﴾ کہ "حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا افقِ مبین پر!اسی طور سے سورۃ النجم میں دوسری ملاقات کا ذکر ہے: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾﴾ کہ حضرت جبرئیل کو اصل ملکی صورت میں آنحضور ﷺ نے دوسری بار شبِ معراج میں سدرۃ المنتہٰی پر دیکھا تھا۔ قرآن مجید نے ان دونوں کی اس ملاقات کو دو مقامات پر اس قدر صراحت کے ساتھ اسی لیے بیان کیا ہے کہ یہ وحی کی دو کڑیاں ہیں۔ رسولِ مَلک نے اللہ تعالیٰ سے اس پیغام کو حاصل کر کے پہنچایا رسولِ بشر تک اور رسولِ بشر نے اس کو پہنچا دیا خلقِ خدا تک۔ یہ گویا کہ ایمان بالرسالت کی ایک اہم بحث تھی جو اس مقام پر ایک آیت میں آ ئی!

اب چوتھی آیت میں عقیدۂ معاد اور عقیدۂ آخرت کا بیان ہے: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ﴾ "وہ (اللہ تعالیٰ) جانتا ہے جو کچھ کہ لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے"۔ لیکن یہ جاننا کس لیے ہے؟ جواب بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٧٦﴾﴾ "بالآخر سارے معاملات اللہ کی طرف لوٹا دیے جائیں گے"۔ تمام معاملات آخری فیصلے کے لیے اس کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ ہر شخص کو جواب دہی کے لیے وہاں حاضر ہونا ہوگا۔

یہاں ایک آیت میں بڑے اختصار کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا گویالبِّ لباب اور خلاصہ سامنے لے آیا گیا ہے۔ اس اختصار کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ (سورۃ الحج) کے پہلے رکوع میں چونکہ انتہائی وضاحت کے ساتھ آخرت کا بیان ہوا ہے' لہٰذا یہاں آخری رکوع میں اس کی طرف ایک اجمالی اشارے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ چار آیات ہیں جن کا آغاز ''یٰٓـاَیُّـھَا النَّاسُ'' کے خطاب سے ہوا ہے۔ ان میں جو اہم مضامین آئے ہیں ان میں شرک کا ابطال' توحید کا اثبات' شرک کا اصل سبب ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ﴾' شرک کا انسان کی سیرت وکردار پر یہ اثر کہ پھر وہ ایک پست شخصیت کا مالک ہو کر رہ جاتا ہے اور توحید کا اصل حاصل کہ اللہ کے پجاری اور اللہ کے پرستار خود اپنی ذات میں بھی ترفع حاصل کرتے ہیں' پھر نبوت ورسالت کی اہم بحث میں سلسلۂ وحی کی دو کڑیوں رسولِ مَلک اور رسولِ بشر کا ذکر اور اس کے بعد عقیدۂ آخرت کا بیان سب شامل ہیں۔

اہل ایمان سے دین کے تقاضے

اب اگلی آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو ان حقائق کو مان چکے ہوں' ان پر ایمان لا چکے ہوں۔ چنانچہ آغاز ہو رہا ہے ﴿یٰٓـاَیُّـھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ کے الفاظ سے۔ ''اے اہل ایمان!'' یعنی اے وہ لوگو جنہوں نے مان لیا توحید کو' جنہوں نے تسلیم کر لیا آخرت کو' جو ایمان لے آئے رسالت پر' آؤ کہ تمہیں بتایا جائے کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے! دین تم سے کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے' تمہاری دینی ذمہ داریاں کیا ہیں؟— آپ دیکھیں گے کہ اس مقام پر دو آیتوں میں دین کے عملی تقاضوں کو نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا۔ اور پے بہ پے فعل امر کا استعمال ہے کہ یہ کرو اور یہ کرو اور یہ کرو! یہ ہیں دین کے عملی تقاضے! فرمایا:

﴿یٰٓـاَیُّـھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّـکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۷۷﴾ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰـکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْـکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَـکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰـٮکُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۸﴾﴾

''اے اہل ایمان! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے ربّ کی پرستش کرو' اور نیک کام کرو' تاکہ تم

فلاح پاؤ۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے' اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے۔ اُس نے تمہارا نام رکھا مسلمان' اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی' تا کہ ہو جائیں رسولؐ گواہ تم پر اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر۔ پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اللہ سے چمٹ جاؤ! (اللہ کے دامن سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ) وہ تمہارا حامی ہے' (مددگار ہے' پشت پناہ ہے۔) تو کیا ہی اچھا ہے وہ ساتھی اور مددگار اور کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ اور حمایتی!''۔

پہلا تقاضا: ارکانِ اسلام کی پابندی

ان دو آیات پر غور کیجیے۔ پہلی آیت میں چار اوامر وارد ہوئے اور ان میں ایک بڑی خوبصورت معنوی ترتیب نظر آتی ہے۔ اس حقیقت کو اختصار کے ساتھ سمجھنے کے لیے ایک ایسی سیڑھی کا نقشہ اپنے ذہن میں لایے جس کے چار قدمچے (steps) ہوں۔ دیکھئے' کسی بھی مدعی ایمان سے دین کا پہلا تقاضا یہ ہوگا کہ وہ ارکانِ اسلام کی' شعائرِ دین کی اور فرائض کی پابندی کرے۔ ان میں اوّلین فریضہ' کہ جس کو اسلام اور کفر میں امتیاز قرار دیا گیا ہے —— **اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْکُفْرِ وَالْاِسْلَامِ الصَّلَاۃُ** یہ **عمـاد الدین**' یعنی دین کا ستون ہے۔ ارکانِ اسلام میں سے رکنِ رکین یہی نماز ہے۔ اس آیت میں نماز کے دو ارکان یعنی رکوع اور سجود کے حوالے سے مراد درحقیقت نماز ہے اور یہ نماز گویا نمائندگی ہو گی تمام ارکانِ اسلام کی۔ اس لیے کہ یہ ان میں سرفہرست ہے۔ لہٰذا مطالباتِ دینی کی پہلی سیڑھی مشتمل ہے ارکانِ اسلام کی پابندی پر۔

دوسرا تقاضا: عبادتِ ربّ

اب دوسری سیڑھی کی طرف قدم بڑھاؤ ﴿وَاعْبُدُوْا رَبَّـکُمْ﴾ صرف نماز روزہ ہی مطلوب نہیں ہے' ربّ کی پرستش' اس کی بندگی اور اس کی اطاعتِ کلی پوری زندگی میں درکار ہے۔ یہ اطاعت بلا چون وچرا ہونی چاہیے اور بلا استثناء بھی! زندگی کو حصوں اور اجزاء میں تقسیم نہ کر دیا گیا ہو کہ ایک حصے میں اس کی اطاعت کی جاتی ہو اور زندگی کے بعض گوشے اس اطاعت سے یکسر خالی ہوں۔ احکامِ خداوندی کی تفریق نہ ہو جائے کہ کوئی سر آنکھوں پر اور کوئی پاؤں تلے! وہ بندگی اور اطاعتِ کلی مطلوب ہے جو محبت خداوندی کے جذبے سے سرشار ہو کر کی جائے۔ یہ دوسری سیڑھی ہے مطالباتِ دین کی۔ اور درحقیقت ارکانِ اسلام سے بھی مطلوب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے اندر یہ صلاحیت و استعداد پیدا ہو

جائے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اپنے ربّ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال سکے۔ نماز و روزہ اور زکوٰۃ و حج سب اسی لیے ہیں کہ انسان پوری زندگی بندگیٔ رب کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن سکے! یہ دوسرا تقاضا ہوا۔

تیسرا تقاضا: بھلائی کے کام اور خدمتِ خلق

اس سلسلے کی تیسری سیڑھی کا بیان اس آیۂ مبارکہ میں ﴿وَافۡعَلُوا الۡخَیۡرَ﴾ کے الفاظ میں ہوا ہے کہ نیک کام کرو' بھلے کام کرو۔ یہاں ظاہر بات ہے کہ خدمتِ خلق کے کام مراد ہیں کہ انسان کا وجود اپنے ہم نوع افراد کے لیے' پوری نوعِ انسانی کے لیے سراپا خیر کا موجب اور سبب بن جائے۔ اس کے بھی دو درجے ذہن میں رکھئے' ایک درجہ وہ ہے جسے آپ خدمتِ خلق کا بنیادی تصور کہہ سکتے ہیں اور جس سے سب لوگ واقف ہیں' یعنی یہ کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے' اگر کوئی لباس سے محروم ہے تو اسے کپڑے پہنائے جائیں' کوئی بیمار ہے تو اس کی دوا دارو کا اہتمام کر دیا جائے' کسی راہ چلتے کو راستہ بتا دیا جائے۔ اسی طرح یتیموں' بیواؤں' مسکینوں اور محتاجوں کی خبر گیری اور سرپرستی کا شمار بھی خدمتِ خلق کے کاموں میں ہوگا۔ آیۂ بر میں یہ بحث ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ﴾

خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح

لیکن غور کیجیے گا۔ خدمتِ خلق ہی کی ایک بلند تر سطح اور بھی ہے' وہ بلند تر سطح ہے بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لانا' وہ کہ جن کی زندگی کا رخ غلط ہو گیا ہے' جو ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں' جو اپنی بے بصیرتی کے باعث آگ کے الاؤ میں کود جانا چاہتے ہیں' ان کو سیدھی راہ پر لانا' خلقِ خدا کو راہِ ہدایت کی طرف دعوت دینا' اس سے بڑا خدمتِ خلق کا معاملہ اور کوئی نہیں! اس لیے کہ موٹی سی بات ہے کہ اگر کسی کو غذا فراہم کر کے اس کے پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ کو آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا ہوا' اگر وہ ہمہ تن آگ کے حوالے ہونے والا ہو اور آپ کو اس کی فکر نہ ہو! یہ کوئی ایسا بڑا خدمتِ خلق کا کام تو نہ ہوا۔ اگر کسی کی کوئی وقتی سی دنیاوی ضرورت آپ نے پوری کر بھی دی درآنحالیکہ آپ کو یقین ہے' اگر واقعتاً آپ کی آنکھیں کھل چکی ہیں کہ وہ جس ڈگر پر چل رہا ہے اس کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں تو آپ نے اس کے ساتھ کیا بھلائی کی! جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے جس میں تم گر پڑنا چاہتے ہو اور مَیں

تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر اور تمہارے کپڑے گھسیٹ گھسیٹ کر تمہیں اس سے روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہی مضمون سورۃ التحریم میں بھی وارد ہوا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾

''اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے!'' اور حضور ﷺ کا وہ طرزِ عمل کہ ((یَا فَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِیْ نَفْسَکِ مِنَ النَّارِ))(۱) ''اے محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچالے''۔ اور ((یَا صَفِیَّۃُ عَمَّۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ لَا اُغْنِیْ عَنْکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا))(۲) ''اے اللہ کے رسول (ﷺ) کی پھوپھی صفیہ! اپنے آپ کو آگ سے بچالے'' کہ آپؐ اپنے گھر کے ایک ایک فرد کو گویا جہنم کی آگ سے خبردار فرماتے تھے اور اس سے خود کو بچانے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ یہ خدمتِ خلق کی بلند ترین منزل ہے۔

نبی اکرم ﷺ پر جب تک وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں خدمتِ خلق کی وہ ابتدائی منزل بتمام و کمال موجود تھی۔ یتیموں کی خبر گیری ہے' مسکینوں کی خدمت ہے' مسافروں کی مہمان نوازی ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں حضور ﷺ کی سیرت میں موجود تھیں۔ لیکن جب آپؐ کے پاس وہ ''اَلْحق'' آ گیا' ہدایتِ خداوندی نازل ہوگئی' جب آپؐ پر حقائق منکشف کر دیے گئے' جب عالمِ آخرت کے اسرار آپؐ کی نگاہوں پر روشن کر دیے گئے' آپ کی ساری مساعی' ساری تگ و دو' ساری دوڑ دھوپ اور خدمتِ خلق کا وہ پورا جذبہ مرتکز ہوگیا اسی پر کہ خلقِ خدا کو خدا کی بندگی کی دعوت دیں' راہِ ہدایت کی طرف بلائیں' نیند کے ماتوں کو جگائیں' جو لوگ مدہوش ہیں اور ہلاکت و بربادی کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کریں۔ یہ چار باتیں جو درحقیقت منبر کی تین سیڑھیوں کے مشابہ ہیں' بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ''لَعَلَّ'' کے اصل معنی ہوتے ہیں ''شاید'' ترجمہ یوں ہوگا ''شاید کہ تم فلاح پاؤ'' اور یہ ''شاید'' کا لفظ جب شاہانہ انداز میں کلامِ الٰہی میں آتا ہے تو اس میں حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے' جیسے کوئی بادشاہ اگر کسی سے کہے کہ اگر تم یہ کرو تو شاید ہم تمہارے ساتھ یہ معاملہ کریں' تو درحقیقت یہاں یہ ''شاید'' ایک مکمل وعدے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ تو فرمایا: ''لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ'' یہ سب کچھ کرو گے تو فلاح سے ہمکنار ہو گے۔ یہ کرو گے تو

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب فی قولہ تعالیٰ وأنذر عشیرتک الاقربین (۲) ایضاً

کامیابی حاصل کرسکو گے۔

''اِک پھول کا مضموں ہوتو سو رنگ سے باندھوں!''

معلوم ہوا کہ اب ہم پھر اسی مقام پر پہنچ گئے جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔اس آیۂ مبارکہ میں گویا سورۃ العصر اپنے جملہ مضامین کے ساتھ پھر ہمارے سامنے آ گئی۔اس لیے کہ وہاں نجات کی شرطِ اوّل تھی ایمان' یہاں خطاب ہوا ہے:﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ ''اے اہلِ ایمان!'' کے الفاظ سے۔وہاں ایمان کے فوراً بعد﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کی شرط مذکور تھی۔یہاں اسی عملِ صالح نے ﴿ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ﴾ کے الفاظ میں چار اوامر کی شکل اختیار کر لی۔''رکوع کرو' سجدہ کرو' بندگی کرو اپنے ربّ کی اور تمہارا عمل خیر پر مبنی ہو جائے''۔البتہ 'وَافْعَلُوا الْخَیْرَ' کو اس کے وسیع تر مفہوم میں لیجیے جیسے کہ حضورﷺ نے فرمایا:((خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسِ)) کہ لوگوں میں بہتر وہی ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچا رہا ہو' جس سے لوگوں کو نفع پہنچ رہا ہو۔اب ظاہر بات ہے کہ نفع صرف دنیا کا نفع ہی تو نہیں ہے۔یہ نفع کا نہایت محدود تصور ہے اور اگر فی الواقع آنکھیں کھل گئی ہوں' حقیقت منکشف ہوگئی ہو' آخرت کا علم انسان کو حاصل ہو گیا ہو' تو اب ''نفع'' کا مفہوم بدل جائے گا۔اب انسان کو نظر آئے گا کہ اصل نفع تو آخرت کا نفع ہے۔اصل جیت وہاں کی جیت اور اصل ہار وہاں کی ہار ہے۔سورۃ التغابن میں ہم پڑھ چکے:﴿ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ ''وہ ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن''۔جو اُس روز نفع میں رہا وہ حقیقتاً نفع میں رہا اور جو اُس روز گھاٹے میں قرار دیا گیا وہی ہے اصل میں گھاٹا پانے والا!

فلاح کا دارومدار دینی فرائض کی ادائیگی پر ہے!

اس آیۂ مبارکہ پر پھر اپنی توجہ مرکوز کیجیے!

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾﴾

''اے اہل ایمان! رکوع کرو' سجدہ کرو' اپنے ربّ کی بندگی کرو (اُس کی اطاعتِ کلی پر کاربند ہو جاؤ' اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر) اور بھلے کام کرو' (نیکیاں کرو' خلق خدا کی خدمت کرو) یہ سب کام کرو گے تو فلاح پاؤ گے!''

آپ غور کیجیے کہ اگر صرف دعوائے ایمان سے فلاح اور کامیابی کا حصول یقینی ہو جائے تو کیا یہ سارا کلام

نعوذ باللہ من ذلک مہمل نہیں قرار پائے گا؟ یہ بے معنی بات ہوگی۔ یہ منطق کی اصطلاح میں تحصیل حاصل قرار پائے گا۔ جو چیز محض دعوائے ایمان سے یا مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے خود بخود حاصل ہو جائے اس کے لیے اتنا کھکھیڑ مول لینا' اتنی محنت اور مشقت کرنا سعیٔ لا حاصل قرار پائے گا۔ پھر یہ رکوع وسجود' بندگیٔ رب' پوری زندگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعتِ کلی اور خدمتِ خلق پر کمر بستہ ہو جانا گویا یہ سب چیزیں اضافی قرار پائیں گے! لیکن قرآن حکیم اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتا ہے۔ جیسے کہ سورۃ العصر میں یہ بات وضاحت سے سامنے آئی تھی کہ نجات کی شرائط چار ہیں!

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾

چوتھا تقاضا: جہاد فی سبیل اللہ

ایمان اور عمل صالح کی حد تک بحث تو سورۃ الحج کی اس ایک آیت میں مکمل ہوگئی جس کا مطالعہ ہم نے ابھی کیا ہے۔ اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے قائم مقام کے طور پر' جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کے حوالے سے اب اصطلاح آ رہی ہے یہاں جہاد کی۔ چنانچہ دوسری جو اس رکوع کی آخری آیت ہے' پوری کی پوری جہاد ہی کے موضوع پر ہے۔ فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾

''اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ جہاد کا حق ہے''۔ آپ دیکھیں گے کہ اس رکوع کے پہلے اور دوسرے حصے کے مابین مضامین کے اعتبار سے بڑا گہرا ربط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے ہمارے اس منتخب نصاب میں اب جہاد ہی کا موضوع چل رہا تھا لیکن اس آخری آیت کے مفہوم کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس پورے رکوع کا مضمون سامنے آ جائے۔

رکوع کے دونوں حصوں کا تقابل کیجیے! اوپر لفظ آیا تھا: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ﴾ کہ انہوں نے خدا کو نہ پہچانا جیسے کہ پہچاننا چاہیے تھا۔ وہ اللہ کے مقام و مرتبہ اور اُس کی صفاتِ جمال و کمال کا کوئی اندازہ نہ کر پائے جیسا کہ اس کے اندازے کا حق تھا۔ وہی اسلوب یہاں آ رہا ہے: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾۔ یہ دو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: (۱) خدا کی معرفت

جیسا کہ اس کا حق ہے' اور (۲) خدا کے لیے جہاد' کوشش' جد و جہد اور محنت جیسا کہ اس کا حق ہے۔ پہلی چیز ایمان کا لبِّ لباب اور ایمان کا اصل حاصل ہے۔ انسان کی نظری و فکری و عملی قوتوں کی معراج ہے اللہ کی معرفت! اور انسان کا قوائے عملیہ کا جو بہترین ہدف اور ان کا بہترین مصرف ہے وہ ہے جہاد فی اللہ' یعنی اللہ کے لیے جہاد۔ درحقیقت ''فی اللہ'' سے مراد بھی کم و بیش وہی ہے جو ''فی سبیل اللہ'' سے ہے' جس پر مفصل گفتگو پچھلے سبق میں ہو چکی ہے۔ آیت کے الفاظ پر توجہ کو جمائیے! ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ اور محنتیں کرو' کوششیں کرو' جد و جہد کرو' لگاؤ اس راہ میں اپنی جانیں اور اپنے مال اور کھپاؤ اپنی جسمانی قوتیں اور صلاحیتیں اور صرف کرو اپنے اوقات اس طور سے اور اس شان سے کہ جس شان سے اللہ کے لیے محنت کرنے کا حق ہے۔

یہاں ذہن میں رکھیے کہ انسان محنتیں کرتا ہے' مشقتیں بھی کرتا ہے' لیکن یہ مسئلہ کہ اس کی محنت اور مشقت پر کس کا کتنا حق ہے' اس کی صحیح تعیین ہی پر دار و مدار ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا۔ ہم میں سے اکثر لوگ وہ ہیں جو اپنے آپ کو گویا کہ ہمہ تن کھپا دیتے (invest کر دیتے) ہیں اپنی اولاد پر۔ بلکہ ہم میں سے اکثر و بیشتر کے معاملے میں یہ بات شاید غلط نہ ہوگی جو ایک صاحب نے بڑے عجیب پیرائے میں ایک زمانے میں مجھ سے کہی تھی کہ میں تو اپنی بیوی بچوں کا ملازم ہوں کپڑے اور روٹی پر! میری ساری محنت صرف ہوتی ہو کمانے پر۔ اور اس کمائی کا مصرف کیا ہے؟ میرے یہ گھر والے' ان کی ضروریات' ان کا پیٹ پالنا' ان کا تن ڈھانپنا اور بس! یہ انتہائی تلخ حقیقت ہے کہ اگر تجزیہ کیا جائے تو ننانوے فیصد لوگوں کی سعی و جہد' ان کی بھاگ دوڑ' ان کی محنت کا اصل حاصل اس کے سوا کچھ نہیں! سوال یہ ہے کہ انسان اگر اپنے اہل و عیال کے لیے محنتیں اور مشقتیں کر رہا ہے تو وہ اہل و عیال آخر اس کو کیا repay کر سکیں گے؟ اس کی اس محنت اور جد و جہد کی کیا قیمت ادا کر سکیں گے؟ اسے اس کا کیا بدلہ دے سکیں گے؟ اکثر و بیشتر تو وہی اولاد انسان کے بڑھاپے کے وقت اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہوتی ہے۔ یہ الفاظ بھی زبان سے نکلتے ہیں کہ ابا جان! آپ پرانے زمانے کے لوگ ہیں' آپ کو کیا معلوم کہ جدید زمانے کے تقاضے کیا ہیں! اس وقت جس طرح کلیجہ اندر سے کٹتا ہے کہ یہ ہیں وہ کہ جن پر ہم نے اپنے آپ کو نچھاور کر دیا تھا' لگا دیا تھا اور کھپا دیا تھا! چنانچہ فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ تم سوچو کہ تمہاری محنت و مشقت اور تمہاری سعی و جہد کا اصل حق دار کون ہے؟ کیا وہی نہیں جو تمہارا خالق ہے' تمہارا مالک ہے' تمہارا پروردگار ہے' تمہارا پالن ہار ہے اور تمہارا رازق

ہے! اگر واقعتاً تم نے اسے پہچان لیا ہے‘ اگر یہ تمہارا اقرار لسانی محض ایک عقیدہ نہیں ہے جو زبان پر ہو‘ بلکہ اس کی حقیقت بھی کسی درجے میں تمہیں حاصل ہو چکی ہے اور تمہارے دل و دماغ اس حقیقت سے منور ہو چکے ہیں تو اس کا تو پھر ایک ہی نتیجہ نکلنا چاہیے‘ وہ یہ کہ تمہاری سعی و جہد کا اوّلین ہدف اور تمہاری قوتوں اور توانائیوں کا اوّلین مصرف اللہ اور اس کے دین کی سربلندی قرار پانا چاہیے۔ اور تمہاری قوتوں اور صلاحیتوں کا بہتر اور بیشتر حصہ لگنا چاہیے اور کھپنا چاہیے اللہ کے لیے! اسی کا نام جہاد فی اللہ یا جہاد فی سبیل اللہ! اس طور سے جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ یہ نہ ہو کہ معمولی سی کوشش یا تھوڑی سی محنت کر کے اور ذرا سا ایثار یا تھوڑا سا وقت لگا کر یا کچھ تھوڑا سا کہیں چندہ دے کر انسان اپنے دل کو مطمئن کر بیٹھے کہ میں نے حق ادا کر دیا‘ میں نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی‘ اللہ کے لیے جتنا کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نے کر دیا! یہاں ’’حَقَّ جِهَادِهٖ ‘‘ کے الفاظ بہت اہم ہیں اور ان کے ذریعے اس عمل کو جس شدّ و مد کے ساتھ اور جس وسعت کے ساتھ ہونا چاہیے اور زندگی میں اس کو جس درجے اہمیت‘ جو مقام اور مرتبہ ملنا چاہیے‘ اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ ابھی یہ مضمون جاری رہے گا‘ جہاد فی سبیل اللہ کا ہدفِ اوّلین یعنی شہادت علی الناس درحقیقت اس آخری آیت کا اصل مضمون ہے‘ جس کے پیشِ نظر اس مقام کو منتخب نصاب کے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے۔

مطالباتِ دین کا خلاصہ

سورۃ الحج کے آخری رکوع کا جزوِ ثانی جو دعوتِ عمل پر مشتمل ہے‘ یا جس میں یوں کہنا چاہیے کہ ایمان کے عملی مقتضیات کا بیان ہوا ہے کہ ایک بندۂ مؤمن سے اس کا دین کیا تقاضا کرتا ہے‘ دو آیات پر مشتمل ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۸﴾﴾

’’اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے ربّ کی اور بھلے کام کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چن لیا ہے اور

تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کے طریقے پر۔ اس نے تمہارا نام رکھا مسلمان‘ پہلے بھی اور اس میں بھی‘ تاکہ ہو جائیں رسول (ﷺ) گواہ تم پر اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر۔ پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اللہ سے چمٹ جاؤ۔ وہی ہے تمہارا پشت پناہ۔ تو کیا ہی اچھا ہے پشت پناہ اور کیا ہی عمدہ ہے مددگار!‘‘

یہ دو آیات ہیں جن میں ایمان کے مقتضیات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ پہلی آیت نسبتاً چھوٹی ہے‘ دوسری طویل‘ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ قرآن مجید کی طویل ترین آیات میں سے ہے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ ان آیات میں‘ جیسا کہ آپ نے نوٹ کیا ہوگا‘ پے بہ پے فعل امر وارد ہوئے ہیں کہ یہ کرو اور یہ کرو۔ حکمت قرآنی کا یہ اصول پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلام کی دعوت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے‘ ایک ہے دعوتِ ایمان جو عام ہے پوری نوعِ انسانی کے لیے‘ ہر فردِ نوعِ بشر کے لیے اور دوسری ہے دعوتِ عمل۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے مخاطب صرف وہی ہو سکتے ہیں کہ جو ایمان کا اقرار کر چکے ہوں‘ جو دعویٰ کرتے ہوں اللہ کو ماننے کا‘ آخرت کو ماننے کا اور نبوت و رسالت کو ماننے کا۔ ایسے ہی لوگوں سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اب ایمان کے ان عملی تقاضوں کو پورا کرو! اس ضمن میں یہاں جو چند الفاظ وارد ہوئے ہیں اگر نگاہ کو صرف ان کے ظاہر تک محدود نہ رکھا جائے‘ بلکہ کسی قدر گہرائی میں اتر کر غور کیا جائے‘ تو مطالباتِ دین اور دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں ایک بڑا عمدہ نقشہ سامنے آتا ہے جسے اگر ایک سیڑھی سے مشابہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جیسے ایک منبر کے قدمچے (steps) ہوتے ہیں جن پر قدم رکھ کر انسان درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا ہے‘ اسی طرح مقتضیاتِ دین یا عملی کے عملی مطالبات کا تدریجاً اور سلسلہ وار بیان ان دو آیتوں میں آیا ہے۔

پہلی سیڑھی: ارکانِ اسلام

فرمایا: ﴿اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ ’’رکوع کرو اور سجدہ کرو!‘‘ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر آپ دیکھیں گے کہ نماز کے مختلف ارکان کا ذکر ہوتا ہے‘ لیکن ان سے نماز مراد لی جاتی ہے۔ جیسے سورۃ المزمل میں فرمایا گیا: ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ ’’کھڑے رہا کرو رات کو سوائے اس کے کچھ حصے کے‘‘۔ اب ظاہر بات ہے کہ کھڑے ہونے سے یہاں نماز میں کھڑے ہونا مراد ہے۔ اسی طرح سورۃ الدھر کی آیت ہے: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝﴾ ’’اور رات کے ایک حصے میں اللہ کے سامنے سربسجود رہا کرو اور تسبیح کیا کرو!‘‘ یہاں تسبیح اور سجدہ سے مراد درحقیقت نماز ہی ہے۔

چنانچہ سورۃ الحج کی اس زیرِنظر آیۂ مبارکہ میں بھی رکوع اور سجود سے مراد نماز ہے۔ اور نماز درحقیقت ارکانِ اسلام میں رکن رکین ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ارکانِ اسلام میں سے پہلا رکن کلمۂ شہادت ہے، لیکن وہ آپ سے آپ یہاں گویا understood ہے'اس لیے کہ جب گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ سے تو سیدھی سی بات ہے کہ وہی لوگ یہاں مخاطب ہیں جو کلمۂ شہادت ادا کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ارکانِ اسلام میں سے اہم ترین رکن بلاشبہ نماز ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الْکُفْرِ وَالشِّرْکِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ))[1]

''کفر و شرک اور بندے کے درمیان نماز کا معاملہ حائل ہے۔''

لہٰذا اوّلاً اسی کا حوالہ دیا گیا کہ نماز قائم کرو۔ گویا نماز کی حیثیت تمام ارکانِ اسلام میں نمائندہ رکن کی ہے اور اس کے ذیل میں زکوٰۃ' روزہ اور حج آپ سے آپ مندرج ہیں' خواہ لفظاً وہ مذکور نہ ہوں۔ یہ حقیقت اگلی آیت کے آخر میں جا کر کھل جائے گی کہ یہاں رکوع و سجود سے مراد صرف نماز نہیں بلکہ تمام ارکانِ اسلام مراد ہیں۔ بہرحال یہ بات بالکل منطقی ہے اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ جو شخص ایمان کا اقرار کرتا ہے اُس پر سب سے پہلی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ارکانِ اسلام کی پابندی کرے۔ یہ پہلی سیڑھی ہے۔ اس پر قدم جماؤ تب دوسری سیڑھی کی طرف بڑھو!

دوسری سیڑھی: بندگیٔ ربّ

وہ دوسری سیڑھی کیا ہے: ﴿وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ﴾ ''اپنے ربّ کی بندگی کرو!'' یعنی اس کے عبد اور غلام بن کر زندگی بسر کرو! اس (تعالیٰ) کو اپنا آقا سمجھو اور اپنے آپ کو اس کا مملوک جانو! اپنے کل وجود کا مالک اسی کو سمجھو اور اپنی پسند و ناپسند' اپنی چاہت' اپنی مرضی' ان سب سے اس کی اطاعت کے حق میں دستبردار ہو جاؤ! یہ اطاعت تمہاری پوری زندگی پر حاوی ہونی چاہیے' بغیر اس کے کہ اُس کے کسی جزو کو اُس سے مستثنیٰ کیا گیا ہو! اسی کی مرضی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالو! اور یہ پورا طرزِ عمل اختیار کرو اللہ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر! اس منتخب نصاب میں اس سے پہلے ایک سے زائد مقامات پر عبادت کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا چکی ہے۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج جنہیں ہم عبادات کہتے ہیں' سب اصلاً اسی ہمہ گیر عبادت کے لیے مطلوب ہیں۔ یہ اس عبادتِ عظیم کی رکاوٹوں کو

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ

دور کرنے کے لیے فرض کیے گیے ہیں۔ نسیان اور غفلت کا علاج نماز سے کیا گیا۔ اپنے نفس کے تقاضوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے روزہ عطا کیا گیا۔ مال کی محبت کی گرفت دل سے کم کرنے کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی۔ اور ان تمام مقاصد کو پورا کرنے والی ایک جامع اور عظیم عبادت حج کی شکل میں تجویز کی گئی۔ لیکن غور کیجیے کہ ان سب کا مقصد یہی تو ہے کہ بندگی ٔ ربّ کا تقاضا پورا کرنے میں جو رکاوٹیں اور موانع ہیں انسان کے اندر ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ارکانِ اسلام کی پہلی سیڑھی کے بعد ''عبادتِ ربّ'' کی یہ دوسری سیڑھی منطقی طور پر بہر مربوط ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡکَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ﴾.

تیسری سیڑھی: افعالِ خیر' خدمتِ خلق

لیکن اسی پر بس نہیں' ابھی اس سے آگے ایک تقاضا اور بھی ہے: ﴿وَافۡعَلُوا الۡخَیۡرَ﴾ نیک کام کرو' بھلے کام کرو' خلقِ خدا کی خدمت پر کمر بستہ ہو جاؤ۔ ((خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ)) ——اسے یوں سمجھئے کہ اللہ کی عبادت کا تقاضا تو اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے پورا ہو جائے گا' لیکن اس سے آگے بھی انسان کے لیے نیکی کا' خیر کا' بھلائی کا ایک وسیع و عریض میدان ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا سورۃ البقرۃ میں: ﴿وَلِکُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّیۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ﴾ کہ ہر کسی نے اپنا کوئی نہ کوئی ہدف بنایا ہوا جس کی طرف اُس کا رُخ ہے' پس اے اہل ایمان! تم نیکیوں میں' بھلائیوں میں' حسنات میں' خیرات میں' صدقات میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ تو جہاں تک عبادت کا تقاضا ہے وہ تو احکامِ خداوندی پر عمل کرنے سے پورا ہو گیا' لیکن اب آگے بڑھو' یہ خدمتِ خلق کا میدان کھلا ہوا ہے۔ یہ ہے مفہوم ''وَافۡعَلُوا الۡخَیۡرَ'' کا۔

البتہ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ خدمتِ خلق کا ابتدائی درجہ یقیناً وہی ہے جس سے سب واقف ہیں' یعنی بھوکے کو کھانا کھلانا' کسی کے پاس تن ڈھانپنے کو اگر کچھ نہیں ہے تو اس کا تن ڈھانپ دینا' کسی بیمار کے علاج معالجے اور دوا دارو کا اہتمام کر دینا' کسی کی عیادت یا مزاج پرسی کر دینا وغیرہ۔ حضور اکرم ﷺ نے تو اس کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ فرمایا: ((تَبَسُّمُكَ فِیْ وَجْهِ اَخِیْكَ صَدَقَةٌ)) [1] ''اپنے کسی ملاقاتی سے کشادہ روئی اور متبسم چہرے کے ساتھ ملاقات کر لینا بھی صدقہ ہے''۔ یہ بھی خیر اور نیکی کا کام ہے کہ وہ آئے تو آ کر پشیمان نہ ہو کہ میں خواہ مخواہ کیوں آیا' بلکہ وہ

(۱) رواہ الترمذی، مشکاۃ المصابیح، کتاب الزکاۃ، باب فضل الصدقہ

محسوس کرے کہ تمہیں اس سے مل کر ایک فرحت ہوئی ہے' تا کہ اس کی طبیعت میں بھی ایک انبساط پیدا ہو۔ تو یقیناً خیر' بھلائی' نیکی اور خدمتِ خلق کا بنیادی تصور یہی ہے' لیکن اسے ایک بلند تر سطح بھی ہے۔

خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح

وہ بلند تر سطح یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگی غلط رُخ پر پڑ گئی ہے اور وہ لوگ کہ جو اپنی غفلت اور نادانی کے باعث ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں' ان کی عاقبت سنوارنے کی فکر کرنا۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے جیسے کہ آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ ہے' تم اس میں گر پڑنا چاہتے ہو اور مَیں تمہارے کپڑے پکڑ پکڑ کر تمہیں گھسیٹ کر اس ہلاکت خیز انجام سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ چنانچہ خلقِ خدا کو خدا کی بندگی کی دعوت دینا اور بھولے اور بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم اور سواء السبیل پر لے آنے کی کوشش کرنا درحقیقت خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح ہے۔ موٹی سی بات ہے' ہم خود سوچ سکتے ہیں' ایک انسان کے پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ کو اگر آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا حاصل اگر وہ سموچا آگ کا نوالہ بننے والا ہے! آپ کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کا دارومدار دراصل اس بات پر ہے کہ آیا آخرت پر یقین ہے یا نہیں؟ اگر یقین ہے تو جیسا کہ ہم سورۃ التحریم میں پڑھ آئے ہیں کہ کسی شخص کو اگر آخرت کا یقین ہے تو وہ اپنی اولاد اور اپنے اہل وعیال کے بارے میں سب سے بڑھ کر جس چیز کے لیے کوشاں ہوگا وہ ان کی آخرت کی بھلائی ہوگی۔ اگر آخرت نگاہوں کے سامنے ہے ہی نہیں تو ظاہر بات ہے کہ اپنے اہل وعیال کی صرف دنیوی منفعت ہی پیشِ نظر رہے گی۔ یہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ ایک ایسے شخص کے نزدیک جس کی باطنی آنکھ کھل چکی ہے اور جسے آخرت کی حقیقت نظر آ گئی ہے اصل خدمتِ خلق کا کام خلقِ خدا کو راہِ ہدایت پر لانا ہوگا کہ جس سے ان کی ابدی زندگی' ہمیشہ کی زندگی سنور جائے۔ اگرچہ ظاہر بات ہے کہ ایسا شخص اس دنیا میں بھی کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھے گا۔ آیۂ بر میں ہم تفصیل کے ساتھ پڑھ چکے ہیں: ﴿وَاٰتَی الْمَالَ

﴾ اسی حقیقت کو حضور ﷺ نے یوں تعبیر فرمایا تھا: ((مَنْ یُّحْرَمِ الرِّفْقَ فَقَدْ حُرِمَ الْخَیْرَ کُلَّهٗ))[1] کہ جو شخص دل کی نرمی سے' دردمندی سے محروم ہے وہ گویا کُل کے کُل خیر سے محروم ہو گیا۔ تو خدمتِ خلق کے اس درجے کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی، جز اول

ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں خدمتِ خلق کے یہ دونوں پہلو بتمام وکمال نظر آتے ہیں۔ وحی کے آغاز سے قبل بھی آپ ﷺ انسانیتِ کاملہ کی معراج پر فائز تھے۔ انسانی ہمدردی کا مادہ آپؐ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ ﷺ یتیموں کی خبر گیری کرنے' بیواؤں کی سرپرستی فرمانے' مساکین اور محتاجوں کی امداد کرنے اور مسافروں کی مہمان نوازی فرمانے میں پیش پیش تھے' جس کی سب سے بڑی شہادت آپؐ کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ نے اس موقع پر دی تھی جب پہلی وحی کے بعد آپؐ پر بربنائے طبع بشری کچھ گھبراہٹ کی کیفیت طاری تھی۔ جب آپ ﷺ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ تو اب آپؐ کی پوری زندگی' آپؐ کی تمام توانائیاں' آپؐ کا ایک ایک لمحہ بسر ہو رہا ہے خلقِ خدا کو آخرت کے برے انجام سے بچانے کی کوشش میں۔ یہی خدمتِ خلق کی معراج ہے۔ یہ اس کی بلندترین منزل ہے۔

چڑھائی تو بہرطور چڑھنی ہے!

بہرحال پہلی آیت میں یہ تین سیڑھیاں سامنے رکھ دی گئیں کہ اب تمہیں چڑھنا ہوگا۔ ایک عجیب آیت قرآن مجید میں سورۃ المدثر میں وارد ہوئی ہے: ﴿سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا﴾ ''ہم چڑھوائیں گے اُسے بلندی''۔ ولید بن مغیرہ کے ذکر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ آخرت کے عذاب کا نقشہ کھینچا گیا کہ وہاں چڑھایا جائے گا اسے بلندی پر' اسے بلندی چڑھوائی جائے گی۔ یہ بلندی انسان کو بہرحال چڑھنی پڑے گی' اس دنیا میں چڑھ لے یا پھر آخرت میں وہ یہ چڑھائی چڑھنے پر مجبور ہوگا۔ اس دنیا میں اہل ایمان کو عمل صالح کی چڑھائی چڑھنی ہوگی۔ اسی طرح دین کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے محنت اور جدوجہد درکار ہوگی' سیڑھی بہ سیڑھی چڑھنا ہوگا۔ ہم پر تو ارکانِ اسلام کی پابندی ہی بہت شاق ہے۔ اس سے اوپر پوری زندگی میں اللہ کی اطاعتِ کاملہ ہمارے اعتبار سے بہت بھاری' بہت ثقیل' بہت مشکل معلوم ہوتی ہے۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ الا را!

پھر اس سے اوپر بھی ایک تقاضا ہے دین کا۔ اپنے آپ کو ہمہ تن خلق خدا کی خدمت میں صرف کر دینا'

اس کے لیے وقف کر دینا' اور لگا دینا۔ یہ ہے مطالباتِ دینی کی تیسری منزل۔

فلاح کی اُمید!

ان تین تقاضوں کے بیان کے بعد فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ ''تاکہ تم فلاح پاؤ!'' لَعَلَّ کا اس انداز میں ترجمہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ یہ کلامِ الٰہی ہے' ورنہ 'لَعَلَّ' ' کا اصل لفظی مفہوم عربی زبان میں ''شاید'' کا ہے۔ گویا لغوی ترجمہ یوں ہوگا ''شاید کہ تم فلاح پاؤ'' لیکن چونکہ شاہانہ کلام میں لفظ ''شاید'' اگر آئے تو وہ ایک حتمی وعدے کی صورت ہوتا ہے' جیسے کوئی بادشاہِ وقت اگر اپنے کسی درباری سے یہ کہے کہ تم یہ کام کرو شاید کہ ہم تمہیں فلاں چیز دیں تو دراصل یہ ایک پختہ وعدہ ہے۔ اس لیے سورۃ الحج کی اس آیت میں ہم ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''تاکہ تم فلاح پاؤ''۔ لیکن اس آیت کے حوالے سے بھی کم سے کم اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے کہ یہ فلاح ایسے ہی حاصل ہو جانے والی چیز نہیں ہے' یہ اتنی بے وقعت شے نہیں ہے کہ بس زبان سے چند کلمات ادا کرنے سے حاصل ہو جائے۔ اگر اسلام اور ایمان کا صرف زبانی اقرار کافی ہوتا تو ان الفاظ مبارکہ کا یہاں لانا کہ ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ یہ سب تحصیل حاصل قرار پائے گا۔ پھر یہ سارا کلام' نعوذ باللہ من ذٰلک ایک مہمل اور عبث کلام قرار پائے گا' اگر کوئی یہ سمجھے کہ فلاح اس کے بغیر بھی حاصل ہوتی ہے۔

یہاں گویا کہ اس آیۂ مبارکہ کی شکل میں وہ پورا سبق ایک مرتبہ پھر ہمارے سامنے آ گیا جو سورۃ العصر کا حاصل اور ہمارے اس پورے علمی و ذہنی سفر کا نقطۂ آغاز ہے: ﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝﴾ ''وہاں وہ بات منفی اسلوب میں تھی۔ ''زمانہ گواہ ہے کہ یقیناً تمام انسان خسارے اور گھاٹے میں رہیں گے'' ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ ''سوائے اس کے جو ایمان لائیں' نیک عمل کریں' ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور وصیت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں''۔ یہاں دیکھئے وہی بات ایک مثبت اسلوب میں آئی ہے کہ اگر فلاح کے طالب ہو' کامیابی چاہتے ہو' رشد سے ہم کنار ہونا چاہتے ہو' تو تمہیں محنت و مشقت لازماً کرنی ہوگی۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ!

وہ محنت کیا ہے؟اس کی وضاحت ہے سورۃ الحج کی اس آیت میں کہ: ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ پہلی چیز ہے نماز' اور اس کے ساتھ ہی گویا بقیہ ارکانِ اسلام زکوٰۃ' روزہ اور حج بھی اس کے تابع ہیں اور ان کا التزام بھی ضروری ہے۔ پھر دوسرا تقاضا بندگی ٔرب کا ہے ﴿وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ کہ ہر معاملے میں اپنے ربّ کی اطاعت پر کمر بستہ ہو جاؤ' پوری زندگی اس کے حوالے کر دو اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ﴿وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ بھلائی پر' خدمت خلق پر کمر بستہ ہو جاؤ۔ لوگوں کی خیر خواہی' لوگوں کی فلاح' خلق خدا کی ابدی بہبود کے لیے اپنی قوتیں' اپنی توانائیاں اور اپنی صلاحیتیں صرف کر دو' اپنے اوقات لگاؤ اور کھپاؤ! یہ ساری محنت کرو تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ شاید کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے بعد دوسری آیت میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ العصر میں بیان کردہ نجات کی چار شرائط میں سے آخری دو یعنی ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ کے لیے ایک جامع اصطلاح آ گئی ''جہاد''۔

جہاد کی اہمیت

اب ذرا جہاد کی اہمیت کے حوالے سے دونوں آیات کا موازنہ کیجیے! پہلی آیت میں چار فعل آئے تھے: ارْكَعُوْا' وَاسْجُدُوْا' وَاعْبُدُوْا اور وَافْعَلُوا' اور اس دوسری آیت میں جو حجم کے اعتبار سے بہت طویل ہے صرف ایک فعل امر آ رہا ہے ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ معلوم ہوا کہ جہاد کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ پوری آیت جہاد اور اس کی غرض و غایت ہی کے بیان پر مشتمل ہے۔

فرمایا ''جہاد کرو اللہ کے لیے'' ''فِي اللّٰهِ'' دراصل فی سبیل اللہ کا مخفف ہے۔ مراد ہے اللہ کی راہ میں ''in the cause of Allah'' یا یوں کہیے: ''for the cause of Allah'' اس کے لیے محنتیں کرو' جدوجہد کرو' کوششیں کرو۔ کشمکش' تصادم اور مجاہدہ اس میدان میں ہونا چاہیے۔ یہ تمہارے ایمان کا چوتھا بنیادی تقاضا ہے۔

''حَقَّ جِهَادِهٖ'' کا حقیقی مفہوم

یہاں نوٹ کیجیے کہ اس رکوع کے پہلے جزو میں شرک کی مذمت اور اس کے سبب کے بیان کے ضمن میں الفاظ وارد ہوئے تھے: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ط﴾ وہی اسلوب یہاں ہے: ﴿جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ یہ محنت' کوشش' جدوجہد اور تصادم ہوگا اللہ کے لیے' جس پر تم ایمان لائے ہو' جسے تم نے اپنا مطلوب و مقصود اور محبوبِ حقیقی قرار دیا ہے' اور یہ جہاد اور مجاہدہ' کوشش اور یہ سعی اتنی

ہونی چاہیے جتنا اور جیسا کہ اس کا حق ہے۔ غور کرو کہ تم پر کس کا کتنا حق ہے! کیا تم خود اپنے خالق ہو کہ اپنے نفس کے تقاضوں اور اس کے حقوق ہی کے پورا کرنے میں اپنی تمام توانائیاں' اپنی قوتیں اور اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہو؟ سوچو' کس کے تم پر کتنے حقوق ہیں! والدین کے حقوق ہیں' ادا کرو! لیکن غور کرو کہ والدین کے دل میں محبت وشفقت کے جذبات پیدا کرنے والا کون ہے؟ تم پر کس کا حق کتنا ہے' معین تو کرو۔ اگر کوئی اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنے وطن کے لیے وقف کر چکا ہے تو کیا صرف وطن کے حقوق کی ادائیگی ہی اس کے ذمے تھی؟ یہ درست ہے کہ وطن کا زیر بار احسان ہر شخص ہوتا ہے۔ وہ زمین کہ جس سے اس کے لیے غذا کے خزانے ابلتے رہے ہیں یقیناً اس کا ایک احسان اس کی گردن پر ہے۔ لیکن احسانات کو ناپو تو سہی' کس کا کتنا حق ہے! معلوم ہوگا کہ تمام حقائق پر فائق حق اللہ کا ہے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام حقوق اللہ کے حقوق کے تابع ہو جائیں۔ وہ بات جو شرک کی حقیقت کے ضمن میں ''شرک فی الحقوق'' کی بحث میں کافی تفصیل سے بیان ہو چکی ہے اسے یہاں اپنے ذہن میں تازہ کیجیے کہ انسان پر اوّلین حق اللہ کا ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں یہ مضمون آیا تھا: ﴿اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیۡکَ﴾ ''کہ شکر کر میرا اور اپنے والدین کا''۔ اگر یہ فہرست مرتب کی جائے کہ انسان پر کس کس کے حقوق ہیں تو سرفہرست آئے گا اس کا خالق و مالک' اس کا پروردگار' اس کا پالن ہار۔ جس نے اسے عدم سے وجود بخشا' جو اس کی کل ضروریات فراہم کر رہا ہے' جو اسے درجہ بدرجہ تدریجی مراحل سے گزارتا ہوا ترقی کے مراحل طے کرا رہا ہے' وہ ہے کہ جس کے حقوق سب سے فائق ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان یقیناً صد فی صد درست ہے کہ ((وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۱) ''تمہارے نفس کا تم پر حق ہے' تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے''۔ یہ سب حقوق تسلیم' لیکن یہ طے ہے کہ اللہ کا حق سب سے فائق ہے۔ تو اب ذرا سوچو کہ تمہاری توانائیوں کا کتنے فیصد اپنے نفس کے لیے صرف ہو رہا ہے! کتنے فیصد تم اپنی اولاد کے لیے صرف کر رہے ہو' کتنا جز و اپنی توانائیوں کا تم نے اپنی قوم یا وطن کے لیے وقف کیا ہے اور اس کا کتنا حصہ ہے جو تم نے خدا کے لیے وقف کیا ہے؟ ﴿وَجَاهِدُوۡا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ کہیں کسی محفل میں ذرا سا کلمۂ خیر کہہ دینے یا دین کے کسی کام پر کوئی چندہ دے دینے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم

سے یہ سمجھ لینا کہ اللہ کا حق ادا ہو گیا' انگلی کٹوا کر شہیدوں میں شریک ہونے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے! یہاں اس کا سدّ باب کیا جا رہا ہے: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾.

ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے کہ واقعتاً انسان کی شخصیت کے دو ہی پہلو ہیں' ایک اس کا علم اور فکر ہے' اس کی نظری اور فکری قوتیں ہیں' اور دوسرا اس کا عمل ہے' بھاگ دوڑ ہے' سعی و جہد ہے' اس کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار آنا ہے۔ ان دونوں کا جو نقطۂ عروج ہے اس کو اس رکوع کے دو حصوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک ہے اللہ کی معرفت' اللہ کا اندازہ جیسا کہ اس کا حق ہے: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ﴾ اور دوسرا ہے اللہ کے لیے محنت' بھاگ دوڑ اور سعی و جہد۔ ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ کہ انسان کا جینا اور مرنا' جاگنا اور سونا' بیٹھنا اور اٹھنا' یہ سب درحقیقت اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ اسی کے لیے جدوجہد' اسی کے لیے کوشش' اسی کے لیے بھاگ دوڑ' گویا اسی میں انسان ہمہ تن اپنے آپ کو جھونک دے' یہ ہے ﴿جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾.

فریضۂ رسالت کی ادائیگی اب اُمت کے ذمے ہے!

اگلا لفظ بہت ہی معنی خیز اور قابل توجہ ہے: ﴿هُوَ اجْتَبٰـكُمْ﴾ کہ اے مسلمانو' اے ایمان کے دعوے دارو اور اے ہمارے رسول محمد ﷺ کے اُمتی ہونے کے دعوے دارو! تم اپنا مقام اور مرتبہ پہچانو' تم اُسی طرح چن لیے گئے ہو جس طرح رسولؑ چنے ہوئے ہیں۔ لفظ ''اصطفٰی'' اور ''اجتبٰی'' عربی زبان کے دو بڑے قریب المفہوم الفاظ ہیں۔ اگرچہ ان میں ایک باریک سا فرق بھی ہے جو انگریزی کے دو الفاظ ''choice'' اور ''selection'' میں ہے۔ ''choice'' میں پسند کرنے والے کی پسند کو زیادہ دخل ہوتا ہے' جبکہ ''selection'' فی الاصل کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ کسی معینہ ہدف کے لیے کسی موزوں ترین شخصیت یا جماعت کا انتخاب ''selection'' کہلائے گا۔ ''اصطفاء'' میں choice کا معاملہ ہوتا ہے اور اجتباء میں selection کا۔ لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ دونوں الفاظ بہرحال بہت قریب المعنی ہیں۔ چنانچہ محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ دونوں ہی الفاظ مستعمل ہیں۔ محمد مصطفٰی اور احمد مجتبٰی ﷺ۔ چنانچہ وہی لفظ جو رسولوں کے لیے مستعمل ہے یہاں اُمت کے لیے آیا ہے ''هُوَ اجْتَبٰـكُمْ'' ''تمہیں چن لیا گیا ہے' تمہیں پسند کر لیا گیا ہے' ایک مقصد عظیم کے لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے۔ یہ مقصد عظیم کیا ہے؟ ذہن میں رکھیے کہ اس رکوع

کے نصف اوّل میں نبوت و رسالت کے جس سلسلۃ الذھب کا بیان آیا تھا' اس سنہری زنجیر میں گویا ایک کڑی کا اضافہ ہوا ہے ختم نبوت کے باعث۔ اب نہ کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ ہی کوئی اور رسول مبعوث ہوگا۔ چنانچہ خلقِ خدا پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت کا فریضہ اب اس اُمت کے سپرد کیا گیا ہے جو اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف۔ گویا کہ وہ ہدایت جس کی تلقی اوّلاً جبرئیل نے کی تھی اللہ سے' اور پہنچا دیا جسے محمد رسول اللہ ﷺ تک' اور پھر جسے پہنچایا محمد رسول اللہ ﷺ نے اُمت تک' اب اس اُمت محمدؐ کا فریضۂ منصبی ہے کہ وہ اسے پہنچائے پوری نوعِ انسانی تک۔ گویا یہ امت اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی (Link) کی حیثیت سے مستقلاً اس کے ساتھ جوڑ دی گئی' ٹانک دی گئی۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں الفاظ بالکل ہم وزن لائے گئے ہیں۔ وہاں فرمایا تھا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ اللہ چن لیتا ہے' پسند کر لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے ایلچی اور پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی۔ اور یہاں فرمایا: ''هُوَ اجْتَبٰىكُمْ'' اے مسلمانو' اے ایمان کے دعوے دارو! اب تم چن لیے گئے ہو' تمہارا انتخاب ہو گیا ہے ایک عظیم مقصد کے لیے۔

اُمت مسلمہ کا یہ ''اجتبــــــاء'' یا چناؤ کس مقصد کے لیے ہوا' اس کا جواب آگے آ رہا ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ کہ تمہارے اس ''انتخاب'' (selection) کی اصل غرض وغایت یہ ہے کہ رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ پوری نوعِ انسانی پر ـــــــ یہ مقصد عظیم ہے جس کے لیے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے

لیکن آیت کے اس ٹکڑے سے پہلے ایک ضمنی بات درمیان میں آئی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک ''subordinate clause'' جملے کے بیچ میں شامل کر دی گئی ہے۔ چنانچہ جس اُمت پر یہ بھاری ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے اس کی ہمت بندھانے کے لیے کچھ ترغیب وتشویق کے انداز میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ﴾ کہ اس دین کے معاملے میں اللہ نے تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ ان الفاظِ مبارکہ کا ایک عمومی مفہوم تو یہ ہے کہ یہ دین' دینِ فطرت ہے۔ خلافِ فطرت کوئی حدود اور قیود یہاں عائد نہیں کی گئی۔ فطری تقاضوں کے اوپر کوئی غیر فطری بندش اور پابندی یہاں نہیں

لگائی گئی۔ اس کی تعلیمات فطرتِ انسانی کے لیے معروف اور جانی پہچانی ہیں۔ ان سے انسان طبعًا مانوس ہے۔ اس پہلو سے یہ دین آسان دین ہے۔ اس میں کوئی تنگی نہیں‘ کوئی سختی نہیں‘ اس میں رہبانیت کی پابندیاں نہیں‘ اس میں نفس کو کچل دینے والی ریاضتیں نہیں‘ اس میں رسومات کا کوئی لمبا چوڑا طومار نہیں۔ بہت سادہ دینِ فطرت ہے۔

بنو اسماعیل کے لیے اضافی سہولت

آیت کا یہ مفہوم اُمت مسلمہ کے تمام افراد سے متعلق ہے‘ خواہ دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں‘ لیکن بالخصوص وہ لوگ جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے‘ جن سے اس اُمت محمدؐ کا نیوکلیس تیار ہوا‘ جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور اس ناطے سے ان کا رشتہ جڑتا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ‘ ان کے لیے اس پہلو سے بھی اس دین میں کوئی تنگی نہیں ہے کہ یہ تو ان کے جدامجد ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ یہ بیت اللہ جس سے محبت وعقیدت انہیں وراثتاً بھی ملی تھی انہی کا بنایا ہوا گھر ہے جس کے گرد طواف کا سلسلہ ان کے ہاں دورِ جاہلیت میں بھی جاری رہا‘ قربانی کا سلسلہ جاری رہا‘ منیٰ اور عرفات کا قیام جاری رہا‘ یہ سب چیزیں تو تمہاری نسلی اور قومی روایات کا جزو بن چکی ہیں۔ اس پہلو سے تمہارے لئے تو کوئی تنگی نہیں‘ اس دین کے اور تمہارے درمیان اجنبیت کا کوئی پردہ حائل نہیں۔ ہاں‘ جو غلط باتیں تم نے اس میں شامل کر دی تھیں ان کو ہٹا دیا گیا ہے۔ اسی طرح تمہارے جو اپنے رواج اور معاشرتی طور طریقے تھے بنیادی طور پر انہی کی اساس پر شریعت محمدیؐ کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔ ان میں جو چیزیں غلط تھیں انہیں کاٹ پھینکا گیا اور جو صحیح تھیں انہیں برقرار رکھا گیا۔ لہٰذا یہاں خطاب کے اعتبار سے جو لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کے اوّلین مخاطب تھے ان کے حوالے سے کہا گیا: ﴿مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ﴾ ”یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے“۔ تمہارے لیے اس کے قبول کرنے میں یا اس کے علمبردار اور پرچارک بننے میں کہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے‘ کوئی اجنبیت کا پردہ حائل نہیں۔

آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا﴾ ”اس نے تمہارا نام رکھا مسلمان‘ پہلے بھی اور اس میں بھی“۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اس اُمت کے لیے لفظ مسلمان تجویز کیا تھا۔ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی زبان پر یہ دعا جاری رہی: ﴿رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ﴾ ”اے ہمارے ربّ! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار (مسلمان) بنائے رکھ اور

ہماری اولاد میں سے بھی ایک اُمت مسلمہ برپا کیجیو!'' تو تمہارا یہ نام تمہارے جدامجد نے رکھا ہے۔ اللہ نے بھی اس کتاب میں' اس کلام پاک میں تمہیں اسی نام سے موسوم کیا ہے: ﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ﴾ اس پہلو سے گویا ایک مرتبہ پھر اعادہ ہو گیا اسی حقیقت کا جو اس سے پہلے سورۃ حٰمٓ السجدۃ کے درس میں آ چکی ہے کہ ایک داعیِ حق اور ایک داعی الی اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا تعارف صرف بطور مسلمان کرائے: ﴿اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ کسی اور گروہی نسبت یا کسی تعلق کو نمایاں کرنا درحقیقت دعوتِ اسلامی یا دعوت الی اللہ کے مزاج کے منافی ہو جائے گا۔

شہادت علی الناس: اُمت کا فرضِ منصبی

یہ ضمنی مضمون تھا۔ اس کے بعد اگلے الفاظِ مبارکہ کو جوڑ لیجیے: ﴿ھُوَ اجۡتَبٰکُمۡ﴾ سے۔ کہ اے مسلمانو! تمہارا انتخاب ہو گیا ہے' تم چن لیے گئے ہو ایک مقصدِ عظیم کے لیے۔ اور وہ مقصدِ عظیم ہے کہ سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد اب کارِ نبوت کی ذمہ داری مجموعی طور پر تمہارے کاندھوں پر ہے۔ شہادت علی الناس کا فریضہ جو انبیاء ادا کرتے رہے وہ اب تمہارے ذمے ہو گا۔ اللہ کی طرف سے خلقِ خدا پر اتمامِ حجت' اللہ کا پیغام خلقِ خدا تک پہنچا دینا' جیسے کہ پہنچا دینے کا حق ہے' اور اپنے قول و عمل سے اس دین اور اس توحید کی شہادت دینا' جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ع ''دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!'' — یہ سب کام اب تمہیں بحیثیت اُمت کرنے ہوں گے۔ ﴿لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ﴾ ''تاکہ ہو جائیں رسول گواہ تم پر'' — انہوں نے تو ابلاغ و تبلیغ کا حق ادا کر دیا' انہوں نے اللہ کا کلام تمہیں پہنچا دیا خواہ اس راہ میں انہیں ماریں کھانی پڑیں' گالیاں سننی پڑیں' استہزاء اور تمسخر کا ہدف بننا پڑا' ان پر پتھروں کی بارش ہوئی' ان کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور خواہ انہیں اپنے قریب ترین اعزہ کی جانوں کا نذرانہ اللہ کے حضور میں پیش کرنا پڑا۔ ذرا تصور میں لائیے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے اعضاء بریدہ لاشے کو۔ ناک کٹی ہوئی' کان کٹا ہوا' اسی پر بس نہیں' سینہ چاک کر کے کلیجہ تک چبا ڈالا گیا تھا — محمد ﷺ نے یہ سارے شدائد جھیلے' تمام مصیبتیں برداشت کیں' مسلسل تئیس برس تک سخت ترین مشقت سے آپ کو سابقہ رہا۔ اس میں تین برس کی وہ قید بھی ہے' شعب بنی ہاشم کی قید' جس میں سخت ترین فاقہ اور شدید ترین بھوک کی آزمائش بھی آئی۔ اسی میں وہ یومِ طائف بھی ہے جس کا نقشہ یہ ہے کہ ہر طرف سے پتھراؤ ہو رہا ہے' اور محمد رسول اللہ ﷺ کا جسم مبارک لہولہان

ہو گیا ہے! پھر اس میں غارِ ثور کا وہ صبر آزما مرحلہ بھی ہے' اس میں وہ دامنِ اُحد کا جاں گسل معرکہ بھی ہے' اس میں بدر و حنین کے تمام مراحل آئے' لیکن ان تمام مراحل کا نتیجہ کیا ہے؟ محمد ﷺ نے اللہ کی توحید کی گواہی اس شان سے دی کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اللہ کے کلام کا ابلاغ اس طور سے فرمایا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اللہ کے دین کی گواہی اپنے قول سے بھی دی اور عمل سے بھی دی۔ اور اس دین کے نظام کو عملاً بر پا کر کے دکھا دیا' تاکہ کسی کے پاس کوئی عذر نہ رہے' کوئی یہ بہانہ پیش نہ کر سکے کہ اے اللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گواہی

چنانچہ ذرا چشمِ تصور سے دیکھئے! حجۃ الوداع کا موقع ہے' عرفات کا میدان ہے' حضور ﷺ نے اپنے اس آخری حج میں متعدد خطبے ارشاد فرمائے' عرفات کے میدان میں بھی اور منیٰ کی وادی میں بھی۔ تیئیس برس کی محنت شاقہ کا حاصل' ایک لاکھ سے زائد افراد کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر ہے۔ عرب کے کونے کونے سے کھنچ کر آئے ہوئے لوگ جمع ہیں۔ حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں جس کے آغاز ہی میں آپؐ یہ فرما کر لوگوں کو چونکا دیتے ہیں کہ لوگو شاید دوبارہ اس مقام پر ملاقات نہ ہو! گویا اشارہ دے دیا گیا کہ یہ الوداعی خطبہ ہے' آخری باتیں ہیں جو حضور ﷺ ارشاد فرما رہے ہیں۔

اسی خطبے میں وہ الفاظ بھی آئے جن کا حوالہ سورۃ الحجرات کے درس کے ضمن میں دیا جا چکا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کا ملخص' لبِّ لباب اور اہم نکات کو بتکرار اعادہ بیان فرمایا کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ عورتوں اور غلاموں کے حقوق کی طرف آپؐ نے انتہائی تاکیدی انداز میں توجہ دلائی۔ بڑا مفصل خطبہ ہے جسے پورا نقل کرنا یہاں پیشِ نظر نہیں ہے۔ خطبے کے اخیر میں آپؐ پورے مجمع سے ایک سوال کرتے ہیں: اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ لوگو' کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ صحابہ کرامؓ کا عام معمول یہ تھا کہ حضور ﷺ جب بھی بغرضِ تعلیم ان سے کوئی سوال کرتے تھے تو صحابہؓ بالعموم اوّلاً اس کے جواب میں کہتے تھے اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ (یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں) پھر جب آپؐ دوبارہ یا سہ بارہ سوال کرتے تو تب وہ اپنی سمجھ کے مطابق مختصر سا جواب دیتے تھے۔ لیکن اس موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ خلافِ معمول اس ایک سوال کا مفصل جواب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیک زبان دیا کہ "اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ (۱)" بلکہ ایک

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجسم، باب حجۃ النبیؐ

روایت میں مزید تفصیل وارد ہوئی: ''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ '' کہ اے نبیؐ ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حق امانت ادا کر دیا' آپؐ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا' آپؐ نے حق نصح وخیر خواہی ادا کر دیا' 'آپؐ نے گمراہی کے پردوں کو چاک کر دیا اور ہدایت کا سراجِ منیر اور خورشید تاباں آپؐ کی کوششوں کے نتیجے میں اس وقت نصف النہار پر چمک رہا ہے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ گواہی تین مرتبہ لی۔ پھر آپؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور تین مرتبہ زبان سے یہ الفاظ ادا فرمائے: ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ''تفصیل یہاں تک آتی ہے کہ آپؐ نے اپنی انگشت شہادت سے پہلے اشارہ فرمایا آسمان کی طرف' پھر لوگوں کی طرف' زبان پر یہ الفاظ جاری تھے: ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ '' کہ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ تو بھی گواہ رہ کہ میں آج سبکدوش ہو گیا۔ میری ذمہ داری ختم ہو گئی۔ تیری ایک امانت مجھ تک پہنچی تھی بواسطہ جبریل۔ پیغام تھا نوعِ انسانی کے لیے۔ میری حیثیت امین کی تھی' میں نے وہ ذمہ داری ادا کر دی۔ میں نے وہ پیغام لوگوں تک پہنچا دیا اور ان سے گواہی لے لی ہے کہ میں نے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا حق ادا کر دیا ہے۔

حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے گواہی کیوں لی؟

غور کرنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے اس اہتمام کے ساتھ یہ گواہی کیوں لی۔ درحقیقت منصب نبوت ورسالت سے سرفراز ہونا جہاں ایک طرف باعث عز وشرف ہے وہاں دوسری طرف یہ ایک انتہائی کٹھن اور نازک ذمہ داری بھی ہے۔ ایک سادہ سی مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اگر آپ اپنے کسی عزیز کو کوئی پیغام بھیجیں کہ فلاں کام فلاں وقت تک ضرور ہو جائے' ورنہ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ آپ نے کسی کی معرفت وہ پیغام بھیجا۔ گویا درمیان میں ایک ایلچی ہے جو آپ کے پیغام کو آپ کے عزیز تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ فرض کیجیے وہ کام نہیں ہوا۔ اب آپ تحقیق وتفتیش کریں گے کہ اس کام کے نہ ہونے کی وجہ سے جو نقصان ہوا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے! اگر تو پیغام پہنچ گیا تھا اور پھر اس عزیز نے وہ کام نہیں کیا تو آپ کا سارا گلہ شکوہ اس سے ہوگا' وہ ایلچی بری قرار پائے گا' اور اگر کہیں اس ایلچی نے کوتاہی کی ہے' اس نے پیغام پہنچایا ہی نہیں' تو ظاہر بات ہے کہ آپ اپنے اس عزیز سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتے' سارا بوجھ آئے گا تو اس ایلچی پر کہ جس نے وہ ذمہ داری ادا نہ کی۔ یہ ہے وہ نازک اور کٹھن ذمہ داری جو انبیاء ورسل کے کندھوں پر آتی ہے۔ اُن کی جانب سے اگر ابلاغ میں اور

پہنچانے میں بالفرض کوئی کمی رہ جائے تو بقیہ انسانوں سے باز پرس کی نوبت تو بعد میں آئے گی' پہلے ان کی جواب طلبی ہو جائے گی۔ یہ بات سورۃ الاعراف کے آغاز میں نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے: ﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ ''ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی''۔ اور یہ ہے اس آیت کا حاصل کہ: ﴿بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ (المائدۃ:٦٧) ''کہ اے نبیؐ پہنچا دیجیے جو کچھ نازل ہوا ہے آپؐ پر آپؐ کے ربّ کی جانب سے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہوئی تو یہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی شمار ہوگی۔ اگرچہ بظاہر احوال اس کا ہرگز کوئی امکان نہیں کہ اس معاملے میں نبی اکرم ﷺ سے کسی کوتاہی کا صدور ہوتا' لیکن یہاں دراصل مقامِ نبوت و رسالت کی نزاکت کا اظہار مقصود ہے۔

یہ بات ایک اور انداز میں بالکل آغاز ہی میں ان الفاظ میں واضح کر دی گئی تھی کہ ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝﴾ (المزمل) ''ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں''۔ ایک بہت بڑی ذمہ داری آپ کے کاندھے پر آنے والی ہے۔ یہ ہے وہ بارِ امانت جو نبی اور رسول کے کندھے پر ہوتا ہے۔ رسول اس کو پہنچا کر بری ہو جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس نے گواہی دے دی حق کی' صداقت کی' توحید کی اور جو بھی اللہ کا پیغام آیا تھا اس کی۔ یہ گواہی اس نے قولاً بھی دے دی اور عملاً بھی۔ اور پھر لوگوں سے بھی یہ گواہی لے لی کہ ''میں نے پہنچانے کا حق ادا کر دیا!'' اب وہ بری ہو گیا۔ یہ ہے شہادت علی الناس۔ اسی کا ظہور ہوگا روزِ قیامت میدانِ حشر میں جب انفرادی محاسبے سے پہلے اُمتوں کے محاسبے کا مرحلہ آئے گا اور اُمتوں کو اجتماعی جواب دہی کے لیے کٹہرے میں آنا پڑے گا۔

رسولوں کی گواہی اپنی اُمتوں کے خلاف!

قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر یہ نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اُس وقت ہر اُمت کی طرف بھیجا جانے والا رسول پہلے سرکاری گواہ (Prosecution Witness) کی حیثیت سے کھڑا ہوگا اور یہ شہادت دے گا' testify کرے گا کہ اے ربّ! تیرا جو پیغام مجھ تک پہنچا تھا میں نے بلا کم و کاست پہنچا دیا تھا۔ اب یہ لوگ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں' یہ خود مسئول ہیں' یہ خود جواب دہ ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو سورۃ النساء میں بڑی صراحت سے آئی ہے۔ اور ایک عجیب

واقعہ سیرت النبیؐ کا اس کے ساتھ متعلق ہے کہ حضورﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضورؐ! آپ کو قرآن سناؤں' آپ پر تو وہ نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں' لیکن مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور کیف اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے امتثالِ امر میں سورۃ النساء کی آغاز سے تلاوت شروع کی اور جب آیت نمبر ۴۱ پر پہنچے جس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾

''کیا حال ہوگا اس دن جبکہ ہم ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے' اور اے نبی آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان لوگوں کے خلاف!''

تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا: حسبك! حسبك! بس کرو! بس کرو! اب جو میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو نبی اکرمﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔(۱)

یہ ہے وہ نازک ذمہ داری کہ نبی کو میدانِ حشر میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے اُمت کے خلاف دینی ہوگی کہ اے ربّ! میں بری ہوں' میں نے پہنچا دیا تھا اور اب یہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔ جیسے کہ سورۃ المائدۃ کے اختتام پر نقشہ کھینچا گیا ہے کہ روزِ محشر حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال ہوگا: ﴿ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۱۶) ''اے مسیح! کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور میری ماں کو بھی معبود بنالینا اللہ کے ساتھ؟'' جواب میں وہ عرض کریں گے کہ پروردگار! اگر میں نے یہ کہا ہوتا تو تیرے علم میں ہوتا۔ میں نے تو وہی کچھ کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ میں نے تو انہیں تیری بندگی کی دعوت دی تھی۔ یہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ یہ ہے وہ شہادت اور گواہی جس کے لیے قرآنی اصطلاح ''شہادت علی الناس'' ۔ دنیا میں تبلیغ' تلقین اور ابلاغ کے ذریعے سے انسانوں پر اللہ کی طرف سے اتمام حجت قائم کرنا' قولاً اور عملاً بھی۔ اور اسی کی بنیاد پر میدانِ حشر میں وہ گواہی ہوگی جس کی تفصیل سورۃ النساء کی آیت نمبر ۴۱ کے حوالے سے ہمارے سامنے آچکی ہے۔

تبلیغ دین کا کام اب اُمت مسلمہ کے ذمے ہے!

ہمارے لیے اصل قابل توجہ بات یہ ہے کہ خطبۂ حجۃ الوداع میں حضورﷺ نے صحابہ کرامؓ سے گواہی لینے کے بعد آخری بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی: ''فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ (۲)'' کہ اب

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن باب قول المقرئ للقارئ حسبك (۲) صحیح البخاری

پہنچائیں وہ جو یہاں ہیں ان کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اللہ کے پیغام کو نوعِ انسانی تک پہنچانے کا جو فریضہ انبیاء سرانجام دیتے تھے وہ اب اس اُمت کے ذمے ہے۔ قرآن جوابی ہدایت نامہ ہے' اس کی حفاظت کا ذمہ تو اللہ نے لے لیا۔ اب کسی نئی وحی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پیغامِ ربانی اپنے اتمامی اور تکمیلی درجے کو پہنچ چکا: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾ (المائدۃ: ۳) چنانچہ تکمیل دین اور اتمامِ نعمت کے ساتھ ہی بعثت انبیاء ورسل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ خاتم النبیین اور آخر المرسلین قرار پائے اور اب اللہ کے پیغام کو خلق خدا تک پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔ گویا اب کارِ نبوت' کارِ تبلیغ' کارِ دعوت' فرائض رسالت اور نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت یہ تمام کام اب تا قیامِ قیامت اُمت کے ذمے ہیں۔ یہ فرضِ منصبی' اے مسلمانو اب تمہارے کاندھوں پر اجتماعی حیثیت سے عائد کر دیا گیا۔ یہ ہے وہ عظیم فریضہ اور یہ ہے نبوت ورسالت کے اس ''سلسلة الذهب'' (سنہری زنجیر) میں ایک مستقل کڑی کی حیثیت سے شامل کیے جانے کا مقام اور مرتبہ جو اے اُمت محمد (ﷺ) اب تمہیں حاصل ہوا ہے:

﴿هُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا لِيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖ﴾

''اُمت وسط'' کا مفہوم

قرآن حکیم کے اسلوب سے متعلق اس اہم حقیقت کا بیان اس سے پہلے بھی متعدد بار ہوا ہے کہ اہم مضامین قرآن میں دو مرتبہ ضرور ملیں گے' تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے مقام پر وہی مضمون بالعموم عکسی ترتیب کے ساتھ آتا ہے۔ اس کی ایک بڑی نمایاں مثال ہمیں یہاں نظر آتی ہے —— چنانچہ یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں بھی آیا ہے۔ نوٹ کیجیے کہ سورۃ الحج کی اس آیت میں جو ہمارے زیر درس ہے' لفظ اُمت وارد نہیں ہوا ہے' گو اس کی تشریح میں مَیں نے بار بار لفظ اُمت استعمال کیا ہے' جبکہ سورۃ البقرۃ میں یہ مضمون لفظ اُمت کے حوالے سے وارد ہوا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (آیت ۱۴۳) اے مسلمانو' غور کرو' تمہیں اُمت کیوں بنایا گیا! لغت میں ''اَمَّ يَؤُمُّ'' کے معنی قصد کرنے اور ارادہ کرنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے اُمت کے معنی

ہوئے ہم مقصد لوگوں کا گروہ! ایک ایسی اجتماعیت اُمت کہلائے گی جو کسی ایک مقصد یا کسی ایک نصب العین کے گرد جمع ہو۔ اس اُمت مسلمہ کو' جسے سورۂ آل عمران میں ''خیر اُمت'' بھی کہا گیا﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آیت ۱۱۰) یہاں سورۃ البقرۃ میں اُمت وسط قرار دیا گیا ہے۔

اُمت وسط کے دو معنی کیے گئے ہیں' ایک تو اس اعتبار سے کہ جو شے درمیانی ہوتی ہے' جو وسط کی ہوتی ہے' وہ بہترین ہوتی ہے۔ اس معنی میں اس کا ترجمہ ہوگا بہترین اُمت۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۰ اس مفہوم کی مزید تائید کر رہی ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ ''وسط'' درحقیقت دو چیزوں کے مابین کڑی (Link) کو کہتے ہیں۔ گویا اب تم ایک کڑی (Link) کی حیثیت رکھتے ہو محمد ﷺ کے اور پوری نوعِ انسانی کے مابین۔ جس طرح جبرئیل علیہ السلام کڑی تھے اور محمد ﷺ کے درمیان! محمد ﷺ نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا کر اتمامِ حجت کر دیا' اس پر تم سے شہادت اور گواہی بھی لے لی۔ اب تم واسطہ اور ذریعہ (Link) ہو اس پیغام کے آگے پہنچنے کا۔ اب تمہارے ذریعے اس پیغام کو آگے پہنچنا اور پھیلنا ہے۔ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت تمہارے ذریعے ہونی ہے۔ تو یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے اے مسلمانو! تمہیں ''اُمتِ وسط'' بنایا گیا ہے۔

سورۃ الحج میں پہلے رسول کا ذکر تھا: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ﴾ اور اس کے بعد اُمت کا ذکر آیا: ﴿وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ جبکہ سورۃ البقرۃ میں ترتیب الٹ دی گئی ہے۔ یہاں اُمت کے ذکر سے بات شروع کی گئی: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (آیت ۱۴۳) تمہیں بھی قیامت کے روز بطورِ گواہ پیش ہونا ہوگا اور اللہ کے دربار میں یہ گواہی دینی ہوگی کہ اے اللہ نوعِ انسانی کے نام تیرا جو پیغام قرآن حکیم کی شکل میں محمد رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہم تک پہنچا تھا ہم نے خلق خدا تک پہنچا دیا تھا' ہم نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا تھا۔ اگر ہم نے اپنے اس فرضِ منصبی میں کوتاہی کی اور روزِ محشر ہم یہ گواہی نہ دے پائے تو سوچیے کہ دوسروں کے جرم سے بڑھ کر جرم ہمارا ہوگا۔ ہماری پکڑ پہلے ہوگی اور سب سے پہلے ہم مسئول اور ذمہ دار قرار دیے جائیں گے کہ تم اس ہدایت کے خزانے کے اوپر سانپ بن بیٹھے رہے' تم نے اس کو دوسروں تک پہنچانے کا حق ادا نہیں کیا۔

اُمت کی غفلت شعاری

خلق خدا ہم پر الزام دھرے گی کہ اے اللہ! یہ تھے تیرے دین کے علمبردار' یہ تھے تیرے کلام کے

امین اور حامل، انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہم تک اسے نہیں پہنچایا بلکہ خود بھی اس پر عمل نہیں کیا، یہ اپنے وجود سے خود دین کے لیے ایک حجاب اور رکاوٹ بن گئے تھے۔ جارج برناڈ شا کا مشہور قول ہے کہ میں جب قرآن پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کتاب اور کوئی ممکن نہیں، لیکن جب میں مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ ذلیل قوم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے وہ عملی شہادت جو مسلمان اپنے وجود سے، اپنے حال سے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

جہاد کا مقصد اوّلین: فریضۂ شہادت علی الناس

بہرحال یہ شہادت علی الناس، یہ ابلاغ و تبلیغ دین، یہ دعوت اِلی اللہ کا فریضہ ادا کرنا یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ اور مقصد اوّلین! یہ ہے وہ فرضِ منصبی جس کی ادائیگی کے لیے بڑی محنت اور کوشش کرنی ہوگی، اس کے لیے جان و مال اور اوقات کا ایثار کرنا ہوگا۔ خلقِ خدا پر خدا کی طرف سے اتمامِ حجت کا حق تبھی ادا کیا جا سکے گا کہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ تیرا پیغام ہم تک پہنچایا ہی نہیں گیا! یہ ہے وہ مقصدِ عظیم جس کے لیے اس شد و مد کے ساتھ اس آیت میں جہاد کی تاکید کی گئی: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾

بسم اللہ کرو، عمل کے میدان میں قدم رکھ دو!

اب ہم اس آیۂ مبارکہ کے آخری حصے پر پہنچ گئے ہیں جس میں بڑے ہی عملی انداز میں یہ بات سامنے لائی گئی ہے کہ اگر بات سمجھ میں آ گئی، اپنے فرائض دینی کا شعور حاصل ہو گیا: ﴿اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ اور ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ کے حوالے سے مطالباتِ دین کی چاروں سیڑھیاں اگر نگاہوں کے سامنے آ گئیں، تمہیں اگر معلوم ہو گیا کہ ایمان کا تقاضا کیا ہے تو بسم اللہ کرو! قدم بڑھاؤ اور عمل کا آغاز کر دو! نوٹ کیجیے یہاں گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے ''فَ'' کے حرف سے، جیسے دو مرتبہ یہ کلمہ ''فا'' بڑے بامعنی انداز میں آیا ہے سورۃ التغابن میں۔ اسی طرح کا معاملہ یہاں ہے: ﴿فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ بسم اللہ کرو، پہلی سیڑھی پر قدم رکھو، یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، سفر کا آغاز کر دو! فرائض دینی میں سے جو پہلا فرض ہے اُس کو تو پوری مضبوطی کے ساتھ پکڑو، اس پر تو کاربند ہو جاؤ!

یہاں دیکھئے وہ بات جو میں نے آغاز میں عرض کی تھی کہ ''اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا'' میں محض نماز کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ تمام ارکانِ اسلام مراد ہیں۔ چنانچہ یہاں اُسی نماز کی کوکھ سے زکوٰۃ برآمد ہو گئی۔ آگے فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ اس پہلی سیڑھی پر قدم جما کر آئندہ کے مراحل کے لیے اللہ سے چمٹ جاؤ۔ عصمت کہتے ہیں حفاظت کو۔ اعتصام سے مراد ہے حفاظت کے لیے کسی سے چمٹ جانا۔ اصل میں یہاں تصویر لفظی ہے کہ کسی بچے کو اگر کہیں کسی طرف سے اندیشہ ہو' خوف لاحق ہو تو وہ اپنی ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں قلعے میں آ گیا ہوں اور ہر خطرے سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ یہ ہے اعتصام۔ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ آئندہ کے مراحل کے لیے اللہ سے چمٹ جاؤ' اللہ کی حفاظت میں آ جاؤ' اللہ ہی کو اپنا مددگار سمجھو' اللہ کی تائید وتوفیق پر بھروسہ رکھو! منزلیں بڑی کٹھن ہیں' ان فرائض کی ادائیگی آسان نہیں' ان میں سے ایک ایک سیڑھی بڑی ہی بھاری اور ایک پر ایک منزل بڑی کٹھن ہے' لیکن یہ کہ اللہ کا نام لے کر آغازِ سفر تو کرو — ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ نماز اور زکوٰۃ کے ذریعے بسم اللہ کرو' اور آئندہ کے لیے اللہ پر توکل کرو' اسی پر بھروسہ رکھو! ﴿هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۷۸﴾ ''وہ تمہارا مولیٰ ہے' تمہارا مددگار ہے پس کیا ہی اچھا ہے وہ مددگار اور کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ!'' جسے اُس کی حمایت میسر آ جائے اب اس سے بڑھ کر کسی کو کسی کی حمایت حاصل ہو گی! جس کو اس کی نصرت وتائید مل جائے اس سے بڑھ کر مطمئن اور بے فکر اور کون ہو گا!

''حبل اللہ'' کی تعیین

یہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ ''وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ'' کے الفاظ میں ایک اجمال ہے۔ قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے: (اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا) تو وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ کی مزید شرح ہمیں سورۂ آل عمران میں ملے گی: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آیت ۱۰۲) اب یہاں دیکھئے کہ ''حَقَّ تُقٰتِهٖ'' میں لفظی مناسبت موجود ہیں۔ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آیت ۱) ''اللہ کی رسی کو مضبوط سے تھام لو۔ گویا وہاں اللہ سے چمٹنے اور اس کے دامن سے وابستہ رہنے کے لیے اس کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہے۔ لیکن یہ سوال پھر باقی رہ گیا کہ اللہ کی وہ مضبوط رسّی کون سی ہے؟ اس سوال کا قرآن مجید میں جواب نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید کے اس اجمال کی مزید تفصیل ہمیں ملتی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کے

فرمودات میں۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کے کسی اجمال کی تفصیل اور تبیین کرنا نبی اکرم ﷺ کا صرف حق نہیں آپ ؐ کا فرضِ منصبی ہے۔ ﴿وَاَنۡزَلۡنَا اِلَیۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ﴾ ''اور نازل کیا ہم نے یہ ذکر آپ کی طرف تا کہ اے نبی آپ توضیح کر دیا کریں (مزید وضاحت کر دیا کریں) اُس کی کہ جو لوگوں کے لیے نازل کیا گیا''۔ چنانچہ مذکورہ بالا سوال کا جواب ہمیں نبی اکرم ﷺ کے ایک فرمان میں ملتا ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ وہ ایک طویل روایت ہے جس میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے۔ اسی میں یہ الفاظ بھی آپ ؐ نے ارشاد فرمائے: هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ[1]! یہ قرآن ہے اللہ کی مضبوط رسّی!

سلسلۂ مضمون کو ذہن میں جوڑ لیجیے: ''وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰه '' کی شرح مزید ہوئی ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰه '' کے الفاظ سے۔ اور وہ حبل اللہ کون سی ہے؟ اس کا جواب ملا حدیثِ نبویؐ کے ذریعے کہ ''هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ '' اس سے اشارہ ہو گیا کہ اس سارے عمل یعنی مجاہدہ فی سبیل اللہ اور شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لیے مرکز و محور دراصل قرآن مجید ہوگا۔ یہ مضمون ہمارے منتخب نصاب کے اسی حصہ چہارم میں سورۃ الجمعۃ کے ضمن میں تفصیل سے زیر بحث آئے گا۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

❁ ❁ ❁

(۱) سنن الترمذی، کتاب فضائل القرآن عن الرسول اللهؐ، باب ماجاء فی فضل القرآن

درس 17

جہاد وقتال فی سبیل اللہ
کی غایت قصویٰ
اظہار دین الحق

جہاد وقتال کے موضوع پر قرآن حکیم
کی جامع ترین سورت یعنی

سُوْرَةُ الصَّفِّ کی روشنی میں!

درس ۱۷

جہاد وقتالِ فی سبیل اللہ کی غایت قُصویٰ

''اظہارِ دین الحق''

قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ

سُورۃ الصَّف

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا ہم سلسلہ وار مطالعہ کررہے ہیں اس کے چوتھے حصے میں سورۃ الحج کے آخری رکوع کے بعد اب ہمیں بالترتیب سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا مطالعہ کرنا ہے۔ یہ دونوں سورتیں ایک حسین وجمیل جوڑے کی صورت میں ''سلسلۂ مُسَبِّحات '' کے بالکل وسط میں وارد ہوئی ہیں۔ اس سے قبل سورۃ التحریم کے درس کے ضمن میں بھی یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ کسی ایک مضمون پر' جس کے دو رُخ یا دو پہلو ہوں' بالعموم دو علیحدہ سورتوں میں بحث ہوتی ہے اور دونوں سورتیں مل کر اس ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتیں اور آیات

اس مرحلے پر چونکہ ہم قرآن حکیم کی ایسی دو سورتوں کا مطالعہ کرنے والے ہیں جن کا باہم جوڑا ہونا بہت نمایاں ہے' لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مصحف کی ترتیب سے متعلق اور سورتوں کی گروپ بندی (grouping) کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں عرض کر دی جائیں' تاکہ قرآن مجید کے ساتھ ایک مجموعی اور عمومی تعارف اور اس کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت پیدا ہونے میں مدد مل سکے۔

اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی اکائی ''آیت'' ہے اور قرآن حکیم چھ ہزار سے زائد آیات پر مشتمل ہے۔ آیت کے معنی ہیں نشانی۔ اس لفظ سے دراصل اس حقیقت کی جانب

رہنمائی ملتی ہے کہ قرآن حکیم کی ہر آیت علم وحکمت کا ایک موتی اور اللہ کے علمِ کامل اور اس کی حکمتِ بالغہ کی نشانی ہے۔ بعض آیات صرف حروفِ مقطّعات پر مشتمل ہیں، بعض مرکباتِ ناقصہ پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو مکمل جملوں پر مشتمل ہیں، جبکہ ایسی بھی بہت سی آیات ہیں جن میں متعدد جملے آ جاتے ہیں۔ یہ معاملہ کسی لغوی، نحوی یا اجتہادی اصول پر مبنی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ تمام اُمور توقیفی ہیں، یعنی نبی اکرمﷺ کے بتانے ہی سے اُمت کو معلوم ہوئے ہیں۔

آیات جمع ہو کر سورتوں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ سورتوں کی کُل تعداد ایک سو چودہ ہے جو متفق علیہ ہے۔ ''سورۃ'' کے لغوی معنی ''فصیل'' کے ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے گویا یہ نقشہ سامنے لے آیا گیا کہ قرآن حکیم کی ہر سورۃ علم وحکمت کا ایک شہر ہے، جس کے گرد ایک فصیل موجود ہے۔ آیات ہی کی طرح سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی ہیں۔ سب سے چھوٹی سورتیں تین ہیں جو تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ انہی میں سے ایک سورۃ العصر ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز ہے۔ بقیہ دو سورتیں، سورۃ الکوثر اور سورۃ النصر ہیں۔ قرآن حکیم کی طویل ترین سورتیں وہ ہیں جو سورۃ الفاتحہ کے بعد مصحف کے بالکل آغاز میں آئی ہیں۔ یعنی سورۃ البقرۃ، سورۂ آلِ عمران، سورۃ النساء، سورۃ المائدۃ، سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف۔ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ بعض سورتیں وہ ہیں جو بیک وقت ایک مربوط اور مسلسل خطبے کی شکل میں نازل ہوئیں، لیکن بہت سی سورتوں میں تدوین و ترتیب کا معاملہ بھی ہوا ہے جو نبی اکرمﷺ کے حکم کے تحت ہوا ہے، کہ بعض آیات نازل ہوئیں اور نبی اکرمﷺ نے فرمایا اِن آیات کو فلاں سورۃ میں فلاں آیتوں کے بعد رکھ دو! بہرحال یہ ترتیب اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی رہنمائی میں نبی اکرمﷺ نے خود معین فرمائی۔

سات احزاب

سورتوں کی ایک تقسیم جو بہت معروف ہے وہ ان کے زمانۂ نزول کے حوالے سے ہے۔ کچھ سورتیں مکی ہیں، کچھ مدنی ہیں۔ یعنی کچھ سورتیں وہ ہیں جو ہجرت سے قبل نازل ہوئیں اور کچھ سورتیں وہ ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔

اب ترتیبِ مصحف کی طرف آیئے اور سورتوں کی گروپنگ کو سمجھنے کی کوشش کیجیے! یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب، جس سے ہم واقف ہیں اور جو دَورِ نبویؐ سے چلی آ رہی ہے، ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے نہیں ہے اور یہ بات اظہر من الشّمس ہے، اس پر کچھ مزید عرض کرنے کی حاجت نہیں

ہے۔ اس ترتیبِ مصحف میں سورتیں جس طرح ایک دوسرے کے بعد رکھی گئی ہیں اور اِن میں جو گروپ بندی کی گئی ہے ان میں سے ایک گروپ بندی (grouping) تو وہ ہے جس کا ذکر ہمیں دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ سے ملتا ہے' جس کی رو سے قرآن حکیم کی سورتیں سات احزاب یا سات منزلوں میں منقسم ہیں۔ یہ درحقیقت بغرضِ تلاوت قرآن حکیم کو سات قریباً مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ آغاز میں تقریباً ہر مسلمان ہر ہفتے قرآن مجید کی تلاوت مکمل کیا کرتا تھا' لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن حکیم کو سات تقریباً مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے' تاکہ ایک شخص روزانہ ایک حصہ' ایک حزب یا ایک منزل پڑھ کر ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کر لیا کرے۔ یہ تقسیم' جیسا کہ عرض کیا گیا' دورِ صحابہؓ میں موجود تھی۔ اس تقسیم میں ایک ظاہری حسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو چھوڑ کر' کہ یہ پورے قرآن مجید کے لیے ایک دیباچے اور مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے' پہلی منزل یا پہلا حزب تین سورتوں پر مشتمل ہے' دوسرا پانچ سورتوں پر' تیسرا سات سورتوں پر' چوتھا نو سورتوں پر' پانچواں گیارہ سورتوں پر اور چھٹا تیرہ سورتوں پر مشتمل ہے' جبکہ ساتویں حزب میں' جو کہ ''حزبِ مفصل'' کہلاتا ہے' سورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے' اس لیے کہ قرآن مجید کے آخر میں حجم کے اعتبار سے بہت چھوٹی چھوٹی سورتیں جمع ہیں۔

پارے اور رکوع

سات منزلیں یا سات احزاب تو دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں موجود تھے' البتہ دو تقسیمیں بعد میں کی گئی ہیں جن کا دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں ذکر نہیں ملتا۔ ایک قرآن حکیم کی تیس پاروں میں تقسیم ہے' جو درحقیقت اُس دَور کی تجویز کردہ ہے جب مسلمانوں کا جذبۂ ایمان کچھ مدھم پڑ گیا تھا اور تلاوتِ قرآن کے ضمن میں وہ سابقہ معمول' کہ ہر ہفتے میں قرآن مجید ختم کر لیا جائے' اب کچھ لوگوں پر گراں گزر رہا تھا۔ چنانچہ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کو تیس حصوں میں تقسیم کر دیا جائے' تاکہ ہر مسلمان روزانہ ایک حصہ پڑھ کر ایک مہینے میں تلاوتِ قرآن مکمل کر لیا کرے۔ لیکن یہ تقسیم فی الواقع بڑی ہی مصنوعی اور بے قاعدہ (arbitrary) ہے اور قطعی طور پر کسی بھی اصول پر مبنی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس میں یہ ظلم بھی کیا گیا ہے کہ سورتوں کی فصیلیں توڑ دی گئی ہیں اور نہایت بھونڈے طریقے سے توڑی گئی ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں جبکہ بقیہ پوری سورت چودہویں پارے میں چلی گئی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کسی کے پاس قرآن حکیم کا کوئی ایک نسخہ تھا اور اس نے

اس کے صفحات گن کر اُسے برابر برابر تیس حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ممالک میں جو قرآن مجید طبع ہوتے ہیں ان میں بالعموم ان پاروں کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا۔

ایک دوسری تقسیم جو کی گئی' اور وہ بھی بغرضِ سہولتِ تلاوت کی گئی' وہ ہے سورتوں کی تقسیم رکوعوں میں۔ اس میں پیشِ نظر یہ تھا کہ طویل سورتوں کو جن کا نماز کی ایک رکعت میں پڑھنا مشکل ہے' اس طرح کے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ ایک حصہ ایک رکعت میں بآسانی پڑھا جا سکے۔ اس طرح طویل سورتیں رکوعوں میں منقسم ہو گئیں۔ آخری پارے کی اکثر سورتیں صرف ایک ایک رکوع پر مشتمل ہیں' اس لیے کہ ان کو ایک رکعت میں بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد پیچھے کی طرف آئیے تو ذرا طویل سورتیں ہیں جو دو دو رکوعوں کی سورتیں ہیں۔ پھر مزید طویل سورتیں ہیں جو تین تین اور چار چار رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن حکیم کی طویل ترین سورۃ' سورۃ البقرۃ ہے جو چالیس رکوعوں پر مشتمل ہے۔ یہ تقسیم جس نے بھی کی ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس نے مضامین کا لحاظ رکھا ہے۔ عام طور پر رکوع کا اختتام ایسے ہی موقع پر کیا گیا ہے کہ جہاں ایک مضمون مکمل ہو جائے اور سلسلۂ کلام ٹوٹنے نہ پائے۔ بہرحال پاروں اور رکوعوں کی یہ تقسیم دورِ صحابہؓ میں موجود نہیں تھی' یہ بعد کے زمانے سے متعلق ہے۔

سورتوں کی ایک نئی گروپ بندی

البتہ قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک گروپ بندی اور بھی ہے جس کی جانب ماضی قریب ہی میں بعض محققین کی نگاہ گئی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم میں اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ مکی اور مدنی سورتوں کو کچھ اس طرح آپس میں جوڑا گیا ہے' اکٹھا کیا گیا ہے کہ اس سے سات گروپ وجود میں آ گئے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کے ہر گروپ کا آغاز ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر ہوتا ہے' اور اس طرح مکی اور مدنی سورتیں مل کر ایک گروپ کو مکمل کرتی ہیں۔ ایک گروپ کے مکمل ہونے پر آپ دیکھیں گے کہ دوسرا گروپ شروع ہوگا' پھر آغاز میں مکیّات آئیں گی اور اُن کے بعد پھر مدنیات۔ اور اس طرح دوسرا گروپ مکمل ہو جائے گا۔ پھر تیسرے گروپ کا آغاز بھی ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے ہوگا' جن کے بعد پھر مدنی سورتیں آئیں گی اور گروپ مکمل ہو جائے گا۔ اس طرح مکی اور مدنی سورتوں کے بھی سات ہی گروپ سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون ہے جو اس گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ہر گروپ کا

ایک مرکزی خیال یا ایک عمود (central axis) ہوتا ہے جس کے ساتھ اس گروپ کی تمام مکی اور مدنی سورتیں مربوط ہوتی ہیں۔

اس طرح سے قرآن مجید کی سورتوں کے جو سات گروپ وجود میں آئے ہیں ان میں سے پہلے گروپ میں مکی سورۃ صرف ایک ہے' یعنی سورۃ الفاتحہ' جبکہ اس گروپ میں چار انتہائی طویل مدنی سورتیں شامل ہیں' یعنی البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ۔ دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو مکی سورتیں اور دو ہی مدنی سورتیں شامل ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکی ہیں اور سورۃ الانفال اور سورۃ التوبۃ مدنی ہیں۔ تیسرے گروپ کی مکیات کا سلسلہ بہت طویل ہے جو گیارہویں پارے میں سورۂ یونس سے شروع ہو کر اٹھارہویں پارے تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مدنی سورۃ آتی ہے' یعنی سورۃ النور' اور اس پر گروپ مکمل ہو جاتا ہے۔ پھر مکیات کا سلسلہ اٹھارہویں پارے میں سورۃ الفرقان سے شروع ہو کر بائیسویں پارے تک چلا گیا ہے' جس کے بعد سورۃ الاحزاب مدنی سورۃ ہے جس پر چوتھا گروپ مکمل ہوتا ہے۔ اس طرح سے مکیات اور مدنیات پر مشتمل قرآن حکیم کی سورتوں کے سات گروپ وجود میں آتے ہیں اور ان میں ایک معنوی تقسیم بھی نظر آتی ہے کہ ہر گروپ کا اپنا ایک مرکزی مضمون ہے جس کی تکمیل اس گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتیں مل کر کرتی ہیں۔

مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ

اب آیئے اس اصل موضوع کی طرف جس کے ضمن میں یہ ساری بات زیرِ بحث آئی ہے' اور وہ یہ کہ اس پہلو سے قرآن حکیم کی سورتوں کا جو چھٹا گروپ بنتا ہے اس میں سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ شامل ہیں۔ یہ گروپ بعض اعتبارات سے ایک خصوصی شان کا حامل ہے۔ اس کے آغاز میں سورۂ ق سے سورۃ الواقعہ تک سات مکی سورتیں ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے جانتے ہیں کہ آہنگ (rhythm) اور روانی کے اعتبار سے قرآن حکیم میں ان سورتوں کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان سب کا مرکزی مضمون آخرت ہے اور اسی پر مختلف پہلوؤں سے ان سورتوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہی میں سورۃ الرحمٰن بھی شامل ہے جسے ''عَروس القرآن'' کہا گیا ہے۔ الفاظ کا حسن اور تراکیب اور بندشوں کی بے مثل خوبصورتی اور اچھوتا پن ان سورتوں کا امتیازی اور مشترک وصف ہے۔

ان سات مکی سورتوں کے بعد اس گروپ میں دس مدنی سورتیں شامل ہیں۔ بلحاظِ تعداد مدنی سورتوں کا یہ سب سے بڑا اور خوبصورت مجموعہ (constellation) ہے جس کی کوئی اور نظیر قرآن

حکیم میں موجود نہیں۔ ویسے حجم کے اعتبار سے پہلے گروپ میں جو چار مدنی سورتیں یعنی البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ شامل ہیں' وہ بہت طویل ہیں۔لیکن بہرحال سورتوں کی تعداد وہاں چار ہی ہے' جبکہ یہاں دس مدنی سورتیں مسلسل وارد ہوئی ہیں۔ستائیسویں پارے کی سورۃ الحدید سے ان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اٹھائیسویں پارے کی آخری سورۃ' سورۃ التحریم پر ختم ہوتا ہے۔

زیرنظر مدنی سورتوں کے مشترک اوصاف

ان سورتوں میں کچھ چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔اور چونکہ مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب میں مکمل سورتوں کی سب سے بڑی تعداد اسی گروپ سے متعلق ہے' لہٰذا اس نصاب کے مضامین کی تفہیم کے لیے اس گروپ میں شامل سورتوں کے مشترک امور کو سمجھ لینا مفید ہوگا۔اس سے پہلے اس گروپ کی دو سورتیں ہم پڑھ چکے ہیں۔منتخب نصاب کے حصہ دوم میں' جو مباحثِ ایمان پر مشتمل ہے' ہم نے سورۃ التغابن کا مطالعہ کیا تھا جو اس گروپ میں شامل ہے۔اسی طرح حصہ سوم میں اعمالِ صالحہ کی تفصیل کے ضمن میں عائلی زندگی اور اس سے متعلق اہم ہدایات پر مشتمل سورۃ التحریم کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں جو اس گروپ کی آخری سورۃ ہے۔اب اس مرحلہ پر اسی گروپ کی دو مزید سورتوں یعنی سورۃ الجمعہ اور سورۃ الصّف کا مطالعہ ہم کرنے والے ہیں۔مزید برآں اس منتخب نصاب کے آخری حصے میں ہمیں سورۃ الحدید کا مطالعہ کرنا ہے جس سے اس گروپ کی مدنی سورتوں کا آغاز ہوتا ہے۔لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر ان سورتوں کے بارے میں بعض بنیادی باتیں ذہن نشین کر لی جائیں' تاکہ ہر مرحلے پر ان کے تکرار و اعادہ کی ضرورت نہ رہے۔

تمام خطاب اُمّتِ مسلمہ سے ہے!

پہلی چیز جو اِن دس سورتوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے' یہ ہے کہ تقریباً ان سب کا زمانۂ نزول مدنی دَور کا نصفِ آخر ہے۔یہ وہ دَور ہے جب مسلمانوں کا معاشرہ باقاعدہ وجود میں آ چکا تھا اور مسلمانوں کو غلبہ اور اقتدار بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو چکا تھا۔گویا مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔چنانچہ ان سورتوں میں دوسری قدرِ مشترک آپ یہ دیکھیں گے کہ ان سورتوں میں خطاب کُل کا کُل مسلمانوں سے ہے' بحیثیتِ اُمّتِ مسلمہ۔ان میں یہود و نصاریٰ سے یا مشرکینِ مکہ سے خطاب نہیں ملے گا' نہ بطرزِ دعوت و تبلیغ نہ بطورِ ملامت و زجر و توبیخ! خطاب کُل کا کُل اُمّتِ مسلمہ سے ہے' اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کا اگر کہیں حوالہ آیا بھی ہے تو محض نشانِ عبرت کے طور پر۔ان

میں بھی نصاریٰ کی طرف reference ان سورتوں میں محض دو مقامات پر ہے' جبکہ اکثر سورتوں میں یہود کو بطورِ نشانِ عبرت پیش کیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! جس مقام پر آج تم فائز کیے جا رہے ہو اس مقام پر اس سے پہلے بنی اسرائیل فائز تھے۔ تم سے پہلے کتابِ الٰہی کے حامل وہ تھے' انہیں تورات عطا کی گئی تھی جس میں ہدایت بھی تھی اور قانون وشریعت بھی' تم سے پہلے وہ قوم اللہ کی نمائندہ اُمّت تھی جسے اڑھائی ہزار برس تک یہ مقامِ بلند حاصل رہا' لیکن جب انہوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کے ساتھ غداری کی تو وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنے اور انہیں اس مقام سے معزول کر دیا گیا۔ اس سابقہ اُمّت میں کن کن راستوں سے گمراہیاں آئیں' کس کس پہلو سے ان میں اخلاقی' اعتقادی یا عملی اضمحلال پیدا ہوا' اس کو اپنے سامنے بطورِ نشانِ عبرت رکھو! اس لیے کہ اُمتوں کی تاریخ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ آپ ؐ ارشاد فرماتے ہیں:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) (۱)

''میری اُمت پر بھی وہ تمام حالات لازماً وارد ہوں گے جو اس سے پہلے بنی اسرائیل پر آئے ہیں' بالکل ایسے جیسے کہ ایک جوتا دوسرے جوتے سے مشابہ ہوتا ہے۔''

دونوں اُمتوں کے حالات میں مشابہت کے بیان میں اس سے زیادہ بلیغ تمثیل ممکن نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس معاملے کو اس کی انتہا تک پہنچانے کے لیے یہ مثال بھی دی کہ اگر وہ (یعنی بنی اسرائیل) گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی ضرور گھسو گے' اور اگر ان میں سے کوئی بدبخت اور شقی ایسا پیدا ہوا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے بدکاری کی تھی تو تم میں سے بھی کوئی ایسا بدبخت پیدا ہو کر رہے گا۔ تو ان سورتوں میں درحقیقت اُمّتِ مسلمہ کے سامنے بطورِ نشانِ عبرت یہود اور نصاریٰ کے حالات بار بار لائے گئے۔ اور اس طرح مسلمانوں کو پیشگی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھنا کہیں تم ان گمراہیوں کا شکار نہ ہو جانا!

اہم مضامین کے جامع خلاصے

ان سورتوں میں تیسری قدرِ مشترک یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے وہ اہم مضامین اور مباحث جو طویل مکی اور مدنی سورتوں میں بہت تفصیل سے آئے ہیں' ان کے گویا چھوٹے چھوٹے خلاصے نکال کر اس مقام پر جمع کر دیے گئے ہیں۔ ایمان کے مباحث مکی سورتوں میں بڑی لمبی

(۱) سنن الترمذی' ابواب الایمان عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ۔

بحثوں کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ توحید' معاد اور آخرت کے مباحث اور ان کے لیے دلائل' پھر ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات طویل سورتوں میں بڑی تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' ایمان اور اس کے ثمرات ولوازم کے بیان میں اٹھارہ آیات پر مشتمل سورۃ التغابن انتہائی جامع سورۃ ہے۔ کوئی جاننا چاہے کہ ایمان کیا ہے' اس کے لوازم کیا ہیں' اس کے نتائج اور مضمرات کیا ہیں اور اس کے فکری وعملی تقاضے کیا ہیں' تو سورۃ التغابن اس کے لیے کفایت کرے گی۔

اسی طرح نفاق کا مضمون طویل مدنی سورتوں (سورۃ النساء' سورۂ آل عمران اور سورۃ التوبۃ) میں بڑے طویل مباحث پر پھیلا ہوا ملے گا کہ نفاق کسے کہتے ہیں' اس کی حقیقت کیا ہے' اس کا نقطۂ آغاز کون سا ہے' اس مرض کی علامات کیا ہیں' اس کی ہلاکت خیزی کا عالم کیا ہے' اس سے بچاؤ کی تدابیر کیا ہیں' اگر اس کی چھوت لگ جائے تو اس کا علاج کیا ہے' یہ تمام اُمور اِن سورتوں میں بڑی تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ لیکن ان تمام مضامین کا ایک جامع خلاصہ اور لبِّ لباب ہمیں سورۃ المنافقون کی شکل میں عطا کر دیا گیا جو کُل گیارہ آیات پر مشتمل ہے اور اسی مجموعے میں شامل ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی سے متعلق یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن حکیم میں سب سے زیادہ مفصل ہدایات اسی شعبۂ زندگی کے بارے میں دی گئی ہیں۔ گھر کا ادارہ انسان کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل ہے۔ اس ادارے کو کن خطوط پر استوار کیا جائے' بیویوں اور اولاد کے معاملے میں معتدل اور متوازن طرزِ عمل کون سا ہے' اگر طلاق کی نوبت آ جائے تو کن باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا' ان موضوعات پر دو دو رکوعوں پر مشتمل دو انتہائی جامع سورتیں (سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم) بھی اسی گلدستے میں شامل ہیں۔

اس طرح یہ دس سورتیں گویا مختلف اعتبارات سے قرآن حکیم میں طویل بحثوں میں پھیلے ہوئے اہم مباحث کے خلاصوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن کو ایک مقام پر یکجا کر دیا گیا ہے۔ اور یہی درحقیقت سبب ہے اس کا کہ ان دس سورتوں میں سے چھ ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں' یعنی سورۃ الحدید' سورۃ الصّف' سورۃ الجمعہ' سورۃ المنافقون' سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم۔

سرزنش اور ملامت کا اسلوب

ان سورتوں میں ایک اور قدرِ مشترک یا وصفِ مشترک یہ نظر آتا ہے کہ اُمتِ مسلمہ سے خطاب میں بالعموم کچھ ملامت کا سا اور جھنجوڑنے کا سا انداز جھلکتا نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اُمت کے

بعض طبقات کے جذباتِ ایمانی اور جوشِ جہاد میں کچھ کمی واقع ہوگئی تھی' ان کا جذبۂ انفاق کچھ سرد پڑ رہا تھا اوراب انہیں جھنجوڑا جا رہا ہے' کچھ سرزنش کے انداز میں بھی اور کہیں کہیں ملامت اور زجر کے انداز میں بھی۔ یہ انداز ان تمام سورتوں میں مشترک ہے۔اس کی بہت سی مثالیں دورانِ مطالعہ ہمارے سامنے آ ئیں گی۔سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾﴾ ''اے اہل ایمان! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟'' ﴿کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾﴾ ''یہ چیز اللہ کے غضب کو بھڑ کانے والی ہے کہ تم کہو جو کرتے نہیں ہو۔''اسی طرح سورۃ الجمعہ میں ڈانٹ کے سے انداز میں تنبیہہ کی گئی ہے کہ اے نبی! یہ کیا معاملہ ہے کہ آپؐ کھڑے خطبہ دے رہے تھے اور مسلمان آپ کو چھوڑ کر چلے گئے! کیا خطبے اور نمازِ جمعہ کے مقابلے میں کاروبارِ دُنیوی انہیں زیادہ عزیز ہوگیا ہے؟ سورۃ الحدید میں یہی انداز ہے: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ...... ﴾ (آیت۱۶) ''کیا اہل ایمان کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد میں اور جو کچھ نازل ہوا ہے اللہ کی طرف سے اس کے سامنے......؟'' سورۃ التحریم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک معاملے میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو سرزنش کی گئی ہے اور کم از کم ظاہر الفاظ کے اعتبار سے اس میں بڑی سختی موجود ہے۔تو ان سورتوں میں یہ انداز بتکرار ملتا ہے۔

اس پیرایۂ بیان کا اصل سبب

اس ضمن میں یہ بات سمجھ لیجیے کہ واقعہ یہ ہے کہ ایک دَور تو وہ تھا جب کوئی شخص جان اور مال کی بازی کھیل کر ہی کلمۂ شہادت زبان پر لاتا تھا۔مکی دَور میں یہی کیفیت تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کلمۂ شہادت کے زبان پر جاری ہوتے ہی ہر چہار طرف سے مخالفت کا طوفان اُمڈ پڑے گا' مصائب اور تکالیف کا سامنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس کشمکش میں گھر بار سے تعلق توڑنا پڑے اور تمام پرانے تعلقات اور دوستیوں کو خیر باد کہنا پڑے۔لہٰذا کلمۂ شہادت زبان پر لانے کا فیصلہ کوئی شخص اُسی وقت کرتا تھا جبکہ ایمان اس کے دل میں پورے طور پر جا گزیں اور راسخ ہو چکا ہوتا۔لیکن یہ صورتِ حال تدریجاً بدل گئی۔ بالخصوص مدنی دَور کے آخری زمانے کا خیال کیجیے۔ نبی اکرم ﷺ کو فیصلہ کن اقتدار حاصل ہے' مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگیا ہے اور اب وہ ایک حکمران طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں' چنانچہ اب زبان سے کلمۂ شہادت ادا کرنا نہ صرف آسان ہوگیا ہے بلکہ یہ کلمہ اب انسان کے جان و مال کے تحفظ کا

ضامن بھی ہے۔ لہٰذا اب صورتِ حال وہ ہوگئی جس کا نقشہ سورۃ النصر میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے: ﴿اِذَاجَآءَ نَصۡرُاللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾ تو یہ لوگ جوفوج درفوج اور جوق در جوق دینِ اسلام میں داخل ہو رہے تھے' ظاہر بات ہے کہ ان کے ایمان کی کیفیت وہ نہیں تھی جو سابقون الاوّلون کے ایمان کی تھی۔ یہ بات اس سے پہلے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ میں آ چکی ہے۔ وہاں لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا گیا تھا کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے' بس یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے اسلام قبول کرلیا۔ ﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ﴾ ''یہ بدّو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے' اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اب ظاہر بات ہے جب ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ اُمت میں شامل ہو گئے تو اُمت میں بحیثیتِ مجموعی جذباتِ ایمانی' جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق کا اوسط کم ہوگیا۔ یہ وہ اضمحلال ہے جس پر اُسی وقت گرفت کی گئی۔ اس میں درحقیقت بعد کے اَدوار کے لیے' جبکہ اُمت میں بحیثیتِ مجموعی اضمحلال اور زوال پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہونے والا تھا' پیشگی رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ اور اس طرح آئندہ کے اَدوار میں یہ سورتیں مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی کو للکارنے اور اُن کے جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق کو ازسرِنو تازہ کرنے میں مہمیز کا کام دیں گی۔ ان کی تلاوت سے مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہوگا کہ وہ اپنا جائزہ لیں' اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور اگر ایمان کے اضمحلال کی متذکرہ بالا کیفیات انہیں اپنے باطن میں محسوس ہوں تو اس ضعف واضمحلال کو دُور کرنے پر کمربستہ ہو جائیں۔

ہمارے لیے ان سورتوں کی خصوصی اہمیت

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دَور میں کہ جس میں ہم سانس لے رہے ہیں' اُمتِ مسلمہ زوال وانحطاط کی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ مولانا حالیؔ نے درج ذیل دو اشعار میں جو انہوں نے اپنی مسدّس کی پیشانی پر درج کیے ہیں' اس کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا تھا: ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد

دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

اس دَور میں واقعہ یہ ہے کہ اگر ان سورتوں پر اُمت کی توجہات کو مرتکز کر دیا جائے‘ اِن کا فہم عام کر دیا جائے تو یہ مسلمانوں کے جذبۂ ایمان کی از سرِ نو بازیابی اور ان کے اندر جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق پیدا کرنے میں اِن شاء اللہ العزیز انتہائی مفید اور ممد ثابت ہوں گی۔

المُسَبِّحات

آخری بات ان سورتوں کے بارے میں یہ نوٹ کر لیجیے کہ ان دس سورتوں میں سے پانچ وہ ہیں کہ جن کا آغاز ’’سَبَّحَ لِلّٰہِ‘‘ یا ’’یُسَبِّحُ لِلّٰہِ‘‘ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس دس کے گلدستے میں یہ پانچ سورتیں ایک اضافی اور نرالی شان کی حامل ہیں۔ ان سورتوں کو مجموعی طور پر ’’المُسَبِّحات‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی وہ سورتیں جن کا آغاز تسبیح باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ ان میں سے تین وہ ہیں کہ جن میں آغاز میں ’’سَبَّحَ لِلّٰہِ‘‘ کے الفاظ وارد ہوئے۔ یعنی تسبیح کا ذکر فعل ماضی کی شکل میں کیا گیا ہے‘ جبکہ دو سورتوں کا آغاز ہوتا ہے ’’یُسَبِّحُ لِلّٰہِ‘‘ کے الفاظ سے۔ یہاں فعل مضارع لایا گیا ہے جو حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہے۔ اس معاملے میں بھی ایک عجیب توازن نظر آتا ہے کہ سورۃ الحشر کی آخری آیت میں بھی یہ لفظ ’’یُسَبِّحُ‘‘ شامل ہے۔ اس طرح گویا تین مرتبہ ’’سَبَّحَ‘‘ اور تین ہی مرتبہ ’’یُسَبِّحُ‘‘ کے الفاظ ان سورتوں میں وارد ہوئے ہیں۔ دورانِ مطالعہ آپ محسوس کریں گے کہ اُمّتِ مسلمہ کو جھنجوڑنے‘ مسلمانوں کو ان کے فرائضِ دینی سے آگاہ کرنے اور بالخصوص انہیں آمادۂ عمل کرنے میں ان ’’مُسبِّحات‘‘ کی تأثیر دوسری سورتوں سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ ان پانچ ’’مُسبِّحات‘‘ میں سے چار اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی سورۃ‘ سورۃ الحدید ہے۔ وہ یوں سمجھئے کہ ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ عروج ہوگی۔ گویا اس کا نقطۂ آغاز اگر سورۃ العصر ہے تو اس کی چوٹی (climax) سورۃ الحدید ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ شجرِ ہدایت کا بیج اگر سورۃ العصر ہے تو اس کا پھل ہے سورۃ الحدید‘ جس پر ہمارا یہ منتخب نصاب اِن شاء اللہ تکمیل پذیر ہوگا۔ یہ چند باتیں اگر ذہن نشین کر لی جائیں تو امید ہے کہ قرآن مجید سے ایک عمومی تعارف میں بھی ممد ومعاون ہوں گی اور خاص طور پر ان سورتوں کی اہمیت کو سمجھنے میں ان سے مدد ملے گی۔ اِن شاء اللہ!

چند تمہیدی مباحث

سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا براہِ راست مطالعہ کرنے سے قبل قرآن حکیم کی سورتوں کے بارے میں تعارفی وتمہیدی نوعیت کی دو مزید باتوں کی جانب توجہ کرنا مفید رہے گا۔ اجمالاً ان امور کی جانب اشارات پچھلے اسباق میں بھی کیے جا چکے ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے اسی طرح قرآن حکیم کی ہر سورۃ کا ایک عمود یا axis ہوتا ہے' جسے ایک ایسے دھاگے سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے جس میں موتی پروئے گئے ہوں اور ان موتیوں کو ہار کی شکل دی گئی ہو۔

قرآن حکیم کی ہر آیت اپنی جگہ علم وحکمت کا ایک حسین موتی ہے۔ لیکن جب اسے ایک سلسلۂ کلام کی لڑی میں پرو دیا جاتا ہے' ایک مرکزی مضمون کے ساتھ اس کا ربط قائم ہوتا ہے تو اس کے حسن میں ایک نئی شان پیدا ہوتی ہے اور اس ربط باہم سے علم وحکمت کے نئے نئے پہلو آشکارا ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کی ہر سورۃ پر غور کرنے کے لیے اس سورۃ کے مرکزی مضمون اور عمود کا تعین ضروری ہے۔ پھر ہر آیت پر اپنی جگہ غور کرنے کے بعد اس مرکزی مضمون کے ساتھ ان آیات کے ربط کو تلاش کرنا تدبّرِ قرآن کے نقطۂ نگاہ سے نہایت اہم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ اسلوب نظر آتا ہے کہ کسی ایک مضمون کو جس کے دو رُخ یا دو پہلو ہوں' کسی ایک ہی سورۃ میں بیان کرنے کی بجائے بالعموم دو سورتوں میں منقسم کر دیا جاتا ہے اور وہ دو سورتیں گویا ایک جوڑے (pair) کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس مضمون کے ایک پہلو پر گفتگو اُس جوڑے میں شامل ایک سورۃ میں اور دوسرے پر بحث دوسری سورۃ میں ہوتی ہے۔ اور جیسے کہ محاورتاً کہا جاتا ہے کہ ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں اور ان کے اجتماع سے تصویر مکمل ہوتی ہے' اسی طرح دونوں سورتیں مل کر ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔

اس کی ایک نمایاں مثال ''مُعوَّذتَین'' کی ہے جو قرآن حکیم کی آخری دو سورتیں ہیں۔ ان کا مضمون ایک ہی ہے' یعنی ''تعوّذ''۔ ان چیزوں کو کہ جن سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے' دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک وہ آفات ہیں جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں اور بعض وہ ہیں جو انسان کے اپنے باطن سے اُبھرتی ہیں۔ پہلی قسم کی آفات سے سورۃ الفلق میں اللہ کی پناہ حاصل کرنے کا ذکر ہے اور دوسری نوع کی آفات سے سورۃ الناس میں۔ اس طرح سے ''مُعوَّذتَین'' کی شکل میں قرآن حکیم کی سورتوں کا ایک حسین وجمیل جوڑا وجود میں آ گیا۔

اسی طرح کا معاملہ سورۃالمزّمّل اورسورۃالمدّثّر کا ہے۔ان دونوں سورتوں کے ناموں میں بھی لفظی مشابہت موجود ہے اور مضامین کے اعتبار سے بھی گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ایک میں نبی اکرمﷺ کو قیام اللیل کی شکل میں ذاتی ریاضت کا حکم دیا جا رہا ہے:﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝﴾ ''اے کپڑے میں لپٹنے والے! رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو مگر تھوڑا سا''۔یہ آپؐ کی ذاتی تربیت کے لیے ضروری ہے۔اس لیے کہ:﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝﴾ ''یقیناً ہم آپ پر عنقریب بڑی بھاری بات ڈالنے والے ہیں''۔اس کے لیے آپؐ کو ذاتی تربیت کے اس مرحلے سے گزرنا ہوگا۔اور دوسری سورۃ میں اس مشن کے لیے کھڑے ہونے کا ذکر ہے کہ جس کے لیے آپﷺ کو بھیجا گیا تھا اور جس کے لیے یہ ساری تیاری درکار تھی۔فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ ''اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھیے اور خبردار کیجیے! اور اپنے ربّ کی بڑائی (کا اعلان) کیجیے!''یعنی اب اپنے مشن اور مقصد کی تکمیل کے لیے کھڑے ہو جائیے' اپنی جِد وجہد کا آغاز کیجیے' اور اللہ کی کبریائی کا اعلان کیجیے! چنانچہ یہ دونوں سورتیں مل کر ایک حسین وجمیل جوڑے کی صورت اختیار کرتی ہیں۔

یہ دو مثالیں ان سورتوں سے متعلق تھیں جن کا باہم جوڑا ہونا بہت نمایاں ہے۔ان کے علاوہ بھی بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن کا باہم جوڑا ہونا بڑی آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔مثلاً اٹھائیسویں پارے کے آخر میں دو سورتیں سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق ایک انتہائی خوبصورت جوڑے کی شکل میں ہیں۔یہ دونوں سورتیں عائلی زندگی کے دو مختلف پہلوؤں اور ان سے متعلقہ مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ایک پہلو شوہر اور بیوی کے مابین عدم موافقت سے متعلق ہے جس کی انتہا طلاق ہے۔اور دوسرے کا تعلق شوہر اور بیوی کے مابین محبت والفت سے ہے' جو اگرچہ مطلوب اور پسندیدہ ہے' لیکن اگر یہ معاملہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ اس حد تک کیا جانے لگے کہ حدود اللہ ٹوٹنے لگیں تو یہ دوسری انتہا ہے۔سورۃ الطلاق میں ایک انتہا سے بحث ہوئی اور سورۃ التحریم میں دوسری انتہا زیرِ بحث آئی۔

اسی طرح کا معاملہ سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن کا ہے۔یہ دونوں سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ایمانِ حقیقی اور اس کے ثمرات ومضمرات کے موضوع پر سورۃ التغابن قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ ہے۔اگرچہ قانونی سطح پر ایمان کے مقابل کا لفظ ''کفر'' ہے' لیکن حقیقی اعتبار

سے ایمان کے مقابل کا لفظ ''نفاق'' ہے۔ نفاق دراصل فقدانِ ایمان کی باطنی کیفیت کا نام ہے۔ چنانچہ مصحف میں سورۃ التغابن سے متصلاً قبل جڑی ہوئی سورۃ المنافقون موجود ہے جو نفاق کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ ہے۔ نفاق کے اسباب اور اس کے نقطۂ آغاز سے لے کر اس کے انجام اور اس کے علاج تک تمام اہم مباحث اس ایک چھوٹی سی سورۃ میں جمع ہیں۔ سورۃ التغابن اور سورۃ المنافقون دونوں کو مصحف میں یکجا کر دیا گیا اور اس طرح ایک مضمون کی تکمیل ہوگئی۔

بعثتِ نبوی ﷺ کے دو اہم پہلو

باہم جوڑا ہونے کی یہ نسبت سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ میں بھی بہت نمایاں ہے۔ چونکہ ان دو سورتوں میں بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو رُخ زیرِ بحث آئے ہیں' لہٰذا میرا احساس یہ ہے کہ ان پر غور وفکر کرنے والا ہر شخص اپنے باطن میں ان سورتوں کے ساتھ قلبی اور ذہنی مناسبت کی ایک عجیب اور نرالی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ ایک سورت یعنی سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا ہے! یہ موضوع اپنی جگہ نہایت اہم ہے' اس لیے کہ کسی بھی شخص کے کارنامۂ حیات کو assess کرنے (جانچنے) کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ متعین کیا جائے کہ اس کا ہدف کیا تھا' وہ کیا کرنے چلا تھا اور اس کی منزلِ مقصود کون سی تھی۔ اس پہلو سے سیرتِ محمدیؐ کے مطالعے کے لیے واقعتاً یہ سورۂ مبارکہ اور بالخصوص اس کی مرکزی آیت انتہائی اہمیت کی حامل ہے' کہ یہ سمجھا جائے کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا تھا اور آپؐ کا فرضِ منصبی کیا تھا! یہ ہے مرکزی مضمون سورۃ الصّف کا۔ چنانچہ ہم دیکھیں گے کہ اس سورۂ مبارکہ میں تفصیل سے یہ مباحث آئے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس فرضِ منصبی کا تقاضا ہے کہ جو بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس جدّ وجہد میں رسولؐ کا ہاتھ بٹائیں' رسولؐ کے دست وبازو بنیں' آپؐ کے مشن کی تکمیل میں اپنی جان اور مال' اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو صرف کر دیں' اور اگر ضرورت پڑے اور وقت آئے تو اس راہ میں اپنی جان بھی نچھاور کر دیں۔ یہ گویا ان کے ایمان کی صداقت کی دلیل ہوگی۔ اس پہلو سے واقعہ یہ ہے کہ اس سورۃ الصّف میں جہاد وقتال فی سبیل اللہ کا مضمون اپنی منطقی انتہا اور اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کو مطالعۂ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کے اس چوتھے حصے میں رکھا گیا ہے جو ''تواصی بالحق'' کی تشریحات پر مشتمل ہے اور جس کا جامع عنوان ہے ''جہاد فی سبیل اللہ''۔

ذہن میں رہے کہ اس منتخب نصاب میں جہاد کی بحث کا آغاز سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ سے ہوا

تھا: ﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ﴾۔ پھر آیت ۱۵ میں ایمانِ حقیقی کی تعریف (definition) اِن الفاظ میں آئی: ﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ يَرۡتَابُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''حقیقت میں تو مؤمن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لائے پھر وہ شک میں نہیں پڑے' اور انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا''۔ جہاد فی سبیل اللہ کا ہدفِ اوّلین یا اس کی ابتدائی منزل کا ذکر سورۃ الحج کی آخری آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ یعنی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرنا' لوگوں پر اتمامِ حجت کرنا یا بالفاظِ دیگر ''شہادت علی الناس'' کا فریضہ ادا کرنا جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین ہدف ہے۔ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل' اس کی غایتِ قصویٰ یا اس کا ہدفِ آخریں ہے اللہ کے دین کا غلبہ۔ اور یہ ہے وہ اہم مضمون جو اس سورۃ الصّف میں ہمارے سامنے آئے گا۔

بعثتِ نبویؐ کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ وہ اساسی منہجِ عمل اور وہ بنیادی طریق کار کون سا تھا جس پر عمل پیرا ہو کر محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس فرضِ منصبی کو ادا کیا اور اپنے اس مشن کی تکمیل کی جس کا تعین سورۃ الصّف میں کیا گیا ہے۔ یہ ہے سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون۔ اس پہلو سے سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعے میں ان دونوں سورتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سورتوں نے مل کر گویا ایک مضمون کی تکمیل کر دی کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا تھا' اور اس کے لیے آپؐ کا اساسی طریق کار اور بنیادی منہجِ عمل کون سا تھا!

مقصد کا تعین اور صحیح منہجِ عمل کی تعیین

یہاں ایک بات کی جانب توجہ دلانا غیر مفید نہ ہو گا جو بڑی بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ہر اُس شخص کو جو دین کے ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کا کچھ بھی احساس و شعور رکھتا ہو اور اپنے ان فرائض کی ادائیگی پر کمر بستہ ہو' اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ دین کی سربلندی کی جدّ و جہد میں یہ دونوں باتیں بہت اہم ہیں: (i) مقصد کا تعین اور (ii) اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح راہ کا تعین۔ دونوں انتہائی ضروری ہیں۔ اگر مقصد کا تعین صحیح نہیں ہے' ہدف غلط معین ہو گیا ہے' یا بلا مقصد کسی ایک دائرے (circle) میں حرکت جاری ہے تو لاکھ محنت اور کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا' خواہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ گھروں سے نکلیں اور چالیس چالیس دن بلکہ اس سے بھی زیادہ وقت دین

کی محنت میں صرف کریں۔ اگر یہ ساری محنت بغیر ہدف کے ہو رہی ہے تو غلبۂ دین کی راہ میں کوئی مؤثر پیش رفت اس ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔ منزل اور ہدف کا تعین بہت ضروری ہے —— لیکن ہدف کے تعین کے ساتھ ہی اس طے شدہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے صحیح منہجِ عمل اور طریق کار کا تعین بھی از حد ضروری ہے۔ اس لیے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ منزل کے صحیح تعین کے باوجود انسان کسی غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔ صحیح منہجِ عمل اگر سامنے نہ ہو تو منزل تک پہنچنے کی جلدی میں بعض اوقات انسان کسی راہِ قصیر (short cut) کو آزمانے کی غلطی کر بیٹھتا ہے‘ لیکن پھر وہ شارٹ کٹ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ پھر تمام محنتوں‘ کوششوں اور قربانیوں کے باوجود منزل دُور سے دُور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ صحیح منہجِ عمل کو ترک کرنے کا یہ نتیجہ نکل کر رہتا ہے۔

یہ موٹی سی بات تو ہر شخص کے سمجھ لینے کی ہے کہ ہر مقصد اور ہر ہدف کے حصول کے لیے ہر طریق کار مفید نہیں ہوتا۔ ہر مقصد کے حصول کا اپنا ایک معین طریق کار ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہیں اشتراکی انقلاب برپا کرنے کا خواہش مند ہے تو اسے ایک خاص منہجِ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اسے اپنے معاشرے میں طبقاتی شعور پیدا کرنا ہوگا اور اس طبقاتی شعور کو اُجاگر کر کے طبقاتی تصادم کو جنم دینا ہوگا۔ لیکن اگر کوئی نیک دل انسان تصادم کو ناپسند کرتا ہو اور اس سے گریز چاہتا ہو تو ظاہر بات ہے کہ وہ اشتراکی انقلاب کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اس لیے کہ اس انقلاب کا راستہ اسی وادی میں سے ہو کر گزرتا ہے۔

اسی طرح یہ بات جان لیجیے کہ دین کی اقامت اور اس کا غلبہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ہیں۔ یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سورۃ الصّف کی مرکزی آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آئے گی: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ……﴾. اس ضمن میں اگر کسی کو اشتباہ ہے‘ اور نیک نیتی کے ساتھ اشتباہ ہے تو وہ اللہ کے ہاں تو عذر پیش کر سکے گا‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پھر قرآن مجید اور اس کے فہم سے اسے کوئی حصّہ حاصل نہیں!

دین کو دنیا میں ایک عملی اور ایک زندہ نظام کی حیثیت سے قائم اور برپا کرنا بعثتِ محمدیؐ کا بنیادی مقصد ہے۔ اسی کے لیے محنت‘ اسی کے لیے جدّ وجہد‘ اسی کے لیے کوشش‘ اسی کے لیے جینا‘ اسی کے لیے مرنا‘ اسی میں مال اور جان کا کھپانا بندۂ مؤمن کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس مقصد کی طرف پیش قدمی کا اپنا ایک طریق اور نہج معین ہے۔ اگر

ہم یہ دیکھیں کہ دنیا میں بعض دوسری تحریکیں کسی اور طریقے پر عمل پیرا ہو کر کامیاب ہو گئیں' کوئی وقتی سا نعرہ کسی تحریک کے لیے مفید ثابت ہو گیا یا کسی نے کوئی شارٹ کٹ اختیار کیا اور لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہو گیا' اور اس قسم کی چیزوں سے متأثر ہو کر ہم بھی ایسا ہی کوئی طریق کار غلبۂ دین کی جدوجہد میں اختیار کریں تو یہ بات ذہن میں رکھیے کہ تمام تر خلوص اور اخلاص کے باوجود کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکے گا —— اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا اساسی منہجِ عمل وہ ہے جو سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت میں نہایت دوٹوک الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ﴾ (آیت۲)

مقصدِ بعثت کا مضمون تین مرتبہ دہرایا گیا

یہاں یہ عجیب بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید میں وہ آیت جس میں نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کا بیان ہے' تین مرتبہ وارد ہوئی ہے۔ دو مرتبہ اِس شان کے ساتھ آئی ہے کہ اس میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے: ﴿هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝﴾ یہی الفاظ سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۳ میں وارد ہوئے ہیں اور بعینہٖ انہی الفاظ میں یہ آیت سورۃ الصّف کے وسط میں وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں آیت ۲۸ کا مرکزی حصہ بھی انہی الفاظ پر مشتمل ہے' یعنی: ﴿هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ؕ﴾ —— یہاں تک الفاظ بالکل وہی ہیں جو سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصّف میں وارد ہوئے ہیں' البتہ آیت کے آخری حصے میں یہاں ﴿وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝﴾ کی بجائے ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ۝﴾ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

اساسی منہجِ عمل کا ذکر چار مقامات پر!

اب آیئے سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت کی طرف جو نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے بنیادی طریق کار یا بالفاظِ دیگر انقلابِ محمدیؐ کے اساسی منہاج کو معیّن کر رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سورۃ الصّف کی مرکزی آیت قرآن حکیم میں تین مرتبہ وارد ہوئی تھی تو یہ آیت ترتیب کے ذرا سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں چار مرتبہ وارد ہوئی ہے۔ اوّلاً یہ آیت سورۃ البقرۃ کے پندرہویں رکوع میں وارد ہوئی ہے' جہاں نقشہ کھینچا گیا ہے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا جبکہ وہ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے: ﴿وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ ؕ﴾ اُس وقت جو دعائیں

ان کی زبانوں پر تھیں ان میں ایک دعا تو یہ تھی کہ اے پروردگار! ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری ذُرّیت اور اولاد میں سے ایک اُمتِ مسلمہ برپا کیجیو! اور پھر ان کی آخری اور نہایت اہم دعا یہ نقل ہوئی کہ:

﴿رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۲۹)

''اے ہمارے پروردگار! ان میں ایک رسول مبعوث کیجیو انہی میں سے جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔''

یہ ہے درحقیقت بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا۔ پھر تین رکوعوں کے بعد سورۃ البقرۃ ہی میں اٹھارہویں رکوع کے اختتام پر اعلان ہوتا ہے:

﴿كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ......﴾ (آیت ۱۵۱)

''جیسا کہ ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے اندر ایک رسول تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے......''

اعلان کر دیا گیا کہ محمد ﷺ کی بعثت دراصل اُسی دعاءِ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا ظہور ہے۔ سورۂ آل عمران میں اس مضمون کی پھر تکرار ہوئی ہے:

﴿لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ﴾ (آیت ۱۶۴)

''اللہ نے احسان کیا ہے اہل ایمان پر کہ اس نے ان میں ایک رسول مبعوث کیا انہی میں کا' جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

ان تین مقامات کے بعد چوتھی بار یہی مضمون یہاں سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں' جو اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے' وارد ہوا ہے۔ اور اس طرح ان دونوں سورتوں کے باہم مجتمع ہونے سے وہ حسین وجمیل جوڑا وجود میں آیا جو ایک طرف بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مقصد کو معین کر رہا ہے اور دوسری طرف اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح منہجِ عمل اور بنیادی طریق کار کو معین کر رہا ہے۔

اب ہم ان سورتوں کے مطالعے کا آغاز کرتے ہیں اور اس کے لیے ہمیں اپنے سابقہ معمول سے

قدرے مختلف طریق کار اختیار کرنا ہے‘ اس لیے کہ ان سورتوں کا درس اگر اس نہج پر ہو کہ پہلے ایک ایک آیت پر توجہات کو مرتکز کیا جائے اور پھر ان میں شامل ایک ایک لفظ کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کی جائے تو اندیشہ ہے کہ یہ معاملہ بہت طول اختیار کر جائے گا۔ ان دونوں سورتوں کے درس میں یہ طریق ملحوظ رہے گا کہ اوّلاً ہر سورۃ کی مرکزی آیت کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ وہ اصل سِرا یا ڈور ہاتھ میں آ جائے جس میں یہ موتی پروئے ہوئے ہیں۔ اس مرکزی آیت کو سمجھنے کے بعد پھر مختلف آیات کے ساتھ اس مرکزی مضمون کے ربط و تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی جائے‘ تاکہ بحیثیتِ مجموعی سورۃ کا اصل مفہوم واضح ہو جائے۔ اسی طریقے سے سورۃ الصّف کا مطالعہ ہوگا اور اسی نہج پر‘ اِن شاء اللہ العزیز‘ سورۃ الجمعہ کا مطالعہ ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی دو شانیں

اس سے پہلے کہ ہم سورۃ الصّف کی مرکزی آیت پر غور شروع کریں‘ ایک بنیادی حقیقت کی طرف توجہ کر لینا مفید ہوگا۔ ہماری اس گفتگو میں بار بار نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کا حوالہ آیا ہے۔ تو یہ جان لینا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی دو شانیں ہیں۔ اس لیے کہ اگرچہ آپؐ بھی یقیناً دوسرے انبیاء کی طرح اللہ کے ایک نبی ہیں‘ لیکن آپؐ صرف نبی نہیں بلکہ خاتم النبیین بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ آپ ﷺ کو بھی دیگر رسولوں کی طرح رسالت سے سرفراز کیا گیا ہے‘ لیکن آپؐ صرف ایک رسول نہیں‘ آخر المرسلین بھی ہیں۔ گویا آپؐ کی بعثت کے مقاصد میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو تمام نبیوں اور رسولوں کے پیش نظر تھیں‘ اور اضافی طور پر آپؐ کے مقصدِ بعثت کی ایک خصوصی اور امتیازی شان ختم نبوت اور ختم رسالت کے حوالے سے ہے جس میں آپؐ تمام انبیاء و رُسل میں ممتاز ہیں۔

ختم نبوت اور ختم رسالت کے ایک پہلو سے تو ہم سب خوب اچھی طرح واقف ہیں‘ یعنی یہ کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا‘ نہ کوئی صاحبِ شریعت نبی اور نہ کوئی بغیر شریعت نبی‘ نہ کوئی ظلّی نبی اور نہ ہی کوئی بروزی نبی! آپؐ پر ہر نوع کی نبوت و رسالت ختم ہو گئی‘ لیکن ختم نبوت و رسالت کا دوسرا اور اہم تر پہلو یہ ہے کہ آپؐ پر نبوت و رسالت کا محض اختتام ہی نہیں ہوا‘ اتمام بھی ہوا ہے‘ تکمیل بھی ہوئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا یہ وہ امتیازی پہلو ہے جو بالعموم ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ آپ ﷺ کا بنیادی مقصدِ بعثت یقیناً وہی ہے جو تمام انبیاء اور تمام

رسولوں کا تھا' لیکن آپؐ کے مقصدِ بعثت میں ایک تکمیلی اور اتمامی شان بھی ہے جس کی حیثیت ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کے عکس اور پرتو کی ہے اور اس میں کوئی دوسرا نبی اور رسول آپؐ کے ساتھ شریک نہیں! سورۃ الصّف میں درحقیقت نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے اور اسی کے حوالے سے جہاد و قتال کا موضوع تفصیل سے زیرِ بحث آیا ہے۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے اس بنیادی مقصدِ بعثت کا تعلق ہے جو تمام انبیاء اور رُسل کا مشترکہ مقصدِ بعثت رہا ہے' اس کے بارے میں یہاں کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اس حوالے سے جو فرائضِ نبوت دیگر انبیائے کرام علیہم السلام ادا کرتے رہے وہی فرائض آپ ﷺ کو بھی تفویض ہوئے۔ قرآن حکیم میں کئی مقامات پر اس حقیقت کو بیان کیا گیا کہ:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ﴾ (الکھف:٥٦)

''اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر مبشر اور نذیر بنا کر۔''

بعثتِ انبیاء و رُسل کے ضمن میں یہ اللہ کا ایک عمومی قاعدہ ہے۔ چنانچہ یہی بات رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی قرآن میں وارد ہوئی ہے:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿١٠٥﴾﴾ (بنی اسراء یل)

''اور (اے نبی!) ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔''

اسی طرح ہر نبی اپنی جگہ ہدایت و رہنمائی کا ایک روشن چراغ ہے' ہر نبی معلّم ہے' ہر نبی مربی اور مزکی ہے' ہر نبی داعی ہے' مبلّغ ہے اور مذکر ہے۔ یہ ساری حیثیتیں جملہ انبیاءِ کرام علیہم السلام میں مشترک ہیں۔ چنانچہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ میں بھی یہ تمام حیثیتیں جمع ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک حیثیت کے اعتبار سے بھی نبی اکرم ﷺ ایک امتیازی شان کے حامل ہیں ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!'' تاہم یہ وہ مشترک اوصاف اور حیثیتیں ہیں جو تمام انبیاء و رُسل کو حاصل تھیں۔ سورۃ الاحزاب کی یہ مشہور آیت تمام قارئین کو یاد ہوگی:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٤٥﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾﴾

''اے نبیؐ! ہم نے آپؐ کو بھیجا ہے شاہد (گواہ) بنا کر' مبشر بنا کر اور مُنذر بنا کر (یعنی سیدھی راہ اختیار کرنے والوں کے لیے بشارت دینے والا بنا کر اور فکری و عملی کج روی اختیار کرنے والوں کے لیے خبردار کرنے والا بنا کر)۔ اور اللہ کی طرف بلانے والا اس کے حکم سے اور (ہدایت

کا) ایک روشن چراغ بنا کر۔''

یہ تمام حیثیتیں مشترک ہیں نبی اکرم ﷺ اور جملہ انبیاء و رُسل میں۔ جہاں تک اس بنیادی مقصدِ بعثت کا تعلق ہے اس کے ضمن میں قرآن حکیم کی سب سے جامع اصطلاح ''شہادت علی الناس'' کی ہے۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ الحج کی آخری آیت کے درس میں ''شہادت علی الناس'' کا موضوع تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔ اور وہیں یہ توجہ بھی دلائی گئی ہے کہ یہ مضمون ایک عکسی ترتیب کے ساتھ سورۃ البقرۃ میں بھی جوں کا توں موجود ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (آیت ۱۴۳)

اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے یہ بات بڑی وضاحت سے ہمارے سامنے آئی تھی کہ ختم نبوت و رسالت کے بعد ''شہادت علی الناس'' کی ذمہ داری اب اُمتِ مسلمہ کے کاندھے پر آ چکی ہے۔ اس کے لیے سعی وجُہد' اس کے لیے ایثار و قربانی' اس کے لیے اوقات اور صلاحیتیں کھپانا اور مال و جان کا لگانا درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ ہے۔ یہ مقصدِ اوّلین ہے جہاد فی سبیل اللہ کا! —— اور جہاں تک تعلق ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی اور تکمیلی شان کا' اس کے اعتبار سے بھی ایک فرضِ منصبی اب تا قیامِ قیامت اُمّتِ مسلمہ کے کاندھے پر ہے۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل اب ایک ذمہ داری کے طور پر منتقل ہو چکی ہے آپؐ کے ماننے والوں پر' جو اپنے آپ کو نبی اکرم ﷺ کی شفاعت کا حق دار سمجھتے اور آپؐ سے اپنی نسبت پر فخر کرتے ہیں۔ یقیناً آپ ﷺ کی اُمت میں سے ہونا مسلمانوں کے لیے موجبِ صد افتخار ہے' لیکن جہاں یہ بہت بڑی فضیلت کی بات ہے وہاں اتنی ہی بڑی ذمہ داری کا معاملہ بھی اس سے وابستہ ہے ع

''جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!''

اس پہلو سے سورۃ الصّف کی بڑی اہمیت ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کیا ہے اور اس کے ضمن میں کیا عملی ذمہ داریاں ہیں جو آپؐ کے ماننے والوں پر' آپؐ کی اُمت پر عائد ہوتی ہیں!

نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تعیین

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹﴾

سورۃ الصّف کی یہ آیت‘ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے‘ باعتبارِ مضمون اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے۔ اسی سے اس سورۃ کا عمود معین ہوتا ہے۔ یہ بات بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا بڑا اور مرکزی حصہ جوں کا توں قرآن مجید میں تین مقامات پر وارد ہوا ہے۔ اس تکرار اور اعادے سے دراصل اس مضمون کی اہمیت کی جانب راہنمائی ہوتی ہے۔ یقیناً قرآن مجید میں بعض الفاظ یا مضامین کا بار بار آنا ان کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ”اِزَالَةُ الْخِفَاءِ عَنْ خِلَافَةِ الْخُلَفَاءِ“ میں قرآن کریم کی اہم ترین آیات میں سے شمار کیا ہے۔ بلاشبہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے تعین میں اس آیۂ مبارکہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اسے ”اسلامی انقلاب“ کے لیے عنوان قرار دیا تھا۔ بعض حضرات نے یہ بات نقل کی ہے‘ اگرچہ میں خود اس کی تصدیق نہیں کر پایا‘ کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اس آیۂ مبارکہ کو پورے قرآن مجید کے لیے بمنزلۂ عمود قرار دیا ہے۔ اور اس میں تو ہرگز شک نہیں کہ سیرتِ محمدی ؐ کو سمجھنے اور نبی اکرم ﷺ کے کارنامۂ حیات کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لیے کہ آپ ؐ کی عملی جدوجہد کن کن مراحل سے ہو کر گزری‘ کہاں سے سفر شروع ہوا اور کہاں پر ختم ہوا‘ اس آیت کا سمجھنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ نبوی ؐ کو سمجھنے میں لوگوں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو اگر صرف دوسرے انبیاء پر قیاس کیا جائے تو بہت سی چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

مستشرقین کی کوتاہ فہمی

مستشرقین نے بالخصوص اس معاملے میں بڑا دھوکہ کھایا ہے۔ان کے سامنے نبوت و رسالت کے آئیڈیل حضرت مسیح یا حضرت یحیٰی علیہما السلام ہیں اور ان کی زندگی میں کسی قتال یا جنگ کا سراغ نہیں ملتا۔ چنانچہ مغربی مفکرین اور مستشرقین کو جنگ و قتال کا معاملہ منصبِ رسالت سے بڑا ہی متصادم نظر آتا ہے۔ وہ ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مشہور مؤرخ ٹائن بی کا یہ جملہ بہت مشہور ہے:

"Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman."

ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا جو نقشہ مکی دَور میں سامنے آتا ہے صرف وہی نبوت و رسالت سے مطابقت رکھتا ہے' جبکہ وہاں سے آپؐ کو ہجرت کرنا پڑی۔ گویا ان کے خیال میں بحیثیتِ نبی اور رسول آپ ﷺ ناکام ہو گئے۔(معاذ اللہ)۔اس کے برعکس مدنی دَور میں جو نقشہ ان کے سامنے آتا ہے اس میں انہیں آنحضور ﷺ ایک حکمران' ایک مدبّر' ایک سیاست دان اور ایک سپہ سالار کی حیثیت میں نظر آتے ہیں اور اس پہلو سے وہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ کامیابی کی انتہاؤں کو چھو رہے ہیں۔اور واقعہ یہ ہے کہ کون اندھا ہوگا کہ جس کی نگاہیں آپؐ کی عظمت کے احساس سے جھک نہ جائیں کہ کامیابی گویا اپنے آخری اور تکمیلی درجے میں محمد ﷺ کے قدم چومتی نظر آتی ہے۔لیکن یہاں مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے یہ گرہ لگا دی کہ یہ کامیابی بحیثیتِ مدبّر (statesman) تھی' بحیثیتِ نبی نہیں تھی۔ اسی مغالطے کو پیدا کرنے کے لیے سر منٹگمری واٹ نے سیرتِ نبویؐ پر جو کتاب لکھی اسے دو حصوں میں تقسیم کیا:''Muhammad at Mecca'' اور ''Muhammad at Madina'' اور اس طرح اس نے مکی اور مدنی دَور کے ظاہری تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔اگرچہ نبی اکرم ﷺ کی تعریف میں اس نے کہیں بخل سے کام نہیں لیا' بلکہ اس نے نبی اکرم ﷺ کو نسلِ آدم کے عظیم ترین افراد میں شمار کیا ہے۔آپؐ کے تدبّر' آپؐ کی فراست' آپؐ کی معاملہ فہمی' آپؐ کی پیش بینی' آپؐ کی دُور اندیشی' ان تمام اعتبارات سے اس نے آپؐ کی صلاحیتوں کا لوہا مانا ہے اور آپؐ کی تعریف میں آخری حد تک چلا گیا ہے۔لیکن اس مٹھاس کے اندر اس نے بڑے لطیف پیرائے میں ایک زہر بھی

شامل کر دیا ہے۔ وہ زہر یہی ہے کہ وہ لوگ یہ تصور دینا چاہتے ہیں کہ آپ ؐ کی یہ تمام کامیابیاں ایک سیاست دان اور ایک مدبّر کی حیثیت سے تھیں، نبی کی حیثیت سے نہیں تھیں۔ یہ سارا مغالطہ اسی بنیاد پر ہے کہ ختم نبوت اور تکمیلِ رسالت کے لازمی اور منطقی تقاضے کو نہیں سمجھا گیا۔ اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ سیرتِ محمدیؐ کے صحیح فہم کے لیے یہ آیۂ کریمہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

رسولِ کامل ﷺ

اس تمہید کے بعد اب ذرا اس آیۂ مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ ﴿هُوَ الَّذِیْٓ﴾ ''وہی ہے وہ''۔ یہاں اشارہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف۔ اس لیے کہ سورۃ الصّف میں جو آیت اس آیت سے متصلاً قبل وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ: ﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸﴾ ''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں، اور اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا، خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو''۔ اس پہلو سے جب ''هُوَ'' سے اگلی آیت شروع ہوئی تو معین ہو گیا کہ اس سے مراد ہے ذاتِ باری تعالیٰ۔

آگے چلیے: ﴿اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ﴾ ''(وہی ہے اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو''۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ذکر ہے محمد ﷺ کا۔ عربی زبان میں اَرْسَلَ، یُرْسِلُ، اِرْسَالًا کا مفہوم ہے بھیجنا۔ یعنی کسی کو ایلچی بنا کر، سفیر بنا کر یا پیغمبر بنا کر بھیجنا۔ یہاں آنحضور ﷺ کے حوالے سے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مختلف انبیاء و رُسل (علیہم السلام) کے اَسماء کے ساتھ ان کی بعض خصوصی نسبتوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ صفی اللہ کے الفاظ معروف ہیں۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو نجی اللہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح اللہ، حضرت موسٰی علیہ السلام کو کلیم اللہ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کو روح اللہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اس فہرست میں حضرت محمد ﷺ کے نام کے ساتھ ''رسول اللہ'' ہی کے الفاظ معروف و مشہور ہیں۔ غور کرنے پر یہ حقیقت کھلے گی کہ اگرچہ نوح علیہ السلام بھی اللہ کے رسول تھے، موسٰی علیہ السلام بھی اللہ کے رسول تھے، عیسٰی علیہ السلام بھی اللہ کے رسول تھے، لیکن اس لفظ ''رسول'' کا مصداقِ کامل اور مصداقِ اَتم ہیں محمدٌ رسول اللہ ﷺ۔ رسالت کا ادارہ تکمیل کو پہنچا ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں۔ گویا آپ ؐ کا امتیازی لقب یا امتیازی شان ہی یہ ہے کہ آپ ''رسول اللہ'' ہیں۔ سورۃ الفتح میں آپ ﷺ کی اسی نسبت کو نمایاں کیا گیا ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ......﴾ (آیت ۲۹)
''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت ہیں' آپس میں رحم دل ہیں......''اس میں گویا اس حقیقت کی جانب ایک لطیف اشارہ موجود ہے جس کی جانب پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے کہ رسالت اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذات میں۔

''اَلْھُدٰی''اور''دِیْنِ الْحَقّ''

اب آگے بڑھیے: ﴿بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ ''الہدیٰ اور دینِ حق دے کر''۔حرفِ''ب'' عربی میں کسی چیز کی معیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مفہوم یہ ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا ہے: (۱) الھدیٰ اور (۲) دین الحق ۔الہدیٰ سے مراد ہے ہدایتِ کاملہ' وہ کتابِ ہدایت کہ جس نے ہدایت کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہو' سمیٹ لیا ہو' سمو لیا ہو۔اس کی تعیین کے ضمن میں اگر قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ اس سے مراد خود قرآن ہے۔اس لیے کہ اسی قرآن کے لیے سورۃ البقرۃ کے بالکل آغاز میں ''ھُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' کے الفاظ آئے ہیں۔اسی کو''ھُدًى لِّلنَّاسِ'' قرار دیا گیا ہے۔اور یہی قرآن ہے جس کے بارے میں سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ......﴾ (آیت ۹) ''درحقیقت یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے......''تو معلوم ہوا کہ''الہدیٰ'' سے مراد ہے قرآن حکیم۔دوسری چیز جسے آپ ﷺ کو دے کر بھیجا گیا' وہ''دینِ حق'' ہے۔یہاں''دین الحق'' عربی نحو کے اعتبار سے مرکب اضافی کی صورت میں ہے۔اس اعتبار سے اس کے معنی ہوں گے''حق کا دین'' تاہم عربی میں بعض اوقات مرکبِ توصیفی مرکبِ اضافی کی شکل میں آ جاتا ہے۔اس صورت میں اس کا ترجمہ ہوگا: حق دین یا سچا دین۔ ویسے ان دونوں صورتوں میں مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لیے کہ اسے اگر حق کا دین قرار دیں تو بھی درست ہے' کیونکہ قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر اللہ کو''الحقّ'' کہا گیا ہے۔جیسے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ (الحج: ۶) ''یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے''۔مجسم حق اور کامل حق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ گویا''حق کا دین'' کے معنی ہوں گے اللہ کا دین۔اور اگر اسے مرکبِ توصیفی مان کر''سچا دین'' ترجمہ کیا جائے تو بھی بات وہیں جا پہنچے گی' اس لیے کہ سچا ترین دین تو اللہ ہی کا ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کے دین سے کیا مراد ہے؟ لفظ دین پر غور کیجیے! یہ لفظ اس سے پہلے سورۃ

الفاتحہ کے درس میں ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ '' کے ضمن میں زیر بحث آ چکا ہے۔ وہاں پر عرض کیا گیا تھا کہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے جزا وسزا اور بدلہ۔ مشہور مصرعہ ہے: ع دِنّاھُمْ كَمَا دَانُوْا کہ جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ معاملہ کیا تھا ویسا ہی ہم نے ان سے کر دیا۔ یعنی ہم نے ان کے عمل کا انہیں پورا پورا بدلہ دے دیا ہے۔ اسی طرح ایک معروف کہاوت ہے: كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ '' جیسا کرو گے ویسا بھرو گے''۔ عربی زبان میں ''دَيْنٌ'' کہتے ہیں قرض کو' کہ وہ لوٹ کر آ تا ہے۔ جس طرح کسی عمل کی جزا عمل کرنے والے کی طرف لوٹ کر آتی ہے اسی طرح ''دَيْن'' (قرض) دینے والے کو واپس ملتا ہے۔ تو لفظ دِين کے اصل لغوی معنی بدلے اور جزا وسزا کے ہیں۔ لیکن قرآن مجید نے جب اس لفظ کو اس اصل لغوی اساس سے اٹھا کر اسے اپنی ایک اصطلاح بنایا تو اس میں ایک اضافی مفہوم شامل ہو گیا۔ چنانچہ قرآنی اصطلاح میں لفظ دین بالعموم قانون' ضابطہ اور شریعت کے معنوں میں آتا ہے' اس لیے کہ جزا وسزا کے ساتھ کسی نہ کسی قانون اور ضابطے کا تصور لازم وملزوم ہے۔ پھر اس میں اضافی مفہوم پیدا ہوا اطاعت کا۔ قرآن حکیم میں متعدد بار ''مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ '' کے الفاظ آئے ہیں' یعنی ''اطاعت کو اس (اللہ ہی) کے لیے خالص کرتے ہوئے''۔ اس لیے کہ کسی قانون یا ضابطے کی اگر اطاعت کی جائے گی تو جزا ملے گی' اور اگر اس کی خلاف ورزی ہوئی تو سزا ملے گی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن مجید نے جب اسے دِيْنُ اللّٰهِ (النصر:۱) کی مرکب شکل میں ایک گھمبیر اصطلاح کا درجہ دیا تو اس میں جو مفہوم پیدا ہوا اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے! کسی ہستی کو مطاعِ مطلق مان کر اس کے قانون کے تحت جو زندگی بسر کی جائے گی وہ زندگی گویا اس کے دین کے اندر رہتے ہوئے گزاری جا رہی ہے۔ یہ ہے دین کا گھمبیر' ہمہ گیر اور جامع تصور جسے قرآن مجید نے ایک بہت اہم اصطلاح کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔

چنانچہ اس تناظر میں غور کیجیے کہ اگر کسی جگہ بادشاہت کا نظام قائم ہے' ایک فردِ واحد کو ہی حاکمِ مطلق (sovereign) ہونے کی حیثیت حاصل ہے' اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے تو یہ گویا کہ ''دِيْنُ الْمَلِكِ '' ہے۔ اس لیے کہ اس نظام میں بادشاہ مطاعِ مطلق ہے۔ یہ لفظ بعینہٖ اسی مفہوم میں سورۂ یوسف میں وارد ہوا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے ایک خاص واقعے کے ضمن میں ''دِيْنُ الْمَلِكِ '' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ واقعہ لمبا ہے' مختصراً یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر میں ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہو چکے تھے اور ان کے بھائی قحط کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُن کے

پاس غلہ حاصل کرنے کے لیے آئے تو انہوں نے اپنے حقیقی بھائی بن یامین کو' جسے انہوں نے خاص طور پر فرمائش کر کے بلوایا تھا' اپنے پاس روکنا چاہا' لیکن چونکہ انہوں نے خود کو اپنے بھائیوں پر ظاہر نہیں کیا تھا' بلکہ بھائی اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ ان کا واسطہ جس ''عزیزِ مصر'' سے ہے وہ ان کا بھائی یوسف ہے' لہٰذا بن یامین کو اپنے پاس روکنے کا کوئی معقول سبب بظاہر سجھائی نہیں دیتا تھا' تب اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص طریقہ سجھایا اور ایک خصوصی تدبیر کے ذریعے وہ اپنے بھائی کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ سورۂ یوسف میں اس پورے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا: ﴿مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْـمَلِكِ......﴾ (آیت ۷۶) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اُس بادشاہی نظام کے اندر رہتے ہوئے (جس میں وہ خود ایک اہم عہدہ پر فائز تھے) یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی بن یامین کو روک سکتے۔ تو یہ بات واضح ہو گئی کہ کسی فردِ واحد کو مختارِ مطلق اور مطاعِ مطلق مان کر اس کے تحت جو اجتماعی نظام کسی جگہ پر قائم ہو گا اسے دِيْنُ الْـمَلِكِ کہا جائے گا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے آپ دورِ جدید کے مقبول ترین نظام یعنی جمہوریت کو ''دِيْنُ الْجَمْهُوْرِ'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نظام میں اصل حاکمیت جمہور کی ہے۔ ان کے نمائندے کثرتِ رائے سے جس چیز کو چاہیں جائز قرار دے دیں اور جس چیز کو چاہیں ناجائز قرار دے دیں۔ یہ ایک مکمل نظام ہے' پورا دین ہے' جسے بجا طور پر دین جمہور قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر میں غور کیجیے کہ ''دین اللہ'' اور ''دین حق'' کا مفہوم کیا ہو گا! وہ نظام جس میں اللہ ہی کو مطاعِ مطلق تسلیم کیا جائے' حاکمیتِ مطلقہ (sovereignty) صرف اسی کے لیے ہو۔ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی' باقی بتانِ آزری!

اس اصول پر مبنی پورے نظامِ زندگی کا جو مکمل ڈھانچہ استوار ہو گا وہ کہلائے گا ''دین اللہ''۔ یہ ''دین اللہ'' یا ''دین حق'' ہے جو نبی اکرم ﷺ کو دے کر مبعوث فرمایا گیا تھا۔ یہ وہ دوسری چیز ہے جو آپؐ کو عطا ہوئی تھی۔ ذہن نشین کر لیجیے کہ پہلی چیز جو آپؐ کو عطا ہوئی وہ ہے ''الہدیٰ'' یعنی قرآن حکیم اور دوسری شے جو دے کر آپؐ مبعوث فرمائے گئے اسے قرآن نے ''دِيْنُ الْحَقِّ'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی عدل و قسط پر مبنی ایک مکمل نظامِ اجتماعی' ایک مکمل ضابطۂ حیات' ایک کامل نظامِ اطاعت جس میں زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں ضابطہ و قانون موجود ہے۔

یہاں ذہن میں ایک سوال یہ آ سکتا ہے کہ کیا قرآن میں کامل نظام نہیں ہے؟ ''الہدیٰ'' کے بعد حرف ''وٗ'' واوِعطف ہے اور واوِعطف مغائرت کا متقاضی ہے۔ پھر کیا ''دین الحق'' قرآن سے کوئی جدا شے ہے؟ تو واقعہ یہی ہے کہ صرف قرآن پر مبنی کوئی نظام نہیں ہوسکتا۔ قرآن میں صرف اصول دیے گئے ہیں اور زندگی کے ہر گوشے کے متعلق صرف حدود کو معین کر دیا گیا ہے۔ ایک مکمل نظام اگر بنتا ہے تو وہ قرآن پر سنتِ رسولؐ کے اضافے سے بنتا ہے۔ اس خاکے کے اندر اگر رنگ بھرا جا سکتا ہے تو وہ سنت رسولؐ کے اضافے سے بھرا جا سکتا ہے۔ ایک مکمل نظام کی تشکیل کتاب اور سنت دونوں کے مجموعے سے ہوگی۔ یہ بات اس سے پہلے بھی عرض کی گئی ہے کہ ہمارے ہاں پاکستان کی جو بھی کبھی کوئی دستوری دستاویز بنی ہے تو اس میں یہ الفاظ صحیح طور پر شامل ہوئے ہیں:

"No legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

اس لیے کہ قرآن وسنت کے اجتماع ہی سے دینِ حق مکمل ہوتا ہے اور ایک پورا نظام تشکیل پاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے لیے وقت کی تعیین

اب آگے بڑھنے سے پہلے ایک اہم علمی حقیقت کی طرف توجہ مبذول فرمالیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ اب ذرا ذہن کے سامنے ایک سوالیہ نشان لائیے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت کا وقت معین کرنے میں اللہ کی کون سی حکمت تھی؟ اس کی تفتیش کیجیے تو عجیب حقائق سامنے آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کرۂ ارضی پر نسلِ انسانی کی تاریخ اور تاریخ نبوت دونوں ساتھ ساتھ چلی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان ہی نہیں پہلے نبی بھی تھے۔ انسانیت اور نبوت کے یہ قافلے ساتھ ساتھ چلے ہیں اور دونوں قافلوں نے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ انسان نے بھی ارتقائی مراحل طے کیے ہیں اور نبوت ورسالت میں بھی ایک ارتقاء کا عمل جاری رہا ہے۔ اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے آج سے چودہ سو برس پہلے دو اعتبارات سے عہدِ طفولیت سے قدم نکال کر اپنی جوانی میں قدم رکھا ہے۔ قرآن مجید میں الفاظ آتے ہیں: ﴿حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ﴾ (الاحقاف: ۱۵) ''جب وہ اپنی پوری قوت (پختگی) کو پہنچ گیا......''۔ تو نسلِ انسانی بحیثیتِ مجموعی دو اعتبارات سے ایک بلوغ اور پختگی کو پہنچی ہے اُس وقت جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ انسانی ذہن اور اس کے فکر وشعور کے ارتقاء کا ایک عمل مسلسل جاری رہا ہے۔ اور جس طرح ایک بچے پر عہدِ طفولیت کے بعد لڑکپن، جوانی اور پھر عقل کی

پختگی کے سارے اَدوار آتے ہیں اسی طرح نسلِ انسانی ان تمام مراحل سے گزری ہے۔ انسان کو کامل اور مکمل ہدایت روزِ اوّل سے نہیں دی جا سکتی تھی۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ ''نعوذ باللہ من ذٰلک'' اُس وقت اللہ کے پاس کامل ہدایت تھی نہیں۔ بلکہ اللہ کے پاس تو تھی' لیکن انسان ابھی اس قابل نہ تھا کہ اُس کو حاصل کر سکتا۔ ذہنی اور فکری اعتبار سے وہ ابھی اس سطح تک نہ پہنچا تھا کہ اس کو ابدی ہدایت نامے کا اہل سمجھا جاتا۔ لہٰذا عبوری دَور میں ہدایات دی جاتی رہیں' کتابیں نازل ہوتی رہیں' صحیفے اُترتے رہے' ابتدائی احکام دیے جاتے رہے' تا آنکہ انسان اپنی عقل وشعور کی پختگی کو پہنچ گیا اور فکر کی سطح کے اعتبار سے اس کا اہل ہو گیا کہ ابدی ہدایت نامہ اب اسے دے دیا جائے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی ہے۔

نوعِ انسانی کی ذہنی وفکری بلوغت کا دَور

میں یہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب مرحوم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں' جو اگرچہ معروف تو کچھ دوسرے اعتبارات سے تھے' انہوں نے علامہ اقبال کی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں جن لوگوں سے مل سکا ہوں ان میں مجھے اپنے محدود علم کے مطابق فلسفہ' تاریخِ فلسفہ' تاریخ مذاہب اور منطق وغیرہ میں مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان کی ٹکر کا نہیں ملا۔ انہوں نے ایک روز برسبیلِ تذکرہ یہ بات کہی کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کے بارہ سو برس بڑے اہم اور بہت productive ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بارہ سو سال کے دوران انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا اور اس کی سوچ اپنی پختگی کو پہنچ چکی۔ یہ ہیں چھ سو قبل مسیح سے لے کر چھ سو بعد مسیح تک کے بارہ سو برس' جن کے دوران تمام مکتبہ ہائے فکر' تمام مدارسِ فلسفہ اور تمام مذاہب جو بھی پیدا ہونے تھے' ہو چکے' اس کے بعد کوئی نیا مذہب اور کوئی نیا فلسفہ وجود میں نہیں آیا۔ دَورِ حاضر میں یہ سارے جو نام لیے جاتے ہیں اور بڑی بھاری بھرکم اصطلاحات میں مغرب کے جو نئے فلسفے سمجھے جاتے ہیں' وہ Logical Positivism ہو یا Existentialism ہو' یہ سب نئے لیبلوں سے نئی بوتلوں میں پرانی شرابوں کے سوا کچھ نہیں۔ انسان جو کچھ بحیثیتِ انسان سوچ سکتا تھا وہ چھ سو بعد مسیح تک سوچ چکا تھا اور اس کی فکر پختہ ہو چکی تھی۔

چشتی صاحب مرحوم سے یہ بات سن کر میرا ذہن فوراً منتقل ہوا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کا گہرا تعلق ہے بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے زمانے اور وقت کے تعین کے

ساتھ کہ جب انسان سوچ چکا جو کچھ کہ وہ سوچ سکتا تھا' سقراط' ارسطو اور افلاطون اپنے نظریات دنیا کے سامنے رکھ چکے' فلاسفۂ ہند نے عقل کی جو بھی جولانیاں ہوسکتی تھیں وہ دکھالیں' فلاسفۂ یونان اور فلاسفۂ چین اور ایران انسان کو جو کچھ دے سکتے تھے دے چکے' تب وہ الکتاب اور الھُدیٰ اس دعوے کے ساتھ نازل ہوئی کہ یہ ہدایتِ تامّہ ہے' یہ آخری اور مکمل ہدایت ہے جو اَب انسان کو دی جا رہی ہے۔اور آپ غور کیجیے' اس حقیقت کا اس سے بڑا گہرا تعلق ہے کہ اللہ نے اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے' ازروئے الفاظِ قرآنی:﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ (الحِجر) ''یقیناً ہم نے ہی اس الذکر (قرآن مجید) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔سوچئے' تورات بھی اللہ ہی کی کتاب تھی' اگر اللہ اس کی حفاظت کا ذمہ لیتا تو کیا اس میں تحریف ممکن ہوتی ؟ بلکہ میں اس کے برعکس یوں کہوں گا کہ اگر قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہوتا تو کیا ہم قرآن مجید کو بخش دیتے ؟ کیا اُمتِ مسلمہ اس میں تحریف نہ کر دیتی ؟ کیا معنوی تحریف ہمارے ہاں نہیں ہوئی ؟ یہ جو حفاظتِ خصوصی قرآن کو دی گئی اور تورات' زبور اور انجیل کو نہ دی گئی' اس کا کیا سبب ہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ ان کتابوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ کی جناب میں یہ شکوہ کریں کہ پروردگار! یہ ہم سے سوتیلی بیٹیوں والا معاملہ کیوں ہوا؟ ہم بھی تیری کتابیں تھیں' ہمیں تو نے تحفظ کیوں نہ دیا؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ ابھی عبوری دَور کی ہدایات تھیں' جب نسلِ انسانی ابھی عقل اور شعور کی منزلیں طے کر رہی تھی۔اس عبوری دَور کی حفاظت لازمی نہ تھی۔ان کو مستقل بنانا اور محفوظ رکھنا ضروری نہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ ایک ہی کتاب ہے جس کے سابقہ ایڈیشن پہلے دیے گئے اور یہ اسی کا کامل اور مکمل آخری ایڈیشن ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا۔

اجتماعی شعور کی پختگی

اب آیئے دوسرے مضمون کی طرف!''دِیْنِ الْحَق '' کے الفاظ میں درحقیقت نسلِ انسانی کے ایک اور اعتبار سے بلوغ کو پہنچنے کی طرف اشارہ بھی ہے۔اس سے پہلے بھی بعض مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں کہ انسان نے انفرادیت سے تدریجاً اجتماعیت کا سفر طے کیا ہے۔کبھی صرف ایک قبیلے کی زندگی تھی' پھر شہری ریاستیں وجود میں آئیں' پھر بڑی بڑی مملکتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں۔ یہ عظیم سلطنتوں کا دَور تھا جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔اُس وقت قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں قائم تھیں جن کے مابین تاریخ کئی سو برس سے جھولا جھول رہی تھی۔ان سلطنتوں کی لکھوکھا کی تعداد میں

مستقل اور تیار فوجیں (standing armies) تھیں۔ یہ تربیت یافتہ مسلح افواج تھیں۔ یہ وہ دَور تھا جبکہ محمد عربی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے۔ گویا کہ انسان اجتماعی اعتبار سے بھی اب اس سطح پر آ گیا تھا کہ اس کی ضرورت اب ایک اجتماعی نظام کی تھی۔ صرف انفرادی اخلاقیات اب اس کی ضرورت کی کفالت نہ کر سکتے تھے۔ انفرادی اخلاقیات کے اعتبار سے حضرت مسیح علیہ السلام کہیں پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن اب ضرورت تھی ایک اجتماعی نظام کی' ایک ایسے نظامِ عدل وقسط کی جس میں انسانی زندگی کے جو بھی متصادم (conflicting) تقاضے ہیں ان کو اس طریقے سے سمو دیا جائے کہ ان میں اعتدال بھی ہو اور توازن بھی ہو' کوئی تقاضا کسی دوسرے تقاضے کے نیچے دب نہ جائے' انفرادیت بھی مجروح نہ ہو اور اجتماعیت کے حقوق بھی محفوظ رہیں۔ مرد کی قوامیت بھی مجروح نہ ہو اور عورت کے حقوق بھی اس طرح پامال نہ ہو جائیں کہ وہ بھیڑ بکری کی طرح صرف ملکیت بن کر رہ جائے۔ اسی طرح زندگی کے اندر جو مختلف پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں اور جو مختلف نزاعات وجود میں آ چکے تھے انسان کو اُن سب کا ایک معتدل اور متوازن حل درکار تھا۔ یہ ہے اس دَور کے انسان کی اصل ضرورت! اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے انسان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ وہ ایک دین لے کر آئے' ایک نظام لے کر آئے۔ یہ نظامِ اجتماعی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا نظام ہے اور یہ توازن اور اعتدال کی ایک عجیب کیفیت اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہی توازن اور اعتدال ہے جس کی وجہ سے سورۃ الحدید میں اس دینِ حق کو ''اَلۡمِیۡزَان'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ میزان ہے' یہ تول دینے والی شے ہے' افراد کے حقوق کو معین کرنے والی' عورت اور مرد کے حقوق واختیارات اور فرائض کو معین کرنے والی اور تول دینے والی میزان ہے۔ یہ فرد اور اجتماعیت کے مابین اور سرمائے اور محنت کے مابین توازن پیدا کرنے والی میزان ہے' جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو دینِ حق کی شکل میں دے کر بھیجا گیا۔

''لِیُظۡهِرَهٗ'' کا مفہوم

اس کا لفظی ترجمہ ہوگا ''تاکہ وہ غالب کر دے اُس کو''۔ اس میں جو ضمیریں وارد ہوئی ہیں ان کے بارے میں مفسرین کے ہاں ایک سے زائد آراء موجود ہیں۔ چنانچہ اس لفظ کا ہمیں تفصیلاً تجزیہ کرنا ہوگا۔ ایک ترجمہ اس کا یہ کیا گیا ہے: ''تاکہ اللہ غالب کر دے اس دین کو''۔ اسی طرح یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے: ''تاکہ اللہ غالب کر دے محمد (ﷺ) کو''۔ اور ایک ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے: ''تاکہ محمدؐ غالب کر دیں اس دین کو''۔ ضمیرِ فاعلی اور ضمیرِ مفعولی کے مراد مختلف معین کرنے کی وجہ سے درحقیقت

ترجموں میں یہ فرق واقع ہوا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظی فرق کے باوجود اس کے اصل مفہوم اور معنیٰ میں ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لفظ ''اظہار'' پر غور کیجیے۔ ظَھَرَ ' یَظْھَرُ کا مفہوم ہے کسی چیز کا ظاہر ہو جانا۔ اور اسی میں ایک مفہوم غالب ہو جانے کا بھی شامل ہے' اس لیے کہ کوئی چیز نمایاں اور ظاہر اُس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے ماحول پر غالب ہوتی ہے۔ اسی سے بابِ افعال میں مصدر بنا ہے ''اِظہار'' یعنی غالب کر دینا۔ اس کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ عربی زبان میں ظَھُر کہتے ہیں پیٹھ کو۔ کسی کی پیٹھ پر سوار ہو جانا اُس پر غالب ہونے کے مترادف ہے۔ تو اِظہار کا یہ مفہوم مسلّم ہے۔

لِیُظْھِرَہٗ کی ضمیرِ فاعلی کے بارے میں جو دو رائیں ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کا مدلول ایک ہی ہے۔ چنانچہ ''غالب کرنے والا'' خواہ اللہ کو قرار دیا جائے خواہ رسول اللہ ﷺ کو' حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو صرف اللہ ہی ہے۔ اگرچہ اس دنیا میں بظاہر ہم محنت و مشقت سے روزی کماتے ہیں' لیکن ہمارا رازق اللہ ہی ہے۔ انسان تو محض کاسبِ اعمال ہے' خالقِ اعمال صرف اللہ ہے۔ چنانچہ اس عمل ''اظہار'' کے کرنے والے عالمِ اسباب میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ ہیں' اور عالمِ حقیقت میں اس کا فاعل اللہ ہے۔ لہٰذا مراد اور معنی کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح کہ سورۃ الانفال میں غزوۂ بدر کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ﴾ (آیت ۱۷) کہ اے مسلمانو! یہ ستر سردارانِ قریش جو تمہارے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوئے ہیں' انہیں تم نے قتل نہیں کیا' بلکہ درحقیقت اللہ نے انہیں قتل کیا ہے' اور اے نبیؐ! وہ مٹھی بھر کنکر جو آپ نے لشکرِ کفار کی طرف پھینکے تھے تو وہ آپؐ نے نہیں پھینکے تھے' اللہ نے پھینکے تھے۔ معلوم ہوا کہ عالمِ واقعہ میں یا بالفاظِ دیگر عالمِ اسباب میں غلبۂ دین کے لیے محنت' جدّ و جہد' سرفروشی اور جہاد و قتال کرتے نظر آتے ہیں محمد ﷺ اور آپؐ کے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' لیکن حقیقت کی سطح پر فاعلِ حقیقی صرف اللہ ہے۔

اسی طرح کا معاملہ لِیُظْھِرَہٗ میں شامل ضمیرِ مفعولی کا ہے۔ چنانچہ اس سے خواہ دین کو غالب کرنا مراد لیا جائے چاہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو' مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ آنحضور ﷺ کی جدوجہد کا مقصود ہرگز اپنی ذات کا غلبہ نہ تھا۔ یہ بھاگ دوڑ اور سعی و جہد اپنی یا

اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کے لیے ہرگز نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا غلبہ درحقیقت اللہ کے دین کا غلبہ تھا۔ لہٰذا لفظی ترجمہ چاہے جو بھی کیا جائے اور ضمیروں کے مراجع کے بارے میں خواہ کوئی بھی رائے قائم کی جائے' مفہوم ایک ہی رہے گا۔

اب تک اس آیۂ مبارکہ میں جو کچھ مضمون آیا ہے اسے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اللہ نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو دو چیزیں دے کر: (۱) الہدیٰ اور (۲) دین حق۔ کیوں بھیجا؟ اس کا جواب درحقیقت اس لفظ **لِیُظۡهِرَهٗ** میں بیان ہوا ہے۔ یعنی اس لیے بھیجا تا کہ اس دین حق کو غالب کر دے پورے نظامِ زندگی پر (**عَلَى الدِّیۡنِ کُلِّهٖ**)۔

لفظ ''دین'' کے ترجمہ میں بھی ہمارے ہاں کچھ اختلاف رہا ہے۔ بعض لوگوں نے ''تمام اَدیان'' ترجمہ کر دیا ہے' بعض نے ''سب دین'' ترجمہ کیا ہے' اسی طرح بعض لوگوں نے اس سے ''کُل دین'' اور بعض نے ''جنسِ دین'' مراد لیا ہے۔ یہ مؤخر الذکر ترجمہ درحقیقت اصل مفہوم سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ گویا اس کا اصل مفہوم اور معنی یہ ہوگا کہ یہ دین حق غالب ہو جائے پورے جنسِ دین پر۔ پورے نظامِ زندگی پر اللہ کا نظام اس شان سے قائم ہو جائے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے مستثنیٰ نہ رہے۔ اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدل و قسط زندگی پر بحیثیت ایک وحدت اور ایک ''organic whole'' کے نافذ و غالب ہو جائے۔ یہ ہے مقصد محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا۔

''دین'' اور ''مذہب'' میں فرق

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ لفظ ''دین'' اور لفظ ''مذہب'' میں مفہوم کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کو مذہب کہا جاتا ہے' لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں اور حدیث کے پورے ذخیرے میں اسلام کے لیے مذہب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا' بلکہ اس کے لیے ہمیشہ ''دین'' ہی کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۟ ﴾ (آیت ۱۹) ''یقیناً اللہ کے ہاں (اُس کی بارگاہ میں مقبول) دین تو صرف اسلام ہے''۔ دین اور مذہب میں بنیادی فرق کو سمجھ لیجیے! مذہب ایک جزوی حقیقت ہے۔ یہ صرف چند عقائد (dogma) اور کچھ مراسمِ عبودیت (rituals) کے مجموعے کا نام ہے۔ جبکہ دین سے مراد ہے ایک مکمل نظام جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ گویا مذہب کے مقابلے میں دین ایک بڑی اور جامع حقیقت ہے۔ اس پس منظر میں اگرچہ یہ کہنا تو شاید درست نہ ہوگا کہ اسلام مذہب نہیں

ہے' اس لیے کہ مذہب کے جملہ عناصر (elements) بھی اسلام میں شامل ہیں' اس میں عقائد کا عنصر بھی ہے' ایمانیات ہیں' پھر اس کے مراسمِ عبودیت ہیں' نماز' روزہ ہے' حج اور زکوٰۃ ہے۔ چنانچہ صحیح یہ ہوگا کہ یوں کہا جائے کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں' ایک دین ہے۔ اس میں جہاں مذہب کا پورا خاکہ موجود ہے وہاں یہ ایک مکمل نظامِ زندگی بھی ہے' بلکہ اصلاً یہ دین ہے۔

اب اس حوالے سے ایک اہم حقیقت پر غور کیجیے! کسی ایک خطۂ زمین میں مذاہب تو بیک وقت بہت سے ہو سکتے ہیں' لیکن دین ایک وقت میں صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ نظام تو لازماً ایک ہی ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کسی خطۂ زمین پر یا کسی ایک ملک میں بیک وقت قائم ہوں! حاکمیت (sovereignty) تو کسی ایک ہی کی ہوگی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ملوکیت اور جمہوریت دونوں بیک وقت کسی ملک میں نافذ ہو جائیں۔ نظام ایک ہی رہے گا۔ اللہ کا نظام ہوگا یا غیر اللہ کا ہوگا۔ نظام دو ہرگز نہیں ہو سکتے' جبکہ ایک خطۂ زمین میں مذاہب بیک وقت بہت سے ممکن ہیں۔ [1] ہاں نظاموں کے ضمن میں ایک امکانی صورت پیدا ہوسکتی ہے کہ ایک نظام غالب و برتر ہو' اور وہی حقیقت میں ''نظام'' کہلائے گا' اور دوسرا نظام سمٹ کر اور سکڑ کر ایک مذہب کی شکل اختیار کر لے اور اس کے تابع زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ ہے درحقیقت ایک امکانی حالت! میرا ذہن منتقل ہوا علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف کہ: ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

دین کب مذہب کی شکل اختیار کرتا ہے؟

دین جب مغلوب ہوتا ہے تو ایک مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت میں وہ دین نہیں رہتا' بلکہ مذہب بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اسلام کے دَورِ عروج میں غالب نظام تو اسلام کا تھا' لیکن اس دین کے تابع یہودیت' مجوسیت اور نصرانیت مذاہب کی حیثیت سے برقرار تھے۔ انہیں یہ رعایت دی گئی تھی اور صاف الفاظ میں سنا دیا گیا تھا کہ اگر وہ اسلامی حدود کے اندر رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے ہاتھ سے جزیہ دینا ہوگا اور چھوٹے بن کر رہنا ہوگا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿......یُعۡطُوا

(۱) یہ بات اس حقیقت سے بہت مشابہ ہے جو ایک کہاوت کے طور پر بیان کی جاتی ہے کہ دس درویش ایک گدڑی میں گزارا کر سکتے ہیں' لیکن دو بادشاہ ایک سلطنت میں اکٹھے نہیں رہ سکتے!

الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ (التوبۃ) ''......وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں''۔ملکی قانون (law of the land) اللہ کا ہوگا' غالب نظام اللہ کا ہوگا' اس کے تحت اپنے پرسنل لاء میں اور اپنی ذاتی زندگی میں محدود سطح پر وہ اگر اپنے مذاہب اور اپنے عقائد و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں تو اس کی انہیں اجازت ہوگی۔اسلام کے دَورِ زوال و انحطاط میں یہ صورت برعکس ہوگئی۔یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس برعظیم میں دین انگریز کا تھا' law of the land اُس کا تھا۔ دینِ انگریز کے تحت اسلام نے سمٹ کر ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی تھی کہ نمازیں جیسے چاہو پڑھو' انگریز کو کوئی اعتراض نہ تھا' اذانیں بخوشی دیتے رہو' وراثت اور شادی بیاہ کے معاملات بھی اپنے اصول کے مطابق طے کرلو' لیکن ملکی قانون انگریز کی مرضی سے طے ہوگا۔ یہ معاملہ تاجِ برطانیہ کی sovereignty کے تحت ہوگا' اس میں تم مداخلت نہیں کر سکتے! یہ تھا وہ تصور جس کے بارے میں اقبال نے بڑی خوبصورت پھبتی چست کی تھی :ؔ

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

یعنی اسلام آزاد کہاں ہے؟ وہ سمٹ سکڑ کر اور اپنی اصل حیثیت سے بہت نیچے اتر کر ایک مذہب کی شکل میں باقی ہے! اللہ اللہ اور خیر صلّا!

نفاذِ دین کے بغیر اتمامِ حجت ممکن نہیں!

دین ہے ہی وہ کہ جو غالب ہو۔ اگر مغلوب ہے تو وہ دین نہیں رہے گا' بلکہ ایک مذہب کی صورت میں سمٹ اور سکڑ جائے گا' اس کی اصل حیثیت مجروح ہو جائے گی۔اس پہلو سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ نظام بھی اگر صرف نظری اعتبار سے پیش کیا جا رہا ہو' صرف کتابی شکل میں نسلِ انسانی کو دیا گیا ہو تو وہ ایک خیالی جنت (utopia) کی شکل تو اختیار کر سکتا ہے' لیکن حجت نہیں بن سکتا۔نوعِ انسانی پر حجت وہ صرف اُس وقت بن سکتا ہے جب اسے قائم کر کے' نافذ کر کے اور چلا کر دکھا دیا جائے۔ یہ ہے بعثتِ نبویؐ کی وہ امتیازی شان اور کٹھن ذمہ داری جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر عائد ہوئی کہ آپؐ جو دینِ حق دے کر بھیجے گئے ہیں اسے پورے نظامِ زندگی پر غالب و قائم اور نافذ و رائج فرما

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب من سأل وھو قائم عالما جالسا۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

دیں۔ایک حدیث مبارک میں اس حقیقت کو یوں تعبیر فرمایا گیا کہ: ((لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا)) [1]'' تا کہ اللہ کی بات ہی سب سے بلند ہو۔''اس کی مرضی سب سے بالاتر ہو اور اس کا جھنڈا سب سے اونچا ہو جائے۔

سورۃ المدثّر میں اس اہم مضمون کو دو الفاظ میں سمو دیا گیا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! کھڑے ہو جاؤ' کمر بستہ ہو جاؤ' اپنے مشن کی تکمیل کے لیے جدّ و جہد کا آغاز کرو! اور اس کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ اِنذار۔ یعنی خبردار کرو' اُن نیند کے ماتوں کو جگاؤ' جو بھول گئے ہیں اس حقیقت کو کہ اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت)''اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا''۔ یہ ہے نبی اکرم ﷺ کے مشن کا نقطۂ آغاز! اور اس کا ہدفِ مقصود اور اس کی غایتِ قصویٰ کیا ہے؟ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ ''اور اپنے ربّ کو بڑا کرو!'' تکبیر کے معنی صرف یہ نہیں کہ بڑائی کا اعلان یا اعتراف کر لیا جائے' زبان سے اللہ اکبر کہہ دیا جائے' بلکہ تکبیر سے مقصود یہ ہے کہ اس کی بڑائی نافذ ہو جائے' اس کی کبریائی کے اعتراف پر مبنی نظام بالفعل قائم ہو جائے' اسی کی بات سب سے اونچی اور اسی کا حکم سب سے بالا ہو۔ یہ ہے تکبیر ربّ کا حقیقی مفہوم۔ علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں تکبیر ربّ کے اس انقلابی تصور کو شعر کا لبادہ اوڑھایا ہے: ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملاّ و جمادات و نباتات

اسی مضمون کو انہوں نے کسی قدر ظریفانہ انداز میں یوں بیان کیا: ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملاّ کی اَذاں اور' مجاہد کی اَذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

تکبیر ربّ کا کچھ یہی مفہوم حضرت مسیح علیہ السلام کے ان الفاظ میں بھی سامنے آتا ہے کہ ''اے ربّ! جیسے تیری مرضی آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پوری ہو''۔

دینِ حق کا نفاذ انقلابی جدّ وجُہد کا متقاضی ہے

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ سورۃ الصّف کی زیرِنظر آیت کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا جو مشن سامنے آتا ہے اس کا تقاضا محض دعوت وتبلیغ' بشارت وانذار یا تعلیم وتربیت سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ یہ ایک انقلابی مشن ہے۔ ایک نظام کو کسی معاشرے پر برپا کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے وہاں پر موجود نظام کو جڑوں سے اکھیڑا جائے۔ یہ کام خلاء میں کیا جانے والا نہیں ہے۔ جہاں بھی دینِ حق کے نفاذ کی جدّ وجہد کی جائے گی کوئی نہ کوئی نظام وہاں پہلے سے موجود ہوگا۔ اُس باطل نظام کے ساتھ لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں گے' سیادتیں اور چودھراہٹیں ہوں گی' لوگوں کے مالی مفادات ہوں گے۔ آپ جب اُس نظام کو ذرا سا چھیڑیں گے' اس کے خلاف ذرا آواز بلند کریں گے تو نمعلوم کس کس کے کن کن مفادات پر آنچ آئے گی! چنانچہ وہ تمام قوتیں اپنے اس نظام کی مدافعت میں آپ کے خلاف متحد ہوجائیں گی کہ ع

''نظامِ کہنہ کے پاسبانو' یہ معرضِ انقلاب میں ہے!''

اپنے نظام کو برقرار رکھنے اور اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر وہ سب مجتمع ہوکر آپ کے خلاف صف آراء ہوجائیں گے۔ تصادم' کشمکش اور جہاد وقتال کا مرحلہ لازماً آکر رہے گا۔ چنانچہ اس مقصد بعثت کے اعتبار سے جو سورۃ الصّف کی اس آیت میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے لیے معین ہوا ہے' انقلابی جدوجہد لازم اور ناگزیر ہے۔ یہ محض دعوت وتبلیغ سے ہونے والی بات نہیں!

اگرچہ سورۃ الجمعہ کے حوالے سے اگلے درس میں یہ بات آئے گی کہ اس انقلابی جدوجہد کا منہج اساسی یقیناً دعوت وتبلیغ ہے' اس کے ابتدائی مراحل میں یقیناً تعلیم بھی ہے' تربیت بھی ہے اور تزکیہ بھی ہے' لیکن ان ابتدائی اور اساسی مراحل سے بلند تر سطح پر ایک انقلابی جدّ وجہد بھی ناگزیر ہے' ایک تصادم کہ جس میں کشت وخون کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیّبہ میں جہاں ہمیں دعوت وتبلیغ کا مرحلہ نظر آتا ہے وہاں جہاد وقتال کے مراحل بھی آئے۔ حنین کی وادی میں آپؐ یہ رجز پڑھتے ہوئے اپنے لشکر کی کمان کرتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں:

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسير باب من قاد دابَّةَ غيره في الحرب

((اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ　　　اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ))[۱]

یہ وہ بات ہے جو اُن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی جنہوں نے نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے مقصد بعثت کی اس منفرد اور امتیازی شان کو نہیں سمجھا کہ آپؐ صرف داعی اور مبلغ نہ تھے' آپؐ محض مبشر اور نذیر نہ تھے' آپؐ صرف مزکی' مربی اور معلم نہ تھے' آپؐ تاریخ انسانی کے عظیم ترین انقلاب کے داعی اور نقیب بھی تھے۔ کون انکار کرسکتا ہے اس حقیقت سے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے برپا فرمایا' جس نے زندگی کے ہر گوشے کو بدل کر رکھ دیا! ایسا ہمہ گیر انقلاب جس نے لوگوں کے افکار بدلے' عقائد بدلے' نظریات بدلے' کردار بدلے' حتیٰ کہ لوگوں کے شب و روز کے انداز اور نشست و برخاست کے طریقے بدل گئے۔ وہ قوم کہ جس کے اندر کوئی کسی کی بات سننے والا نہ تھا' انتہائی منظم قوم بن گئی۔ اس معاشرہ نے کہ جہاں پڑھنے لکھنے والے لوگ انگلیوں پر گنے جانے کے قابل تھے' دنیا کو معلم فراہم کیے۔ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نوعِ انسانی کو ایک نئی تہذیب اور ایک نیا تمدن عطا کیا۔ بلاشبہ یہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت کا یہ پہلو کہ آپؐ عظیم داعیٔ انقلاب تھے' درحقیقت آپؐ کے اس فرضِ منصبی کا تقاضا ہے جو اِن الفاظِ مبارکہ میں بیان ہوا: ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ﴾۔

''اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری!''

مہاتما گاندھی کے بارے میں غالباً جارج برنارڈ شا نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے کہ:

> " He is a saint among politicians and a politician among saints".

اگرچہ ع ''چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک'' کے مصداق ان الفاظ کی یا ان جیسے الفاظ کی کوئی دُور کی نسبت بھی آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ گرامی سے نہیں ہوسکتی' تاہم واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے فہم کے لیے اگر یوں تعبیر کیا جائے تو شاید بات غلط نہ ہوگی کہ:

> "He was a revolutionary among prophets and a prophet among revolutionaries."

یعنی نبیوں اور رسولوں میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی امتیازی شان یہ ہے کہ آپؐ ایک عظیم انقلابی رہنما ہیں' اور انقلابی رہنماؤں میں آپؐ کی منفرد شان یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صرف دعوت و تبلیغ کا کام نہیں کیا' بلکہ اس دعوت کی بنیاد پر ایک انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ دعوت

وتبلیغ کے ابتدائی مرحلے سے کام کا آغاز کیا اور کُل تیئیس (۲۳) برس میں اس جدوجہد کو ایک نظام کے باقاعدہ قیام اور باضابطہ نفاذ کے تکمیلی مرحلے تک پہنچا دیا۔ اگرچہ یہ امر واقعہ ہے کہ اس جدوجہد میں آپؐ کو ان تمام مراحل سے گزرنا پڑا جو کسی بھی انقلابی جدّوجہد میں آتے ہیں۔ زمین پر قدم بقدم چل کر نبی اکرمﷺ نے وہ مرحلے طے کیے۔ آپؐ کو فقر و فاقے کی صعوبت بھی برداشت کرنا پڑی۔ شعبِ بنی ہاشم میں تین سال کی قید کو ذہن میں لائیے کہ جس میں وہ وقت آیا کہ فقر و فاقے کی شدت سے بنی ہاشم کے دودھ پیتے بچے بلک رہے تھے اور ان کے کھانے کے لیے کوئی چیز میسر نہ تھی' سوائے اس کے کہ سوکھے چمڑوں کو اُبال کر اس کا پانی ان کے حلق میں ٹپکا دیا جائے۔ طائف میں آپﷺ کو شدید پتھراؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ مکے کی گلیوں میں آپﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ یہ منظر بھی چشم فلک نے دیکھا کہ آپﷺ سربسجود ہیں اور ایک شقی انسان عقبہ بن ابی معیط ابوجہل کے کہنے سے اٹھتا ہے اور اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی لا کر شانۂ مبارک پر رکھ دیتا ہے۔ پھر غارِ ثور کا مرحلہ بھی آیا۔

میدانِ بدر کا وہ نقشہ بھی ذہن میں لائیے کہ اللہ کا رسولﷺ ان دونوں لشکروں کے درمیان گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی میں سربسجود ہے اور اللہ سے گڑگڑا کر نصرت کی درخواست کر رہا ہے۔ پھر اُحد کا سخت مرحلہ بھی آیا۔ آپؐ کے دندانِ مبارک شہید اور چہرۂ انور لہولہان ہو گیا ہے۔ آپؐ پر کچھ دیر کے لیے غشی طاری ہو جاتی ہے۔ آپؐ کے انتہائی جاں نثار ساتھی حضرت مصعب بن عمیرؓ کا لاشہ بے گور و کفن پڑا ہے کہ جسم پر موجود چادر اتنی چھوٹی تھی کہ اگر سر کو ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کو ڈھانپتے تو سر کھل جاتا تھا۔ نبی اکرمﷺ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ اسی میدانِ اُحد میں آپؐ کے انتہائی قریبی عزیز حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کا اعضاء بریدہ لاشہ پڑا ہوا ہے۔ آپﷺ کے قلبِ مبارک کی جو کیفیت ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مدینہ پہنچنے پر جب آپؐ نے دیکھا کہ گھر گھر سے رونے کی آوازیں آ رہی ہیں' شہداء پر اُن کی رشتہ دار خواتین بین کر رہی ہیں' تو آپﷺ کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے: ((لٰکِنَّ حَمْزَۃَ لَا بَوَاکِیَ لَہٗ)) [1] ''ہائے حمزہ کے لیے تو کوئی رونے والی بھی نہیں!'' یہ تمام صدمے نبی اکرمﷺ نے دیکھے اور یہ سب سختیاں جھیلی ہیں' تب یہ انقلاب آیا

(۱) سنن ابن ماجه' کتاب ما جاء فی الجنائز' باب ما جاء فی البکاء علی المیت۔

ہے۔ گویا ع ''اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سوگزری'' کے مصداق اس عظیم انقلابی جدوجہد میں نبی اکرم ﷺ کو اُن تمام مراحل اور مشکلات و موانع کا سامنا کرنا پڑا جو دنیا کی کسی بھی انقلابی جدوجہد میں پیش آتے ہیں۔ بہرکیف یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ بعثتِ محمدیؐ کی یہی امتیازی شان ہمارے سامنے رہنی چاہیے جو اس آیت کریمہ میں بیان ہوئی کہ: ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ یعنی پورے کے پورے دین (نظامِ اطاعت) پر اس دینِ حق کو غالب و قائم کر دینا یہ ہے بعثتِ محمدی ﷺ کی غرض و غایت!

دوچشم کشا واقعات

یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ یہ چیز بعثتِ انبیاء کے اساسی مقصد سے جدا نہیں ہے۔ دیکھئے' بعثتِ انبیاء کا اصل مقصد نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت ہے۔ اور یہ اسی اتمامِ حجت کا تکمیلی مرحلہ ہے کہ انسان کو اجتماعی نظام کے ضمن میں رہنمائی کے لیے عدل و قسط پر مبنی نظام کا ایک مکمل نمونہ دکھا دیا جائے۔ صرف نظری سطح پر پیش کر دینے سے وہ حجت مکمل نہیں ہوگی' بلکہ اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہوگا کہ اس نظام کو بالفعل قائم و نافذ کر کے اور عملاً چلا کر دکھا دیا جائے۔ اس معاملے کی اہمیت کا حوالہ رواں صدی کے دو واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ جب ہندوستان میں پہلی بار مختلف صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں بنی تھیں اُس وقت گاندھی نے اپنے کانگریسی ساتھیوں اور زعماء کے سامنے ایک عجیب بات کہی تھی' اور وہ یہ کہ ''میں اس موقع پر تمہارے سامنے حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی مثال رکھتا ہوں' اس مثال کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو!'' غور کیجیے گاندھی نے یہ بات کیوں کہی! اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس عہدِ جدید کے انسان کو جس نوع کے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے اس نظام کا ایک کامل نقشہ اور ایک مکمل ماڈل اگر درکار ہے تو اس کی نظیر تاریخ انسانی میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے دورِ خلافتِ راشدہ' یعنی وہ نظامِ عدلِ اجتماعی جو قائم فرمایا تھا محمد عربی ﷺ نے۔

ایک دوسرا واقعہ جو اس کے دوسرے رُخ پر روشنی ڈال رہا ہے' مولانا عبید اللہ سندھی کے حوالے سے ہے۔ اس واقعہ سے دینِ حق کے قیام و نفاذ کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی جب شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی ریشمی رومالوں کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان چھوڑ کر افغانستان گئے' اور جب افغانستان سے بھی گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر سرحد عبور کر کے انہیں روس جانا پڑا تو اُس وقت بالشویک انقلاب ابھی نیا نیا آیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس موقع پر انقلاب کے مرکزی

رہنماؤں کے سامنے اگر اسلام کا انقلابی پروگرام رکھا جائے تو کیا عجب کہ وہ اس کو قبول کر لیں' ابھی ان میں انقلابی جذبہ بھی ہے اور انقلاب کے نقطۂ نظر سے فضا سازگار بھی ہے۔ چنانچہ اس اُمید پر انہوں نے لینن سے بات کرنا چاہی' لیکن لینن بستر مرگ پر تھا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ٹراٹسکی سے بات کیجیے' چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی کی ٹراٹسکی سے مفصل گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے آخر میں اس نے پوچھا کہ مولانا! یہ نظام جو آپ پیش کر رہے ہیں بظاہر بہت عمدہ معلوم ہوتا ہے' لیکن کیا آپ نے دنیا میں کہیں اسے قائم بھی کیا ہے؟ مولانا عبیداللہ سندھی کہتے ہیں کہ اس کے بعد میری نگاہیں زمین میں گڑی کی گڑی رہ گئیں' دوبارہ میں اس سے آنکھیں چار نہیں کر سکا۔ سیدھی سی بات ہے کہ کوئی نظام حجت تب بنتا ہے جب اسے چلا کر دکھا دیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس اتمام حجت کو اپنے تکمیلی درجے تک پہنچا دیا۔ آپؐ نے جہاں نظری' فکری اور اعتقادی ہدایت دی' انسان کی سوچ کو صحیح رُخ پر ڈالا' جہاں آپؐ نے انفرادی اخلاق کے ضمن میں انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے ایک مکمل ہدایت نامہ عطا فرمایا' خود اپنی سیرت و کردار اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت و کردار کو اس رُخ پر ڈھال کر انفرادی اخلاق کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے لیے نوعِ انسانی پر حجت تمام کی' وہاں آپؐ نے ایک جاں گسل جدوجہد کے ذریعے تیئیس سالہ محنتِ شاقہ کے نتیجے میں اس نظامِ عدل وقسط کو عملاً برپا کر دیا جس میں انفرادی آزادی بھی ہے' لیکن اجتماعیت کے حقوق بھی پورے طور پر محفوظ ہیں' جس میں مساواتِ انسانی بھی ہے' لیکن وہ انفرادی آزادی کی قیمت (cost) پر نہیں کہ مساوات تو ہو لیکن انسان شخصی آزادی سے یکسر محروم کر دیا جائے' بلکہ یہ دونوں اعلیٰ اقدار اس نظام میں بیک وقت موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان جس اعلیٰ قدر کا تصور کرے گا اسے وہ اس نظام میں موجود پائے گا۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے : ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیؐ ست

یہ ہے اصل کارنامہ حیاتِ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا جس کو سمجھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی اس امتیازی شان کا فہم ضروری ہے جو اس آیۂ مبارکہ میں وارد ہوئی: ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ

رَسُوْلَـہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾

سورۃ الصّف کے مضامین کا جائزہ

سورۃ الصّف کے عمود کی تعیین اوراس کی مرکزی آیت کے اکثر حصے پرغور وفکر کر لینے کے بعد اب آیئے کہ ہم اس سورۂ مبارکہ پر بحیثیت مجموعی غور کریں۔لیکن اس سے قبل اس سورۃ کی مرکزی آیت یعنی آیت ۹ کے آخری ٹکڑے کے حوالے سے ایک اورعظیم حقیقت کی طرف توجہ کرنا مفید ہوگا۔

آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ الصّف کی یہ مرکزی آیت قرآن مجید میں تین مقامات پر آئی ہے۔ایک مقام پر اس کا اختتام ﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا﴾ کے الفاظ پر ہوتا ہے۔اس میں تو گویا اشارہ ہے اسی بات کی طرف جو اِس سے پہلے سورۃ الحج کے آخری رکوع کے درس کے ضمن میں عرض کی جا چکی ہے کہ رسول اگر اپنا فرضِ منصبی ادا کردیں تو گواہی کے لیے اللہ کافی ہے۔اس حوالے سے سیرتِ طیبہ کا وہ اہم واقعہ ذہن میں تازہ ہو گیا ہوگا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضورﷺ نے تمام حاضرین سے یہ گواہی لینے کے بعد کہ میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا' آسمان کی طرف انگشتِ شہادت اٹھا کر اور لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے بھی تین بار عرض کیا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ' اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ!))[1] کہ اے اللہ تو بھی گواہ رہ! میرے پاس تیری دو امانتیں پہنچی تھیں' ایک تیری کتاب' جسے میں نے اُمت تک بلا کم و کاست پہنچا دیا' حق تبلیغ ادا کر دیا' اور دوسری نعمت دینِ حق' جسے تیری تائید اور اپنے صحابہؓ کے تعاون سے میں نے تیئیس سالہ محنتِ شاقہ کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب پر بالفعل قائم کر دیا۔اب یہاں تیرا ہی بول بالا ہے' تیرا ہی حکم نافذ ہے اور تیرا ہی جھنڈا سب سے بلند ہے۔ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا۔اس کی شہادت اور گواہی کے لیے اللہ کافی ہے۔

بقیہ دو مقامات پر یعنی سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصّف میں یہ آیت ﴿وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾ کے

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ۔

الفاظ پر ختم ہوتی ہے— ''چاہے یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو'—اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ تصادم ناگزیر ہے۔ مشرک کبھی گوارا نہ کریں گے کہ اللہ کا دین یہاں قائم ہو' وہ نظامِ عدل وقسط عملاً برپا ہو جائے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ کفر اور شرک کی قوتیں دینِ حق کے لیے آسانی سے راستہ نہیں چھوڑیں گی۔ وہ لازماً retaliate کریں گی۔ تصادم ہو کر رہے گا' کشمکش ہو گی' لیکن اس سب کے علی الرغم' اس سب کے باوجود' رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے کہ اس دین کو قائم کریں' اسے غالب و نافذ کریں جو اللہ نے ان کو دے کر بھیجا ہے۔

مذہبی اور سیاسی شرک کا گٹھ جوڑ

یہاں ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے اور اس کا تعلق ہمارے اس منتخب نصاب میں شرک کی بحث سے جڑ جاتا ہے۔ شرک کے بارے میں یہ خیال بڑا عامیانہ اور سطحی سا ہے کہ اس کا تعلق محض مخصوص مذہبی امور کے ساتھ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں تاریخِ نسلِ انسانی کے دوران ہر دَور میں اور ہر خطۂ زمین میں شرک کے دو نظام ہمیشہ قائم رہے ہیں' ایک مذہبی شرک اور دوسرا سیاسی شرک۔ انہی دو راستوں سے درحقیقت نوعِ انسانی کا استحصال ہوتا چلا آیا ہے۔ مذہبی شرک کی شکل تو یہ ہے کہ کوئی پنڈت' کوئی پروہت' کوئی پادری' کوئی پجاری یا کوئی پیر کسی آستانے کا مجاور بن کر یا کسی بُت کدے کا پروہت یا پجاری بن کر لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوتا ہے اور مذہب کے نام پر عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے نذرانے اور چڑھاوے وصول کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاشی استحصال (economic exploitation) کی انتہائی مکروہ صورت ہے۔ بقولِ اقبال ؏

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج!

دوسری جانب بادشاہت کے نظام کی صورت میں سیاسی شرک کا نظام تاریخ انسانی کے ہر دَور میں قائم رہا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے اَوراق پر نظر دوڑائیں تو نظر آتا ہے کہ کہیں یورپ میں بادشاہوں کے خدائی اختیارات (Divine Rights of Kings) کا راگ الاپا جا رہا ہے اور کہیں ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کی حکمرانی کا سلسلہ رواں ہے۔ یہ بادشاہ اور ملوک اپنے اقتدار و اختیار کے بل پر عوام سے خراج اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ اس طرح انسانی تاریخ میں یہ دونوں مشرکانہ نظام ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے سے تعاون کرتے نظر آتے ہیں۔ اِدھر مذہبی طبقات کی طرف سے بادشاہِ وقت کو ''His Holiness'' کا خطاب مل رہا ہے تو اُدھر سے انہیں

''Defenders of the Faith'' کے خطاب سے نوازا جا رہا ہے۔ گویا ع من ترا حاجی بگویم تو مرا مُلّا بگو! یہ مذہبی شرک اور سیاسی شرک کے دو نظام جو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے اور جنہوں نے انسانوں کی گردنوں پر اپنی خدائی کا جواڈالے رکھا' ظاہر بات ہے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ یہ سارا تانا بانا ٹوٹ کر رہ جائے اور یہ سارے مفادات آنِ واحد میں ختم ہو جائیں۔ علامہ اقبال نے اسی پس منظر میں کہا تھا : ؎

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو!
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

اسلام ہے وہ نظام جو اِن درمیانی واسطوں کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے' جو یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ جہاں چاہو اور جب چاہو خدا سے ہم کلام ہو جاؤ:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾ (البقرۃ)

''اور (اے نبیؐ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (انہیں بتا دیں کہ) میں قریب ہی ہوں' میں ہر پکارنے والے کی پکار (کو سنتا اور اس) کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے' تو چاہیے کہ وہ بھی میرا کہا مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں' تاکہ رشد و کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں۔''

وہ انسان پر سے انسان کی خدائی کا نام ونشان مٹانا چاہتا ہے۔ ع ''تمیزِ بندہ وآقا فسادِ آدمیت ہے''۔ یہاں کوئی کسی کا آقا نہیں اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا بندہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا)) [1] ''سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''۔ تمہارے مابین قوم' نسل اور رنگت کے اعتبار سے کوئی اونچ نیچ نہیں ہے' کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ ہے وہ انقلابی پیغام جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ ان اصولوں پر مبنی نظام کا قیام ظاہر بات ہے کہ اس مشرکانہ اور باطل نظام کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے' جہاں اس نظام سے لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں۔ اس لیے فرمایا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کہ مشرکین کی طرف سے تو مخالفت ہو کر رہے گی۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب ما یُنتھی عن التَّحاسُد

وہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ یہ نظامِ عدل وقسط دنیا میں قائم اور برپا ہو جائے' انسانوں کی گردنوں پر سے دو طرفہ غلامی کے جوئے اٹھا دیے جائیں' اوران کی گردنوں میں سے وہ طوق اتار دیے جائیں جن کے بوجھ تلے نوعِ انسانی ہمیشہ دبی اور سسکتی رہی ہے۔ سورۃ الاعراف میں رسول اللہ ﷺ کی یہ شان ان الفاظ میں بیان ہوئی: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾

آنحضور ﷺ کے مشن کا لازمی تقاضا' جہاد فی سبیل اللہ!

بہرحال اس آخری ٹکڑے یعنی ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے ضمن میں اس مختصر سی وضاحت کے بعد اب یہ بات جان لیجیے کہ سورۃ الصّف میں نبی اکرم ﷺ کے اس مقصد بعثت کی تعیین کے بعد اس کے لازمی تقاضے کی حیثیت سے اب مضمون آ رہا ہے جہاد فی سبیل اللہ کا' کہ اے اہل ایمان! اب اس مشن کی تکمیل کے لیے کمر ہمت کس لو! دین اللہ کا ہے اوراس کو غالب کرنا فرضِ منصبی ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا۔ تو اب اللہ اوراس کے رسول کے ماننے والوں اوران پر ایمان کے دعوے داروں کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ اس مقصد کے حصول اوراس مشن کی تکمیل کے لیے اپنے آپ کو لگا دیں اور کھپا دیں۔ اس مقصد کے لیے جدّ وجہد کریں' کوششیں کریں اوراس راہ میں اپنے مال لگائیں' اپنی جانیں کھپائیں' اپنی قوتیں صرف کریں اوراپنے اوقات لگائیں کہ یہ ان کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ کے دین کو برپا کرنا اوراسے قائم ونافذ کرنا کسی ایک فردِ بشر کا کام نہیں۔ یہ ایک نہایت عظیم کام اور بہت اونچا نصب العین ہے اور اس کے لیے ایک بڑی بھرپور اجتماعی جدّ وجہد کی ضرورت ہے۔ اس اجتماعی جدّ وجہد میں نبی ﷺ کے دست و بازو بننا' اُن کا ساتھ دینا' ان کی نصرت کرنا اور جہاں اُن کا پسینہ گرا ہو وہاں اپنا خون بہا دینے کو اپنے لیے موجبِ فخر وسعادت جاننا ہر مسلمان کے ایمان کا تقاضا تھا۔ اس لیے کہ جب تک یہ کیفیت اللہ اور رسول ﷺ کے ماننے کے دعوے داروں میں پیدا نہ ہو اس مشن کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ سیرت النبیؐ اور سیَرِ صحابہؓ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ انقلاب اسی طور سے برپا ہوا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنا تن من دھن سب کچھ اس راہ میں نچھاور کر دیا۔ غزوۂ خندق کا تصور کیجیے جبکہ بڑا ہی کٹھن وقت آن پڑا تھا۔ مدینے کی چھوٹی سی بستی کو بارہ ہزار کا لشکر چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا اوراُس وقت جبکہ خندق کھودی جا رہی تھی اور پھاوڑے چل

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسير' باب التحريض على القتال۔ وصحيح مسلم' كتاب الجهاد والسير' باب غزوة الاحزاب وهی الخندق۔

رہے تھے' یہ رجز اور ترانہ صحابہؓ کی زبانوں پر تھا:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدَا
عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدَا[1]

کہ ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے بیعت کی ہے محمد ﷺ کے ہاتھ پر' جہاد کی بیعت کہ جب تک ہم زندہ ہیں اور جب تک جسم و جان کا تعلق برقرار ہے ہم اس جہاد' اس کوشش اور اس جدّ و جُہد میں لگے رہیں گے۔

ایک انتہائی نفع بخش تجارت!

سورۃ الصّف کی اس مرکزی آیت کے بعد اگلی ہی آیت میں مسلمانوں سے یہ سوال کیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝﴾ ''اے اہل ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اُس تجارت (یا کاروبار) کی طرف جو تمہیں نجات دے ایک دردناک عذاب سے؟'' یہ انسانی ذہن کے بہت قریب آ کر بات کرنے کا انداز ہے کہ تم دُنیوی کاروبار اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کو خوب جانتے ہو' لیکن ایک کاروبار وہ بھی ہے کہ جس سے حاصل ہونے والا نفع عذابِ الیم سے چھٹکارے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اس کاروبار کے نتیجے میں تم دردناک عذاب سے بچ جاؤ گے' جہنم کی آگ سے تمہیں رستگاری حاصل ہو جائے گی۔ یہ سوال کرنے کے بعد جواب بھی اللہ تعالیٰ نے خود دیا۔ تعلیم و تفہیم کا یہ بڑا ہی حکیمانہ انداز ہے کہ سوال کیا جائے اور پھر اس کا جواب دیا جائے گا۔

فرمایا: ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''تم ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر''۔ یہ مقام بھی ان مقامات میں سے ہے جہاں یہ بات بڑی وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ قانونی ایمان کچھ اور شے ہے اور حقیقی ایمان کچھ اور! خطاب اُن سے ہو رہا ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں۔ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ پر غور کیجیے! فرمایا جا رہا ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جو ایمان کا دعویٰ اور اس کا اعلان کر رہے ہو! اور اقرارٌ بـاللسَان کا مرحلہ طے کر چکے ہو! تم اگر یہ چاہتے ہو کہ تمہیں فی الواقع عذابِ الیم سے چھٹکارا ملے تو اس کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر یقین محکم رکھو۔ مزید یہ کہ: ﴿وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾ ''اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ!'' کھپاؤ اُس کی راہ میں اپنی جانیں بھی اور اپنے مال بھی۔ دیکھئے ''فی سبیل اللہ'' کا تعین پچھلی آیت میں کیا جا چکا ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے اور

اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کے لیے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ دے کر مبعوث کیے گئے ہیں' تمہیں اپنی جان اور اپنے مال کو لگانا اور کھپانا ہے۔ دین کو قائم و غالب کرنا اگرچہ اصلاً فرضِ منصبی ہے نبی اکرم ﷺ کا' لیکن اس کے غلبے کی جدوجہد میں تمہیں اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کرنا ہے اور اپنے خون سے اس انقلاب کی آبیاری کرنی ہے۔ تمہیں اس کی بنیادوں میں اپنی ہڈیوں اور خون کا گارا بھرنا ہوگا! یہ کام اسی طور سے ہوگا اور اسی میں درحقیقت تمہارے ایمان کا امتحان ہے۔ یہ دلیل ہوگی اس بات کی کہ واقعتاً ایمان تمہارے دلوں میں اتر گیا ہے۔

اس آیت میں گویا اسی مضمون کا اعادہ ہوگیا جو سورۃ الحجرات میں بیان ہو چکا ہے کہ:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

کہ اپنے دعوائے ایمان میں صرف وہی لوگ سچے ہیں جو اِن دو شرائط کو پورا کریں: (i) یقینِ قلبی کی یہ صورت کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ان کا ایمان یقین کی شکل اختیار کر کے دل کے اندر جاگزیں ہو چکا ہو' اور (ii) اس یقین کا عملی مظہر ہوگا جہاد فی سبیل اللہ' اللہ کے دین کے غلبے اور اس کے کلمے کی سربلندی کے لیے جان اور مال کا کھپانا۔ یہ ہے گویا کہ سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون جو آیت ۹ اور ۱۰ کے حوالے سے معین ہوگیا۔

اب ہمیں اس سورۂ مبارکہ کا ابتدا سے مطالعہ کرتے ہوئے اس کے تین حصوں اور اُن میں شامل آیات کے باہمی ربط اور بالخصوص اس سورۃ کے مرکزی مضمون کے ساتھ ان کے ربط و تعلق کو سمجھنا ہے۔ مرکزی مضمون کی تعیین کے بعد بقیہ آیات کو سمجھنا اِن شاء اللہ بہت آسان ہوگا۔

قول و فعل کے تضاد پر اللہ کا غضب

اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ چار آیات پر مشتمل ہے۔ پہلی آیت ہے:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۱﴾﴾

''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے' اور وہ زبردست کمالِ حکمت والا ہے''۔

یہ ایک بڑا ہی پُرشکوہ آغازِ کلام ہے۔ جانتے ہو کون تم سے مخاطب ہے؟ وہ جو خالقِ ارض وسماء ہے' جس کی تسبیح و تحمید میں اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ لگا ہوا ہے۔ وہ العزیز ہے' زبردست ہے' اور الحکیم ہے' کمالِ

حکمت والا ہے۔

اگلی آیت میں زجر اور ڈانٹ کا انداز ہے‘ مسلمانوں کو جھنجوڑا جا رہا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾﴾

''اے اہلِ ایمان! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟''

تمہارے قول اور فعل کا یہ تضاد اللہ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اگلے الفاظ بہت سخت ہیں:

﴿کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾﴾

''اللہ کے نزدیک یہ بات انتہائی بیزارکن ہے کہ تم کہو وہ کچھ جو کرتے نہیں ہو۔''

''مَقْتٌ'' عربی زبان میں غیظ اور غصے سے بھی آگے کی کیفیت کے لیے آتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی وقت آپ کی توقعات پر پورا نہ اترے تو آپ کو غصہ آتا ہے‘ لیکن ایک مرحلہ وہ آتا ہے کہ توقع بالکل ختم ہو جاتی ہے اور ایک بیزاری کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ''مَقْت'' کا لفظ درحقیقت اسی کیفیت کا غماز ہے۔[1] یہ گویا انتہائی ملامت کا انداز ہے کہ تمہاری یہ لن ترانیاں‘ تمہارے محبتِ خداوندی اور عشقِ رسول ﷺ کے یہ دعوے تمہارے عمل سے مطابقت نہیں رکھتے۔ دعوے اتنے بلند آہنگ ہوں اور عمل اس معیار پر پورا نہ اتر رہا ہو‘ اللہ کے ساتھ وفاداریاں اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری نہ ہو رہی ہو‘ اللہ اور رسول ﷺ اور ان کے دین کے لیے حمیت اور غیرت موجود نہ ہو‘ دینِ حق کو پامال دیکھو اور اپنے دھندوں میں لگے رہو‘ اسے مغلوب پاؤ اور پھر بھی دنیا کمانے میں مصروف و مشغول رہو‘ یہ قول و فعل کا وہ تضاد ہے جو اللہ کے نزدیک انتہائی قابلِ مذمت اور بیزارکن ہے۔ ﴿کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾﴾ ایمان لائے ہو تو اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا‘ خدا کو مانا ہے تو اس کے دین کے لیے جان اور مال کھپانے ہوں گے‘ محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے محبت ہے تو آپؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنی جانیں اور اپنے مال صَرف کرنے ہوں گے۔ یا چناں کن یا چنیں! یا اس دعوے سے دستبردار ہو جاؤ‘ یا دعویٰ کرتے ہو تو اس کو عملاً پورا کرو! اقبال نے غالباً اسی لیے کہا تھا: ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم

(۱) عرب میں ایک مکروہ رواج یہ تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اُس کے بیٹے اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتے تھے۔ تاہم ایسے نکاح کو اس معاشرے میں انتہائی ناپسندیدہ خیال کیا جاتا تھا اور اس کے لیے ''نکاحِ مقت'' کی اصطلاح مستعمل تھی۔

اور: ؎

کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے......

چوتھی آیت میں یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝﴾

''اللہ کو تو محبت اُن سے ہے [1] جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں صفیں باندھ کر' ایسے گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

یہاں جہاد فی سبیل اللہ کے بلند ترین مقام یعنی قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ جہاد ایک وسیع اصطلاح ہے۔ دین کے لیے جِدّ وجُہد' محنت' کوشش اور دعوت وتبلیغ' سب جہاد ہی کی صورتیں ہیں۔ اسی طرح دین کی نشر واشاعت کے لیے محنت کرنا' لوگوں سے گفتگو کر کے انہیں ہم خیال بنانے کی ہر ممکن صورت کا اختیار کرنا' پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں انہیں منظّم کرنا اور ان کی مناسب تربیت کا اہتمام کرنا' یہ تمام کام جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہیں' لیکن اس تصادم اور کشمکش کا آخری مرحلہ اور اس کا نقطۂ عروج ہے قتال فی سبیل اللہ! یہاں اس کا ذکر کیا گیا' تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ راستہ جا کدھر رہا ہے! جہاد فی سبیل اللہ کے جس راستے پر تم نے قدم دھرے ہیں اس کی آخری منزل کون سی ہے! چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰـهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝﴾ قدم اس طرح سے جمے ہوئے ہوں اور صف بندی ایسی مضبوط ہو کہ جیسے کوئی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو کہ نہ اسے اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکے' نہ اس میں کہیں کوئی رخنہ پیدا کیا جا سکے۔

اسلام میں ''خیر اعلیٰ'' کا تصور

اس آیت کا حوالہ ہمارے منتخب نصاب کے بالکل آغاز میں آیۂ بِرّ کے ضمن میں آیا تھا کہ ہر نظامِ

---

(۱) غالباً علامہ اقبال نے اپنے اس شعر کا اسلوبِ بیان اسی آیت مبارکہ سے اخذ کیا تھا کہ ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

فکر کے نظریۂ اخلاق میں کسی نہ کسی خیرِ اعلیٰ (summum bonum) یا بالفاظِ دیگر کسی highest virtue کا تصور موجود ہوتا ہے کہ سب سے اعلیٰ قدر کون سی ہے، نیکی کی بلند ترین منزل کون سی ہے۔ نوٹ کیجیے کہ آیۂ بر (البقرۃ: ۱۷۷) کے اختتام پر جو مضمون آیا تھا اسی کا اعادہ سورۃ الصّف کی اس آیت میں ہوا ہے۔ وہاں نیکی کی بحث کا اختتام ان الفاظ پر ہوا تھا: ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾ ''اور صبر کرنے والے (ڈٹ جانے والے، برداشت اور تحمل کا مظاہرہ کرنے والے) فقر و فاقہ میں، تکلیف و اذیت میں اور لڑائی کے وقت (میدانِ جنگ میں)''۔ گویا اسلام کے نظامِ فکر اور اس کے نظریۂ اخلاق میں بلند ترین نیکی یا خیرِ اعلیٰ (summum bonum) کا جو تصور ہے وہ اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دینا ہے۔

بہر حال یہ پہلی چار آیات تمہید بن رہی ہیں اس مطالبۂ جہاد و قتال کی جو آگے آ رہا ہے۔ اگلی آیات میں بعثتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مقصد اور مشن کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کو عمل کی دعوت دی جاتی ہے، لہٰذا آغاز میں تمہید کے طور پر یہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ جان لو کہ صرف زبانی اقرارِ ایمان تمہیں اللہ کے ہاں اُن وعدوں کا مستحق نہیں بنائے گا جو اُس نے اپنے مؤمن بندوں سے کیے ہیں، بلکہ قولی اقرار کے ساتھ ساتھ عمل کی گواہی بھی ضروری ہے، اور اس عمل کی چوٹی ہے قتال فی سبیل اللہ، جو بندۂ مؤمن کی عملی جدوجہد کا نقطۂ عروج ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ)) [1] ''جس شخص کی موت اس حال میں واقع ہوئی کہ اس نے نہ تو کسی غزوے میں شرکت کی اور نہ ہی اس کے دل میں شہادت کی تمنا پیدا ہوئی تو اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوئی''۔ یہ درحقیقت ایمان کا منطقی اور لازمی نتیجہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ انسان کی ساری زندگی اللہ کی راہ میں مجاہدے اور جدوجہد میں گزرے، لیکن قتال کا مرحلہ نہ آئے۔ تاہم ایک بندۂ مؤمن کے سینے کو اِس آرزو سے آباد رہنا چاہیے کہ کاش کہ وہ وقت آئے کہ اپنی جان کا ہدیہ اللہ کے حضور میں پیش کر کے وہ سرخرو ہو جائے، سبکدوش ہو جائے۔ سورۃ الاحزاب میں اہل ایمان کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۫ۖ﴾ (آیت ۲۳) کہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بہت سے وہ ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے، راہِ حق میں گردنیں کٹوا کر سبکدوش ہو چکے اور باقی منتظر ہیں کہ کب ہماری

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسہ بالغزو۔

باری آئے اور ہم بھی اس امتحان میں سرخرو ہو جائیں!

یہود کا ذکر بطور نشانِ عبرت

اگلی چار آیات میں یہود کی تاریخ کے حوالے سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے —— اور یہ ان ''مُسَبِّحَات'' کے مشترک امور میں سے ہے کہ ان میں جا بجا بنی اسرائیل کو بطور نشانِ عبرت پیش کیا گیا ہے —— کہ اے مسلمانو! قول وعمل کا تضاد اور ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی سے پہلوتہی' یہی وہ اصل جرم تھا کہ جس کی پاداش میں یہود اس مقام اور منصب سے معزول کر دیے گئے جس پر آج تم فائز کیے گئے ہو۔ چار آیات میں یہود کی تاریخ کے تین اَدوار کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ط فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾

''اور (یاد کرو) جب کہا تھا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہ اے میری قوم کے لوگو! کیوں مجھے ایذا پہنچاتے ہو درانحالیکہ تم خوب جان چکے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف؟ پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی کج کر دیا' اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

قوم کے جہاد سے انکار پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیزاری

اس آیۂ مبارکہ پر پہلے تو اس اعتبار سے غور کیجیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی اُمت کے ہاتھوں کس نوعیت کے دکھ سہنے پڑے ہوں گے! یقیناً کوئی نہ کوئی ذاتی اذیت بھی آپؑ کو پہنچائی گئی ہو گی' جیسے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن لوگوں کی زبان سے جو بظاہر کلمہ گو لیکن حقیقت کے اعتبار سے منافق تھے' انتہائی اذیت پہنچتی رہی' یہاں تک کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی۔ ہم تصور نہیں کر سکتے کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ سے کتنی کوفت اور کتنی ذہنی وقلبی اذیت پہنچی ہو گی۔ تو جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کی کچھ اذیتیں بھی یہود کے ہاتھوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہنچی ہوں تو یہ کوئی بعید از قیاس نہیں ہے' لیکن ''اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' کے اصول کے تحت تلاش کیجیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم کے ہاتھوں اصل اذیت کب پہنچی تھی' تو آپ کو سورۃ المائدۃ میں اس کی تفصیل ملے گی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر کی غلامی کے پھندوں سے نجات دلا کر لائے اور صحرائے سینا میں پڑاؤ کیا جہاں انہیں ''تورات'' عطا کی گئی' تو بالآخر جہاد وقتال کا مرحلہ سامنے آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ اب اس ارضِ مقدس یعنی فلسطین میں داخل ہو جاؤ' قتال

فی سبیل اللہ کے لیے کمر ہمت کس لوتو قوم نے صاف جواب دے دیا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ ''(اے موسیٰ!) پس جاؤ تم اور تمہارا ربّ' تم دونوں قتال کرو' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں!'' ہم اپنی گردنیں کٹوانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس پر رنج و صدمے کی جو کیفیت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی اس کا نقشہ قرآن مجید نے کھینچا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے حد درجہ مایوسی اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں: ﴿رَبِّ اِنِّیْ لَا اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴾ ''اے میرے پروردگار! مجھے خود اپنی اور اپنے بھائی کی جان کے سوا کسی پر کوئی اختیار حاصل نہیں' پس تو اب ہمارے اور فاسقوں کی اس قوم کے درمیان تفریق کر دے''۔ (میں ان کے ساتھ مزید رہنے کے لیے تیار نہیں)۔ یہ گویا وہ سب سے بڑی اذیت تھی جو اپنی اُمت کے ہاتھوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھیلنی پڑی۔

اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی ایک اہم دفعہ

سورۃ الصّف کی آیت ۵ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ ...... ﴾ جس سلسلۂ کلام اور جس ربط کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہوئی ہے' اس کے مطابق اس کا اصل مفہوم واضح ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ بارہا عرض کیا گیا ہے' یہ بات پیشِ نظر رہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت اپنی جگہ علم وحکمت کا ایک مکمل موتی ہے۔ اسے جب ایک سلسلۂ مضمون کی کڑی میں پرویا جاتا ہے تو اس کا ایک مفہوم اور ایک رُخ متعین ہو جاتا ہے' لیکن اس کا کوئی دوسرا رُخ بھی ہوسکتا ہے جو اس سلسلۂ کلام کے اعتبار سے اگرچہ ضمنی قرار پائے گا لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہو گی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم کے علوم و معارف کے بہت سے قیمتی موتی اسی طرح آیات کے ضمنی مضامین کی حیثیت سے وارد ہوئے ہیں۔

یہاں ﴿فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ (پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی کج کر دیا) کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی ایک بہت اہم دفعہ بیان ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ہدایت یا ضلالت میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار (choice) دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الدھر میں فرمایا گیا: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾ ''خواہ وہ شکر بجا لانے والا بنے خواہ کفر کرنے والا''۔ چاہے اِدھر آ جائے' چاہے اُدھر چلا جائے۔ انسان اگر ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے لیے کھولتا چلا جائے گا' آسان کرتا چلا جائے گا' اور اگر وہ کج روی اختیار کرے گا تو وہی راستہ اس کے لیے آسان کر دیا جائے گا اور پھر اس پر وہ بڑھتا

چلا جائے گا۔ اور جب انسان غلط راستے پر پڑ جائے اور پھر اس پر بڑھتا چلا جائے تو ایک وقت ایسا آتا ہے جسے ہم انگریزی میں ''point of no return'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ گویا آدمی اس درجے آگے نکل گیا کہ اب واپسی کا امکان ہی نہیں۔ اس مرحلے کو قرآن حکیم ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫﴾ (البقرۃ:۷)

''اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کی سماعت پر مہر لگا دی ہے' اور اُن کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔''

اسی کیفیت کے لیے یہاں ''اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ یعنی جب انہوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا۔ اس لیے کہ اللہ کا یہ ضابطہ اور قانون ہے کہ وہ کسی کو بالجبر ہدایت کی راہ پر نہیں لانا چاہتا۔ چنانچہ آیت کے اختتام پر فرما دیا گیا: ﴿وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴾ یعنی اللہ ان لوگوں کو جو فسق و فجور ہی کی راہ اختیار کر لیں' جو کج روی کو پسند کر لیں' زبردستی ہدایت نہیں دیا کرتا۔

مذکورہ بالا آیۂ مبارکہ میں تاریخ بنی اسرائیل کے ایک دَور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے' جب اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے مابین موجود تھے اور اس کے باوجود ان کا طرزِ عمل یہ تھا۔ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سے خطاب کر کے انہوں نے فرمایا: ''اے قوم! تُو تو اس چھنال کی مانند ہے کہ جو پہلی شب میں بے وفائی کی مرتکب ہوئی ہو!''

حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اور یہود کا معاندانہ رویّہ

اگلی آیت میں بنی اسرائیل کی تاریخ کی ایک جھلک دکھائی جا رہی ہے۔ یہ قوم اپنی اس کج روی میں اس حد تک بڑھ گئی کہ جب سلسلۂ بنی اسرائیل کے خاتم الانبیاء اور آخر الرُّسل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو آپؑ کے ساتھ بھی ان کا طرزِ عمل انتہائی معاندانہ رہا۔ فرمایا گیا:

﴿ وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴾

''اور جب کہا عیسیٰ ابن مریم نے کہ اے اولادِ یعقوب! میں تمہاری طرف اللہ کا فرستادہ ہوں' میں تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں اس کی جو میرے سامنے موجود ہے تورات میں سے اور

بشارت دیتے ہوئے آیا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام ہے احمد (مجتبیٰ ﷺ)۔ پھر جب وہ ان کے پاس صریح نشانیوں کے ساتھ آئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس ایسی کھلی کھلی نشانیاں اور معجزات لے کر آئے تھے جو پہلے کسی کو نہ دیے گئے تھے۔ حسّی معجزات میں مُردوں کو زندہ کر دینے اور مٹی سے پرندوں کی تخلیق سے بڑھ کر کسی معجزے کا تصور نہیں کیا جا سکتا' لیکن علمائے یہود اور ان کے بڑے بڑے اصحابِ علم وفضل کی گراوٹ' ان کی پستی اور حق سے ان کے بُعد کا عالَم یہ ہو گیا کہ ایسے صریح معجزے دیکھ کر بھی ان بدبختوں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے' اور چونکہ جادو کفر ہے' لہٰذا یہ مرتد ہے' اور واجب القتل ہے۔ تو بنی اسرائیل نے اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ یہ گویا تاریخ بنی اسرائیل کا دوسرا دَور ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں بھی ایک مضمون' جو اِس سورۃ کے سلسلۂ کلام کی نسبت سے تو اگرچہ ضمنی کہلائے گا لیکن اپنی جگہ پر بہت اہم ہے' یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ایک عجیب شان کی حامل ہے۔ وہ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے' بلکہ شریعتِ موسوی ہی کی تجدید کے لیے آئے تھے۔ متی کی انجیل میں ''Sermon of the Mount'' میں ان کا یہ جملہ موجود ہے:

"Don't think I have come to destroy law."

یعنی ''کبھی یہ نہ سمجھنا کہ میں شریعت کو ختم کرنے آیا ہوں''۔ آپؑ شریعت کو ختم کرنے کے لیے نہیں' بلکہ شریعت کو قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کی ایک حیثیت ہے شریعتِ موسوی کے مجدّد کی اور ایک حیثیت ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے پیشرو اور آپؐ کے بارے میں بشارت وخوشخبری دینے والے کی۔ چنانچہ ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ؕ﴾ کے الفاظِ مبارکہ میں بعثتِ عیسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو پہلو بھی بیان ہو گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی جو رَوش رہی اس کو واضح کرنے کے بعد فرمایا:

﴿وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ وَہُوَ یُدۡعٰۤی اِلَی الۡاِسۡلَامِ ؕ﴾

''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ تراشے' جبکہ اسے اسلام کی طرف پکارا جا رہا ہو۔''

یہ آیت کچھ برزخی مزاج کی ہے۔ اس کا تعلق آیۂ ماسبق سے بھی جڑ جاتا ہے اور آیۂ مابعد سے

بھی۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دَور میں یہود کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ بھی موجود ہے اور بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو اُن کا سلوک رہا' وہ بھی اس کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ فرمایا گیا کہ ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف جھوٹ منسوب کریں' جبکہ انہیں اسلام کی طرف پکارا جا رہا ہو' اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو! حضرت مسیح علیہ السلام بھی دعوتِ اسلام لے کر آئے تھے اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ بھی دعوتِ اسلام لے کر آئے۔ آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

ربطِ کلام کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ قول اور فعل کے تضاد سے کوئی اُمتِ مسلمہ پستی کی کس حد تک پہنچ سکتی ہے! اس کے لیے ایک نشانِ عبرت کے طور پر تاریخ بنی اسرائیل کے یہ اَدوار سامنے لائے جا رہے ہیں۔

؏ نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

اس کے بعد آتی ہے وہ آیت جس میں یہود کے اس طرزِ عمل کا ذکر ہے جو انہوں نے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اختیار کیا' اور جس کی طرف اشارہ اس سے پہلی آیت میں موجود ہے۔ یہود کی بدبختی اور بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ وہ خود منتظر تھے آخری نبی کی بعثت کے' اور ان سے یہ توقع تھی کہ وہ بڑھ کر آپ ﷺ کا استقبال کریں گے۔ ان کے کچھ قبیلے عرب میں آ کر آباد ہی اس لیے ہوئے کہ ان کی کتابوں میں یہ خبر تھی کہ کھجوروں کی سرزمین میں آخری نبی کا ظہور ہوگا۔ چنانچہ اس اُمید میں کہ ہم اس کا وقت پالیں اور اس کے ساتھی بن سکیں' ان کے کچھ قبیلے یہاں آ کر آباد ہوئے' اور وہ اوس و خزرج کے لوگوں کو دھمکایا کرتے تھے کہ اس وقت تو تم ہم پر غالب ہو' ہمیں دبا لو جتنا چاہو' لیکن ایک وقت آنے والا ہے' اور وہ دُور نہیں' کہ نبی آخر الزّمان کا ظہور ہونے والا ہے' اور جب ہم ان کے ساتھ ہو کر تم سے جنگ کریں گے تو تم ہم پر غالب نہ آ سکو گے۔ لیکن یہود کی کہی ہوئی اسی بات کی وجہ سے اوس اور خزرج کے لوگ ایمان میں پیش قدمی کر گئے۔

بیعتِ عقبۂ اولیٰ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حج کے لیے آئے ہوئے مدینہ کے چھ افراد کے سامنے دعوت پیش کی تو انہوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور آپس میں سرگوشی کی کہ معلوم

ہوتا ہے کہ یہ وہی رسول ہیں جن کا یہود حوالہ دیا کرتے ہیں اور جن کا ذکر کیا کرتے ہیں‘ اور آ ؤ اس سے پہلے کہ یہود پیش قدمی کریں‘ ہم اُن پر سبقت کریں اور ایمان لے آ ئیں۔ تو اللہ نے انہیں ایمان کی دولت سے سرفراز فرما دیا اور یہود اس نعمت سے محروم رہے‘ اور نہ صرف محروم رہے بلکہ یہ قوم نبی اکرم ﷺ کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہی اور آپؐ کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں کھلے کھلے کافروں اور مشرکوں کو مات کر گئی۔ یہاں قرآن نے ان پر ایک تعریض کے انداز میں ان کی جو اصل صورت حال تھی‘ اس کا نقشہ اِن عجیب الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾

’’یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں‘‘۔

مولانا ظفر علی خاں نے دراصل یہیں سے اپنے اس شعر کے لیے خیال اخذ کیا ہے: ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ کے الفاظ میں خاص طور پر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہود کبھی بھی کھلے میدان میں رسول اللہ ﷺ کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ابوجہل مقابلے پر آیا تو مرنے اور مارنے کے لیے آیا اور اس نے اپنی گردن کٹالی۔ لیکن یہود میں یہ حوصلہ نہ تھا۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اے نبی! یہ یہودی کبھی آپ کے ساتھ کھلے میدان میں مقابلے پر نہ آئیں گے۔ ان کا سارا معاملہ کہیں دیواروں کے پیچھے سے اپنا تحفظ لے کر‘ کہیں چھتوں کے اوپر سے پتھر برسا کر یا دوسروں کو ابھار کر اور اشتعال دلا کر آپ کے خلاف اکسانے کی طرح کا ہی ہوگا۔ یہاں اسی کی طرف تعریض کے انداز میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ کی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں۔

’’اور اللہ تو اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا‘ اگرچہ یہ کافروں کو کیسا ہی ناگوار گزرے‘‘۔

اللہ کا یہ اٹل فیصلہ ہے اور تاریخ نسلِ انسانی کا وہ وقت آ چکا ہے کہ اس نور کا اتمام کر دیا جائے‘ اس ہدایت کی تکمیل ہو جائے‘ وہ وقت آ جائے جبکہ اعلانِ عام ہو کہ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:۳) اور اللہ کا یہ اٹل فیصلہ پورا ہو کر رہے گا۔ بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حکمتِ خداوندی کے اسی تقاضے کے تحت ہوئی

ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ' تا کہ وہ غالب کردے اس کو کُل کے کُل دین پر' خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے''۔

عالمِ واقعہ میں اللہ کے نور کے اتمام کی صورت یہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو جو ''الہدیٰ'' یعنی قرآن مجید دے کر بھیجا ہے' اس کا نور عام ہوگا۔ اس عالم میں اس قرآن مجید کا چرچا ہوگا۔ محمد ﷺ اس قرآن کی مکمل طور پر تبلیغ فرمائیں گے اور اس کے ساتھ دینِ حق یعنی جو نظامِ عدل وقسط دے کر وہ بھیجے گئے ہیں' اسے قائم و نافذ کر کے نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت فرما دیں گے۔ اسی کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ......﴾ یعنی دین کی تکمیل اور نوعِ انسانی پر نعمتِ خداوندی کا اتمام بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی صورت میں ہو کر رہے گا۔

کارِ رسالت کی تکمیل کے لیے اہل ایمان کی ذمہ داریاں

اس کے بعد اب وہ آیت آ رہی ہے جس کا اس درس کے آغاز میں حوالہ دیا گیا تھا۔ جب اللہ کا اٹل فیصلہ یہ ہے تو اب اس کے لیے اہل ایمان کو جان اور مال کھپانا ہے۔ چنانچہ یہاں اہل ایمان کو اس کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ کسی کو کسی کام پر آمادہ کرنے کے دو انداز ہوتے ہیں۔ ایک ترغیب و تشویق کا انداز ہے کہ یہ کرو گے تو یہ اجر ملے گا' یہ بدلہ ملے گا' یوں شاباش ملے گی' اس طرح تمہاری خدمات کا اعتراف کیا جائے گا' تمہیں ان خلعتوں سے نوازا جائے گا' اور دوسرا انداز یہ کہ اگر نہ کرو گے تو یہ سزا ملے گی۔ ان میں سے پہلا تشویق کا انداز ہے اور دوسرے کے اندر دھمکی اور وعید کا پہلو ہے۔ اس لیے پہلے کو ''ترغیب'' اور دوسرے کو ''ترہیب'' کہا جاتا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کے عین مرکز میں بعثتِ محمدیؐ کا مقصد معین ہوا ہے۔ اس کے لیے یہاں اہل ایمان کو جہاد کی دعوت دی جا رہی ہے اور اس کے لیے ترغیب اور ترہیب کے دونوں انداز اختیار کیے جا رہے ہیں۔ اس سورۃ مبارکہ کا پہلا رکوع بھی ترہیب پر مشتمل تھا کہ اگر دین کے تقاضوں پر عمل پیرا نہ ہو گے تو قول وعمل کے

تضاد کے مرتکب گردانے جاؤ گے‘ اللہ تمہارے طرزِعمل سے بیزار ہوگا اور تم اس کے غضب کے مستحق ٹھہرو گے‘ اور اس طرح تم گویا یہود کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے جنہوں نے یہ طرزِعمل اختیار کیا اور وہ اس مقام اور منصب سے معزول کر دیے گئے جہاں آج تمہارا تقرر عمل میں لایا گیا ہے۔

دوسرے رکوع میں ترغیب کا انداز غالب ہے‘ اگرچہ اس کی ابتدا بھی ترہیب سے کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾﴾

’’اے اہل ایمان! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں (آخرت کے) دردناک عذاب سے چھٹکارا دے دے؟‘‘

گویا یہاں یہ بات خود بخود دعیاں (implied) ہے کہ اگر تم یہ نہ کرو گے تو چھٹکارا پانے کی کوئی اُمید نہیں۔ اگر تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ محض یہ کہنے سے کہ ’’ہم ایمان لے آئے‘‘ چھٹکارا ہو جائے گا‘ تو یہ اُمید موہوم ہے‘ خیالِ خام ہے۔ جیسے سورۃ العنکبوت کے بالکل شروع میں الفاظ آئے ہیں:

﴿الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾﴾

’’ا‘ ل‘ م۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے‘ اور انہیں آزمایا نہ جائے گا؟‘‘

انہیں پرکھا نہ جائے گا‘ ان کی آزمائش نہ کی جائے گی‘ انہیں جانچا نہ جائے گا‘ انہیں امتحانوں کی بھٹیوں میں ڈالا نہ جائے گا؟ وہی بات یہاں فرمائی جا رہی ہے کہ اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ محض یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے‘ چھٹکارا ہو جائے گا تو یہ خیالِ خام ہے۔ اگر عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو ایک کاروبار کرنا پڑے گا‘ ایک مشقت جھیلنی پڑے گی‘ ایک محنت کرنی ہوگی۔ اور وہ یہ کہ:

﴿تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ تُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ﴾

’’ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر‘ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔‘‘

﴿ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾

’’یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو۔‘‘

اگر تم واقعی علم رکھتے ہو‘ اگر ہوش مند ہو‘ باشعور ہو‘ نفع اور نقصان کا صحیح فہم تمہیں حاصل ہے تو جان لو کہ یہی بہتر ہے۔ اپنی جان کا اللہ کی راہ میں دے دینا درحقیقت اس جان کو ہمیشہ کے لیے جاوداں بنا لینا ہے۔

جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾ ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے ہیں انہیں مُردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (اُن کی زندگی کا) شعور نہیں ہے''۔ اسی طرح اگرچہ بظاہر مال سے محبت ہے اور اس کو جمع کر کے سینت سینت کر رکھنے کی طرف طبیعت کا میلان ہے لیکن اگر تم حقیقت شناس اور حقیقت بین ہو تو جان لو کہ اللہ کے راستے میں اس کے دین کی سربلندی کے لیے اس کا کھپا دینا اور لگا دینا ہی بہتر ہے۔

مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے انعاماتِ ربّانی

اگلی دو آیات گویا اسی آخری ٹکڑے ﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ کی شرح ہیں جن میں ''ترغیب'' کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں ایک کے بعد دوسرے انعام اور اعلیٰ مراتب کا ذکر ہے کہ اگر یہ کرو گے تو کیا کیا کچھ ملے گا۔ تو سب سے پہلے فرمایا:

﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ ''وہ تمہاری خطائیں معاف فرمائے گا''۔

یعنی اگر تم اس راستے پر قدم بڑھاتے چلو اور اس سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش نہ کرو اس فرضِ منصبی کی ادائیگی سے پہلو تہی نہ ہو تو پھر اگر کہیں کوئی لغزش یا خطا ہو بھی گئی تو اللہ کا پہلا وعدہ تو یہ ہے کہ تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، تمہاری غلطیوں کو معاف فرما دے گا، تمہارے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گا۔ مزید برآں یہ کہ:

﴿وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ﴾

''اور تمہیں داخل کرے گا اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی اور ان پاکیزہ گھروں میں جو جنّاتِ عدن میں ہیں''۔

یعنی ہمیشہ باقی رہنے والے رہائشی باغات (residential gardens) میں تمہیں اعلیٰ مسکن عطا فرمائے گا۔

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾﴾ ''یہ ہے اصل کامیابی!''

یہ ہے اصل فوز و فلاح۔ یعنی اصل کامیابی و کامرانی آخرت کی کامیابی ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو پورے شدّ و مدّ (emphasis) کے ساتھ سورۃ التغابن میں بیان ہو چکا ہے۔ وہاں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ﴾ (آیت ۹) ''وہ ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن''۔ جو اُس روز جیتا وہ جیتا اور جو اس روز ہارا وہ ہارا۔ جو اُس روز کامیاب قرار دیا گیا وہی کامیاب ہے اور جو اُس روز ناکام قرار

پایا وہی ناکام ہے۔ چنانچہ اصل کامیابی یہی ہے‘ بڑی کامیابی یہی ہے۔

نصرتِ خداوندی اور فتح قریب کا وعدہ

﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ﴾ ’’اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت محبوب ہے‘‘۔

یہ بڑا ہی عجیب اور قابلِ توجہ پیرایۂ کلام ہے۔ اللہ کے نزدیک تو اصل کامیابی وہ ہے جس کا ذکر ہو چکا‘ لیکن ایک اور چیز کا بھی وعدہ ہے‘ جو تمہیں بہت محبوب ہے‘ اور وہ ہے:

﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ﴾

’’اللہ کی طرف سے مدد اور جلد فتح یابی۔‘‘

یعنی اللہ کی طرف سے مدد کا وعدہ بھی ہے اور اس فتح کا بھی جو زیادہ دُور نہیں ہے‘ اب یہ مرحلہ آیا چاہتا ہے‘ اللہ کے دین کا غلبہ ہوا چاہتا ہے۔ درحقیقت اس سورۂ مبارکہ کے زمانۂ نزول کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو اِن آیات کا مفہوم صحیح طور پر سامنے آتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ آیات غزوۂ احزاب کے فوراً بعد نازل ہوئیں۔ غزوۂ احزاب رسول اللہ ﷺ کی اس جدّ وجہد‘ کشمکش اور انقلابی دعوت میں ایک فیصلہ کن موڑ (turning point) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد نظر آ رہا تھا کہ گویا اب صورتِ حال تبدیل ہو جانے والی ہے۔ (Tables were to be turned) اس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احزاب کے فوراً بعد ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) [1] یعنی اے مسلمانو! اِس سال کے بعد اب قریش تم پر قطعاً حملہ آور نہیں ہوں گے بلکہ اب تم ان پر جنگ مسلط کرو گے۔ یہ ان کی طرف سے آخری حملہ تھا‘ کفر کی کمر ٹوٹ چکی اور کفار حوصلہ ہار گئے‘ اب اقدام تمہاری طرف سے ہو گا۔ اسی کا گویا نقشہ ہے جو اس آیۂ مبارکہ کے الفاظ میں سامنے آ رہا ہے۔ اللہ کی طرف سے فتح ونصرت کے وعدے کے ساتھ فرمایا جا رہا ہے:

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾﴾

’’اور (اے نبیؐ!) اہلِ ایمان کو بشارت دے دیجیے!‘‘

نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ بالا فرمانِ مبارک اور اس آیۂ مبارکہ کے مابین ایک گہرا منطقی ربط معلوم ہوتا ہے اور آپ ﷺ کا وہ قول اغلباً —— واللہ اعلم —— اسی آیۂ مبارکہ کے نزول کے بعد کی

(۱) تفسیر ابن کثیر ۳۹٦/٦

بشارت محسوس ہوتا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبیؐ! اہل ایمان کو بشارت دیجیے کہ اب وہ مرحلہ دُور نہیں ہے۔ اب اللہ کی مدد آیا چاہتی ہے اور فتح تمہارے قدم چومنے کو ہے۔ لیکن اس پورے معاملے کو ''اُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے کہ تم کامیاب ہوتے ہو یا ناکام! اس کے نزدیک تو اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ بندۂ مؤمن کا فرض ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اسے اللہ کی راہ میں لگا دے اور اپنے تمام وسائل میدان میں لا ڈالے۔ دنیا میں وہ کامیاب ہوتا ہے یا ناکام' اس سے اس کی حقیقی کامیابی اور ناکامی کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ یوم اُحد ہی کو شہید ہو گئے اور انہوں نے دین کا غلبہ اپنی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ انہوں نے وہ دَور نہیں دیکھا جب اللہ کے دین کا جھنڈا لہرا رہا تھا' جب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ عرفات میں یا وادیٔ منیٰ میں سوا لاکھ کے مجمع کو خطاب فرما رہے تھے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ناکام ہوئے۔ نعوذ باللّٰه من ذٰلك! یہی وجہ ہے کہ یہاں ان دو وعدوں کو علیحدہ علیحدہ گروپ کیا گیا ہے۔ پہلا وعدہ خطاؤں کی بخشش اور داخلۂ جنت کا ہے' جسے ''اصل کامیابی'' قرار دیا گیا ہے' اور دوسرا وعدہ اور خوشخبری ایک ایسی چیز کے بارے میں ہے جس کے لیے فرمایا گیا کہ ''جو تمہیں بہت پسند ہے''۔ انسان بربنائے طبعِ بشری اپنی جِدّ وجُہد کے نتائج کو دیکھنا چاہتا ہے' اپنی کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہوئے دیکھنے کی خواہش انسان میں فطری طور پر ہوتی ہے۔ یہاں اس کی طرف اشارہ فرما دیا گیا۔

''کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ'' کی پکار

اب ہم اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت کا مطالعہ کرتے ہیں جو ایک طویل آیت ہے۔ اور منطقی اعتبار سے یہ اس سلسلۂ مضمون کا ایک انتہائی اہم اور بلند ترین مقام ہے جو گزشتہ آیات میں چلا آ رہا ہے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾

''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو......''

اس کا تعلق اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت کے ساتھ جوڑیئے۔ وہاں فرمایا گیا تھا: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝﴾ کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول ہے اور وہ زبردست ہے' توانا ہے' غالب ہے' کمالِ حکمت والا ہے۔ اس کی حکومت اس

پوری کائنات پر چھائی ہوئی ہے' اسے کسی کی نصرت کی کوئی احتیاج نہیں۔ وہ (معاذ اللہ) ضعیف نہیں ہے کہ اسے کسی کی مدد کی احتیاج ہو۔ بایں ہمہ اگر بندۂ مؤمن اس کے دین کے غلبے کے لیے سعی کر رہا ہو' اس کے دین کی سربلندی کے لیے جان اور مال کھپا رہا ہو' اس کے رسول کے مشن کی تکمیل کے لیے جسم و جان کی توانائیوں کو صرف کر رہا ہو' اپنے مال و اسباب اور وسائل و ذرائع کو اس کی راہ میں خرچ کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی اس حد تک حوصلہ افزائی فرماتے ہیں کہ اس کی اس جدّ و جہد کو اپنی نصرت سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور بندے کے لیے اس سے اونچا مقام اور کوئی نہیں ہے کہ مخلوق ہو کر خالق کا مددگار قرار پائے' عبد ہوتے ہوئے معبود کا مددگار قرار پائے' اور معبود اپنے بندوں سے کہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾

''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو!''

اس کے لیے اب یہاں تاریخ سے شواہد لائے گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ جہاں بہت سی پستیوں کی امین ہے' وہاں اس میں رفعتیں بھی ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے ع ''ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما'' کے مصداق حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بعد اُن کے پیغام کی نشر و اشاعت میں جس تندہی کے ساتھ محنتیں کی ہیں' جو کوششیں کی ہیں' جس طرح کے مصائب جھیلے ہیں' جس طرح کی صعوبتیں اور شدائد برداشت کیے ہیں' وہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا اس پہلو سے ایک بڑا درخشاں باب ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿كَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ﴾

''جیسے کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف؟''

چونکہ یہ کام اللہ کا ہے' اللہ کے دین کی تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت مقصود ہے' لہٰذا اسے ''اللہ کی طرف نصرت'' سے تعبیر فرمایا۔ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مقصد اور اس کی غرض و غایت کو سامنے رکھیے تو کہا جائے گا کہ کون ہے جو اللہ کے دین کے غلبے اور اس کی سربلندی کی جدّ و جُہد میں میرا مددگار ہو' میرا دست و بازو بنے' میرا ممدّ و معاون ہو' اس راہ میں میرا ساتھ دے؟

آپ نے دیکھا کہ ﴿كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ اور ﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ﴾ میں نصرت کی دونوں نسبتیں آ گئی ہیں' ایک نسبت اللہ کی طرف اور دوسری رسول کی طرف۔ یعنی اللہ کی نصرت بایں معنی کہ دین اللہ کا ہے' اور رسولؐ کی نصرت اس حوالے سے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنا اصلاً رسول کا

فرضِ منصبی ہے۔ یہ دونوں نسبتیں ہمارے منتخب نصاب کے آخری مقام سورۃ الحدید میں اِن الفاظ میں بیان ہوئی ہیں: ﴿وَلِيَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَيۡبِ ؕ﴾ (آیت ۲۵) کہ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وہ جان نثار اور وفادار بندے جو غیب میں رہتے ہوئے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔ تو یہ نصرتِ خداوندی اور نصرتِ رُسل ہی گویا جہاد فی سبیل اللہ کی اصل ماہیت، اس کی اصل حقیقت، اس کا لبِّ لباب اور اس کا خلاصہ ہے۔ آگے ''مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ'' کے جواب میں حواریینِ مسیحؑ کا جواب نقل ہوا ہے:

﴿قَالَ الۡحَوَارِيُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ﴾

''حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے!''

﴿فَاٰمَنَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَكَفَرَتۡ طَّآئِفَةٌ ۚ﴾

''پھر بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا (حضرت مسیح علیہ السلام پر) اور ایک گروہ کفر پر اڑا رہا۔''

اللہ کی تائید سے اہلِ ایمان کا غلبہ

﴿فَاَيَّدۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا عَلٰى عَدُوِّهِمۡ فَاَصۡبَحُوۡا ظٰهِرِيۡنَ ﴿۱۴﴾﴾

''تو ہم نے تائید فرمائی ان کی جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں کے مقابلے میں، اور (بالآخر) وہی غالب ہوئے!''

یہاں ﴿فَاَصۡبَحُوۡا ظٰهِرِيۡنَ﴾ میں وہی لفظ ''اظہار'' اسم فاعل کی شکل میں آیا ہے جو ﴿لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ﴾ میں بطورِ فعل آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا دنیا میں غالب ہوئے اور اللہ کے رسول کا انکار کرنے والے یہودی مغلوب ہوئے۔ اور تاریخ میں پھر وہ اَدوار بھی آئے کہ جن میں ان کے لیے اپنا کوئی تشخص برقرار رکھنا بغیر اس کے ممکن نہیں رہا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیواؤں کی پناہ میں آئیں اور ان کے دامن میں اپنے آپ کو چھپائیں۔ تاریخِ انسانی کے دوران وقفے وقفے کے بعد اُن پر عذابِ خداوندی کے کوڑے بھی برستے رہے۔ کبھی بخت نصر کے حملے کی صورت میں ان پر عذابِ الٰہی آیا اور کبھی ٹائٹس رومی کی صورت میں ان پر قہرِ خداوندی نازل ہوا۔ بیسویں صدی میں ہٹلر کے ہاتھوں ان پر قیامت ٹوٹی۔ لیکن بہرحال تاریخ کی یہ انمٹ شہادت ہے کہ وہ اُس وقت سے ہمیشہ مغلوب ہی رہے ہیں۔ اس وقت بظاہر دنیا میں ان کی کچھ چلت پھرت اور کچھ حیثیت و مقام نظر آتا ہے، لیکن وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیواؤں کے طفیل اور اُن کے سہارے پر ہے۔ اور اگر یہ آج کچھ ناچ رہے ہیں تو انہی کے کھونٹے پر جو اگرچہ حضرت

عیسٰی علیہ السلام کے صحیح معنوں میں متّبعین نہیں ہیں' لیکن بہر حال ان کے نام لیوا ہیں۔

یہاں یہ سورۃ مبارکہ ختم ہوتی ہے۔ اب چند جملوں میں اس کا لبِ لباب ذہن نشین کر لیجیے۔ سورۃ مبارکہ کا مرکزی مضمون ہے محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت اور اس کی تکمیلی اور امتیازی شان' یعنی وہ دینِ حق جو آپؐ دے کر بھیجے گئے اسے پورے نظامِ زندگی پر بالفعل قائم کرنا' غالب کرنا' رائج کرنا' نافذ کرنا۔ اور وہ جو ایمان رکھتے ہوں اللہ پر اور ایمان رکھتے ہوں محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر' ان کا فرضِ منصبی ہے اس مقصد کے لیے جان اور مال کے ساتھ جہاد کرنا۔ وہ اگر یہ کرتے ہیں تو ان کے لیے سب کچھ ہے' مغفرت بھی ہے اور ہمیشہ ساتھ رہنے والے رہائشی باغات میں ان کو بہترین ٹھکانے بھی میسر آ جائیں گے۔ ان پر اللہ کی طرف سے انعام واکرام اور اعزاز کی بارش ہو گی۔ پھر مزید یہ کہ اس دنیا میں بھی نصرت اور فتح کے وعدے ہیں۔ اور مزید برآں ان کی اس طرح قدر افزائی ہو گی اور وہ بلند مقام انہیں ملے گا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مددگار قرار پائیں گے۔ اور اگر نہیں کرتے تو عذابِ الیم سے چھٹکارا پانے کی امید بھی موہوم ہے' بلکہ یہ اللہ کے غضب کو بھڑکا دینے والی بات ہے کہ انسان زبان سے دعوائے ایمان کرے' اللہ اور اس کے رسول کو ماننے کا اقرار کرے اور بالفعل اس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انکار کر دے!!

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
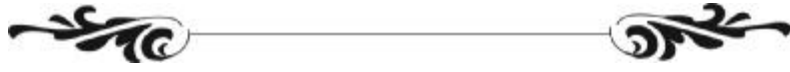
❁ ❁ ❁

درس 18

انقلاب نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا
اساسی منہاج
افراد کی تیاری کا
نبوی طریقہ کار

سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃ کی روشنی میں!

درس ۱۸

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اساسی منہاج

''افراد کی تیاری کا نبویؐ طریقہ کار''

سورۃ الجمعہ کی روشنی میں

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

سورۃ الجمعہ کے مضامین پر غور و فکر کے ضمن میں بھی ہم وہی طریق کار اختیار کریں گے جو سورۃ الصّف کے ذیل میں اختیار کیا گیا تھا کہ پہلے سورت کی مرکزی آیت کو کما حقہٗ سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے بعد ایک ایک آیت کو غور و فکر کا موضوع بنایا جائے۔ بالخصوص ہر آیت کا جو ربط و تعلق اس مرکزی آیت کے ساتھ بنتا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کے مضامین کا باہمی ربط

یہ بات اس سے پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ میں جوڑے جوڑے ہونے کی وہ نسبت جو قرآن مجید کی اکثر سورتوں میں موجود ہے' بہت ہی نمایاں ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں بلند پایہ سورتیں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دو پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں۔ چنانچہ سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون تھا نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت' جبکہ سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس مقصد بعثت کے حصول اور اس عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آپؐ کا بنیادی طریق کار کون سا تھا! —— یہاں لفظ ''بنیادی'' خاص طور پر قابل توجہ ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں قدرے تفصیل میں جانا ہوگا۔

اگرچہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اگر ہم عام مروّجہ معنوں میں نبی اکرم ﷺ کو ایک انقلابی رہنما

کہیں تو یہ یقیناً آپ ؐ کی توہین کے مترادف ہوگا' لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ داعیٔ انقلاب کا اطلاق نسل انسانی کے کسی فرد پر اگر بتمام وکمال ہوسکتا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں!! اس لیے کہ تاریخ انسانی کا ہمہ گیر ترین اور گھمبیر ترین انقلاب برپا کرنے کا سہرا بلاشبہ آپ ؐ ہی کے سر ہے۔

تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب

غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ تاریخ کے دو بڑے بڑے انقلاب جن کا بہت شہرہ ہے' محض جزوی انقلابات تھے۔ انقلابِ فرانس ہو یا انقلابِ روس' ان دونوں نے زندگی کے رخ میں کوئی ہمہ گیر تبدیلی برپا نہیں کی۔ انقلابِ فرانس میں لوگوں کے افکار اور عقائد نہیں بدلے' ان کا طرزِ معاشرت تبدیل نہیں ہوا' صرف نظامِ حکومت کا ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ یعنی شخصی حکومت کا دَور ختم ہوا اور جمہوریت کا آغاز ہوا۔ اسی طرح انقلابِ روس (Baolshewik Revolution) اگرچہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا' بلکہ اگر اسے انقلابوں کی ماں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کی کوکھ سے انقلابوں کی ایک پوری کھیپ برآمد ہوئی ہے' بایں ہمہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ذریعے بھی ایک جزوی تبدیلی ہی آسکی' یعنی محض نظامِ معیشت کا ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ اور ویسے تو کہا جا سکتا ہے کہ ایک بڑا انقلابی فکر یعنی جدلی مادیت (Dialectical Materialism) اس انقلاب کی پشت پر تھا لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو مادیت پہلے سے موجود تھی' اس نے صرف ایک قدم آگے بڑھایا اور جدلی مادیت کی شکل اختیار کرلی' اسے آپ ''مادیت'' سے ''جدلی مادیت'' تک ایک ارتقائی عمل تو کہہ سکتے ہیں' انقلابی عمل نہیں کہہ سکتے۔ گویا کہ وہاں بھی اصل تبدیلی زندگی کے محض ایک گوشے یعنی نظامِ معیشت میں واقع ہوئی کہ کوشش کی گئی کہ ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لے کر حصہ رسدی تمام افراد تک کسی قدر منصفانہ انداز میں پہنچا دیا جائے۔ اس سے قطع نظر کہ معاشی ڈھانچے میں اس تبدیلی کے ضمن میں انسان کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی اور اس کا کیا ردّعمل سامنے آرہا ہے' فی الوقت صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ دنیا کے یہ تمام انقلابات جزوی تھے' جبکہ نبی اکرم ﷺ کا لایا ہوا انقلاب ہمہ گیر تھا۔ اس انقلاب میں لوگوں کے عقائد بدلے' افکار بدلے' نظریات بدلے' زندگی کی قدریں بدلیں' نقطۂ نظر تبدیل ہو گیا' سوچ کا رُخ بدل گیا' طرزِ بود و باش بدل گئی' معیشت کا انداز بدل گیا' سیاست کے طور واطوار بدل گئے' یوں کہیے کہ زمین بدل گئی' آسمان بدل گیا۔ بلکہ یہاں یہ تلاش کرنا پڑتا ہے کہ کیا چیز نہیں

بدلی!—— اس پہلو سے کسی دوسرے انقلاب کو انقلابِ محمدی ﷺ سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہوسکتی! چنانچہ اس پہلو سے ہمارے اس دور کے برعظیم پاک وہند کے ایک بہت بڑے انقلابی ایم این رائے نے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اپنی مشہور کتاب ''Historical Role of Islam'' میں اگر یہ کہا کہ محمد ﷺ بہت بڑے انقلابی راہنما تھے تو واقعہ یہ ہے کہ غلط نہیں کہا۔

دوسری طرف یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ دنیا کے تمام اہم انقلابات کا اگر مشاہدہ کیا جائے تو ایک بات قریباً ہر جگہ مشترک نظر آئے گی کہ انقلابی فکر تخلیق کرنے والے یا پیش کرنے والے کچھ اور لوگ تھے اور اس انقلاب کو عملاً برپا کرنے کا معاملہ کچھ اور لوگوں کے ہاتھوں ہوا۔ انقلابِ فرانس کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ والٹیر' روسو اور اُن جیسے نامعلوم کتنے اہل قلم تھے جنہوں نے وہ فکر دیا کہ جس کی بنیاد پر اس انقلابی عمل کا آغاز ہوا۔ لیکن یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ انقلابِ فرانس کے عملاً برپا ہونے اور اس کی عملی رہنمائی میں ان مفکرین کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ وہ انقلاب عملاً کچھ اوباش قسم کے لوگوں کی رہنمائی میں برپا ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بڑا ہی خونی انقلاب تھا۔ اسی طرح کا معاملہ انقلابِ روس (Baolshewik Revolution) کا بھی تھا۔ اس انقلاب کے لیے انقلابی فکر دینے والا کارل مارکس جو جرمنی کا رہنے والا تھا' خود اپنی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہیں کرسکا۔ سوچیے' یہاں ایک بالکل ہی دور دراز کے ملک میں ایک فعال شخصیت لینن کے ہاتھوں وہ انقلاب برپا ہوا جس نے کارل مارکس کے دیے ہوئے فکر و فلسفہ کو دنیا میں ایک انقلاب کی عملی شکل میں ڈھالا۔ معلوم ہوا کہ انقلابی فکر دینے والے بالعموم کچھ اور لوگ ہوتے ہیں اور انقلاب برپا کرنے والے کوئی اور!

اس پس منظر میں دیکھیے تو نبی اکرم ﷺ کا معاملہ منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے۔ ایک فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور کل تیئس برس میں یعنی ایک ''life span'' کے اندر اندر انقلاب کی تکمیل ہوگئی۔ بلکہ یہ تیئس برس بھی شمسی نہیں قمری ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہمارے حساب سے وہ بمشکل بائیس برس بنتے ہیں۔ کل بائیس برس میں ایک شخص فردِ واحد کی حیثیت سے دعوت کا آغاز کرتا ہے اور پھر وہ دعوتی و انقلابی جدوجہد ان تمام مراحل کو طے کر کے جو کسی بھی انقلاب کو درپیش ہوتے ہیں' نہایت خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ اس میں آپ ﷺ کو تمسخر و استہزاء کے ابتدائی مرحلے سے گزرنا پڑا' پھر وہ شدید تشدّد (persecution) کا دور بھی آیا جس میں اہل ایمان پر وحشیانہ مظالم ڈھائے گئے' پھر وہ مرحلہ بھی آیا کہ وطن کو چھوڑنا پڑا' مکے کی سرزمین کو خیر باد کہہ کر مدینہ

منورہ کا رُخ اختیار کرنا پڑا' پھر اقدام کا مرحلہ بھی آیا اور جہاد وقتال کے مراحل سے بھی گزرنا پڑے۔ اور اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے تمام مراحل سے گزر کر کل تئیس برس کی مدت میں وہ انقلاب اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ جس کی طرف توجہ دلانے کے لیے یہ ساری بات گوش گزار کی گئی' یہ نکلا کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں اس انقلابی عمل کے مختلف مراحل بہت نمایاں ہو گئے۔ بلکہ آپؐ کے اس انقلابی عمل کا tempo اتنا شدید ہے اور وہ انسان کی توجہ کو اس درجے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کہ اس انقلابی عمل کی پشت پر کارفرما اساسی طریق کار بالعموم نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اساسی طریق کار یا منہجِ عمل اپنی جگہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ اس انقلابی جدوجہد' اس تصادم اور اس تمام تر جہاد وقتال کے لیے وہ افراد کس طور سے حاصل ہوئے کہ جن میں ہر ایک عزم وہمت اور استقامت کی چٹان ثابت ہوا۔ ان افراد کے فکر ونظر میں انقلاب کیونکر برپا ہوا اور پھر ان کی تربیت کا معاملہ کس نہج پر ہوا! گویا غور طلب بات یہ ہے کہ اس انقلابی عمل کی تہہ میں کارفرما وہ کون سا عمل تھا کہ جس کے ذریعے انفرادی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا۔ جس طرح کسی پہاڑی ندی کا زور وشور اور اس کی موجوں کا تلاطم انسان کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کہ اس کی گہرائی کی طرف توجہ نہیں ہوتی' اسی طرح نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا یہ پہلو یعنی انقلابی کشمکش اور اس میں تصادم کے مختلف مراحل کسی بھی سیرت کے سننے یا پڑھنے والے کو اس درجے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں کہ اس جدوجہد کے پس پشت کارفرما اساسی منہاج اور بنیادی طریق کار نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور ساری توجہ اسی ایک پہلو پر مرتکز ہو جاتی ہے۔

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اساسی منہاج

سورۃ الجمعہ میں درحقیقت نبی اکرم ﷺ کے اسی اساسی منہاج اور بنیادی طریق کار کو واضح کیا گیا ہے جس کے ذریعے وہ افراد تیار کیے گئے کہ جو اس انقلابی جدوجہد میں نبی اکرم ﷺ کے دست و بازو بنے اور جن کے اندر کا انقلاب بیرونی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا۔ اس مضمون کی اہمیت کو اکبر الٰہ آبادی کے ایک شعر کے حوالے سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے' بڑا پیارا شعر ہے ؎

خدا کے کام دیکھو' بعد کیا ہے اور کیا پہلے!
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

کہ اگرچہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ میں غزوۂ بدر' غزوۂ اُحد' غزوۂ احزاب' صلح حدیبیہ اور فتح مکہ

بڑے اہم نشاناتِ راہ (land marks) شمار ہوتے ہیں لیکن اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ وہ بنیادی process اور طریق کار کون سا تھا کہ جس سے انقلاب کی داغ بیل پڑی' جس سے افراد کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا' وہ افراد کہ جنہوں نے اپنی سیرت و کردار سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا نقشہ وہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں بایں طور آیا ہے کہ:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ﴾

''اہل ایمان میں ایسے جوان مرد موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچا کر دکھایا۔''

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾﴾

''تو ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے (اور گردنیں کٹوا کر سبکدوش ہو چکے' سرخرو ہو چکے) اور باقی ابھی منتظر ہیں (کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی سبکدوش ہو جائیں اور) انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

وہ مردانِ کار کس process سے اور کس طور سے تیار ہوئے تھے' یہ ہے درحقیقت سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون۔

سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت

سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت (یعنی آیت ۲) کے بارے میں پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس میں جو چار اصطلاحات وارد ہوئی ہیں' ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں چار مقامات پر ان کا اعادہ کیا گیا ہے اور یہ ایک نہایت غیر معمولی بات ہے۔ سب سے پہلے سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دعا میں وہ الفاظ آئے' پھر چند رکوعوں کے بعد اللہ کی طرف سے اس دعا کی قبولیت کے اعلان کے ذکر میں انہی الفاظ کا اعادہ ہوا' پھر سورۂ آلِ عمران میں اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے بیان میں کہ اللہ نے تم پر اپنا ایک رسول بھیج دیا ہے پھر انہی چار اصطلاحات کو دہرایا گیا اور پھر آخری مرتبہ یہ چاروں اصطلاحات یہاں سورۃ الجمعہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اور یہاں تو یہ الفاظ یا یہ اصطلاحات گویا کہ اس پوری سورت کے لیے بمنزلۂ عمود ہیں' یا یوں کہہ لیجیے کہ انہیں اس سورت کے مرکزی مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے آیئے کہ اس سورۂ مبارکہ پر اور بالخصوص اس کی آیت ۲ پر نگاہوں کو پورے طور پر مرتکز کر دیا جائے۔

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝﴾

دیکھئے! جس طرح سورۃ الصّف کی مرکزی آیت کا آغاز ہوا تھا: ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ﴾ کے الفاظ سے‘ اسی طرح سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت کا آغاز ہو رہا ہے ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ کے الفاظِ مبارکہ سے۔ دونوں مقامات پر ایک ہی اسلوب ہے اور نہایت ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ ’’وہی اللہ ہے جس نے اٹھایا اُمیین میں ایک رسول انہی میں سے‘‘۔ بعث کے معنی ہیں کسی چیز کا اٹھانا یا برپا کرنا۔ چنانچہ ’’بعث بعد الموت‘‘ کی اصطلاح موت کے بعد جی اٹھنے کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ لفظ ’’اُمّیین‘‘ پر ہم ان شاء اللہ بعد میں گفتگو کریں گے کہ یہ اس سورۂ مبارکہ کے اہم مضامین میں سے ہے۔ ابھی ذرا وقتی طور پر اس لفظ سے توجہ کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھئے۔ اگلے الفاظ اس اعتبار سے نہایت اہم ہیں کہ ان میں رسول کے طریقِ کار یا منہجِ عمل کا بیان ہے کہ وہ رسول جو اللہ نے مبعوث فرمایا ہے‘ کیا کرتے ہوئے آیا ہے: ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ﴾ ’’تلاوت کرتا ہے ان لوگوں پر اس کی آیات (یعنی اللہ کی آیات)‘ اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی‘‘۔ آیت کا آخری ٹکڑا حسب ذیل ہے: ﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝﴾ ’’اور اگرچہ وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے‘‘۔

چار اہم اصطلاحات

یہ ہے وہ آیۂ مبارکہ جس کے بارے میں عرض کیا گیا ہے کہ یہ مضمون کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے۔ اس میں چار اصطلاحات وارد ہوئی ہیں: i) تلاوتِ آیات‘ ii) تزکیہ‘ iii) تعلیم کتاب‘ اور iv) تعلیمِ حکمت۔ ان چاروں پر آپ غور کریں گے تو پہلی بات نمایاں ہو کر آپ کے سامنے یہ آئے گی کہ ان چار میں سے کم از کم دو کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ان سے مراد سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں! ظاہر بات ہے کہ تلاوتِ آیات سے مراد قرآن

مجید کی آیات ہی کا پڑھ کر سنانا ہے۔ اسی طرح تعلیم کتاب سے مراد بھی قرآن حکیم ہی کی تعلیم ہے۔ البتہ دو اصطلاحات سے کتاب اللہ کے سوا کوئی اور شے مراد ہے۔ چنانچہ عمل تزکیہ کے بارے میں ایک گمان یہ ہوسکتا ہے کہ اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا اپنا علیحدہ تشخص ہے۔ اسی طرح لفظ ''حکمت'' کے بارے میں بھی ہمارے ہاں ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا اور بعض بڑے بڑے ائمہ دین کی طرف سے' جن میں امام شافعی ؒ بھی شامل ہیں' یہ خیال سامنے آیا ہے کہ اس سے مراد سنّتِ رسول ﷺ ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے تمام تر احترام کے باوصف یہاں ہمیں یہ غور کرنا ہوگا کہ ان چاروں اصطلاحات کا باہمی ربط و تعلق کیا ہے اور خود قرآن حکیم کے دوسرے مقامات سے ان کا کیا مفہوم متعین ہوتا ہے۔ جس طرح سورۃ العصر کے بارے میں عرض کیا گیا کہ شرائط نجات کے بیان میں وہ چاروں چیزیں جو وہاں بیان ہوئی ہیں ان میں باہم بڑا گہرا معنوی ربط موجود ہے۔ ایمانِ حقیقی کا لازمی نتیجہ عمل صالح ہے۔ اور عمل صالح اگر پختگی کو پہنچے گا تو اس سے تواصی بالحق کے برگ و بار لازماً ظاہر ہو کر رہیں گے۔ اسی طرح اگر صحیح معنی میں حق کی دعوت دی جائے تو یقیناً صبر کا مرحلہ آ کر رہے گا' تکالیف و مشکلات آئیں گی اور انہیں جھیلنا ہوگا۔ تو جس طرح سورۃ العصر کی ان چار اصطلاحات میں باہم گہرا ربط ہے' اسی طرح سورۃ الجمعہ کی متذکرہ بالا چار اصطلاحات بھی باہم مربوط ہیں۔

تزکیے کے بارے میں تفصیلی گفتگو تو بعد میں ہوگی' سردست اتنی بات نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید مدعی ہے کہ تزکیہ کا اصل ذریعہ وہ خود ہے۔ سورۂ یونس میں صاف الفاظ میں فرما دیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ یعنی ''اے لوگو! تمہارے پاس آ چکی ہے تمہارے ربّ کی طرف سے ایک موعظت' ایک نصیحت جو شفا ہے تمہارے سینوں کے امراض کے لیے''۔ یہ قرآن تمہارے تمام باطنی اور روحانی امراض کا مداوا بن کر نازل ہوا ہے۔ تزکیۂ نفس یا تزکیۂ باطن کا اصل ذریعہ خود قرآن ہے۔ اور جہاں تک ''تعلیم حکمت'' کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۂ بنی اسرائیل میں وہ آیت وارد ہو چکی ہے جو اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہے کہ حکمت کا اصل سرچشمہ بھی خود قرآن ہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤی اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ ''یہ ہے وہ چیز کہ (اے محمد ﷺ) آپ پر وحی کی ہے آپ کے ربّ نے از قسم حکمت!'' تو معلوم ہوا کہ یہ چاروں اصطلاحات یعنی تلاوتِ آیات' تزکیہ' تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت درحقیقت قرآن مجید ہی کے گرد گھوم رہے ہیں اور ان سب کا محور و مرکز قرآن

مجید ہی ہے۔ گویا بالفاظِ دیگر محمد رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب یہی قرآن مجید ہے' جس کے بارے میں مولانا حالی نے بڑے پیارے انداز میں کہا تھا ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

غور کیجیے' محمد رسول اللہ ﷺ نے افراد کی زندگیوں میں وہ عظیم انقلاب کیسے برپا فرمایا! ان کے فکر اور ان کے کردار میں جو ہمہ گیر تبدیلی آئی وہ کیونکر آئی؟ اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس تمام تبدیلی کی بنیاد اور اساس خود قرآن حکیم ہے۔ تو آیئے کہ ہم ان چار اصطلاحات پر اپنی توجہات کو مرکوز کریں!

تلاوتِ آیات

نبی کریم ﷺ کا پہلا کام یا آپ کے فرائض چہارگانہ میں سے پہلا فریضہ ہے تلاوتِ آیات' جس کے لیے یہاں الفاظ لائے گئے: ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ﴾ —— ''تَلَا' یَتۡلُوۡ'' اگر کسی صلے کے بغیر آئے تو اس کے معنی خود پڑھنے کے ہوتے ہیں اور جب اس پر ''عَلٰی'' کا اضافہ ہو جائے' جیسے ''تَـلَا عَلَیۡہِ'' تو اس کے معنی ہوں گے کسی کو پڑھ کر سنانا۔ کارِ نبوت یا کارِ رسالت کا سرآغاز یہی تلاوتِ آیات ہے۔ دعوت کا آغاز تلاوتِ آیات ہی سے ہوتا ہے۔

لفظ آیات پر اس سے قبل ہمارے ان اسباق میں گفتگو ہو چکی ہے۔ غور کیجیے کہ آیات یا نشانیوں کا حاصل کیا ہے! ہم پڑھ چکے ہیں کہ ان آیات سے اصل مقصود ذہن کو اللہ کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ اللہ کی یاد دلوں میں تازہ ہو جائے' اللہ کی معرفت اور اس پر ایمان قلوب میں اُجاگر ہو جائے۔ یہی آیات ہیں کہ جو پھر انسان کو بعث بعد الموت کی طرف اور جزا و سزا کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ گویا ہر اعتبار سے اوّلین کام تلاوتِ آیات ہی بنتا ہے۔ قرآن مجید کی حکمتِ نزولی سے ہمیں اس کی مزید تائید ملتی ہے کہ قرآن مجید میں مکی سورتوں میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان سب کا بنیادی موضوع ایک ہی ہے اور وہ ہے توحید' کہ اصل مقصود یہ ہے کہ ایمان باللہ دلوں میں جاگزیں ہو جائے' ہستی باریٔ تعالیٰ کا یقین راسخ ہو جائے' اس کی صفاتِ کمال کا علم حاصل ہو جائے' اس کی توحید پر دل ٹھک جائے' جزا و سزا' بعث بعد الموت' حشر نشر اور جنت و دوزخ پر ایک یقین محکم پیدا ہو جائے' نبوت و رسالت اور انزالِ وحی و کتب کے ضمن میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ یہ ہے اصل اہمیت کی چیز' یہ ہے کارِ رسالت کا نقطۂ آغاز!

قرآن حکیم کی آیات نے آ کر لوگوں کے ذہنوں سے تمام ملحدانہ خیالات' مشرکانہ عقائد اور اس

کائنات اور خود اپنے بارے میں انسان کے قائم کردہ تمام غلط نظریات کو دھو دیا اور صاف کر دیا۔ اس تطہیر ذہنی وفکری کا اصل ذریعہ ہے تلاوتِ آیات!

ایک فرد کے معاملے کو ذہن میں رکھ کر آپ اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایک فرد میں اسلامی انقلاب آ جائے تو ظاہر بات ہے کہ آپ کو سب سے پہلے اس کی سوچ اور اس کے نقطۂ نظر کا جائزہ لینا ہوگا اور اس کے فکر کی اصلاح سے کام کا آغاز کرنا ہوگا۔ اگر آپ چھوٹتے ہی اسے کچھ شعائر اسلامی کا احترام کرنے یا نماز روزے کی تلقین کریں گے تو یہ ایک غیر حکیمانہ ترتیب ہوگی۔ آپ کو سب سے پہلے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ اُس شخص کا فکر کیا ہے' اس کی سوچ کیا ہے' آیا وہ اس کائنات کو محض ایک حادثہ سمجھتا ہے اور اس کا یہ خیال ہے کہ یہ نظام از خود چل رہا ہے یا وہ مانتا ہے کہ اس کا کوئی خالق' مالک اور مدبر بھی ہے!! اسی طرح یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ اسی دُنیوی زندگی کا کل زندگی سمجھتا ہے یا حیاتِ بعد موت کا کوئی تصور اس کے ذہن میں موجود ہے! —— اور آیا وہ صرف عقل اور حواس ہی کو اپنے لیے حصولِ علم کا ذریعہ اور ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ سمجھتا ہے یا یہ کہ وہ کسی ماوراء عقل یا ماوراء حواس ذریعہ علم (source of knowledge) کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہے؟ اگر آپ کی اس انقلابی کوشش کا آغاز یہاں سے نہیں ہوگا تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی کوششیں بار آور نہیں ہوں گی۔ اگر ذہن پر مادہ پرستی' الحاد اور مختلف مشرکانہ اوہام کا تسلط ہے تو سب سے پہلے ان کی تطہیر لازم ٹھہرے گی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جس ماحول میں وہ انقلاب برپا فرمایا اس میں تلاوتِ آیات کے ذریعے لوگوں کی ذہنی اور فکری تطہیر کے عمل کو مقدم رکھا۔ مادہ پرستی' الحاد اور مشرکانہ اوہام کے زہر سے قلوب واذہان کو پاک کر کے مثبت طور پر دلوں میں ایمان باللہ' ایمان بالآخرت اور ایمان بالوحی اور رسالت کی بنیادیں قائم کیں۔ یہ ہے درحقیقت انقلابِ محمد ﷺ کا نقطہ آغاز۔ یہاں سے بات آگے چلتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ دعوت وتبلیغ کے بارے میں جتنی اصطلاحات بھی وارد ہوئی ہیں ان سب کا مبنیٰ' ان سب کا مرکز اور محور قرآن مجید خود اپنے آپ کو قرار دیتا ہے۔ دعوت وتبلیغ کے ضمن میں ''انذار وتبشیر'' انبیاء کرام کا ایک بنیادی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ انذار کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ﴾ (الانعام: ١٩) ''مجھ پر یہ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ذریعے سے خبردار کر دوں''۔ معلوم ہوا کہ

انذار کا اصل ذریعہ خود قرآن حکیم ہے۔ اسی طرح تبشیر کے بارے میں فرمایا: ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الۡمُتَّقِيۡنَ وَتُنۡذِرَ بِهٖ قَوۡمًا لُّدًّا ۝﴾ (مریم) ''(اے نبیؐ!) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا ہے' تا کہ آپ اسی کے ذریعے اہل تقویٰ کو بشارت دیجیے اور اسی کے ذریعے آپ انذار فرمایئے اور خبردار کیجیے جھگڑالو قوم کو''۔ گویا انذار ہو یا تبشیر دونوں کا ذریعہ اور مرکز و محور خود قرآن ہے۔

اسی طرح انبیاء کا ایک فریضہ ''تذکیر'' بھی ہے یعنی یاد دہانی کرانا' نصیحت کرنا۔ سورۂ قٓ کی آخری آیت میں اس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿فَذَكِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مَنۡ يَّخَافُ وَعِيۡدِ ۝﴾ ''تذکیر فرمایئے اس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہو''۔ اسی طرح فرائض نبوت و رسالت کی تعبیر کے ضمن میں ایک اہم اصطلاح ''تبلیغ'' کی ہے۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ﴾ ''(اے نبیؐ) پہنچا دیجیے تبلیغ فرمایئے اُس کی جو نازل کیا گیا آپ پر آپ کے رب کی طرف سے''۔ الغرض دعوت و تبلیغ کے ضمن میں قرآن حکیم کی جو بھی بنیادی اصطلاحات ہیں مثلاً انذار و تبشیر اور تذکیر و تبلیغ' ان سب کا مرکز و محور خود قرآن ہے۔ چنانچہ سیرت مطہرہ میں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ آپؐ نے ہر جگہ قرآن ہی کو پیش کیا' اپنی بات کہنے اور اپنی تقریر کرنے سے حتی الامکان احتراز فرمایا۔ بعض لوگوں نے خطباتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی قلیل تعداد میں خطبات دستیاب ہو سکے ہیں۔ آپؐ کی گفتگو نہایت جامع اور مختصر ہوتی تھی اور جس جگہ بھی آپؐ دعوت پہنچانے کے لیے تشریف لے جاتے قرآنی آیات لوگوں کو پڑھ کر سناتے اور ان کے ذریعے انذار' تبشیر اور تذکیر فرمایا کرتے تھے کہ یہ ایک کلام ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ یہ ایک پیغام ہے جس کو لے کر میں آیا ہوں۔ اسی قرآن کے ذریعے سے آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ تو گویا انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا نقطۂ آغاز ہے تلاوتِ آیات اور اس کے ذریعے انذار و تبشیر' تذکیر و نصیحت اور دعوت و تبلیغ!

تزکیہ

﴿يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ﴾ کے بعد اب آگے چلیے! ﴿وَيُزَكِّيۡهِمۡ﴾۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں بدقسمتی سے ہمارے ہاں سب سے زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور یہ خیال عام ہے کہ قرآن مجید نے شاید تزکیۂ نفس کا کوئی طریقہ ہمیں عطا نہیں فرمایا! بلاشبہ یہ بہت بڑا سوئے ظن ہے۔ اسی

طرح بعض لوگوں کے طرزِ عمل سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سوئے ظن میں مبتلا ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے تزکیۂ نفس کا کوئی طریقہ ہمیں عطا نہیں فرمایا۔ میں پھر عرض کروں گا کہ یہ بہت بڑا سوئے ظن ہے قرآن حکیم سے بھی اور محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی۔

تزکیے کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس مرحلے پر اسے اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ نوٹ کیجیے کہ تزکیہ کرنا انسان کا مطلوب ہے اور انسان مجموعہ ہے دو چیزوں کا۔ ایک ہے اس کی فکر اور اس کی سوچ اور دوسری چیز ہے اس کا عمل اور اس کی روش یا اس کا وہ طرزِ عمل جو وہ زندگی میں اختیار کرتا ہے۔ کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں جن کے فکر و عمل میں بُعد یا تضاد پایا جاتا ہے۔ ایسے شخص کو آپ ایک مریض شخصیت قرار دیتے ہیں' اسے نارمل انسان نہیں قرار دیا جاتا' ورنہ ایک نارمل انسان کا ناقابل تقسیم اکائی (intergrated whoel) ہوتا ہے' اس کا عمل اور اس کا رویہ درحقیقت اس کے نظریات' اس کے افکار' اس کی سوچ اور اس کی فکر پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر سوچ غلط ہے' نقطۂ نظر غلط ہے' قلوب و اذہان پر اگر غلط نظریات و افکار کا تسلط ہے تو ظاہر بات ہے کہ عمل از خود غلط ہو جائے گا۔ عمل کو درست کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے سوچ کو درست کیجیے' نقطۂ نظر کی اصلاح کیجیے' فکر کو صحیح بنیادوں پر استوار کیجیے' اسے صحیح اساس پر reconstruct کیجیے اور تب توقع رکھیے کہ اس کا عمل درست ہوگا اور صحیح خطوط پر استوار ہوگا۔ قرآن مجید کا طریق تزکیہ یہ ہے۔ چنانچہ اس آیت میں تزکیے کا ذکر دراصل ﴿يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ﴾ کے نتیجے کے طور پر آیا ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کے ذریعے سے جب انسان کے فکر کی اصلاح ہوگئی' اس کے نظریات درست ہو گئے' الحاد و مشرکانہ اوہام کی جڑیں جب انسان کے ذہن اور اس کے قلب سے کٹ گئیں تو گویا اس طریقے سے غلط اعمال' غلط کردار اور غلط عادات کی جڑ بھی کٹ گئی۔ اس لیے کہ ان کے لیے اب غذا مہیا نہیں ہو رہی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ غلط اعمال بالکل اس طرح سے انسانی سیرت سے علیحدہ ہو جائیں گے جس طرح سے پت جھڑ کے موسم میں پتے درختوں سے گر جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے تزکیۂ نفس کے ضمن میں ہمارے صوفیاء نے جو مختلف طریقے اختیار کیے ہیں وہ طریق نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتے۔ ہماری ایک بڑی بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد ہمارے ہاں اس وحدتِ فکر و عمل میں بتدریج زوال آتا چلا گیا جو دورِ خلافت راشدہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ کچھ لوگ قانون اور فقہ کے ماہر بن گئے اور کچھ نے تزکیۂ نفس کے میدان کو اختیار کر لیا۔ اس

طریقے سے مختلف گوشوں میں یہ تمام امور بڑھتے چلے گئے اور ہر گوشہ اپنے ہی انداز میں ترقی کرتا اور پروان چڑھتا رہا۔ اس طرح وہ وحدت فکر و عمل جو قرآن مجید نے عطا کی تھی' مجروح ہوئی۔ چنانچہ تزکیۂ نفس کے معاملے میں نمعلوم کہاں سے یہ نظریات لیے گئے اور کہاں سے یہ نفسیاتی ریاضتیں اور مشقتیں اخذ کی گئیں کہ جن کے ذریعے سے تصفیۂ باطن' تزکیۂ نفس اور تربیتِ روحانی کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ میں گہرے احساس کے ساتھ اور علیٰ وجہ البصیرت یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس میدان میں طریقِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے کچھ زیادہ ہی دور ہوتی چلی گئی۔ نبی اکرم ﷺ کا طریقۂ تربیت اور اسلوبِ تزکیہ اس سے بہت مختلف تھا۔

نبی اکرم ﷺ نے تزکیۂ نفس کے لیے جو طریقہ اختیار فرمایا تھا وہ یہی تھا کہ پہلے اس قرآن کے ذریعے سے فکر کی تطہیر کی جائے' نقطۂ نظر اور سوچ کی اصلاح کی جائے' نتیجتاً غلط اعمال پت جھڑ کے پتوں کی طرح ازخود جھڑ جائیں گے یا جیسے اس درخت کے پتے سوکھ کر جھڑ جاتے ہیں جس کی جڑ کاٹ دی گئی ہو۔ یہ ہے تزکیہ کا عمل اور جان لیجیے کہ قرآن مجید ہی درحقیقت اس عمل تزکیہ کا بھی محور ہے۔ ''تلاوتِ آیات'' کی طرح تزکیے کی اساس اور بنیاد بھی یہی قرآن ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس معاملے میں جو طریقے اختیار کیے گئے ان میں بالعموم قرآن حکیم کو نظرانداز کر دیا گیا۔ علامہ اقبال نے اس تلخ حقیقت کی جانب اپنے ان اشعار میں بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے: ؎

صوفی پشمینہ پوشِ حال مست
از شراب نغمہ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

کہ اس عمل تزکیہ کا سارا تعلق قرآن حکیم سے تو کٹتا چلا گیا اور صوفیوں کا حال بالعموم یہ ہو گیا کہ عراقی یا اس قبیل کے دیگر شعراء کے اشعار سے تو ان کے دلوں میں حرارت پیدا ہوتی ہے لیکن قرآن کو سن کر اُن کی آنکھیں پرنم نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ تلاوتِ قرآن کے ذریعے سے اندرونی کثافتوں اور کدورتوں کی صفائی کا جو طریقہ تھا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا' وہ متروک ہوتا چلا گیا اور تزکیہ کا عمل جو درحقیقت براہِ راست نتیجہ تھا ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ کا اسے اس کی اصل سے کاٹ دیا گیا۔ علامہ اقبال نے بعض حقائق کی تعبیر بڑی خوبصورتی سے کی ہے اور اس اعتبار سے میری گفتگو میں اُن کا بار بار

حوالہ آ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زاں کہ اُو گم اندر اعماقِ دل است

کہ ابلیس کو قتل کر دینا اور اس کو بالکل ختم کر دینا بڑا مشکل کام ہے' اس لیے کہ وہ تو لوگوں کے وجود کے اندر سرایت کر جاتا ہے' دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ یہ درحقیقت اس حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ترجمہ یا ترجمانی ہے کہ جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (۱)

''بے شک شیطان تو انسان کے وجود کے اندر اس طرح جاری و ساری ہو جاتا ہے جیسے (اس کی رگوں میں) خون دوڑتا ہے''۔

اس کے بعد علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

اس شعر کے پہلے مصرعے میں بھی درحقیقت ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ اس پر صحابہؓ میں سے واقعتاً کسی نے بڑی ہمت کر کے سوال کیا کہ حضور! کیا آپؐ کے ساتھ بھی شیطان ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں ہے' لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حدیث کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ع

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی

یعنی بہتر یہ ہے کہ تم اس شیطان کو مسلمان کر لو! لیکن اس کا طریقہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ ع

کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

اسے قرآن کی شمشیر سے قتل کرو۔ تمہارے اندر یہ غلط خیالات' غلط رجحانات' غلط جذبات اور غلط شہوات پیدا ہو رہی ہیں تو یہ درحقیقت تمہاری غلط سوچ وفکر اور تمہارے نقطۂ نظر کے کج ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ یہ قرآن ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہاری سوچ کو صحیح کرے گا' تمہارے نقطۂ نظر کو درست کرے گا' اور تمہارے نظامِ اقدار (Value System) کو صحیح بنیادوں پر استوار کرے گا۔ یہ ہے وہ طریقہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاعتکاف باب زیارۃ المرأۃ زوجھا فی اعتکافہ

کہ جس سے تمہاری شخصیت میں انقلاب آئے گا اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غلط عادات اور غلط افکار کے دھبے تمہاری شخصیت سے خود بخود دور ہوتے چلے جائیں گے اور باطن کے اس انقلاب کے بعد ہی تم اس قابل ہوسکو گے کہ خارج میں بھی انقلاب برپا کرسکو!

میں یہاں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس انقلابی عمل میں قرآن حکیم کو جو اہمیت حاصل ہے اور جس کو بڑے ہی اجمال کے ساتھ مولانا حالی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں اس حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے کما حقہٗ سمجھا ہے اور اس کا ادراک کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی عظمت کا بیان جس طرح ہمیں ان کے ہاں ملتا ہے، وہ اس دَور کے کسی اور شخص کے ہاں نہیں ملتا۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمایے ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
آن کتابِ زندہ قرآن حکیم
حکمت اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثل حق پنہاں و ہم پیداست اُو
زندہ و پایندہ و گویاست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

ان اشعار میں سے آخری شعر میں علامہ اقبال نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ جب یہ قرآن کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے، اس کے اندر ایک عظیم انقلاب آجاتا ہے، اس کی سوچ، اس کا فکر اور اس کے نظریات بدل جاتے ہیں، اس کی اقدار، اس کا نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب گویا کہ وہ مکمل طور پر ایک بدلا ہوا انسان ہے اور اس کے اندر سے

جو یہ تبدیلی ابھری ہے، یہی درحقیقت صحیح طور پر خارج میں ایک تبدیلی برپا کردے گی اور اس طرح تمام غلط رویے اور تمام غلط اعمال خودبخود دھوتے چلے جائیں گے، کیونکہ اندر سے ان کو غذا دینے والی جڑیں اب کاٹی جا چکی ہیں۔

تعلیم کتاب

تلاوتِ آیات اور تزکیۂ نفوس کے بعد تیسرا مرحلہ ''تعلیمِ کتاب'' کا ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا:

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾

''اور وہ تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب کی''۔

یہاں ایک بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ جیسا کہ آغاز میں عرض کیا جا چکا ہے ''تلاوتِ آیات'' میں بھی پیشِ نظر قرآن ہے۔ لیکن یہاں پھر جو کتاب کا لفظ آیا ہے تو اس میں یقیناً قرآن مجید کا کوئی دوسرا پہلو پیشِ نظر ہے۔ اس طرح مختلف الفاظ سے قرآن مجید ہی کے مختلف گوشوں یا مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید میں لفظ ''کتاب'' بالعموم قانون کے لیے آتا ہے، مثلاً کسی چیز کے وجوب اور فرضیت کا بیان ''کُتِبَ'' کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جیسا فرمایا گیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ ''تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا'' ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ ''تم پر قتال فرض کر دیا گیا''۔ ایسے ہی وصیت کے وجوب کے بارے میں جو ابتدائی حکم تھا اس کے الفاظ ہیں: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ......﴾ ''تم پر واجب کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ موجود ہو اور اگر وہ کچھ مال چھوڑ کر جا رہا ہو تو والدین اور رشتے داروں کے لیے وصیت کر جائے!'' کہیں آتا ہے: ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ......﴾ ''یہاں تک کہ قانون اپنی اصل مدت کو پہنچ جائے''۔ تو لفظ ''کتاب'' کا اطلاق اس کی پوری ہمہ گیریت کے ساتھ پورے قرآن مجید پر بھی ہوگا۔ لیکن جب قرآن کے مختلف پہلوؤں کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جا رہے ہوں تو ''کتاب'' سے مراد قوانین اور احکام ہوں گے۔ چنانچہ آیت زیرِ مطالعہ میں انقلابِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لیے مختلف الفاظ آ رہے ہیں۔ سب سے پہلے فرمایا: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ اور یہاں ''تلاوتِ آیات'' سے مراد لازمی طور پر قرآن حکیم ہی کی آیات کی تلاوت ہے۔ اس کے بعد ﴿يُزَكِّيْهِمْ﴾ کے الفاظ میں تزکیۂ نفوس کا ذکر کیا گیا جو اسی کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ پھر

﴿یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ﴾ میں جو لفظ ''کتاب'' دوبارہ آیا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد احکامِ شریعت (DOs & DON'Ts) ہیں' یعنی یہ کرو اور یہ نہ کرو! یہ حلال ہے اور یہ حرام!

احکامِ شریعت میں حکمت تدریج

حلال و حرام کے احکام دینے میں یہ تدریج اور ترتیب برقرار رکھی گئی ہے کہ انہیں قلوب واذہان کو بدلے بغیر نافذ نہیں کیا گیا۔ جب ذہن وفکر کی تبدیلی عمل میں آ چکی' دلوں کی دنیا میں ایمان جاگزیں اور راسخ ہو چکا اور بنیادی طور پر برے کردار اور برے اخلاق سے انسان کا دامن صاف ہو چکا تو اب یوں سمجھئے کہ گویا زمین میں ہل چل چکا ہے اور وہ بیج ڈالے جانے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اب بیج ڈالیں گے تو وہ بیج بارآور ہوگا' نتیجہ خیز ہوگا۔ زمین کو تیار کیے بغیر بیج ڈال دیا جائے تو بیج ضائع ہو جائے گا۔ چنانچہ جب ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ﴾ کا عمل کیا جا چکا اور تزکیے کے بنیادی تقاضے پورے ہو چکے' تب کہا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو! اور اس وقت ہر حکم کو پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کیا گیا۔ غور کیجیے کہ قرآن میں پہلے ہی حلال اور حرام کے احکام کیوں نہیں آ گئے اور ان کا نزول اتنی دیر کے بعد کیوں ہوا؟ یا پورا قرآن یک دم کیوں نازل نہیں کر دیا گیا؟ اس کی وجہ یہی حکمت تدریج ہے۔ پہلے وہ آیات اور سورتیں اُتریں جنہوں نے قلوب واذہان کی دنیا میں ہل چلایا اور اس میں سے کثافتوں کو نکال کر باہر پھینک دیا' ایمان کی بنیادوں کو استوار کیا' نتیجتاً بنیادی انسانی اخلاق پروان چڑھے اور گندگیوں سے سیرتیں پاک ہو گئیں۔ اس طرح جب یہ زمین پوری طرح تیار ہو گئی تو اس میں بیج ڈالا گیا اور یہ بیج خوب بارآور ہوا۔ یہ ہے وہ حکمت اور تدریج کہ جو قرآن مجید نے اپنے نزول میں ملحوظ رکھی' یا صحیح تر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ قرآن کے نازل کرنے والے نے اس کے نازل کرنے میں پیش نظر رکھی اور اسی حکمت اور اسی تدریج کے ساتھ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے انقلاب برپا کیا۔

یہ اسی کا مظہر ہے کہ ذہنی وقلبی تربیت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو بھی حکم دیا گیا وہ انہوں نے بلاتامل قبول کیا۔ انہیں جس چیز کے چھوڑنے کو کہا گیا وہ انہوں نے فوراً ترک کر دی۔ غور کیجیے کہ شراب جیسی چیز جسے طبی دنیا میں بھی ''habit making'' مانا جاتا ہے اور جو انسان کے پورے جسمانی نظام کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جاتی ہے کہ پھر اس کا دفعتاً چھوڑ دینا نقصان دہ ہو سکتا ہے' جب اس کی حرمت کا حکم آتا ہے تو قرآن مجید اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا اعجاز دیکھئے کہ شراب کا جام اگر کسی کے ہونٹوں تک بھی پہنچا ہوا تھا تو اس کا ایک گھونٹ اس کے اندر نہیں گیا۔ شراب کی حرمت کے

اعلان کے ساتھ ہی اس کے تمام برتن توڑ ڈالے گئے اور مدینے کی گلیوں میں شراب کی ندیاں بہہ نکلیں۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے کہ جن کی گھٹی میں شراب تھی‘ جن کے ہاں شراب کا بالکل وہی تصور تھا جو آج آپ کو مغربی تہذیب میں نظر آتا ہے کہ پانی تو پانی ہے‘ لیکن پینے کی اصل شے شراب ہے۔ شراب ان کی تمدنی زندگی کا جزولاینفک تھی‘ شراب پیتے ہوئے ان کی ساری ساری عمریں بیت گئی تھیں‘ شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی‘ لیکن جب شراب کی حرمت کا حکم آ گیا تو انہوں نے اس کو کسی توقف کے بغیر چھوڑ دیا‘ اور اس شان کے ساتھ چھوڑا کہ پھر پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ یہ درحقیقت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ ہے اور اس معجزے کی بنیاد یہی تدریج اور حکمت ہے۔

احکام کی تنفیذ سے پہلے ان کے دلوں میں ایمان راسخ ہو چکا تھا۔ یہ یقین پیدا ہو چکا تھا کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہہ رہے ہیں اپنی طرف سے نہیں‘ اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں ﴿وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ۝ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ يُّوۡحٰى ۝﴾ انہیں اللہ کی ذات اور آخرت پر یہ پختہ یقین حاصل ہو چکا تھا کہ مرنے کے بعد اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے‘ جہاں تمام اعمال کی جواب دہی ہو گی اور یہ کہ اصل زندگی آخرت کی ابدی زندگی ہے۔ جب یہ یقین پیدا ہو چکا تو اب کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ جب سود کی حرمت کا حکم آیا تو اس کے لیے کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں پڑی۔ تجارت کے ساتھ اس کی ظاہری مشابہت کی بناء پر اگر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ ﴿اِنَّمَا الۡبَيۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا﴾ تو جواب صرف یہ دیا گیا: ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾
کہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔ تو جو کوئی اللہ کو مانتا ہو اور یہ ایمان رکھتا ہو کہ محمد (ﷺ) یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے‘ اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں‘ تو اب اس کے لیے چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس کے برعکس امریکہ میں بڑے ٹھوس اعداد و شمار کی بنیاد پر شراب پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ شراب نوشی کے نقصانات گنوائے گئے‘ بتایا گیا کہ ٹریفک کے حادثات اکثر و بیشتر شراب نوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں‘ کئی بار ایسا ہو چکا ہے کہ کسی ذمہ دار افسر کو شراب کے نشے میں مست کر کے جاسوس حسینائیں اس سے قومی اہمیت کے بڑے بڑے راز اگلوا کر لے گئیں۔ لیکن اس طرح کے متعدد حقائق بیان کرنے اور پورے اعداد و شمار مہیا کرنے کے بعد بھی جب اس پر پابندی عائد کی گئی تو یہ سارے اعداد و شمار‘ یہ سارا فلسفہ اور سارے طبی اور سائنسی حقائق دھرے کے دھرے رہ گئے اور ع

''چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' کے مصداق پابندی کا یہ حکم قبول نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حکم واپس لینا پڑا اور شراب کی حلت کو پھر سے تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا اس کے process میں ہمیں ایک تدریج نظر آتی ہے۔ چنانچہ پہلے کتابِ الٰہی کی تلاوت آیات اور پھر اسی کے ذریعے سے تزکیۂ نفوس کے بعد تعلیم کتاب یعنی احکامِ شریعت کی تعلیم اور تنفیذ کا مرحلہ آتا ہے۔ اس مرحلے پر اب اوامر و نواہی' حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی پوری فہرست دے دی گئی اور اس کی تنفیذ بھی ہو گئی۔

تعلیم حکمت

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اساسی منہاج کا آخری مرحلہ ''تعلیمِ حکمت'' کا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ''حکمت'' کا لفظ اس سے پہلے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ضمن میں آیا تھا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ اُس مقام پر لفظ ''حکمت'' پر گفتگو کی گئی تھی اور عرض کیا گیا تھا کہ عربی میں ''ح ک م'' کا مادی بنیادی طور پر کسی شے کی پختگی اور استحکام کے لیے آتا ہے۔ حکمت انسانی عقل اور شعور کی پختگی ہے۔ انسان کے اندر غور و فکر کی جو استعداد ہے اس کا پختہ (mature) ہو جانا اور اس میں اصابت رائے کی صلاحیت کا پیدا ہو جانا حکمت ہے اور یہ انسان کی صلاحیتوں میں بلند ترین چیز ہے۔ عام تعلیمی نظام میں بھی تربیت انسانی کے نقطۂ نظر سے یہ تدریج ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ کسی بچے کو آپ پہلے تاریخ کے واقعات کا مطالعہ کروائیں گے اور اس کو یاد کروائیں گے کہ فلاں فلاں واقعات کب اور کیسے ہوئے۔ اس کے بعد پھر ایک مرحلہ ''فلسفۂ تاریخ'' کا آتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ فلاں قوم کو شکست کیوں ہوئی' فلاں تہذیب کو عروج کیوں حاصل ہوا اور فلاں تمدن زوال پذیر کیوں ہوا؟ وغیرہ۔ اسی طرح آپ جغرافیہ میں پہلے یہ پڑھائیں گے کہ فلاں ملک کی آب و ہوا کیا ہے' وہاں کی زرعی پیداوار کیا ہے اور وہاں کون کون سے معدنی ذخائر پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد پھر طبعی جغرافیہ (Physical Geography) میں یہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ یہ تغیر و تبدل کیوں ہے؟ یہ موسم اس طرح کیوں بدلتے ہیں؟ فلاں جگہ یہ چیز کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ اور فلاں خطے میں یہ معدنیات کیوں پائی جاتی ہیں؟ تو درحقیقت یہ ''کیوں اور کیسے؟'' ہر گوشۂ علم میں چوٹی کی چیز ہے۔ اسی طریقے سے دین کا معاملہ ہے۔ انسانی ذہن اور شعور تربیت پا کر وہ پختگی حاصل کر لیں کہ انسان دین کے ''کیوں اور کیسے'' کو سمجھ سکے تو یہ ''حکمت'' ہے۔ فاتح دورِ جدید امام الہند حضرت شاہ

ولی اللہ دہلوی ؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''حُجَّةُ اللّٰهِ البَالِغه '' کا موضوع یہی حکمت دین ہے کہ احکامِ شریعت میں کیا حکمتیں ہیں' ان کے کیا مقاصد ہیں؟

دین پرعمل کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کو شریعت کا اوامر ونواہی کی پابندی کرنی ہے۔ ''سمع و طاعت'' اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔

Theirs not to reason why?
Theirs but to do die!

لیکن اس سے بلندتر سطح یہ ہے کہ وہ بصیرتِ باطنی اور enlightment پیدا ہو جائے کہ جس سے نظر آنے لگے کہ یہ حکم کیوں دیا جارہا ہے' اس کی حکمتیں کیا ہیں' اس کی غرض کیا ہے' اس کی علت کیا ہے' اس کی مصلحتیں کیا ہیں! انسان کے اپنے مفاد میں اور نظام اجتماعی کے اپنے مصالح کے اعتبار سے دین کے ان احکام کی کیا اہمیت اور کیا مقام و مرتبہ ہے!! اس مرحلے پر پہنچ کر حکم بوجھ محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک نعمت معلوم ہونے لگتا ہے۔ تب شریعت کے اوامر ونواہی طبیعت کے لیے کسی ناگوار کیفیت کے حامل نہیں رہ جاتے' بلکہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے انعام واحسان ہونے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں شریعت کو نعمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ ......﴾ یعنی یہ اللہ کا انعام ہے کہ اُس نے تمہیں تمام پیچیدہ اور پر پیچ راہوں میں ایک درمیانی راہ ''صراطِ مستقیم'' عطا فرما دی اور ایک متوازن اور معتدل نظام تمہیں عطا فرمایا۔ یہ سراسر انعامِ خداوندی ہے ا اور اس نعمت کا اتمام ہوا ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر۔ سورۃ البقرۃ میں اس ''حکمت'' کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ؕ﴾ کہ جس کو حکمت عطا کر دی گئی اسے تو خیر کثیر سے نواز دیا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ حکمت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی دولت ہے اور اللہ کا اُس شخص پر بہت ہی بڑا احسان ہے جسے اُس نے حکمت سے نوازا ہو۔ علامہ اقبال نے اسے ''اِسرارِ دین'' سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

اے کہ می نازی بہ قرآنِ حکیم
تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن!
نکتہ شرعِ مبیں را فاش کن!

تو حکمت دین کی تعلیم اور اس کا عام کیا جانا انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اساسی منہاج میں چوٹی کا

معاملہ ہے۔ گویا یہ اس کا مرتبۂ کمال اور نقطۂ عروج ہے۔

فرد اور معاشرے میں انقلاب کا لائحۂ عمل

اب آپ ان چاروں اصطلاحات کو ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن کے سامنے لائیے: (۱) یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ (۲) وَیُزَکِّیۡهِمۡ (۳) وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ (۴) وَالۡحِکۡمَةَ — اور دیکھئے کہ انقلاب کے عمل میں ان کو بتدریج کیسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کا کوئی عزیز، کوئی نوجوان ہے جو آپ کو محبوب ہے اور آپ پورے خلوص کے ساتھ چاہتے ہیں کہ وہ دین کی طرف آئے، یا یوں تعبیر کیجیے کہ اس میں دینی انقلاب برپا ہو جائے۔ اس کی کچھ عادات اور دلچسپیاں ایسی ہیں کہ جو آپ کی نظر میں کھٹکتی ہیں، اس کے صبح و شام کا رنگ کچھ بدل گیا ہے۔ آپ اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے فکر اور ذہن کا جائزہ لیجیے کہ کہیں اس کے ذہن میں کوئی ''برٹینڈ رسل'' تو نہیں ہے، وہاں کوئی ''ساختؔ'' اور اس کا فلسفہ موجودیت تو مسلط نہیں ہے، کہیں کسی ''فرائیڈ'' کے نظریات نے تو اس پر تسلط حاصل نہیں کر لیا، کہیں کسی اور کا نظریہ تو نہیں ہے کہ جو اس کے ذہن اور دل میں مستولی ہو گیا ہو۔ اگر آپ یہ تجزیہ نہیں کر سکتے اور اس کا مداوا نہیں کر سکتے، آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے سے اس کے دل میں نورِ ایمان، اللہ کا یقین، آخرت کا یقین، جنت و دوزخ کا یقین اور وحی اور رسالت کا یقین پیدا نہیں کر سکتے، تو جان لیجیے کہ آپ کی وہ ساری خواہش دھری رہ جائے گی اور اس کے اندر کوئی تبدیلی برپا نہ ہو سکے گی۔ وہ اگر سعادت مند ہے تو آپ کے سامنے چپ ہو جائے گا، گردن جھکا دے گا۔ ہو سکتا ہے آپ کے دباؤ کے تحت، جہاں آپ کے سامنے ہو، نماز بھی پڑھ لے، لیکن اس کی فکر کچھ اور ہے، اس کی سوچ کچھ اور ہے ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

اس کی فکر اور اس کی سوچ پر تو کچھ اور چیزوں کا تسلط ہو چکا ہے، جن میں کہیں نماز یا روزے کی گنجائش ہی نہیں۔

اوامر و نواہی اور حلال و حرام کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی صاحبِ ایمان ہو، وہ وحی و رسالت اور کتاب کو مانتا ہو، اگر وہ بنیاد ہی موجود نہ ہو تو کیا حلال اور کیا حرام؟ اس کے ذہن میں کس چیز کے بارے میں فرض کا تصور قائم ہو گا اور کس چیز کو وہ ممنوع اور حرام سمجھے گا؟ یہ ساری چیزیں اس وقت تک بے بنیاد

ہیں جب تک ایمان دل کے اندر پیدا نہ ہو جائے۔ یہی ایک واحد راہِ عمل ہے کسی شخص کو بدلنے کی۔ اور یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ اس سارے عمل کا مرکز و محور قرآن حکیم ہے۔ اگر ''تلاوتِ آیات'' کے ذریعے اس میں ذہن و فکر کی تبدیلی آتی ہے تو اس کی بری عادتیں خود بخود بدل جائیں گی اور سب بری لتوں سے وہ خود بخود آزاد ہوتا چلا جائے گا اور اب آپ کو ایک ایک چیز کے لیے علیحدہ علیحدہ دردِ سر مول لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جب وہ جڑیں کٹ جائیں گی جن سے ان عاداتِ فاسدہ کے پتوں کو فاسد غذا باہم پہنچ رہی تھی تو وہ خود بخود خشک ہو کر گر پڑیں گے۔ اب وہ وقت آئے گا کہ آپ اسے بتائیں کہ یہ ہے دین کا حکم' اور وہ اس پر عمل پیرا ہو جائے گا۔ اور یہ عمل مصنوعی نہیں ہوگا' بلکہ فطری ہوگا۔ اس کے بعد اگر اس میں استعداد ہے تو اسے مرتبۂ حکمت تک پہنچایئے۔ یہاں پہنچ کر اس کی شخصیت کو دین کے بارے میں ٹھہراؤ' تمکن اور دوام حاصل ہوگا۔ اس کے کیا ہی کہنے ہیں! ظاہر بات ہے کہ حکمت کا یہ مقام کچھ نرالا ہی مقام ہے۔ یہاں انسان گویا کہ اپنی بصیرتِ باطنی سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ حق یہی ہے۔ یہ اس کا ذاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ دین میں کیا مقدم ہے' کیا مؤخر ہے۔ کس چیز کی حیثیت جڑ کی ہے اور کس کی فرع کی۔ اب وہ اندھے کی طرح ٹامک ٹوئیے نہیں مار رہا ہوتا' بلکہ وہ دین کی تمام اقدار کو ان کے صحیح مقام پر صحیح توازن و اعتدال کے ساتھ برقرار رکھتا ہے۔ یہ ہے مرتبۂ حکمت' کہ جس کو عطا ہو گیا اسے خیر کثیر عطا ہو گئی۔

اب یہاں ایک اور بات سمجھ لیجیے تو یہ مضمون مکمل ہو جائے گا۔ جس طرح کا معاملہ ایک فرد نوعِ بشر کا ہے بالکل اسی طرح ایک قوم یا اجتماعیت کے تحت زندگی بسر کرنے والے ایک مجموعۂ افراد کا ہے۔ ایک ہیئت اجتماعیہ سے منسلک ہونے والے افراد بھی مجموعی طور پر ایک فرد (individual) ہی کی طرح کا رویہ رکھتے ہیں۔ اور جس طرح ایک فرد کے وجود میں دماغ قوتِ فیصلہ کا حامل ہوتا ہے اور پورے وجود پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح ایک ہیئت اجتماعیہ میں ایک ''ذہین اقلیت'' اس پورے مجموعۂ افراد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دماغ میں پکڑنے کی طاقت نہیں ہے' یہ طاقت ہاتھ میں ہے' لیکن پکڑنے کا حکم اسے دماغ سے ملتا ہے۔ ہاتھ کیا پکڑے اور کیا نہ پکڑے' اس کا فیصلہ بھی دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح پاؤں چل سکتے ہیں' لیکن چلیں نہ چلیں' اور اگر چلیں تو کدھر جائیں کدھر نہ جائیں' اس کا فیصلہ دماغ کرے گا۔ نوعِ انسانی کے ایک فرد میں ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء و جوارح ہیں' لیکن ان سب کو دماغ کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ گویا کہ انسان کے دو ڈھائی من کے وجود میں پاؤ

ڈیڑھ پاؤ کے دماغ کو ایک حکمران کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ بالکل اسی طریقے سے جان لیجیے کہ کسی قوم‘ کسی معاشرے‘ کسی سوسائٹی‘ کسی کمیونٹی یا کسی ہیئت اجتماعیہ میں جو ایک ذہین اقلیت (intellectual minority) یا intelligentsia ہوتی ہے‘ جسے آپ brain trust سے تعبیر کر سکتے ہیں‘ اس پوری ہیئت اجتماعیہ کو کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے لوگ اگرچہ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں‘ لیکن یہ اپنے معاشرے‘ اپنی قوم اور اپنے ملک میں بالکل اسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ جو اہمیت ایک فردِ بشر میں اس کے اپنے دماغ کو حاصل ہے۔ یہ سوچتے ہیں اور معاشرے کے رخ کا تعین کرتے ہیں۔ باقی عوام الناس اعضاء و جوارح کی مانند ہیں۔ جدھر یہ رخ کر لیں گے پورا معاشرہ اُدھر رخ کر لے گا‘ بالکل اسی طرح جیسے دماغ کے فیصلے کے تحت پاؤں چلتے اور ہاتھ حرکت کرتے ہیں۔

آپ کسی بھی معاشرے میں تبدیلی برپا کرنا چاہتے ہیں‘ کسی قوم یا ہیئت اجتماعیہ کو اسلام کے حق میں بدلنا چاہتے ہیں یا یوں کہیے کہ کسی جگہ پر بھی آپ اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کے طریق انقلاب پر اساسی منہاج یہی ہوگا کہ پہلے اس ذہین اقلیت کو تبدیل کیجیے۔ اگر اس کو آپ اسلام کے حق میں convert کر لیں اور اس میں ایمان و یقین کی روشنی پیدا ہو جائے تو اس طرح اس حلقے اور طبقے میں ایک ایسا مضبوط نیوکلیس پیدا ہو جائے گا جس نے دین کی بنیادی اقدار کو علی وجہ البصیرت قبول کیا ہوگا‘ نہ کہ محض اعتقادی طور پر صرف ایک ''dogma'' کی حیثیت سے۔ چنانچہ اس ذہین اقلیت اور brain trust کے تبدیلی قبول کرنے سے مجموعی طور پر پورا معاشرہ تبدیلی قبول کر لے گا۔ ورنہ آپ عوام میں وعظ و نصیحت کرتے رہیے تو اگرچہ اس سے عوام الناس کے اندر ایک رجوع عام بھی ہو جائے‘ تبدیلی برپا نہیں ہوگی۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے اس چھوٹی سی مثال پر غور کر لیجیے کہ ہمارے ہاں کسی زمانے میں ترقی پسند ادیبوں نے بعض اصطلاحات کا استعمال شروع کیا اور آج وہ اصطلاحات ہمارے معاشرے کے نچلے طبقات تک پہنچ گئی ہیں۔ ''استحصال'' جیسا بھاری بھرکم لفظ آج کسی تانگے بان اور کسی ریڑھی چلانے والے کی زبان پر آپ کے سننے میں آئے گا‘ اس لیے کہ یہ عمل ان لوگوں سے چلا تھا جو اس ملک کے اندر غور و فکر کرنے والے اور سوچ بچار کرنے والے لوگ تھے۔ اس ''ذہین اقلیت'' نے ایک فلسفے کو قبول کیا تھا اور پھر وہ فلسفہ اس معاشرے کے اندر سرایت کرتا چلا گیا۔ آپ کسی پارٹی کو تو ban کر

سکتے ہیں' لیکن فکر پر کوئی قدغنیں عائد نہیں کی جاسکتیں' فکر کے لیے کسی پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بخود پھیلتا ہے اور کسی ملک یا کسی معاشرے میں اس کو قید و بند میں ڈالنا ممکن نہیں ہے۔اس وقت کی دنیا میں جبکہ فاصلے معدوم ہو گئے ہیں آپ کسی ملک یا خطۂ زمین کو محفوظ خطہ بنا کر نہیں رکھ سکتے کہ یہ فکر وہاں نہ آنے پائے۔ اصل معاملہ فکر ہی کا ہے۔ اگر فکر بدلے گا' سوچ بدلے گی' تو انسان بدلے گا۔ انسان کی انفرادی تبدیلی کے لیے بھی فکر کی تبدیلی لازمی ہے اور کسی معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کے لیے بھی فکر کی تبدیلی ناگزیر ہے۔اسلامی انقلاب کے لیے فکری بنیاد بھی قرآن حکیم سے مہیا ہوتی ہے اور اس کا پورا اساسی منہاج بھی قرآن حکیم ہی پر مبنی ہے: ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

چوں بجا در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس ضمن میں بعض لوگوں کو مغالطہ اور اشتباہ لاحق ہوسکتا ہے کہ کیا اتنا عظیم انقلاب اور اتنی بڑی تبدیلی صرف ایک کتاب کے بل پر پیدا ہو جائے گی؟ میں انہیں دعوت دوں گا کہ ذرا نگاہ دوڑائیے' اس وقت اشتراکی نظام روئے ارضی کے کتنے بڑے حصے پر قائم ہے۔ پورے مشرقی یورپ' پورے شمالی ایشیا' بلکہ چین سمیت ایشیا کے اکثر و بیشتر حصے کے علاوہ دنیا کے کئی دور دراز ممالک میں یہ جو نظام قائم ہے اس کا سراغ لگائیے کہ یہ کس کا نتیجہ ہے؟ یہ سب کارل مارکس کی کتاب داس کیپیٹل (Das Capital) اور اس کے فلسفے کا اثر ہے کہ ذہنوں نے جس کو قبول کیا اور ان پر اس کی چھاپ قائم ہوئی۔ اور یہ انقلابات درحقیقت اسی کی بنیاد پر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے مارکس کے بارے میں کہا تھا ؏

''نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب''

اس کی بغل میں ''کتاب'' تھی' اور یہ بات کسی کو پسند ہو یا ناپسند ہو' کوئی اسے غلط سمجھے یا صحیح' لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ سارے انقلابات درحقیقت اسی کتاب کا ایک ظہور اور اسی کتاب کا ایک بروز ہیں۔تو ذرا سوچیے کہ ایک انسان کی کاوش' اس کی تصنیف کردہ ایک کتاب اگر دنیا میں اتنے وسیع و عریض پیمانے پر اتنے وسیع و عریض خطے میں انقلاب برپا کرسکتی ہے تو کیا کتاب اللہ دنیا میں انقلاب برپا نہیں کرسکتی؟ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کتاب کی طرف approach درست ہو' اس کتاب

کو اس کا صحیح مقام دیا گیا ہو' اس کتاب سے واقعتاً وہ کام لیا جائے کہ جس کے لیے وہ نازل کی گئی ہے' جس کے لیے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی شان میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ جس کے ذریعے سے افراد بدلے' ان کے اندر انقلاب آیا اور پھر انہوں نے ساری انقلابی جدوجہد سے گزر کر انقلابِ محمد ﷺ کی عملی تکمیل فرمادی۔

سورۃ الجمعہ کا عمود معین ہو جانے کے بعد اور اس کی مرکزی آیت کے مفہوم و معنی کو کسی حد تک سمجھ لینے کے بعد اب آیئے کہ اس کا آغاز سے تسلسل کے ساتھ مطالعہ شروع کریں۔ ہمیں اس کی ایک ایک آیت پر بھی اجمالاً غور کرنا ہے اور خاص طور پر ہر آیت کا اس سورۃ کے عمود اور مرکزی مضمون کے ساتھ جو ربط بنتا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش بھی ناکام ہوتی ہے۔

پرجلال آغازِ کلام

فرمایا:

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①﴾

''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے' (اس اللہ کی) جو الملک (یعنی بادشاہ) ہے' القدوس (یعنی پاک) ہے' العزیز (یعنی زبردست) ہے' الحکیم (یعنی کمال حکمت والا) ہے''۔

یہ پہلی آیت گویا اس سورۂ مبارکہ کے لیے ایک نہایت پرشکوہ اور پُرجلال تمہید اور آغازِ کلام ہے۔ تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم اس سے پہلے سورۃ التغابن کے درس کے ضمن عرض کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ نوٹ فرمالیں کہ سورۃ الصّف میں اس کا ذکر صیغہ ماضی میں تھا: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ جبکہ یہاں فعل مضارع آیا ہے: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس طرزِ بیان کو اختیار کر کے تسبیح باری تعالیٰ کے ضمن میں قرآن حکیم نے گویا زمان و مکان کا احاطہ کر لیا ہے۔ اللہ کی تسبیح اس کائنات میں ہر آن اور ہر لحظہ ہو رہی ہے اور کائنات کے ہر گوشے میں یہ عمل جاری ہے۔ ﴿مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ کے الفاظ پر غور کیجیے۔ یہ دراصل کل سلسلۂ کون و مکان' کل کائنات کے احاطے کے لیے قرآن حکیم میں مستعمل ہیں۔ اسی طرح فعل ماضی اور فعل مضارع کو جمع کر لیجیے تو کل زمان کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ فعل مضارع عربی

زبان میں حال اور مستقبل دونوں کومحیط ہے۔ چنانچہ تسبیح کے لفظ کو ماضی اور مضارع میں لاکر قرآن حکیم نے گویا زمان کا احاطہ بھی کرلیا ہے۔

اللہ کے چار اسماءِ حسنیٰ اور نبی اکرمﷺ کے فرائض چہارگانہ

اس آیۂ مبارکہ کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے چار اسماء وارد ہوئے ہیں اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔قرآن مجید میں اللہ کے اسماء وصفات عام طور پر آیات کے آخر میں وارد ہوتے ہیں' لیکن اکثر و بیشتر جوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔مثلاً **وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ' وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ' وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ** —— **وَقِسْ عَلٰى ذٰلِكَ.** لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اکٹھے چار اسماء وارد ہوئے ہیں۔نوٹ کیجیے کہ اس کا اصل سبب اس سورۂ مبارکہ کا عمود ہے۔ ذہن میں تازہ کیجیے کہ اس مرکزی آیت میں جس پر ہم غور کر چکے ہیں' نبی اکرمﷺ کے طریق کار کے ضمن میں چار اصطلاحات آئی ہیں' یا یوں کہہ لیجیے کہ آپؐ کی چار شانوں کا ذکر ہے: تلاوتِ آیات' تزکیہ' تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت۔ درحقیقت ان چاروں کا بڑا گہرا ربط ہے ان چار اسماءِ حسنیٰ کے ساتھ!—— وہ ''الملک'' ہے۔یعنی بادشاہِ ارض وسماوات ہے۔ چنانچہ اس کی آیات پڑھ کر سنائی جارہی ہیں' جیسے کوئی منادی کرنے والا شہنشاہ کے فرامین (proclamations) لوگوں کو سنا رہا ہو۔گویا ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ عکس ہے اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی ''اَلْمَلِكُ'' کا۔دوسری شان اللہ کی یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ اَلْقُدُّوْسُ ہے' یعنی انتہائی پاک۔غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ قدوسیت کا بڑا گہرا تعلق ہے نبی اکرمﷺ کے بارے میں بیان کردہ دوسری اصطلاح ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ یعنی عمل تزکیہ کے ساتھ —— اسی طرح ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ (وہ تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب یعنی احکام شریعت کی) میں اللہ تعالیٰ کی شان ''العزیز'' کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔وہ زبردست ہے' مختارِ مطلق ہے' وہ جو چاہے حکم دے' بندوں کا کام ہے اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت! سورۃ التغابن میں یہ مضمون آچکا ہے: ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''سنو اور اطاعت کرو''۔سورۃ البقرۃ میں سود کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ کان کھول کر سن لو! اللہ نے سود حرام کیا ہے اور بیع کو حلال ٹھہرایا ہے' تم کون ہوتے ہو اُس پر اعتراض کرنے والے؟ یہ ہے ''العزیز'' کا مفہوم۔یعنی ایک ایسی ہستی جس کے اختیارات پر کوئی تحدید نہ ہو' کوئی limitations نہ ہوں' کوئی checks & balances نہ ہوں' مختارِ مطلق! اور آخری اور چوتھا لفظ جو اللہ کی شان میں آیا ہے ''اَلْحَكِيْمُ'' اس

کا ربط وتعلق گویا از خود ظاہر ہے نبی اکرم ﷺ کے فرائض چہار گانہ میں سے چوتھے کے ساتھ ہے جو درحقیقت نبی اکرم کے اساسی منہاج کا نقطۂ عروج ہے' یعنی تعلیمِ حکمت!

تو پہلی آیت کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ایک پُرشکوہ اور پُرجلال تمہید ہے۔ اور اس کے بعد آئی وہ آیت جس پر ہم غور کر چکے:

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

اس ''هُوَ'' کو جوڑ لیجیے پہلی آیت کے ساتھ کہ محمد ﷺ کا بھیجنے والا ہے کون؟ وہ کہ جس کی تسبیح میں آسمان وزمین کی ہر شے ہمیشہ سے اور ہر آن لگی ہوئی ہے اور وہ ہمیشہ ہمیش تسبیح میں لگی رہے گی' جو الملک ہے' القدوس ہے' العزیز ہے' الحکیم ہے۔ وہ ہے کہ جس نے اٹھایا اُمّیین میں سے ایک رسول جو انہی میں سے ہے۔ جہاں تک ان اصطلاحات کا تعلق ہے ان پر تو ہم کسی درجے میں غور وفکر کر چکے ہیں' اب ہمیں اس آیۂ مبارکہ کے بعض دوسرے پہلوؤں پر توجہ مرتکز کرنا ہے۔

اُمّی کا مفہوم

اُمّیین جمع ہے اُمّی کی یہ لفظ ''اُم'' سے بنا ہے۔ ''اُم'' عربی زبان میں ماں کے لیے مستعمل ہے۔ ''اُمی'' سے گویا ایک ایسی کیفیت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جیسے کوئی شخص بطن مادر سے برآمد ہوا ہو اور وہ اسی طرح کی کیفیت میں برقرار رہے۔ تو اگرچہ اس اعتبار سے ایک سے زائد مفہوم لیے جا سکتے ہیں' لیکن اس لفظ کا استعمال خاص طور پر ان لوگوں کے لیے ہے کہ جن کے ہاں رواجی تعلیم یعنی لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہو۔ قرآن مجید نے اصطلاحاً یہ لفظ استعمال کیا ہے بنی اسماعیل کے لیے' اس لیے کہ اوّلاً ان میں پڑھنے لکھنے کا رواج ہی بہت کم تھا اور ثانیاً یہ کہ بنی اسماعیل کے لیے یہ لفظ لایا جاتا ہے بنی اسرائیل کے مقابلے میں' اس لیے کہ وہ اہل کتاب تھے' ان کے ہاں لکھنے پڑھنے کا باقاعدہ رواج تھا۔ ان کے ہاں شریعت تھی' قانون تھا' عدالتیں تھیں' فقہاء تھے' مفتی تھے' لہٰذا بنی اسرائیل کے پس منظر میں یہ بنی اسماعیل اُمی اور اَن پڑھ تھے' ان کے پاس کوئی قانون' کوئی ضابطہ' کوئی کتاب نہیں تھی' یہاں تک کہ لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔

یہاں نوٹ کر لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت اوّلین ''اُمّیین'' میں تھی۔ آپ کے مخاطب اوّلین یہی اُمی تھے' اصلاً آپ کی بعثت انہی میں ہوئی۔ ''مِنْهُمْ'' کا لفظ اس حقیقت کی جانب رہنمائی دے رہا

ہے۔ بلکہ اس کے حوالے سے مزید اشارہ کر دیا گیا اس بات کی طرف کہ کسی نبی اور رسول کے لیے اس قوم میں سے ہونا جس کی جانب وہ نبی یا رسول بنا کر بھیجے گئے' درحقیقت اس کے فرائض رسالت اور منصبِ نبوت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ نبی اس قوم کا جانا پہچانا فرد ہوتا ہے جس کی سیرت و کردار سے وہ واقف ہیں' جو انہی کی زبان بولتا ہوا آتا ہے' اجنبیت کا کوئی پردہ اس کے اور قوم کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔ یہی دلیل قرآن استعمال کرتا ہے اس اعتراض کے جواب میں کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کسی فرشتے کو نبی بنا کر کیوں نہیں بھیجا جاتا: ﴿لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓـئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا﴾ کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو ہم لازماً کسی فرشتے ہی کو پیغامبر بنا کر بھیجتے' جب یہاں انسان آباد ہیں تو ہم نے انسانوں ہی میں سے انبیاء کو مبعوث فرمایا جن کے احساسات وہی ہوں جو دوسرے انسانوں کے ہیں' جن کے مسائل وہی ہوں جن سے دوسرے انسان دوچار ہوتے ہیں' پیٹ انہیں بھی لگا ہوا ہو' جسم و جان کے تقاضے ان کے ساتھ بھی ہوں' تاکہ وہ اپنے جیسے انسانوں پر تبلیغ کریں تو اتمامِ حجت کر سکیں' کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ جس بات کی تم تبلیغ کر رہے ہو یا جو عملی نمونہ تم ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو انسانوں کے لیے قابلِ عمل نہیں ہے!

اب آیئے اس آیۂ مبارکہ کے آخری ٹکڑے کی جانب: ﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ ''اور اگرچہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے''۔ بنو اسماعیل کی گمراہی کی تفصیل یہاں بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ ان کے اوہام' ان کے مشرکانہ عقائد' ان کی اخلاقی زندگی کا نقشہ معلوم و معروف ہے۔ ''ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کے مصداق وہ تہہ در تہہ گمراہیوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ فکر کی' عقیدے کی' عمل کی' اخلاق کی' غرضیکہ ہر اعتبار سے وہ کجی اور گمراہی کا شکار تھے۔ پھر یہ کہ ان کے معاشرے میں کوئی نظام تھا نہ تنظیم' ہر ایک اپنی جگہ فرعون بے ساماں ہے' کوئی کسی کی بات سننے والا نہیں۔ ﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ میں گویا اس پوری صورت حال کا ایک نقشہ کھینچ دیا گیا۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دو رُخ

آگے فرمایا: ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ﴾ آیت کا یہ ٹکڑا عطف ہو رہا ہے اُمّیین پر کہ دوسرے کچھ اور بھی ہیں جن کی طرف آپؐ کو مبعوث فرمایا گیا۔ یعنی بَعَثَ فِي الْاُمِّيّنَ وَالْاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ ۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت اولاً ہوئی ہے اُمیین میں' لیکن آپؐ صرف اُمیین کے رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے

بلکہ ''آخرین'' یعنی دیگر اقوام کے لیے بھی آپ ﷺ رسول بن کر تشریف لائے تھے۔

اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ آپ کی ایک بعثت خصوصی تھی اہل عرب کی طرف' بنو اسماعیل کی طرف' اُمیین کی طرف' جبکہ ایک بعثت عمومی تھی اِلٰی کَافَّۃً لِّلنَّاسِ یعنی پوری نوعِ انسانی کی جانب۔ جیسے کہ فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ ''اور اے نبی! ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ نبوت کے ابتدائی دور کے ایک خطبے میں آپؐ کے یہ الفاظ منقول ہیں: ((وَاللّٰہُ الَّذِیۡ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ ' اِنِّیۡ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ خَاصَّۃً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً))(۱) ''اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری جانب بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم'' تو یہ ہے مفہوم اُمّیین اور آخرین کا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ یہ آخرین سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی قوم۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ حکمت اور دانائی کی کوئی بات اگر ثریا پر بھی ہوگی تو اس کی قوم کا کوئی نہ کوئی فرد وہاں سے بھی لے آئے گا۔

یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تشکیل کچھ اس طرز پر ہے کہ اس کا ایک مرکز (Nucleus) ہے جو بنی اسماعیل پر مشتمل ہے جو نبی اکرم ﷺ کے اوّلین مخاطب تھے۔ خود نبی اکرم ﷺ ان ہی میں سے تھے' ان ہی کی زبان بولتے ہوئے آئے۔ آپؐ نے اوّلاً ان ہی کو تبلیغ فرمائی' انہی کے اندر سے ایک اُمت تشکیل فرما دی۔ اس کے بعد پھر دوسری اقوام سے' دوسری نسلوں اور دوسرے ملکوں سے لوگ گویا تہہ در تہہ دائروں کی شکل میں اس امت میں شامل ہوتے چلے گئے۔ ایرانی آئے' تورانی آئے' ہندی آئے' بربر آئے' ایشیائی آئے' افریقی آئے۔ یہ سب ''آخرین'' میں شامل ہیں۔ تو نبی اکرم ﷺ کی بعثتیں دو ہوئیں: اوّلین بعثت اُمیین میں اور ثانوی بعثت آخرین میں۔

﴿وَّاٰخَرِیۡنَ مِنۡھُمۡ﴾ کے الفاظ پر توجہ فرمائیے' یہاں ''مِنۡھُمۡ'' معنوی مفہوم میں آیا ہے یعنی جو بھی دائرہ اسلام میں آ جائے گا' چاہے وہ ہندی ہو' وہ مشرقِ بعید کا زرد رو انسان ہو' افریقہ کا سیاہ فام ہو' یورپ کا سرخ و سفید رنگ کا حامل ہو' یہ سب ملت کی وحدت میں گم ہوتے چلے جائیں گے' ایک ملت بنتی چلی جائے گی۔ اسی جانب اشارہ ہے ''مِنۡھُمۡ'' میں کہ یہ ایک ہی اُمت ہے' بعد میں آنے والے اسی

---

(۱) الانساب للبلا ذری، نہج البلاغہ۔

امت کا جزو بنتے چلے جائیں گے۔ ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ کہ نبی اکرم کی بعثت ہوئی آخرین میں بھی اور جو ابھی ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے' ہو جائیں گے۔ ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳﴾ اور وہ (اللہ) العزیز ہے' الحکیم ہے''۔ اس آخری اور کامل نبوت و رسالت کے بارے میں اس کی حکمت تامہ کا یہ تقاضا ہوا کہ وہ آپ ؐ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمائے۔ وہ العزیز ہے' زبردست ہے' جو چاہے کرے' اور الحکیم ہے' اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ―― ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے' دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے''۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

یہاں یہ اشارہ کر دیا گیا کہ یہ درجہ بدرجہ فضل کا معاملہ ہے۔ اللہ کا سب سے بڑھ کر فضل ہوا محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا﴾ کہ اے نبی (ﷺ) آپ پر اس کا بہت بڑا فضل ہوا۔ آپ ؐ کو وہ مقام و مرتبہ حاصل ہوگا جسے مقامِ محمود سے تعبیر فرمایا گیا ہے: ﴿عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ تو اوّلین اور بلند ترین فضیلت حاصل ہوئی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو جو سید الاوّلین والآخرین ہیں' سید الانبیاء ہیں' امام الرسل ہیں۔ پھر بقیہ نوعِ انسانی کے مقابلے میں ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہوا اُمّیین کو یعنی بنو اسماعیل کو ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اب یہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور دین ہے کہ اس نے عربوں کو چن لیا اور ان میں اپنا آخری نبی مبعوث فرمایا' ان کی زبان میں اللہ کا آخری کلام نازل ہوا' جو طور طریقے ان کے ہاں رائج تھے انہی میں قطع و برید کر کے آخری اور کامل شریعت کا تانا بانا تیار کیا گیا۔ یہ بات اس سے پہلے سورۃ الحج کے آخری رکوع میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ کسی غیر ابراہیمی نسل کے انسان کے لیے مغائرت کا کوئی معاملہ ہو سکتا ہے۔ زبان کا حجاب ایک بڑی رکاوٹ ہے' پھر نسلی اور موروثی عادات و خصائل کا معاملہ ہے جو منافرت کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن اے بنو اسماعیل! تمہارے لیے تو کوئی غیریت نہیں' کوئی اجنبیت نہیں' تمہارے جو موروثی مراسم تھے ان ہی میں سے اکثر و بیشتر کو معمولی سی قطع و برید کے بعد اس آخری شریعت کا جزء بنا لیا گیا۔ یہ طواف تمہارے ہاں ہوتا چلا آ رہا تھا' قربانی کی رسم تمہارے ہاں چلی آ رہی تھی' منیٰ اور عرفات کا

قیام کسی نہ کسی درجے میں تمہارے ہاں جاری تھا' تلبیہ تمہارے ہاں مروج تھا' اگرچہ اس میں تم نے اپنی طرف سے بعض شرکیہ کلمات شامل کر لیے تھے۔ گویا مجموعی طور پر وہ پورا ڈھانچہ (structure) موجود تھا جس میں ترمیم واضافہ کر کے آخری شریعت کا تانا بانا تیار ہوا۔ تو یہ بلا شبہ ایک فضیلت کا مقام ہے جو انہیں حاصل ہوا۔ پھر درجہ بدرجہ یہ فضیلت حاصل ہے نوعِ انسانی کے ہر اُس فرد کو جو دامنِ محمدیؐ سے وابستہ ہو جائے' جو ملت اسلامیہ میں شامل ہو جائے' جو اس اُمت محمدیہ (علیٰ صاحبها الصلوٰة والسَّلام) میں شریک ہو جائے۔ ﴿ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ۝۴﴾

یہود کا ذکر ——— بطور نشانِ عبرت

اب اگلی آیت میں یہود کا تذکرہ ہے۔ اور یہ بات اس سے قبل ''الـمُسَبّحات'' کے تعارف کے ضمن میں اصولاً بیان کی جا چکی ہے' جس کی ایک بڑی واضح اور نمایاں مثال سورۃ الصّف میں ہمارے سامنے آ چکی ہے' کہ ان سورتوں میں اگرچہ اصلاً خطاب اُمت مسلمہ سے ہے' لیکن سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو بطور نشانِ عبرت مسلمانوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ہر سورت میں بنی اسرائیل یعنی یہود میں اعتقادی یا عملی گمراہیوں کا وہی پہلو زیر بحث آئے گا کہ جو اس سورت کے عمود سے متعلق ہو۔ جہاد و قتال کا مضمون سورۃ الصّف میں مذکور تھا تو وہاں اس خاص پہلو سے ان کا جو معاملہ رہا اور قتال فی سبیل اللہ سے انکار کر کے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس قدر شدید ذہنی اذیت سے دوچار کیا' اسے نمایاں کیا گیا کہ مسلمانو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اس روش کو اختیار کر لو! اب غور کیجیے کہ یہاں سورۃ الجمعہ میں ساری گفتگو قرآن مجید کے گرد گھوم رہی ہے۔ واضح کر دیا گیا کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن حکیم ہے' مزید یہ کہ نبی اکرم ﷺ صرف اُمّیین کے لیے رسول ہو کر نہیں آئے پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

کتاب اللہ کا وارث کون؟

یہی وجہ ہے کہ سیرتِ طیبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اسی قرآن کے ذریعے انذار و تبشیر کا فریضہ سرانجام دیا' اسی کے ذریعے تذکیر فرمائی' اور اسی کی دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں اُمّیین میں سے ایک اُمت تیار فرما دی' اسے تربیت وتزکیہ کے مراحل سے گزارا' اسے نہ صرف یہ کہ کتاب و شریعت کی تعلیم دی بلکہ کتاب کا ایک بھرپور عملی نمونہ اس کے سامنے پیش کر کے دکھا دیا' اور پھر حجۃ

الوداع کے موقع پر اُمت سے یہ گواہی لینے کے بعد کہ: ''اِنَّـا نَشْهَـدُ اِنَّكَ قَـدْ بَـلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَـصَحْتَ ''[۱] (اے نبی ﷺ! ہم گواہ ہیں کہ آپ نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا' اللہ کی امانت درست طور پر پہنچا دی اور نصح وخیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔) خطبے کے آخر میں فرمایا: ((فَلْيُبَـلِّـغِ الشَّـاهِدُ الْغَائِبَ)) [۲] کہ جو یہاں موجود ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پیغامِ حق کو پہنچائیں ان تک کہ جو یہاں موجود نہیں۔ غور کیجیے' یہی واحد لائحہ عمل ممکن تھا' اس کے سوا کوئی صورت حال قابل عمل نہیں تھی' اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ اگر پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول ہیں' اور بلا شک وشبہ ہیں' تو یا تو یہ صورت ہوتی کہ آپؐ کی حیاتِ دُنیوی قیامت تک دراز کر دی جاتی تا کہ آپؐ اپنے فرائض رسالت خود بنفس نفیس ادا فرماتے رہتے' پھر جو کوئی آپؐ کا ساتھی بنتا وہ دعوت وتبلیغ کے کام میں آپؐ کا دست وبازو بنتا جاتا' آپؐ کے اعوان وانصار بنتے' آپؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنی جانیں دیں اور اپنی جان اور مال اس راہ میں کھپایا۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً تبلیغ دین کا کام قیامت تک براہِ راست نبی اکرم ﷺ ہی کی زیر سرکردگی جاری رہتا۔ لیکن جب نبی اکرم ﷺ کا وصال ہو گیا تو اب ایک ہی راستہ ممکن تھا کہ وہ اُمت جو آپؐ نے تیار فرما دی' اللہ کا پیغام نوعِ انسانی تک پہنچانے کی ذمہ دار بنے' وہ اسی قرآن کو ہاتھ میں لے کر نکلے اور اس کی ہدایت تامہ سے پورے روئے ارضی کو منور کرے' قرآن کی تعلیمات کو عام کرے اور اس کی تبلیغ کا فریضہ ادا کرے' بلکہ اس کا حق ادا کر دے۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں!

اسی حوالے سے خطبہ حجۃ الوداع کا ایک اور جملہ بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((قَـدْ تَـرَكْتُ فِيْكُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا' كِتَابَ اللّٰهِ)) ''لوگو! میں چھوڑ کر جا رہا ہوں تمہارے مابین وہ چیز کہ اگر تم نے اس کو تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' اور وہ ہے اللہ کی کتاب!'' —— غور کیجیے کہ یہاں ''اعتصام'' کا لفظ آیا ہے۔ اس کا تعلق جوڑ لیجیے سورۃ الحج کے درس کے ساتھ۔ وہاں ﴿وَاعْتَـصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ کے الفاظ وارد ہوئے تھے اور میں نے عرض کیا تھا کہ اعتصام باللہ کی قدرے وضاحت کے لیے میں نے قرآن مجید کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا یہ قول سنایا تھا کہ: ((هُـوَ حَبْلُ اللّٰـهِ الْمَتِيْنُ)) (یہ قرآن ہے اللہ کی مضبوط رسی)۔ یہاں خطبہ حجۃ الوداع میں یہی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبیؐ

(۲) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی

بات آئی کہ ((قَدۡ تَرَکۡتُ فِیۡکُمۡ مَا اِنِ اعۡتَصَمۡتُمۡ بِہٖ)) کہ اے مسلمانو' میں تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں وہ کتاب کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہ ہو گے —— تو جان لیجیے کہ انبیاء کے بعد ان کی اُمتیں کتاب کی وارث ہوا کرتی ہیں' وراثت کتاب کا مضمون سورۃ الشوریٰ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَاِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡرِثُوا الۡکِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لَفِیۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِیۡبٍ﴾ ایک شکوے کے سے انداز میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ وہ لوگ یا وہ اُمتیں جو نبیوں کے بعد ان کی کتابوں کی وارث بنتی ہیں وہ اس کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ کتاب کے وارث ہونے کے ناطے اُمت کا فرضِ منصبی یہ بنتا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کو ہاتھ میں لے کر اُٹھ کھڑی ہو اور اس کے نورِ ہدایت سے چہار دانگ عالم کو منور کر دے۔ اے مسلمانو! اگر تم یہ فرضِ منصبی ادا نہیں کرو گے تو جان لو کہ پھر تمہارا طرزِ عمل وہ ہو گا جو اس سے پہلے یہود اختیار کر چکے ہیں' اور جس کی پاداش میں انہیں مغضوب علیہم قرار دیا جا چکا ہے —— یہاں وہ ربط اب معین ہو گیا۔ اگلی آیات کے مضامین کا اس سورت کے مرکزی مضمون کے ساتھ درحقیقت یہی ربط ہے۔

تورات کے ساتھ یہود کا طرزِ عمل —— ایک عبرت ناک مثال

فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىةَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡهَا كَمَثَلِ الۡحِمَارِ یَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ؕ بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۝۵﴾

کہ تم سے پہلے بھی ایک اُمت حامل کتاب بنائی گئی تھی' تورات جیسی نعمت اسے عطا ہوئی تھی۔ حامل کا لفظ ''حَمَلَ یَحۡمِلُ'' سے اسم الفاعل ہے۔ اس کا مفہوم ہے ''بوجھ اٹھانے والا''۔ اسی طرح ''حَمَّالٌ'' کہتے ہیں بوجھ اٹھا کر لے جانے والے کو۔ عربی زبان میں یہ لفظ عام طور پر مزدور کے لیے مستعمل ہے' یعنی وہ شخص جس کا کام ہی یہ ہے کہ بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرے۔ گویا حامل کتاب الٰہی اُس قوم کو کہا جائے گا جس کے ذمے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کو دوسروں تک پہنچائے' اسے پھیلائے' اس کی ہدایت کو عام کرے۔ یہ کتاب رسول ﷺ کے ذریعے تم تک پہنچی ہے' اب اس کو پوری نوعِ انسانی تک پہنچانا تمہارے ذمے ہے۔ لیکن یہود نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا: ﴿مَثَلُ الَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىةَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡهَا﴾ ''مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے (جو اٹھوائے گئے تورات)' پھر انہوں نے اسے نہ اٹھایا (اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا)﴿كَمَثَلِ

الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ﴾ ''اس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتابوں کا بوجھ!''
یہاں یہود کو اس گدھے کے مثل قرار دیا گیا ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔

عربی زبان میں سِفر اور سَفر دونوں کی جمع اَسفار آتی ہے۔ سفر کے معنی ہیں کتاب۔ چنانچہ تورات میں شامل کتابوں (یا ابواب) کے لیے یہی لفظ مستعمل ہے' مثلاً سِفرِ پیدائش' سِفرِ تقسیم (The Book of Genesis) وغیرہ۔ اس اعتبار سے یہاں آیت زیر نظر میں ''اَسفار'' کا لفظ اپنے اندر بڑی معنویت لیے ہوئے ہے۔

﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ﴾ یہ تمثیل بھی نہایت بلیغ ہے۔ گدھے کی پیٹھ پر مکالماتِ فلاطوں کی سو جلدوں کی گٹھڑی باندھ کر رکھ دیجیے' اس سے اس کے اندر نہ تو کوئی فلسفیانہ بصیرت پیدا ہو گی اور نہ ہی حکمت اور دانائی کی کوئی بات اسے حاصل ہو گی۔ یہ مثال ہے اُس قوم کی جو کتابِ الٰہی کی حامل بنائی جائے اور پھر وہ اس کا حق ادا نہ کرے' اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے! اگرچہ یہ تمثیل ایک بار تو انسان کو چونکا دیتی ہے کہ تورات کی حامل اُمت کے لیے گدھے کی مثال! لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی نکمی شے کے اندر شناعت اور گراوٹ کا جو پہلو موجود ہوتا ہے اسے واضح کرنے کے لیے کوئی ایسی تمثیل مؤثر ہوتی ہے جس سے طبیعت میں ایک دفعہ لرزش سی پیدا ہو جائے۔ فصاحت اور بلاغت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

تکذیب حالی

آگے فرمایا: ﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''بری ہے مثال اُس قوم کی جنہوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا'' — یہاں لفظ ''تکذیب'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تکذیب قول سے بھی ہو سکتی ہے اور عمل سے بھی۔ یعنی تکذیب باللسان بھی ہو سکتی ہے اور بالحال بھی۔ یہ بھی تکذیب ہی کی ایک صورت ہوتی اگر بنی اسرائیل زبان سے صاف کہہ دیتے کہ تورات اللہ کی کتاب نہیں ہے' لیکن تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے اس معنی میں تورات کی تکذیب کبھی نہیں کی۔ ہاں تکذیب عملی کے وہ ضرور مرتکب ہوئے۔ وہ تکذیب عملی کہ جس کا نقشہ بدقسمتی سے آج اُمت مسلمہ پیش کر رہی ہے کہ بجائے قرآن کو اپنا پیشوا' رہنما اور مشعل راہ بنانے کے اُمت کی عظیم اکثریت نے اسے طاقِ نسیاں پر رکھ چھوڑا ہے۔ قرآن نے اس طرزِ عمل کو تکذیب کے لفظ سے موسوم کیا ہے: ﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ﴾ یہ اللہ کی آیات کی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے! زبان سے چاہے

قرآن مجید پر کتنا ہی ایمان کا دعویٰ کیا جائے‘ اگر قرآن مجید کو ہم نے اپنا امام نہیں بنایا‘ قرآن مجید کی رہنمائی کو عملاً اختیار نہیں کیا‘ قرآن مجید کے عطا کردہ ضابطے اور قانون کو نافذ نہیں کیا‘ اس کی تعلیمات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو استوار نہیں کیا تو گویا کہ اپنے عمل سے ہم قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں۔ یہ تکذیب حالی ہے۔

اُمت مسلمہ کے لیے ایک پیشگی تنبیہہ

اب آیئے آیت کے آخری ٹکڑے کی طرف: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ’’اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا‘‘۔ نوٹ کیجیے‘ یہ وہی انداز ہے جو سورۃ الصّف میں آ چکا ہے۔ وہاں ظالم کی بجائے فاسق کا لفظ تھا: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ﴾ اسلوب اور اسٹائل بعینہٖ وہی ہے۔ یہ چیز اُن مشترک اوصاف میں سے ہے جو جڑواں سورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ بہرحال اس آیۂ مبارکہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی کہ کتابِ الٰہی کے حامل ہونے کے ناطے ہر اُمت اور ہر قوم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں‘ اگر اُن ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے تو درحقیقت یہ طرزِ عمل تکذیب کتاب کے مترادف ہے۔ یہ ایک پیشگی تنبیہہ تھی اُمت مسلمہ کو کہ اے مسلمانو! کہیں یہی معاملہ تم کتاب اللہ کے ساتھ نہ کر بیٹھنا! یہی وہ بات ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ایک نہایت جامع فرمان میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ فرمایا: ((يَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) ’’اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا‘‘۔ وسادہ کہتے ہیں تکیے کو۔ یہ جملہ دو مفہوم دے رہا ہے (۱) تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے‘ اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا۔ اور (۲) تکیے پر انسان سہارا لیتا ہے۔ اور ایک سہارا ذہنی اور نفسیاتی بھی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کو اس طرح کا ذہنی اور نفسیاتی سہارا نہ بنا بیٹھنا کہ ہم تو حامل کتاب ہیں‘ قرآن کے وارث ہیں‘ محمد ﷺ کے اُمتی ہیں۔ اس طرح کا ذہنی سہارا بسا اوقات بے عملی کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ روک دیا گیا کہ قرآن کو اس نوع کا ایک ذہنی سہارا نہ بنا لینا‘ بلکہ تمہاری اصل توجہ اس جانب ہونی چاہیے کہ قرآن کے حوالے سے ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں‘ قرآن کے ساتھ ہمارا عملی رویہ کیا ہونا چاہیے‘ اور یہ کہ قرآن مجید کے وہ کون کون سے حقوق ہیں جن کی ادائیگی کی فکر ہر مسلمان کو کرنی ہے اور ان کی ادائیگی کی عملی صورت کیا ہے؟

قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں

نبی اکرم ﷺ کی جس حدیث شریف کا ابھی ذکر ہوا تھا اس میں اس پیشگی تنبیہہ کے بعد کہ ((یَـااَھْـلَ الْـقُـرْآنِ لَا تَتَـوَسَّـدُوا الْـقُـرْآنَ)) ''اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ اور ذہنی سہارا نہ بنا لینا''آپؐ نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان اساسات کو واضح فرمایا' کہ جن پر قرآن حکیم کے ساتھ اُمت مسلمہ کے صحیح تعلق کا دار و مدار ہے' اور جن کی بجا آوری کی اُمت کو فکر کرنی چاہیے۔فرمایا: ((وَاتْـلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ فِیْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ)) ''اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی''۔((وَتَـغَـنَّوْهُ)) ''اور اسے خوش الحانی سے پڑھا کرو!''اس لیے کہ ہر انسان کو کسی نہ کسی درجے میں حسن سماعت سے بھی حصہ ملتا ہے۔بندۂ مؤمن کے لیے اپنی فطرت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ اچھی سے اچھی آواز میں اور بہتر سے بہتر انداز میں قرآن مجید کو پڑھے اور اس سے حظ حاصل کرے۔

آگے فرمایا:((وَافْشُـوْهُ)) ''اور اسے پھیلاؤ''۔اسے عام کرو! حضرت مسیح علیہ السلام نے بڑی پیاری بات فرمائی تھی کہ چراغ جلا کر اسے کہیں نیچے نہیں رکھا کرتے' بلکہ بلند مقام پر رکھتے ہیں تاکہ اس کی روشنی عام ہو۔یہ نورِ ہدایت' قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔جس کا نقشہ کھینچا گیا اس شعر میں ؎

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

بھٹکتے ہوئے قافلہ انسانیت کے لیے قندیل ہدایت یہی قرآن ہے۔اس کو پھیلانے اور عام کرنے کی نبی اکرم ﷺ نے تاکید فرمائی۔اسی کی جانب اشارہ فرمایا آپؐ نے اپنے آخری خطبے میں :((فَـلْیُبَـلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ''کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہیے کہ اس پیغام کو پہنچائیں ان تک جو یہاں موجود نہیں''۔اور اس بات کو منطقی انتہا تک آپؐ نے پہنچا دیا اپنے اس قولِ مبارک کے ذریعے کہ:((بَـلِّـغُـوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً)) ''پہنچاؤ میری جانب سے' خواہ ایک ہی آیت ہو''۔چراغ سے چراغ اسی طور سے روشن ہوگا۔اس ضمن میں آپ کا یہ ارشاد بھی نہایت اہم ہے:((خَیْـرُکُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْـقُـرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے''جو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں اور متفق علیہ روایت

ہے۔یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں:((وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)) ''اس پر غور وفکر کرو(اس کے مفاہیم ومعنی کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرو) تاکہ تم فلاح اور کامیابی سے ہمکنار ہوسکو!''

اسی سلسلے میں ایک اور حدیث بھی جس کے راوی حضرت علی ؓ ہیں' انتہائی توجہ کے لائق ہے۔ نبی اکرم ﷺ قرآن کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:((وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ)) ''اور یہ کتاب وہ ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے'' ((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ)) ''اور اہل علم اس سے کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے'' ((وَلَا يخلق عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ))[1] ''بار بار کے پڑھنے کے باوجود(اس سے طبیعت اکتائے گی نہیں)اس پر پرانے پن کا کوئی احساس کبھی پیدا نہ ہونے پائے گا''—— یہ ہے اللہ کی کتاب' جس کے حقوق کی ادائیگی ہم سب کو فکر ہونی چاہیے۔

اس موضوع پر اللہ کے فضل وکرم سے مَیں نے کسی زمانے میں مسجد خضریٰ لاہور میں دو تقریریں کی تھیں جو اَب ایک کتابچے کی شکل میں موجود ہیں' جس کا عنوان ہے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' یہ کتابچہ یوں سمجھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث ہی کی وضاحت پر مشتمل ہے کہ ''اے مسلمانو! حامل قرآن ہونے کے اعتبار سے پہچانو کہ تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں' تمہارے فرائض کیا ہیں!اس کو مانو جیسا کہ ماننے کا حق ہے' اسے پڑھو جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے' اس کو سمجھو جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے' اس پر عمل کرو جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے' اور آخری ذمہ داری یہ کہ اس کو پھیلاؤ' اس کی تبلیغ وتبیین کرو جیسا کہ اس کی تبلیغ کا حق ہے''۔ چہار دانگ عالم کو اس کے نور سے منور کرنے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں خرچ کرنا اور کھپانا ہر مسلمان پر اس کتاب عزیز کا وہ حق ہے جسے ہم فراموش کیے ہوئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت چونکہ ((اِلَی کَافَّةَ النَّاسِ)) تھی' یعنی آپؐ تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں' لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے تبلیغ وتعلیم قرآن کے ذریعے ایک مخصوص خطہ زمین میں ایک انقلابِ عظیم برپا فرما دیا اور وہاں بسنے والی قوم کو وہ نسخۂ کیمیا قرآن مجید عطا فرما کر آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اب اُمت کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ وہ اس چراغ کو لے کر نکلے اور اس کے نور سے روئے ارضی کو منور کردے ؎

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

ذہن میں رکھیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے اس فرضِ منصبی کا پورا شعور حاصل تھا۔ چنانچہ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا تو دوسرے میں تلوار! حقیقت یہ ہے کہ ایک مردِ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولا انسان کے تصور میں اُبھرتا ہے اس میں لازماً یہ بات شامل ہوتی ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہے اور دوسرے میں تلوار۔ ایک طرف قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اس کے نورِ ہدایت کو عام کرنا اور دوسری جانب اللہ کے دین کے غلبے کے لیے اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں سے جہاد اور قتال' یہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا نقشہ!

قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل

یہ ہے وہ کام کہ جو نبی اکرم ﷺ اُمت کے سپرد فرما کر گئے تھے۔ اس سلسلے میں پیشگی تنبیہہ سورۃ الجمعہ میں کر دی گئی کہ دیکھنا کہیں اس کے برعکس تمہارا طرزِ عمل یہود کا سا نہ ہو جائے' جنہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ وفاداری نہیں کی تو اللہ نے انہیں اس گدھے کے مشابہ قرار دیا جس پر کتابوں کا بوجھ لدھا ہوا ہو۔

﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝﴾

''نہایت بری مثال ہے اس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

یہ بات دوسری ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا قول مبارک ہمارے بارے میں پورا ہوا ہے کہ ((لَـيَـاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) اور ہم بعینہٖ یہود کے نقش قدم پر چل رہے ہیں' چنانچہ قرآن کے ساتھ ہمارا تعلق بس اتنا رہ گیا ہے کہ ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یاسین اُو آساں بہ میری

قرآن ہمارے نزدیک محض ایصالِ ثواب یا حصولِ ثواب کا ایک ذریعہ ہے یا موت کو آسان کرنے کا ایک نسخہ کہ مرتے ہوئے سورۂ یٰسین سنا دی جائے تاکہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔ ہماری عملی زندگی کا قرآن حکیم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ ہماری رہنما کتاب ہے' نہ یہ ہماری امام ہے' نہ یہ قولِ فیصل ہے کہ ہمارے تمام فیصلے اسی پر مبنی ہوں' نہ اس پر ہماری زندگی کا نظام استوار ہے۔ تو گویا بعینہٖ وہ بات کہ جو یہود کو نشانِ عبرت کے طور پر پیش کر کے ہمیں بطور تنبیہہ کہی گئی تھی ہماری بدبختی اور

بدقسمتی کہ ہم پر صادق آ رہی ہے اور ہم اس وقت اپنی موجودہ صورت حال سے اس کا ایک مکمل نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

اگلی آیات میں یہ حقیقت کھولی گئی ہے کہ کسی مسلمان اُمت میں زوال اور گمراہی کا پیدا ہو جانا کن اسباب سے ہوتا ہے! بڑی جامعیت کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا گیا:

﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝﴾

''(اے نبیؐ) کہیے: اے یہودیو! اگر تمہیں یہ زُعم ہے (اگر تمہیں یہ خیالِ خام لاحق ہو گیا ہے) کہ تم اللہ کے بڑے دوست ہو (اس کے چہیتے اور محبوب ہو) لوگوں کو چھوڑ کر' تو اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو!''

دوست سے ملاقات کی آرزو ہر شخص کو ہوتی ہے' اس سے دُوری تو انسان پر شاق گزرتی ہے۔

عملی اضمحلال کا اصل سبب

یہاں اشارہ ہوا اس بات کی طرف کہ کسی مسلمان اُمت میں عملی گمراہی اور اضمحلال کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہنوں میں بالعموم یہ خیالِ خام راسخ ہو جاتا ہے کہ ہم بخشے بخشائے ہیں' ہم اللہ کے چہیتے ہیں: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ہم اللہ کے برگزیدہ بندوں کی اولاد اور اس کے پسندیدہ بندوں کے ساتھ نسبت اور تعلق رکھنے والے لوگ ہیں' جہنم کی آگ ہمارے لیے نہیں کسی اور کے لیے ہے۔ اس زعم اور بے بنیاد خیال کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں تساہل اور عملی زوال شروع ہو جاتا ہے۔ پھر انسان اپنی نجات کے معاملے کو عمل کرنے کی بجائے ان تعلقوں اور نسبتوں پر موقوف سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں جھنجوڑنے کے لیے ایک بڑی ہی عملی مثال سامنے لائی گئی کہ اگر تمہیں فی الواقع یہ خیال ہے کہ تمہیں خدا سے محبت ہے تو اس سے جلد سے جلد ملاقات کا جذبہ اور شوق تمہارے دل میں موجزن ہونا چاہیے۔ وہ جس کا نقشہ کھینچا علامہ اقبال نے ان الفاظ میں ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

اپنے گریبانو میں جھانکو' کیا واقعی یہ کیفیت ہے؟ کیا واقعی یہ زندگی تم پر اسی طرح بھاری گزر رہی ہے جیسے کہ حضور ﷺ نے نقشہ کھینچا تھا کہ: ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ)) ''یہ دنیا ایک

بندۂ مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے گلستان''۔ یا معاملہ اس کے برعکس ہے اور دنیا سے محبت کی کیفیت وہ ہے جو سورۃ البقرۃ میں یہود کی بیان ہوئی:

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴾ (البقرۃ:٩٦)

کہ ان میں سے ہر ایک کی بڑی خواہش ہے کہ زندگی طویل ہو جائے' ایک ہزار برس تک وہ اس دُنیا میں جی سکیں اور یہاں کا لطف اٹھا سکیں' ان کی اصل کیفیاتِ باطنی تو یہ ہیں' دعویٰ کر رہے ہیں خدا کی محبت کا اور خدا کے محبوب ہونے کا۔

یہ ہے وہ پریکٹیکل ٹیسٹ جو اُن کے سامنے رکھ دیا گیا کہ اس پر اپنے آپ کو پرکھو۔ آیت کے اگلے ٹکڑے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ﴾

''اور یہ ہرگز ہرگز تمنا نہیں کر سکتے موت کی' بسبب اس کمائی کے جو اُن کے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہوئی ہے''۔

سورۃ القیامۃ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ﴾ کہ انسان کو خوب معلوم ہوتا کہ وہ کہاں کھڑا ہے' کتنے پانی میں ہے۔ ﴿وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۭ﴾ خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں اور کتنے ہی بہانے تراش لے اور خواہ وہ اپنی استدلالی قوت سے اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند کرا دے' لیکن اس سب کے باوجود اس کا ضمیر اسے بتا رہا ہوتا ہے کہ تم حقیقت میں کیا ہو—— چنانچہ صاف فرما دیا کہ یہ یہود اگرچہ خود کو اللہ تعالیٰ کا لاڈلا اور چہیتا قرار دیتے ہیں' لیکن جو کچھ یہ اپنے ہاتھوں سے آگے بھیج چکے ہیں' جو کمائی انہوں نے کی ہے آخرت کے نقطۂ نگاہ سے' اس کے پیش نظر یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کر سکتے۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ''اور اللہ ظالموں سے بخوبی باخبر ہے''۔

اگلی آیت میں یہ مضمون اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ﴾ کہ (اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو' جس سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی۔ کتنا ہی بھاگو' کتنا ہی اس سے پہلو بچانے کی کوشش کرو' وہ سامنے آ کھڑی ہوگی۔ ﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف کہ جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے ﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

تَعۡمَلُوۡنَ﴿۸﴾ پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔

اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان آیات میں خطاب اگرچہ یہود سے ہے' لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا تھا ان سورتوں میں اصل تخاطب اُمت مسلمہ سے ہے' ساری بات مسلمانوں سے ہو رہی ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اصل میں اُمت مسلمہ کو گویا پیشگی طور پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے اندر اگر عملی اضمحلال آئے گا' اپنے دینی مطالبات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے تم اگر پہلوتہی کرو گے تو اس کا اصل سبب یہ ہوگا کہ تمہیں یہ زعم لاحق ہو جائے گا کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں' ہم اس کے محبوبوں کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ زعم ہے جو تمہیں عمل سے دور کرتا چلا جائے گا اور اس کا ایک نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم دنیا پرستی میں غرق ہوتے چلے جاؤ گے۔ دنیا ہی تمہارا مطلوب ومقصود بنتی چلی جائے گی اور دوسرے یہ کہ موت کا خوف رفتہ رفتہ تم پر مسلط ہو جائے گا۔

ایک چونکا دینے والی حدیث

نبی اکرم ﷺ نے خبر دی تھی کہ اے مسلمانو! ایک وقت آئے گا کہ دنیا کی قومیں تم پر ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے دعوت کا اہتمام کرنے والا کوئی شخص دسترخوان کے چنے جانے کے بعد مہمانوں سے کہتا ہے کہ آیئے تشریف لایئے' کھانا تناول فرمایئے! اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حیران ہو کر پوچھا کہ مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ یَوْمَئِذٍ؟ حضور! کیا اس زمانے میں ہماری تعداد بہت کم رہ جائے گی؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نہیں! ((بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ)) تعداد تو تمہاری بہت ہوگی' نوے کروڑ' ایک ارب اور نمعلوم کتنی! لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہوگی کہ جیسے کسی جگہ اگر سیلاب آ جائے تو سیلاب میں پانی کے ریلے کے اوپر کچھ جھاڑ جھنکار ہوتا ہے' کچھ جھاگ ہوتا ہے ((وَلٰکِنَّکُمْ غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیْلِ)) اس سے زائد تمہاری حیثیت نہیں ہوگی' دنیا میں تمہاری اہمیت اس سے بڑھ کر نہ رہے گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر سوال کیا کہ حضور! ایسا کیوں ہو جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا: تمہارے اندر ایک بیماری پیدا ہو جائے گی جس کا نام ''وھن'' ہے۔ سوال کیا گیا: ''مَا الْوَھْنُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ'' کہ حضورؐ! وہ وہن کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ((حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ)) دنیا کی محبت اور موت سے نفرت —— یہ بیماری جب تم میں پیدا ہو جائے گی' جب دنیا تمہاری محبت کا مرکز بن جائے

گی اور موت سے تم دور بھاگنے لگو گے تو بہت بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود تم اقوامِ عالم کے لیے لقمۂ تر بن جاؤ گے —— لیکن ظاہر بات ہے کہ کوئی اپنی درازیٔ عمر کے باعث اللہ کی پکڑ سے بہر حال بچ نہیں سکے گا' اسے بالآخر اپنے ربّ کی طرف لوٹنا ہی ہوگا اور وہاں اس کا حساب چکا دیا جائے گا۔

یہاں اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ مکمل ہوا جو چار آیات پر مشتمل ہے۔ ان میں ذکر اگرچہ سابقہ اُمت مسلمہ یہود کا ہے' لیکن اصلاً یہ ایک آئینہ ہے کہ جس میں نئی اُمت مسلمہ کو آئندہ کی تصویر دکھائی جا رہی ہے کہ جیسے وہ حاملِ کتاب بنائے گئے تھے اس طرح تم بھی حامل قرآن بنائے جا رہے ہو' جیسے وہ وارثِ کتاب بنے تھے ویسے ہی تم بھی وارثِ کتاب بنائے گئے ہو' دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ جو معاملہ انہوں نے کیا تھا تم بھی قرآن کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگو!! یہ ہے درحقیقت اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے اور دوسرے حصے کے مابین ربط و تعلق۔ چونکہ انقلابِ محمدیؐ کا آلہ قرآن حکیم ہے اور حضورﷺ کی بعثت قیامت تک آنے والی پوری نوع انسانی کے لیے ہے' لہٰذا جس عمل کو حضورﷺ نے جاری رکھا ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡھِمۡ وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ﴾ اور جس کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر انقلاب جزیرہ نمائے عرب میں برپا کر دیا' اسی عمل کو جاری رکھنا اور آگے چلانا اُمت کی ذمہ داری ہے۔

اس کے لیے اساسی منہاج وہی ہوگا جو نبی اکرمﷺ نے اختیار کیا' جس میں مرکز و محور کی حیثیت قرآن حکیم کو حاصل تھی۔ یہاں سورۃ الجمعہ کا پہلا رکوع ختم ہوا۔

حکمت و احکامِ جمعہ

سورۃ الجمعہ کا دوسرا رکوع تین آیات پر مشتمل ہے اور اس میں حکمت و احکامِ جمعہ کا بیان ہے۔ یہاں ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ اس سورۂ مبارکہ کے مرکزی مضمون اور عمود کے ساتھ نظامِ جمعہ کا کیا تعلق ہے۔ اس لیے کہ بظاہر تو معاملہ غیر متعلق سا نظر آتا ہے! —— تاہم پہلے ان آیات کا ایک رواں ترجمہ کر لینا مفید ہوگا۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَۃِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الۡبَیۡعَ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹﴾﴾

''اے اہل ایمان! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو لپکو اللہ کی یاد کی طرف اور

کاروبار چھوڑ دو! یہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھو۔''

ذہن میں تازہ کیجیے' سورۃ الصّف کا دوسرا رکوع بھی شروع ہوا تھا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ کے الفاظ سے اور اس میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے تھے کہ ﴿ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

یہ مشابہت لفظی بھی بہت قابل توجہ ہے۔ آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْ لَھْوَا ۨانْفَضُّوْٓا اِلَیْھَا وَتَرَکُوْکَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّھْوِ وَمِنَ التِّجَارَۃِ ؕ وَاللّٰہُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ۝۱۱﴾

''جب نماز ادا کی جا چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو' اور اللہ کا ذکر جاری رکھو کثرت کے ساتھ' تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (اب ایک متعین واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) جب انہوں نے دیکھا کوئی کاروبار یا کوئی اور دلچسپی کی چیز تو وہ اس کی طرف لپک گئے اور چھوڑ گئے آپ کو (اے نبیؐ) کھڑے ہوئے۔ کہہ دیجیے جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے تجارت سے بھی اور دلچسپیوں کی چیزوں (لہو ولعب) سے بھی' اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔''

ان تین آیات میں' جیسا کہ ترجمے سے واضح ہو گیا' ساری بات نمازِ جمعہ اور خطبۂ جمعہ کی ہو رہی ہے۔ جمعہ کی فرضیت اس درجے واضح کی گئی کہ صریحاً فرما دیا گیا کہ جب جمعہ کی اذان ہو جائے تو ہر نوع کا کاروبارِ دنیوی ترک کر دیا جائے' ہمہ تن متوجہ ہو جایا جائے! یہ ساری باتیں جو آ رہی ہیں تو پہلے جیسا کہ عرض کیا گیا تھا یہ سمجھئے کہ اس کا ربط کیا ہے۔

رہ گئی رسمِ اذاں......

درحقیقت یہ نظامِ جمعہ جس کو ہم نے ایک رسم بنا لیا' ایک نہایت عظیم اور مبنی برحکمت نظام ہے۔ اس معاملے میں تو شاید مسلمانوں کو دنیا کی کوئی قوم بھی مات نہ دے سکے کہ بڑی سے بڑی چیز کو ایک رسم بنا کر رکھ دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے — نتیجہ یہ ہے کہ اعمال کی محض صورت اور شکل باقی رہ جاتی ہے اور اس کی روح غائب! یہ بات نظروں کے سامنے رہتی ہی نہیں کہ وہ عمل کس لیے تھا' اس کا مقصد کیا تھا؟ بس عمل کی ظاہری صورت باقی رہتی ہے اور اس کی حیثیت ایک رسم (Ritual) سے زیادہ نہیں ہوتی۔

رہ گئی رسم اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی!

اسی طرح کا معاملہ اجتماعِ جمعہ کا ہے۔ آج اس گئے گزرے دَور میں بھی مسلمانوں میں ابھی کثیر تعداد میں وہ لوگ موجود ہیں جو جمعہ کے لیے بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آتے ہیں' نہا دھو کر' اچھے صاف ستھرے کپڑے پہن کر' خوشبو لگا کر آتے ہیں' لیکن یہ بات بالعموم پیشِ نظر نہیں ہوتی کہ اس نظامِ جمعہ کا اور اس سب اہتمام کا حاصل کیا ہے' اس کی غرض و غایت کیا ہے' اس کی حکمت کیا ہے!۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس جمعہ کی اصل اہمیت خطبہ جمعہ کی وجہ سے ہے' ورنہ جمعہ کی نماز میں فرض رکعتوں کی تعداد نمازِ ظہر سے بھی نصف رہ جاتی ہے جس کا کہ وہ قائم مقام بنتی ہے۔ نماز ظہر کی چار رکعتیں ہیں جب کہ نمازِ جمعہ میں کل دو رکعات فرض شامل ہیں۔ گویا نماز کی رکعتوں کی تعداد کم ہوگئی۔ جمعہ کو جس چیز نے ''جمعہ'' بنایا ہے وہ خطبہ جمعہ ہے' اور خطبہ جمعہ کی غرض و غایت کیا ہے' اسے مسلم شریف کی ایک روایت کے حوالے سے سمجھئے کہ حضور ﷺ خطبہ جمعہ میں کیا کیا کرتے تھے؟ —— ''كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَءُ الْقُرْآنَ وَيُذَكِّرُ النَّاسَ '' —— ''آپ ﷺ قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے اور لوگوں کو تذکیر فرماتے تھے' یاددہانی کیا کرتے تھے۔ یہ تذکیر بالقرآن وہی ہے جس کا ذکر سورۂ ق کی آخری آیت میں آیا ہے: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ یعنی ''اے نبی! اس قرآن کے ذریعے سے تذکیر فرمائیے (اور یاددہانی کراتے رہیے) ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہو''۔

حکمت جمعہ

خطبہ جمعہ دراصل عوامی سطح پر تذکیر بالقرآن ہی کی ایک ہمہ گیر شکل ہے۔ یہ گویا تعلیم بالغاں کا ایک عظیم نظام ہے جو اُمت میں رائج کیا گیا کہ کوئی نائب رسول منبر رسولؐ پر کھڑا ہو کر اور قرآن حکیم کی آیات کے ذریعے تذکیر و نصیحت کا وہی فریضہ سرانجام دے جو درحقیقت انقلاب محمد ﷺ کی جڑ اور بنیاد ہی نہیں' مرکز و محور بھی ہے۔ یعنی ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اسی نبوی عمل کو دوام بخشا گیا اور اسے اُمت کے اندر ایک مستقل عمل کی حیثیت سے جاری کر دیا گیا نظامِ جمعہ کی صورت میں' کہ لوگ خطبہ سننے کے لیے پورے اہتمام سے نہا دھو کر آئیں' اعصاب چاق و چوبند ہوں' ماحول معطر ہو۔ غور کیجیے' یہ ساری ہدایات کیوں دی گئیں! نبی اکرم ﷺ نے اس معاملے میں یہاں تک فرمایا کہ کیا تمہارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اپنے ان کپڑوں کو جو محنت

مزدوری کے وقت پہنتے ہو' علیحدہ رکھو اور جمعہ کے لیے ایک صاف ستھرا جوڑا علیحدہ تیار رکھو؟ تا کہ جب مسلمان جمع ہوں تو وہاں کا ماحول پسینے کی بدبو سے منغض نہ ہو بلکہ پاک صاف اور معطر ماحول ہو کہ مسلمان خطبہ جمعہ پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ سن سکیں اور کوئی نائب رسول جب عمل نبویؐ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے آیات قرآنی کے ذریعے سے وعظ ونصیحت کرے تو ان باتوں کو سننے اور سمجھنے کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکے۔

ہفتہ وار اجتماعات کی ضرورت

یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ ہر انقلابی جماعت کے لیے اس طرح کے اجتماعات کا اہتمام کرنا ایک لازمی امر ہے۔ ہر انقلابی گروہ یا جماعت کا کوئی نہ کوئی لٹریچر ہوتا ہے جو اس کے اساسی افکار و نظریات پر مشتمل ہوتا ہے اور کسی بھی انقلابی گروہ یا جماعت کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اساسی لٹریچر کے ساتھ اپنے ذہنی ربط وتعلق کو برقرار رکھے اور اس لٹریچر کے ذریعے وقتاً فوقتاً اپنے افکار و نظریات کو تازہ کرتی رہے۔ مختلف جماعتیں اسی غرض سے ہفتہ وار اجتماعات کا اہتمام کیا کرتی ہیں۔ مسلمان بھی دراصل ایک نظریاتی گروہ کے افراد ہیں۔ اس گروہ یا اُمت کے سامنے ایک عظیم مشن ہے' فرائض رسالت کی ادائیگی کی ذمہ داری اسی اُمت کے کاندھوں پر آئی ہے' انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی عالمی سطح پر تکمیل اُمت کا مشن قرار پایا ہے اور اس انقلابی جماعت کا لٹریچر ہے قرآن مجید۔ ان کے فکر کو تازہ کرنے اور ان کے نقطۂ نظر کو صحیح رکھنے کے لیے اس ابدی لٹریچر کی پیہم اور مسلسل تعلیم کا نظام جاری کر دیا گیا خطبہ جمعہ کی شکل میں۔ اس خطبے کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ فرمایا گیا کہ جب امام خطبہ دے رہا ہو تو ایک دوسرے سے کلام نہ کرو' یہاں تک کہ دورانِ خطبہ اگر تم نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ خاموش رہو تو اتنا کہنا بھی ایک ناپسندیدہ حرکت ہے۔ ((اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ اَنْصِتْ فَقَدْ لَغَوْتَ)) کہ اگر کسی نے کوئی لغو حرکت کی کہ دوران خطبہ بولنا شروع کر دیا اور تم نے اس سے کہا کہ ''چپ ہو جاؤ'' تو تم نے بھی ایک لغو حرکت کا ارتکاب کیا۔ پوری خاموشی کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہو کر سنو۔ اللہ کے پاک کلام کی جو تعلیم وتلقین ہو رہی ہے اور اس کے ذریعے سے جو تذکیر ونصیحت کا عمل خطبے کی صورت میں جاری ہے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤ!

خطبۂ جمعہ کی اہمیت کا اندازہ حضور ﷺ کے اس فرمان سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب خطبے کا آغاز ہو جاتا ہے تو وہ فرشتے کہ جو مسجد کے دروازوں پر بیٹھے آنے والوں کی حاضری کا اندراج کر

رہے ہوتے ہیں' اپنے صحیفے اور رجسٹر بند کر دیتے ہیں اور وہ خود ہمہ تن خطبے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جمعہ میں صرف وہی لوگ حاضر شمار ہوتے ہیں جو وقت پر آئیں اور مکمل خطبے کی سماعت کریں۔ ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ اوّل تو وہ خطبہ عربی زبان میں ہے اور ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ع زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم!—— اس کی تلافی کے لیے اگر تقریروں اور وعظوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تو بڑے دکھ کے ساتھ یہ عرض کر رہا ہوں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان تقریروں میں اور سب کچھ ہوتا ہے سوائے قرآن کے! اس میں سیاست پر بات ہوگی' فرقہ واریت پر گرما گرم گفتگو ہوگی' اس میں کہانیاں ہوں گی' لطیفے بیان ہوں گے' نہیں ہوگا تو بس قرآن نہیں ہوگا جس کے لیے یہ سارا نظام تجویز کیا گیا! جس کے لیے یہ سارا کھکھیڑ مول لیا گیا ہے!

یہ ہے حکمت واحکامِ جمعہ کا مضمون جو اس سورۂ مبارکہ میں بڑی جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ جمعہ سے متعلق احکام دوسرے رکوع میں وارد ہوئے اور اس کی حکمت کا بیان گویا پہلے رکوع میں ہو گیا کہ وہی نبوی عمل جس کا بیان چار اصطلاحات کی صورت میں ہوا ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡھِمۡ وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ﴾ اس کو دوام اور تسلسل عطا کر دیا گیا خطبہ جمعہ کی شکل میں۔ بلاشبہ یہ تعلیم بالغاں کا ایک عظیم نظام ہے۔ چشمِ تصور سے دیکھئے آج اس گئے گزرے دَور میں بھی لاکھوں انسان جمعہ کے لیے بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آتے ہیں ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی''۔ افسوس کہ یہ عظیم عمارت فی الواقع اب کھنڈر بن چکی ہے۔ اس کی حکمت اور اس کی غرض و غایت ہمارے پیشِ نظر ہی نہیں رہی' جمعہ اب ہمارے ہاں بس ایک رسم بن کر رہ گیا ہے اور اس کو رسم کی حیثیت سے ادا کرنے والے آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن ہماری کوتاہی کے باعث اس سے وہ مقصود حاصل نہیں رہا جو کہ اس مبارک عبادت سے حاصل ہونا چاہیے۔

احکامِ جمعہ —— بعض دیگر ہدایات

بہرکیف یہ ہے وہ ربط وتعلق جو دوسرے رکوع کی تین آیات کا اس سورۂ مبارکہ کے عمود کے ساتھ بنتا ہے۔ اس دوسرے رکوع میں بعض مضامین اور بھی ہیں جو اگرچہ سورۃ کے عمود اور ربطِ کلام کے اعتبار سے ضمنی قرار پائیں گے لیکن بہرحال ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ علم وحکمت کا ایک قیمتی موتی ہے۔ ایک تو خطبہ جمعہ کی خصوصی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ﴾ کہ لپکو اللہ کے ذکر کی طرف!— خیال رہے کہ نماز کے لیے دوڑ کر جانے سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے' یہ وقار

کے منافی ہے۔ ورنہ یہاں لفظی ترجمہ تو یہی ہوگا کہ دوڑو اللہ کی یاد کی طرف۔ لیکن ہم اس سے مراد لیں گے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہو جاؤ۔

اگلے الفاظ بھی نہایت قابل توجہ ہیں''وَذَرُوا الْبَيْعَ'' کاروبار ترک کر دو!''وَذَرُوا'' امر کا صیغہ ہے اور یہ قاعدہ سب کے علم میں ہے کہ''اَلْاَمْرُ لِلْوُجُوْبِ''۔ چنانچہ اذانِ جمعہ کے بعد کاروبارِ دنیوی مطلقاً حرام ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ ذہن میں رہے کہ یہ حکم اصلاً اذانِ ثانی سے متعلق ہے' اس لیے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ایک ہی اذان ہوتی تھی۔ دوسری اذان کا اضافہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں کیا گیا جب مدینہ منورہ نے وسعت اختیار کر لی۔ لہٰذا اس حکم کا پوری شدت کے ساتھ اطلاق تو ہوگا اذانِ ثانی کے بعد' لیکن تبعاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اذانِ اولیٰ کے بعد جمعہ کی تیاری کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو جانا اور مسجد کی طرف لپکنا اس آیت کے منشا میں شامل ہے۔

اس آیت میں لفظ''ذکر'' بھی خصوصی طور پر لائق توجہ ہے۔ یہاں ذکر سے مراد ہے خطبہ جمعہ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' خطبہ دراصل قرآن کی تعلیم ہی کا ایک ذریعہ ہے۔ خطیب کا کام یہ ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے حوالے سے تذکیر کرے' وعظ و نصیحت کرے۔ اور قرآن مجید خود اپنے آپ کو ''الذِّکر'' قرار دیتا ہے۔ سورۃ الحجر کی اس آیت میں بھی جو کثرت سے بیان کی جاتی ہے' قرآن کے لیے''الذِّکر'' کا لفظ آیا ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ (الحجر)

''یقیناً ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں''۔

اُمتِ مسلمہ کے لیے خصوصی سہولت

اس کے بعد فرمایا جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ۔ ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ سابقہ اُمت میں یوم السبت (ہفتے کا دن) کُل کا کُل عبادات کے لیے مخصوص تھا اور اس میں کاروبارِ دنیوی مطلقاً حرام تھا۔ لیکن اُمتِ محمد ﷺ کے لیے اس معاملے میں آسانی پیدا کی گئی ہے اور وہ یہ کہ صرف اذانِ جمعہ سے لے کر اختتامِ نماز تک دُنیوی کاروبار اور تجارتی لین دین کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اجازت دے دی گئی کہ جب نماز ادا ہو چکے تو اب تمہیں اختیار ہے کہ جاؤ اور تلاشِ معاش میں مصروف ہو جاؤ۔ اس ضمن میں جو الفاظ یہاں لائے گئے ہیں وہ نوٹ کرنے کے قابل ہیں۔ فرمایا: ﴿وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ کہ جو کچھ

تم کماؤ گے اسے اللہ کا فضل سمجھو' اسے اپنی محنت کا نتیجہ سمجھنا درست نہ ہوگا۔ محنت یقیناً تمہیں کرنی ہے' لیکن جو رزق اور روزی تمہیں عطا ہوئی ہے یہ اللہ کا فضل ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کا نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی تاکید فرما دی: ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰﴾ کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی اللہ کا ذکر جاری رہنا چاہیے۔ اپنے تمام اوقات کو ذکر الٰہی سے آباد رکھنے کی کوشش کرو—— ''اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ''۔ دوامِ ذکر کی بڑی فضیلت ہے۔ ''اِسْتِحْضَارُ اللّٰهِ فِي الْقَلْبِ ''یعنی اللہ کی یاد کو دل میں تازہ رکھنا پسندیدہ ہی نہیں مطلوب بھی ہے۔ اور یہاں تو اسے فلاح کے لیے بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آخری آیات کے حوالے سے ذکر کے مفہوم پر کچھ باتیں قدرے تفصیل سے عرض کی جا چکی ہیں' ان کو ذہن میں تازہ کیجیے!

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت میں ایک متعین واقعے کے حوالے سے تنقید کر کے خطبہ جمعہ کی اہمیت کو مزید واضح کر دیا گیا کہ خطیب جب خطبہ دے رہا ہو تو اس حال میں اسے چھوڑ کر کسی تجارتی لین دین یا کسی دیگر مصروفیت کی جانب متوجہ ہو جانا نہایت نامناسب طرزِ عمل ہے' خواہ کسی اشد ضرورت کے تحت یہ معاملہ کیا گیا ہو۔ مختصراً یہ کہ سورۂ مبارکہ گویا گھوم رہی ہے اس مرکزی آیۂ مبارکہ کے گرد: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ﴾ اور یہی ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا بنیادی طریق کار اور انقلابِ محمدیؐ کا اساسی منہاج!

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم
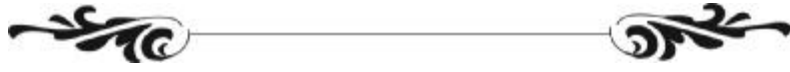
اعراض عن الجہاد کی پاداش
نفاق یا منافقت

سُورَۃُ المُنَافِقُون کی روشنی میں !

درس ۱۹

اِعراض عن الجہاد کی پاداش
''نفاق یا منافقت''

سورۃ المنافقون کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

نفاق کی حقیقت' اس کا سبب اور درجات

سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کے بعد مطالعہ قرآن حکیم کے ہمارے اس منتخب نصاب کے حصہ چہارم کا آخری درس سورۃ المنافقون پر مشتمل ہے۔ حسنِ اتفاق سے زیر نظر منتخب نصاب میں بھی یہ سورتیں اسی ترتیب سے شامل کی گئی ہیں جس ترتیب سے یہ مصحف میں وارد ہوئی ہیں' یعنی پہلے سورۃ الصّف' پھر سورۃ الجمعہ اور پھر سورۃ المنافقون۔ اس ترتیب میں بڑی معنویت پنہاں ہے' اس لیے کہ نفاق درحقیقت نتیجہ ہے جہاد فی سبیل اللہ سے کنی کترانے اور اس سے دامن بچانے کا۔ یہی وجہ ہے کہ نفاق کی حقیقت' اس کا اصل سبب' اس کا نقطۂ آغاز' اس کی علامات' اس کے مدارج و مراتب' اس کی ہلاکت خیزی اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے بچنے کی تدابیر' بلکہ کہیں اگر اس کی چھوت لگ گئی ہو تو اس کے علاج اور معالجے کی تدابیر' ان بہت سے موضوعات پر مشتمل یہ سورۃ مصحف میں بھی سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کے بعد وارد ہوئی ہے اور ہمارے اس منتخب نصاب میں بھی یہ تینوں سورتیں اسی ترتیب سے شامل ہیں۔

منافقین کی دو قسمیں

اس سے پہلے کہ سورۃ المنافقون کی آیات کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کیا جائے' مناسب ہو گا کہ پہلے اصولاً یہ سمجھ لیا جائے کہ نفاق اصل میں ہے کیا! گویا کہ اب چند باتیں حقیقت نفاق سے متعلق عرض کی جائیں گی۔

نفاق کے بارے میں یہ بات تو معلوم اور معروف ہے کہ منافق اسے کہتے ہیں جس کے دل میں ایمان نہ ہو لیکن وہ ایمان کا مدعی اور ایمان کا دعوے دار ہو' گویا وہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل کراتا ہو' حالانکہ اس کا دل نورِ ایمان سے خالی ہو۔ یہ بات یقیناً صحیح ہے' لیکن اس کے بارے میں یہ عام تصور جو لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ منافق صرف وہی ہوتا ہے کہ جو ابتداء ہی سے دھوکہ اور فریب کی نیت کے ساتھ اسلام میں داخل ہو' گویا کہ اسے کبھی ایمان کی کوئی رمق سرے سے نصیب ہی نہ ہوئی ہو' یہ بات پورے طور پر درست نہیں ہے۔ اس نوع کے منافق بھی یقیناً پائے جاتے تھے لیکن ایسا معاملہ بہت کم تھا۔ قرآن مجید میں یہود کی ایک سازش کا ذکر ہے کہ جب ان کی ساری مخالفتوں کے علی الرغم اور تمام تر ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باوجود مدینے میں اسلام کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں اور نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں تمکن عطا فرما دیا تو انہوں نے اسلام کی قوت کو کمزور کرنے کے لیے ایک تدبیر سوچی۔ انہوں نے دیکھا کہ اسلام کی یہ ساکھ عرب معاشرے میں قائم ہو چکی ہے کہ جو شخص ایک بار ایمان لے آتا ہے وہ واپس نہیں پھرتا' چاہے ایمان قبول کرنے کے نتیجے میں اسے کتنی ہی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اور کیسی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ اس ساکھ کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے یہ سازش تیار کی کہ صبح کے وقت ایمان لانے کا اعلان کر و اور شام کو انکار کر دو اور مرتد ہو جاؤ' اپنے سابق دین میں واپسی کا اعلان کر دو۔ اس طرح اُمید کی جا سکتی ہے کہ کچھ اور لوگ بھی لوٹ آئیں' اپنے آبائی دین کی طرف پلٹ آئیں۔ عام لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ آخر یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے' اندر جا کر انہوں نے ضرور کوئی ایسی غیر متوقع بات دیکھی ہوگی جس سے بدک کر یہ لوگ واپس لوٹ آئے' ممکن ہے جس اُمید میں یہ اسلام میں گئے تھے اس کے برعکس کوئی صورت وہاں نظر نہ آئی ہو کہ انہیں لوٹنا پڑا!...... ایمان کی ساکھ کو ختم کرنے کے لیے یہود نے یہ تدبیر اختیار کی۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ جو شخص بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہوا اس نے اگرچہ کلمۂ شہادت زبان سے ادا کیا ہوگا لیکن اس کا یہ داخلہ ابتداء ہی سے دھوکے کے تحت ہے' ایمان کی کوئی رَمق اسے کسی ایک لمحے کے لیے بھی حاصل نہیں ہوئی۔ ایسے کسی شخص نے ایک آدھا دن یا چند دن اگر اس قانونی اسلام کی کیفیت میں بسر کیے تو یقیناً ایک خالص منافق کی حیثیت سے بسر کئے ہیں۔

اس نوع کا معاملہ بعد میں بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں میں جاسوس کی حیثیت سے شامل ہونے کے لیے اسی قسم کے کسی انداز میں اسلام میں داخل ہو' اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرے تو

ایمان سے یکسر محروم ہونے کے باوجود بھی قانونی طور پر وہ مسلمان سمجھا جائے گا۔ اور ایسا شخص تو ظاہر بات ہے کہ شعائرِ دینی کا احترام بھی عام مسلمان سے زیادہ کرے گا' اپنے آپ کو مسلمان منوانے کے لیے وہ نمازیں بھی پڑھے گا' روزے بھی رکھے گا' لیکن اس شخص کے قلب کی کیفیت کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ ایک لحظہ کے لیے بھی اسے کبھی ایمان کی روشنی نصیب نہیں ہوئی۔ تو اگرچہ اس نوع کا نفاق بھی دورِ نبویؐ میں موجود تھا لیکن اکثر و بیشتر جس قسم کے نفاق کا ذکر ہمیں قرآن مجید میں ملتا ہے اس کی نوعیت اس سے مختلف تھی۔

نفاق کا اصل سبب

اس نفاق کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے جو دورِ نبویؐ میں بالعموم پایا جاتا تھا اور جس کا قرآن حکیم میں کثرت سے ذکر ملتا ہے' یہ بات پیش نظر رکھیے کہ انسان اپنی قوتِ ارادی کے اعتبار سے مختلف کیفیات اور مختلف درجوں کے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی نظریے یا مسلک کو ہرچہ بادا باد کی سی شان کے ساتھ قبول کرتے ہیں

ع ہرچہ بادا باد ما کشتی درآب انداختیم

کہ ہم نے کشتی دریا میں ڈال دی ہے اب جو ہو سو ہو۔ طارق بن زیادؒ نے جس کی انتہائی مثال قائم کی کہ ع طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت

ساحل اندلس پر پہنچ کر کشتیاں جلا ڈالیں کہ واپسی کا دھیان بھی کبھی نہ آئے۔ اس مزاج کے حامل لوگ ہر دَور میں دنیا میں موجود رہے ہیں' کبھی کم اور کبھی زیادہ' لیکن ایک دوسرے مزاج کے لوگ بھی دنیا میں رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے جنہیں ہم کمزور طبائع کے حامل لوگ یا ضعیف قوتِ ارادی کے مالک لوگ قرار دیتے ہیں کہ ایک خاص راستے پر چلنا چاہتے ہیں' لیکن اپنی کم ہمتی کے باعث چل نہیں پاتے۔ اس راہ میں درپیش مشکلات و موانع اور سختیوں اور آزمائشوں کے مقابلے میں قدم قدم پر ان کی ہمتیں جواب دیتی نظر آتی ہیں' ان کا جوشِ عمل سرد پڑتا ہے' وہ آگے بڑھنے کے بجائے کسی ایک مقام پر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں یا کبھی لوٹنے کے ارادے سے چند قدم پیچھے ہٹتے ہیں تو پھر اگر کوئی آسان صورت حال سامنے آئے تو دو چار قدم آگے بڑھا لیتے ہیں' حالات کی سختی اگر برقرار رہے تو بالآخر ان میں سے بعض کے قدم پیچھے ہی ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دونوں طبائع ہمیشہ پائی گئی ہیں اور آئندہ بھی پائی جائیں گی۔

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ مکی دَور میں جو لوگ ایمان لائے ان کی غالب اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حقانیت کو پوری طرح قلبی و ذہنی طور پر تسلیم کرنے کے بعد ایمان لائے تھے۔ کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرنے سے پہلے ہی وہ ہر مصیبت کو جھیلنے کے لیے آمادہ اور ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو چکے ہوتے تھے۔ اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کہ ادھر ہم نے یہ الفاظ زبان سے نکالے اُدھر مصیبتوں کے پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑیں گے' گھر میں اور گھر کے باہر ہر جگہ مشکلات' تکالیف اور تشدد (persecution) کا سامنا ہوگا' لہٰذا جو آتا خوب سوچ سمجھ کر اسلام کی طرف آتا۔ لیکن یہ صورت حال بعد میں برقرار نہ رہی۔ مدنی دَور کے ابتدائی دو ایک سال کے بعد حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ مدینہ منورہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو تمکن فی الارض یعنی غلبہ عطا فرما دیا' اوس اور خزرج ہی مدینہ کے دو بڑے قبیلے تھے' دونوں ایمان لے آئے' گویا آپؐ مدینہ منورہ کے بے تاج بادشاہ ہو گئے۔ اب یہ بات نہیں رہی کہ جو ایمان لائے اس کو شدائد اور مصائب سے سابقہ پیش آتا ہو' لہٰذا کچھ کمزور طبائع نے بھی ہمت کی اور حالات کو سازگار دیکھتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ واضح رہے کہ یہ لوگ بھی اسلام کی دعوت سے متأثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے' ان کے دل نے بھی یہ گواہی دی ہوگی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کی تعلیمات انسانی فطرت کی شہادتوں سے ہم آہنگ ہیں' اس لیے کہ اللہ پر ایمان لانا اور اس کی توحید کا اقرار کرنا فطرتِ انسانی میں شامل ہے۔ اسی طور پر فطرتِ انسانی اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے اور عقل اس حقیقت کو قبول کرتی ہے کہ اعمالِ انسانی کے بھرپور نتائج نکلنے چاہئیں' میزانِ عدل نصب ہونی چاہیے اور اس کے مطابق جزا و سزا ہونی چاہیے۔ حشر و نشر اور جنت و دوزخ ان سب حقیقتوں کو ذہن قبول کرتا ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کی سیرت و کردار اور ایک خورشید تاباں و درخشاں کی مانند آپؐ کی شخصیت بھی لوگوں کے سامنے تھی اور آپؐ کی حقانیت کی گواہی بھی لوگوں کے دل کی گہرائیوں سے پھوٹتی تھی' چنانچہ لوگ آئے' ایمان قبول کر لیا۔ لیکن جیسے جیسے ایمان کے عملی تقاضے سامنے آنے لگے' جان اور مال کھپانے کے مطالبے شدت پکڑنے لگے تو ضعیف الارادہ اور کم ہمت لوگوں کے لیے اسلام اور ایمان کے راستے پر چلنا مشکل ہوتا گیا۔ سورۃ الصّف کی آخری آیت ذہن میں لائیے! اللہ کے دین کے غلبے کے لیے نبی اکرم ﷺ کی نصرت کا مطالبہ کس زوردار انداز میں آیا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ

اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ﴾

اللہ کی راہ میں جان و مال کھپانے کے پرزور مطالبے پر مبنی سورۃ الصّف کی آیات ۱۰ اور ۱۱ کو بھی ذہن میں لائیے:

﴿هَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ ؕ﴾

اور پیچھے چلیے' سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں ہم پڑھ آئے ہیں جس میں جہاد فی سبیل اللہ کو ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا:

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾

یہ تقاضے نہایت کٹھن ہیں' جان اور مال دونوں انسان کو بہت عزیز ہیں' بلکہ بسا اوقات انسان کا مزاج یہ بن جاتا ہے کہ جان چلی جائے' مال نہ جائے۔ چنانچہ ایسے کمزور طبائع کے حامل لوگوں کو دُنیا اور اس کی آسائشیں چھوڑ کر جہاد و قتال کے راستے پر جانا بہت دشوار معلوم ہوتا' بقول جگر مراد آبادی:

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

دو بلیغ تمثیلیں

ایسے لوگوں کے لیے سورۃ الحج میں بڑی پیاری تشبیہ وارد ہوئی ہے۔ فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّعۡبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرۡفٍ﴾ کہ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کنارے رہ کر اللہ کی بندگی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک وہ ہے جو ہر چہ بادا باد کا نعرہ لگا کر منجدھار میں کودنے کے لیے آمادہ ہیں اور ایک وہ ہے جو کنارے کنارے چلنا چاہتا ہے' اپنی جان اور مال کو بچا کر رکھنا چاہتا ہے' اگرچہ ؎

آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

کے مصداق کنارے پر بھی انسان پر کوئی مصیبت آ سکتی ہے۔ لیکن بہرحال منجدھار کے مقابلے میں دریا کا کنارہ آرام و آسائش اور عافیت کا ایک گوشہ ہے۔ اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاِنۡ اَصَابَهٗ خَیۡرُ ۣ اطۡمَاَنَّ بِهٖ﴾ کہ اگر اسے خیر پہنچتا رہے' سہولتیں میسر رہیں تو مطمئن رہتا ہے ﴿وَاِنۡ

﴿اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةُ ۨانۡقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ﴾ اور اگر کوئی آزمائش آ پڑی‘ کوئی کٹھن مرحلہ درپیش ہوا یا جان اور مال کے لگانے کا کوئی تقاضا سامنے آیا تو پھر وہ اوندھے منہ گر کر رہ جاتا ہے۔ فرمایا: ﴿خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ﴾ یہ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے۔ ایسے شخص کی دنیا بھی برباد ہوئی اور آخرت بھی۔ ﴿ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ﴾ یہ ہے واضح اور صریح خسارہ۔

یہی مضمون سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں بھی آیا ہے۔ وہاں تین قسم کے انسانوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک وہ متقی اور خدا ترس لوگ جو قرآن حکیم سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کے اہل ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جن کی مسلسل ہٹ دھرمی اور ضد کے باعث ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اور قرآن کی ہدایت اب ان کے حق میں قطعاً مفید نہیں۔ تیسرا طبقہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ آیت ۸ میں ان کا تذکرہ ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۘ﴿۸﴾﴾ کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مدّعی ہیں اس بات کے کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور یومِ آخر پر درانحالیکہ وہ فی الواقع مؤمن نہیں ہیں۔ ذرا آگے چل کر اسی دوسرے رکوع میں ان کے لیے ایک تمثیل بیان کی گئی:

﴿اَوۡ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ ۚ يَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِىۡٓ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيۡطٌ ۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الۡبَرۡقُ يَخۡطَفُ اَبۡصَارَهُمۡ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِيۡهِ ۙ وَاِذَآ اَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُوۡا ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمۡعِهِمۡ وَاَبۡصَارِهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۰﴾﴾

یہ ایک مرکب تمثیل ہے۔ رات کا وقت ہے‘ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے‘ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک اور چمک نے ماحول کو ہیبت ناک بنا دیا ہے‘ کچھ کم ہمت اور بزدل لوگ اس طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔ کڑک سے ان کی جان نکلی جا رہی ہے۔ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے ہوئے وہ خوف و دہشت کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ جیسے ہی بجلی کی چمک سے ماحول تھوڑی دیر کے لیے منور ہوتا ہے تو وہ ہمت کر کے دو چار قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور جب ماحول پھر تاریک ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

نفاق کا آغاز

اس تمثیل میں ایک خاص انسانی کردار کا مکمل نقشہ موجود ہے۔ حالات سازگار اور موافق ہوئے تو ایمان اور اسلام کے راستے پر چلتے رہے‘ لیکن جب آزمائش کا وقت آیا‘ جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی

کڑک اور گھن گرج سنائی دی' جان و مال کے ایثار کا کٹھن مطالبہ سامنے آیا تو ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے' کمر ہمت ٹوٹ کر رہ گئی۔ یہ کیفیت درحقیقت مرضِ نفاق کا آغاز ہے۔ یہ اس مہلک مرض کا starting point ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس کیفیت کے ابتدائی مراحل کو قرآن نفاق قرار نہیں دیتا۔ نفاق سے پہلے ایک منزل ضعف ایمان کی ہے کہ ایمان ابھی اس درجے پختہ نہیں ہوا کہ انسان کا عمل پورے طور پر اس کے تابع ہو سکے۔ چنانچہ عمل میں بھی کمی اور کوتاہی کا صدور ہوتا رہتا ہے' لیکن ضعفِ ایمانی کی اس کیفیت کا یہ ایک لازمی امر ہے کہ انسان اپنی خطا کا اعتراف کرتا ہے' جھوٹے بہانے نہیں بناتا بلکہ اپنی غلطی اور کوتاہی کو صاف تسلیم کر لیتا ہے' اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے' نبی ﷺ سے بھی معذرت کرتا ہے اور استدعا کرتا ہے کہ میرے لیے اللہ سے استغفار کیجیے۔ جب تک یہ صورت برقرار رہے اسے نفاق نہیں کہا جائے گا بلکہ اسے ضعفِ ایمان سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں پر پردے ڈالنے لگے' جھوٹے بہانوں کو اپنی بے عملی کے لیے آڑ اور ڈھال کے طور پر استعمال کرنے لگے' تو یہاں سے یوں سمجھئے کہ نفاق کی سرحد شروع ہو گئی' مرضِ نفاق کے پہلے مرحلے کا آغاز ہو گیا۔

نفاق ایک روگ ہے

جس طرح یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ ٹی بی کی تین stages ہوتی ہیں' اس طرح یہ جان لیجیے کہ مرضِ نفاق کے بھی تین درجے یا تین مرحلے ہوتے ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ قرآن مجید نے نفاق کو بھی ایک روگ اور مرض قرار دیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں فرمایا: ﴿فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّـرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ ''ان کے دلوں میں ایک روگ ہے' پس اللہ نے اس روگ میں اضافہ فرما دیا''—— اور یہ اللہ تعالیٰ کی مستقل سنت اور طے شدہ ضابطہ ہے کہ اگر تم ہدایت کی طرف آؤ گے تو تمہاری ہدایت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اگر گمراہی کا راستہ اختیار کرو گے تو گمراہی اور ضلالت کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔ بے حیائی کی طرف اگر تم رُخ کرو گے تو بے حیائی کے کاموں میں بڑھتے چلے جاؤ گے۔ جن گھرانوں کے بارے میں آج سے پچاس سال پہلے یہ تصور نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی خواتین کی کوئی جھلک کبھی کوئی دیکھ پائے گا' جو حفیظ کے اس شعر کے مصداق کامل تھیں کہ ع

چشمِ فلک نے آج تک دیکھی نہ تھی ان کی جھلک

اب انہی گھرانوں کی بیٹیاں اور پوتیاں قریباً نیم عریاں لباس میں سڑکوں پر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ یہ سب کچھ تدریجاً ہوا ہے۔ ایک برائی اگلی دس برائیوں کی راہ ہموار کرتی ہے۔ تو اللہ کی سنت اور اس کا دستور یہی ہے کہ ہدایت کی طرف آؤ گے تو وہ اس کے راستے کھول دے گا ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡيُسۡرٰى ۝﴾ برائی کی طرف جاؤ گے' بے حیائی کا راستہ اختیار کرو گے تو اس میں آگے بڑھتے چلے جاؤ گے' اللہ تعالیٰ اس راستے کو تمہارے لیے آسان بنا دیں گے ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡعُسۡرٰى ۝﴾ اسی طرح اگر نفاق کا راستہ اختیار کرو گے تو اسی راہ میں بڑھتے چلے جاؤ گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا ذکر اس آیت مبارکہ میں ہے: ﴿فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾.

مرضِ نفاق کے تین درجے

تو آیئے کہ اب ہم دیکھیں کہ نفاق کے تین درجات کون کون سے ہیں۔ پہلا درجہ یا پہلی stage یہ ہے کہ انسان اپنی عملی کوتاہی اور غلط روی پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا شروع کر دے۔ حدیثِ نبویؐ میں بھی منافق کی نشانیوں میں جھوٹ کا بطور خاص ذکر ملتا ہے۔ فرمایا: ((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ)) ''منافق کی تین نشانیاں ہیں'' اور پہلی نشانی آپؐ نے یہ بیان فرمائی: ((اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ)) کہ جب بولے جھوٹ بولے۔ یہ اس کی نمایاں ترین علامت ہے۔ تو جھوٹ بول کر اور جھوٹے بہانوں کے ذریعے اپنی کوتاہی اور اپنی تقصیر پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا مرضِ نفاق کا اوّلین درجہ ہے۔

پھر اس کذب بیانی اور دروغ گوئی میں جب جھوٹی قسموں کا اضافہ ہوتا ہے تو اب گویا یہ اس مرض کے اگلے مرحلے کا آغاز ہے۔ سورۃ المنافقون میں آپ دیکھیں گے کہ اسی مضمون سے سورۃ کا آغاز ہو رہا ہے: ﴿اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ﴾ ''(اے نبیؐ!) جب یہ منافقین آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں''—— اس سلسلۂ مضمون میں آگے یہ الفاظ آئے: ﴿اِتَّخَذُوۡا اَيۡمَانَهُمۡ جُنَّةً﴾ کہ ان منافقین نے اپنی قسموں کو اپنے لیے ڈھال بنا لیا ہے۔

ایک اہم نفسیاتی حقیقت

تیسرا مرحلہ اس کے بعد ہے' لیکن اسے سمجھنے کے لیے ایک اہم نفسیاتی حقیقت کا جاننا بہت ضروری ہے۔ یہ ایک عام نفسیاتی حقیقت ہے کہ اگر آپ عمل کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہوں تو وہ

لوگ آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتے جو اپنی ہمت کی بدولت آپ سے آگے نکل گئے ہوں۔ آپ کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ بھی پیچھے رہ جائیں' اس لیے کہ ان کے آگے بڑھنے نے ہماری کمزوری کو مزید نمایاں کر دیا۔ اگر ہم سب کے سب کھڑے رہ جاتے اور کوئی بھی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ نہ کرتا تو سب کے سب ایک ہی درجے میں آ جاتے۔ نتیجتاً اس سے ان کم ہمت لوگوں کے دلوں میں ان مؤمنین وصادقین کے لیے جو غلبہ واقامتِ دین کے لیے جان اور مال کی بازیاں کھیل رہے ہوتے ہیں' نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے خلاف دشمنی کے جذبات سینوں میں پروان چڑھنے لگتے ہیں جو ایمان کے تقاضوں کے جواب میں آگے بڑھ کر اس شان سے لبیک کہنے والوں میں ہوں کہ اگر مال کا مطالبہ ہے تو جو میسر ہے حاضر ہے' جان کا تقاضا ہے تو سر بکف حاضر ہیں۔ سچے اہل ایمان اور ان کی سرفروشیوں کے خلاف اگر یہ احساسات اور جذبات پیدا ہونے لگیں تو جان لیجیے کہ یہ مرضِ نفاق کی وہ تیسری اور آخری منزل ہے جو ناقابل علاج ہے۔ اب اس مرض سے رستگاری کی کوئی صورت موجود نہیں! تو یہ ہے درحقیقت نفاق کا نقطۂ آغاز' اس کا اصل سبب اور اس مہلک مرض کے مختلف مراحل ومدارج۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نفاق کی ہر صورت سے محفوظ رکھے۔ آمین!

لفظ ''نفاق'' کی لغوی بحث

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ نفاق کے لفظی معنی کیا ہیں! جیسا کہ کئی مرتبہ عرض کیا جا چکا ہے' اکثر عربی الفاظ کا ایک سہ حرفی مادہ ہوتا ہے۔ لفظ نفاق کا مادہ ''ن ف ق'' ہے۔ عربی زبان میں اس کے دو بنیادی لغوی استعمالات ہیں اور دونوں کے اعتبار سے قرآن مجید کی دو بالکل مختلف اصطلاحات وجود میں آئی ہیں' اگرچہ ان دونوں میں ایک بڑا لطیف ربط ہے' جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا۔ ''نَفَقَ الْفَرَسُ'' اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولا جاتا ہے کہ گھوڑا مر گیا' جیسے ہم کہتے ہیں مرکھپ گیا ''نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ'' کا معنی ہے پیسے ختم ہو گئے۔ اسی مادہ سے بابِ اِفعال میں لفظ ''اِنفاق'' بنا ہے' یعنی خرچ کر دینا' کھپا دینا' لگا دینا۔ انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم ہوگا اللہ کی راہ میں لگا دینا' کھپا دینا' خرچ کر دینا' صَرف کر دینا۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں یہ لفظ سورۃ التغابن میں آ چکا ہے: ﴿وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ﴾ ''اور خرچ کرو' اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے''۔ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور لگا دینا ہی تمہارے حق میں خیر اور بھلائی ہے۔ اور اس ضمن میں تعلیم دی گئی کہ اپنا بہتر سے بہتر مال خرچ کرو: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ کہ تم نیکی کو حاصل نہ کرسکو گے'

مرتبۂ بر تک نہ پہنچ پاؤ گے جب تک کہ خرچ نہ کرو وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے۔ اور فرمایا گیا کہ جب تک کہ جی کے اس لالچ سے رستگاری حاصل نہ کرو گے فلاح نہ پاؤ گے۔ سورۃ التغابن میں انفاق کے حکم کے فوراً بعد فرمایا: ﴿وَمَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ ''اور جو کوئی جی کے اس لالچ سے بچا لیا گیا تو فلاح تک پہنچنے والے صرف وہی لوگ ہیں''۔ چنانچہ یہ اصطلاح ''انفاق'' ہے جو ''ن ف ق'' کے مادے سے اخذ کی گئی ہے۔

اب اسی مادے سے اخذ کردہ دوسری اصطلاح کی طرف آیئے! ''نَفَق'' بطور اسم ایک اور معنی میں آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں ''سرنگ''۔ چنانچہ سورۃ الانعام میں یہ لفظ بایں طور آیا ہے:

﴿وَاِنۡ کَانَ کَبُرَ عَلَیۡکَ اِعۡرَاضُھُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِیَ نَفَقًا فِی الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاۡتِیَھُمۡ بِاٰیَۃٍ﴾ (آیت ۳۵)

کہ اے نبیؐ! یہ کفار و مشرکین آپ سے جس قسم کے حسی معجزات کا مطالبہ کر رہے ہیں، اللہ کی حکمت ان کے ظہور کی متقاضی نہیں ہے، اللہ کا فیصلہ ہے کہ اس قسم کے معجزات ان کو نہیں دکھائے جائیں گے۔ لیکن بالفرض اگر آپ پر ان کا یہ اعتراض و انکار بہت شاق گزر رہا ہے تو اگر آپ کے لیے ممکن ہے تو کہیں زمین میں سے کوئی سرنگ لگا کر یا آسمان پر سیڑھی لگا کر ان کی مطلوبہ نشانیوں میں سے کوئی نشانی انہیں لا کر دکھا دیجیے! اسی ''ن ف ق'' سے ایک اور لفظ بنا ہے۔ عربی زبان میں ''نافقاء'' گوہ کے بل کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ذی حیات کو کچھ نہ کچھ شعور بخشا ہے۔ گوہ ایک حقیر سا جانور ہے، لیکن اس میں اپنے تحفظ کا مادہ اتنا قوی ہے کہ وہ اپنا بل سرنگ کی مانند بناتا ہے جس کے دو مُنہ ہوتے ہیں، تاکہ اگر کوئی شکاری کتا کسی ایک رخ سے داخل ہو تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے مُنہ سے نکل بھاگے اور اگر اُدھر سے کوئی خطرہ ہو تو اِدھر سے نکلنے کی کوئی سبیل رہ جائے۔ یہی لفظ منافقت کی لغوی اصل ہے جس پر کہ قرآن مجید کی یہ اصطلاح مبنی ہے۔

منافقت کیا ہے؟

سرسری مفہوم میں منافق وہ ہے جس کے دو رُخ ہیں۔ وہ ایمان سے بھی ایک تعلق رکھتا ہے اور کفر سے بھی۔ چنانچہ منافقین کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰی شَیٰطِیۡنِھِمۡ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَکُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَھۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ (البقرۃ)

''کہ جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی صاحبِ ایمان ہیں' ہم بھی ایمان لائے ہیں۔ اور جب اپنے شیطانوں یعنی اپنے سرغنوں سے ملتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں' مسلمانوں سے تو ہم استہزاء کر رہے ہیں' ان کا مذاق اڑا رہے ہیں' ہمارا ایمان کا دعویٰ محض تمسخر اور دل لگی کے سوا کچھ نہیں''۔

منافقین کی اس نفسیاتی کیفیت کو سورۃ النساء میں اس طرح بیان فرمایا گیا:

﴿مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ﴾ (آیت ۱۴۳)

''کہ یہ مذبذب ہو کر رہ گئے ہیں' معلق ہو کر رہ گئے ہیں' نہ اِدھر یکسو ہیں نہ اُدھر یکسو۔''

یہ دورُخا پن اور دو جانب تعلق رکھنے کا طرزِ عمل دراصل انسان اپنے تحفظ' اپنی جان اور مال کے بچاؤ اور اپنی دنیا کو کسی نہ کسی طور سے بچا لینے کے لیے اختیار کرتا ہے کہ کسی طرف بھی اپنے آپ کو مکمل طور پر identify نہ کرے۔ ایک وابستگی کا وہ انداز ہوتا ہے کہ اگر یہ کشتی تیرتی ہے تو ہم تیریں گے' ڈوبتی ہے تو ہم بھی ساتھ ہی ڈوبیں گے۔ اور ایک وہ رویہ ہے کہ ہمیں تو بہرصورت اپنا تحفظ کرنا ہے' لہٰذا کشتیاں جلانی نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا پلڑا بھاری ہو جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کو بالادستی حاصل ہو جائے' لہٰذا دونوں سے بنا کر رکھو۔

یہ تو ہوا اُس دورُخے پن کا وہ ایک ظاہری سا نقشہ کہ جس کی مناسبت ہے اس لفظ ''نفق'' اور ''نافقاء'' سے۔ لیکن ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں جو اصل جذبہ کارفرما ہے وہ جان و مال کے بچاؤ کا ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے' بقول علامہ اقبال کہ ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اِسے' ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

ایمان کا تقاضا ہے تو یہ ہے کہ اپنا سب کچھ لگا دو اور کھپا دو۔ اگر اللہ پر ایمان لائے ہو' اس کے رسول ﷺ پر ایمان کے دعوے دار ہو تو اللہ کے دین کے غلبے اور اس کے رسول ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنی قوتوں اور توانائیوں کو صرف کر دینا ایمان کا لازمی تقاضا ہے' اس لیے کہ ایمان تو بندے اور ربّ کے درمیان ایک قول وقرار کا نام ہے۔ سورۃ التوبۃ میں اس کو یوں تعبیر فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ﴾ (آیت ۱۱۱)

''بے شک اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں''۔

یہ بیع وشراء ہو چکا ہے۔ جان و مال اسی دنیا میں اللہ اوراس کے دین کے لیے لگا دو اور کھپا دو' اُس کے عوض آخرت میں اللہ تمہیں جنت عطا فرمائے گا۔ تو جان لو کہ اب یہ جان اور مال تمہارے پاس اللہ کی امانت ہیں' غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد میں جب جان و مال کے ایثار کی ضرورت پیش آئے انہیں اللہ کی راہ میں نچھاور کر دو۔ یہ ہے ایمان کا تقاضا۔ اسی لیے سورۃ الحجرات میں ایمانِ حقیقی کے بیان میں لفظ صدق کو نمایاں کیا گیا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ؀﴾

''حقیقی مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائیں اللہ اور اس کے رسولؐ پر اور پھر شک میں نہ پڑیں' اور وہ جہاد کریں اپنے اموال کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں' یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

اور یہی وجہ ہے کہ سورۃ الاحزاب میں اس صدق پر مبنی طرزِ عمل کی طرف توجہ بایں الفاظ دلائی گئی ہے: ﴿رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ ''وہ جواں مرد کہ جنہوں نے جو عہد اپنے ربّ سے کیا تھا اسے پورا کر دکھایا''۔ اس عہد میں کوتاہی' اس کے تقاضوں کو ادا کرنے سے پہلوتہی' اس سے کنی کترانا' اس میں پیچھے ہٹنا نفاق کا ایک سبب ہے۔ اس کے لیے ایک بڑی واضح اور مؤثر مثال سورۃ التوبۃ میں آئی ہے۔ فرمایا:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؀﴾

''اور ان میں سے کچھ لوگ وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے ایک عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے کچھ عطا فرمائے گا (یعنی رزق میں کشادگی فرمائے گا اور ہمیں تونگری عطا فرمائے گا) اور ہم صالحین میں سے ہو جائیں گے''۔

﴿فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ؀﴾

''لیکن جب اللہ نے اپنے فضل میں سے انہیں عطا کیا (انہیں غنی کر دیا) تو اب وہ اس کے ساتھ بخل کر رہے ہیں (مال کو سینت سینت کر رکھ رہے ہیں) اور اپنے اس عہد سے منہ موڑ رہے ہیں اور پیچھے ہٹ رہے ہیں''۔

اس سے اگلی آیت میں وہ الفاظ آ رہے ہیں جن کے لیے میں نے اس آیت کا حوالہ دیا' اور جو نفاق کے اصل سبب کو واضح کر رہے ہیں:

﴿فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَبِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴿۷۷﴾﴾

''تو اللہ تعالیٰ نے (ان کے اس طرزِ عمل کی پاداش میں سزا کے طور پر) ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اس دن تک کہ جب وہ اس سے ملاقات کریں گے' اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

نفاق کا اصل سبب

قرآن مجید میں سورۃ التوبۃ اور سورۃ الاحزاب میں منافقت اور منافقین کے بارے میں بڑے طویل مباحث آئے ہیں' لیکن اکثر و بیشتر قرآن کا پڑھنے والا ان پر سے یہ سمجھ کر گزر جاتا ہے کہ یہ تو صرف وہ لوگ تھے جو محض دھوکہ دینے کے لیے اہل ایمان میں داخل ہوئے تھے۔ حالانکہ بات صرف یہی نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی ایک نوع کا نفاق تھا' لیکن درحقیقت دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں جو نفاق پیدا ہوا اس کا اصل سبب اعراض عن الجہاد تھا' یعنی جان و مال کے کھپانے سے کنی کترانا۔ ایمان محبوب ہے لیکن کفر سے بھی مفادات وابستہ ہیں' آخرت بھی مطلوب ہے' لیکن دنیا بھی ہاتھ سے دینے کو تیار نہیں۔ تو یہ دو کشتیوں کی سواری درحقیقت نفاق کی بنیاد ہے۔ اگر بات وہ ہے کہ ؏ ''ہر چہ بادا باد درآب انداختیم'' تو یہ ہے صدقہ' یہ ہے سچا ایمان۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ الفاظ ہم نے پڑھے ہیں کہ: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾ اور ﴿رِجَالٌ صَدَقُوۡا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيۡهِ﴾ اس کے برعکس اپنے اس عہد میں جھوٹا ہونا' اس میں پیچھے قدم ہٹانا ہی دراصل کذب اور نفاق ہے۔

معنی کے پس منظر میں بھی دیکھا جائے تو نفاق کی اصل جڑ اور بنیاد درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ سے کنی کترانا ہے۔

منافق کی علامت

لفظ کذب کے حوالے سے نفاق کے ضمن میں یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ نے منافق کی جو علامتیں بیان فرمائی ہیں ان میں کذب کو سرفہرست رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

﴿آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ : اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ﴾

''منافق کی تین نشانیاں ایسی ہیں : (۱) جب بات کرے جھوٹ بولے۔ (۲) جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور (۳) جب اس کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھوائی جائے تو

خیانت کرے''۔

یہاں چونکہ معاملہ اس نوع کے نفاق کا نہیں ہے جو ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے کہ منافق تو اسے کہتے ہیں جس نے مسلمانوں اور اسلام کو زک پہنچانے کے لیے سازش کے طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھا ہو' لہٰذا اس حدیث کی تشریح میں بالعموم علماء کرام نفاق کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں کہ ایک ہے نفاقِ اعتقادی اور دوسرا نفاقِ عملی۔ ان کی توجیہہ کے مطابق اس حدیث میں نفاقِ عملی کا تذکرہ ہے' نفاقِ اعتقادی کا نہیں۔ بہرکیف اس بحث سے قطع نظر نبی اکرم ﷺ کا فرمان یہ ہے کہ یہ تین اوصاف وہ ہیں کہ جو اگر کسی کی طبیعت میں راسخ ہو جائیں تو وہ پکا منافق ہے۔ ہاں اگر کبھی کسی وقت جھوٹ کا ارتکاب ہو جائے یا کبھی کسی وقت وعدہ خلافی ہو جائے تو یہ چیز نفاق کے ذیل میں نہیں آئے گی۔

یہ مضمون ایک اور متفق علیہ حدیث میں اس سے بھی زیادہ مؤکدہ شکل میں آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((اَرْبَعٌ مَّنْ کُنَّ فِیْهِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا)) کہ چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس کسی میں وہ چاروں موجود ہوں تو وہ شخص منافق ہے' پکا اور کٹر منافق! ایک روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی آئے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ((وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ)) ''خواہ وہ شخص روزہ رکھتا ہو' خواہ نماز پڑھتا ہو اور خواہ اسے خود بھی یہ زعم ہو اور وہ یہ خیال کرتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن اگر یہ چاروں وصف اس میں موجود ہیں تو وہ پکا منافق ہے۔ اس حدیث میں ان تین باتوں کے علاوہ جن کا ذکر پچھلی حدیث میں تھا' چوتھی چیز آپؐ نے یہ گنوائی: ((وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) کہ جب کہیں کوئی جھگڑا ہو تو وہ آپے سے باہر ہو جائے' نہ زبان پر کنٹرول رہے نہ جذبات پر۔ یہ چوتھا وصف یا چوتھی علامت ہے منافق کی۔ حضور ﷺ نے اس حدیث میں مزید وضاحت فرمائی کہ جس میں یہ چاروں خصلتیں جمع ہیں وہ تو کٹر منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک وصف پایا جاتا ہے اس میں اسی مناسبت سے نفاق موجود ہے۔ یہ ہے نفاق کی حقیقت از روئے قرآن و حدیث!

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اب ایک اور بات جان لیجیے۔ ایک خیال یہ بھی عام لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ گیا ہے اور بعض روایات سے غلط طریقے پر یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ نفاق تو بس دورِ نبویؐ ہی میں تھا' اس کے بعد اب نفاق کہیں موجود نہیں ہے۔ حالانکہ یہ تو ایک ایسا نفسیاتی مرض ہے کہ کوئی انسانی معاشرہ کبھی اس سے خالی نہیں رہا۔ ہر انسانی جدوجہد میں تین طرح کے طبقات ہمیشہ موجود رہے۔ ایک وہ کہ جو کسی نئی

دعوت کو یا نظریے کو کھلم کھلا قبول کرتے ہیں' ہر چہ بادا باد کی شان کے ساتھ۔ دوسرے وہ جو کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں اور اس دعوت یا جدوجہد کا راستہ روکنے کے لیے میدان میں آ جاتے ہیں۔ ایک تیسرا طبقہ وہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جانب یکسو نہیں ہوتا' بلکہ ادھر والوں سے بھی بنا کر رکھنا چاہتا ہے اور اُدھر بھی اپنے روابط برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے ہر قیمت پر اپنا تحفظ مطلوب ہوتا ہے کہ اگر اونٹ اِس کروٹ بیٹھ جائے تب بھی ہمارے لیے بچاؤ کا کوئی راستہ رہ جائے اور اگر کہیں اُس کروٹ اونٹ بیٹھے تب بھی ہمارے لیے مکمل تباہی نہ ہو! —— اس کیفیت کو قرآن ''تربص'' سے تعبیر کرتا ہے اور یہی درحقیقت نفاق کی بنیاد ہے۔ سورۃ الحدید میں جہاں نفاق کی اصل حقیقت اور اس کے اسباب کا بیان ہے' وہاں یہ لفظ آیا ہے۔ اسی طرح سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ میں بھی' جس کا حوالہ اس سے قبل دیا جا چکا ہے' یہ لفظ ہمارے مطالعے میں آ چکا ہے' کہ اے نبی! ان مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اپنے باپ اور اپنے بھائی اور اپنے بیٹے اور اپنی بیویاں اور اپنے رشتہ دار اور اپنے وہ مال جو تم نے جمع کیے ہیں اور اپنے کاروبار جو تم نے بڑی محنت سے جمائے ہیں اور جن کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور اپنی جائیدادیں جو تمہیں بہت محبوب ہیں' اگر یہ تمام چیزیں محبوب تر ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے تو جاؤ حالت تربص میں رہو' انتظار کرو! —— یہاں اسلوب میں غیظ و غضب نمایاں ہے اور الفاظ یہ ہیں: ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ ''جاؤ' انتظار کرو' یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

نفاق کا اندیشہ کسے لاحق ہوتا ہے؟

نفاق کے بارے میں ایک اور بات جو لائق توجہ ہے اور نبی اکرم ﷺ کی ایک بڑی ہی حکمت افروز حدیث بھی اس ضمن میں ملتی ہے کہ مرضِ نفاق کے حملے کا اصل خوف مؤمن ہی کو لاحق ہوتا ہے' منافق اس سے اندیشہ محسوس نہیں کرتا' اس لیے کہ وہ تو اس بیماری کے چنگل میں جکڑا جا چکا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

((مَا خَافَهُ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا اَمِنَهُ اِلَّا مُنَافِقٌ))

''کہ اس مرضِ نفاق سے صرف مؤمن ہی اندیشہ محسوس کرتا ہے اور اس سے خود کو محفوظ و مامون صرف منافق ہی سمجھتا ہے''۔

ظاہر بات ہے کہ ڈرے گا وہی جس کی گٹھڑی میں مال ہوگا۔ چنانچہ جس کے پاس ایمان کی کچھ پونجی

موجود ہوگی وہی اس کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ محسوس کرے گا اور جس کی پونجی لٹ چکی ہو' اسے اب کاہے کا خوف! ع ''رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو''۔

احادیثِ مبارکہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ گناہ اور غلطی اگرچہ مؤمن سے بھی صادر ہو جاتی ہے لیکن مؤمن کے احساس کی شدت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر اس سے کوئی گناہ صادر ہو جائے تو وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ ایک پہاڑ تلے دب گیا ہو یا پہاڑ کا سا بوجھ اس کے سر پر آ گیا ہو۔ اس کے برعکس منافق سے جب کوئی اس طرح کا معاملہ صادر ہوتا ہے تو ایک ہلکا سا احساسِ تقصیر تو اسے بھی ہوتا ہے لیکن بس اتنا کہ جیسے کسی کی ناک پر ایک مکھی بیٹھی تھی اور اس نے اسے اڑا دیا۔ اس شدتِ احساس کی آخری درجے میں کیفیت کا مشاہدہ اگر کرنا ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معاملہ ذہن میں لائیے۔ ان کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ گواہی دیتے ہیں کہ جس راستے سے عمر کا گزر ہوتا ہے اس راستے سے شیطان کنی کترا جاتا ہے۔ حق و باطل میں فرق کر دینے والے اس عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) کے شدتِ احساس کا عالم یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے' جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ راز کچھ منافقین کے نام بتا دیے تھے اور جو صاحب سر النبی مشہور تھے' حضرت عمرؓ اللہ کی قسم دے کر پوچھتے ہیں کہ اے حذیفہ! میں اللہ کی قسم دے کر تم سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کہیں میرا نام تو ان منافقین میں شامل نہیں تھا! یہ ہے شدتِ احساس!

اسی کا نقشہ ایک انصاری صحابی حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے واقعے میں سامنے آتا ہے۔ وہ ایک بار ایک عجیب کیفیت میں گھر سے نکلے۔ زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے: نَافَقَ حنظلة' نافَقَ حنظلة' نافَقَ حنظلة کہ حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے راستے میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سوال کیا کہ معاملہ کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ میں تو منافق ہو گیا ہوں' اور وہ اس لیے کہ جب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں ہوتا ہوں' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوتا ہوں تو ایمان و یقین کے اعتبار سے میرے دل کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے اور جب اپنے گھر بار میں جا کر دنیاوی مشاغل میں مصروف ہو جاتا ہوں تو وہ کیفیت برقرار نہیں رہتی' یہی تو نفاق ہے! —— حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اگر چاہتے تو خود کو سمجھا سکتے تھے اور ان کی الجھن کو رفع کر سکتے تھے' لیکن آپؓ نے فرمایا کہ حنظلہ یہ کیفیت تو میری بھی ہے۔ تو آؤ چلو' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کریں کہ یہ معاملہ کیا ہے! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' معاملہ پیش کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے حنظلہ! اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے' جو کیفیت میری صحبت میں اور میری مجلس میں تمہیں

حاصل ہوتی ہے اگر وہ مستقل اور دائم ہو جائے اور تم ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہو تو فرشتے تم سے تمہارے راستوں میں اور تمہارے بستروں میں مصافحہ کرنے لگیں! ((وَلٰـــكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً)) لیکن اے حنظلہ! یہ تو وہ دولت ہے جو کبھی کبھار میسر آتی ہے۔ (۱) یعنی کیفیات کا یہ فرق بالکل فطری ہے' یہ نفاق نہیں ہے۔

بہرحال نفاق سے جس درجے آج مسلمان اپنے آپ کو محفوظ و مأمون سمجھتے ہیں' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ ہمارا حال یہ ہے کہ قرآن کو پڑھتے ہوئے جب منافقین کا ذکر آتا ہے' جب ہم ان آیات کو پڑھتے ہیں جن میں منافقین پر سخت انداز میں گرفت کی گئی ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان آیات اور ان مضامین کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے' ان آیات میں ہم سے کوئی بحث نہیں' یہ کوئی اور ہی مخلوق ہے جس کے بارے میں یہ ساری باتیں ہو رہی ہیں۔ گویا کہ قرآن مجید کے ان مقامات اور ان آیات سے ہم بالکل محروم ہو جاتے ہیں۔

نفاق کی ہلاکت خیزی

اب ذرا ایک نظر اس مرضِ نفاق کی ہولناکی اور اس کی ہلاکت خیزی پر بھی ڈال لیجیے! اس کا ایک نقشہ تو ان شاء اللہ سورۃ المنافقون میں ہمارے سامنے آئے گا' تاہم اس ضمن میں سورۃ النساء کی یہ آیت بھی بہت قابل توجہ بلکہ لرزہ خیز ہے: ﴿وَاِنَّ الْـمُـنٰـفِقِيْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ ''یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے''۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو کفر کے مقابلے میں نفاق زیادہ مبغوض و ناپسند ہے۔ کافر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کھلم کھلا سامنے آ کر مقابلہ کرتا ہے' جو کچھ اس کے باطن میں ہوتا ہے اسی کا باہر اعلان کرتا ہے۔ کافروں میں وہ بھی ہیں جو اپنے باطل دین یا اپنے مشرکانہ اوہام وعقائد کے لیے گردنیں کٹوا کر اپنے کردار کی پختگی کا ثبوت دے جاتے ہیں۔ ابوجہل اسی نوع کا ایک کردار تھا جس نے اپنے معبودانِ باطل اور دین باطل کے لیے اپنی گردن کٹوا دی۔ اس کے مقابلے میں منافقانہ کردار بڑا گھناؤنا کردار ہے اور اللہ کی نگاہ میں انتہائی مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سخت ترین سزا اللہ تعالیٰ نے منافقین ہی کے لیے تیار کی ہے۔

اس کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ منافقین کو رسول اللہ ﷺ کی شفاعت اور استغفار سے محروم کر دیا گیا۔ سورۃ المنافقون میں یہ بات بڑے دوٹوک انداز میں آئی ہے کہ منافقین کے حق میں نبی اکرم ﷺ کا استغفار بھی اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہے۔ یہی مضمون سورۃ التوبۃ میں اپنی انتہائی صورت میں آیا

ہے۔فرمایا:﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْلَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ ''(کہ اے نبی!اللہ تعالیٰ ان منافقین سے اس درجے ناراض ہے کہ) اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو معاف نہیں کرے گا''۔لہٰذا اس راہ میں آنا ہے تو دل ودماغ کے یکسو فیصلے اور ہرچہ بادا باد کی شان کے ساتھ آنا ہوگا۔ع ''جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟''تحفظات کے ساتھ مت آؤ' جان و مال کو کسی طور سے سلامت رکھنے کا فیصلہ کر کے نہ آؤ' بلکہ طے کر کے آؤ کہ جو تقاضا ہوگا حاضر ہوں گے' جو مطالبہ کیا جائے گا پورا کریں گے۔تبھی نفاق سے محفوظ رہ سکو گے۔

نفاق سے بچاؤ کا ذریعہ ـــــــ ذکر الٰہی

اب ذرا ہمیں اس پہلو سے بھی غور کرنا ہے کہ مرضِ نفاق سے بچاؤ کا ذریعہ اور طریقہ کون سا ہے! ظاہر بات ہے کہ نفاق ضد ہے ایمان کی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ایمان کی ضدیں (antonyms) دو ہیں' ایک قانونی یا ظاہری اعتبار سے اور دوسری باطنی اعتبار سے۔قانونی اعتبار سے مؤمن کے مقابلے میں کافر کا لفظ آتا ہے۔ بلکہ یہاں مؤمن کی بجائے مسلم کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ چنانچہ قانونی اعتبار سے تو دو ہی درجے ممکن ہیں: کافر یا مسلم۔تاہم باطنی اعتبار سے اور دلی کیفیات کے لحاظ سے ایمان کی ضد ہے نفاق!ـــــ اس پہلو سے مؤمن کے مقابلے میں منافق کا لفظ آتا ہے' گویا حقیقت کے اعتبار سے ایمان کی ضد نفاق ہے اور قانونی اعتبار سے کفر! لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے آپ کو نفاق سے بچانا چاہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ کبھی اس مرض کی چھوت اسے لگے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اپنے ایمان کی حفاظت کرے اور اسے مستحکم رکھنے کی فکر کرے۔اور ایمان کی آبیاری' اس کی تقویت اور اس کو سرسبز و شاداب رکھنے کا حقیقی اور مؤثر ذریعہ ذکر الٰہی کے سوا اور کوئی نہیں! تلاوتِ قرآن حکیم اور نماز ذکر کی اعلیٰ ترین صورتیں ہیں' یا پھر دوامِ ذکر کی وہ صورت جس کا تذکرہ پچھلے سبق یعنی سورۃ الجمعہ میں تھا:﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتے رہا کرو' اس کی یاد کو اپنے دل میں ہر دم تازہ رکھو' اس سے لو لگائے رکھو' آخرت کو مستحضر رکھو اور جان لو کہ تمہاری اصل منزل یہ دنیا نہیں' آخرت ہے۔﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾۔ہار اور جیت کے فیصلے کا دن وہ ہے ـــــ اور اگر کہیں مرضِ نفاق کی کوئی چھوت تمہیں لگ گئی ہو' انفیکشن ہوگئی ہو' اس مرض نے دل میں کچھ جڑیں جمالی ہوں تو اب اس کا علاج کرنا ہوگا اور وہ علاج ہے انفاق!

نفاق کا علاج: انفاق

دلچسپ بات یہ ہے کہ ''نفاق'' اور ''انفاق'' دونوں کا سہ حرفی مادہ ایک ہی ہے یعنی ''ن ف ق''۔ اس سے ''نفق'' اور ''نافقاء'' کے الفاظ آتے ہیں جس سے منافقت کا لفظ نکلا ہے اور اسی مادے سے ''نَـفَقَ یَنْفَقُ '' کے الفاظ مشتق ہیں جن سے باب افعال میں ''انفاق'' بنتا ہے' یعنی خرچ کر دینا اور کھپا دینا۔ یہی انفاق دراصل منافقت کا تیر بہدف علاج ہے۔ اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرو' لگاؤ اور کھپاؤ! دل کی دنیا کو اس مال کی محبت اور اس کی نجاست سے پاک وصاف کرو!—— دنیا کا تمام مال واسباب محض برتنے اور استعمال کرنے کی چیز ہے(مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا) لیکن دیکھنا اس کی محبت دل میں راسخ نہ ہونے پائے' یہ مال و دولتِ دنیا کسی درجے میں بھی تمہارا مطلوب ومقصود نہ بن جائے! اس کا ذریعہ یہی ہے کہ جو مال و دولت اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے اسے زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ مال کی محبت کو دل سے کھرچنے اور نفس کے تزکیئے کے لیے یہ عمل بہت ضروری ہے۔ سورۃ المؤمنون کے درس میں یہ بات آئی تھی' وہاں اہل ایمان کا ایک اہم وصف یہ بیان ہوا تھا: ﴿وَالَّـذِیْـنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ﴾—— وہ لوگ کہ جو زکوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں' یعنی نفس کے تزکیئے کے لیے اپنا مال پیہم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں——یہ مضمون سورۃ المنافقون کے آخری حصے میں تفصیل سے آئے گا۔ اس سے قبل سورۃ التغابن کے آخر میں بھی ہم نے دیکھا کہ اس جانب اشارہ موجود تھا: ﴿وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِاَنْفُسِکُمْ ط وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓـئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ کہ خرچ کرو' اس میں تمہارا بھلا ہے اور جو کوئی جی کے لالچ سے بچا لیا گیا وہی لوگ فلاح پائیں گے—— تاہم یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا نظر آئے گا سورۃ الحدید میں جو ہمارے اس منتخب نصاب کا آخری مقام ہے۔ ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا مضمون ان شاء اللہ العزیز جب ہم سورۃ المنافقون کا مطالعہ کریں گے تو ہر ہر آیت ایک بالکل صاف اور شفاف موتی کی طرح سامنے آئے گی' ہر ہر حرف خود بولتا محسوس ہوگا اور آیات کے مابین ربط وتعلق از خود نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔

یہ بات اس سے پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کی سورتیں بالعموم جوڑوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔ ایک ہی مضمون کا ایک رخ ایک سورۃ میں اور اس کا دوسرا رخ اس جوڑے کی دوسری سورت میں زیر بحث آتا ہے۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ سورۃ المنافقون حقیقت نفاق سے بحث کرتی ہے۔ نفاق ضد ہے ایمان کی۔ گویا ایک ہی تصویر کے مثبت رخ کا بیان سورۃ التغابن میں ہے اور اس کے منفی

رخ کا ذکر سورۃ المنافقون میں ہے اور اس طرح ایک مضمون اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۳﴾ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۵﴾ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۶﴾ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۷﴾ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹﴾ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِىْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾

یہ سورۃ المنافقون ہے جو اٹھائیسویں پارے میں سورۃ الجمعہ کے بعد اور سورۃ التغابن سے قبل وارد ہوئی ہے۔ دو رکوعوں پر مشتمل اس سورۃ کی کل گیارہ آیات ہیں۔ اس کا ایک رواں اور بامحاورہ ترجمہ یوں ہوگا:

''اے نبیؐ! جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہ ہیں اس پر کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ کو خوب معلوم ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ

یہ منافق جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے‘ پس وہ اللہ کے راستے سے رُک گئے ہیں‘ یقیناً بہت برا ہے وہ طرزِ عمل جو انہوں نے اختیار کیا۔ یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے‘ پھر انہوں نے کفر کیا‘ تو ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی‘ تو اب وہ تفقہ سے عاری ہو چکے ہیں۔ اور جب آپ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کی جسامت اور ان کی تنومندی سے آپ متأثر ہوتے ہیں‘ اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو آپ ان کی بات توجہ سے سنتے ہیں۔ ان کی مثال ان سوکھی لکڑیوں کی سی ہے جنہیں سہارے سے کھڑا کر دیا گیا ہو۔ ہر دھمکی کو وہ اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں۔ یہی دشمن ہیں‘ پس ان سے بچیے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرے‘ کہاں سے بچلائے جا رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کے رسول تمہارے لیے استغفار کریں تو وہ اپنے سروں کو مٹکاتے ہیں اور آپ دیکھتے ہیں ان کو کہ وہ رُک کے رہ جاتے ہیں گھمنڈ اور غرور کی وجہ سے۔ ان کے حق میں بالکل برابر ہے خواہ آپ ان کے لیے استغفار کریں خواہ نہ کریں‘ اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو معاف فرمانے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ وہی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو ان پر کہ جو اللہ کے رسول ﷺ کے آس پاس ہیں یہاں تک کہ یہ بھیڑ منتشر ہو جائے‘ حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کی ملکیت ہیں لیکن منافقین کو اس کا فہم حاصل نہیں۔ کہتے ہیں اگر ہم لوٹ گئے مدینے کی طرف تو ہم میں سے باعزت لوگ کمزوروں کو لازماً نکال باہر کریں گے‘ حالانکہ عزت تو اللہ کے لیے‘ اس کے رسول ﷺ کے لیے اور اہل ایمان کے لیے ہے‘ لیکن منافق اس کا علم نہیں رکھتے۔

اے ایمان والو! نہ غافل کر پائیں تمہیں تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے۔ اور جو کوئی اس کا ارتکاب کرے گا تو وہی ہیں کہ جو خسارے میں رہنے والے ہیں۔ اور خرچ کرو اور کھپا دو اس میں سے کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت آن کھڑی ہو اور پھر وہ کہے اے میرے ربّ کیوں نہ تُو مؤخر کر دے میرے اس وقتِ معین کو تھوڑے سے وقت کے لیے تو میں صدقہ کروں اور میں نیکوکاروں میں سے ہو جاؤں۔ اور ہرگز ہرگز مؤخر نہ کرے گا اللہ کسی ذی نفس کے لیے بھی جب کہ اس کا وقتِ معین یعنی اس کی اجل آن پہنچے‘ اور اللہ تعالیٰ باخبر ہے اس سے کہ جو تم کر رہے ہو‘‘۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے‘ یہ مختصر سورۃ نفاق کے موضوع پر انتہائی جامع ہے۔ اب ہم اللہ کے نام سے اس کی آیاتِ مبارکہ کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ جو باتیں نفاق کے بارے میں تمہیداً عرض کی جا چکی ہیں‘ ان شاء اللہ العزیز ان کے بعد اس سورۂ مبارکہ کے مطالب و

مفاہیم بڑی آسانی سے واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اگرچہ نفاق کا ذکر بعض مکی سورتوں میں بھی موجود ہے' چنانچہ ہمارے اس ''منتخب نصاب'' کے اگلے درس یعنی سورۃ العنکبوت میں یہ بات سامنے آئے گی' لیکن نفاق نے ایک باقاعدہ ادارے کی شکل مدنی دور میں اختیار کی اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک بیماری تھی جس نے بڑھ کر تدریجاً ''نفاق'' کی معین شکل اختیار کی۔ چنانچہ اس ضمن میں ہمیں یہ حکمت نظر آتی ہے کہ مدنی سورتوں میں سے اوّلین سورتوں میں اس روگ کی نشان دہی تو کر دی گئی ہے اور بیماری کا ذکر تو موجود ہے مگر لفظ ''نفاق'' استعمال نہیں کیا گیا۔ یعنی کسی کو تعین کے ساتھ منافق قرار نہیں دیا گیا۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا﴾ ''ان کے دلوں میں ایک بیماری تھی تو اللہ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا'' لیکن پوری سورۃ البقرۃ میں کہیں لفظ ''نفاق'' یا ''منافقت'' یا ''منافق'' موجود نہیں۔ تاہم جیسے جیسے معاملہ آگے بڑھا' یہ مرض پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ آغاز میں حکمت تربیت کا تقاضا بھی یہ تھا کہ ان کو بالکل ننگا نہ کیا جائے' علامات بیان کر دی جائیں' تاکہ جن کے دلوں میں ابھی یہ روگ ابتدائی درجے میں ہو' اگر وہ متنبہ ہو جائیں اور اصلاح پر آمادہ ہوں تو اس میں انہیں کوئی حجاب محسوس نہ ہو۔ لیکن بہرحال ایک وقت آیا کہ پھر منافق کی اصطلاح کھل کر استعمال ہوئی۔

سورۃ المنافقون کا زمانۂ نزول

اس سورۃ کے زمانۂ نزول کے بارے میں قریباً اتفاق ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق کے دوران یا اس کے فوراً بعد اس کا نزول ہوا۔ اگرچہ اس غزوے کا قطعی زمانہ معین کرنا خاصا مشکل ہے اور اس بارے میں کچھ اختلاف رائے بھی پایا جاتا ہے' تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ غزوہ مدنی دور کے قریباً وسط میں پیش آیا اور اس موقع پر بعض معین واقعات ایسے سامنے آئے کہ جن کے پس منظر میں جب یہ آیات نازل ہوئیں تو انہوں نے ''نفاق'' کے موضوع پر ایک نہایت جامع مضمون کی حیثیت اختیار کر لی۔

منافقین کے دعوائے ایمان کی حقیقت

فرمایا: ﴿اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡہَدُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ ۘ﴾ کہ جب وہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ـــــ یہ ٹکڑا بہت قابل توجہ

ہے۔ یہاں نفاق کے بارے میں ایک بات یہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ وہ نفاق جس کا ظہور دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مدینہ میں ہوا' اس کا آغاز درحقیقت یہود کی جانب سے ہوا اور مسلمانوں میں سے بھی اَوس اور خزرج کے قبیلوں کے وہ لوگ سب سے پہلے اس مرض کی لپیٹ میں آئے جن کے یہودیوں کے ساتھ حلیفانہ تعلقات اور سماجی روابط تھے۔ یہیں سے نفاق کا پودا پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ یہود کے بارے میں ایک بات یہ جان لینی چاہیے کہ انہوں نے جب نبی اکرم ﷺ کی اُبھرتی ہوئی طاقت کو دیکھا تو اگرچہ ان کے علماء خوب پہچان گئے تھے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں ﴿یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَھُمۡ﴾ لیکن نسلی تعصب کے باعث ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ نبی آخر الزماں کی پیشین گوئیاں ان کے ہاں موجود تھیں اور وہ منتظر تھے کہ اس نبی کے ظہور کا وقت اب قریب ہے۔ چنانچہ جب کبھی اَوس اور خزرج کے لوگوں سے ان کا جھگڑا ہوتا اور ان کی عددی اکثریت کی وجہ سے یہودیوں کو دبنا پڑتا تو وہ یہ دھمکی دیا کرتے تھے کہ اس وقت تو تم ہمیں جس طرح چاہو دبا لو لیکن یاد رکھو کہ نبی موعود کی بعثت کا وقت قریب ہے' جب ہم اس کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں گے تو تم ہم پر غالب نہ آ سکو گے۔ گویا نبی اکرم ﷺ کو انہوں نے پہچان تو لیا تھا لیکن انہیں یہ گمان تھا کہ آخری نبی انہی میں سے یعنی بنی اسرائیل سے ہوگا۔ چنانچہ یہ نسلی اور قومی تعصب ان کے پاؤں کی بیڑی بن گیا کہ ہم سے یہ فضیلت کیوں چھین لی گئی اور بنی اسماعیل میں آخری اور کامل نبوت کا ظہور کیسے ہو گیا!! یہی ان کے قبولِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا۔

بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کو تمکن اور غلبہ عطا فرمایا اس کے آگے وہ بے بس سے ہو کر رہ گئے۔ ان کے بعض لوگوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہمیں بھی مسلمان تسلیم کیا جائے' اس لیے کہ جن باتوں کی دعوت محمد (ﷺ) دے رہے ہیں ان میں سے دو باتیں وہ ہیں جن کو ہم پہلے ہی سے مانتے ہیں۔ آپؐ توحید کی دعوت دے رہے ہیں' ہم توحید کے پہلے سے علمبردار ہیں' آپؐ آخرت کی دعوت دے رہے ہیں' ہم بھی آخرت کے ماننے والے ہیں۔ پھر یہ کہ تیسری بنیادی شے نبوت و رسالت ہے' اس میں بھی ہمارے مابین کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ نبوت و رسالت کے ہم بھی اسی طرح قائل ہیں جیسے محمد (ﷺ)۔ خود محمد (ﷺ) یہ فرما رہے ہیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے رسول تھے' عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے رسول تھے اور یہی نہیں بلکہ بنی اسرائیل کے تمام انبیاء جو اُن کے مابین آئے ان سب کی صداقت کے وہ (ﷺ) معترف ہیں تو اب باقی سارے معاملات میں ہمارے اور ان کے

مابین کامل اشتراک موجود ہے‘ سوائے اس کے کہ ہم ان کی رسالت کے قائل نہیں۔

سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع کے ابتدائی الفاظ بڑے قابل توجہ ہیں۔ وہاں جونقشہ کھینچا گیا وہ یہوداور منافقین دونوں پر راست آتا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ﴾ ”کہ لوگوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پراور یوم آخر پر‘ حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے“۔ اس میں درحقیقت یہود کے اس موقف کی ترجمانی بھی ہوگئی کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ماننے والے اور یومِ آخر پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اب جھگڑا صرف رہ جاتا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کا۔ تو چلیے اگر اتنی سی بات رہ بھی جائے تو اس میں حرج کیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہماری یہ حیثیت تسلیم کریں کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ یہی معاملہ تھا کہ یہود کے زیر اثر جب اوس اور خزرج کے کچھ لوگوں تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے بھی کچھ اسی طرز کا موقف اختیار کیا کہ اگر ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت اور متابعت اختیار نہ بھی کریں تو تب بھی ہمارے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا! لیکن پھر جب کوئی ایسا موقع آتا تھا کہ ان کی کوتاہی پر سرزنش کی جاتی تھی اور انہیں کوئی وضاحت یا کوئی معذرت پیش کرنی پڑتی تو ان کی طرف سے اپنے ایمان کے ادعاء اور اظہار کے لیے جو سب سے زیادہ پرزور بات کہی جاتی تھی وہ یہی تھی کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں ایمانیات میں سے صرف ایمان بالرسالت کا ذکر ہے: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ کہ منافق لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے بعد بڑے ہی لطیف پیرائے میں تعریض کے انداز میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ﴾ کہ اللہ سے بڑھ کر کس کو معلوم ہوگا کہ آپؐ اس کے رسول ہیں! —— اللہ کو خوب معلوم ہے آپؐ اس کے رسول ہیں‘ لیکن فی الحقیقت یہ منافق کذب بیانی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ گویا کہ جو بات ان کی زبان سے نکل رہی ہے وہ اگرچہ لفظاً غلط نہیں ہے‘ لیکن ان کا قول ان کی دلی کیفیات کی ترجمانی نہیں بلکہ تکذیب کر رہا ہے۔ یہ لوگ دل سے آپ کو اللہ کا رسول تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾ ”اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں“۔

نفاق کے درجات اور ان کی علامات

یہاں لفظ ''کذب'' خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ کذب ہی درحقیقت نفاق کا نقطۂ آغاز ہے۔ چنانچہ سورۃ المنافقون کی پہلی ہی آیت میں اس کی نشاندہی ہوگئی۔ ابتداء میں تو یہ کذب سادہ سے جھوٹ کی صورت میں ہوتا ہے' لیکن آگے بڑھ کر جب یہ مرض دوسرے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو پھر یہ جھوٹی قسموں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں دیکھئے قسموں کا ذکر آ گیا۔ فرمایا: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً......﴾ ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے''۔ یمین داہنے ہاتھ کو بھی کہتے ہیں۔ اور چونکہ قسم کھاتے ہوئے اور قول وقرار کے موقع پر داہنا ہاتھ اٹھانے کی ایک روایت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے' لہٰذا قسم کو بھی یمین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ ان منافقوں نے اپنی قسموں کو اپنے لیے ڈھال بنالیا ہے۔ اگر آپ ان سے پُرسش کریں' کوئی پوچھ گچھ کریں یا ان کو کہیں بھی کسی معاملے میں اپنے موقف کی وضاحت کرنی پڑے تو فوراً قسموں کو اپنی ڈھال کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں کہ خدا کی قسم ہے' اللہ گواہ ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ درست ہے! — اپنی قسموں کو ڈھال بنانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ﴿فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط﴾ صَدَّ يَصُدُّ عربی زبان میں لازم اور متعدی دونوں معنی دیتا ہے۔ یہاں مفہوم یہ ہوگا کہ پس یہ خود بھی رک گئے ہیں اللہ کے راستے سے اور دوسروں کو بھی روکنے کا سبب بن گئے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ہر فرد اپنی اپنی حیثیت کے اعتبار سے دوسروں کے لیے نمونہ بنتا ہے۔ وہ یا تو خیر کی تشویق وترغیب کا سبب بنے گا' یا دوسروں کے لیے شر کا راستہ کھولے گا اور نمونۂ شر بنے گا۔ ﴿اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ ''واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی بُرا طرزِ عمل ہے جو انہوں نے اختیار کیا ہے''۔ یعنی انجامِ کار کے اعتبار سے یہ بہت ہی بری روش ہے۔ دنیا میں تو شاید وقتی طور پر انہیں یہ محسوس ہوتا ہو کہ ہم نے اپنے اس طرزِ عمل کی بدولت جان و مال کا تحفظ کر لیا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ انجامِ کار کے اعتبار سے بہت ہی غلط طرزِ عمل ہے جو انہوں نے اختیار کیا۔

نفاق کا اصل سبب

یہاں اس آیۂ مبارکہ میں ''عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کے الفاظ نوٹ کر لیے جائیں۔ یہ گویا کہ نشاندہی کر رہے ہیں کہ نفاق کا اصل سبب اعراض عن الجہاد یعنی اعراض عن الجہاد فی سبیل اللہ ہے۔ منافقین کا معاملہ یہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی درجے میں نمازیں پڑھنے کو تیار تھے' لیکن جان و مال کے ساتھ جہاد سے ان

کی جان جاتی تھی۔ عبداللہ بن اُبی کا قول روایات میں آتا ہے کہ ہم نے نمازیں بھی پڑھی ہیں اور زکوٰتیں بھی دی ہیں' لیکن اللہ کی راہ میں جان و مال کھپانے کا جو ایک تقاضا اور مطالبہ ہر دم ہمارے سروں پر مسلط رہتا ہے کہ نکلو اللہ کی راہ میں' اللہ کے دین پر پھر ایک کٹھن مرحلہ آ گیا ہے' اپنی جانیں اور اپنے مال پیش کرو' یہ ہم پر بہت شاق ہے۔ یہ وہ چیز تھی جو اُن کو قدم قدم پر روکتی تھی۔ یہی وہ سبب اور بنیاد ہے کہ جس پر درحقیقت نفاق کا یہ پورا قصر تعمیر ہوتا ہے۔

نفاق کی اصل حقیقت

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا......﴾ اب یہاں نفاق کی اصل حقیقت کا ذکر آ رہا ہے' جس کے بارے میں اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ نفاق کی ایک قسم وہ بھی تھی اور یقیناً تھی کہ انسان اسلام کا لبادہ ہی دھوکے کے تحت' فریب دینے کے لیے اوڑھتا تھا اور ایمان کی کبھی کوئی رمق اسے نصیب ہوتی ہی نہ تھی ـــــ لیکن حقیقت کے اعتبار سے نفاق کی جو اصل نوعیت تھی وہ یہاں بایں الفاظ واضح ہو رہی ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ وہ ایمان لائے' پھر انہوں نے کفر کی روش اختیار کی''۔ نوٹ کیجیے کہ یہ کفر قانونی کفر نہیں ہے۔ اگر تو کوئی شخص ایمان لانے کے بعد اعلانیہ کافر ہو جائے تو وہ مرتد قرار پائے گا' لیکن منافق مرتد نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ اہل ایمان کی صفوں میں' قانونی اسلام کے دائرے میں رہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں یہ لفظ کفر کفرِ حقیقی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جس طرح ایک ایمان قانونی ایمان ہے اور ایک ایمان حقیقی ایمان ہے' اسی طرح ایک کفر قانونی کفر ہے یعنی علانیہ کفر اور ایک ہے کفر حقیقی۔ اس کفر حقیقی کو اپنے ذہن میں نفاق کے مساوی قرار دے لیجیے۔ یعنی کفر حقیقی ہی دراصل نفاق ہے۔

سورۃ المنافقون میں نفاق کے موضوع سے متعلق سارے مضامین بڑے ہی اختصار کے ساتھ سمو دیے گئے ہیں' لیکن اس آیۂ مبارکہ کی جو شرح سورۃ النساء میں وارد ہوئی ہے اس سے انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہ پورا process ایک دم اور یک بارگی نہیں ہو جاتا اور انسان یہ فیصلے اچانک اور ایک ہی مرتبہ نہیں کر لیتا، بلکہ اس میں بہت سے اتار چڑھاؤ آتے ہیں، انسان کبھی آگے بڑھ رہا ہے، کبھی پیچھے ہٹ رہا ہے، پھر کبھی آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے، پھر پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اس طرح کی کیفیت دیر تک رہتی ہے، تآنکہ پھر مرضِ نفاق دل میں راسخ ہو جاتا ہے اور اپنی جڑیں مضبوطی سے جما لیتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں جو الفاظ آئے ہیں وہ بڑے فکر انگیز ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ

لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿١٣٧﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٣٨﴾﴾

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے' پھر انہوں نے کفر کیا' پھر ایمان لائے' پھر کفر کیا' پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے' اللہ تعالیٰ ان کو بخشنے والا نہیں ہے اور نہ ہی انہیں راہ یاب کرنے والا ہے۔ (اے نبیؐ!) ایسے منافقوں کو آپ بشارت سنا دیجیے کہ ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔''

یہ ہے مرضِ نفاق کے شکار انسان کی باطنی کیفیت کا نقشہ کہ کچھ آگے بڑھا' پھر پیچھے ہٹا' پھر حالات بہتر ہوئے اور آسانی ہوئی تو سرگرمی کے ساتھ کچھ پیش قدمی کی' لیکن پھر کہیں کوئی مشکل مرحلہ آ گیا تو پسپائی اختیار کر لی۔ اس کیفیت کی تمثیل اس سے پہلے سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع کے حوالے سے بیان کی جا چکی ہے: ﴿كُلَّمَا اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا﴾ کہ ایمان کے راستے میں' ایمان کے تقاضوں کو ادا کرنے میں کچھ آگے بڑھتے ہیں' قدم اٹھاتے ہیں' پھر ہمت جواب دے دیتی ہے۔ جان و مال کھپانے کے تقاضے بڑے کڑے اور بڑے کٹھن نظر آنے لگتے ہیں تو انسان بیٹھ جاتا ہے۔ پھر کمر ہمت کستا ہے' پھر بیٹھ رہتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے' تاآنکہ ایسا انسان مستقلاً بیٹھ رہتا ہے اور اس سے ہمت و کوشش کی توفیق ہی سلب ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں یہاں فرمایا گیا: ﴿فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٣﴾﴾ ''تو ان کے دلوں پر مہر ہو چکی' پس وہ فہم سے عاری ہو چکے ہیں۔''

اس کے لیے قرآن حکیم میں ''طبع قلوب'' کے علاوہ ''ختم قلوب'' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دونوں تراکیب مفہوم' معنی اور نتیجے کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ سورۃ البقرۃ کے پہلے رکوع میں کھلے کھلے کافروں کے ذکر کے ضمن میں الفاظ آئے ہیں: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ جبکہ یہاں منافقین کے ضمن میں فرمایا گیا: ﴿فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ ''پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی ہے''۔ ﴿فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٣﴾﴾ ''چنانچہ وہ فہم سے عاری ہو چکے ہیں۔'' اسی کو سورۃ البقرۃ میں ﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ اندھے' بہرے اور گونگے ہو چکے ہیں' ان کی سماعت و بصارت کی صلاحیتیں بظاہر موجود ہیں' لیکن وہ بصارتِ حقیقی سے تہی دست ہو چکے ہیں' سماعتِ حقیقی سے محروم ہو چکے ہیں اور اب ان کے لوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔

ذہن میں رکھیے کہ نفاق کا یہ سارا معاملہ دراصل قلب کی دنیا سے یعنی انسان کے باطن سے متعلق ہے۔ ورنہ ظاہری طور پر منافقین مسلمانوں ہی میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ منافقوں کے سردار عبداللہ

بن اُبی کو بھی آخری وقت تک مسلمان تسلیم کیا گیا۔ یہاں اسلام اور ایمان کے مابین فرق کو' یا یوں کہہ لیجیے کہ ''قانونی ایمان'' اور ''حقیقی ایمان'' کے درمیان اس فرق کو جو اِس سے پہلے مختلف مواقع پر اس منتخب نصاب کے دروس کے دوران زیر بحث آ چکا ہے' ایک مرتبہ پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اس لیے کہ یہ بڑی اہم بحث ہے۔ دین کے نظام کو سمجھنے کا بہت حد تک دارومدار اِس پر ہے۔

مختصر یہ کہ ایک ہے ''قانونی ایمان'' جس کے لیے مترادف نظام ''اسلام'' ہے اور ایک ہے ''حقیقی ایمان'' جو یقینِ قلبی سے عبارت ہے۔ اس یقینِ قلبی والے ایمان سے اگر انسان محروم ہو جائے تو یہ ایک نوع کے نفاق کی کیفیت ہے۔ تاہم یہ واضح رہنا چاہیے کہ نفاق یا منافقت کسی قانونی درجے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی منافق کی کوئی علیحدہ قانونی حیثیت ہوتی ہے' بلکہ قانونی اعتبار سے تو مسلم اور کافر بس یہی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ہاں ایک مسلمان کی باطنی کیفیات مختلف ہو سکتی ہیں۔ وہ مثبت طور پر مؤمن بھی ہو سکتا ہے اور منفی طور پر منافق بھی!

منافقین کی اسلام دشمنی ——— ایک چشم کشا واقعہ

سورۃ المنافقون کی ابتدائی تین آیات کا مطالعہ کسی درجے ہم نے مکمل کر لیا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے پہلے رکوع کی بقیہ آیات کو سمجھنے کے لیے اس کے تاریخی پس منظر کو پہلے ذہن میں مستحضر کر لینا مفید ہوگا۔ حقیقت نفاق پر اصولی گفتگو اگرچہ ہو چکی ہے' لیکن یہ کہ عملاً یہ نفاق کا مرض انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا تا ہے' جس کو اس سے قبل ٹی بی کی تھرڈ سٹیج سے تعبیر کیا گیا تھا' یعنی نفاق کا وہ مرتبہ جہاں پہنچ کر اہل ایمان کے لیے بغض وعداوت اور ان سے دشمنی منافق کے دل میں گھر کر جاتی ہے' اس کی ایک نمایاں مثال اس واقعے کے حوالے سے سامنے آتی ہے جو غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر پیش آیا۔

اس غزوے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ساتھ کچھ منافقین بھی لشکر میں شامل تھے۔ عبداللہ بن اُبی بھی اپنی جمعیت کے ساتھ موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ واپسی پر مریسیع کے کنویں کے قریب جہاں لشکر کا پڑاؤ تھا' دو مسلمانوں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک حضرت جہجاہؓ تھے جو حضرت عمرؓ کے ملازم تھے اور ان کے گھوڑے وغیرہ کو سنبھالتے تھے' اور دوسرا شخص انصار کا حلیف تھا۔ معمولی سا جھگڑا ہوا۔ حضرت جہجاہؓ نے کہیں جذبات میں آ کر اس کو ایک لات رسید کر دی۔ اس پر ہنگامہ ہوا' ایک شور مچ گیا اور پرانی عصبیتوں کو آواز دی گئی۔ ہوتے ہوتے یہ معاملہ مہاجرین اور انصار کے مابین ایک جھگڑے کی شکل اختیار کر گیا۔ نبی اکرم ﷺ کو اطلاع ہوئی' آپؐ تشریف لائے' سمجھایا

بجھایا' معاملہ رفع دفع ہوگیا۔لیکن جیسا کہ عموماً ہوتا ہے' اس کے بعد چہ مے گوئیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ لوگ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے پاس گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے تشویش کا اظہار کیا کہ مہاجرین کی جرأتیں بڑھتی جارہی ہیں! عبداللہ بن اُبی کو تو یوں سمجھئے کہ ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ اس کے خبثِ باطن کے اظہار کے لیے یہ ایک بڑا مناسب موقع تھا۔ اس نے لوگوں کو سخت سست کہا کہ آج مجھ سے کیا کہتے ہو' یہ سب کچھ تم لوگوں کا کیا دھرا ہے۔ یہ لٹے پٹے مہاجرین مکہ سے آئے تھے' ان کے پاس کوئی ٹھکانہ نہ تھا' تم نے ان کو جگہ دی' تم نے انہیں پناہ دی' تم نے ان پر خرچ کیا' انہیں کھلایا پلایا۔ اب ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ہم لوگ یعنی اہل مدینہ ان کی دست درازیوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف بڑے گستاخانہ الفاظ استعمال کیے۔ عربی زبان کی ایک کہاوت کا حوالہ دیا ''سَمِّنْ كَلْبَكَ يَاْكُلُكَ '' (یعنی اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو' کسی روز وہ خود تمہیں کاٹے گا) اور کہا کہ یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے' اور خدا کی قسم! اگر تم لوگ اپنا دستِ تعاون اُن سے کھینچ لو اور اُن پر خرچ نہ کرو تو یہ سب چلتے بنیں گے۔ یہ ایمان اور جہاد کا غلغلہ محض اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں کو کھانے پینے کو ملتا ہے' آرام اور آسائش حاصل ہے۔ یہ سہولت اگر سلب کر لی جائے تو یہ ساری بھیڑ چھٹ جائے گی۔ مزید برآں اس نے بہت زور دے کر کہا کہ جب ہم مدینہ واپس پہنچیں تو بالکل متفق الرائے ہو کر یہ طے کر لیں کہ جو صاحبِ عزت ہیں' جو مدینہ کے قدیم باشندے ہیں (یا جدید اصطلاح میں جو Sons of the soil ہیں) وہ ان کمزور لوگوں کو نکال باہر کریں۔ ان مہاجروں کو جو بڑے کمزور ہیں' جن کی کوئی حیثیت نہیں' اب ہم مدینہ سے بے دخل کر کے چھوڑیں گے۔

یہ باتیں جہاں ہو رہی تھیں وہاں حضرت زید بن ارقمؓ بھی موجود تھے جن کا شمار اس وقت نوجوان اور کم عمر صحابہ میں ہوتا تھا۔ انہوں نے جا کر یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی۔ معاملہ چونکہ اہم تھا لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس بارے میں اچھی طرح پوچھ گچھ کی کہ کہیں ان سے سننے میں تو کوئی سہو تو نہیں ہوا۔ لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان ہوگیا کہ حضرت ارقمؓ جو بیان کر رہے ہیں وہ مبنی برحقیقت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبی کو طلب فرمایا اور باز پرس کی۔ وہ صاف قسم کھا گیا کہ مَیں نے ایسی کوئی بات ہی نہیں کہی' یہ بالکل جھوٹ اور افتراء ہے جو مجھ پر باندھا جا رہا ہے۔ اب حضرت زید بن ارقمؓ کی پوزیشن بڑی خراب (awkward) ہوگئی کہ عبداللہ بن اُبی کی بات کو درست تسلیم کیا جائے تو وہؓ جھوٹے پڑتے تھے۔ اتنے بڑے سردار اور اتنے معتبر شخص' رئیسِ خزرج کے مقابلے میں اس کم سن اور نوجوان صحابیؓ کی بات کون سنے! تو اس طرح حضرت زیدؓ کی پوزیشن بڑی ہی خراب ہوئی۔ اس پر یہ

آیات نازل ہوئیں۔ ان میں گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نیک دل اور مخلص مسلمان کے قول کی توثیق و تصویب کی کہ جو جھوٹ اس پر چسپاں کر دیا گیا تھا اسے اس سے براءت حاصل ہو جائے' اور اصل حقیقت پورے طور پر مسلمانوں کے سامنے آ جائے۔

اس پس منظر میں ان آیات کا مطالعہ کیجیے اور اس پورے سلسلۂ کلام کو مدنظر رکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرضِ نفاق کی ہلاکت خیزی کیا ہے اور یہ انسان کو کس انجامِ بد سے دوچار کرتا ہے۔ چنانچہ یہ مرض جس کا آغاز معمولی سی تقصیر سے ہوتا ہے' یعنی دین کے تقاضوں کے مقابلے میں اپنی جان و مال کے تحفظ کا خیال اور ایثار وقربانی سے گریز' لیکن جب یہ آگے بڑھتا ہے تو جھوٹے بہانوں اور جھوٹی قسموں سے ہوتا ہوا اس منزل تک پہنچ جاتا ہے کہ اللہ کے رسول کی عداوت و دشمنی اور صادق الایمان مسلمانوں سے بغض اور دشمنی دل میں گھر کر جاتی ہے۔ یہ گویا کہ اس مرض کی وہ آخری سٹیج ہے کہ جس کے بعد دلوں پر مہر ہو جاتی ہے۔ یہ point of no return ہے کہ یہاں سے واپسی کا اب کوئی امکان نہیں۔

منافقین کا ظاہر

فرمایا:﴿وَاِذَا رَاَیۡتَھُمۡ تُعۡجِبُکَ اَجۡسَامُھُمۡ ؕ﴾ کہ اے نبیؐ! جب آپؐ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کا تن و توش آپؐ کو بڑا اچھا لگتا ہے —— یہ بات سورۃ التوبۃ میں بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں آئی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ دنیادار اور دنیا پرست ہیں اور جن کی ساری محنت اور جدوجہد کا مقصود اور مصرف بس دنیا کی زندگی ہے' ان کے پاس مال و دولت بھی وافر ہوگی اور معاشرے میں انہیں ایک حیثیت و وجاہت بھی حاصل ہوگی۔ وہ جس مجلس میں بیٹھے ہوں گے معتبر نظر آئیں گے۔ تو اس کا ایک نقشہ یہاں کھینچا گیا ہے کہ اے نبی! جب آپؐ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کے قد و قامت اور ان کے تن و توش سے آپؐ متاثر ہوتے ہیں ﴿وَاِنۡ یَّقُوۡلُوۡا تَسۡمَعۡ لِقَوۡلِھِمۡ ؕ﴾ ''اور جب وہ کوئی بات کرتے ہیں تو (ان کی ظاہری حیثیت کے موافق) آپ ان کی طرف متوجہ ہوتے اور بڑے غور سے ان کی بات سنتے ہیں —— ﴿کَاَنَّھُمۡ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ ؕ﴾ یہ ان لکڑیوں کی مانند ہیں جنہیں سہارا دے کر کھڑا کیا گیا ہو —— آپؐ ان کے اس ظاہری تن و توش پر نہ جائیے' یہ لوگ اندر سے کھوکھلے ہیں۔

انسان کی ایک معنوی شخصیت ہوتی ہے۔ وہ اس کی قوتِ ارادی' اس کے عزم اور اس کی سیرت و کردار کی قوت سے عبارت ہوتی ہے۔ کوئی شخص خواہ بظاہر دبلا پتلا اور نحیف الجثہ ہو' ابوبکر صدیقؓ کی

مانند کہ جو نحیف ونزار ہی نہیں رقیق القلب بھی تھے' لیکن اندر اگر ایک عزیمت اور ایک فیصلہ کن ولولہ موجود ہو تو یہ شخص ان لوگوں میں سے ہوگا جو تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں کہ جن کے ذریعے سے قوموں کی تقدیریں بدلتی ہیں۔ تو اس معنوی شخصیت کے اعتبار سے ان منافقین کا حال یہ ہے کہ: ﴿كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ﴾ بڑی عمدہ تشبیہ ہے کہ ایک تو وہ درخت ہے کہ جو خود اپنے بل پر کھڑا ہے اور ایک وہ لکڑی ہے جو اپنی جگہ چاہے کتنی ہی موٹی اور وزنی کیوں نہ ہو لیکن زمین سے چونکہ اسے غذا نہیں مل رہی لہٰذا وہ سوکھ چکی ہے اور اب وہ اپنے بل پر کھڑی نہیں ہو سکتی' اسے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ کہیں اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیجیے تو کھڑی رہے گی' بصورتِ دیگر ڈھیر ہو جائے گی۔ ان منافقین کی معنوی حیثیت بھی ان خشک لکڑیوں سے مختلف نہیں!

منافقین کی باطنی کیفیت

آگے فرمایا: ﴿يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ان کی اس باطنی کیفیت میں جو بزدلی' کمزوری اور ضعف مضمر تھا اس کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی کی جب بھی کوئی چیخ یا کوئی بلند آواز کان میں پڑتی ہے تو یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری شامت آ گئی۔ دل ہی دل میں لرزتے اور کانپتے رہتے ہیں۔ سورۃ القیامۃ کی اس آیت کے مصداق کہ ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴾ انہیں خوب معلوم تھا کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ ان کی اصل حقیقت کیا ہے! —— قرآن میں اگر کوئی وعید وارد ہوتی تو بھی کم از کم وقتی طور پر انکی جان پر بن جاتی تھی' اس لیے کہ ان کا ضمیر متنبہ کر دیتا تھا کہ یہ ہے انجام جس سے تم دوچار ہو گے۔ اور صَيْحَة کے لفظ کے حوالے سے اشارہ کر دیا گیا کہ کہیں کوئی خطرے کی گھنٹی بجتی' یعنی کسی طرف سے کوئی خطرے کی آواز سنائی دیتی کہ کوئی لشکر حملہ آور ہوا چاہتا ہے تو خوف و دہشت سے ان کی جانیں لرزنے لگتیں۔ فرمایا: ﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ﴾ یہی ہیں اصل دشمن۔ اے نبی! ان کو پہچانئے اور ان کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کی کوشش کیجیے۔ یہ جو آستین کا سانپ ہیں ان کا ڈنگ بہت خطرناک ہے۔ لہٰذا آپ پورے طور پر چوکس اور محتاط رہیں اور ان کے طرزِ عمل پر نظر رکھیں۔ آیت کے آخری حصے میں فرمایا: ﴿قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝﴾ اللہ انہیں ہلاک کرے' یہ کہاں سے لوٹائے جا رہے ہیں! اس میں ایک حسرت بھی ہے کہ کہاں تک ان کی رسائی ہوئی' یہ اپنی خوش بختی کا تصور کریں کہ محمد ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونے کا شرف انہیں حاصل ہوا' لیکن یہ بد بخت کہاں تک پہنچ کر واپس جا رہے ہیں! —— یہ کس خوش بختی' رشد اور فوز و فلاح کی منزل کے قریب پہنچ

کر اب محرومی کی طرف لوٹائے جا رہے ہیں!!

منافقین کی ہٹ دھرمی اور تکبر

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ کہ اپنے غلط طرزِ عمل پر پشیمان ہونے اور اصلاحِ احوال کی جانب متوجہ ہونے کی اب ان سے توقع بھی عبث ہے۔ یہ چیز اس مرض کے آغاز میں تو ہوتی ہے لیکن اب معاملہ آگے بڑھ چکا ہے۔ مرضِ نفاق اب تیسری سٹیج میں داخل ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان کا حال یہ ہے کہ جب اہل ایمان ان سے یہ کہتے کہ تم سے جو غلطی ہوئی ہے اس کے ازالے کے لیے چلو نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضری دو اور اپنی غلطی کا اعتراف کرلو تا کہ اللہ کے رسول ﷺ تمہارے لیے استغفار کریں اور اللہ سے تمہاری خطاؤں کی معافی چاہیں تو بجائے اس کے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی خطا کا اعتراف کریں ﴿لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ﴾ ''اپنے سروں کو مٹکاتے ہیں''— یعنی متکبرانہ انداز میں اپنے سر کو جھٹک دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے باطن میں نفاق کا پودا پوری طرح برگ و بار لا چکا ہے اور ان کی پوری شخصیت پر آکاس بیل کی طرح مسلط ہو چکا ہے۔ فرمایا: ﴿وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝﴾ ''اور آپ دیکھتے ہیں کہ وہ رُک کے رہ جاتے ہیں' استکبار کرتے ہوئے''— ان کے قدم گویا کہ جکڑ دیے گئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر غلطی کا اعتراف اور استغفار کی درخواست کرنے سے گویا کوئی چیز ان کے قدموں کو روکے ہوئے ہے اور یہ سب کچھ درحقیقت تکبر اور گھمنڈ کے باعث ہے۔

منافقین کا حسرت ناک انجام

اگلی آیت میں اس حسرت ناک انجام اور محرومی کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو منافقین کا مقدر ہے۔ فرمایا: ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ﴾ کہ اے نبی! ان منافقین کے لیے برابر ہے کہ آپؐ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں' اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ گویا کہ آپؐ کا استغفار بھی ان بدبختوں کے حق میں مفید نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں یہ مضمون سورۃ التوبۃ میں دہرایا گیا ہے۔ وہاں اضافی طور پر فرمایا: ﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ کہ اگر آپؐ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار فرمائیں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہیں بخشے گا۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ منافقین کے بیان میں یہاں وہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو سورۃ البقرۃ کے پہلے رکوع میں پکے اور کٹر کافروں کے لیے ملتا ہے۔ وہ کھلے کافر جو کفر کی آخری حدوں کو پہنچ

چکے تھے' جن کے لیے ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ کے فیصلے کا اعلان ہوا' ان کے بارے میں سورۃ البقرۃ میں یہی الفاظ آتے ہیں: ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ کہ ان کافروں کے حق میں بالکل برابر ہو چکا ہے خواہ آپؐ انہیں خبردار فرمائیں خواہ نہ فرمائیں' اب یہ ایمان لانے والے نہیں۔ وہی بات یہاں منافقین کے بارے میں فرمائی گئی۔ گویا منافقین کا شمار اگرچہ دنیا میں مسلمانوں ہی میں ہوتا ہے لیکن ان کا انجام بدترین کافروں کے ساتھ ہوگا۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں اسی قاعدہ کلیہ کو دہرایا گیا جو اس سے پہلے سورۃ الصّف میں بھی بیان ہوا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ ''یقیناً اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا'' یہ بات اس کی سنت اور اس کے ضابطے کے خلاف ہے کہ وہ کسی کو زبردستی راہِ ہدایت پر لے آئے۔ زبردستی ہدایت دینی ہوتی تو پھر کون ہوتا جو ہدایت سے محروم رہ جاتا۔ پھر تو ابوجہل اور ابولہب بھی ہدایت سے محروم نہ رہتے۔ اللہ تو ہدایت انہی کو دیتا ہے جو ہدایت کے جویا ہوں' جو ہدایت کے طالب اور متلاشی ہوں' جو ہدایت اختیار کرنے کا فی الواقعہ ارادہ رکھتے ہوں۔ جو لوگ دیدہ دانستہ فسق و فجور کے راستہ پر چل رہے ہوں انہیں زبردستی ہدایت دینا اللہ کا طریقہ نہیں!

اگلی دو آیات میں عبداللہ بن اُبی کا وہ قول نقل کیا گیا جس سے اس کا خبثِ باطن جھلکتا تھا۔ اس طرح گویا تصدیق ہوگئی حضرت زید بن ارقمؓ کی کہ انہوں نے عبداللہ بن اُبی پر جو الزام لگایا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ فرمایا: ﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰی يَنْفَضُّوْا ؕ﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں کہ جو کہتے ہیں مت خرچ کرو اُن پر جو اللہ کے رسول کے ساتھ ہیں' یہاں تک کہ منتشر ہو جائیں!'' —— یہ لوگ تمہارے چندوں اور تمہارے صدقات پر پل رہے ہیں۔ یہ ساری ہمہ ہمی اور ساری شوراشوری درحقیقت تمہارے اس ایثار اور اس انفاق کی بنیاد پر ہے۔ تم اگر ہاتھ روک لو تو یہ سب چلتے پھرتے نظر آئیں گے' یہ بھیڑ چھٹ جائے گی۔ جواباً فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں''۔ یعنی یہ ان کی نری خام خیالی ہے کہ مہاجرین کو رزق وہ فراہم کرتے ہیں' لیکن ان منافقین کو کون سمجھائے ﴿وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝﴾ یہ بات اس سے پہلے آیت ۳ کے ذیل میں بھی گزر چکی ہے کہ یہ لوگ فہم و شعور سے عاری ہو چکے ہیں۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝﴾

اگلی آیت میں بھی عبداللہ بن اُبی ہی کا ایک قول نقل ہوا ہے۔فرمایا:﴿یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْھَا الْاَذَلَّ ﴾ ''انہوں نے کہا کہ اگراس دفعہ ہم مدینہ لوٹ گئے (یعنی اگر ہم بخیر و عافیت واپس پہنچ گئے) تو یہ بات طے شدہ سمجھو کہ عزت دار لوگ (مراد ہے اہل مدینہ یعنی اوس وخزرج) ان بے وقعت لوگوں کو (یعنی مہاجرین مکہ) کو نکال باہر کریں گے''۔ یہ روز روز کا جھگڑا اسی صورت میں ختم ہوسکتا ہے کہ مدینہ کے باعزت باشندے اپنی سرزمین سے ان لٹے پٹے مہاجرین کو بے دخل کر دیں۔اس گستاخی اور جسارت پر سرزنش کے انداز میں فرمایا: ﴿وَلِلّٰہِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾﴾ ''حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ عزت تو کُل کی کل اللہ کے لیے ہے' اس کے رسول کے لیے ہے اور اہل ایمان کے لیے ہے' لیکن منافقین کو اس کا علم نہیں ہے''۔ وہ اپنی نادانی میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ عزت دار وہ خود ہیں' جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

یہاں اس سورۂ مبارکہ کا پہلا رکوع ختم ہوتا ہے۔اس میں گویا کہ مرضِ نفاق' اس کی علامات' اس کا نقطۂ آغاز' اس کا سبب' اس کے مختلف مراتب و مدارج' اس کی ہلاکت خیزی' یہ تمام چیزیں زیر بحث آ گئی۔

دوسرے رکوع کی تین آیات میں ایک عجیب ترتیب نظر آتی ہے۔جس طرح کہ طب میں ایک مرض کے علاج کی شکلیں ہیں۔ ایک حفاظتی (Preventive) قسم کا علاج ہے اور دوسرا معالجاتی (Curative) طرز کا۔یعنی ایک تو وہ تدابیر ہیں کہ جن سے اس مرض کی چھوت سے بچا جا سکے۔اور دوسرے یہ کہ اگر وہ مرض لاحق ہو جائے' اس کی چھوت لگ جائے تو پھر اس کا مداوا اور اس کا چھٹکارا حاصل کرنے کی تدابیر کی جاتی ہیں۔ یہاں دیکھئے کہ مرضِ نفاق کے علاج کے ضمن میں یہ دونوں پہلو سامنے آ رہے ہیں۔

نفاق سے بچاؤ کی حفاظتی تدابیر

دوسرے رکوع کی پہلی آیت میں حفاظتی تدبیر کا بیان ہے۔فرمایا:﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ﴾ ''اے اہل ایمان! تمہیں غافل نہ کر دیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے''۔نفاق سے بچنا چاہتے ہو تو اللہ کو کثرت سے یاد رکھو' اس کی یاد کو اپنے دل میں مستحضر رکھو۔ وہی ذکرِ الٰہی جس کے لیے نماز کا نظام قائم کیا گیا﴿اقم الصلوة لذکری﴾ دن رات میں پانچ مرتبہ اپنے معمولات میں سے نکل کر ایمان کو تازہ کرتے رہو۔تجدیدِ

ایمان اور تجدیدِ عہد کا یہ سلسلہ برقرار رہنا چاہیے۔ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کی تلاوت تجدیدِ ایمان کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ غور کیجیے! ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ سے ایمان باللہ کی تجدید ہوگئی' ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ سے ایمان بالمعاد یعنی با یمان بالآ خرت از سرنو تازہ ہوگیا' ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ سے اس عہد کی تجدید ہوگئی جو بندے اور ربّ کے درمیان ہے۔ تو نماز درحقیقت ذکرِ الٰہی کی انتہائی مؤثر اور جامع صورت ہے۔ لیکن اصل میں مقصود یہ ہے کہ **استحضار اللّٰہ فی القلب** کی یہ کیفیت دائم ہو جائے' مستقل ہو جائے۔

صوفیاء نے اس معاملے کو خصوصی طور پر اپنا موضوع بنایا اور اسے اپنی آخری منطقی انتہا تک پہنچایا ہے۔ پاسِ انفاس کی مسلسل ریاضت اور مشق سے یہ کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ذکر کا معاملہ ہر سانس کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی سانس غفلت میں نہ نکلے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے پیارے انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے ہر سانس جب انسان کے اندر جاتا ہے تو موجبِ تقویت بنتا ہے اور جب باہر نکلتا ہے تو باعثِ تصفیہ ہوتا ہے۔ جسم کے بہت سے خراب بخارات کو لے کر وہ باہر نکلتا ہے اور انسان کے اندرونی نظام کی صفائی کا ذریعہ بنتا ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں: ''پس بر ہر نفس دو شکر واجب است'' کہ پس ثابت ہوا کہ ہر سانس پر دو مرتبہ اللہ کا شکر لازم ہے۔ بہرکیف ان چیزوں میں کچھ مبالغہ نظر آئے تب بھی یہ بات جان لیجیے کہ دوامِ ذکر کے لیے شعوری کوشش کرتے رہنا انسان کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ نفاق سے بچنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

اس سے پہلے سورۃ الجمعہ کے درس میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ دوامِ ذکر کی ایک نہایت مفید اور قابلِ عمل صورت یہ ہے کہ انسان ''ادعیہ ماثورہ'' کا التزام کرے۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعائیں جو آپؐ زندگی کے مختلف اعمال وافعال کرتے ہوئے مانگا کرتے تھے اور اس طرح آپؐ کی زبان پر اللہ کا ذکر دعاؤں کی صورت میں جاری رہتا تھا۔ روز وشب کے معمولات کو ادا کرتے ہوئے قدم قدم پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا ثابت ہے۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے تو ساتھ ہی دعا زبان پر آ جاتی ہے' جوتے پہن رہے ہیں تو دعا ہے' سواری پر داہنا پاؤں آگے بڑھا کر چڑھ رہے ہیں تو دعا ہے' اتر رہے ہیں تو دعا ہے' گھر سے نکلے ہیں تو دعا ہے۔ گویا کہ زندگی کے ہر ہر کام کو انجام دیتے ہوئے دعا کی صورت میں اللہ کا ذکر جاری رہتا ہے۔ اس سے معمولات میں قطعاً کوئی خلل واقع نہیں ہوتا' انسان اپنی زندگی کی مصروفیات میں مشغول رہتے ہوئے بھی ذہن اور قلب کا رشتہ اللہ کے ساتھ

برقرار رکھ سکتا ہے۔

نبی اکرمﷺ نے فرمایا کہ شیطان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل پر اپنی تھوتھنی جمائے رکھتا ہے جس سے وہ وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝﴾ جب تک انسان اللہ کو یاد رکھتا ہے وہ پیچھے دبکا رہتا ہے اور وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اس آخری سورۃ میں شیطان کے لیے''خناس'' کا لفظ آیا ہے۔ ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝﴾ خنس کہتے ہیں پیچھے ہٹنے کو۔ جب انسان اللہ کو یاد کر رہا ہو' اس کا دل یادِ الٰہی سے آباد ہو تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے' لیکن منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی دل پر غفلت طاری ہو جائے تو وہ پھر دل پر اپنا تسلط جمائے اور اپنی تھوتھنی رکھ کر پھونکیں مارنی شروع کر دے! لہٰذا کوشش کرو کہ تمہارا کوئی وقت' کوئی لمحہ یادِ الٰہی سے اور ذکرِ الٰہی سے خالی نہ ہو۔ یہ ہے مرضِ نفاق سے بچاؤ کی تدبیر۔ یہ ہے وہ حفاظتی ٹیکہ جو نفاق کی چھوت سے انسان کو محفوظ رکھے گا۔

آیت زیر بحث کے الفاظ کو ذہن میں لایئے: فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ﴾ یہاں دو چیزوں کو معین کیا گیا ہے کہ جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا باعث بنتی ہیں' یعنی مال اور اولاد۔ یہ وہ بات ہے جو ہم سورۃ التغابن میں اس سے قبل پڑھ چکے ہیں۔ گو ہمارے منتخب نصاب میں سورۃ التغابن پہلے ہے اور سورۃ المنافقون کا نمبر بہت بعد میں آتا ہے تاہم مصحف میں سورۃ التغابن میں اس سورۃ المنافقون کے معاً بعد آتی ہے۔ اس اعتبار سے یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہی مضمون آگے چل کر سورۃ التغابن میں نہایت واضح شکل میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ ''جان لو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد ہی ذریعۂ آزمائش ہیں''۔ یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تمہیں پرکھا جا رہا ہے۔ آیا ان کی محبت اس درجے دل پر مسلط ہو گئی ہے کہ ساری بھاگ دوڑ بس انہی کے لیے ہو رہی ہے؟ یا یہ کہ اللہ کی یاد دل میں تازہ ہے' اپنی زندگی کی اصل منزل یعنی آخرت ذہن میں مستحضر ہے' اصل توجہ اپنے خالق و مالک اور آقا کی طرف ہے؟ یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تم جانچے اور پرکھے جا رہے ہو۔ چنانچہ متنبہ کر دیا گیا کہ اے اہل ایمان! دیکھنا' تمہیں یہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔

یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ نور میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں اللہ کے کچھ نیک بندوں کی تعریف میں مثبت انداز میں یہ بات آئی تھی: ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ وہ جواں مرد'

وہ باہمت لوگ جنہیں کوئی کاروبارِ دنیوی' کوئی تجارت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔ اور اگر کوئی شخص ان چیزوں کی محبت سے مغلوب ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہو گیا تو اس کے بارے میں فرمایا: ﴿اُولٰٓـئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ''یہی ہیں جو خسارہ پانے والے ہیں''۔

نفاق کا علاج: انفاق

یہ تو ہوئی حفاظتی تدبیر جس کو ایک لفظ میں اگر بیان کریں تو وہ ہے ''دوامِ ذکرِ الٰہی!'' لیکن اگر کہیں اس مرض کی چھوت لگ گئی ہو تو اس بارے میں جو تجزیہ ہم کر چکے ہیں اس کی رو سے اس کا اصل سبب ہے مال و دولت دنیا کی محبت! یہی وہ محبتیں ہیں جو انسان کو نفاق کے راستے پر ڈالتی ہیں۔ اللہ کی راہ سے انسان اگر رکتا ہے تو اصل میں انہی محبتوں کے باعث۔ لہٰذا اب اس کا علاج اسی طور پر ہو گا کہ مال کی محبت کو دل سے کھرچنے کی کوشش کی جائے۔ انسان چاہتا ہے کہ اس مال کو جو اسے بہت محبوب ہے' روک روک کر اور سینت سینت کر رکھے۔ سورۃ المعارج میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا﴾

کہ انسان بہت ہی تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے' جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو واویلا کرتا ہے اور جب خیر پہنچتا ہے' مال میسر آتا ہے تو اسے روک روک کر رکھتا ہے۔ یہ انسان کی طبیعت ہے۔ اسی سے اس کے دل کی کلی کھلتی ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ ''خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تمہیں عطا کیا' اس سے پہلے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے''۔ اس مال کو صرف کرو' اس کو خرچ کرو' اللہ کی راہ میں لگا دو۔ اس طرح قلب کی صفائی ہو گی' مال کی محبت کا زنگ دھلے گا' اسی سے تزکیہ ہو گا۔ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات میں بھی یہ مضمون آ چکا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾ تزکیۂ عمل' تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے لیے درحقیقت سب سے مؤثر تدبیر یہی ہے کہ اس مال کو اللہ کی راہ میں لگاؤ اور خرچ کرو۔ اسی کا نام ہے انفاق فی سبیل اللہ۔

یہاں ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ انفاق کے بارے میں عام تصور تو یہی ہے کہ اس سے مراد ہے انفاقِ مال' اور قرآن مجید میں بھی اکثر و بیشتر مال کے صرف کرنے کے لیے ہی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن انفاق کا لفظ' جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' عام ہے اور اس کے مفہوم میں خاصی وسعت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ کی طرح نَفَقَ الْفَرَسُ بھی مستعمل ہے۔ گویا کسی کام میں اپنی جان' اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو کھپانا اور اوقات کا صرف کرنا' انفاق کا لفظ ان سب کو محیط ہے۔ اس لیے کہ

رزق بھی ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے۔ انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ اس کا رزق ہے۔ اس کا نصیب' اس کی ذہانت' اس کی صلاحیتیں' یہ سب رزق میں شامل ہیں۔ کوئی بھاگ دوڑ زیادہ کر سکتا ہے' کوئی منصوبہ بندی بہتر کر سکتا ہے۔ آج کے دور میں علمِ معاشیات نے جو وسعت اختیار کی ہے' اس کے اعتبار سے اب یہ بات معروف ہے کہ یہ سب چیزیں capital یعنی سرمایہ شمار ہوتی ہیں۔ انہی صلاحیتوں سے سرمایہ کمایا جاتا ہے۔ یہ interconvertible ہیں۔ لہٰذا انفاقِ مال میں بذلِ نفس یعنی انفاقِ نفس بھی شامل ہے۔ جو کچھ انسان کو دیا گیا ہے اس میں سے ایک قابل ذکر حصہ اللہ کی راہ میں لگائے اور کھپائے۔ یہ گویا کہ علاج بالضِد ہے کہ جس چیز سے محبت ہے اسی کو خرچ کرو اور اللہ کے راستے میں لگاؤ۔

یہی بات چوتھے پارے کے آغاز میں بیان ہوئی ہے: ﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ﴾ کہ تم نیکی اور وفاداری کا مقام حاصل کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ خرچ نہ کرو وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے' جسے تم پسند کرتے ہو۔ یہی بات آیۃ البر میں ایک مختلف اسلوب میں بیان ہوئی ہے: ﴿وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ﴾ کہ انسان مال کو خرچ کرے اس کی محبت کے علی الرغم۔

حسرت بوقتِ مرگ

یہاں سورۃ المنافقون کے آخری حصہ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ایک بڑا حسرت کا وقت آئے گا جب انسان کفِ افسوس ملے گا کہ اے کاش! میں اس مال کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر سکتا۔ آج یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے مال جمع کر رہے ہیں' گھروں کی آرائش وزیبائش پر بے تحاشا خرچ ہو رہا ہے' ان میں نامعلوم کہاں کہاں سے فرنیچر اور کراکری جمع کی گئی ہے' یہ سب چیزیں انسان کو بڑی محبوب ہیں ﴿وَمَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَہَا﴾ (التوبۃ:۲۴) لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جس کے بارے میں سورۃ القیامہ میں ہم پڑھ چکے ہیں ﴿وَظَنَّ اَنَّہُ الۡفِرَاقُ﴾ کہ وہ فراق کا وقت ہوگا۔ مال و دولت اور جائیداد' سب کو چھوڑ کر جانا ہوگا' یہاں سے نکلنا ہوگا' اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی تعلق منقطع ہو کر رہے گا' اہل وعیال سے بھی جدا ہونا پڑے گا' اُس وقت انسان حسرت سے کہے گا: ﴿رَبِّ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ﴾ کہ اے ربّ! کیوں نہ تو نے مجھے ذرا اور مہلت دے دی! تُو اگر ذرا اس وقت کو ٹال دے تو ﴿فَاَصَّدَّقَ﴾ پھر میں یہ سب کچھ تیری راہ میں دے دوں' سارا مال صدقہ کر دوں ﴿وَاَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰﴾﴾ اور میں بالکل سچائی اور صداقت کی راہ اختیار کر لوں۔ کاش مجھے تھوڑی سی مہلت اور

مل جاتی تو میں صالحین میں سے ہو جاتا!! اس وقت بس یہی ایک حسرت ہوگی‘ لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ کی یہ سنت ثابتہ ہے کہ جب کسی کا وقتِ معین آ جائے تو پھر اسے مؤخر نہیں کیا جاتا۔ ﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ﴾ امتحان کا وقت ختم ہو چکا‘ اب تو نتیجہ کے نکلنے کا انتظار کرو! اور آخری تنبیہ کر دی گئی کہ ﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱﴾ ”اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم کرتے ہو“۔ اس وقت کی یہ جزع فزع اور نالہ وشیون بھی فی الحقیقت منافقانہ ہوگی۔ اگر کہیں بالفرض کوئی مہلت مل بھی جائے تو پھر دوبارہ مال کی محبت عود کر آئے گی اور پھر تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کنّی کتراؤ گے۔

منافقت سے متعلق بنیادی اور تمہیدی مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے سورۃ التوبۃ کی وہ آیت پڑھی تھی جس میں واضح نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کچھ لوگ ہیں کہ جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ اگر ہمیں کشادگی اور غنا عطا فرمائے اور مال و دولت سے نوازے تو ہم اس کی راہ میں صدقہ وخیرات کریں گے‘ لیکن جب اللہ نے انہیں وہ سب کچھ دے دیا جو انہوں نے مانگا تھا تو اب وہ اس میں بخل سے کام لے رہے ہیں اور اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات پر آمادہ نہیں ہیں۔ فرمایا: ﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ تو اس بدعہدی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا۔ تو اللہ ان منافقین کے ظاہر اور باطن دونوں سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر کہیں بالفرض انہیں مہلت مل جائے تو پھر بھی یہ وہی کچھ کریں گے۔ جیسے کہ سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ تاکہ اگر ان کو لوٹا دیا جائے‘ ایک موقع اور دے دیا جائے تب بھی یہ ان حرکتوں کا اعادہ کریں گے جن سے انہیں روکا جاتا ہے۔ یقیناً یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

❁❁❁

حصہ پنجم
مباحثِ تواصی بالصبر
درس 20 تا درس 24
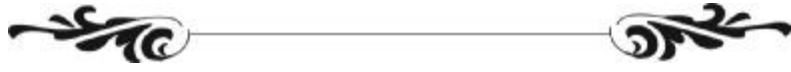
درس 20

شرائط نجات میں سے
آخری شرط
صبر و مصابرت

سورۃ آل عمران کی آخری آیت ــــ اور ــــ سورۃ العنکبوت

کے پہلے رکوع کی روشنی میں!

درس ۲۰

سورۃ العصر میں بیان کردہ شرائطِ نجات میں سے آخری شرط

صبر و مصابرت

سورۂ آل عمران کی آخری آیت اور سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۰۰﴾﴾ (آلِ عمران) ...... صدق اللہ العظیم

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس ان مجالس میں ہو رہا ہے اس کا پانچواں حصّہ مباحثِ صبر و مصابرت پر مشتمل ہے۔ اس کے لئے ایک نہایت جامع اور موزوں عنوان کے طور پر سورۂ آل عمران کی آخری آیت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے:

> ''اے ایمان والو! صبر کی روش اختیار کرو اور صبر کے معاملے میں (اپنے مخالفین اور اپنے دشمنوں پر) بازی لے جاؤ اور (ہر جانب سے چوکس اور چوکنے رہ کر) حفاظت کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

اس آیۂ مبارکہ کا اختتام ''فلاح'' کے لفظ پر ہوا اور یہاں فلاح کا ذکر مؤمن کے اصل مقصود کی حیثیت سے آیا ہے۔ فلاح کے معنی اور مفہوم پر اس سے پہلے اس منتخب نصاب میں سورۂ مؤمنون کی پہلی آیت ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾﴾ کے حوالے سے مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ یہاں سب سے پہلے تقویٰ کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے۔ تقویٰ قرآن حکیم کی ایک نہایت جامع اصطلاح ہے۔ تقویٰ

کا مادہ ''وق ی'' ہے۔ اس کا لغوی مفہوم ہے: بچنا۔ سوال یہ ہے کہ کس شے سے بچنا؟ مراد ہے کہ اس دنیا میں اللہ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنا' آخرت میں اللہ کے غضب اور اس کی سزا سے بچنا۔ گویا تقویٰ پورے دینی عمل کے لئے یا سلوکِ قرآنی کے لئے ایک مستقل روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح دنیا میں ہم ع ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں'' کے مصداق بہتری کے حصول کی کوشش کرتے ہیں' دین میں بھی خوب تر کی طرف پیش قدمی کرنا ہمارا مقصودِ حیات ہونا چاہئے۔ اسی لئے فرمایا: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ کہ نیکیوں میں' خیر میں' بھلائی میں' ایمان میں' عمل صالح میں مسلسل ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہو۔ اس کے لئے جو قوتِ محرکہ درکار ہو سکتی ہے' قرآن اسے لفظِ تقویٰ سے تعبیر کرتا ہے۔

اس ضمن میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ بہت اہم ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے علمی و عملی ارتقاء کا دارومدار روحِ تقویٰ پر منحصر ہے۔ فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۠﴾

کہ جب کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت کا پورا ضابطہ بیان ہو گیا تو کچھ مسلمانوں کے دل میں ایک تشویش سی پیدا ہوئی کہ جو چیزیں ہم پہلے استعمال کر چکے ہیں' ایسا تو نہیں کہ ان ناجائز چیزوں کے اثرات ہمارے وجود میں باقی رہ جائیں اور وہ ہمارے اعمالِ صالحہ پر اثر انداز ہوں! ان کی اس تشویش کے ازالے کے لئے فرمایا کہ اہل ایمان نے اس سے پہلے جو کچھ کھایا پیا ہے اس کی ان سے کوئی باز پُرس نہیں' اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا' جبکہ انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی۔ اس کو اگلے جملے میں یوں بیان فرمایا: ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کہ جب انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی' ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا﴾ پھر مزید تقویٰ ان میں پیدا ہوا' اور انہیں ایمان میں مزید ترقی حاصل ہوئی...... یہاں ایمان کے دو مراتب یا مدارج کی جانب اشارہ فرمایا۔ ایک ایمان کا اوّلین یا ابتدائی مرحلہ ہے جس میں عمل صالح کا ذکر ایک جداگانہ entity کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور دوسرا ایمان کا اس سے برتر اور اعلیٰ مرتبہ ہے جہاں عمل اور ایمان ایک وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں' لہٰذا پھر عمل کے دوبارہ ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مزید فرمایا: ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا﴾ پھر ان میں تقویٰ اور بڑھا اور نتیجۃً وہ درجۂ احسان پر فائز

ہو گئے۔ اور یہ تقویٰ کی معراج ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ o﴾ ''اور اللہ تعالیٰ محسنین سے محبت کرتا ہے۔'' تو سورۂ آل عمران کی اس آخری آیت کے آخری حصے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ میں تو گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو گیا' اب اس کے پہلے ٹکڑے پر توجہ مرتکز کیجئے جو منتخب نصاب میں ہمارے آج کے موضوع کے اعتبار سے اہم تر ٹکڑا ہے۔

فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا﴾ آیت کے اس حصّے میں ''صبر'' ہی سے دو فعل امر وارد ہوئے ہیں' دو حکم ہیں کہ جو مسلمانوں کو دیئے گئے۔ ایک ''اِصْبِرُوْا'' یعنی صبر کرو اور دوسرے ''صَابِرُوْا''۔ یہاں یہ ''بابِ مفاعلہ'' سے صیغۂ امر ہے۔ جس طرح اس باب میں قتل سے ''مقاتلہ'' اور جہد سے ''مجاہدہ'' کے مصادر آتے ہیں اسی طرح صبر سے مصدر ہوگا ''مصابرہ''۔ صبر ایک یک طرفہ عمل ہے۔ صبر کے معنی ہیں اپنے آپ کو روک کر رکھنا' تھام کر رکھنا اور اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی منزل اور اپنے ہدف کے تعین کے بعد انسان پوری ثابت قدمی سے اس کی طرف پیش قدمی جاری رکھے۔ کوئی مخالفت' کوئی رکاوٹ' کوئی تشدد اسے اپنے مقصد اور اپنی منزلِ مقصود کی جانب پیش قدمی سے روک نہ سکے۔ اور دوسرا پہلو یہ کہ کوئی طمع' کوئی لالچ' یا کسی اعتبار سے مرغوباتِ نفس کی کوئی کشش بھی اس کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ یہ دونوں پہلو ''صبر'' میں مضمر ہیں۔

محض صبر نہیں' مصابرت درکار ہے

جیسا کہ اس سے پہلے بارہا عرض کیا جا چکا ہے' ایک بندۂ مؤمن جس ماحول میں ایمان اور عمل کی منزلیں طے کرتا ہے وہاں کوئی خلا نہیں ہوتا۔ اگر اس کا ایک مخصوص نظریہ ہے تو اسی معاشرے میں اور بھی نظریات کارفرما ہیں' جہاں اس کا ایک مسلک ہے وہاں دوسرے مسالک کے لوگ بھی موجود ہیں۔ یہ دنیا مختلف نظریات کی ایک آماج گاہ ہے' یہاں تو کشمکش بلکہ کشاکش (struggle) ہو کر رہے گی۔ چنانچہ ''صبر'' کے بعد دوسرا لفظ یہاں آیا ''وَصَابِرُوْا''۔ مصابرہ کا لفظ مجاہدہ اور مقابلہ کے وزن پر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اہلِ کفر اپنے نظریات کے دفاع میں صبر کریں گے' اہلِ شرک اپنے معبودانِ باطل کے لئے ایثار کا وطیرہ اپنائیں گے' اے اہلِ ایمان! تمہیں اللہ کے لئے' اس کے دین کی سربلندی کے لئے صبر کرنا ہے اور صبر میں ان سب معاندین پر بازی لے جانا ہے۔ جب تک تم انہیں اس مقابلۂ صبر میں نیچا نہ دکھاؤ گے' آگے نہ بڑھ سکو گے۔ ہونا یہ چاہئے کہ اس تصادم' کشمکش اور ٹکراؤ میں تمہارا صبر

دوسروں کے صبر پر سبقت لے جائے‘ تمہارا ایثار وقربانی دوسروں سے بڑھ جائے‘ تم اپنے مقصد کے حصول کے لئے جان ومال نچھاور کرنے میں دوسروں پر بازی لے جاؤ۔ اگر تم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی اور ﴿لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ﴾ کا معاملہ صرف اسی ایک صورت میں ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیۂ مبارکہ ہمارے منتخب نصاب کے اس پانچویں حصّے کے لئے نہایت موزوں اور بہت جامع عنوان کی حامل ہے۔ اب آیئے ذرا ایک نگاہِ بازگشت ڈالیں کہ صبر کا ذکر اس سے پہلے ہمارے اس منتخب نصاب میں کہاں کہاں ہوا ہے۔

گزشتہ اسباق میں ''صبر'' کا ذکر

ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ منتخب نصاب کا پہلا حصّہ چار جامع اسباق پر مشتمل تھا اور ان چاروں اسباق میں چوٹی کی چیز اور آخری منزل صبر ہی کی تھی۔ سورۃ العصر کی طرف آیئے‘ سورۃ کا اختتام ''صبر'' ہی کے لفظ پر ہوا:

﴿وَالۡعَصۡرِ ۝۱ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۝۳﴾

آیۂ برکو دیکھئے‘ نیکی اور تقویٰ کا نقطۂ عروج (climax) وہاں کن الفاظ میں بیان ہوا: ﴿وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ﴾۔ اگلے سبق یعنی سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر نگاہ ڈالئے‘ آیت ۱۷ میں صبر کا ذکر موجود ہے: ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡهَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ﴾۔ سورۂ حٰم السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ پر توجہ کو مرکوز کیجئے‘ وہاں بھی صبر کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا: ﴿وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ ۝﴾ ان چاروں جامع اسباق میں جس بلند ترین اور آخری منزل کی نشان دہی کی گئی وہ صبر ہی ہے۔ ان چاروں مقامات میں صبر کا وہ پہلو زیادہ پیشِ نظر ہے جس سے انسان اس وقت دوچار ہوتا ہے جب وہ تواصی بالحق‘ دعوت الی اللہ اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کا فریضہ سرانجام دے رہا ہو۔ ظاہر بات ہے کہ حق کی بات کہنی ہے تو طبیعت میں سہار اور تحمل کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ''اَلۡحَقُّ مُرٌّ'' یعنی سچ کڑوا ہوتا ہے۔ سچائی عام طور پر قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ لہٰذا تکالیف آئیں گی‘ ان کو جھیلنے کے لئے صبر کا بھرپور مادہ ہونا چاہئے۔ پہلے سے تیار ہو جاؤ کہ یہ راستہ پُرخار ہے‘ اس

میں مخالفتوں کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں‘ یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے۔اس کے بارے میں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں ہم یہ پڑھ آئے ہیں: ﴿اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ کہ یہ کام بڑی ہمت کے متقاضی ہیں۔

اس کے بعد عمل صالح کی تفاصیل پر مشتمل جو حصّہ سوم ہمارے اس منتخب نصاب میں آیا وہاں سورۃ الفرقان میں لفظ صبر ایک دوسری شان کے ساتھ وارد ہوا تھا۔فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جن کو جنت کے بالا خانے عطا کئے جائیں گے اس صبر کے عوض جو انہوں نے کیا'' ...... یہاں لفظ صبر درحقیقت انسانی شخصیت اور اس کی سیرت و کردار کے ایک نہایت ہمہ گیر پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔مطلب یہ ہے کہ ایمان پر کاربند رہنا بھی ممکن نہیں جب تک کہ صبر نہ ہو‘عمل صالح کے بنیادی تقاضے بھی پورے نہیں ہو سکتے جب تک انسان میں صبر کا مادہ نہ ہو۔اپنے جذبات کو تھامنا بھی صبر ہی سے ممکن ہوتا ہے اور خواہشات کی لگامیں بھی صبر ہی کے ذریعے کھینچی جاسکتی ہیں۔سوۃ النازعات کی آیت: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝﴾ میں صبر ہی کا تو بیان ہے کہ خواہشات کو دبانا‘ شہوات کو لگام دینا اور مرغوباتِ نفس کے حصول کے لئے طبیعت میں جو طوفان بپا ہے اس کو روک کر رکھنا ہوگا‘ تبھی ایمان پر گامزن رہنا اور عملِ صالح کے ابتدائی تقاضے پورے کرنا ممکن ہوگا‘ تبھی اس راہ میں آگے قدم بڑھانے کا امکان ہوگا۔پھر جب احقاقِ حق اور ابطالِ باطل‘ یا بالفاظ دیگر اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین کی جدوجہد کا مرحلہ آتا ہے تو ظاہر بات ہے یہاں نمایاں ترین وصف صبر اور مصابرت ہی کا ہے۔

اسی مفہوم کی تائید سورۂ مؤمنون میں اس طرح سے ہوتی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کافروں سے جو دنیا میں حق کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے‘ یہ فرمائیں گے: ﴿اِنِّىْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ کہ یہ لوگ جن کا تم دنیا میں استہزاء اور تمسخر کرتے رہے‘ جن کی عملی جدوجہد میں تم رکاوٹ بنتے رہے‘ جنہیں کمزور دیکھ کر تم نے دبائے رکھا اور وہ کمالِ ہمت و بردباری سے صبر کا دامن تھامے رہے‘ دیکھو آج اس صبر کی بدولت مَیں انہیں کیسا عمدہ بدلہ دے رہا ہوں‘ کیا اعلیٰ مقامات انہیں حاصل ہو رہے ہیں!! حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں صبر کا ذکر اس طور سے کیا گیا ہے کہ سلوکِ قرآنی میں صبر بنیادی اور لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے اور صراطِ مستقیم کا ہر ہر مرحلہ صبر ہی کے ذریعے طے پاتا ہے۔اس پورے

عمل کی روحِ رواں‘اس کے جذبۂ محرکہ‘اوراس کی شرطِ ناگزیر کے طور پرصبر ہی کا ذکر ہوتا ہے۔اب آیئے اس پہلو سے جائزہ لیں کہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن مجید میں صبر کا ذکر کس طور سے آیا ہے!۔

نبی اکرم کو صبر کی تاکید وتلقین

قرآن حکیم کی ابتداءً نازل ہونے والی سورتوں میں ہرجگہ صبر کا لفظ فعل امر بصیغہ واحد وارد ہوا ہے اوراس کے مخاطب اوّلین خود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۔آپ پر جب وحی کا نزول شروع ہوا تو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے پہلے حکم کے ساتھ ہی صبر کی ہدایت بھی نازل ہوئی ۔ فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝﴾

دیکھئے آخری آیت میں صبر کا حکم موجود ہے ۔جس راہ پر آپ نے قدم رکھا ہے یہ اس کا لازمی تقاضا ہے ۔اب جھیلنا ہوگا‘ برداشت کرنا ہوگا‘تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوگا‘ مصائب‘ تکالیف اورآزمائشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا ۔ چنانچہ ابتدائی ہر وحی میں نمایاں طور پر لفظ صبر کہیں حکم کے انداز میں اور کہیں تلقین و ہدایت کے پیرائے میں آتا ہے ۔سورۂ قلم کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوتا ہے: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ کہ اے نبی !اپنے ربّ کے حکم کا انتظار کیجئے اوراس کے لئے صبر کی روش پر کاربند رہئے‘ خود کو تھامے رکھئے‘ روکے رکھئے اوراس مچھلی والے یعنی حضرت یونسؑ کے مانند نہ ہوجایئے جنہوں نے کچھ جلدی کی تھی ۔کہیں فرمایا جاتا ہے: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝﴾ کہ اپنے ربّ کے لئے صبر کیجئے‘اس کے حکم کا انتظار کیجئے اوران گناہوں میں ڈوبے ہوئے منکر لوگوں کی باتوں میں نہ آجایئے ۔کہیں صبر کی تلقین ان الفاظ میں کی جاتی ہے: ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا ۝﴾ پس صبر کیجئے خوبصورتی کے ساتھ!......ایک مجبوری کا صبر ہوتا ہے ۔مثلاً کسی نے آپ کو گالی دی اور آپ نے جواباً گالی دے دی اور دعویٰ یہ ہے کہ میں صبر کررہا ہوں! یہ صبر جمیل نہیں ہے ۔جھیلئے‘ برداشت کیجئے اورخوبصورتی کے ساتھ صبر کیجئے ۔کہیں حکم ہوتا ہے: ﴿فَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ صبر کیجئے اورصبر کے لئے آپ کا سہارا اللہ کی ذات ہے۔ اللہ سے قلبی تعلق اوراللہ پر توکل واعتماد یہی آپ کے لئے صبر کی اصل بنیادیں ہیں ۔ایک جگہ فرمایا:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ صبر کیجئے جیسے کہ ہمارے صاحبِ عزیمت رسول صبر

کرتے رہے ہیں۔ سورۃ العنکبوت میں حضرت نوحؑ کا ذکر ہے کہ ساڑھے نوسو برس تک دعوت دیتے رہے۔ مخالفت ہوئی' انکار و اعراض اور مسلسل تمسخر و استہزاء ہوا' لیکن وہ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے' ان کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی۔ یہ ہے قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں میں صبر کا حکم جو بتکرار و اعادہ نبی اکرم ﷺ کے لئے وارد ہوا۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ آنحضور ﷺ نے جب دعوت کا آغاز فرمایا تو سب سے پہلا ردِعمل جو اس معاشرے کی جانب سے ظاہر ہوا وہ تمسخر و استہزاء کی صورت میں تھا۔ اس میں کہیں کہیں ظاہری ہمدردی کا عنصر بھی شامل ہوتا تھا' کہ نہ معلوم بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا' اچھے بھلے آدمی تھے' ہمیں تو ان سے بڑی اچھی توقعات تھیں' بڑی اچھی اُمیدیں ان سے وابستہ تھیں' نہ معلوم کیا ہوا ہے۔ اسی طرح ''نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ '' اور ''نقلِ کفر کفر نہ باشد'' کوئی کہتا کہ خلل دماغی کا کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے' کوئی جنون کا عارضہ ہو گیا ہے یا کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ یہ باتیں استہزاءً بھی کہی گئیں اور تمسخر کے انداز میں بھی' ہمدردانہ بھی کہی گئیں اور تاسف کے ساتھ بھی۔ ان سب باتوں کے جواب میں نبی اکرم ﷺ کو صبر کرنے' جھیلنے اور برداشت کرنے کا حکم دیا گیا۔ انتیسویں پارے کی دوسری سورۃ ''ن'' جسے سورۃ القلم بھی کہتے ہیں' کی ابتدائی آیات کے پس منظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نبی اکرم ﷺ معاندین کے اس طرزِ عمل پر بہت ملول اور غمگین ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿١﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢﴾ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ﴿٣﴾ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿٤﴾ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ﴿٥﴾ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ﴿٦﴾﴾

''گواہ ہے قلم اور جو کچھ کہ یہ لکھتے ہیں۔ اے نبی! آپ (ﷺ) اپنے ربّ کی رحمت اور نعمت سے مجنون نہیں ہیں (آپ ملول و غمگین اور رنجیدہ نہ ہوں' آپ ان پاگلوں کے کہنے سے کہیں پاگل تھوڑا ہی ہو جائیں گے) اور یقیناً آپ کے لئے وہ اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہو گا اور آپ تو اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں (کیا دنیا نے ایسا پاگل اور ایسا مجنون کبھی دیکھا ہے جو خلق عظیم کا پیکر ہو' کردار اور شرافت میں کوئی اس کا ہمسر نہ ہو؟) یہ کوئی دن کی بات ہے کہ آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے (ساری دنیا دیکھ لے گی) کہ کس کا دماغ اُلٹ گیا تھا (کس کو دماغ کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ جلد ہی حقیقت سامنے آ جائے گی)''۔

سورۂ نون کا اختتام اس آیت پر ہو رہا ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے کہ: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ کہ اے نبیؐ جھیلئے' برداشت کیجئے' اپنے ربّ کے حکم کا انتظار کیجئے

کہ وہ کب فیصلہ سناتا ہے اور حضرت یونسؑ کی طرح کوئی عاجلانہ اقدام نہ کیجئے۔

ابتدا میں تو یہ تمسخر واستہزاء کسی درجے میں کچھ ہمدردانہ انداز کا تھا' لیکن جیسے جیسے بات آگے بڑھی تمسخر واستہزاء کا معاملہ سختی اور شدت کا روپ دھارتا چلا گیا۔ چنانچہ اس کی جھلک سورۂ مزمل کی اس آیت کے پس پردہ نظر آتی ہے: ﴿وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا ۝﴾ کہ اے نبی ! صبر کیجئے ان کڑوی باتوں پر جو یہ کہہ رہے ہیں اور ان سے قطع تعلق کر لیجئے' لیکن یہ قطع تعلقی ہجرِ جمیل ہو۔ اگلی آیت میں بھی یہی مضمون بیان ہوا: ﴿وَذَرۡنِیۡ وَالۡمُکَذِّبِیۡنَ اُولِی النَّعۡمَةِ وَمَهِّلۡهُمۡ قَلِیۡلًا ۝﴾ چھوڑ دیجئے مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو جو بڑے دولت مند ہیں' سرمایہ دار ہیں' صاحب اقتدار اور صاحب وجاہت لوگ ہیں' ہم ان سے نپٹ لیں گے۔ آپ اپنی توجہ کو اپنی دعوت وتبلیغ پر مرتکز رکھئے۔ آپ ان کی جانب التفات نہ فرمایئے' ان سے نپٹنے کے لئے ہم کافی ہیں۔ ﴿اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡکَالًا وَّجَحِیۡمًا ۝ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِیۡمًا ۝﴾ ہمارے پاس ان کے لئے عذاب کا پورا سامان مہیا ہے جو منہ کھولے ان کا منتظر ہے۔ یہ کہیں بچ نہ نکلیں گے۔ لیکن آپ ان سے چشم پوشی فرمایئے۔

ایک اور مقام پر بڑے خوبصورت انداز میں یہ بات بیان فرمائی: ﴿فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ﴾ کہ آپؐ ان منکروں سے اپنی توجہ کو ہٹا لیجئے' ان مخالفین کی جانب ملتفت ہی نہ ہوں' ان کے استہزاء کی طرف توجہ ہی نہ کیجئے' آپؐ لگے رہیے دعوت وتبلیغ اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں' انذار اور تبشیر میں۔ ﴿فَذَکِّرۡ ۟ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَکِّرٌ ؕ لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ﴾ (سورۃ الغاشیہ) آپؐ یاددہانی کراتے رہئے' آپؐ کا کام یاددہانی کرانا ہے' آپؐ ان پر نگران اور ان کے ذمہ دار نہیں ہیں' آپؐ سے یہ باز پُرس نہیں ہوگی کہ انہوں نے کیوں آپؐ کی دعوت پر لبیک نہ کہا!......سورۃ الاعلیٰ میں یہی بات ایک اور انداز سے آئی: ﴿فَذَکِّرۡ اِنۡ نَّفَعَتِ الذِّکۡرٰی ۝ سَیَذَّکَّرُ مَنۡ یَّخۡشٰی ۝﴾ کہ آپؐ تذکیر کرتے رہئے اگر وہ تذکیر مفید ہو' اس کے مفید نتائج ظاہر ہوں۔ جس کے دل میں کچھ بھی اللہ کا خوف ہے' کسی بھی درجے میں اسے اپنے خالق اور مالک اور اس کے حضور میں لوٹنے کا خیال ہے تو وہ اس سے نصیحت اخذ کر لے گا اور اس تذکیر سے فائدہ اٹھائے گا۔

صحابہ کرام کے لئے صبر کے مرحلے کا آغاز

بہر حال صبر کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کو سب سے پہلے تمسخر واستہزاء اور مذاق کے مقابلے

میں جمے رہنے‘ ڈٹے رہنے‘ جھیلنے‘ برداشت کرنے اور ثابت قدم رہنے کا حکم ہوا۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات جان لینی چاہئے کہ تقریباً تین برس تک نبی اکرم ﷺ کی دعوت اندر ہی اندر باہمی گفتگوؤں اور انفرادی رابطوں (personal contacts) تک محدود رہی۔ ابھی لوگوں کو خطرے کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ نبوت کے چوتھے برس لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ دعوت تو ایک بہت بڑے چیلنج کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ع ''نظامِ کہنہ کے پاسبانو‘ یہ معرضِ انقلاب میں ہے''۔ تب ان کے کان کھڑے ہوئے اور سوچنے لگے کہ آپؐ کا راستہ روکنا ہوگا‘ جسے ہم مشتِ غبار سمجھے تھے یہ تو ایک تیز و تند آندھی بن کر ہمارے اس پورے نظام‘ ہمارے مفادات اور اس پورے معاشرتی ڈھانچے اور vested interests کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر منتشر کر دے گی۔ یہیں سے وہ دَور شروع ہوا جسے سیرت کی کتابوں میں ''تَعْذِیْبُ الْمُسْلِمِیْنَ'' یعنی مسلمانوں کی ایذا رسانی اور بہیمانہ تشدد (Persecution) کا دَور کہا جاتا ہے۔ کفار کی طرف سے جب مسلمانوں پر شدید جسمانی تشدد کیا جانے لگا تو بعض مسلمانوں کو کچھ گھبراہٹ لاحق ہوئی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ عنکبوت میں بھرپور خطاب وارد ہوا۔ چنانچہ صبر و مصابرت کی بحث میں قرآن کا اوّلین مقام جو ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہے وہ سورۂ عنکبوت کے پہلے رکوع پر مشتمل ہے۔ اب اسی پر آئندہ گفتگو ہوگی۔ ان شاء اللہ!

اہل ایمان کے لئے
ابتلاء وامتحان سے گزرنا لازمی ہے!

سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:
اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿الٓـمّٓ ۚ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾ وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَلَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۳﴾ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّسۡبِقُوۡنَا ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۴﴾ مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ ؕ وَہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۵﴾ وَمَنۡ جَاہَدَ فَاِنَّمَا یُجَاہِدُ لِنَفۡسِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶﴾ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَلَنَجۡزِیَنَّہُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷﴾ وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ حُسۡنًا ؕ وَاِنۡ جَاہَدٰکَ لِتُشۡرِکَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡہُمَا ؕ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّہُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۹﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتۡنَۃَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰہِ ؕ وَلَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکَ لَیَقُوۡلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمۡ ؕ اَوَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِیۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰﴾ وَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَیَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ﴿۱۱﴾ وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوۡا سَبِیۡلَنَا وَلۡنَحۡمِلۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ وَمَا ہُمۡ بِحٰمِلِیۡنَ مِنۡ خَطٰیٰہُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وَلَیَحۡمِلُنَّ اَثۡقَالَہُمۡ وَاَثۡقَالًا مَّعَ اَثۡقَالِہِمۡ ۫ وَلَیُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ عَمَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۳﴾﴾ ...... صدق اللہ العظیم

ان آیات مبارکہ کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''الٓمّٓ' کیا لوگوں نے یہ خیال کیا تھا کہ وہ محض یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا۔ درآنحالیکہ ہم نے آزمایا ہے اُن کو جو اِن سے پہلے تھے' پس اللہ ضرور ظاہر کرے گا سچے ایمان والوں کو اور انہیں بھی ظاہر کردے گا جو (اپنے دعوائے ایمان میں) جھوٹے ہیں۔ کیا برے عمل کرنے والوں کا یہ گمان ہے کہ وہ ہماری گرفت سے بچ نکلیں گے؟ بہت ہی بری رائے ہے جو انہوں نے قائم کی ہے۔ جو کوئی بھی اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہے اسے جان لینا چاہئے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت آ کر رہے گا اور وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور جو کوئی جہاد کرتا ہے تو وہ اپنی جان (کی بھلائی) کے لئے ہی جہاد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ہم لازماً دور کر دیں گے ان سے ان کی برائیاں اور ہم لازماً انہیں ان کے اعمال کی بہترین جزا دیں گے۔ اور ہم نے انسان کو وصیت کی والدین سے بھلائی اور حسن سلوک کی۔ (لیکن) اگر وہ تجھ سے جھگڑیں (اور مجبور کریں) کہ تُو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لئے تیرے پاس کوئی علم نہیں ہے تو ان کا کہا مت مان۔ میری ہی طرف تم سب کو لوٹنا ہے' پھر میں تمہیں جتلا دوں گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ہم ضرور داخل کریں گے انہیں صالحین میں۔ اور لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے لیکن اللہ کی راہ میں جب انہیں تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی طرف سے ڈالی ہوئی اس آزمائش سے یوں گھبرا اٹھتے ہیں جیسے اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہئے۔ اور اگر آ جائے مدد تیرے ربّ کی طرف سے تو وہ لازماً یہ کہیں گے کہ ہم بھی تمہارے ہی ساتھ تھے۔ تو کیا اللہ نہیں جانتا جو کچھ لوگوں کے سینوں میں چھپا ہے۔ اور اللہ تو لازماً ظاہر کردے گا ان کو جو واقعتاً مؤمن ہیں اور واضح کردے گا ان کو کہ جو حقیقتاً منافق ہیں۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ کہتے ہیں ایمان والوں سے کہ ہماری پیروی کرتے رہو اور ہم تمہاری خطاؤں کا بوجھ اٹھا لیں گے۔ حالانکہ وہ نہیں ہیں اٹھانے والے ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی۔ یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔ اور وہ لازماً اٹھائیں گے اپنے بوجھ بھی اور اپنے ان بوجھوں کے ساتھ کچھ مزید بوجھ بھی۔ اور ان سے لازماً بازپرس ہوگی قیامت کے دن اس جھوٹ کے بارے میں جو وہ باندھ رہے تھے۔''

یہ ہے ان آیات مبارکہ کا ترجمہ۔ ابتداء سے محسوس ہو رہا ہے کہ اندازِ کلام کچھ تیکھا ہے۔ اس کے

پس منظر کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ ایک حدیث اس کی بڑی صحیح وضاحت کرتی ہے۔

پس منظر

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا' مکی دور کے ابتدائی تین چار سال ایسے تھے کہ جن میں سردارانِ قریش' جنہیں قرآن حکیم نے ''ائمہ کفر'' قرار دیا ہے' اس خیال میں رہے کہ ع ''چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی'' اور یہ کہ ہمارے اس نظام باطل کو کوئی حقیقی خطرہ درپیش نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس دعوت کو چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کی' اس کے استہزاء اور تمسخر کا معاملہ کیا' لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ بات آگے بڑھ رہی ہے' ہمارے نوجوان اس دعوت کو قبول کر رہے ہیں' ہمارے غلاموں کے طبقے میں اس دعوت کا نفوذ ہو رہا ہے' تب وہ چونکے کہ ع ''نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!'' ان حالات میں جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے وہ اپنی پوری قوتِ مدافعت کو مجتمع کر کے حملہ آور ہوئے۔ اس حملے نے تشدد اور تعذیب (persecution) کی شکل اختیار کی۔ دو طبقات اس تشدد کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ ایک غلاموں کا طبقہ' جن کا نہ تو کوئی پرسانِ حال ہی تھا اور نہ ہی ان کے کوئی حقوق تھے' وہ تو اپنے آقاؤں کی ایسی ملکیت تھے جیسے بھیڑ اور بکری' کہ جب چاہا اسے ذبح کر دیا اور جو چاہا ان کے ساتھ سلوک کیا۔ لہٰذا اس بہیمانہ تشدد کا سب سے زیادہ شکار وہی لوگ ہوئے جو غلاموں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ۔ اسی طرح آلِ یاسر جو اگرچہ غلام نہیں تھے لیکن باہر سے آ کر شہر میں آباد ہونے کی وجہ سے اجنبی تھے' کوئی ان کا پشت پناہ' حامی اور مددگار نہ تھا۔ اس لئے ابوجہل نے انہیں بدترین تشدد اور اپنے بہیمانہ انتقامی جذبات کا ہدف بنایا۔ چشمِ تصور سے دیکھئے اُمیہ بن خلف حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تپتی ہوئی پتھریلی زمین پر اوندھے منہ لٹا کر گھسیٹ رہا ہے' جبکہ سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو اور آگ اگل رہا ہو۔ پھر ان کے سینے پر ایک بھاری سل بھی رکھ دی جاتی تھی۔ یہ تھا وہ اذیت ناک سلوک جوان غلاموں اور بے یار و مددگار لوگوں کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ پر تشدد کی جو حدیں توڑی گئیں اس کی ایک مثال اس واقعہ میں دیکھئے کہ ایک مرتبہ آگ جلائی گئی' دہکتے ہوئے انگارے زمین پر بچھا دیئے گئے اور حضرت خبابؓ کو ننگی پیٹھ ان انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ کمر کی کھال جلی' چربی پگھلی اور اس سے بتدریج وہ انگارے سرد ہوئے!! تشدد کا یہ سلسلہ مسلسل تین چار سال تک اپنے پورے نقطۂ عروج پر رہا۔

اس دور کا ایک واقعہ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ سناتے ہیں کہ جب یہ مصائب ہمارے لئے نا قابل برداشت ہو گئے تو ایک روز ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ اُس وقت کعبے کے سائے میں اپنی چادر کا ایک تکیہ سا بنائے ہوئے استراحت فرما رہے تھے۔ ہم نے جا کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی مدد کب آئے گی (اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہونے کو ہے اور برداشت کی انتہا ہو گئی ہے)۔ حضرت خبابؓ فرماتے ہیں اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر قدرے ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے اور آپؐ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! تم سے پہلے لوگ اللہ کی راہ میں مصائب اور شدائد میں یہاں تک مبتلا کئے گئے کہ توحید کا علَم تھامنے کی پاداش میں ان میں سے کسی کو گڑھا کھود کر آدھے دھڑ تک گاڑ دیا جاتا اور پھر ایک آرا اس کے سر پر رکھ کر اسے چیرنا شروع کرتے یہاں تک کہ اس کا پورا جسم دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا لیکن پھر بھی وہ لوگ توحید پر کاربند رہتے اور راہِ حق سے ہٹنے کا نام تک نہ لیتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوہے کی کنگھیوں سے لوگوں کے جسموں کو اس طرح مجروح کیا گیا کہ ان کی ہڈیوں پر سے گوشت کھرچ ڈالے گئے اور ایسا بھی ہوا کہ آگ کے الاؤ جلائے گئے اور ان میں زندہ انسانوں کو جھونک دیا گیا۔ تم پر تو ایسی کوئی مصیبت نہیں پڑی (تم لوگ جلدی مچا رہے ہو)۔ وہ وقت آ کر رہے گا کہ ایک سوار صنعا سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اسے سوائے اللہ کے اور کسی کا خوف نہ ہوگا''۔

کسی قدر خفگی کا یہ انداز جو اس حدیث مبارکہ سے سامنے آتا ہے' وہی اسلوب یہاں سورۃ العنکبوت کی ابتداء میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ گویا ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

تم نے اسے پھولوں کی سیج سمجھا تھا حالانکہ یہ وہ راستہ ہے جس میں آزمائشوں کی خاردار جھاڑیاں قدم قدم پر موجود ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں اللہ کی جانب سے اظہارِ خفگی یقیناً موجود ہے تاہم یہ بات ذہن میں رکھئے کہ جیسے کسی استاد یا مربی کا اپنے زیر تربیت تلامذہ کے ساتھ ہمیشہ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ ڈانٹتا ہے تو کبھی دلجوئی بھی کرتا ہے' اور کبھی ہمت بڑھانے کے لئے شاباش بھی دی جاتی ہے اور کبھی زیر تربیت شخص کی طرف سے ذرا کم ہمتی کا مظاہرہ ہو یا اس سے کسی کمزوری یا تقصیر کا صدور ہو رہا ہو تو پھر زجر و توبیخ بھی ہوتی ہے' ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لینا پڑتا ہے' اسی طرح اللہ جو سب کا حقیقی

مربی ہے‘ وہ اپنے بندوں کے حق میں یہ دونوں صورتیں استعمال کرتا ہے۔لیکن اس ڈانٹ میں بھی ایک شفقت ہوتی ہے‘ وہ محبت سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ عتاب درحقیقت محبت آمیز ہوتا ہے۔تربیت کے عمل میں یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔تربیت کا یہی اسلوب سورۂ عنکبوت کے اس پہلے رکوع میں بہت نمایاں ہے۔

آیات کی تشریح

اس رکوع کی پہلی آیت جو سورۂ عنکبوت کی بھی پہلی آیت ہے‘ حروفِ مقطعات پر مشتمل ہے۔ان کا مفہوم و معنی کیا ہے؟ ہمارے اس منتخب نصاب میں چونکہ حروفِ مقطعات کا ذکر پہلی بار آ رہا ہے لہٰذا ان کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔تاہم یہاں صرف اسی قدر سمجھ لیجیے کہ ان کے حتمی اور یقینی معنی کوئی نہیں جانتا۔ یہ ایک راز ہے‘ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مابین۔ کہنے والوں نے بہت کچھ کہا ہے‘ ان کے مفہوم کی تعیین میں عقل و خرد کے گھوڑے دوڑائے گئے ہیں‘ ظن و تخمین سے بھی بہت سی باتیں کہی گئیں لیکن حق بات یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ہی ان کی اصل مراد سے واقف ہیں۔

اگلی آیت پر نظر کیجیے: ﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا……﴾ کہ کیا لوگوں نے یہ گمان کیا تھا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے‘ انہیں چھٹکارا مل جائے گا‘ جہنم سے نجات حاصل ہو جائے گی اور جنت میں داخلہ ہو جائے گا‘ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے۔ یہاں یہ بات نوٹ کیجیے کہ مسلمانوں سے براہِ راست خطاب کی بجائے صیغہ غائب میں ان سے گفتگو ہو رہی ہے۔یوں نہیں فرمایا کہ ’’اے مسلمانو! کیا تم نے یہ سمجھا تھا……‘‘ بلکہ فرمایا ’’کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا……‘‘ یہ اجنبیت اور غیریت کا انداز ہے جو درحقیقت خفگی اور ناراضگی کو واضح کرنے کے لئے بڑا ہی لطیف پیرایہ ہے۔

ذرا اس پس منظر میں اپنا جائزہ لیجیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں! آج کے مسلمان کی سوچ کیا ہے؟ انہوں نے تو پھر بھی دعوتِ ایمان کو شعوری طور پر قبول کیا تھا۔اگر ’’اٰمَنَّا‘‘ کہا تھا تو اپنے کچھ آبائی عقائد کو چھوڑ کر کہا تھا‘ ایک انقلابی قدم اٹھایا تھا۔گویا ایک طرح کا مجاہدہ اور ایثار کیا تھا اور ایک ہم ہیں کہ بس ایک متوارث مذہبی عقیدے کی بنیاد پر مسلمان ہیں‘ عمل کا خانہ بالکل خالی ہے‘ یقین قلبی کی دولت سے محروم اور عملی اعتبار سے دین و مذہب سے کوسوں دور‘ لیکن سمجھے یہ بیٹھے ہیں کہ ہم تو بخشے بخشائے ہیں‘ جنت ہمارا پیدائشی حق ہے‘ فوز و فلاح تو ہمیں ہی ملنی ہے۔اس پس منظر میں ذرا اس آیۂ مبارکہ کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے!

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَھُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴾

''کیا لوگوں نے یہ گمان کیا تھا کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے محض یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا!''

کیا ان کی جانچ پرکھ نہیں ہوگی' انہیں ٹھوک بجا کر نہیں دیکھا جائے گا کہ کتنے پانی میں ہیں' کیا واقعی ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں ہو چکا ہے یا یہ صرف مُنہ کا پھاگ ہے جو کھیلا جا رہا ہے؟ فتنے کا لفظ اس سے پہلے سورۃ تغابن میں بھی آ چکا ہے: ﴿اِنَّمَا اَمۡوَالُکُمۡ وَاَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ﴾ فتنہ عربی میں کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر گھس کر کھرے اور کھوٹے کی پہچان کی جاتی ہے' جس پر سونے کو رگڑ کر یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ زرِ خالص ہے یا اس میں کھوٹ شامل ہے' اور اگر کھوٹ شامل ہے تو کتنا ہے۔ اللہ کی راہ میں یہ مشکلات و مصائب' یہ تکالیف و آلام' یہ ایذائیں اور یہ قربانیاں' یہ سب درحقیقت کسوٹی کے درجے میں ہیں جن پر تمہیں پرکھا جا رہا ہے۔ یہ تمہارے ایمان کا ٹیسٹ ہے' یہ سب تمہارے ایمان کی صداقت کا ثبوت فراہم کرنے کا ذریعہ ہیں!!

اللہ کی مستقل سنّت

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ ﴾ کہ ہماری تو یہ سنت ثابتہ ہے' ہمارا تو یہ مستقل طریقہ اور قاعدہ رہا ہے کہ جس نے بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہم نے اسے جانچا اور پرکھا' اسے امتحانات اور آزمائشوں سے دوچار کیا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ اس طرح ہم نے کھرے کو کھوٹے سے ممیز کیا اور سچے کو جھوٹے سے ممتاز کر دکھایا۔ ﴿ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَلَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴾ لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا ''اللہ ان کو جان کر رہے گا جو سچے ہیں اور ان کو بھی جان کر رہے گا جو جھوٹے ہیں۔'' لیکن چونکہ علمِ الٰہی قدیم ہے' اللہ کو کسی چیز کے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' وہ علم ازخود اور وقوع سے پہلے اسے حاصل ہے لہٰذا یہاں اس سے مراد ہوگی کہ اللہ ظاہر کر دے گا' کھول دے گا' اصل حقیقت کو بے نقاب کر دے گا۔ یہاں نوٹ کیجئے کہ الفاظ ایسے لائے گئے ہیں کہ عربی زبان میں تاکید کے لئے اس سے اوپر اور کوئی اسلوب نہیں ہے۔ فعل مضارع سے قبل لام مفتوح اور اس کے آخر میں نون مشدد۔ ''لَیَعۡلَمَنَّ'' یہ گویا تاکید کا آخری اور انتہائی انداز ہے جو عربی زبان میں مستعمل ہے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ ضرور واضح کرے گا' لازماً کھول کر رکھ دے گا کہ کون لوگ سچے ہیں اور کون جھوٹ موٹ کا دعوائے ایمان کر رہے ہیں۔ یہاں لفظ ''صَدَقُوۡا'' کو بھی خاص طور پر نوٹ کیجئے۔ آیۂ بر بھی اسی پر ختم ہوئی تھی:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ اسی طرح سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کا اختتام بھی اسی لفظ پر ہوا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾ گویا صادق القول اور مخلص مسلمانوں کو جھوٹے اور دغاباز مدعیانِ ایمان سے ممیّز و ممتاز کرنا درحقیقت آزمائش کا اصل مقصود ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴

یہ مضمون قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر آیا ہے اور اسی شان اور اسی گھن گرج کے ساتھ آیا ہے۔ اسی طرح کان کھول کر سنایا گیا ہے کہ ابتلاء اور آزمائش تو لازماً آئے گی۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴ میں فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝﴾

''اے مسلمانو! کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ جنت میں (آسانی سے) داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات وارد ہی نہیں ہوئے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے۔ (حضرت خبابؓ بن الارت کے حوالے سے جو حدیث ابھی بیان ہوئی تھی' یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل اسی آیۂ مبارکہ کی ترجمانی ہے کہ وہ کٹھن مراحل اور بڑے بڑے امتحانات تو ابھی اس راہ میں تمہیں درپیش ہی نہیں ہوئے۔) ان پر فقر و فاقے کی سختیاں آئیں' اور بہت سی جسمانی تکالیف انہیں جھیلنی پڑیں اور وہ ہلا ڈالے گئے (جھنجھوڑ دیے گئے)' یہاں تک کہ پکار اٹھے (چیخ اٹھے) وقت کے رسول اور ان کے ساتھی اہل ایمان کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انہیں بتایا گیا کہ) آگاہ رہو! اللہ کی مدد قریب ہے۔''

یہ ہے امتحان و آزمائش کی وہ کسوٹی جس کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

ایمان کی اس راہ میں قدم رکھو تو ذہنی طور پر تیار ہو کر آؤ کہ آزمائشوں اور امتحانات سے گزرنا ہو گا۔ تکالیف اور مصائب تو اس راہ کے سنگ میل ہیں اور یہ سب چیزیں اہل ایمان کو جانچنے اور مزید نکھارنے کا ذریعہ ہیں۔ بادِ مخالف کی تندی سے گھبرا اٹھنے کی بجائے اسے خوش آمدید کہنا چاہئے کہ ع یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے۔

سورۂ آل عمران اور سورۂ توبہ کی آیات

یہی مضمون سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں وارد ہوا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۝﴾ (آل عمران:١٤٢)

''کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر ہی نہیں کیا (جانچا ہی نہیں) کہ کون ہیں تم میں سے وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کون ہیں جو صبر کا دامن تھامے رہتے ہیں۔''

سورۃ الحج کے الفاظ ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ ذہن میں لایئے۔''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے''۔اور اسی میں اہل ایمان کے ایمان کی آزمائش مضمر ہے کہ کون ہیں جو اس کے نام پر اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کرنے کو حقیقی کامیابی سمجھتے ہیں جیسے کہ ایک صحابی نے شہید ہوتے وقت کہا تھا: فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ ''ربِّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا''۔سورۂ توبہ میں اس مضمون کو دیکھئے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝﴾ (التوبة:١٦)

''کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی تو یہ دیکھا ہی نہیں کہ کون ہیں تم میں سے وہ لوگ کہ جو جہاد کا حق ادا کرتے ہیں اور جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول اور سچے مؤمنوں کے سوا کسی اور کو اپنا بھیدی نہیں بنایا (جو اللہ اور اس کے رسول کے لئے تمام دُنیوی تعلقات پر خطِ تنسیخ پھیر سکتے ہیں) اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔''

تو بالکل اسی انداز سے سورۂ عنکبوت شروع ہوئی:

﴿ الٓمّٓ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۝ ﴾

ابتلاء وآزمائش کی حکمت

اللہ کی راہ میں ابتلاء وآزمائش کی سب سے پہلی حکمت یہاں واضح کر دی گئی ہے کہ کسی بھی

انقلابی جدوجہد کے لئے جو اس اہم کام کے لئے کھڑی ہو رہی ہو' یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تطہیر ہوتی رہے' وقتاً فوقتاً چھانٹی ہوتی رہے۔ صرف مذہبی سطح پر انسانوں کی بھیڑ جمع ہو تو وہاں چھانٹی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اگر نصب العین انقلابی ہو' اقامت دین کی جدوجہد درپیش ہو' کسی غلط نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر نظامِ حق کو برپا کرنا اور غالب و نافذ کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے جس قسم کی جماعت درکار ہوگی اس میں چھانٹی کا عمل ضروری ہوگا تا کہ کچے اور ناپختہ لوگ جھڑتے چلے جائیں اور صرف پختہ کار سرفروش' کہ جو دین کی راہ میں تن من دھن نثار کرنے والے ہوں' اس جماعت کی ریڑھ کی ہڈی بن سکیں۔ اسی تطہیر کے عمل سے معلوم ہوگا کہ کون کتنے پانی میں ہے' کون واقعتاً اللہ کو ماننے والا اور آخرت کا یقین رکھنے والا ہے' کون واقعتاً اللہ اور اس کے رسول کو ہر معاملے میں مقدم رکھنے والا ہے' کون ہے جو اس ترازو پر پورا اتل رہا ہے جو سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ کے حوالے سے آئی تھی کہ ''اے نبی! لوگوں سے کہہ دیجئے: اگر تمہیں اپنے باپ اور اپنے بھائی اور اپنے بیٹے اور اپنی بیویاں اور اپنے رشتہ دار اور اپنے وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں اور اپنے وہ کاروبار جو بڑی محنت سے جمائے ہیں اور جن میں اب مندے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور اپنے وہ مکان جو تمہیں بہت محبوب ہیں' اگر یہ سب محبوب تر ہیں اللہ سے اور اللہ کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد سے تو جاؤ' انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے' اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

یہ چھانٹی' یہ تمییز اور یہ تطہیر کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے' یہی اصل غرض و غایت ہے ان ابتلاؤں اور آزمائشوں کی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ مختارِ مطلق ہے' اس کے اذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کرتا' ابوجہل کی کیا مجال کہ وہ آلِ یاسرؓ کو ستا سکے! اُمیہ بن خلف کی کیا جرأت کہ وہ اللہ کے ایک سچے پرستار' ایک مؤحد بندے بلالؓ کو اس طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر سکے!!...... یہ جو کچھ ہوا اذنِ ربّ سے ہوا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ ان کٹھالیوں میں سے گزار کر تمہیں زرِ خالص بنانا چاہتا ہے۔ تمہاری تربیت' تمہاری پختگی' تمہارے ایمان کا ثبوت' تمہارے اندر عزم اور ہمت اور ولولے کو اوجِ کمال تک پہنچانا یہ وہ غرض اور مقصد ہے جس کے تحت یہ مصیبتیں' ایذائیں' تکالیف' ابتلائیں اور آزمائشیں اہلِ ایمان کو درپیش ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ راہِ حق میں استقامت عطا فرمائے۔

مسلمانوں کے لئے تسلّی و تشفی کے کلمات

ان دو آیات میں اس گھبراہٹ پر کہ جو بعض مسلمانوں کی طرف سے اللہ کی راہ میں ایذاؤں'

تکلیفوں اور مصیبتوں کے ضمن میں ظاہر ہوئی تھی' اللہ کی جانب سے کسی قدر خفگی کا اظہار نمایاں تھا۔لیکن اب اگلی آیت میں ان کی تسلّی' دلجوئی اور تشفی کے ضمن میں ان کفار ومشرکین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوانہیں ستا رہے تھے اور جن کے ہاتھوں انہیں ایذائیں پہنچ رہی تھیں' فرمایا جا رہا ہے کہ کیا ان بدبختوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے! ابوجہل نے جو حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو برچھا مار کر شہید کیا اور اس نے حضرت یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو اس طور سے شہید کیا کہ چار مضبوط وتوانا سانڈ اونٹ لے کر' ان چاروں سے رسے باندھ کر' ان میں سے ایک رسے سے حضرت یاسرؓ کا ایک بازو' دوسرے سے دوسرا بازو' تیسرے سے آپؓ کی ایک ٹانگ اور چوتھے سے دوسری ٹانگ باندھی گئی اور پھر ان چاروں اونٹوں کو جو دوڑایا گیا تو حضرت یاسرؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے' اُمیہ بن خلف جو حضرت بلالؓ کو ستا رہا تھا اور حضرت خبابؓ بن ارت کو جو ایذائیں دی جا رہی تھیں' یہ آیۂ مبارکہ ان کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔فرمایا:

﴿اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّسۡبِقُوۡنَا ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ۝﴾

''کیا ان لوگوں نے جو اِن برائیوں میں مبتلا ہیں (کہ ہمارے چاہنے والوں کو ستا رہے ہیں) یہ گمان کیا ہے کہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے؟ بڑی بری رائے ہے جو وہ قائم کرتے ہیں۔''

اس میں دراصل کفار ومشرکین سے تخاطب نہیں ہے۔ بات ان سے کہنی مقصود ہی نہیں ہے' بلکہ درحقیقت یہ مسلمانوں کو سنایا جا رہا ہے اور اس طرح ان کے زخمی دلوں پر گویا ہمدردی کا پھاہا رکھا جا رہا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ تمہیں ایذائیں دینے والے یہ مشرکین ہماری گرفت سے بچ نکلیں گے' یہ تو ہماری حکمت کے تحت ہے کہ ہم نے ان مشرکین کی رسی دراز کی ہوئی ہے۔اس ذریعے سے دراصل تمہاری آزمائش مقصود ہے۔تمہیں ان آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزار کر کندن بنانا ہے۔اسی لئے ابھی ہم نے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔لیکن اگر وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے تو وہ بڑے مغالطے میں ہیں۔تم مطمئن رہو' ان میں سے ہر ایک کو اپنے کئے کی بھرپور سزا مل کر رہے گی۔اگلی آیت میں مزید تسلّی اور دلجوئی کے لئے فرمایا:

﴿مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ﴾

کہ جو کوئی اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہے تو وہ جان لے کہ اللہ کا معین کردہ وہ وقت آ کر رہے گا۔ اشارہ اہل ایمان کی طرف ہے کہ تم یہ سب تکالیف جھیل رہے ہو اللہ سے ملاقات کی اُمید میں' اس اُمید

میں کہ ایک دن آئے گا کہ اپنے پروردگار سے کہ جو تمہارا مطلوب ومقصود ہے اور جس کی خاطر تم یہ تکالیف اٹھا رہے ہو' تمہاری ملاقات ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہارے دل میں یہ وسوسہ پیدا کر دے کہ کیا خبر وہ دن آئے گا بھی کہ نہیں!...... مطمئن رہو' اللہ کا وہ مقرر کیا ہوا وقت آ کر رہے گا۔ وہ گھڑی اٹل اور شدنی ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ کسی وسوسے کو ذہن کے قریب مت پھٹکنے دو' تمہارا اجر محفوظ ہے۔ اور جان لو ﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ کہ جس کے لئے تم یہ سب کچھ جھیل رہے ہو وہ کوئی بے خبر ہستی نہیں ہے' وہ معاملہ نہیں ہے کہ مر گئے ہم انہیں خبر نہ ہوئی' وہ سمیع (سب کچھ سننے والا) اور علیم (سب کچھ جاننے والا) ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نگاہوں میں ہے۔ بلالؓ کی زبان سے نکلنے والا کلمۂ توحید' اس حال میں کہ پیاس کی شدت سے زبان باہر نکلی ہوئی ہے' دھوپ کی تمازت کی وجہ سے جان لبوں پر آئی ہوئی ہے' لیکن کلمۂ توحید ہی نکل رہا ہے اَحد' اَحد' کہ میں تو ایک اللہ ہی کا ماننے والا ہوں' اسی کا پرستار ہوں' اس کے سوا کسی اور کو معبود ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی زبان سے نکلنے والا یہ کلمہ اللہ سن رہا ہے۔ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ تمہارے دلوں سے جو صدائیں نکل رہی ہیں ان کا بھی جاننے والا ہے۔ تو پہلی دو آیات میں کسی قدر زجر' جھڑکی اور خفگی کا اظہار تھا اور اس کے بعد دو ہی آیات میں صحابہ کرامؓ کے لئے تسلّی' تشفی اور دلجوئی کا انداز اختیار کیا گیا۔

جہاد' اللہ پر احسان نہیں ہے!

اگلی آیت میں سختی کا رنگ پھر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ کان کھول دینے کے انداز میں فرمایا:

﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ﴾

کہ کوئی جہاد کرتا ہے تو وہ جان لے کہ وہ اپنے ہی بھلے کو جہاد کرتا ہے۔ یہ خیال ہرگز دل میں نہ آئے کہ وہ اللہ پر کوئی احسان کر رہا ہے' اس جدوجہد اور ایثار وقربانی کا تمام تر فائدہ خود اسی کو پہنچے گا۔

یہاں ''جہاد'' کا لفظ خصوصی طور پر توجہ کے لائق ہے۔ اس لئے کہ یہ سورت بالاتفاق مکّی ہے اور اس کا زمانۂ نزول سن پانچ یا چھ نبوی بنتا ہے۔ ہجرتِ حبشہ کے موقع پر یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی' بلکہ ہجرت کی طرف اشارہ اور رہنمائی اسی سورۃ میں موجود ہے۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کا ذکر نہایت اہتمام کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ﴾ حالانکہ قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ تو ابھی آٹھ نو برس کے بعد آنے والا تھا۔ یہ کشمکش اور یہ جدوجہد اس وقت Passive Resistance (صبرِ محض) کے دور میں تھی۔ مسلمانوں کو حکم تھا کہ ڈٹے رہو' قائم رہو' ماریں کھاؤ

لیکن مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے باوجود اس صورت حال کو جہاد کا نام دیا گیا۔ یہ جدوجہد اور یہ Struggle ہے اپنے مسلک اور اپنے ایمان کے لئے' اپنے عقائد اور اپنے نظریات کے لئے۔ ثابت کردو کہ تم ثابت قدم ہو اور اس کے لئے ہر شے کو قربان کر سکتے ہو' ہر بازی کھیل سکتے ہو' لیکن کبھی بھولے سے بھی دل میں یہ خیال نہ آئے کہ تم اللہ پر' اس کے دین پر یا اس کے نبی ﷺ پر کوئی احسان کر رہے ہو۔ اللہ تو بے نیاز ہے' اللہ کو کوئی احتیاج نہیں' وہ غنی ہے تمام جہانوں سے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ تمہارے اس جہاد و مجاہدہ' صبر و مصابرت اور ایثار و قربانی کا سارا نفع تمہی کو پہنچنے والا ہے ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ﴾۔ چنانچہ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ تمہاری سیرت پختہ ہوگی' تمہارا کردار کندن بنے گا بلکہ تمہارے ایمان و عمل کو جلا حاصل ہوگی' آخرت میں تمہیں اس کی بدولت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ اور جنت کی نعمتیں نصیب ہوں گی۔ لہٰذا اللہ کی راہ میں جہاد و مجاہدہ اس خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے کرو کہ یہ میں اپنا کام کر رہا ہوں' اللہ پر اور اس کے نبی ﷺ پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ یہ مضمون یہاں بڑے تیکھے انداز میں آیا ہے: ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۞﴾ کہ جو کوئی جہاد کرتا ہے' دین کی راہ میں سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے' وہ اپنے ہی فائدے کے لئے یہ سب کچھ کرتا ہے' اللہ کو کسی کی کوئی احتیاج نہیں ہے' وہ تمام جہانوں سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اسی مضمون کا دوسرا رخ اس سے قبل سورۃ الحجرات میں ہمارے زیرِ مطالعہ آیا تھا:

﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞﴾

''(اے نبیؐ) یہ آپ پر احسان دھر رہے ہیں اپنے اسلام کا۔ فرما دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا کوئی احسان نہ دھرو' بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ سجھائی اگر تم سچے ہو!''

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

کہ بادشاہ کی خدمت کا تمہیں اگر کوئی موقع ملا ہے تو یہ نہ سمجھو کہ اس پر تمہارا کوئی احسان ہے بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے بھی اللہ نے اپنے دین کی خدمت کی توفیق دی ہے اسے اللہ کا احسان مند ہونا چاہئے کہ اس نے اسے اپنی خدمت کے

لئے قبول فرمالیا ہے۔

اطمینانِ قلب کے لئے ایک عظیم بشارت

اگلی آیت میں ایک بار پھر ہمت بندھانے کا انداز ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کی تسلی، تشفی اور قلبی اطمینان کے لئے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ان سے ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ ہم لازماً ان سے ان کی برائیوں کو دور کر دیں گے اور ہم لازماً ان کے اعمال کا بہترین بدلہ انہیں عطا کریں گے۔

نوٹ فرمالیجئے کہ یہاں ایمان کے ساتھ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" اسی طرح جڑا ہوا آ رہا ہے جیسے کہ ہمارے پہلے سبق یعنی سورۃ العصر میں تھا: ﴿وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ...... اگر ایمان ہے اور عمل صالح نہیں ہے، بلکہ ایمان کا بھی صرف اقرار باللسان والا پہلو ہو یعنی صرف قانونی ایمان موجود ہو تو اس کا فائدہ بس اتنا ہی ہوگا کہ دنیا میں مسلمان سمجھ لئے جاؤ گے لیکن اللہ کے ہاں کسی کا واقعتاً مؤمن قرار پانا کچھ اور شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ ہاں وہ ایمان اگر یقین بن کر دل میں جاگزیں ہو گیا ہو اور اس کے عملی تقاضے انسان پورے کر رہا ہو تب اللہ کا پختہ وعدہ ہے کہ: ﴿لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ انتہائی تاکیدی انداز ہے کہ ایسے لوگوں سے ہم ان کی برائیوں کو لازماً دور کر دیں گے اور ان کی محنت و کاوش کا بھرپور صلہ انہیں عطا فرمائیں گے۔

یہ مضمون تقریباً انہی الفاظ میں سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی آیات میں بھی آ چکا ہے:

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ج﴾

"پس وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور وہ اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور انہیں میری راہ میں تکالیف پہنچائی گئیں اور انہوں نے قتال کیا اور جان قربان کر دی، میں لازماً دور کر دوں گا ان سے ان کی برائیوں کو۔ (ان کے نامۂ اعمال کے دھبے بھی دھو دوں گا اور ان کے دامن کردار

کے داغ بھی صاف کر دوں گا) اور میں انہیں لازماً داخل کروں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔''

نوجوانوں کا خصوصی معاملہ

مکّہ میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے والوں پر جو بدترین تشدّد ہو رہا تھا اس کا اوّلین نشانہ تو وہ لوگ بنے جو غلاموں کے طبقے سے ایمان لائے تھے لیکن اس تشدّد کا دوسرا بڑا شکار نوجوان تھے۔ یہ بات یہاں سمجھ لینی چاہئے کہ ہر دور میں کسی بھی انقلابی دعوت کی طرف پیش قدمی کرنے والوں میں معاشرے کے یہی دو طبقے آگے بڑھتے ہیں۔ یا تو معاشرے کے مظلوم اور پسے ہوئے طبقات کسی انقلابی دعوت کو لپک کر قبول کرتے ہیں اور یا پھر نوجوان اس میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ اسلام کی دعوت اپنی اصل کے اعتبار سے' اپنی نوعیت کے اعتبار سے انقلابی دعوت ہے۔ اسلام کی دعوت' عام مذہبی معنی میں تبلیغ کا عمل نہیں ہے۔ یہ بدھ مت کے بھکشوؤں یا عیسائی مشنریوں کی طرح کی تبلیغ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے جس کی پشت پر ایک مضبوط نظریہ ہے۔ اس نظریئے کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کرنا ہے' نظام تبدیل کرنا ہے' اللہ کے دین کو سربلند کرنا ہے' اس کی کبریائی کو نافذ و قائم کرنا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' ایک نہایت گھمبیر انقلابی جدوجہد ہمیں نبی اکرم ﷺ کی اس تیئیس سالہ جدوجہد میں نظر آتی ہے جس کا آغاز پہلی وحی کے نزول کے ساتھ ہوا اور جو آپؐ کے وصال تک جاری رہی۔ انقلابی دعوت کے بارے میں یہ سمجھ لیجئے کہ اگرچہ اس کا رُخ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کی طرف ہوتا ہے اور وہ پس ماندہ طبقات کو اپنا اوّلین ہدف نہیں بنایا کرتی' جیسے کہ عیسائی مبشرین یا مبلغین کا عام انداز ہوتا ہے کہ پسے ہوئے اور دبے ہوئے طبقات کی دلجوئی کر کے اور کچھ ان کی خدمت کر کے' مثلاً کچھ دودھ کے ڈبے تقسیم کر کے یا ان کے علاج معالجے کا بندوبست کر کے ان کے دلوں میں اپنے لئے ایک نرم گوشہ پیدا کر لیا جائے' تاہم اس انقلابی دعوت کی طرف سب سے پہلے یہی طبقات پیش قدمی کرتے ہیں۔

انقلابی دعوت ہمیشہ ایک فکر' ایک نظریہ پیش کرتی ہے اور اسے اس کی Face Value پر قبول کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ چنانچہ انبیاء اور رسولوں کی دعوت کا انداز ہمیشہ یہ رہا کہ وہ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کو سب سے پہلے مخاطب کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تو حکم ہوا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ ''جاؤ فرعون کے پاس وہ بہت سرکشی دکھاتا ہے''۔ گویا پہلا تبلیغی

مشن جو انہیں سونپا گیا وہ فرعون کے دربار میں دعوت پیش کرنے کے حکم پر مشتمل تھا۔ نبی اکرم ﷺ کو اُم القریٰ یعنی مکّہ میں جو بستیوں کا مرکز تھا' مبعوث کیا گیا۔ مکّہ پورے عرب کے لئے تہذیبی' مذہبی اور ثقافتی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سیاسی صدر مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپؐ جب مکّہ سے مایوس ہوکر طائف تشریف لے گئے تو وہاں آپؐ نے گلیوں میں کھڑے ہوکر اسلام کی صدا نہیں لگائی' دعوت وتبلیغ کے لئے پس ماندہ طبقات کو منتخب نہیں کیا بلکہ آپؐ نے طائف کے تین چوٹی کے سرداروں سے ملاقات کی اور اسلام کی دعوت ان کے سامنے رکھی! یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ دعوت اسلامی کا مزاج عام مذہبی تبلیغ سے بالکل جدا ہے' لیکن اپنی جگہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات ہوتے ہیں ان کے Vested Interests ہوتے ہیں' پہلے سے موجود نظام کے ساتھ ان کے بھاری مفادات وابستہ ہوتے ہیں' مصلحتوں کی بڑی بھاری بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی ہوتی ہیں۔ ان کے لئے کسی انقلابی دعوت کو قبول کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تاہم ان میں بعض اوقات کچھ ایسے انتہائی سلیم الفطرت لوگ بھی ہوتے ہیں جو فوراً اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن عام طور پر جو لوگ اس دعوت کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں ان میں ایک تو وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اس معاشرے میں ویسے ہی دبے ہوئے اور پسے ہوئے ہوتے ہیں' جن کے کوئی مفادات اس نظام کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتے کہ جو ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن سکیں یا ان کی آنکھوں کے آگے پردہ بن کر حائل ہوسکیں' وہ اس دعوت کو Face Value پر آگے بڑھ کر قبول کرتے ہیں۔ (اس طبقے میں سے حضرت بلالؓ اور حضرت خبابؓ بن الارت کا ذکر ہوچکا ہے)۔

دوسرا طبقہ جو کسی بھی انقلابی دعوت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے وہ نوجوانوں کا طبقہ ہوتا ہے' اس لئے کہ یہ عمر ولولوں اور امنگوں کی عمر ہوتی ہے۔ ابھی کوئی مصلحت کوشی اور مصلحت بینی ان پر مسلّط نہیں ہوئی ہوتی۔ ان کے جسم و جان میں کردار کی حرارت موجود ہوتی ہے۔ ابھی ان کا ضمیر مفادات کے مقابلے میں اتنا شکست خوردہ نہیں ہوتا کہ کسی بات کو حق سمجھنے کے باوجود اسے رد کر دے۔ چنانچہ نوجوان ہی کسی انقلابی دعوت کا ہراول دستہ بنتے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر بھی ایمان لانے میں قریش کے سربرآوردہ اور شرفاء کے خاندانوں میں سے نوجوانوں ہی نے پیش قدمی کی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو ابھی نوعمر یعنی teen ager تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جب ایمان قبول کیا تو وہ بھی عمر کے اسی دور سے گزر رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو

نوعمری میں اللہ نے جو امتیاز بخشا اس سے کون واقف نہیں! بلکہ ان کے بارے میں یوں کہئے کہ وہ تو پہلے ہی اپنے تھے' گھر کے فرد تھے۔ اسی طرح نوجوانوں میں سے کئی ایسے تھے جو ایمان لائے۔ ان نوجوانوں پر بھی تشدّد ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو بنواُمیہ کے بڑے اعلیٰ گھرانے کے چشم و چراغ تھے' اگرچہ اتنے کم عمر نہیں تھے کہ انہیں teen ager قرار دیا جاسکے' لیکن ایمان لانے پر چچا نے یہ معاملہ کیا کہ ایک چٹائی میں لپیٹ کر انہیں دھواں دے دیا کہ دم گھٹ جائے۔ ان نوجوانوں کو اس جسمانی ایذاء اور تشدّد پر مستزاد جو مسئلہ درپیش ہوا وہ یہ کہ ان کے والدین اپنے حقوق کا واسطہ دے کر ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ اس نئے دین کو چھوڑ و اور آبائی دین پر واپس آ جاؤ۔

ظاہر بات ہے کہ نوجوانوں کے طبقے (teen agers) میں سے جن لوگوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا ان کے بارے میں بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ انتہائی سلیم الطبع اور سلیم الفطرت نوجوان ہوں گے۔ ان کی سلامتیٔ طبع اور سلامتیٔ فطرت ہی کا یہ بھی تقاضا تھا کہ وہ اپنے والدین کا ادب و احترام ملحوظ رکھیں اور ان کے حقوق ادا کریں۔ لہٰذا ان کے لئے یہ ایک نہایت پریشان کن مرحلہ تھا کہ وہ والدین کی اطاعت کریں اور ان کا کہا مانیں یا توحید کو اختیار کریں اور والدین کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ادھر ان کے والدین اپنے حقوق کا واسطہ دے کر انہیں راہِ حق سے برگشتہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا واقعہ

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب معاملہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت سعدؓ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور انہی کے ہاتھوں بعد میں ایران فتح ہوا۔ یہ جب ایمان لائے تو ابھی نوعمر نوجوان تھے۔ والد فوت ہو چکے تھے' ماں نے بڑی محبت سے پالا اور بڑی محنت سے ان کی تربیت کی تھی۔ ماں اگر انتہائی محبت کرنے والی تھی تو بیٹا بھی سعادت مندی میں کم نہ تھا۔ ان کے سعادت منداور سلیم الطبع ہونے کا ایک مظہر یہ بھی سامنے آیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ مشرک ماں نے اب اپنا پورا وزن ایک پلڑے میں ڈالا اور بیٹے پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ اگر سعد اپنے آبائی دین میں واپس نہ آیا تو نہ کچھ کھاؤں گی اور نہ پیوں گی' اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گی۔ گویا آج کی اصطلاح میں ہم یوں کہیں گے کہ اس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ آپ غور کیجئے کہ کیسی شدید ذہنی اذیّت اور سخت آزمائش سے حضرت سعدؓ اس وقت دوچار ہوئے ہوں گے۔ یہ ہے

پس منظر جس میں یہ موضوع یہاں زیرِ بحث آ رہا ہے۔

مسئلے کا حل

فرمایا: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ...... ﴾ کہ اے نوجوانو' تمہاری فطرت کا یہ اقتضاء غلط نہیں ہے کہ والدین کا ادب ولحاظ ہونا چاہئے' یہ چیز ہم نے خود فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے۔ ہم ہی نے تاکید کی ہے انسان کو کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے' ان کا ادب واحترام کرے اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرے۔ یہ مضمون اس منتخب نصاب میں اس سے قبل سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں آ چکا ہے۔لیکن آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید میں مضامین کا تکرار و اعادہ کے ساتھ آنا بغیر کسی حکمت کے نہیں ہوتا۔ وہاں سورۂ لقمان میں حقوق کے حوالے سے گفتگو ہو رہی تھی کہ انسان پر سب سے پہلا اور سب سے مقدم حق اللہ کا ہے ﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ﴾ اس کے بعد والدین کا نمبر آتا ہے۔ گویا اللہ کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اپنے والدین کا ہے۔تو وہاں یہ بحث اس حوالے سے آئی تھی کہ اگر کسی معاملے میں اللہ کا حق اور والدین کے حقوق ٹکرانے لگیں تو صحیح قابل عمل صورت کیا ہو گی! ...... یہاں سورۃ العنکبوت میں معاملہ زیرِ بحث ہے کہ ایمان لانے والوں کو کن کن مسائل اور کون کون سے مخمصوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔نوجوانوں کے لئے چونکہ بالخصوص یہ مسئلہ خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ ان کے والدین انہیں شرک کرنے پر مجبور کرتے تھے لہٰذا اس مضمون کا یہاں پھر اعادہ کر دیا گیا۔فرمایا:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے لیکن ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے۔ ہر صاحبِ حق پر کوئی اور صاحبِ حق موجود ہے' اور تمام حقوق میں فائق ترین حق اللہ کا ہے۔ والدین کا حق مسلّم' لیکن ''اگر وہ تم سے جھگڑیں (اور مجبور کریں) اس بات پر کہ تم میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو شریک ٹھہراؤ جس کے بارے میں تمہیں کوئی علم حاصل نہیں' تو ان دونوں کا کہا مت مانو!''

یہاں نوٹ کیجئے کہ لفظ جہاد مشرک والدین کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ان کی یہ کوشش یعنی شرک کے حق میں اپنا دباؤ استعمال کرنا' یہ سب ان کا مجاہدہ ہے اور اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجاہدہ فی سبیل الشرک ہے' یا یوں کہئے کہ فی سبیل الطاغوت یا فی سبیل الشیطان ہے! ......تو اگر تمہارے والدین تمہیں شرک پر مجبور کر رہے ہیں تو درحقیقت وہ اپنے حقوق سے تجاوز کر رہے ہیں' لہٰذا ان کا کہنا مت

مانو!......مزید فرمایا:

﴿اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴾

''میری ہی طرف تم سب کولوٹنا ہے اور پھر میں تمہیں جتلا دوں گا (کھول کھول کرسامنے رکھ دوں گا) جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔''

معلوم ہوا کہ ایک تو اس طرح اس نہایت اہم مسئلے کا حل اللہ تعالیٰ نے پیش فرما دیا جو اہل ایمان میں سے نو جوان طبقہ کو درپیش تھا اور اس طرح ان کی ذہنی الجھن دور ہوئی۔

اہلِ ایمان کے لئے ایک نوید

اگلی آیت میں اہلِ ایمان کے لئے پھر reassurance ہے۔یعنی تسلی و تشفی کا انداز اور اچھے انجام کی نوید ہے۔ یہاں ہمیں اس معاملے پر بھی خاص طور پر غور کرنا ہوگا کہ یہ اعادہ کیوں ہو رہا ہے' حالانکہ دو آیات قبل اس سے ملتا جلتا مضمون گزر چکا ہے۔فرمایا:

﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ﴾

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہم انہیں لازماً نیکوکاروں میں داخل کریں گے۔''

دیکھئے' ایمان کے ساتھ اس کے عملی تقاضے یعنی عمل صالح کا ذکر ایک بار پھر اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس سیاقِ کلام اور جس context (پس منظر) میں گفتگو ہو رہی ہے' اس میں ''عمل صالح'' سے کون سے اعمال مراد ہیں؟ ابھی نماز تو فرض نہیں ہوئی' روزے کا کوئی حکم ابھی آیا ہی نہیں' زکوٰۃ کا ابھی کوئی نظام سرے سے قائم نہیں ہوا' تو یہاں ''عمل صالح'' سے آخر کون سا عمل مراد ہے! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان کا جو بھی عملی تقاضا سامنے آئے اسے پورا کرنا' ایمان پر ثابت قدمی دکھانا' رسول اللہ ﷺ کے حکم کی اطاعت کرنا کہ رسولؐ اگر یہ کہیں کہ خواہ تمہیں اذیت دے کر ہلاک کر دیا جائے تم مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے' جماعتی ڈسپلن کی پابندی کرنا اور دین کی دعوت و تبلیغ میں نبی ﷺ کے دست و بازو بننا' یہ سب چیزیں عمل صالح میں شامل ہیں۔ گویا ایک لفظ میں اگر ہم یوں کہیں کہ یہاں ''عمل صالح'' سے مراد ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی ہے تو یہ درست ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارے ذہنوں میں عمل صالح کا جو نقشہ بنا ہوا ہے اس کا ابتدائی مکی دور میں وجود نہیں تھا! اس آیت میں ﴿لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ﴾ کے الفاظ بھی

خصوصی طور پر لائق توجہ ہیں: ''ہم لازماً انہیں صالحین میں داخل کر دیں گے''۔ وہی تاکیدی انداز جو آیت ۷ میں اختیار فرمایا گیا' یہاں بھی موجود ہے۔اس آیت کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝﴾

غور طلب بات یہ ہے کہ دوبارہ اس مضمون کا اعادہ کیوں ہوا! ذرا غور کریں گے تو بات واضح ہو جائے گی اور اس تکرار میں جو معنوی حسن ہے وہ سامنے آ جائے گا۔ دیکھئے' یہاں ان نوجوانوں کا معاملہ زیرِ بحث تھا جو اسلام لانے کی پاداش میں اپنے والدین سے کٹ رہے تھے' جنہیں اپنے رشتہ داروں سے تعلق کاٹنا پڑ رہا تھا۔ یہاں ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھا جا رہا ہے کہ تم صرف کٹے ہی نہیں ہو' کسی سے جڑے بھی ہو!......تمہیں اس بات پر خوش ہونا چاہئے کہ اب تمہارا تعلق قائم ہوا ہے محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کے ساتھ! تم ان صالحین اور نیکوکاروں کے ساتھ ایمانی رشتے میں منسلک ہو گئے ہو۔ چنانچہ وہ صدمہ جو ایک سلیم الطبع انسان محسوس کرتا ہے کہ میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے کٹ گیا ہوں' اس کا ازالہ اس آیت سے ہو جاتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ ابوجہل نے عین میدانِ بدر میں جو دعا مانگی تھی تو اس میں تعلقات کے انقطاع ہی کی دہائی دی تھی۔ وہ دعا اس اعتبار سے بھی بڑی عجیب ہے کہ اس نے وہاں کسی لات' عزیٰ' ہبل یا کسی منات کو نہیں پکارا بلکہ صرف اللہ کو پکارا: ''اَللّٰھُمَّ اَقْطَعَنَا لِلرَّحِمِ فَاَھِنْهُ الْیَوْمَ'' اے اللہ جس شخص نے ہمارے رحمی رشتے کاٹ دیئے اسے آج رسوا کر دے!'' وہ دہائی دے رہا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کے خلاف اور اس کے نزدیک آنحضور ﷺ کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ آپ ؐ نے باپ کو بیٹے سے جدا کر دیا' بھائی کو بھائی سے علیحدہ کر دیا' بیویوں اور شوہروں میں جدائی ڈال دی۔اور اس طرح قریش کی قبائلی جمعیت منتشر ہو کر رہ گئی' ان کا شیرازہ پراگندہ ہو کر رہ گیا۔ یہ ہے وہ معاملہ جس کے لئے ان نوجوانوں کے دلوں پر مرہم رکھا جا رہا ہے۔تم اگر اپنے عزیز رشتہ داروں سے کٹے ہو تو سوچو کہ نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ سے جڑے بھی ہو! تمہیں ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہوئی ہے جنہیں سورۃ الفاتحہ میں ''مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ'' قرار دیا گیا——اور مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ کون ہیں' اس کا جواب سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ

وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾

کہ اپنے آباء واجداد سے اگر تم کٹ گئے' اپنے بھائی بندوں سے تمہارا تعلق منقطع ہو گیا تو ملول و غمگین نہ ہو' تمہیں ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہو گئی ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے' روزِ قیامت تم انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور نیکوکاروں کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے اور ان کے ساتھ جنت الفردوس میں تمہارا داخلہ ہوگا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایسے لوگوں میں شامل فرمائے! وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ' يَا عَزِيْزُ يَا غَفَّارُ!!

نفاق کا نقطۂ آغاز

اس کے بعد اب وہ مضمون آ رہا ہے جو اس سے قبل کسی قدر تفصیل کے ساتھ منافقت کی وضاحت کے ضمن میں سورۃ المنافقون کے درس میں بیان ہو چکا ہے۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ سورۃ العنکبوت جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں' مکّی سورۃ ہے اور مکّی دَور کے بھی زیادہ سے زیادہ درمیانی عرصے میں اس کا نزول ہوا۔ اس اعتبار سے نفاق کی اس معروف صورت کا ابھی مسلمانوں کی صفوں میں کہیں دُور دُور تک نشان نہیں تھا جس کا بالعموم تصور ہمارے ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے کہ منافق وہ ہے جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی نیت سے اسلام قبول کرے' اس نے محض ظاہراً اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو' اندرونی طور پر وہ پکا کافر ہو' وغیرہ۔ مکّی دَور میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہاں تو کلمۂ شہادت کا زبان پر لانا معاشرے کو چیلنج کرنے اور اس کے خلاف اعلانِ بغاوت کرنے کے مترادف تھا۔ یہ گویا ایسے ہی تھا کہ کوئی انسان خود ہر طرح کی مصیبت کو دعوت دے اور آگے بڑھ کر للکارے۔ لہٰذا اس معروف نفاق کا ابھی کہیں دُور دُور تک کوئی امکان نہیں تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کون سا نفاق ہے جس کا ذکر اس سورۂ مبارکہ میں ہو رہا ہے۔ یہ ہے درحقیقت وہ اصل نفاق جو کم ہمتی' بزدلی اور قوّتِ ارادی کی کمزوری سے عبارت ہے کہ اگرچہ ایمان جب قبول کیا تھا تو اس کی face value پر قبول کیا تھا' نبی ﷺ کی بات دل کو لگی تھی تبھی اسے تسلیم کیا تھا' لیکن پھر ایمان کے کٹھن تقاضے جب سامنے آنے لگے' مصائب' تکالیف اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا تو ان سے طبیعت گھبرانے لگی اور گریز کی طرف مائل ہونے لگی۔ اگر تو ان مشکلات کی وجہ سے کوئی انسان اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں پس و پیش کرنے لگے' دین کے راستے میں اس کے قدم رکنے لگیں اور گومگو کی سی کیفیت اس پر طاری ہو جائے تو یہی درحقیقت مرضِ نفاق کا نقطۂ آغاز ہے!

نفاق اور منافقت کا یہ نقطۂ آغاز اس آیۂ مبارکہ میں بڑی وضاحت سے سامنے آتا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَا اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ط﴾

''لوگوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر' پھر جب انہیں ایذا پہنچائی جاتی ہے اللہ کی راہ میں (کچھ انفاقِ مال اور بذلِ نفس یعنی جان و مال کے ایثار کا مرحلہ آتا ہے یا کوئی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں) تو وہ لوگوں کی (طرف سے ڈالی ہوئی) اس آزمائش سے ایسے گھبرا اٹھتے ہیں جیسے اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہئے۔''

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس رکوع میں فتنے کی دو نسبتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ہم نے فتنے میں ڈالا ہے' ہم تم سے پہلے لوگوں کو بھی آزماتے رہے ہیں ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اور دوسرے یہ کہ یہ فتنہ اور آزمائش لوگوں کی طرف سے ہے۔ یہ دونوں باتیں بیک وقت درست ہیں۔ اگرچہ یہ ابوجہل ہے جو مسلمانوں کو ستا رہا ہے' اور اُمیہ بن خلف ہے کہ جو تکالیف پہنچا رہا ہے' لیکن یہ بغیر اذنِ ربّ نہیں ہے۔ فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی تو اللہ ہے جس کے اذن کے بغیر پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔ بلالؓ پر جو کچھ بیت رہا ہے عالمِ اسباب میں اس کا سبب اُمیہ بن خلف ہے۔ آلِ یاسرؓ پر جو قیامت ڈھائی جا رہی ہے اس کا ذمہ دار اس ظالمانہ عمل کا کمانے والا ابوجہل ہے لیکن فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے' آزمائش اس کی جانب سے ہے' گو اس کی یہ آزمائش ابوجہل کے ہاتھوں اور اُمیہ بن خلف ہی کے ذریعے سے اہلِ ایمان کو پہنچ رہی ہے۔ اس اعتبار سے فتنے کی یہ دونوں نسبتیں بیک وقت درست ہیں۔

اس آیت میں ان کم ہمت لوگوں کا ذکر ہے کہ جو لوگوں کی طرف سے ڈالی ہوئی آزمائش اور تکلیف سے ایسے گھبرا اٹھتے ہیں جیسے کہ اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہئے۔ ان تھڑدلے لوگوں کی سیرت کا ایک دوسرا رُخ اگلے الفاظ میں واضح کیا گیا:

﴿وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ط﴾

''اور اگر تمہارے ربّ کی طرف سے کوئی مدد آ جائے تو یہ ضرور کہیں گے کہ ہم یقیناً تمہارے ساتھ تھے۔''

کہ آزمائش کا وقت آتا ہے تو پیچھے ہٹتے ہیں' لیکن اگر کہیں کوئی فتح نصیب ہو جائے' اللہ کی مدد آ جائے' کوئی مالِ غنیمت ہاتھ لگ جائے تو وہ پیش پیش ہوں گے اور کہیں گے کہ آخر ہم بھی تمہارے ساتھ تھے'

ہم بھی ان ثمرات سے متمتع ہونے کا حق رکھتے ہیں‘ ہمیں بھی اس مالِ غنیمت سے میں سے پورا پورا حصّہ ملنا چاہئے۔ یہ ایک کردار ہے جو کسی ایک معیّن دَور سے متعلق نہیں ہے بلکہ ہر انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے والوں میں یہ کردار بھی ہوتا ہے۔

تین قسم کے کردار

ہر انقلابی دعوت اور انقلابی جدوجہد میں تین کردار بالکل نمایاں طور پر ہوتے ہیں۔ایک وہ جو اِس دعوت کو ہر چہ بادا باد کی شان کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

ع ’’ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم‘‘

کہ اب جو ہو سو ہو‘ ہم نے کشتی پانی میں ڈال دی ہے‘ اب یہ تیرے گی تو ہم تیریں گے اور یہ ڈوبے گی تو ہم بھی ساتھ ہی ڈوبیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس انقلابی جدوجہد اور اس کے مقصد (cause) کے ساتھ ذہناً اور عملاً پورے طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس نظامِ کہنہ اور نظامِ باطل کو بچانے کے لئے میدان میں آتے ہیں اور کھلم کھلا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس باطل نظام کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور اس کے حمایتی بن کر کھڑے ہوتے ہیں کہ جو پہلے سے قائم ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے کے مدمقابل آتے ہیں اور اس طرح کشمکش و کشاکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام مجاہدہ ہے اور اس کشاکش میں بالعموم جنگ و قتال کی نوبت بھی آتی ہے۔ ایک تیسرا عنصر درمیان درمیان میں رہتا ہے۔ وہ اس فیصلہ کن انداز میں بازی کھیلنے کا قائل ہی نہیں‘ اس لئے کہ اسے ہر حال میں اپنے مفادات عزیز ہیں۔ قرآن حکیم میں ایسے شخص کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا: ﴿لَا اِلٰی ھٰٓؤُلَاۗءِ وَلَا اِلٰی ھٰٓؤُلَاۗءِ﴾ کہ نہ وہ اِدھر اپنے آپ کو وابستہ اور identify کرنے پر آمادہ ہے‘ نہ اُدھر یکسو ہو کر ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے بلکہ وہ ان کے بین بین رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات کا انتظار کرتا ہے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کی حکمتِ عملی یہ ہوتی ہے کہ دونوں پارٹیوں کے ساتھ روابط رکھے تاکہ جس کسی کو بھی فتح نصیب ہو وہ ان کے پاس جا کر اپنی وفاداری یا اپنی سابقہ خدمات کا حوالہ دے کر اپنے لئے تحفظات اور مراعات حاصل کر سکے۔ یہ ہے وہ منافقانہ کردار جس کو خوب اچھی طرح پہچاننے کی ضرورت ہے! اسی کردار سے پیشگی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ:

وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ﴾

کہ یہ دراصل اس مرض اور قلبی روگ کا نقطۂ آغاز ہے جو آگے بڑھ کر منافقت کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ آگے فرمایا:

﴿اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

''تو کیا اللہ تعالیٰ زیادہ باخبر نہیں ہے اس سے کہ جو کچھ جہان والوں کے سینوں میں پنہاں ہے؟''

جہان والوں کے سینوں کے پوشیدہ اسرار سے اللہ سے بڑھ کر کون واقف ہوگا؟ یہ لوگ اپنی غلط بیانی سے کسے دھوکہ دینا چاہتے ہیں' کس کو فریب دینا چاہ رہے ہیں!! سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۹ میں اس فریب کاری کا پردہ چاک کر دیا گیا:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ ......﴾

''کہ یہ دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور اہل ایمان کو' درآنحالیکہ یہ دھوکہ نہیں دے رہے مگر خود اپنے آپ کو......''

سیدھی سی بات ہے کہ اگر تو معاملہ اللہ کے ہاتھ ہے تو وہ کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے' وہ تو لوگوں کے سینوں میں پوشیدہ باتوں سے بھی بخوبی آگاہ اور ان کی نیتوں اور ارادوں سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہے۔

جھوٹا مدعیٔ ایمان کون؟

اور اب اگلی آیت کے مطالعے سے پہلے ذرا ذہن میں لائیے آیت ۳ کا آخری حصّہ' جس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں: ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ کہ اللہ بالکل کھول کر رکھ دے گا' ظاہر کر دے گا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔ وہاں سچے اور جھوٹے سے حقیقتاً جو مراد تھی یہاں اس پر سے پردہ اٹھا دیا گیا اور بات بالکل کھول دی گئی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴾

کہ اللہ کھول کر رہے گا' الم نشرح کر دے گا' بالکل واضح کر دے گا کہ کون ہیں وہ جو واقعتاً صاحب ایمان ہیں' حقیقتاً مؤمن ہیں' جو قلب و ذہن کی یکسوئی کے ساتھ ایمان لائے ہیں' جو اس عزمِ مصمم کے ساتھ آئے ہیں کہ ہر چہ بادا باد' اور وہ کون ہیں جنہوں نے اس وادی میں قدم رکھا تو ہے لیکن تحفظات کے ساتھ! جنہیں اس راہ کے مصائب و مشکلات کے مقابلے میں جان و مال کا تحفظ زیادہ عزیز ہے' جنہوں نے گوہ

کے بل کی طرح اپنے لئے دونوں راستے کھلے رکھے ہیں کہ حالات کا اونٹ خواہ کسی کروٹ بیٹھے انہوں نے اپنے تحفظ کا سامان کیا ہوا ہے' جن کی کم ہمتی اور بودے پن کا یہ عالَم ہے کہ اللہ کی راہ میں جیسے ہی کوئی آزمائش آتی ہے وہ اس طرح گھبرا اٹھتے ہیں جیسے کوئی آسمانی آفت ٹوٹ پڑی ہو!

پھر نوٹ کر لیجئے کہ اگرچہ یہ مَکّی سورت ہے' اور مَکّی دَور کے بھی وسطی حصّے سے اس کا تعلق ہے جبکہ ابھی اس نفاق کا دُور دُور تک امکان نہیں تھا جو بعد میں مدنی دَور میں پورے طور سے ظاہر ہوا' لیکن یہاں صاف الفاظ میں 'نفاق' اور 'منافقت' کا ذکر موجود ہے۔ گویا پیشگی متنبہ کر دیا گیا کہ اس راہ میں اگر کم ہمتی کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ طرزِ عمل انسان کو منافقت کی آخری سرحدوں تک لے جا سکتا ہے۔

نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا ایک پُرفریب انداز

اس کے بعد انہی نوجوانوں کا ایک اور مسئلہ زیر بحث آ رہا ہے جن پر ان کے والدین کا دباؤ تو تھا ہی' ان کے بڑے اور بزرگ بڑے ہی ناصحانہ اور مشفقانہ انداز میں ایک بات ان سے کہتے تھے جس کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ یہ وہ معاملہ ہے جس کا تجربہ ہر اُس نوجوان کو ہوگا جو کسی بھی انقلابی دعوت سے منسلک ہو۔ یہ باتیں وہ ہیں کہ جن سے ہر انقلابی جدوجہد میں فی الواقع سابقہ پیش آتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ﴾

''اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا (جو کفر کی روش پر قائم تھے) ان لوگوں سے کہ جو ایمان لائے تھے کہ اتباع کئے جاؤ ہمارے ہی راستے کا اور ہم اٹھا لیں گے تمہاری خطاؤں کا بوجھ۔''

یہ نوجوانوں کو بہکانے اور ورغلانے کا ایک انداز تھا جو قوم کے ان بڑے بوڑھوں نے اختیار کیا جو خود شرک پر قائم تھے۔ وہ بڑے مشفق اور خیر خواہ بن کر ان نوجوانوں سے کہ جو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے' یہ کہتے تھے کہ بالکل بے فکر ہو کر چلے آؤ اپنے آباء واجداد کے راستے پر' آنکھیں بند کر کے ہمارے پیچھے چلتے رہو' ہماری پیروی کرتے رہو' ہم ہی حق پر ہیں' آخر اپنے آباء واجداد کے راستے کو کیوں ترک کرتے ہو!! پھر مزید ترغیب کے طور پر اتمامِ حجت کے انداز میں وہ کہتے تھے کہ اگر واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے آباء واجداد کا یہ راستہ غلط ہے اور تمہاری سمجھ میں ہماری بات نہیں آ رہی تو بھی ذرا سوچو کہ اگر تمہاری ساری ذمہ داری ہم اٹھا لیں تو پھر تمہارے لئے تشویش کا کون سا معاملہ باقی رہ جاتا ہے؟ مطمئن رہو' ہم خدا کے ہاں تمہاری طرف سے جواب دہی کریں گے' تمہاری

ذمہ داری ہم قبول کریں گے۔ اگر فی الواقع ہم غلطی پر ہوئے تو بھی گھبراؤ نہیں' تمہاری خطاؤں کا بوجھ ہماری گردنوں پر ہوگا۔ فرمایا:

﴿وَمَا هُمۡ بِحٰمِلِیۡنَ مِنۡ خَطٰیٰهُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ۝﴾

''اور نہیں ہیں وہ اٹھانے والے ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی۔ بلاشبہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔''

وہاں تو ہر ایک کو اپنی جواب دہی کرنی ہے' کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں۔ یہ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں' دوسروں کو فریب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں جس شدّت کے ساتھ ان کے دعوے کی نفی کی گئی ہے اور اگلی آیت میں جس طرح اللہ تعالیٰ کا غضب اُن پر ظاہر ہو رہا ہے' اس کے پس منظر میں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اس طرزِ خطاب میں اور فریب آمیز طرزِ تکلم میں واقعتاً کچھ لوگوں کے لئے کچھ وزن تھا۔ آخر جب قوم کے بڑے بوڑھے کوئی بات اپنے تجربے کے حوالے سے کہتے ہیں تو ان کی بات بالعموم توجہ سے سنی جاتی ہے۔ دعوتِ حق پر کان دھرنے والے نوجوانوں پر اثر انداز ہونے کے لئے بزرگانِ قوم کی گفتگو کا انداز ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ میاں ہم نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے' ہم نے دنیا دیکھی ہے' تم ابھی نوعمری کے دَور میں ہو' تمہیں اپنے نفع ونقصان کی ابھی سمجھ نہیں ہے' کوئی سر پھرا شخص ہے جو تمہیں غلط راستے پر ڈال رہا ہے' وہ تمہاری دنیا برباد کر کے رکھ دے گا' ہمارے راستے پر آ ؤ! ہم تمہاری رہنمائی کریں گے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ان کی طرف سے سننے میں آتی ہیں اور اس بات کا امکان ہر دم رہتا ہے کہ کسی وقت انسان اگر کسی خاص کیفیت میں ہو اور ان بزرگوں کے ساتھ اس کے حسنِ ظن کا رشتہ برقرار ہو تو وہ ان سے کوئی اثر قبول کر لے۔ لہٰذا پوری شدت کے ساتھ ان کے دعوے کی نفی کی گئی اور ان کے فریب کا پردہ چاک کر دیا گیا کہ ﴿اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ۝﴾ ''بلاشبہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں!'' دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں!!

اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوگا

اس دورِ زوال میں جبکہ بہت سے دینی تصورات مسخ ہو گئے ہیں' ہمارے ذہنوں میں بالعموم یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ روزِ محشر کوئی وہاں ہمیں چھڑا لے گا اور ہمارا بوجھ اٹھا لے گا' کسی کے دامن سے وابستہ ہو کر نکل جائیں گے اور اس طرح ہمارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ یہ تمام تصورات ایک طرف رکھئے اور قرآن مجید کا انداز دیکھئے! ﴿وَمَا هُمۡ بِحٰمِلِیۡنَ مِنۡ خَطٰیٰهُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ﴾ ''اور وہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہوں گے''۔ جیسے ایک جگہ فرمایا: ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ

اُخۡــــرٰی ﴾ ''کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہ ہوگا''۔ وہاں تو اپنی اپنی گٹھڑی ہوگی اور اپنا اپنا کاندھا۔ ہر ایک کو اپنے بوجھ خود اٹھانے پڑیں گے۔ ہر شخص کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہو گی : ﴿وَ کُـلُّهُـمۡ اٰتِیۡـهِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فَرۡدًا ﴾ قیامت میں ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں پیش ہونا ہوگا اور اسی اعتبار سے اس کا محاسبہ ہوگا کہ تم کیا تھے؟ کہاں تھے؟ تمہاری صلاحیتوں کا مصرف کیا ہوا؟ تمہیں ہم نے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی اس سے کتنا کچھ فائدہ اٹھایا؟ یہ دلیل وہاں ہرگز قبول نہیں ہوگی کہ ہم نے تو اپنے بزرگوں کے نقش قدم کی پیروی کی تھی' اگر ہم غلطی پر تھے تو اس کے ذمہ دار ہمارے بڑے بزرگ ہیں' ہم نہیں ہیں!!

اضافی بوجھ اٹھانے والے!

اب اگلی آیت پر اپنی توجہ مرکوز کیجئے! مشرکین کے اس گھناؤنے کردار پر اللہ کا غضب بہت نمایاں ہے:

﴿وَلَیَحۡمِلُنَّ اَثۡقَالَهُمۡ وَ اَثۡقَالًا مَّعَ اَثۡقَالِهِمۡ ۫﴾

''یہ لوگ لازماً اٹھائیں گے اپنے بوجھ' اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور کچھ بوجھ بھی (انہیں اٹھانے ہوں گے)''

نوجوانوں کو فکری طور پر داغ دار کرنے اور گمراہ کرنے کی یہ کوشش' ان کو غلط راستے پر ڈالنے کی یہ سعی یقیناً ان کے اپنے گناہوں کے بوجھ میں اضافے کا باعث بنے گی۔ اس سے ان کی ذمہ داری بلاشبہ بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نوجوان جو اِن کے فریب میں آ کر اپنی منزل کھوٹی کر رہے ہیں اپنی ذمہ داری سے دستکش ہوسکیں گے اور بازپُرس سے بچ جائیں گے۔ نہیں' ان کی ذمہ داری میں ہرگز کمی نہیں آئے گی۔ انہیں اپنے فیصلے کی پوری ذمہ داری قبول کرنی پڑے گی۔ یہ دلیل کہ کسی نے مجھے اس گمراہی کے راستے پر ڈالا' اللہ کے ہاں کوئی وزن نہیں رکھتی۔ ہر شخص کو جو کچھ دیا گیا ہے' جو جسمانی صلاحیتیں اور ذہن وفکر کی قوتیں عطا کی گئی ہیں' ان کی بنیاد پر وہ خود انفرادی حیثیت میں مسئول ہے۔ ہاں وہ لوگ جو دوسروں کو گمراہ کرنے اور انہیں غلط راستے پر ڈالنے کی سعی کر رہے ہیں' اپنے اس طرزِ عمل سے اپنے بوجھ میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں' انہیں اپنی خطاؤں کے ساتھ ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھانا ہوگا جو ان کی باتوں میں آ کر گمراہی کا شکار ہو گئے تھے' یہ اضافی بوجھ بھی ان کے سروں پر ہوگا! یہ آیت مبارکہ ان الفاظ پر ختم ہو رہی ہے:

﴿وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۝﴾

''اور لازماً ان سے باز پُرس ہو کر رہے گی قیامت کے دن اس افترا کے بارے میں جو وہ کرتے ہیں۔''

جو جھوٹ یہ گھڑ رہے تھے' جو افترا پردازیاں کر رہے تھے اور جو غلط دعوے کر رہے تھے کہ ہم تمہارا بوجھ اٹھائیں گے' اس سب کے بارے میں انہیں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ ان سے اس معاملے میں باز پُرس ہو کر رہے گی!

پہلے رکوع کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

آپ نے دیکھا کہ اگر سلسلۂ کلام معیّن ہو جائے' سیاق وسباق واضح ہو جائے کہ کن حالات میں گفتگو ہو رہی ہے' اس وقت کیا مسائل درپیش تھے' اور کون لوگ ہیں جن کی طرف روئے سخن ہے تو قرآن مجید کی ایک ایک آیت کس طرح خود بولتی ہے اور کس طرح اس کی آیات کے مابین ایک ربط اور تعلق قائم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک مربوط اور مسلسل کلام ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ قرآن مجید کا نزول ایک خاص قوم کے مابین ایک خاص ماحول میں ہوا ہے۔ اس کے نزول کے ساتھ ساتھ ایک خاص جماعت تیار ہو رہی تھی جسے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ایک منظّم قوّت کے طور پر تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم ان کے احساسات اور ان کے مسائل و معاملات کو وقتاً فوقتاً' وقفے وقفے سے زیرِ بحث لاتا ہے۔

سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع میں ان مسائل و مشکلات' ان امتحانات' ان آزمائشوں' ان تکالیف اور مصیبتوں کے ضمن میں ایک مکمل ہدایت نامہ موجود ہے کہ ان کے بارے میں اہل ایمان کا نقطۂ نظر کیا ہونا چاہئے۔ چنانچہ ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ تمہارے ایمان کی آزمائش ہے۔ تمہارے ایمان کی صداقت کا ثبوت اسی سے مہیا ہوگا۔ یہ امتحان تمہارے جذبۂ ایمانی کی تربیت کے لئے بھی مطلوب ہے۔ اور یہ آزمائش اصلاً اللہ کی طرف سے ہے' اگرچہ بظاہر یہ اللہ کے دشمنوں کے ہاتھوں تم تک پہنچ رہی ہے۔ اور پھر یہ بھی نہ سمجھو کہ تمہیں ایذائیں دے کر وہ بری ہو جائیں گے' ان کو لازماً پکڑا جائے گا۔ ابھی اللہ کی حکمت میں ان کی رسّی دراز کرنا ہے۔ وہ تمہیں اُس وقت تک ستا سکیں گے جب تک اللہ چاہے گا۔ اور ایک وقت لازماً آئے گا کہ وہ اللہ کی گرفت میں آئیں گے ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ

لَشَدِيۡدٌ ﴾ ''تمہارے ربّ کی پکڑ بہت سخت ہے''۔ اگر انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ اس سے بچ نکلیں گے تو بڑا غلط فیصلہ کیا ہے۔ پھر ایمان کی حقیقت بھی بیان فرما دی گئی اور ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کرنے والوں کے لئے بہترین اجر کی بشارت بھی دی گئی۔ یہ سب کچھ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کو صبر کی تلقین ہی تو ہے۔

ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز سورۃ العصر ہے، جس میں ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو بھی لوازمِ نجات میں سے شمار کیا گیا ہے:

﴿وَالۡعَصۡرِ ۞ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۞ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۞﴾

سورۃ العنکبوت کا یہ مقام دراصل ''تواصی بالصبر'' کے لئے انتہائی خوبصورت افتتاحی سبق ہے۔ یہاں تواصی بالصبر کا فریضہ گویا اللہ تعالیٰ خود سرانجام دے رہے ہیں۔ اہل ایمان کو صبر و ثبات کی تلقین کی جا رہی ہے کہ اپنے قول پر ڈٹے رہو، جمے رہو، اپنے دعوائے ایمان میں اس طور سے ثابت قدم رہو کہ تمہارے پائے ثبات میں کہیں کوئی لرزش نہ آنے پائے۔

رکوع ۲ تا ۴ کے مضامین کا مختصر جائزہ

یہ سورۂ مبارکہ ایک خاص پہلو سے انہی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس منتخب نصاب میں اس کا تو امکان نہیں ہے کہ سات رکوعوں پر مشتمل اس پوری سورۂ مبارکہ کا درس شامل کیا جا سکے، تاہم پہلے رکوع کے علاوہ ہم اس کی مزید چند آیات کا مطالعہ بھی کریں گے۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رُسل کے حالات سے استشہاد فرمایا ہے۔ گویا کہ مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ تم پہلی اُمت نہیں ہو، نہ محمد ﷺ اللہ کے پہلے رسول ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الاحقاف میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿قُلۡ مَا کُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ یعنی اے نبیؐ! کہہ دیجئے کہ مَیں کوئی نیا نویلا رسول نہیں ہوں۔ بہت سے رسول آپؐ سے پہلے آئے ہیں۔ یا جیسے سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ﴾ یعنی ''محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں اور آپؐ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں''۔ ان رسولوں کے ساتھ بھی یہ تمام حالات پیش آئے۔ ان پر ایمان لانے والوں کو بھی ان تمام گھاٹیوں سے گزرنا پڑا اور وہ ان تمام آزمائشوں کے مراحل سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ ایک ایک کا نام لے کر بہت سے انبیاء و رُسل کا تذکرہ کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت

نوح علیہ السلام کا ذکر آیا اور اس ضمن میں خاص طور پر یہ بات نمایاں کی گئی کہ ان کی استقامت بے مثل تھی کہ انہوں نے ساڑھے نوسو برس اپنی قوم میں گزارے۔ مسلسل اعراض، مسلسل انکار، استہزاء اور تمسخر سے ان کا سابقہ رہا، لیکن ہمارا وہ بندہ ثابت قدم رہا۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان آتی ہے۔ کون سی آزمائش ہے جس سے آپؑ نہیں گزرے۔ گھر سے انہیں نکالا گیا۔ مشرک باپ نے زجر و ملامت کے انداز میں ان سے کہا: ﴿لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ وَاهۡجُرۡنِیۡ مَلِیًّا﴾ یعنی ''اے ابراہیم! اگر تم (میرے ان خداؤں کی مخالفت سے) باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور یہ کہ تم فی الفور میری نگاہوں سے دُور ہو جاؤ!'' پھر کون سا ایسا کٹھن مرحلہ ہے جو ان پر نہیں گزرا۔ بادشاہِ وقت کے دربار میں پیشی ان کی ہو رہی ہے، آگ کے الاؤ میں وہ جھونکے جا رہے ہیں، اپنا وطن خیر باد کہہ کر پوری زندگی ایک مسافرت کے عالم میں وہ بسر کر رہے ہیں۔ آج یہاں ہیں، کل وہاں ہیں، کبھی شام کے بالائی علاقے میں ہیں، کبھی فلسطین میں آ کر ڈیرے لگائے ہیں تو کبھی مصر میں ہیں۔ حجاز میں دعوتِ توحید کا ایک مرکز تعمیر کیا ہے۔ دوسرے بیٹے کو فلسطین میں بٹھا دیا ہے۔ اللہ کا یہ بندہؑ اپنے اس یقین پر قائم ہے کہ اس کا تعلق اپنے گھر والوں سے نہیں، آباء و اجداد سے نہیں، کسی زمین سے نہیں، کسی وطن سے نہیں، اس کا تعلق صرف اور صرف خدائے واحد کے ساتھ ہے۔ اللہ کا وہ بندہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اس آخری امتحان سے بھی گزرا کہ عین بڑھاپے کے عالم میں دعائیں مانگ مانگ کر جو اکلوتا بیٹا لیا تھا اللہ نے اس کے ضمن میں بھی آزما لیا کہ کہیں اس کی محبت ابراہیمؑ کے دل میں میری محبت سے زیادہ تو نہیں ہو گئی۔ تو یہ آزمائش اور امتحان تو اس راہ کا ایک مستقل ضابطہ اور قانون ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں ہے، جو ادھر آئے گا آزمایا جائے گا۔ یہاں انبیاء و رُسل کے حالات کا ذکر گویا ﴿وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ﴾ کی تفسیر ہے۔

اہل ایمان کے لئے خصوصی ہدایات

انبیاء اور رُسل کے احوال بیان کرنے کے بعد پانچویں رکوع میں آیت نمبر ۴۵ سے کہ جہاں سے اکیسویں پارے کا آغاز ہوا ہے، ایک نہایت اہم مضمون شروع ہوتا ہے کہ اس قسم کے حالات میں اہل ایمان کو کرنا کیا چاہئے۔ اس ضمن میں بعض معین ہدایات مسلمانوں کو دی جا رہی ہیں۔ اجمالاً یہاں اس میں سے صرف چند آیات کا حوالہ دینا مفید رہے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اس پوری عبارت کو جو تین رکوعوں پر مشتمل ہے، ہم اس مختصر نصاب میں شامل نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے کی پہلی ہدایت اکیسویں

پارے کے بالکل آغاز میں وارد ہوئی ہے:

﴿اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ۝﴾

''(اے نبیؐ!) تلاوت کیا کرو اس کی جو وحی کیا گیا ہے تمہاری جانب کتابِ الٰہی میں سے اور نماز قائم رکھو' یقیناً نماز برائی سے اور بے حیائی سے روکنے والی ہے۔ اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو۔''

یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ المنافقون میں ہم پڑھ چکے ہیں' یعنی ذکرِ الٰہی کا التزام۔ اس کٹھن راستے میں ہمدم' غم خوار' پشت پناہ اور ہمت بندھانے والا اگر کوئی ہے تو وہ اللہ کا ذکر ہے۔ وہاں فرمایا گیا تھا کہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝﴾

''اے مسلمانو! دیکھنا تمہارا مال اور تمہاری اولاد کہیں تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اس لئے کہ جو اس فتنے میں گرفتار ہو گیا تو وہی ہے خسارہ پانے والا۔''

یہاں فرمایا کہ مشکل اور کٹھن حالات میں تمہارے لئے اصل سہارا تلاوتِ قرآن اور ادائے صلوۃ ہے' اور یہ دونوں ذکر کی اعلیٰ ترین صورتیں ہیں۔ قرآن حکیم مجسم ذکر ہے۔ یہ ''الذکر'' بھی ہے اور ''ذکریٰ'' بھی! اس کی تلاوت پر کاربند رہنا' اس کو پڑھتے رہنا ذکر کی نہایت عمدہ صورت ہے۔ پھر یہ کہ جامع ترین ذکر ہے نماز۔ اس میں ذکرِ قولی بھی ہے اور ذکرِ عملی بھی۔ اس میں اپنی زبان سے اللہ کو یاد کرنا بھی ہے اور اس کے سامنے اظہارِ بندگی کے طور پر جھک جانا یعنی رکوع اور سجود بھی ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ کہ اس راہ میں ہمت بندھانے والی اور ثابت قدم رکھنے والی سب سے بڑی چیز بلاشبہ ''اللہ کی یاد'' ہے۔

اس سلسلے کی دوسری اہم ہدایت اس سلسلۂ کلام میں ذرا آگے چل کر وارد ہوئی ہے۔ یہ آیت نمبر ۵۶ ہے جس میں ہجرت کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ فرمایا:

﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ۝۵۶﴾

''اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین بہت کشادہ ہے' پس تم صرف میری بندگی کرو۔''

کہ اگر کسی ایک مقام پر تمہارے لئے توحید پر کاربند رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہو تو تم اس زمین کے ساتھ بندھے نہ رہو' وہ شہر' وہ ملک یا وہ خطۂ ارضی تمہارے قدموں کو روک نہ لے' باندھ نہ لے' بلکہ تم ہجرت کر جاؤ۔ اس لئے کہ بہرصورت تمہیں بندگی میری ہی کرنی ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں گویا کہ مسلمانوں کو ہدایت دے دی گئی اور صاف الفاظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ اگر مکّہ کی سرزمین تم پر تنگ ہوگئی ہے اور یہاں رہ کر توحید پر کاربند رہنا تمہارے لئے مشکل بنا دیا گیا ہے تو اس سرزمین کو خیرباد کہو اور ہجرت کر جاؤ۔ درحقیقت اسی ہدایت اور رہنمائی کے تحت ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ نے اہل ایمان کو یہ اجازت دی کہ وہ مکّہ سے چلے جائیں اور حبشہ میں جا کر پناہ گزین ہوجائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے دو قافلے حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان ہجرت کرنے والوں میں شامل تھے۔ اس سورۂ مبارکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاص طور پر جو ذکر آیا ہے' جس طریقے سے ان کی زندگی مسلسل مہاجرت میں گزری ہے' یہ حکم گویا اسی کا ایک عکس ہے۔ آگے فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ قف ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ۝﴾

''ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے' پھر تم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

کہ یہ زندگی عارضی ہے' تکلیفوں اور مشقتوں میں بھی بیت جائے گی اور آرام و آسائش کے ساتھ بھی بہرحال ختم ہو کر رہے گی۔ پھر تم سب ہماری طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔ موت کا خوف اگر ہجرت کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے تو اسے ذہن سے جھٹک دو' موت تو بہرصورت آ کر رہے گی۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ۝﴾

پھر دیکھئے وہی مؤکد وعدہ جو پہلے رکوع میں دو مرتبہ آیا تھا' یہاں سورۃ کے آخری حصّے میں بھی موجود ہے: ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے (یعنی ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کیا) ہم لازماً ان کو ٹھکانہ دیں گے جنت کے بالاخانوں میں''۔ نوٹ کیجئے' ہجرت کے ساتھ اس لفظ ''لَنُبَوِّئَنَّهُمْ'' کی بڑی مناسبت ہے۔ ''بَوَّءَ. يُبَوِّءُ'' کے معنی ہیں کہیں ٹھکانہ فراہم کرنا۔ ''ہم ان کے لئے ٹھکانہ بنائیں گے جنت کے ان بالاخانوں میں (بہشت کے ان جھروکوں میں) جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' اور کیا ہی عمدہ ہے یہ بدلہ عمل کرنے والوں کا''۔ اور یہ عمل کرنے والے کون ہیں؟ ساتھ ہی واضح فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾ وہ لوگ جنہوں نے صبر کی

روش اختیار کی' جو ثابت قدم رہے' نہ کسی تشدد اور مخالفت سے بددل ہوئے نہ کسی لالچ اور temptation سے انہوں نے اپنی منزل کھوٹی کی۔ان کا توکل صرف اپنے ربّ پر تھا' ان کی تمام امیدیں صرف اسی کی ذات سے وابستہ رہیں اور وہ اسی کی پکڑ سے ڈرتے رہے!

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوید جانفزا

یہ سورۂ مبارکہ ختم ہوتی ہے ایک ایسی نوید جانفزا پر جو ہر اُس بندۂ مؤمن کے لئے ہے کہ جو اِس قسم کی کسی کشمکش میں عملاً مبتلا ہو اور صبر و مصابرت کے ان امتحانات سے اور آزمائشوں اور تکالیف کے اس دَور میں سے گزر رہا ہو۔ایسے شخص کے لئے اس سے بڑی نوید جانفزا اور اس سے زیادہ قطعی یقین دہانی کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

''اور وہ لوگ جو ہماری راہ میں جہاد کریں گے ہم ان کے لئے اپنے راستے کھولتے جائیں گے۔اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔''

پھر نوٹ کیجئے لفظ ''جہاد'' مکّی سورت میں وارد ہوا ہے جب کہ ابھی قتال کا دُور دُور تک کہیں کوئی سوال نہیں تھا۔یہ مجاہدہ' یہ کشمکش اور یہ تصادم درحقیقت نظریات کی سطح پر ہو رہا ہے۔صبر کا صبر کے ساتھ مقابلہ ہو رہا ہے۔وہ لوگ اپنے نظامِ باطل کے تحفظ میں اپنی قوّتوں کو مجتمع کر رہے ہیں' یہاں اہل ایمان ہیں جو اپنے ایمان کے لئے' اپنے ربّ کے کلمے اور اس کے دین کی سربلندی کے لئے جان توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔دینِ حق کے ان سرفروشوں سے ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ دیکھئے' یہاں تاکید کا وہی آخری اسلوب ہے۔اس سورۂ مبارکہ کے شروع میں بھی یہ صیغۂ تاکید بتکرار آیا ہے اور یہاں آخر میں پھر یہ اسلوب اختیار کیا گیا: ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ''ایسے لوگوں کے لئے ہم لازماً اپنے راستے کھولتے چلے جائیں گے''۔یہ ایک بہت اہم بات ہے' بہت اعلیٰ اور عمدہ وعدہ ہے جو مسلمانوں سے کیا جا رہا ہے۔قدم بڑھاؤ تو سہی' آگے کی منزلوں کے بارے میں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں' اللہ تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں اپنے راستے پر چلائے گا' تمہارے لئے وہاں سے راستے کھولے گا جہاں سے کوئی راستہ کسی کو نظر نہ آتا ہوگا۔نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر نگاہ ڈالئے' ہجرت سے قبل سن دس گیارہ نبوی میں بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کہیں کوئی راستہ دُور دُور تک نظر نہ آ رہا ہو۔مکّہ سے مایوس ہو کر آپؐ طائف تشریف لے گئے۔وہاں جو کچھ ہوا اور جس طور سے ہوا وہ سب کے علم میں

ہے۔ زبانی مخالفت پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا‘ آپؐ پر پتھراؤ بھی کیا گیا‘ یہاں تک کہ جسمِ اطہر لہولہان ہو گیا۔ واپس آئے تو مکّہ میں حالات اس درجے مخدوش تھے کہ ایک مشرک کی امان لے کر مکّہ میں داخل ہوئے‘ اس لئے کہ آپؐ کے قتل کی سازش تیار ہو چکی تھی‘ تمام راستے گویا بند ہو چکے تھے‘ امید کی کوئی کرن دُور دُور نظر نہیں آتی تھی‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے گھر بیٹھے راستہ کھول دیا۔ مدینہ منورہ سے چھ افراد آئے اور ایمان لے آئے۔ اگلے سال بارہ آئے‘ بیعت ہوگئی۔ اس سے اگلے سال بہتر (۷۲) یا پچھتر (۷۵) افراد آئے اور مشرف باسلام ہو گئے۔ گویا مدینہ منورہ کا دارالہجرت بننا مقدر ہو رہا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے لئے ٹھکانہ اور جائے پناہ بنانے کا فیصلہ صادر فرما چکا ہے۔ وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کے قدم ہائے مبارک ابھی پہنچے بھی نہیں لیکن آپؐ کے استقبال کی وہاں تیاریاں ہو رہی ہیں اور ایمان کو تمکن حاصل ہو چکا ہے۔ یہ ہے اللہ کا وہ پختہ وعدہ جس کا عملی ظہور اس صورت میں ہوا۔ بندۂ مؤمن کا فرض یہ ہے کہ اپنے حالات کے مطابق جو کچھ وہ کر سکتا ہے کر گزرے‘ نتائج کو اللہ کے حوالے کرے۔ آئندہ کہاں سے راستہ نکلے گا‘ اس کے بارے میں اسے خود فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ نے یہ چیز اپنے ذمے لے لی ہے: ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ’’اور ہم لازماً کھولتے چلے جائیں گے ان کے لئے اپنے راستے!‘‘

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربِّ العالمین○○

❁❁❁
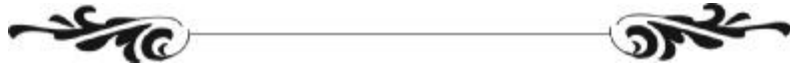
سیرت طیبہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

صبر ومصابرت کے مختلف ادوار

سُوْرَۃُ الکھف کی آیات ۲۷ تا ۲۹ کی روشنی میں!

درس ۲۱

سیرتِ طیّبہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں

صبر و مصابرت کے مختلف ادوار

سورۃ الکہف کی آیات ۲۷ تا ۲۹ کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتٰبِ رَبِّکَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ ۚ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِھِمْ سُرَادِقُھَا ۭ وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ کَالْمُھْلِ یَشْوِی الْوُجُوْہَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾﴾ ...... الکھف

ہمارا آج کا درس اگرچہ صبر اور مصابرت فی سبیل اللہ کے نقطۂ نگاہ سے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ایک خاص دَور اور آپؐ کی سیرتِ مطہرہ کے ایک اہم باب کے مطالعے سے متعلق ہے تاہم اس کے لئے سورۃ الکہف کی یہ تین آیات (۲۷ تا ۲۹) عنوان کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''اور تلاوت کرتے رہو (اس کلام کی) جو کہ وحی کیا گیا ہے تمہاری جانب تمہارے پروردگار کی کتاب میں سے۔ اُس کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں۔ اور تم اس کے سوا اپنے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہ پاسکو گے۔ اور روکے رکھو اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح وشام، جو اس کی رضا جوئی ہی کے خواہاں ہیں، اور تمہاری آنکھیں ان سے متجاوز نہ ہوں، دُنیوی زندگی کی زینت کی طلب میں۔ اور مت کہنا مانو اس کا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر

دیا ہے اور جو پیروی کر رہا ہے اپنی خواہش نفس کی اور اس کا معاملہ حدود سے تجاوز پر مبنی ہے۔ اور کہہ دو کہ یہ سراسر حق ہے تمہارے ربّ کی جانب سے‘ تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ ہم نے تیار کی ہے ان ظالموں کے لئے ایک بڑی آگ‘ اس کی قناتیں انہیں اپنے گھیرے میں لیں گی۔ اور اگر یہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو کھولتے ہوئے تانبے کی مانند ہوگا‘ جو جھلس کر رکھ دے گا ان کے چہروں کو۔ بہت ہی بری ہوگی وہ پینے کی چیز اور بہت ہی برا ہوگا وہ انجام جس سے وہ دوچار ہوں گے۔‘‘

یہ بات سابقہ درس میں واضح کی جا چکی ہے‘ اور ویسے بھی اس منتخب نصاب کے بحیثیتِ مجموعی مطالعے سے یہ بات بالکل مبرہن ہو چکی ہے کہ قرآن مجید کی دعوت ایک انقلابی دعوت ہے۔ دعوتِ ایمان یعنی اللہ‘ آخرت اور رسالت پر ایمان کی بنیاد پر ایک بھرپور انقلابی دعوت۔ بقول حالی

؎ وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؑ
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

پھر اس دعوت کی بنیاد پر ایک مضبوط جماعت کی تشکیل اور اس کی تربیت‘ پھر ماحول سے تصادم کا معاملہ‘ پھر اس تصادم کا مختلف ادوار سے گزر کر اللہ کے دین کے غلبے اور اس کے بالفعل نفاذ و قیام پر منتج ہونا‘ یہ ہے خلاصہ اور لب لباب اس عملی جدوجہد کا جس کا نقشہ ہمیں سیرتِ طیبہ میں نظر آتا ہے اور جس کے خطوط ہمیں آیاتِ قرآنی میں ملتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت سے یہ معاملہ نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہے۔ مجرد دعوت و تبلیغ کے کام میں یا بدھ مت کے بھکشوؤں کے مانند صرف اخلاقی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں وہ مراحل نہیں آیا کرتے جو کسی انقلابی دعوت میں آتے ہیں۔ نبی اکرمﷺ کی دعوت کا اٹھان آغاز ہی سے ایک انقلابی دعوت کا تھا۔ یہ بات اس سے قبل عرض کی جا چکی ہے کہ اس کے خلاف پہلا ردعمل اس وقت کے ماحول کی جانب سے استہزا اور تمسخر کی شکل میں ہوا‘ چٹکیوں میں بات کو اڑانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے پہلی تلقین جو آنحضورﷺ کو کی گئی وہ یہی تھی کہ اے نبی! جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر آپ صبر کیجئے‘ اسے جھیلئے اور ثابت قدم رہئے:

﴿ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاہۡجُرۡہُمۡ ہَجۡرًا جَمِیۡلًا ﴾ (المزمل: ۱۰)

سابقہ درس میں یہ بات بھی بیان ہوئی تھی کہ اگرچہ حضورﷺ کی دعوت کا رخ اس وقت کی سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کی طرف تھا لیکن ابتداءً جن لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا ان میں

ایک بڑی تعداد غلاموں اور نوجوانوں کے طبقے سے تھی۔ چنانچہ اس معاشرے میں تشدد اور ایذا (Persecution) کا اوّلین ہدف یہی دو طبقات بنے۔ تشدد اور ایذا رسانی کا یہ معاملہ سن چار تا چھ نبوی کے دوران اپنی پوری انتہا کو پہنچا اور اسی کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت ملی۔ ہجرتِ حبشہ سے وقتی طور پر حالات میں بہتری پیدا ہوئی جیسے کہ کسی بوائلر سے اگر بھاپ خارج ہو جائے تو اس کی اندر کی ہلچل میں سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ بہت سے مسلمان ہجرت کر گئے لہٰذا کشمکش اور تصادم کی وہ فضا وقتی طور پر کچھ ٹھنڈی پڑی اور مختلف گھرانوں میں اہل ایمان پر تشدد کا جو معاملہ جاری تھا اس کی شدت میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اب ساری مخالفت مرتکز ہو گئی خود محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر!

آنحضور ﷺ کی شخصی مخالفت

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ وہ معاملہ بہر حال نہ ہو سکتا تھا جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا یا جو حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ اور آلِ یاسر رضی اللہ عنہم کے ساتھ پیش آیا۔ یہ بات روایات سے ثابت ہے کہ جس وقت آلِ یاسر (رضی اللہ عنہم) پر ابوجہل دست درازیاں کرتا اور انہیں تشدد کا نشانہ بناتا تھا، حضور ﷺ کا اگر ان کے سامنے سے گزر ہوتا تو آپ انہیں صبر اور استقامت کی تلقین فرماتے۔ گویا صبر کا وہ حکم جو آنحضور ﷺ کو اللہ کی جانب سے پیہم مل رہا تھا آپؐ اسی کو ان الفاظ میں آلِ یاسر (رضی اللہ عنہم) کی جانب منتقل فرما دیتے تھے کہ: اِصۡبِرُوۡا یَا آلَ یَاسِرَ فَاِنَّ مَوۡعِدَکُمُ الۡجَنَّۃُ ''کہ اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو، اور اطمینان رکھو کہ تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے''۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس طرح کے جسمانی تشدد کا کوئی معاملہ شخصاً محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کی وجہ بھی سمجھ لیجئے! دیکھئے اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی کامل ہے اور قدرت بھی۔ وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ﴾ ہے۔ وہ جو کرنا چاہتا ہے اس کے لئے مناسب حالات پیدا فرماتا ہے۔ جس طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی دولت حضور ﷺ کے ظاہری غنا اور خوشحالی کا سبب بن گئی ﴿وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی﴾ کہ مکّے کی متمول ترین خاتون آپؐ کے حبالۂ عقد میں آئیں اور انہوں نے اپنا سب کچھ آپؐ کے قدموں میں ڈال دیا، اسی طرح حکمتِ خداوندی نے مکّے کی اس قبائلی زندگی میں نبی اکرم ﷺ کو ایک اور اعتبار سے بھی تحفظ عطا فرمایا تھا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ سیرتِ مطہرہ کا یہ ایک اہم پہلو ہے کہ حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب کی

زندگی میں پورے قبیلۂ قریش میں بنو ہاشم کو ایک فیصلہ کن اہمیت اور حیثیت حاصل تھی۔ بنو ہاشم کی سرداری کا منصب عبدالمطلب کو حاصل تھا جو بے پناہ شخصی وجاہت کے حامل تھے۔ان کے انتقال کے بعد حضور ﷺ کے تایا زبیر جانشین بنے اور بنی ہاشم کے سردار قرار پائے۔اکثر لوگ اس بات سے لاعلم ہیں کہ دادا کے انتقال کے بعد حضور ﷺ کی کفالت اصلاً آپ کے تایا زبیر نے کی۔ وہ بھی اپنی ذاتی شخصیت کے اعتبار سے اس حیثیت کے مالک تھے کہ انہوں نے بنو ہاشم کی سیادت کو برقرار رکھا۔ان کے انتقال کے بعد بنو ہاشم میں شخصی وجاہت اور ذاتی حیثیت کے اعتبار سے کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا کہ جو قریش میں بنو ہاشم کی سیادت کا سکہ منوالیتا۔ بہرحال وہ سیادت جیسی کچھ بھی تھی' ابوطالب کے ہاتھ آئی۔ابوطالب اگرچہ نبی اکرم ﷺ پر مرتے دم تک ایمان نہیں لائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت انتہائی درجے میں جاگزیں کر دی تھی' جس کی وجہ سے خاندان بنی ہاشم کا تعاون یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی جانب سے ایک حمایت' جو اس قبائلی معاشرے میں بڑی اہمیت کی حامل تھی' نبی اکرم ﷺ کو حاصل رہی۔ چنانچہ مشرکینِ مکّہ کے لئے نبی اکرم ﷺ کے خلاف اس طرح کا معاملہ کرنا ممکن نہ تھا جس طرح کہ حضرت بلالؓ 'یا حضرت خبابؓ یا آلِ یاسرؓ کے ساتھ ہوا۔اکا دکا واقعات ضرور ملتے ہیں' مثلاً ایک مرتبہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے' ابوجہل کچھ فاصلے پر موجود تھا' اس نے اپنے ہم نشینوں سے یہ بات کہی کہ ہے کوئی شخص جو اِن کی خبر لے! عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور اس نے ایک چادر کو بل دے کر اسے ایک پھندے کی شکل میں حضور ﷺ کے گلے میں ڈالا اور اس کے دونوں سروں کو اس طرح کھینچا کہ حضور ﷺ کی آنکھیں ابل آئیں۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ہوئی تو وہ دوڑے ہوئے آئے۔انہوں نے فرمایا: اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ ''بدبختو! کیا تم ایک شخص کو صرف اس جرم کی پاداش میں قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا ربّ اللہ ہے!'' لوگوں نے حضور ﷺ کو تو چھوڑ دیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیٹنا شروع کیا۔اتنا مارا کہ یہ سمجھ کر چھوڑا کہ اب یہ ہلاک ہو چکے ہیں۔اسی طرح کا ایک اور معاملہ بھی پیش آیا۔حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے' ابوجہل نے اسی عقبہ بن ابی معیط کو اشارہ کیا اور وہ ایک اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی اٹھا کر لایا اور جب حضور ﷺ سجدے میں گئے تو اس نے وہ اوجھڑی آپؐ کی گردن پر رکھ دی۔اس طرح کی ایذا رسانی اور اس نوع کے معاملات اکا دکا نبی اکرم ﷺ کے ساتھ پیش آتے تھے۔کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ صبح آپ ﷺ گھر سے نکلتے تو ابولہب اور اس کی بیوی آپؐ کے دروازے کے سامنے کانٹے بچھا دیتے

تھے' یا یہ کہ آپؐ کسی گلی سے گزر رہے ہیں اور کسی نے اوپر سے راکھ یا خاک آپؐ کے سر پر ڈال دی۔

ایک نیا جال

اس قسم کے بعض واقعات تو یقیناً ہوئے لیکن ہجرتِ حبشہ کے بعد ان میں ایک نئی کیفیت کا اضافہ ہوا۔ اور وہ یہ کہ جب لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ بات کسی طریقے سے بھی رک نہیں رہی' ہمارے تشدد کے نتیجے میں کوئی ایک شخص بھی اس نئے دین سے واپس نہیں لوٹا' تو انہوں نے ایک کام تو یہ کیا کہ لالچ کا پھندا پھینکا۔ ابوطالب کے پاس آئے کہ اگر تمہارا بھتیجا بادشاہی چاہتا ہے تو ہم اسے اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں' اگر اسے کچھ دولت کی خواہش ہے تو ہم اس کے قدموں میں دولت کا انبار لگا دیں گے' اگر اسے کسی جگہ نکاح کرنا ہو تو اشارہ کرے' عرب کے جس گھرانے میں وہ چاہے ہم شادی کرا دیں گے۔ ہم اس کا ہر مطالبہ ماننے کے لئے تیار ہیں لیکن کسی طریقے سے تم اس دعوت سے اسے روکو۔ ابو طالب نے حضورﷺ کو بلایا' ساری بات سامنے رکھی۔ حضورﷺ کی عزیمت دیکھئے' آپﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آ سکتا۔

ابوطالب پر قریش کا دباؤ

لالچ (temptation) کے پھندے سے بھی جب آپﷺ صاف بچ نکلے تو پھر ابوطالب کو دھمکی دی گئی کہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے' اب یا تو تم اپنے بھتیجے کی حمایت سے دستکش ہو جاؤ یا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو' ہم نپٹ لیں گے' لیکن اگر تمہارا فیصلہ یہ ہے کہ تم حسبِ سابق خاندانی سطح پر محمد (ﷺ) کی پشت پناہی اور حمایت برقرار رکھو گے تو پھر ٹھیک ہے' کھلے میدان میں آ ؤ' اب بنی ہاشم کا اور قریش کے بقیہ گھرانوں کا کھلا تصادم ہوگا۔ ابوطالب نے گھبرا کر نبی اکرمﷺ کے سامنے یہ بات بھی رکھی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔ گویا ابوطالب کی ہمت بھی جواب دیتی نظر آئی' محسوس ہو رہا تھا کہ قریش کی طرف سے اس متحدہ چیلنج کو قبول کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ شدتِ تاثر سے حضورﷺ کی آنکھیں نم ہو گئیں کہ یہ ایک دُنیوی سہارا جو اب تک حاصل تھا' شاید یہ بھی اب ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ لیکن نہایت پُر عزم لہجے میں آپﷺ نے فرمایا کہ چچا جان! خدا کی قسم' یا تو مَیں اس کام میں اب ہلاک ہو جاؤں گا اور یا اللہ اس کام کو پورا کرے گا' اس سے قدم پیچھے ہٹانے کا کوئی سوال نہیں! اللہ نے اس موقع پر

ابوطالب کو بھی ہمت عطا فرمائی‘ انہوں نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے‘ بھتیجے میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔

شعبِ بنی ہاشم

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کی جانب سے اب نبی اکرم ﷺ اور بنی ہاشم کے خلاف ایک متفقہ اقدام ہوا جس کے نتیجے میں یہ طے کیا گیا کہ بنی ہاشم سے کامل مقاطعہ کیا جائے۔ کوئی خرید وفروخت‘ کوئی لین دین اب ان کے ساتھ نہ کیا جائے اور ہر نوع کا تعلق منقطع کرلیا جائے۔ یہ ایک نوع کا Socio-economic بائیکاٹ تھا جس نے تین سال کی ایک قید کی شکل اختیار کی۔ سن سات نبوی سے شروع ہوکر سن دس نبوی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک گھاٹی میں جسے شعب بنی ہاشم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے‘ یہ خاندان بنو ہاشم محصور ومقید تھا۔ مکمل ناکہ بندی تھی‘ کوئی چیز اندر داخل نہیں ہوسکتی تھی‘ کوئی لین دین ممکن نہیں تھا۔ کچھ نیک دل لوگ کہیں رات کی تاریکیوں میں چھپ چھپا کر کبھی کبھار کھانے پینے کی کوئی چیز پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے تھے ورنہ یہ کہ پورا پہرا موجود تھا۔ یہ ہے سخت ترین قید کی وہ کیفیت کہ جس کے دوران ایسا وقت بھی آیا کہ اس ''وادیٔ غیر ذی زرع'' میں جو جھاڑیاں وغیرہ تھیں ان کے پتے چٹ کرلئے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بنی ہاشم کے بلبلاتے بچوں کو اس کے سوا اور کچھ میسر نہیں تھا کہ سوکھے چمڑے ابال کر ان کا پانی ان کے حلق میں ٹپکا دیا جائے۔ بہرحال نبی اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھ خاندانِ بنی ہاشم نے اس سختی کو جھیلا اور برداشت کیا۔ یہ اسی صبر ومصابرت کا معاملہ تھا کہ مقابلے میں ہاتھ نہیں اٹھائے جارہے‘ لیکن اپنے موقف پر اسی طرح ڈٹے ہوئے ہیں کہ ایک انچ پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔

کچھ صلح پسند اور نیک دل لوگوں کی مداخلت سے سن دس (نبوی) میں یہ مقاطعہ ختم ہوجاتا ہے۔ اخلاقی طور پر کفار کو اس معاملے میں شکست ہوئی‘ اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے موقف میں کوئی نرمی اور کوئی لچک پیدا نہیں کی‘ آپ ﷺ نے اور آپؐ کے خاندان نے ہر سختی کو جھیلا اور تکلیف کو برداشت کیا۔ بالآخر یہ مقاطعہ ختم ہوا۔

شخصی ابتلاء کا نقطۂ عروج: یوم طائف

لوگوں کی طرف سے ڈالی ہوئی آزمائش کا سلسلہ کچھ کم ہوا تو اللہ کی طرف سے ایک براہ راست آزمائش بھی آپ کی منتظر تھی۔ اس پہلو سے گویا شخصاً نبی اکرم ﷺ کے لئے آزمائش کا معاملہ نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ سن دس نبوی میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا بھی انتقال ہوجاتا ہے اور ابوطالب کا بھی۔

گھر میں دلجوئی کرنے والی رفیقۂ حیات تھی' وہ بھی نہ رہی اور خاندانی اعتبار سے سہارا دینے والا ایک پشت پناہ تھا' ابو طالب' وہ بھی رخصت ہوا۔ سرداران قریش کے حوصلے یکدم بلند ہو گئے۔ مشورے ہونے لگے کہ اب وقت ہے کہ آخری فیصلہ کر ڈالا جائے' آخری اقدام اب کر دیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ اس صورتِ حال کو دیکھ کر مکّے سے مایوس ہو کر طائف کا سفر کرتے ہیں۔ عام راستہ آپؐ نے اختیار نہیں کیا' اندیشہ تھا کہ آپؐ کی جان لینے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ ایک نہایت دشوار گزار راستہ اختیار کیا۔ صرف ایک غلام' حضرت زید رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ طائف پہنچ کر آپؐ نے وہاں کے جو تین بڑے سردار تھے' ان تینوں سے ملاقات کی' لیکن ہر طرف سے انتہائی دل کو توڑ دینے والا جواب سننے کو ملا۔ سب نے استہزا' تمسخر اور مذاق کا نشانہ بنایا۔ ایک نے نہایت تمسخر آمیز لہجے میں کہا (معاذ اللہ' نقلِ کفر کفر نباشد) کہ میں تم سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا' اگر تم جھوٹے ہو تو منہ لگانے کے قابل نہیں اور اگر سچے ہو تو ہو سکتا ہے میں کہیں توہین کر بیٹھوں اور اللہ کے نبی کی توہین میرے لئے وبالِ جان بن جائے' لہٰذا آپ تشریف لے جایئے! کسی نے کہا کہ کیا اللہ کو آپ کے سوا کوئی نہیں ملا تھا نبوت اور رسالت کے لئے؟ اسی طرح کے دل توڑ دینے والے اور جگر چھلنی کر دینے والے جواب سن کر نبی اکرم ﷺ لوٹنے کا ارادہ فرما رہے تھے کہ وہ لوگ کچھ اوباش لوگوں کو اشارہ کرتے ہیں کہ ذرا ان کی خبر لو۔ پھر وہ نقشہ جمتا ہے جس کو بیان کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے۔ طائف کی گلیاں ہیں' اللہ کا رسولؐ ہے اور بعینہٖ وہی نقشہ ہے جو ہماری آبادیوں میں کبھی کبھار دیکھنے میں آتا ہے کہ جیسے کوئی دیوانہ شخص ہو اور اوباش چھوکرے چاروں طرف سے اسے کنکریاں مار رہے ہوں' ہنسی مذاق ہو رہا ہو' فقرے چست کئے جا رہے ہوں۔ طائف کی گلیوں میں محمد رسول اللہ ﷺ پر پتھر برسائے جا رہے ہیں' خاص طور پر ٹخنوں کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے جس کے تصور ہی سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے' جسمِ مبارک لہولہان ہو گیا ہے' خون بہہ رہا ہے اور نعلین میں آ کر جم گیا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ نقاہت کی وجہ سے آپؐ بیٹھ جاتے ہیں تو غنڈے آگے بڑھتے ہیں' ایک داہنی بغل میں ہاتھ ڈالتا ہے دوسرا بائیں میں' اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو!! طائف کی گلیوں میں کیا کچھ نہیں ہوا حضور ﷺ کے ساتھ!....گویا ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار

کئی برس بعد مدنی دور میں ایک بار حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ کیا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر یومِ اُحد سے زیادہ سخت بھی کوئی دن گزرا ہے؟ اس لئے کہ ان کی ہوش میں حیاتِ طیبہ کا سخت ترین دن یومِ اُحد تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' زیادہ خون بہہ جانے کے باعث ضعف و نقاہت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بے ہوشی بھی طاری ہوئی' آپؐ کے انتہائی قریبی عزیز اور جان نثار ساتھیوں کی لاشیں آپؐ کی نگاہوں کے سامنے آئیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اسی حوالے سے آپؐ سے سوال کیا تھا کہ اس سے بھی زیادہ کوئی سخت دن آپؐ پر گزرا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں' طائف کا دن مجھ پر اس سے کہیں زیادہ بھاری تھا۔ اُحد کے دامن میں تو وہ جان نثار بھی آپؐ کے ساتھ تھے جنہوں نے آپؐ کی حفاظت کے لئے جسموں کو ڈھال بنایا ہوا تھا۔ طائف میں سوائے ایک غلام کے اور کوئی آپؐ کے ساتھ نہیں تھا۔ گویا آپؐ بالکل یکہ و تنہا تھے اور طائف کی گلیوں میں نقشہ وہ جما جس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا ہے۔ چنانچہ طائف سے واپسی پر ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام کے خیال سے ذرا بیٹھے تو اس وقت آپ کی زبان پر جو دعا آئی اس نے یقیناً عرش کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔((اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَ انِي عَلَى النَّاسِ)) ''اے اللہ! تیری ہی جناب میں شکوہ لے کر آیا ہوں اپنی قوت کی کمی کا' اپنے وسائل و ذرائع کی قلت کا اور اس اہانت و رسوائی کا جو لوگوں کے سامنے ہوئی۔'' ((اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ)) ''اے پروردگار! تُو نے مجھے کس کے حوالے کر رکھا ہے'' ۔((اِلٰى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ اَوْ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَ اَمْرِيْ)) ''کیا میرا معاملہ دشمن کے حوالے کر دیا ہے کہ جو چاہے میرے ساتھ کر گزرے؟'' ((اِنْ لَّمْ يَكُنْ عَلَيَّ غَضَبُكَ فَلَا اُبَالِيْ)) ''اگر تُو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں''۔ اگر تجھے یہی منظور ہے' یہی پسند ہے تو سرِ تسلیم خم ہے۔((اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ)) ''پروردگار! میں تیرے ہی روئے انور کی ضیا کی پناہ میں آتا ہوں جس سے تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔''

یوم طائف کے حوالے سے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بہت صحیح نکتہ بیان کیا ہے کہ شخصی اور ذاتی اعتبار سے طائف کا یہ دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی حد تک ابتلاء و آزمائش کا معاملہ اس آخری انتہا کو پہنچ گیا جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴ میں آیا ہے: ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝﴾ یہ ابتلاء و آزمائش کا وہ نقطۂ عروج

ہے جس کے بعد اللہ کی مدد آتی ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے اسی وقت ملک الجبال' یعنی وہ فرشتہ جو پہاڑوں پر مامور ہے' آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اس نے عرض کیا کہ اللہ نے مجھے بھیجا ہے' اگر آپؐ حکم دیں تو میں طائف کے چاروں طرف کے پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دوں کہ طائف کے رہنے والے سرمہ بن جائیں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت سے نواز دے اور انہیں اسلام لانے کی توفیق عطا فرما دے۔ بہر حال یومِ طائف نبی اکرم ﷺ کے لئے ذاتی اعتبار سے سخت ترین دن تھا کہ اس روز صبر و مصابرت کا مرحلہ آپؐ کے لئے گویا نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ پھر اسی سال آپ کی رفیقۂ حیات اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا اور دنیا میں سہارا دینے والے چچا ابو طالب بھی انتقال کر گئے۔ چنانچہ سن دس نبوی کو حضور ﷺ نے ''عام الحزن'' سے تعبیر کیا' یعنی رنج و غم اور افسوس کا سال۔

طائف سے واپس جب آپ ﷺ مکّے پہنچے تو حالات اتنے مخدوش تھے کہ مکّے میں داخلہ ممکن نہ تھا۔ آپؐ نے مکّہ کے ایک مشرک سردار مطعم بن عدی کو پیغام بھیجا کہ اگر تم مجھے اپنی پناہ میں لے لو تو میں مکّے میں داخل ہو سکتا ہوں۔ اس نے کہا ٹھیک ہے' میں آپؐ کو حمایت کا یقین دلاتا ہوں۔ حضور ﷺ نے دوبارہ پیغام بھجوایا کہ اس طرح نہیں' تم خود آؤ اور مجھے لے کر جاؤ۔ حالات اس درجے ناموافق اور نامساعد ہو چکے ہیں کہ مطعم بن عدی اپنے چھ بیٹوں کو لے کر ہتھیار لگا کر آتا ہے اور نبی اکرم ﷺ کو لے کر مکّہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد البتہ حالات کا رخ بدلتا ہے اور بظاہر مایوسی و ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں امید کے دیئے روشن ہونے لگتے ہیں!

نصرتِ الٰہی کا ظہور

طائف سے واپسی کے بعد سے لے کر ہجرتِ مدینہ تک اڑھائی تین سال کا عرصہ ہماری اِس وقت کی گفتگو کے لحاظ سے دو اعتبارات سے قابل توجہ ہے۔ ایک یہ کہ نصرتِ خداوندی کا ظہور اس شان کے ساتھ ہوتا ہے کہ سن گیارہ نبوی میں مدینہ کے چھ افراد نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آتے ہیں۔ اس کا ذکر اس سلسلۂ درس میں پہلے بھی کسی موقع پر ہو چکا ہے۔ چشم تصور سے دیکھئے! حج کا موسم ہے' مختلف جگہوں سے آئے ہوئے قافلے مختلف وادیوں میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں' اللہ کا رسول ﷺ اللہ کے پیغام کو عام کرنے اور مخلوقِ خدا کو راہِ راست پر لانے کی شدید آرزو دل میں لئے ایک وادی میں سے گزر رہا ہے۔ ایک جگہ چھ افراد ملتے ہیں' ان کے سامنے آپؐ اپنی دعوت پیش کرتے ہیں' وہ چھ افراد

یثرب کی بستی سے آئے ہیں، آپ ؐ کی بات سن کر وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ بات ہوتی ہے کہ یہودی جو دعویٰ کرتے تھے کہ ایک نبی کے ظہور کا وقت قریب ہے، شاید یہ وہی نبی ہیں۔ آؤ کہ ہم ان پر ایمان میں سبقت کرلیں، مبادا یہودی ہم سے آگے بڑھیں اور وہ پہلے ان کی تصدیق کر دیں۔ گویا اوس اور خزرج کو یہود کے ذریعے سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ ان کے ایمان کا ذریعہ بن گئیں۔ (واضح رہے کہ یثرب میں دو قبائل اوس اور خزرج آباد تھے جنہیں ہم وہاں کے قدیم باشندے قرار دے سکتے ہیں، جبکہ یہودیوں کے بھی تین قبائل مدینے کے قرب و جوار میں آ کر آباد ہو گئے تھے) اگلے سال سن بارہ نبوی میں بارہ افراد ایمان لے آئے اور انہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت عقبۂ اولیٰ ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اپنا کوئی نمائندہ ہمیں دیجئے جو ہمیں قرآن کی تعلیم دے۔ سورۃ الجمعہ کا درس ذہن میں لایئے، قرآن حکیم ہی حضور ﷺ کی دعوت کے مرکز ومحور کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ؎ ''قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند'' کے مصداق اس عظیم کام کے لئے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوتا ہے۔

یہاں ان کا شخصی تعارف کرا دینا بہت مناسب ہوگا۔ یہ ایمان اس وقت لائے جب ابھی بالکل نوعمر تھے۔ بڑے ہی ناز ونعم میں پرورش ہوئی۔ ان کے لئے دو دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا۔ نہایت قیمتی اور معطر لباس میں ملبوس جہاں سے گزرتے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے، لوگ اشارہ کرتے کہ وہ مصعب جا رہا ہے۔ ایمان لے آئے تو گھر والوں نے سب کچھ چھین کر بالکل برہنہ حالت میں نکال باہر کیا کہ اگر تم نے آباء واجداد کے دین کو چھوڑا ہے تو اپنے آباء واجداد کی دولت اور ان کی وراثت سے بھی تمہیں کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ اب وہ نوجوان ہر شے سے کٹ کر محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہی مصعبؓ ہیں کہ جن کے نام قرعۂ فال نکلتا ہے اور وہ معلمِ قرآن بنا کر یثرب بھیج دیئے جاتے ہیں۔ وہاں ان کا نام "المُقری" (پڑھانے والا) مشہور ہو گیا۔ انؓ کی محنت کا حاصل یہ تھا کہ اگلے سال سن ۱۳ نبوی کے حج کے موقع پر ۷۵ افراد جن میں ۷۲ مَرد اور ۳ عورتیں شامل تھیں، محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کے لئے حاضر ہوئے۔ بیعتِ عقبۂ ثانیہ ہو رہی ہے۔ یہی بیعت ہجرتِ مدینہ کی بنیاد بن گئی، اس لئے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے یہ معاہدہ کیا کہ آپ ؐ ہمارے ہاں تشریف لایئے، ہم آپ ؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے کہ جیسے اپنے اہل وعیال کی کرتے

ہیں۔ یہ معاہدہ ہوا اور ہجرتِ مدینہ کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔ بہرحال نصرتِ خداوندی کا ظہور اس طور سے ہوا کہ کہاں طائف میں یہ حالت تھی کہ آپؐ خود وہاں تشریف لے گئے اور ہر جانب سے انتہائی مایوس کن جواب ملا اور کہاں یہ کیفیت کہ مدینہ منورہ میں آنحضور ﷺ کے قدم ابھی پہنچے بھی نہیں، آپؐ کا ایک ادنیٰ جان نثار وہاں جا کر دعوت وتبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور وہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک انقلاب آ گیا، اوس اور خزرج کے سربرآوردہ لوگ ایمان لے آئے۔ اللہ نے مدینہ کو حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے لئے سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۲۶ کے مطابق ایک پناہ گاہ اور دعوتِ اسلامی کا مرکز بنا دیا۔ بہرحال ایک طرف تو نصرتِ خداوندی کا یہ ظہور ہے، اسے نگاہ میں رکھئے اور دوسری طرف مَکّہ اور اہلِ مَکّہ کے ساتھ جو ہو رہا ہے، اسے بھی ذہن میں لائیے!

مصالحت کی کوشش۔ دامِ ہمرنگِ زمین

اس دور میں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مصالحت کی ایک بھرپور کوشش ہوئی جس میں ولید بن مغیرہ نے مرکزی کردار ادا کیا۔ بالکل ابتدائی سورتوں میں سورۂ مدثر اور سورۂ نون (جسے سورۃ القلم بھی کہتے ہیں) مشرکین میں سے جس نمائندہ کردار کا مذمت کے انداز میں ذکر ہے وہ جامہ ولید بن مغیرہ پر ہی راست آتا ہے۔ یہ شخص بالکل آغاز ہی میں دل سے قائل ہو چکا تھا کہ محمد (ﷺ) حق پر ہیں۔ حقیقت اس پر منکشف ہو چکی تھی۔ ایک وقت وہ بھی آیا تھا کہ اس کے ساتھیوں کو یہ خطرہ ہو گیا تھا کہ اس پر محمدؐ کا جادو چل گیا ہے، لیکن مصلحتوں، مفادات اور چودھراہٹ کی بیڑیاں اس کے پاؤں میں پڑی رہ گئیں اور وہ محروم رہا۔ لیکن بعد میں محسوس یہ ہوتا ہے کہ مسلسل اس کی یہ کوشش رہی کہ کوئی مصالحت ہو جائے۔ چنانچہ یہ وہ وقت ہے کہ جس کے دوران وہ مصالحانہ کوششیں پوری شدت کو پہنچ گئیں۔ اس ضمن میں چند واقعات ملتے ہیں اور آج کے درس کے لئے جن آیات کو عنوان بنایا گیا تھا ان کا مضمون بھی اسی سے متعلق ہے۔ کسی داعئ حق کے لئے یہ مصالحت کا دامِ ہم رنگِ زمین انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ معاملہ وہ ہے کہ اس میں اگرچہ براہ راست مقابلے یا مخالفت کی فضا نہیں ہوتی اور بظاہر انداز میٹھا ہوتا ہے لیکن اگر کہیں اس دامِ ہم رنگِ زمین میں کوئی داعئ حق گرفتار ہو جائے تو لامحالہ اس کی منزل کھوٹی ہو جائے گی اور معاملہ ختم ہو جائے گا۔ مَکّے میں جو حالات تھے ان کے پیشِ نظر بربنائے طبعِ بشری آپؐ کا ان سے متاثر ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ آپؐ جانتے تھے کہ اگر ان سرداروں میں سے کوئی ایمان لے آئے تو اس سے ایمان اور اسلام کے لئے راستے کھل جائیں گے اور یہ چیز اہل ایمان کے لئے بہت

تقویت کا باعث ہوگی‘ جیسا کہ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام سے اہلِ ایمان کو دُنیوی اعتبار سے سہارا ملا۔ یہی وہ بات تھی کہ جس کے تحت جب یہ سردارانِ قریش آپؐ کے پاس مصالحانہ گفتگو کے لئے آتے تھے تو حضورﷺ پذیرائی فرماتے اور ان کی جانب ملتفت ہوتے۔ اسی سلسلے میں وہ واقعہ پیش آیا کہ جس کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ گرفت بھی ہوئی۔ ایک نابینا صحابی عبداللہ بن اُمّ مکتوم ؓ ایک بار ایسے وقت حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب آپؐ سردارانِ قریش سے گفتگو فرما رہے تھے‘ حضرت عبداللہؓ بار بار حضورﷺ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتے‘ جس پر حضورﷺ کے چہرے پر کسی قدر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ سورۃ عبس کے آغاز میں اسی واقعے کا حوالہ ہے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی ۞ اَنْ جَآءَ ہُ الْاَعْمٰی ۞ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی ۞ اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی۞ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی۞ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی۞ وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی۞ وَاَمَّا مَنْ جَآءَ كَ یَسْعٰی ۞ وَهُوَ یَخْشٰی۞ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی۞ كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۞ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۞﴾

’’تیوری چڑھائی اور رخ پھیر لیا کہ ان کی خدمت میں ایک نابینا حاضر ہوا۔ اور تمہیں کیا معلوم شاید کہ وہ پاکیزگی حاصل کرتا یا نصیحت اخذ کرتا تو وہ نصیحت اس کے لئے فائدہ بخش ہوتی۔ اور وہ کہ جو بے پروائی اختیار کرتا ہے تو تم اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو (یعنی سردارانِ قریش کی جانب آپؐ خصوصی التفات فرماتے اور آپ کی کوشش ہوتی کہ وہ ایمان لے آئیں) اور جو چل کر آتا ہے اور جس کے دل میں خشیت ہے (تزکیہ حاصل کرنے کی طلب ہے) تو تم اس سے اعراض کرتے ہو۔ ہرگز نہیں‘ یہ تو بس ایک یاددہانی ہے‘ تو جو چاہے اس نصیحت کو اخذ کرے‘ (اس سے فائدہ اٹھالے)‘‘۔

آنحضورﷺ کے لئے خصوصی ہدایات

آنحضورﷺ کو یہاں توجہ دلائی گئی کہ اگرچہ آپؐ کی یہ خواہش اپنی جگہ بجا ہے کہ سردارانِ قریش ایمان قبول کرلیں تاکہ مسلمانوں کے لئے آسانی ہوجائے‘ لیکن ان کی جانب آپؐ کا یہ غیر معمولی التفات بھی مناسب نہیں ہے۔ آپؐ انہیں ایمان کی دعوت ضرور دیجئے لیکن یہ انداز اختیار نہ کیجئے! یہی بات سورۂ کہف کی ان آیات میں آئی ہے:

﴿وَاتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ج وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۞﴾

کہ اے نبی! جو کتاب آپؐ پر نازل فرمائی گئی ہے اس کی تلاوت کیجئے‘ اسے پڑھتے رہیے۔ آپؐ کے

صبر و ثبات کی اصل اساس یہ ہے...... یہ مضمون اس سے پہلے ہمارے سابق درس سورۃ العنکبوت میں بھی آ چکا ہے' جہاں اکیسویں پارے کی پہلی آیت بعینہٖ انہی الفاظ سے شروع ہوتی ہے: ﴿اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ......﴾ اور جان لیجئے کہ اللہ کے فیصلوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ آپؐ کی جدوجہد کا نتیجہ کب ظاہر ہوگا' راستہ کہاں سے نکلے گا' یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ آپؐ اپنا فرضِ منصبی ادا کیجئے' آپؐ کے ذمے تو بس صاف صاف پہنچا دینا ہے' کسی کے پیچھے پڑ کر اپنے لئے یا اس دین کی دعوت کے لئے کسی درجے میں بھی کسی ہلکے پن کا کوئی امکان پیدا نہ ہونے دیجئے۔ ﴿وَلَنۡ تَجِدَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا ۝﴾ اور سمجھ لیجئے کہ آپؐ کو پناہ تو بس اللہ ہی کے ہاں ملے گی' وہی پناہ مہیا فرمائے گا' نصرت و تائید وہیں سے ملے گی۔ ان اسبابِ ظاہری کی جانب آپؐ ملتفت نہ ہوں' ان کی طرف زیادہ توجہ نہ فرمائیں' آپؐ کا ملجا و ماویٰ بس اللہ ہی کی ذات ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا:

﴿وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ﴾

یہاں لفظ''صبر'' کو نوٹ کیجئے جو منتخب نصاب کے اس حصّے کا اصل موضوع ہے جو ہمارے زیرِ مطالعہ ہے۔ صبر کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ان فقراء اور ضعفاء کے ساتھ مصاحبت اختیار کیجئے جو اگرچہ کمزور اور بے حیثیت لوگ ہیں لیکن ایمان لا چکے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حضرت نوح علیہ السلام سے ان کی قوم کے سرداروں نے کہا تھا: ﴿ھُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاۡیِ﴾ کہ اے نوح! ہم تمہارے پاس کیا آ کر بیٹھیں اور تم سے کیا بات کریں؟ تمہارے اردگرد تو ان لوگوں کا جمگھٹا ہوتا ہے جو ہمارے معاشرے کے گھٹیا اور کمین لوگ ہیں! ہم تمہاری بات سنیں تو کیسے' تمہارے پاس آئیں تو کیسے؟ یہی معاملہ سردارانِ قریش کا بھی تھا' وہ بھی اس بات پر معترض تھے کہ آپ کے آس پاس بیٹھنے والے تو اکثر وہ لوگ ہیں جو ہمارے غلاموں کے طبقے سے ہیں' ان کی موجودگی میں ہم آپؐ کی محفل میں کیسے آ سکتے ہیں؟ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپؐ تو بس اپنے آپ کو انہی فقراء کے ساتھ تھام کر رکھئے۔ یہ لوگ اگرچہ دنیاوی اعتبار سے بے حیثیت ہیں' دُنیوی مال و اسباب ان کے پاس نہیں ہے' لیکن یہ ایمان اور محبتِ الٰہی کی دولت سے مالا مال ہیں' یہ صرف اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں' یہ صرف اس کی رضا کے طالب ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو صبح و شام اپنے ربّ کو پکارتے ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿وَلَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ ۚ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا﴾ آپ کی نگاہیں ان درویشوں سے

ہٹ کر ان سردارانِ قریش کی جانب متوجہ نہ ہونے پائیں کہ کہیں دیکھنے والے کو یہ مغالطہ ہو کہ شاید آپؐ بھی دنیا کی چمک دمک سے متاثر ہو گئے ہیں اور شاید دنیا کی ظاہری زیب وزینت اور چہل پہل سے آپؐ نے بھی کوئی تاثر قبول کر لیا ہے۔

آیت کے اگلے ٹکڑے میں فرمایا:﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ﴾ کہ یہ جو مصالحت کے لئے سردارانِ قریش آپؐ کے پاس آتے ہیں ان کے اصل باطن کو دیکھئے' یہ حق کو پہچاننے کے بعد اس سے اعراض کر رہے ہیں' ان کے کہنے میں نہ آیئے' ان کی چکنی چپڑی باتوں سے آپؐ متاثر نہ ہوں۔ یہ لوگ اپنی خواہشات کا اتباع کر رہے ہیں' ہماری یاد سے ان کے دل غافل ہیں۔ ہم نے انہیں محروم کر دیا ہے اپنی یاد کی لذت سے۔ ان کی پوری زندگی ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں۔ ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ اور اے نبی! ان سے ڈنکے کی چوٹ کہئے: مجھے تمہاری کوئی خوشامد نہیں کرنی' مجھے چاپلوسی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' یہ تمہارے ربّ کی جانب سے حق ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ تو جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے۔ داعئ حق کے لئے استغنا کا یہ انداز برقرار رکھنا ضروری ہے تاکہ لوگ اس مغالطے میں مبتلا نہ ہوں کہ اس کی کوئی ذاتی غرض اس دعوت کے ساتھ کسی درجے میں ملحق ہو گئی ہے۔

اس کے بعد غیظ وغضب کے انداز میں کفار کے انجام کا ذکر ہے۔ فرمایا:﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ ہم نے ان ظالموں کے لئے وہ آگ فراہم کی ہوئی ہے جو ان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لے گی جیسے کہ قناتیں ہوتی ہیں۔ ﴿وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ﴾ اور اگر یہ چیخیں گے' پکاریں گے' فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی اس پانی سے کی جائے گی جو کھولتے اور پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہو گا کہ جس سے ان کے مُنہ جل کر رہ جائیں' وہ پانی ان کے چہروں کو بھون کر رکھ دے گا۔ ﴿بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا﴾ وہ بہت ہی بری شے ہو گی پینے کی اور بہت ہی برا ہو گا وہ انجام جس سے یہ دوچار ہوں گے۔

''کوئی اور قرآن پیش کرو''۔ مشرکین کا ایک مطالبہ

یہاں دیکھئے کہ اس پُر فریب مصالحانہ روش کی کس شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور اس دامِ ہمرنگ زمین میں کسی داعئ حق کے گرفتار ہو جانے کے امکان یا اندیشے کا کس شدّ ومدّ اور کتنے اہتمام

کے ساتھ سدِّ باب کیا گیا ہے۔اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سردارانِ قریش کی جانب سے اس مرحلے پر ایک خاص بات یہ پیش کی گئی کہ اے محمد (ﷺ)! ہمیں تم سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے' تم سے ہمارا کوئی جھگڑا یا ذاتی نوعیت کی کوئی لڑائی نہیں ہے' لیکن یہ قرآن جو تم پیش کر رہے ہو' ہمارے لئے نا قابلِ قبول ہے۔ٹھیک ہے کچھ باتیں اپنی منوا لو کچھ ہماری مانو' کچھ لے دے کر معاملہ کرو' یہ قرآن تو بہت rigid (بے لچک) ہے' لہٰذا یا تو کوئی اور قرآن پیش کرو جو اِس سے مختلف ہو یا اسی میں کوئی تغیر و تبدل کر کے کچھ لچک پیدا کرو' تبھی ہمارے اور تمہارے مابین کوئی مفاہمت اور مصالحت ہو سکتی ہے۔

اس پوری صورتِ حال کو ذہن میں رکھئے' بظاہر اسلام کے فروغ کا کہیں کوئی امکان نظر نہیں آ رہا' ہر چہار طرف سے راستے بند نظر آتے ہیں' یہ درست ہے کہ نبوت کے گیارہویں سال مدینہ کی جانب سے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلتی ہے' چھ افراد حضور کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں' اگلے سال اس کھڑکی کا حجم کچھ بڑھ جاتا ہے' ایمان لانے والوں کی تعداد چھ سے بڑھ کر بارہ ہو جاتی ہے لیکن باقی تو ہر چہار طرف گھپ اندھیرا ہے' کہیں کسی جانب سے روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی' کچھ پتہ نہیں چلتا کہ راستہ کدھر سے نکلے گا۔ ان حالات میں امکانی طور پر بربنائے طبعِ بشری یہ خیال دل میں آ سکتا ہے کہ چلو حکمتِ عملی کا تقاضا سمجھ کر ہی کچھ لے دے کر معاملہ کر لیا جائے تا کہ بات کچھ تو آگے بڑھے' اگر ہمارا موقف اسی طریقے سے بالکل دوٹوک اور بے لچک (rigid) رہا پھر تو معاملہ بالکل ٹھپ ہو کر رہ جائے گا' راستہ کھلنے کے تمام امکانات مسدود ہو کر رہ جائیں گے۔اس امکان کو سامنے رکھئے اور دیکھئے قرآن مجید اس سلسلے میں کیا ہدایات دیتا ہے۔سورۂ یونس سے سورۂ مؤمنون تک مکّی سورتوں کا جو طویل سلسلہ ہے ان میں سے اکثر و بیشتر سورتیں اسی دور میں نازل ہوئی ہیں۔سورۂ یونس میں فرمایا گیا:

﴿وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَیۡرِ ہٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡہُ﴾

کہ جب ان مشرکین کو ہماری روشن آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ کہ جو ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے' جنہیں یہ گمان ہی نہیں ہے کہ ہمارے حضور میں حاضری ہو گی' کہتے ہیں کہ اے محمد (ﷺ)! اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن پیش کرو یا اس میں کچھ تبدیلی کر لو۔

قرآن کا دوٹوک جواب

جواباً نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا: ﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِيْ﴾ اے نبی! کہہ دیجئے' میرے لئے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اسے اپنے جی سے بدل دوں' اپنی مرضی سے اس میں کوئی ترمیم کر دوں۔ ﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ میں تو خود پابند ہوں اس کا کہ جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے۔ ﴿اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے تو خود اندیشہ ہے اپنے پروردگار کی طرف سے ایک بہت بڑے دن کی سزا کا۔

یہ مضمون قرآن حکیم میں ایک سے زائد مرتبہ آیا ہے' لیکن جیسا کہ قرآن مجید میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر مضمون کے لئے کوئی ایک مقام ایسا ہوتا ہے کہ جہاں وہ مضمون اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے' اسی طرح اس مضمون کا ذروۃ السنام یا نقطۂ کمال (Climax) سورۂ بنی اسرائیل کے وسط میں ملتا ہے۔ آیت نمبر ۷۳ سے بات شروع ہوتی ہے: ﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ق﴾ اور اے نبی! یہ لوگ تو اس پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں کہ کسی طرح آپؐ کو بچلا دیں اس چیز کی طرف سے جو ہم نے آپؐ کی جانب وحی کی ہے (یعنی قرآن حکیم)' تاکہ آپؐ اس کے سوا کوئی چیز اپنے پاس سے گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیں۔ وہ تو آپ پر پورا دباؤ ڈال رہے ہیں اور اپنی پوری قوتیں اس پر صرف کر رہے ہیں کہ کسی طرح آپؐ کو اس موقف سے ہٹا کر مصالحت پر آمادہ کر دیں کہ کچھ لے دے کر بات بن جائے اور کوئی ایسی بات اللہ کی طرف منسوب کر دی جائے کہ جس سے ان کے مشرکانہ موقف کی بھی تائید ہوتی ہو۔ فرمایا: ﴿وَاِذًا لَّا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝﴾ اور اگر آپؐ ایسا کر لیں تو پھر تو وہ آپؐ کو اپنا دوست بنا لیں گے' جھگڑے اور اختلاف کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اگلی آیت اس مضمون کے اعتبار سے بہت اہم ہے: ﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ۝﴾ اور اے نبی! اگر ہم ہی نے آپؐ کو ثبات عطا نہ کیا ہوتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ آپؐ ان کی جانب کچھ تھوڑا سا جھک ہی جاتے۔ یہ ہے طبعِ بشری کا وہ تقاضا اور حالات سے متاثر ہونے کا امکان جس کا واضح ذکر یہاں موجود ہے۔ جب چاروں طرف سے راستہ بند نظر آتا ہو تو امکانی طور پر یہ بات ذہن میں آ سکتی ہے کہ وقتی طور پر اگر کچھ تھوڑی بہت مصالحت کر کے کام نکال لیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے' پھر جب حالات ہمارے کنٹرول میں آ جائیں گے تو ہم پھر اپنے اصل موقف کی طرف رجوع کر جائیں گے۔ اسی امکان کا دروازہ بند کرنے کے لئے قرآن حکیم میں حضور ﷺ کو

مختلف اسالیب میں صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ سورۃ النحل کے آخر میں فرمایا:﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ کہ اے نبی! صبر کیجئے اور آپؐ کا صبر اللہ ہی کے سہارے ہے۔ آپؐ کے صبر کے لئے اصل سہارا اللہ ہی کی ذات ہے۔ اللہ پر بھروسہ' اُس پر توکل اور ''تفویض الامر الی اللّٰہ'' ہی درحقیقت بندۂ مؤمن اور بالخصوص داعیٔ حق کے صبر کی اساس اور جڑ بنیاد ہے۔

اگلی آیت میں الفاظ کی ظاہری سختی پر ذرا نظر کیجئے' اسی سختی اور درشتی کا رخ اصل میں کفار کی طرف ہے' کان ان کے کھولے جا رہے ہیں' انہیں سنایا جا رہا ہے کہ ہمارے نبیؐ سے اس بات کی توقع نہ رکھو کہ وہ تمہاری باتوں میں آ کر اللہ کے کلام میں تغیر و تبدل کی جسارت کریں گے' لیکن ظاہراً خطاب یہاں حضور ﷺ کی طرف ہے: ﴿اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۞﴾ اے نبی! اگر بالفرض ایسا ہو جاتا تو ہم آپؐ کو دوگنا مزا چکھاتے دنیا کی زندگی کے عذاب کا اور دوگنا ہی موت کے عذاب کا اور آپؐ ہمارے مقابلے میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں اشارہ ہو رہا ہے ہجرتِ مدینہ کی طرف۔ ہمارے پچھلے سبق میں' جو سورۃ العنکبوت کی بعض آیات پر مشتمل تھا' ہجرتِ حبشہ کی طرف اشارہ ان الفاظ میں تھا:﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۞﴾ اے میرے وہ بندو جو مجھ پر ایمان لائے ہو! میری زمین کشادہ ہے' پس بندگی صرف میری کرو ؎

پائے مرا لنگ نیست
ملکِ خدا تنگ نیست!

تمہیں ہر حال میں اللہ کی بندگی کرنی ہے اور اس کی خاطر اپنے وطن اور اپنی سرزمین کو چھوڑنا پڑے تو بے دریغ ہجرت کر جاؤ۔ یہاں سورۂ بنی اسرائیل میں بھی ہجرت کا اشارہ دے دیا: ﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا﴾ اور یہ لوگ تو اب تلے ہوئے ہیں اس پر کہ آپؐ کے قدم اکھاڑ دیں اس سرزمین سے۔ ان مشرکین کی پوری کوشش ہے کہ سرزمینِ مکّہ سے آپؐ کو نکال باہر کریں۔ ان کے اس مذموم ارادے پر اللہ تعالیٰ نے نفیاً یہ نہیں فرمایا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا' بلکہ صرف یہ فرمایا:﴿ وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞﴾ کہ پھر اس صورت میں یہ لوگ بھی یہاں زیادہ دیر رہ نہ سکیں گے' انہیں بھی یہاں پر اب زیادہ دیر تک تمکن حاصل نہ رہے گا۔ گویا کہ اشارہ ہو گیا کہ ہجرت کا وقت آ رہا ہے۔ لیکن آپؐ کے یہاں سے تشریف لے جانے کے بعد یہ ابوجہل' یہ ابولہب' یہ ولید بن

مغیرہ‘ یہ عقبہ بن ابی معیط‘ یہ عتبہ بن ربیعہ‘ یہ سب لوگ زیادہ دیر اس مکّے کی سرزمین میں آباد نہ رہیں گے‘ یہ بہت جلد کیفرِ کردار کو پہنچیں گے۔ فرمایا: ﴿سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝﴾ یہ ہمارا مستقل ضابطہ اور قاعدہ ہے ان تمام رسولوں کے بارے میں کہ جنہیں ہم نے تم سے پہلے بھیجا اور ہمارے اس ضابطے میں تم کبھی کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

پھر جس طرح سورۃ العنکبوت کے درس میں یہ بات ہمارے سامنے آئی تھی کہ اس طرح کی کٹھن اور مشکل صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مسلمان کا اصل سہارا نماز اور ذکرِ الٰہی ہے‘ اسی طرح یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیت میں نماز کی تاکید ہے: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ نماز قائم رکھو سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد رات کے تاریک ہو جانے تک! ظہر سے عشاء تک چونکہ اوپر تلے نمازیں آتی ہیں لہٰذا ان نمازوں کا ذکر اس انداز میں کیا گیا۔ ذہن میں رکھئے کہ اس سورۃ یعنی سورۂ بنی اسرائیل میں معراج کا ذکر ہے اور معراج ہی میں پانچ نمازوں کی فرضیت کا معاملہ ہوا۔ سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد سے لے کر ظہر‘ عصر‘ مغرب اور عشاء کی نمازیں پے بہ پے آتی ہیں‘ گویا کہ نماز قائم رہتی ہے۔ جو انسان نماز باجماعت کا پابند ہو وہ وقفے وقفے سے مسجد جاتا اور آتا ہے۔ چار نمازوں کا ذکر یوں ہوا اور پانچویں نماز یعنی نمازِ فجر کا تذکرہ ایک منفرد شان سے ہوا: ﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ اور قرآن پڑھنا فجر کا۔ کیونکہ اس میں طویل قراءت کا خاص اہتمام ہوتا ہے‘ دیگر نمازوں کے مقابلے میں قرآن مجید کا زیادہ حصّہ پڑھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا: ﴿اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝﴾ واقعہ یہ ہے کہ فجر کے وقت قرآن کی جو تلاوت ہوتی ہے اس پر موجودگی ہوتی ہے‘ یعنی قلب بھی حاضر ہوتا ہے اور جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں‘ رات اور دن دونوں اوقات کے فرشتوں کا اس وقت اجتماع ہوتا ہے۔

فرض نمازوں کے ذکر کے بعد فرمایا: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ اور اے نبی (ﷺ)! ایک چیز آپؐ کے لئے اضافی طور پر لازم ہے۔ رات میں بھی آپؐ کھڑے رہا کریں اس قرآن کے ساتھ۔ قرآن کے ساتھ رات کو جاگنے اور قیام کرنے کا حکم بالکل ابتداء میں بھی آ چکا تھا: ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ (سورۃ المزمل) یہاں گویا کہ دوبارہ اس کی تاکید ہو رہی ہے کہ آپؐ کے لئے بالخصوص یہ رات کی نماز بہت ضروری ہے۔ ساتھ ہی ایک بشارت بھی دے دی: ﴿عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝﴾ کہ ہوسکتا ہے کہ آپؐ کا ربّ آپ کو مقامِ محمود عطا فرمائے۔

ابھی تک سورۂ بنی اسرائیل کی جو آیات ہم نے پڑھی ہیں ان میں صرف ایک رواں ترجمہ پر ہی اکتفا کیا گیا ہے تاکہ مضمون یہاں تک پہنچ جائے کہ جہاں ہجرت کا حکم وارد ہوا ہے۔ اگلی آیت میں یہ حکم بشکلِ دعا وارد ہوا ہے:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا﴾

''اور اے نبی! اپنے ربّ سے یہ دعا کیجئے کہ اے میرے ربّ! مجھے داخل کر سچائی کا داخل کرنا اور مجھے نکال سچائی کا نکالنا اور میرے لئے خاص اپنے خزانۂ فضل سے وہ غلبہ وقوت عطا فرما جو میری پشت پناہ بنے۔''

یہ اللہ کی طرف سے اس انداز میں دعا کی تلقین دراصل اس کی پیشگی قبولیت کے اعلان کے طور پر ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک بشارت ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو کہ اب آپؐ کی دعوت ایک دوسرے مرحلے میں داخل ہونے والی ہے۔ اب وہ دَور آیا چاہتا ہے کہ جس میں وہ سرزمین کہ جو آپؐ کی دارالہجرت بننے والی ہے' وہاں آپ کو تمکن اور غلبہ واقتدار حاصل ہوگا اور اس طرح غلبۂ دینِ حق کی راہ ہموار ہو گی۔ اور کچھ عرصے بعد بالآخر وہ صورت ہو جائے گی کہ حق کا بول بالا ہوگا اور باطل نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس کی بشارت اگلی آیت میں موجود ہے: ﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا﴾ ''اعلان کر دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا' اور باطل تو ہے ہی مٹنے والا۔'' یہ تھوڑا سا وقتی غلبہ جو بظاہر باطل کو حاصل ہے اس سے انسان وقتی طور پر متاثر بھی ہو جاتا ہے اور یہ بھی درحقیقت اہل حق کی آزمائش کے لئے ہوتا ہے' ورنہ باطل کے لئے ثبات کہاں؟

یہ ہیں وہ مراحل کہ جن سے نبی اکرم ﷺ گزر رہے تھے۔ مکّی دور کا ایک اجمالی سا نقشہ رکھ دیا گیا کہ کس کس پہلو سے اور کس کس گوشے سے حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ پر آزمائش آئی اور کس کس اعتبار سے صبر اور مصابرت کی ضرورت پیش آئی۔ بہرحال اس مکّی دور کا جو نقطۂ اختتام ہے اسے یوں سمجھئے کہ ان ساری مصالحتی کوششوں کو ان کے پیش کرنے والوں کے مُنہ پر مار کر ان سے دوٹوک الفاظ میں اعلانِ براءت کیا گیا۔ اس راہ میں اگر تشدد ہوا تو اس کو پامردی سے سہا' فقر وفاقہ آیا تو اسے جھیلا' قید وبند آئی تو اسے برداشت کیا' پتھراؤ ہوا تو اس کو انگیز کیا' لالچ دیا گیا تو اس کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑے رہے' مصالحت کی پیشکش ہوئی تو اس کو ٹھکرایا اور آخری اعلان براءت ان الفاظ میں ہوا۔

﴿قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ٪﴿۶﴾﴾

یہ اعلانِ براءت سورۂ زمر میں بہت ہی شدت کو پہنچ گیا ہے۔ یوں کہئے کہ اس کا نقطۂ عروج یہی مقام ہے: ﴿قُلۡ اَفَغَیۡرَ اللّٰهِ تَاۡمُرُوۡٓنِّیۡۤ اَعۡبُدُ اَیُّهَا الۡجٰهِلُوۡنَ ﴿۶۴﴾﴾ اے نادانو' اے کم علمو اور ناسمجھ لوگو' اے جاہلو! کیا تم مجھے یہ حکم دے رہے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو پوجنے لگوں؟ مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو تو درحقیقت تمہاری یہ کوشش اور تمہاری یہ توقع سراسر باطل ہے۔ یہ جماؤ' یہ صبر' یہ تحمل اور یہ مصابرت ہی دراصل اس راہ میں درکار ہے۔

وَآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربِّ العالمین!
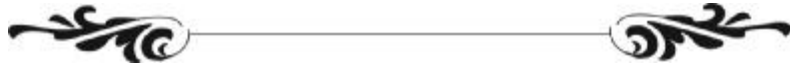
درس 22

مدنی دور کا آغاز

اہل ایمان کو پیشگی تنبیہ

سُوْرَةُ الْبَقَرَة کی آیات ۱۵۳ تا ۱۵۷ کی روشنی میں!

درس ۲۲

مدنی دَور کا آغاز

اہل ایمان کو پیشگی تنبیہہ

سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۵۳ تا ۱۵۷ کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رَسولِہِ الکریم ...... اَمَّا بَعد:

اَعُوذ بِاللّٰہ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّ لٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَ الۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ ۟ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ ...... صدق اللّٰہ العظیم

مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے پانچویں حصّے کا تیسرا درس سورۃ البقرۃ کی پانچ آیات (۱۵۳ تا ۱۵۷) پر مشتمل ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ یوں ہے:

''اے ایمان والو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور مت کہو اُن کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں' مردہ! بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔ اور ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کچھ خوف سے' بھوک سے اور مال و جان کے نقصان سے اور نتائج و ثمرات کے ضیاع سے۔ اور اے نبی! خوشخبری سنا دیجیے ان صبر کرنے والوں کو کہ جن پر اگر کوئی مصیبت ٹوٹتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جن پر اُن کے ربّ کی جانب سے عنایتیں ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ کہ جو راہ یاب ہونے والے ہیں۔ (منزلِ مراد تک پہنچنے والے ہیں۔)

ان آیات سے درحقیقت سورۃ البقرۃ کے نصفِ ثانی کا آغاز ہو رہا ہے' تاہم اس بات کو سمجھنے کے لیے سورۃ البقرۃ کے زمانۂ نزول کو ذہن میں رکھنا اور اس کے مضامین کے درمیان جو ایک نہایت

گہری حکیمانہ ترتیب ہے' اس پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ زمانۂ نزول کے اعتبار سے سورۃ البقرۃ پہلی مدنی سورت ہے۔ تقریباً ڈھائی پاروں پر پھیلی ہوئی اور ۲۸۶ آیات پر مشتمل قرآنِ حکیم کی یہ طویل ترین سورۃ اکثر و بیشتر ان آیات پر مشتمل ہے جو ہجرت کے فوراً بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک وقتاً فوقتاً نازل ہوئیں۔ صرف چند آیات مستثنیٰ ہیں' مثلاً سود کی حرمت سے متعلق آیات اور قرض کے لین دین سے متعلق احکام پر مشتمل طویل آیت جو کہ مدنی دَور کے آخری زمانے سے متعلق ہیں' یا پھر سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیتیں جن کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ وہ معراج کی شب نبی اکرم ﷺ کو اُمت کے لیے تحفے کے طور پر عطا ہوئیں۔ باقی قریباً پوری سورۃ ہجرت کے فوراً بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل کے عرصے کے دوران نازل ہوئی جس کا دورانیہ کم و بیش دو سال بنتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے اور ان دونوں سورتوں کے مضامین میں بڑی گہری مناسبت ہے' گو مصحف میں ان کے مابین لگ بھگ پندرہ پاروں کا فصل ہے' سورۃ البقرۃ بالکل آغاز میں ہے اور تیسرے پارے کے قریباً نصف تک چلی گئی ہے' جبکہ سورۃ الحج سترہویں پارے کے نصف آخر میں ہے' تاہم زمانۂ نزول کے اعتبار سے یہ دونوں سورتیں متصل ہیں۔

سورۃ البقرۃ۔ دواُمتوں کی سورت

سورۃ البقرۃ کے دو بڑے بڑے حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں رکوعوں کی تعداد دوسرے حصّے کے مقابلے میں قدرے کم ہے لیکن آیات کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ حصّہ اٹھارہ رکوعوں اور ایک سو باون آیات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصّے میں رکوع بائیس ہیں اور آیات ایک سو چونتیس ہیں۔ گویا ایک خوبصورت توازن یہاں موجود ہے۔ تقریباً نصفین پر یہ سورۂ مبارکہ تقسیم کی جا سکتی ہے۔ نصفِ اوّل میں خطاب کا رخ تقریباً کل کا کل بنی اسرائیل کی طرف ہے' جبکہ نصفِ ثانی میں خطاب اُمتِ مسلمہ سے بحیثیت اُمتِ مسلمہ ہے۔ ویسے بنی اسرائیل سے براہِ راست خطاب کا آغاز پانچویں رکوع سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پندرہویں رکوع تک چلا گیا ہے۔ گویا مسلسل دس رکوع بنی اسرائیل سے براہ ِراست گفتگو پر مشتمل ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے ابتدائی چار رکوع تمہیدی نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو رُکوعوں میں تین قسم کے افراد کا ذکر آیا ہے اور پھر قرآن کریم کی بنیادی دعوت کا خلاصہ دو رُکوعوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ وہاں بھی اگرچہ بین السطور یہود کا ذکر موجود ہے تاہم ان سے براہِ راست

خطاب نہیں ہے۔

پھر پانچویں رکوع سے یہود کے ساتھ براہِ راست خطاب کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پندرہویں رکوع تک چلا گیا ہے۔ اس میں یہود یعنی بنی اسرائیل کو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی مؤثر دعوت بھی ہے اور اُن پر ایک نہایت مفصل قرار دادِ جرم بھی عائد کی گئی ہے' اس لیے کہ ان کی حیثیت سابقہ اُمتِ مسلمہ کی تھی۔ یہود اڑھائی ہزار برس تک اس منصب پر فائز رہے' نبوت و رسالت کا سلسلہ ان کے یہاں لگاتار جاری رہا' آسمانی کتابیں انہیں عطا کی گئیں۔ اس پورے عرصے کے دوران شریعتِ الٰہی کے وہ حامل رہے۔ یوں کہئے کہ وہ اڑھائی ہزار برس تک اللہ کی زمین پر اللہ کی نمائندہ اُمت تھے۔ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی جو ناقدری کی' شریعتِ الٰہی کو جس طرح بازیچۂ اطفال بنایا' اللہ کی کتاب میں جس جس طرح سے تحریف کی' وہ دنیا پرستی میں جس طرح غرق ہوئے اور دین کا جو حلیہ انہوں نے بگاڑا' اس سب کا ذکر کر کے گویا یہ اعلان فرما دیا گیا کہ انہیں ان کے منصبِ جلیلہ سے معزول کیا جا رہا ہے اور ان کی جگہ ایک نئی اُمت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کی بنیاد پر برپا کی جا رہی ہے۔ یہ ہے وہ مضمون کہ جس کے لیے سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع میں اگرچہ یہود کے لیے دعوتی انداز بھی ملتا ہے لیکن پھر دسویں رکوع تک ملامت کا رنگ غالب ہے' ان کے جرائم کی طویل فہرست کا بیان ہے' بلکہ یوں کہئے کہ ایک مفصل قرار دادِ جرم ہے جس کے نتیجے میں وہ اس مقام و مرتبے سے محروم اور اس عظیم منصب سے معزول ہوئے جس پر وہ اڑھائی ہزار برس تک فائز رہے اور اب اُمتِ مسلمہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس مقام پر فائز کی گئی ہے۔

چنانچہ پندرہویں رکوع سے لے کر اٹھارہویں رکوع تک' ان چار رکوعوں میں اسی اہم تبدیلی کی جانب اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان رکوعوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے کہ جو بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کے جدّ امجد تھے اور اس اعتبار سے دونوں کے نزدیک یکساں طور پر محترم تھے۔ پھر ان رکوعوں میں خانہ کعبہ کی تعمیر کا باہتمام ذکر آیا ہے اور بوقتِ تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا کا ذکر ہے کہ اے پروردگار! ہماری نسل میں سے ایک اُمت برپا کیجیو اور ان میں اپنا ایک نبی مبعوث فرمائیو! اس دعا کا ذکر پندرہویں رکوع میں ہے۔ اور پھر گویا کہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب وہ اُمت برپا ہوگئی ہے اور اُس نبی کی بعثت ہوگئی ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند اسماعیل (علیہما السلام) نے دعائیں مانگی تھیں۔ اب اس نبی کی

نبوت ورسالت کی بنیاد پر ایک اُمت وجود میں آ چکی ہے جسے ایک نہایت بلند منصب عطا کیا گیا ہے۔ چنانچہ سترہویں رکوع میں وہ آیۂ مبارکہ آئی جس میں نئی اُمت کی تشکیل کا ذکر ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾

''اور اسی طرح بنایا ہے ہم نے تمہیں ایک درمیانی اُمت (ایک بہترین اُمت) تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر گواہ بن جائیں''۔

نئی اُمت کیوں تشکیل دی گئی؟

سورۃ الحج کے آخری رکوع میں یہی مضمون ایک دوسری ترتیب سے آیا تھا کہ اے مسلمانو! اپنے نصیب پر فخر کرو کہ اس نے تمہیں ایک اہم منصب کے لیے چن لیا ہے' پسند کر لیا ہے۔ ﴿هُوَ اجْتَبٰـكُمْ﴾ تم نبوت ورسالت کے سلسلے میں ایک مستقل کڑی کی حیثیت سے شامل کر لیے گئے ہو۔ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''تاکہ رسول تم پر گواہ بن جائیں اور تم پوری نوعِ انسانی پر دینِ حق کی گواہی دینے والے بن جاؤ''۔ گویا دونوں مقامات پر ایک ہی مضمون مختلف ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ شہادت علی الناس کا مضمون سورۃ الحج کے درس کے ضمن میں وضاحت کے ساتھ آ چکا ہے۔ پھر انہی رکوعوں میں دو مرتبہ وہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ کے اساسی طریق کار کا بیان ہے۔ پہلے تو پندرہویں رکوع میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں وہ الفاظ وارد ہوئے اور پھر اٹھارہویں رکوع میں جہاں اس دعا کی قبولیت کا اعلان ہے وہاں یہ الفاظ اس شان کے ساتھ آئے:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ......﴾

گویا کہ اُمتِ مسلمہ کے مقصدِ وجود اور اس کی غرضِ تاسیس کا نمایاں انداز میں ذکر سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑی ہی اہم اور قابلِ توجہ بات ہے' اس لیے کہ چھوٹی سی انجمن بھی اگر بنائی جاتی ہے تو آغاز ہی میں اس کے اغراض و مقاصد معین کیے جاتے ہیں کہ یہ ادارہ کیوں تشکیل دیا جا رہا ہے اور کون سا اہم کام ہے جو اس کے پیشِ نظر ہے' اس انجمن کی غرض تاسیس کیا ہے؟ وغیرہ۔ سوچئے کہ اتنی بڑی اُمت اگر تشکیل دی گئی ہے تو لازماً اس کے بھی کچھ اغراض و مقاصد ہوں

گے۔ یہی درحقیقت اس آیت کا موضوع ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل لفظ ''اُمّۃ'' کے مفہوم پر بھی غور کیجیے: اَمَّ ۔ یَـؤُمُّ کے معنی ہیں قصد کرنا' ارادہ کرنا۔ اُمت سے مراد ہے ہم مقصد لوگوں کا ایک گروہ یا ایک جماعت۔ ایک مشترک نصب العین رکھنے والے اور ایک ہی ہدف اور منزلِ مقصود رکھنے والے لوگ اُمت قرار پاتے ہیں۔ اس پس منظر میں سمجھئے کہ مسلمانوں کو اُمت اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ فریضۂ نبوت اور کارِ رسالت جو پہلے انبیاء و رُسل ادا کیا کرتے تھے اب ختم نبوت کے بعد قیامت تک یہ ذمہ داری اس اُمت کو ادا کرنی ہے۔ لوگوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کا فریضہ اب اس اُمت کے حوالے کیا گیا ہے۔ اسی فریضے کا عنوان ہے ''شہادت علی الناس'' اور ''اتمامِ حجت'' کہ اپنے قول و فعل سے دینِ حق کی گواہی دینا اور اللہ کی طرف سے خلقِ خدا پر حجت قائم کر دینا تا کہ محاسبۂ اُخروی کے وقت وہ یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ اے اللہ تیری ہدایت ہم تک پہنچی نہیں' ہمیں معلوم نہ تھا کہ تُو کیا چاہتا ہے' ہمیں بتایا ہی نہیں گیا کہ تیری مرضی کس چیز میں ہے!

سورۃ النساء میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾﴾

''تا کہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں کوئی دلیل اور حجت باقی نہ رہے' اور اللہ تو ہے ہی سب پر غالب' کمالِ حکمت والا''۔

تو سورۃ البقرۃ کے پندرھویں رکوع سے لے کر اٹھارھویں رکوع تک یوں سمجھئے کہ وہی مضامین جن کا مطالعہ ہم سورۃ الحج' سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعۃ میں بڑی تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں' یہاں ایک ذرا مختلف ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ خاص طور پر اُمت کے فرضِ منصبی کے حوالے سے ان سب مضامین کو بیان کرنے کے بعد اب خطاب شروع ہوتا ہے مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمتِ مسلمہ' کہ اپنے فرائض کی عظمت کو پہچانو' ایک بڑا کٹھن اور نہایت بھاری بوجھ ہے جو تمہارے کاندھے پر آ گیا ہے۔ اس پہلو سے یہ مقام سورۃ المُزّمّل کی ابتدائی آیات کے بہت مماثل ہے کہ جہاں آنحضور ﷺ کو آغازِ وحی کے بالکل ابتدائی دَور میں شخصی طور پر خطاب کر کے کچھ خصوصی ہدایات دی گئیں اور پیشگی آگاہ کر دیا گیا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿٥﴾﴾ ''(اے نبی!) ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں''۔ کارِ رسالت کی بھاری ذمہ داری آپؐ کے کاندھوں پر ڈالی جا رہی ہے۔ چنانچہ اسی موقع پر یہ تلقین بھی کی گئی کہ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿١٠﴾﴾ کہ ان مخالفین کی

باتوں پر آپ صبر کیجیے اور استقامت کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی پر کمربستہ رہیے اور ان مخالفین کو خوبصورتی کے ساتھ نظر انداز کر دیجیے!

اُمت سے پہلا باضابطہ خطاب

اب کارِ رسالت کا یہ بوجھ چونکہ اُمت کے کاندھوں پر آ رہا ہے‘ یہ اجتماعی ذمہ داری ہے جو اُمت کو تفویض کی جا رہی ہے لہٰذا اُمت سے خطاب اِن الفاظ میں ہوا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ﴾

’’اے اہل ایمان! مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے‘‘۔

حکم ہو رہا ہے کہ دعوت وتبلیغ دین کی اہم ذمہ داری اور فریضۂ شہادت علی الناس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قوّت پکڑو صبر وثبات سے‘ سہارا اور تحمل سے اور نماز سے کہ جو اللہ کے ذکر کی ایک اعلیٰ شکل اور اس کے ساتھ ایک مضبوط تعلق قائم رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

اگرچہ اس سے پہلے ہمارے اس منتخب نصاب میں ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾ کے الفاظ متعدد بار آ چکے ہیں‘ یہاں تک کہ صرف سورۃ الحجرات میں پانچ مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں‘ لیکن یہاں ان الفاظ کے حوالے سے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم کا یہ وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمتِ مسلمہ گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے۔ اُمت کی تشکیل کے اعلان کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں کو باضابطہ خطاب کیا گیا اور اس کے لیے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے الفاظ لائے گئے۔ یہ بات بہت سے حضرات کے لیے شاید قابلِ تعجب ہو کہ پورے مکّی قرآن میں کہیں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے الفاظ نہیں آئے۔ قرآن مجید کا قریباً دو تہائی حصّہ مکّی سورتوں پر مشتمل ہے اور پورے مکّی قرآن میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے الفاظ سے خطاب نہیں ملتا۔ اس قاعدے میں استثناء صرف ایک ہے اور وہ سورۃ الحج کا وہی مقام ہے جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے‘ لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ اس سورۃ کے مکّی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف چلا آ رہا ہے۔ بہت سے حضرات اسے مدنی مانتے ہیں اور اس کی بعض آیات کے بارے میں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مدنی دَور میں نازل ہوئیں۔ وہ یقیناً یا تو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں یا اثنائے سفر ہجرت میں ان کا نزول ہوا۔ اس پہلو سے یہ استثناء بھی باقی نہیں رہتا اور یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پورے مکّی قرآن میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے الفاظ نہیں آئے۔

آیت زیرِنظر سے قبل سورۃ البقرۃ میں اگرچہ صرف ایک مرتبہ یعنی آیت ۱۰۴ میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ وارد ہوئے ہیں لیکن وہ بھی ایک ضمنی بات کے طور پر' اصل میں مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمت مسلمہ خطاب شروع ہو رہا ہے سورۃ البقرۃ کی اس آیت ۱۵۳ سے۔ اس کے بعد مدنی سورتوں میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا اندازِ خطاب نہایت کثرت سے ملتا ہے۔ مکّی قرآن میں خطاب جہاں بھی ہے وہ براہِ راست محمد رسول اللہ ﷺ سے ہے' بصیغۂ واحد۔ ہاں تبعاً آپ ؐ کی وساطت سے مسلمان بھی اس خطاب کے مخاطب ہوتے ہیں' لیکن قرآن حکیم میں مسلمانوں کو بحیثیت اُمت خطاب کا آغاز مدینے میں آ کر ہوا کہ جہاں مسلمان ایک اُمت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور تشکیل اُمت کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا تھا۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ مکّے میں بھی ان کی حیثیت ایک جماعت کی اور ایک Revolutionary party کی تھی لیکن ان کی بحیثیت اُمت مسلمہ باقاعدہ تاج پوشی (Coronation) مدینے میں ہوئی اور اس کی علامت کے طور پر تحویل قبلہ کا معاملہ ہوا۔ دوسرے پارے کے بالکل آغاز میں یہ حکم وارد ہوا کہ تمہارا قبلہ بدل دیا گیا ہے' آئندہ نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ نہیں ہوگا بلکہ ﴿فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ کہ اب پھیرلو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی جانب۔ ایک نئے مرکز کے گرد ایک نئی اُمت کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا اور اسی اعتبار سے اب قرآن مجید میں مسلمانوں سے خطاب کے لیے مستقل اصطلاح ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔

ایک نئے دورِ آزمائش کا آغاز

بہرحال اس مرحلے پر یہ آیات ایک پیشگی تنبیہ کا درجہ رکھتی ہیں کہ مسلمانو! یہ نہ سمجھو کہ ہجرت کے بعد اب تمہاری تکالیف کا دَور ختم ہو گیا' مشکلات اور مصائب کا دَور اب بیت گیا۔ تم نے ہجرت کی ہے فرار کی راہ اختیار نہیں کی' یہ درحقیقت اپنے مشن اور مقصد کی طرف پیش قدمی کے لیے ایک مرکز ہے جو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے' تمہاری جدوجہد اب ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی ہے ع ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں! ابھی تو بڑی آزمائشیں آئیں گی۔ اصل کٹھن مراحل تو ابھی آنے ہیں کہ جن سے تمہیں سابقہ ہوگا' اس لیے کہ تمہاری یہ دعوت اور تحریک اب ایک ایسے مرحلے میں آ گئی ہے کہ جہاں نظریاتی تصادم اور کشمکش سے آگے بڑھ کر عملی تصادم یعنی جہاد بالسیف اور قتال کا آغاز کرنا ہوگا۔ گویا تم Passive Resistance کے مرحلے سے Active Resistance کے دَور میں داخل ہو گئے ہو۔ اب صرف جھیلنے اور برداشت کرنے کے مرحلے سے آگے بڑھ کر باطل پر حملہ آور ہونے اور

دشمن پر ضرب لگانے کا وقت آ رہا ہے' تو اچھی طرح سمجھ لو کہ آنے والا دَور ہرگز کوئی آسائشوں اور آرام کا دَور نہیں ہے' بلکہ تمہارے لیے نئی نئی آزمائشوں کے دروازے کھل رہے ہیں' لہٰذا ان آزمائشوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے صبر و ثبات اور نماز سے قوّت و استقامت حاصل کرو۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ﴾

ابتلاء و آزمائش کے مرحلے کے لیے اصل ہتھیار۔ صبر اور نماز

اس مرحلے پر تمہاری قوّت کی اساس اور تمہارے صبر و ثبات کی بنیاد دو چیزوں پر ہے' ایک صبر اور دوسرے نماز۔ یہی دو چیزیں ہیں کہ جن کو تم اپنی مدافعت اور اپنے ثبات کے لیے اپنا سہارا اور بنیاد بناؤ۔ اسْتَعِیْنُوْا کا مفہوم ہے مدد چاہو' قوّت پکڑو۔ ذہن میں رکھئے کہ اس سے پہلے ہم سورۃ العنکبوت کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ ہم نے اس کے پہلے رکوع کو تفصیل سے پڑھا' پھر ہم نے دیکھا کہ جن حالات سے اُس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دوچار تھے اس میں انہیں جو ہدایات دی گئیں ان کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔ چنانچہ پانچویں رکوع کے آغاز میں فرمایا گیا:

﴿اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ﴾

''(اے نبی!) تلاوت کرتے رہیے جو وحی کیا گیا آپ کی طرف کتاب میں سے اور نماز قائم کیجئے۔ یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے''۔

یہی بات ہم سورۂ بنی اسرائیل میں دیکھ چکے ہیں۔ وہاں پر بھی فرمایا گیا کہ اے نبی! اگرچہ جو مصالحانہ پھندے آپ کے لیے لگائے گئے آپ اللہ کے فضل و کرم سے ان سے بچ نکلے' لیکن صبر و ثبات کے لیے بنیاد وہی اقامتِ صلوٰۃ ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ﴾ (آیت ۷۸)

''قائم رکھئے نماز کو سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا۔''

اور سورۃ العنکبوت میں تلاوتِ قرآن حکیم اور اقامتِ صلوٰۃ کے حکم کے ساتھ ہی فرمایا: ﴿ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ ''اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی شے ہے''۔ اور تلاوتِ قرآن حکیم اور اقامتِ صلوٰۃ اللہ کے ذکر اور تعلق مع اللہ کی بہترین صورتیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ کسی بھی انقلابی کارکن کے لیے اپنی انقلابی جدوجہد میں ثابت قدم رہنے کا دار و مدار اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ پوری یکسوئی کے ساتھ وابستگی اور لگاؤ پر ہے۔ اپنے نصب العین

سے اس کی وابستگی جس قدر گہری ہوگی' ذہن اور قلب کے اندر اس کی جڑیں جتنی گہری اتری ہوئی ہوں گی' اسی قدر وہ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرے گا' مصائب کو جھیلے گا' امتحانات میں کامیابی سے دڑّاتا ہوا گزر جائے گا اور آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے سرخرو ہو کر نکلے گا۔ یہ جدّ وجہد چونکہ اللہ کے لیے اور اللہ کے دین کے لیے ہے اور اس میں اصل مقصود و مطلوب اللہ کی رضا جوئی ہے لہٰذا یہاں تمہارے صبر و ثبات کی بنیاد تعلق مع اللہ ہے۔ اللہ کی یاد تمہارے دل میں جس قدر رہو گی اور اللہ تمہارے ذہن سے جتنا قریب تر رہے گا اتنا ہی تم اس راہ میں ثابت قدم رہ سکو گے۔ اور ذکر اللہ کے لیے جو سب سے جامع پروگرام تمہیں دیا گیا وہ ہے نماز۔ چنانچہ یہاں فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۝﴾

''اے اہلِ ایمان! مدد چاہو صبر سے اور نماز سے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اللہ کی معیت اور نصرت کے اصل حق دار کون؟

یہ معیت تائید و نصرت کے معنی میں ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی ایک معیت تو وہ ہے جو ہر شے کو حاصل ہے' کیونکہ اللہ ہر جگہ ہر آن موجود ہے۔ ﴿هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے''۔ ان الفاظ میں اللہ کی معیتِ عمومی کا ذکر ہے' لیکن اہلِ ایمان کو اللہ کی جو معیت حاصل ہوتی ہے وہ ہے اللہ کی تائید و نصرت' اس کی طرف سے توفیق و تیسیر' اس کی طرف سے ہمت کا بندھے رہنا اور بشارتوں کا ملتے رہنا۔ یہاں اسی معنی میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۝﴾

کہ یاد رکھو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے! اس کی یہ معیت ان لوگوں کو حاصل نہیں ہے جن میں مصائب جھیلنے اور مشکلات برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں' جو تھڑ دلے' بزدل اور کم ہمت لوگ ہیں' جن کا نقشہ سورۃ النساء میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَآءِ وَلَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَآءِ ؕ﴾ (آیت ۱۴۳)

جن کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا کو بھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا' یہاں کی لذات سے کنارہ کشی بھی کسی درجے میں گوارا نہیں ہے' مال و اولاد اور تعیّشات کی محبتیں بھی دل کے اندر گہری موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ دین کی طرف بھی رغبت ہے۔ ایسے لوگ کسی طرح کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔ تائیدِ ربّانی اور توفیقِ الٰہی تو انہی لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے جو یکسو ہو کر آئیں' جن کے بارے میں پہلے عرض کیا گیا

کہ جو ''ہر چہ بادا باد' ما کشتی در آب انداختیم'' کے سے جذبے کے ساتھ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ کی معیت اور توفیق و تائید حاصل ہوتی ہے۔ سورۃ العنکبوت کی آخری آیت بھی ہم پڑھ آئے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے ہماری خاطر جدوجہد کی ہم لازماً انہیں اپنی راہیں سجھا دیں گے' اور یقیناً اللہ تو احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اللہ کی تائید اور توفیق ہر دم اُن کے شامل حال رہتی ہے۔

اسی معیتِ خداوندی کا ایک ظہور ہمارے سامنے حضرت موسٰی علیہ السلام کی زندگی میں آتا ہے۔ حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے اور پیچھے سے فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب شروع کیا تو ایک مرحلہ وہ آیا کہ بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا' سامنے سمندر تھا اور پیچھے نظر آ رہا تھا کہ فرعون اور اس کا لشکر چلا آ رہا ہے' گرد اڑاتا ہوا قریب سے قریب تر پہنچ رہا ہے۔ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے عالمِ بے چارگی میں کہا: ﴿ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ﴾ ''(اے موسیٰ!) ہم تو پکڑے گئے (اب تو بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے)''۔ اُس وقت حضرت موسیٰ نے کمالِ دلجمعی کے ساتھ جواب دیا: ﴿ كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ﴾ ''نہیں نہیں! میرے ساتھ میرا ربّ ہے' وہ یقیناً مجھے راستہ دے گا''۔ چاہے بظاہر احوال کوئی راستہ نہیں' مادی اسباب و وسائل راستہ روکے کھڑے ہیں' لیکن میرا توکل و انحصار اور میرا تکیہ اور دارومدار اُس ذات پر ہے جو مسبب الاسباب ہے' جو اسباب سے ماوراء ہے' وہ یقیناً راستہ نکال دے گا۔ یہی بات غارِ ثور میں حضور ﷺ نے فرمائی تھی۔ جب بر بنائے طبع بشری حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی کچھ گھبرا گئے تھے کہ حضور! یہ لوگ غار کے دہانے تک پہنچ گئے ہیں اور اگر ان میں سے کسی نے غیر ارادی طور پر بھی اپنے قدموں کی طرف نگاہ ڈال لی تو ہم پکڑے جائیں گے۔ اس وقت حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ ''نہیں نہیں' گھبراؤ نہیں' اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔ تو یہ ہے مفہوم ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ کا۔ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ معیتِ الٰہی کا مقام ہے' یہ درحقیقت بندۂ مؤمن کا آخری سہارا ہے ان حالات میں بھی کہ جہاں کوئی حالت اُمید افزا نظر نہ آ رہی ہو' جہاں کہیں کوئی راستہ نکلتا ہوا دکھائی نہ دے رہا ہو اور امید کی کوئی کرن کسی جانب سے نظر نہ آتی ہو۔ معیتِ خداوندی کا یہ یقین اور اللہ کی تائید و نصرت پر یہ بھروسہ ایک ایسی شے ہے جو بندۂ مؤمن کو اس طرح کے انتہائی مایوس کن

حالات میں بھی ثابت قدم رکھتی ہے اور وہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی جاری رکھتا ہے‘ نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے جو کچھ اس کے بس میں ہوتا ہے وہ کیے چلے جاتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر اُمت کو اس کے فرضِ منصبی سے آگاہ کرنے اور وہ کٹھن ذمہ داری جو اُس کے کاندھے پر آ رہی ہے اس سے مطلع فرمانے کے بعد جو پہلی ہدایت دی گئی وہ یہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

اس کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾

”اور مت کہو ان کو جو قتل ہو جائیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں‘ بلکہ وہ تو زندہ ہیں‘ لیکن تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں ہے“۔

یہ مضمون سورۂ آلِ عمران میں بڑے مؤکد انداز میں پھر دہرایا گیا ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾﴾

”اور ہرگز گمان نہ کرنا ان کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں کہ وہ مُردہ ہیں‘ نہیں وہ زندہ ہیں‘ اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں‘ فرحاں و شاداں ہیں اس (انعام و اکرام) سے کہ جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا فرمایا اور خوش خبریاں حاصل کر رہے ہیں ان لوگوں کے بارے میں کہ جو ابھی ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے ان کے پیچھے سے‘ کہ نہ ان پر کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوشخبری حاصل کر رہے ہوں گے اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر‘ اور اللہ تعالیٰ مؤمنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

قرآن میں لفظ ”شہید“ کا استعمال

یہاں ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا دینا یقیناً مفید ہوگا کہ قرآن حکیم میں اگرچہ لفظ شہید کا استعمال متعدد مقامات پر ہوا ہے اور ”شہادت“ قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے لیکن مقتول فی سبیل اللہ کے لیے قرآن لفظ ”شہید“ استعمال نہیں کرتا۔ اس میں استثناء صرف ایک ہے اور وہ ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴۰۔ وہاں ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾ میں لفظ ”شُهَدَآءَ“ کو اگر مقتولین فی سبیل اللہ کے معنی میں لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دیگر تمام مقامات پر مقتول فی سبیل اللہ کے

لیے اس لفظ کا استعمال ہمیں قرآن میں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ خود نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی سورۂ آل عمران میں جہاں یہ مضمون آیا ہے وہاں بھی شہید ہو جانے یا شہادت پا جانے کے لیے ''قُتِلَ'' کا لفظ ہی صیغۂ مجہول میں آیا ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴۴)

''محمد (ﷺ) اللہ کے ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، تو اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے؟''

ایک حدیث میں جس میں آنحضور ﷺ نے اپنے لیے شہادت کی تمنا کا اظہار فرمایا ہے، وہاں بھی اس ضمن میں ''قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ'' کے الفاظ ہی وارد ہوئے ہیں:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، فَاُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ)) [1]

''اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میری دلی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر مقتول ہو جاؤں (اللہ کی راہ میں) اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور پھر قتل کر دیا جاؤں۔''

ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید میں لفظ شہادت کا استعمال اصلاً دینِ حق کی گواہی دینے کے لیے ہے۔ اللہ کے خالق و مالک ہونے کی گواہی، اللہ کی توحید کی گواہی، محمد ﷺ کی صداقت اور رسالت کی گواہی۔ (ع دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی) آخرت کے حق ہونے کی گواہی، خیر کی گواہی، قرآن کی حقانیت کی گواہی — اور یہ گواہی صرف اپنے قول سے ہی نہیں عمل سے بھی دینی ہے۔ یہ ہے ہر مسلمان کا فرض اور اس کے لیے قرآن کی اصطلاح ہے ''شہادت علی الناس'' جو تمام مسلمانوں کا فرضِ منصبی ہے بحیثیت اُمتِ مسلمہ۔ اس لفظ شہادت کو قرآن مجید نے اس معنی کے لیے خاص کیا ہے۔ تاہم احادیث میں مقتول فی سبیل اللہ کے لیے لفظ شہید کا استعمال بھی مل جاتا ہے۔ اس لیے ان دونوں الفاظ میں اس اعتبار سے ایک گہرا معنوی ربط موجود ہے کہ جس شخص نے حق کے غلبے کی اس جدوجہد میں اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کر دی اس نے گویا کہ آخری درجے میں شہادت دے دی، دین کی خاطر اپنی زندگی دے کر گویا اپنی جان سے دینِ حق کی گواہی دے دی۔ اب وہ شہید (گواہ) کہلانے کا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجھاد والسیر باب تمنی الشھادۃ۔

بتمام وکمال مستحق ہو گیا۔

شہداء کی برزخی حیات!

آیت کے آخری ٹکڑے میں شہداء کی زندگی کے بارے میں ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ کے الفاظ میں ہمارے لیے بڑی اہم رہنمائی مضمر ہے۔ شہداء کو اللہ جس نوع کی حیات عطا فرماتا ہے اور برزخی زندگی میں بھی جس طور سے انہیں رزق مہیا فرماتا ہے اس تک ہمارے فہم وادراک کی رسائی نہیں ہے' اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے۔ بدقسمتی سے برزخی زندگی کے حوالے سے مسلمانوں میں ایک مذہبی بحث (Controversy) نے بڑے ہی شدت اختیار کی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں ایک بڑی بنیادی رہنمائی ہمیں اس آیت سے ملتی ہے۔ وہ بحث یہ ہے کہ عالمِ برزخ میں نبی اکرم ﷺ کی حیات کی نوعیت کیا ہے' اپنی قبر شریف میں آنحضور ﷺ کس حال میں ہیں!! یہ مسئلہ ہمارے مذہبی حلقوں میں نامعلوم کیونکر بحث وتمحیص' قیل وقال اور ردّ وقدح کا موضوع بن گیا! حالانکہ ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے اور یہ قرآن حکیم کی بنیادی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ہے کہ موت خاتمے کا نام نہیں ہے' نہ کسی مؤمن کے لیے نہ کافر کے لیے۔ اِدھر آنکھ بند ہوتی ہے تو دوسرے عالم میں کھل جاتی ہے۔ یہ عالم برزخ ہے جس کا تسلسل قیامت تک رہے گا۔

اس برزخی دَور میں ایک نوع کی حیات تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس برزخی حیات کا مرحلہ کافروں کے لیے بھی ہے اور مؤمنین کے لیے بھی' تاہم زندگی کی کیفیات مختلف ہیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر قبر یا تو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ یہاں قبر سے مراد مٹی کا وہ ڈھیر نہیں جس کے نیچے انسان مدفون ہوتا ہے' بلکہ یہاں یہ اپنے وسیع تر مفہوم میں ہے اور اس سے مراد عالم برزخ ہے۔ چنانچہ خواہ کوئی شخص سمندر میں غرق ہو کر مرا ہو عالم برزخ میں وہ ایک خاص کیفیت سے گزرتا ہے' اس کے آخری انجام کا ایک عکس پڑتا رہتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ابوجہل یا ابولہب کے ساتھ عالم برزخ میں جو معاملہ ہو رہا ہے وہ کچھ اور ہے اور کوئی مسلمان عالم برزخ میں جس کیفیت سے گزر رہا ہے وہ کچھ اور ہے' کوئی مؤمن صالح وہاں کسی اور کیفیت میں ہوگا' شہداء کا کچھ اور عالم ہوگا اور صدیقین کی شان کچھ اور ہوگی' انبیاء ورُسل کا مرتبہ ومقام کچھ اور ہوگا اور سیّد المرسلین' سیّد الاولین والآخرین ﷺ اس عالم برزخ میں جس شان میں ہوں گے وہ ہمارے فہم اور تصور سے ماوراء ہے' بلکہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ جب ہم شہداء کی برزخی

زندگی کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے اور اس کی نوعیت کا تعین نہیں کر سکتے‘ جیسا کہ قرآن نے صاف طور پر کہہ دیا ہے: ﴿وَلٰـكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ﴾ کہ تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں ہے تو نبی اکرم ﷺ کی برزخی حیات کے بارے میں کوئی تصور کرنا ہمارے لیے قطعاً ناممکن ہے۔ یہ چیز ہمارے فہم وشعور اور تخیل و ادراک کی گرفت میں آنے والی ہے ہی نہیں۔ اس معاملے میں بحث کرنا ہی دراصل اپنی حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ کہنا کہ حضور ﷺ بالکل اسی طرح زندہ ہیں جیسے کہ اس دنیا میں زندہ تھے‘ ایک اعتبار سے شاید آپؐ کی توہین قرار پائے‘ اس لیے کہ یہ دنیا کی زندگی تو بہت سی احتیاجات کے ساتھ ہے‘ اس میں طرح طرح کی تحدیدیں ہیں‘ عالمِ برزخ میں نبی اکرم ﷺ کو جو حیات حاصل ہے وہ یقیناً اس سے کہیں اعلیٰ‘ کہیں ارفع ہے‘ جو ہمارے فہم اور ہماری سوچ سے بہت بلند اور بالا ہے۔ بہرحال اس معاملے میں خواہ مخواہ کسی چیز کو معین کر کے اس پر جھگڑنا اور اس کی بنیاد پر ''من دیگرم تُو دیگری'' کے انداز میں تفریق پیدا کر لینا درحقیقت بڑی ہی نادانی کی بات ہے۔

ابتلاء وآزمائش اس راہ کی شرطِ لازم

اب آیئے اصل سلسلۂ کلام کی طرف۔ اگلی آیت میں وہ پیشگی تنبیہہ آ رہی ہے جس کا حوالہ گفتگو کے آغاز میں دیا گیا تھا:

﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾

''اور (اے مسلمانو!) ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کسی قدر خوف سے اور بھوک سے اور مال و جان اور ثمرات کے نقصان سے۔''

اس سے قبل سورۃ العنکبوت کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان میں یہ تاکید کا انتہائی اسلوب ہے کہ فعل مضارع سے قبل لام مفتوح اور آخر میں نون مشدّد کا اضافہ کر دیا جائے۔ یہی انداز ہمیں اس آیت میں ملتا ہے۔ چنانچہ ''وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ'' کا ترجمہ ہوگا: ''ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں''۔ ہم آزمائشوں کی کٹھالیوں میں تمہیں ڈالیں گے‘ تمہارے صبر و مصابرت کا بھرپور امتحان ہوگا‘ نہایت کٹھن حالات سے تمہیں گزرنا ہوگا جن کے ذریعے جانچ لیا جائے گا کہ تم کتنے پانی میں ہو‘ یہ بات خوب نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ ذاتِ باری تعالیٰ پر فی الواقع تمہیں کتنا یقین حاصل ہے‘ حیات بعد الممات پر کتنا کچھ ایمان ہے‘ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر تم کیا کچھ قربان کر سکتے ہو۔ اللہ کی راہ میں اگر تم آئے ہو تو تحفظات (Reservations) کے ساتھ تو نہیں آئے! آزمائشوں اور امتحانات

سے جب تمہیں سابقہ پیش آئے گا تو ان میں سے ایک ایک چیز واضح ہو جائے گی۔

''بَلَا یَبۡلُوۡ'' کے معنی ہیں جانچنا اور پرکھنا۔ یہ لفظ لغت میں بنیادی طور پر گوشت کو آگ پر سینکنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس سینکائی کے عمل میں گوشت کو انگاروں پر الٹا پلٹا جاتا ہے' ابھی اس رخ پر ڈالا ہے' پھر ذرا پلٹ کر دوسرے رخ پر ڈال دیا۔ یہ ہے اس لفظ کی اصل۔ تمہیں بھی مختلف حالات سے دوچار کر کے سینکا جائے گا' تمہیں آزمایا جائے گا' جانچا اور پرکھا جائے گا۔ البتہ اس آیت مبارکہ میں ''بِشَیۡءٍ'' کا ایک لفظ ایسا آیا ہے جس میں تسلی کا پہلو موجود ہے کہ بظاہر تو امتحانات بڑے کٹھن ہوتے ہیں' ایک بار تو انسان دہل کر رہ جاتا ہے' لیکن اگر وہ ثابت قدم رہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بظاہر ایک خوفناک صورت حال سامنے آتی ہے لیکن اگر انسان ڈٹا رہے تو پتہ چلتا ہے کہ بس ایک ریلا تھا حالات کا' آیا اور گزر گیا۔ دیکھنے والے اس آزمائش کی ظاہری شدت سے متاثر اور مرعوب ہوں گے لیکن صبر و ثبات کے ساتھ اس آزمائش سے گزرنے والوں کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے بڑی ہی ہلکی سی کوئی بات تھی کہ جو ہو گئی۔ ﴿بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ﴾

ذہن میں رکھئے کہ یہ آیات مدنی دَور کے بالکل آغاز میں نازل ہو رہی ہیں۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ان آخری دس سالوں پر جو آپؐ نے مدینہ میں گزارے' اگر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو اس آیت کی عظمت کا مزید انکشاف ہوتا ہے کہ اس پورے مدنی دَور میں کس طرح وہ حالات وقفے وقفے سے پیدا ہوتے رہے جن کا پورا نقشہ ایک پیشگی تنبیہہ کے طور پر ان آیات میں کھینچ دیا گیا ہے۔ خوف و خدشات ہوں گے' جان و مال کے اندیشے ہوں گے' بھوک اور پیاس سے سابقہ پیش آئے گا' فاقہ کشی کے باعث جان نکلتی ہوئی محسوس ہوگی' جان و مال اور ثمرات کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس راہ میں یہ سارے مراحل آئیں گے۔

لفظ ''ثمرات'' کا وسیع تر مفہوم

''ثمرات'' کا لفظ یہاں بہت ہی قابل توجہ ہے۔ ثمرات کا عام مفہوم لیا گیا ہے پھل۔ اس اعتبار سے ترجمہ یہ بنتا ہے کہ پھل ضائع ہو جائیں گے۔ مدینہ منورہ کے مخصوص معاشرتی پس منظر میں یہ مفہوم بجا طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ اہل مدینہ بنیادی طور پر کاشتکار تھے' زراعت ان کا پیشہ تھا۔ زراعت کے میدان میں جو محنت بھی کی جاتی ہے' ہل چلایا جاتا ہے' کھیت کی آبیاری کی جاتی ہے' اس ساری محنت کا حاصل چونکہ وہ فصل ہے جو آخر میں کاٹی یا اتاری جاتی ہے اور تمام امیدیں چونکہ اس فصل کے ساتھ

وابستہ ہوتی ہیں لہٰذا اگر فصل اجڑ جائے تو نقصان بہت شدید ہوتا ہے اور یہ آزمائش کی بڑی کٹھن صورتوں میں سے ایک ہے۔ غزوۂ احزاب اور غزوۂ تبوک کے مواقع پر اس نوع کے امتحان سے مسلمانوں کو سابقہ پیش آیا تھا۔ فصلیں تیار ہیں' لوگ اس امید میں ہیں کہ فصلیں اتاریں گے' اپنی محنتوں کی کمائی کو گھروں میں لائیں گے' عین اُس وقت حملہ ہوتا ہے' باغات اجاڑ دیئے جاتے ہیں یا حکم ہوتا ہے کہ تیار فصلوں کو چھوڑ کر جہاد کے لیے نکلو' اور وقت پر فصلیں برداشت نہ کر سکنے کے باعث فصل ضائع ہو جاتی ہے۔ یہ تمام آزمائش کی صورتیں ہیں جن سے مسلمان مدینہ میں گزرتے رہے ہیں۔ البتہ ''ثمرات'' کا لفظ اس سے زیادہ وسیع ہے۔ انسانی محنت خواہ کسی بھی میدان میں ہو' اس کا حاصل دراصل اس کا ثمرہ ہے۔ کسی نے بڑی محنت کر کے کاروبار جمایا ہے' اب دین کی طرف سے پکار آتی ہے کہ آؤ! اور صاف نظر آ رہا ہے کہ دین کی طرف آنے میں کاروبار کا نقصان ہے' تو یہ آزمائش بڑی کڑی ہے۔

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

وہ محنت سے جمایا ہوا کاروبار پاؤں میں بیڑی بن کر پڑ جاتا ہے۔ کسی نوجوان نے بڑا وقت لگا کر اور بڑی محنت سے کسی کیریئر میں اپنا کوئی مقام حاصل کیا ہے اور اب دین کے تقاضے سامنے آتے ہیں' دین کا تقاضا اس پر واضح ہوتا ہے کہ آؤ اور کھپاؤ اپنے آپ کو غلبہ و اقامت دین کی راہ میں! وہ کیریئر اور وہ Profession اب انسان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اسے صاف نظر آ رہا ہے کہ اس طرح اس کی اب تک کی ساری محنت ضائع ہوتی ہے۔

سورۃ الکہف کے ایک مقام سے اگر روشنی حاصل کی جائے تو اولاد بھی انسان کا ثمرہ ہے' یہ بھی درحقیقت ایک اعتبار سے اس کی کمائی ہے۔ انسان کو اگر ایک درخت سے تعبیر کیا جائے تو اس کا پھل اس کی اولاد ہے۔ نگاہوں کے سامنے اگر اس کی اولاد اللہ کی راہ میں قربان ہو رہی ہو تو گویا یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے اس کا ثمر اس کی نگاہوں کے سامنے اجڑ رہا ہے اور یہ آزمائش کی نہایت کٹھن صورت ہے۔ یہاں متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! یہ سارے امتحان اب آئیں گے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ﴾

''اور ہم لازماً آزمائیں گے تمہیں کسی قدر خوف سے' بھوک سے' مال و جان کے نقصان سے' اور ثمرات کے ضیاع سے''۔

آیت کے آخری ٹکڑے پر اپنی توجہ مرکوز کیجیے! فرمایا:

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ﴾

''اور (اے نبی!) بشارت دیجیے صبر کرنے والوں کو''۔ (ان کو کہ جو ان تمام آزمائشوں اور مصائب وتکالیف کو پامردی کے ساتھ جھیل جائیں' برداشت کر جائیں)۔

صبر کا قرآنی تصور

قرآن حکیم کے مطالعے سے صبر کا جو تصور سامنے آتا ہے اس کی رو سے صبر ہرگز کوئی منفی شے نہیں ہے' بلکہ یہ ایک مثبت جذبہ ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یا کسی نصب العین اور منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں جو تکالیف آئیں اور اس راہ کی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے میں جو مصائب آئیں انہیں ثابت قدمی کے ساتھ جھیلنا اور برداشت کرنا صبر ہے' جو یقیناً ایک مثبت جذبہ ہے۔ صبر واستقلال کا مظاہرہ کرنے والے باہمت لوگوں کے بارے میں ہی یہ الفاظ یہاں آئے ہیں: ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ﴾ ''اور (اے نبیؐ!) بشارت دیجیے صبر کرنے والوں کو!''

صبر کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا کوئی شخص اگر میدانِ جنگ میں پامردی اور استقامت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے جان بچانے کے لیے وہاں سے راہِ فرار اختیار کرے گا تو اس کا یہ عمل دراصل اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس کا سب کچھ کیا دھرا ضائع ہو جائے گا' بلکہ سورۃ الانفال میں تو ایسے شخص کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ تو یہاں پیشگی متنبہ کر دیا گیا کہ اس راہ میں آزمائشیں اور مشکلات تو آئیں گی اور ان میں سرخرو وہی ہو سکیں گے جو صبر وثبات کا مظاہرہ کریں گے۔ اگلی آیت میں ان صبر کرنے والوں کے ایک نہایت اہم وصف کا ذکر ہے:

﴿الَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ﴾

''(وہ صبر کرنے والے کون ہیں؟) وہ لوگ کہ جب بھی کوئی مصیبت اُن پر پڑتی ہے یا کوئی تکلیف انہیں پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں''۔

اسی سورۂ مبارکہ میں ذرا آگے چل کر وہ آیۂ بِرّ ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب کے حصۂ اوّل میں شامل ہے۔ وہاں ہم دیکھ چکے ہیں کہ نیکی کی بحث کا نقطۂ عروج یہی مضمون ہے: ﴿وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ﴾ ''اور خصوصاً صبر کرنے والے اور جھیلنے والے جسمانی اذیت کو' فقر

اور فاقے کو اور وہ کہ جو عین حالتِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں''۔ یہاں ان صبر کرنے والوں کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ جب بھی انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے' کوئی بپتا ان پر پڑتی ہے تو ان کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہوتا ہے کہ: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾

بندۂ مؤمن کا نظریۂ حیات

اس آیۂ مبارکہ میں دراصل ایک مسلمان کے نظریۂ زندگی اور تصورِ حیات کی مکمل عکاسی موجود ہے۔ ہمارا تصورِ حیات کیا ہے؟ ہم اللہ کے پاس سے آ رہے ہیں اور اللہ ہی کے پاس واپس لوٹ جائیں گے۔ یہ دُنیوی زندگی ایک سفر ہے' یہ ہرگز ہماری منزل نہیں ہے۔ یہ ہمارے سفرِ حیات کا ایک عارضی سا وقفہ ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ ہم آئے کدھر سے ہیں اور اپنی اس منزل کا بھی واضح شعور ہمیں ہونا چاہیے جہاں ہمیں جانا ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار اس آیۂ مبارکہ میں ہے کہ ہمارا وجود بھی اللہ کا عطا کردہ ہے اور ہمیں حیات بھی اسی نے عطا کی ہے۔ لہٰذا ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' اللہ ہمارے بارے میں جو فیصلہ بھی کرے ہمیں قبول ہے۔ اس کی مرضی کے آگے ہمارا سرِ تسلیم خم ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی عطا ہے۔ ع ''ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است'' میرے اس پیالے میں میرے ساقی نے جو کچھ ڈال دیا یہ اس کی نگاہِ کرم ہی کے طفیل ہے۔ یہ اس کا عطیہ ہے' لہٰذا دل و جان سے قبول ہے۔ آگے فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ﴾

''یہ ہیں وہ لوگ کہ جن پر اُن کے ربّ کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت ہے''۔

صلوٰۃ ـ بندے اور ربّ کے مابین دوطرفہ معاملہ

یہاں لفظ ''صَلَوَات'' بھی خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ یہ صلوٰۃ کی جمع ہے اور اس سے قبل یہ لفظ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کے درس میں آ چکا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ ...... ''صلوٰۃ'' جیسا کہ عرض کیا گیا تھا' توجہ کا نام ہے۔ لغت میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے: ''اِقْدَامٌ اِلَى الشَّيْءِ'' یعنی کسی کی جانب متوجہ ہونا' کسی کی طرف رخ کر لینا۔ اسی لیے نماز جس کی اصل روح ہے اللہ کی جانب متوجہ ہو جانا' اس کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے:

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ

الْمُشْرِكِيْنَ﴾

صلوٰۃ درحقیقت ایک دوطرفہ عمل ہے جو اللہ اور بندے کے مابین ہے۔ بندہ جذبۂ عبودیت کے ساتھ اپنے ربّ کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور پروردگار شفقت وعنایت کے ساتھ بندے کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ ذہن میں رکھئے کہ قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات پر عبد و معبود کے ربط و تعلق کو ایک دوہرے اور دوطرفہ تعلق کی شکل میں سامنے لایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ ہی میں اس مقام سے متصلاً قبل کہ جو ہمارے زیر درس ہے‘ یہ آیت موجود ہے:

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾

''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر بجالاؤ اور میری ناشکری نہ کرو!''

اس کی بڑی عمدہ وضاحت ایک حدیث قدسی سے ہوتی ہے جس کی رُو سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اگر میرا بندہ مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں ‘اور اگر میرا بندہ میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو میں اس سے بہت اعلیٰ محفل میں (یعنی ملائکہ مقربین کی محفل میں) اس کا ذکر کرتا ہوں''۔ اسی طرح کا معاملہ لفظ توبہ کا بھی ہے۔ بندہ اللہ کی جناب میں پشیمانی اور احساسِ ندامت کے ساتھ رجوع کرتا ہے‘ گناہ کے راستے سے واپس پھرتا ہے اور اللہ بھی بندے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اپنی شفقتوں اور عنایتوں کے ساتھ۔ گویا اس کی وہ نگاہِ کرم جو بندے کی جانب سے ہٹ گئی تھی وہ اب پھر اس کی طرف ملتفت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ''نصرت'' کا معاملہ بھی دوطرفہ ہے: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔ یہ صریحاً ایک دوطرفہ معاملہ ہے۔ اسی طرح شکر کے بھی دو رُخ ہیں۔ اللہ بھی شکور ہے اور بندے کے لیے بھی شکور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بندے کا شکور ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ اللہ کا حق مانے‘ اس کا احسان مانے‘ اس کی نعمتوں کا حق ادا کرے اور اس کا شکر بجالائے‘ جبکہ اللہ اس اعتبار سے شکور ہے کہ وہ کوششوں اور قربانیوں کی قدر افزائی فرمانے والا ہے‘ وہ بڑا قدر دان ہے۔ تو ذہن میں رکھئے کہ کچھ اسی طرح کا معاملہ صلوٰۃ کا بھی ہے۔ بندہ اگر اللہ کی طرف متوجہ ہو گا تو اللہ بھی بندے کی طرف کمال شفقت کے ساتھ متوجہ ہو جائے گا۔ سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی شان میں جو الفاظ وارد ہوئے وہ چونکہ بالعموم سیرت کی ہر تقریر کا عنوان بنتے ہیں‘ لہٰذا اکثر لوگوں کو یاد ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا

تَسۡلِیۡمًا ﴿۵۶﴾

یہاں دیکھئے کہ ''صلوٰۃ'' کی نسبت اللہ اور فرشتوں کی طرف ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں' ان کی جانب سے آپؐ پر شفقتوں اور عنایتوں کا مسلسل نزول ہوتا رہتا ہے' لیکن نوٹ کیجیے کہ یہ الفاظ صرف نبی اکرم ﷺ کے لیے نہیں آئے بلکہ سورۃ الاحزاب ہی میں بعینہٖ یہی الفاظ اہلِ ایمان کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَ کَانَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَحِیۡمًا ﴿۴۳﴾﴾

''وہی ہے اللہ جو (اے اہلِ ایمان!) تم پر عنایتیں بھیجتا رہتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تم پر عنایتیں (درود) بھیجتے ہیں' تاکہ وہ تمہیں نکالے اندھیروں میں سے روشنی کی جانب' اور وہ اہل ایمان کے حق میں بہت ہی رحیم ہے''۔

یہ ہے لفظ صلوٰۃ کا قرآن حکیم میں استعمال! یہاں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ﴾ اللہ کی عنایات اور شفقتوں کا نزول ان لوگوں پر ہوتا ہے جو مشکلات اور آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے والے ہیں' جنہوں نے دین کو محض موروثی عقائد اور چند رسومات کا مجموعہ سمجھ کر قبول نہیں کیا بلکہ شعوری طور پر حقائق کو سمجھا' فرائضِ دینی کا شعور حاصل کیا' دین کی دعوت پر لبیک کہا' جنہوں نے اس حقیقت کو جانا کہ دین کے لیے جان و مال کھپانا اور اس کے غلبہ و اقامت کے لیے قربانیوں کا دینا ہمارے ایمان کا عین تقاضا ہے' اور پھر اس راہ کے تمام امتحانوں اور آزمائشوں میں پورے اترے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر اُن کے ربّ کی جانب سے عنایتیں ہیں' جن کے لیے شاباشیں ہیں' جن پر اللہ کی رحمتوں کا مسلسل نزول ہوتا رہے گا۔ اور فرمایا: ﴿وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ﴾ ''اور یہی ہیں وہ لوگ جو راہ یاب ہونے والے ہیں'' جو ہدایت یافتہ ہیں۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں پھر اسلوبِ حصر ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ صرف یہی لوگ فی الواقع راہ ہدایت پر گامزن ہیں۔

اس سے قبل سورۃ الفاتحہ کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ہدایت کے مختلف مدارج ہیں۔ ایک انسان درجہ بدرجہ ہدایت کی منزلیں طے کرتا ہے۔ ایک منزل کے بعد اگلی منزل ہے اور ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ ہے۔ گویا ہدایت ایک مسلسل عمل ہے۔ چنانچہ لفظ ہدایت کا اطلاق اپنے تکمیلی معنوں میں کسی کے منزلِ مراد تک پہنچ جانے کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے ﴿وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ

الْمُهْتَدُوْنَ﴾ کا مفہوم ہوگا:''یہ ہیں وہ لوگ جو منزلِ مراد تک پہنچ جانے والے ہیں''۔

ان چند آیات میں اہلِ ایمان کو مدنی دَور کے بالکل آغاز میں جن مراحل سے سابقہ پیش آنے والا تھا ان کے بارے میں پیشگی طور پر متنبہ کر دیا گیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو بحیثیت اُمتِ مسلمہ شہادت علی الناس کا جو فرضِ منصبی سونپا گیا تھا اس کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے لیے یہ رہنمائی عطا کر دی گئی کہ جو مرتبہ و مقام تمہیں ملا ہے اس کے تقاضے کے طور پر یہ بات جان لو کہ اس راہ میں مصائب و مشکلات آئیں گی' آزمائشوں میں سے تمہیں گزرنا ہوگا۔ اس لیے کہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!

حکمِ قتال اور اس کا ہدف

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ سورۃ البقرۃ مدنی سورۃ ہے اور اس کے زمانۂ نزول کا اگر تعین کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک کے عرصے میں نازل ہوئی۔ چنانچہ یہ آیات جو ہمارے زیر درس ہیں گویا کہ قتال فی سبیل اللہ کے لیے تمہید کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر چوبیسویں رکوع میں قتال فی سبیل اللہ کے ضمن میں متعین حکم بھی موجود ہے: ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا﴾ حکم ہو گیا کہ اے اہلِ ایمان اب اللہ کی راہ میں قتال کرو' اور جان لو کہ تمہاری دعوت اب اگلے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ الحج میں' جو نزولی اعتبار سے سورۃ البقرۃ سے متصلاً قبل شمار کی جاتی ہے' اذنِ قتال والی آیت آئی ہے۔ ذہن میں رکھئے کہ قتال کی اجازت اور قتال کا حکم دو مختلف چیزیں ہیں۔ اجازتِ قتال یہ ہے کہ اب تمہیں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہو گئی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۝۳۹﴾

یعنی آج اجازت مرحمت کی جا رہی ہے ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونسی گئی تھی' جن پر مظالم توڑے گئے تھے' جنہیں اُن کے گھر بار سے نکالا گیا تھا' جن پر زندگی کا قافیہ تنگ کیا گیا تھا' لیکن جنہیں اب تک اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی' گویا ان کے ہاتھ باندھ دیئے گئے تھے' جیسا کہ سورۃ النساء میں ایک جگہ فرمایا گیا کہ ان سے کہہ دیا گیا تھا: ﴿کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ﴾ ''اپنے ہاتھ بندھے رکھو''۔ یعنی جھیلو اور برداشت کرو' جس کے لیے ان دروس میں بار بار Passive Resistance کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ آج ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے اور انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اینٹ کا جواب

پتھر سے دے سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی نوید بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔

اس کے بعد سورۃ البقرۃ میں حکمِ قتال وارد ہوا:

﴿وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ﴾ (آیت ۱۹۰)

''جو لوگ تم سے جنگ کر رہے ہیں اب تم ان سے جنگ کرو اللہ کی راہ میں''۔

سورۃ البقرۃ کے چوبیسویں رکوع میں جہاں قتال کا یہ حکم آیا ہے وہاں ساتھ ہی اس کا ہدف بھی معین کر دیا گیا:

﴿وَقٰتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّيَكُوۡنَ الدِّيۡنُ لِلّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۹۳)

''اور ان سے جنگ کرتے رہو (یہ تلواریں جو اَب میان سے نکلی ہیں یہ اب میان میں واپس نہیں جائیں گی) جب تک کہ فتنہ بالکل فرو نہ ہو جائے (اللہ کے باغی جب تک ہتھیار نہ ڈال دیں) اور پورا نظامِ اطاعت اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے''۔

جب تک اللہ کی زمین پر اسی کا حکم نافذ نہیں ہوتا اور اس کا کلمہ سر بلند نہیں ہوتا اُس وقت تک جنگ جاری رہے گی۔ گویا قتال فی سبیل اللہ کا ہدف یہ ہے کہ دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے' اسی کا جھنڈا سر بلند ہو' اسی کی مرضی نافذ ہو' اسی کے حکم کی تنفیذ ہو' مختصراً یہ کہ اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا دین قائم ہو جائے۔ بہرکیف یہ ہے قتال کا باضابطہ حکم جو سورۃ البقرۃ کے چوبیسویں رکوع میں آیا ہے۔

اب ذرا ایک نظر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴ پر بھی ڈال لیجیے جس کا حوالہ اس سے پہلے سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کے درس میں دیا جا چکا ہے۔ یہ بات سمجھ لیجیے کہ کسی بھی نظریاتی گروہ یا جماعت میں ہر مزاج اور ہر افتادِ طبع کے لوگ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی جماعت میں جہاں کثیر تعداد میں ایسے باہمت لوگ تھے کہ جنہوں نے حکمِ قتال کی آیت کے نزول پر خوشیاں منائیں کہ اب ہمارے ہاتھ کھول دیئے گئے' اب ہمارے لیے دین کی راہ میں سرفروشی کا وقت آ گیا اور ہمیں اب شہادت کے مواقع نصیب ہوں گے' وہاں کچھ وہ بھی ہوں گے کہ جن پر کچھ گھبراہٹ طاری ہوئی ہو گی۔ جن کے لیے یہ نیا مرحلہ جس میں جنگ وقتال سے سابقہ تھا' شاید زیادہ ہی کڑی آزمائش بن گیا ہو۔ ایسے لوگوں سے صاف کہہ دیا گیا: ﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ﴾ ''کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ تم (سیدھے سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے'' ﴿وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ﴾ ''حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات آئے ہی نہیں (وہ آزمائشیں' وہ کٹھنائیاں اور وہ مشکلات ابھی آئی ہی نہیں) کہ جو تم سے

پہلی اُمتوں کو پیش آ ئے تھے''۔ ﴿مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا﴾ ''فقر وفاقہ اور تکالیف ان پر مسلط ہوگئیں اور وہ ہلا مارے گئے'' ﴿حَتّٰی يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ﴾ ''یہاں تک کہ (وقت کے) رسولؐ اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آ ئے گی! (تب انہیں خوشخبری سنائی گئی) آ گاہ رہو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے''۔ اور اس کے ایک ہی آیت کے بعد مسلمانوں سے فرمادیا گیا: ﴿كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ وَهُوَ كُرۡهٌ لَّكُمۡ ۚ﴾ ''تم پر یہ قتال فرض کر دیا گیا (یہ دعوت آج اپنے اگلے مرحلے میں داخل ہوگئی) اور یہ تمہیں ناپسند ہے''۔ تم پر یہ حکم بڑا بھاری گزر رہا ہے۔ ﴿وَعَسٰۤی اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ ۚ﴾ ''اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو درآ نحالیکہ اسی میں تمہارے لیے بہتری ہو''۔ ﴿وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ ؕ﴾ ''اور ہوسکتا ہے کہ کسی چیز سے تمہیں محبت ہو (وہ تمہیں پسند ہو) درآ نحالیکہ فی الواقع وہ تمہارے لیے شر ہو''۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ ''اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔

ایک آ خری بات یہ عرض کرنی ہے کہ یہاں اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا چونکہ بحیثیت مجموعی بھی ایک تجزیہ عرض کیا گیا ہے لہٰذا اسی حوالے سے یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آ گے چل کر تاریخ بنی اسرائیل کی اس اہم جنگ کا تفصیلاً ذکر آیا ہے جسے ان کی تاریخ میں جنگِ بدر کے قائم مقام سمجھا جا سکتا ہے جس کے بعد کہ ان کے دُنیوی اقتدار اور جاہ وجلال کے دَور کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ طالوت اور جالوت کے مابین ہوئی جس کے بعد حضرت داوٗد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا وہ عہدِ حکومت ہے جسے بجا طور پر تاریخ بنی اسرائیل کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں اس اہم تاریخی واقعے کا ذکر دراصل مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لیے ہے کہ اب وہی مرحلہ تمہاری تاریخ میں بھی آیا چاہتا ہے۔ یہ گویا پیشگی خبر تھی غزوۂ بدر کی جو نقطۂ آغاز ہے ایک طویل سلسلۂ قتال کا جس کے پہلے مرحلے کا اختتام ہوتا ہے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں سفر تبوک پر۔ اب ان شاء اللہ آئندہ اس منتخب نصاب کے حصّہ پنجم میں صرف ایک تقریر میں کوشش کی جائے گی کہ اس پورے سلسلۂ قتال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین۔
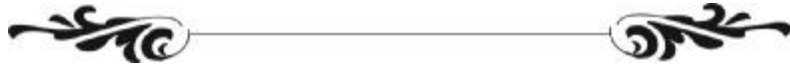
درس 23

نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ

سلسلۂ غزوات کا آغاز
اور
اس کا ہدف آخرین

سُورَةُ الأنفَال کی آیت نمبر ۳۹ اور
سُورَةُ التَّوبَة کی آیت نمبر ۱۱۱ کی روشنی میں !

درس ۲۳

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ:

سلسلۂ غزوات کا آغاز اور اس کا ہدف آخریں

سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۳۹ اور سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۱۱ کی روشنی میں!

نحمدهٗ ونصلّی علٰی رسولهِ الکریم ...... امّا بعد:

اَعُوذ بِاللہ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم ۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾﴾ (الانفال)

وَقَالَ تبارك وتعالىٰ كما ورد فى سورة التوبة:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۨ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾﴾ ...... صدق اللہ العظیم

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں قتال فی سبیل اللہ یا غزوات کا سلسلہ رمضان ۲ھ سے شروع ہو کر اواخر ۹ھ تک جاری رہا۔ اس طرح یہ سلسلۂ قتال وغزوات آٹھ سالوں پر محیط ہے۔ اس دوران میں بہت سے ''غزوات وسرایا'' ہوئے۔ سیرتِ مطہرہ کے حوالے سے غزوہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بنفسِ نفیس شرکت فرمائی ہو، اور ''سریہ'' (جس کی جمع سرایا ہے) اس جنگی مہم کو کہتے ہیں کہ جس کے لئے آپ نے کوئی دستہ بھیجا ہو، لیکن خود اس میں شمولیت نہ فرمائی ہو۔

غزوات کا ذکر قرآن حکیم میں

قرآن حکیم میں متعدد غزوات کا تذکرہ موجود ہے اور اس معاملہ میں ہمیں وہاں ایک عجیب حسن

ترتیب نظر آتی ہے۔قرآن حکیم میں مکّیات اور مدنیات کے لحاظ سے سورتوں کے جو سات گروپ بنتے ہیں ان کے بارے میں بنیادی تعارفی باتیں اس منتخب نصاب کے درس کے دوران ایک موقع پر عرض کی جا چکی ہیں۔اس سلسلے کا دوسرا گروپ اس اعتبار سے نہایت متوازن ہے کہ اس میں شامل کل چار سورتوں میں سے دو سورتیں مکّی ہیں اور دو ہی سورتیں مدنی ہیں۔سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکّیات ہیں اور سورۃ الانفال اور سورۃ التوبۃ مدنیات ہیں۔اس ترتیب میں ایک عجیب حکمت یہ نظر آتی ہے کہ سلسلۂ غزوات کی پہلی کڑی یعنی غزوۂ بدر کا ذکر سورۃ الانفال میں ہے اور اس سلسلے کی آخری کڑی یعنی غزوۂ تبوک کا تفصیلی ذکر ہے سورۃ التوبہ میں۔گویا کہ ان دونوں سورتوں کو مصحف میں متصلاً رکھ کر اس سلسلۂ غزوات کے نقطۂ آغاز اور نقطۂ اختتام دونوں کو یکجا کر دیا گیا۔

قرآنِ حکیم میں تمام غزوات کا ذکر نہیں ہے۔اب ظاہر ہے کہ جن کا ذکر کیا گیا ہے یقیناً ان کی اہمیت کسی نہ کسی پہلو سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔گویا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد اور آپؐ کے مشن کی تکمیل کی اس کوشش میں اہم سنگ ہائے میل (Land Marks) کی حیثیت رکھتے ہیں۔وہ غزوات کہ جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے ان میں غزوۂ بدر ہے جو رمضان ۲ ھ میں ہوا۔قرآن حکیم کی ایک مکمل سورۃ' یعنی سورۃ الانفال اسی غزوے کے حالات و واقعات اور اس سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے۔اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پوری سورۃ ایک انتہائی مربوط خطبے کی حیثیت سے بیک وقت نازل ہوئی' اس لئے کہ اس کے اوّل و آخر کے درمیان ایک بڑا گہرا منطقی اور معنوی ربط ہے' جس کا حوالہ بعد میں ہماری گفتگو میں آئے گا۔غزوۂ بدر کے فوراً بعد غزوۂ بنی قینقاع ہوا' لیکن اس کا قرآنِ مجید میں ذکر موجود نہیں ہے۔شوال ۳ ھ میں غزوۂ اُحد ہوا۔یہ غزوہ بعض اعتبارات سے نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اس میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جن کے نتائج بہت دُور رس نکلے' چنانچہ قرآن مجید میں اس غزوہ کے حالات و واقعات پر بھی نہایت بھر پور تبصرہ موجود ہے۔سورۂ آل عمران کی ایک سو بیسویں آیت سے یہ مضمون شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد تقریباً مسلسل ساٹھ آیات اسی غزوہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔اس کے بعد غزوۂ بنونضیر واقع ہوا۔اس کا ذکر قرآنِ حکیم میں سورۃ الحشر میں ہے۔پھر ۵ ھ میں غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق پیش آیا۔اس کا شمار بھی انتہائی اہم غزوات میں ہوتا ہے اور سلسلۂ غزوات میں اسے ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) کی حیثیت حاصل ہے۔اس پر سورۃ الاحزاب میں مکمل دو رکوعوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے معاً بعد غزوۂ

بنوقریظہ ہے جسے غزوۂ احزاب ہی کا ضمیمہ یا تکملہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب ہی میں غزوۂ احزاب کے ذکر کے ساتھ متصلاً اس کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اس کے بعد اگرچہ اور غزوات بھی ہوئے' مثلاً غزوۂ مریسیع اور غزوۂ بنی مصطلق وغیرہ' لیکن قرآنِ مجید میں ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔

۶ ھ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا اور یہ نبی اکرم ﷺ کی اس جدوجہد میں ایک بڑے اہم سنگ میل (Land Mark) کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم اسے فتح مبین سے تعبیر کرتا ہے' اس لئے کہ یہ اہم واقعہ فتح مکّہ کی تمہید ثابت ہوا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ پر ایک پوری سورۃ' سورۃ الفتح کے نام سے موجود ہے جس کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۝﴾ اس کے بعد ۷ ھ میں غزوۂ خیبر ہوا لیکن قرآن مجید میں اس کے حالات و واقعات کا ذکر موجود نہیں ہے۔ ۸ ھ میں ایک جانب تو جنگ موتہ ہوئی اور سلطنتِ روم کے ساتھ مسلمانوں کے ٹکراؤ کا آغاز ہوا' اس کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں ہے' اور دوسری جانب فتح مکّہ جیسا اہم واقعہ ہوا' تاہم اس پر بھی قرآنِ مجید میں صراحتاً کہیں گفتگو نہیں ہوئی' بلکہ اس کا ضمناً ذکر سورۃ التوبۃ میں ملتا ہے۔ البتہ اسی سورۃ میں غزوۂ حنین کا ذکر' جسے فتح مکّہ ہی کا تکملہ یا تتمہ قرار دیا جا سکتا ہے' نام لے کر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی یا یوں کہئے کہ سلسلۂ غزوات کا نقطۂ عروج وہ ہے جسے ہم غزوۂ تبوک کے نام سے جانتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس غزوہ کے حالات و واقعات بھی بیان ہوئے ہیں اور ان پر بڑا مفصل تبصرہ بھی موجود ہے۔ یہ ہے اجمالی طور پر اِن غزوات کی تاریخ وار ترتیب کہ جو ہجرت کے بعد آٹھ سالوں کے دوران حیاتِ نبوی ﷺ میں واقع ہوئے۔ اب اس سے پہلے کہ ہم ان غزوات کا جو ذکر قرآنِ حکیم میں آیا ہے اور ان کی جن اہم باتوں کی طرف قرآنِ مجید میں توجہ دلائی گئی ہے' ان پر جستہ جستہ غور کرنا شروع کریں' مناسب یہ ہوگا کہ تمہیدی طور پر اپنے ذہن میں اس صورتِ حال کا ایک نقشہ قائم کر لیا جائے جس سے آنحضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ مدینہ میں دوچار تھے اور یہ کہ کس طرح آپ نے غلبۂ دینِ حق کے اس مشن کو' جسے سورۃ الصّف میں آپ ﷺ کا مقصدِ بعثت قرار دیا گیا' مدنی دَور میں درجہ بدرجہ تکمیل تک پہنچایا۔

مدینہ کے خاص حالات

ہم آنحضور ﷺ کی مکّی زندگی سے متعلق کچھ باتوں پر اِس سے پہلے غور کر چکے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جب آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کیا صورت حال تھی۔ مدینہ منورہ میں اوس

اورخزرج کے نام سے دو قبیلے تو وہ تھے کہ جن کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ وہاں کے اصل راجپوت قبیلے تھے۔ اوس نسبتاً چھوٹا قبیلہ تھا جبکہ خزرج عددی اعتبار سے بڑا قبیلہ تھا۔ ان کے علاوہ تین یہودی قبیلے بھی وہاں آباد تھے جن کی حیثیت کچھ مہاجنوں کی سی تھی۔ ان کا نہ صرف علمی اعتبار سے وہاں ایک رعب اور دبدبہ تھا بلکہ تہذیبی و تمدنی اور ثقافتی اعتبار سے بھی ان کی مدینہ میں ایک حیثیت تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روپے پیسے کے اعتبار سے بھی انہیں برتری حاصل تھی۔ یہ قبائل مدینے کے اطراف میں آباد تھے اور نہایت مضبوط گڑھیوں اور قلعوں میں رہتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ جب مدینے تشریف لائے تو اوس اور خزرج کی اکثریت ایمان لے آئی۔ ان میں سے اگرچہ کثیر تعداد ان لوگوں کی تھی جو صدقِ دل سے ایمان لائے تھے تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس بنا پر ایمان لائے کہ چونکہ سردارانِ قبیلہ ایمان لے آئے ہیں تو ہم بھی اسلام قبول کیے دیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ وہاں ایسے بھی تھے کہ جو ایمان تو لے آئے لیکن بادلِ ناخواستہ۔ اس طور سے ایمان لانے والوں میں دو شخصیتیں بہت نمایاں ہیں' ابو عامر اور عبداللہ بن اُبی بن سلول۔ دونوں کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا کہ جو زیادہ طاقتور اور بڑا قبیلہ تھا۔ ابو عامر کی نیکی اور دینداری کا وہاں لوہا مانا جاتا تھا اور عبداللہ بن اُبی بن سلول کی سیاسی سمجھ بوجھ کے سب معترف تھے اور اسے ایک بڑا سردار تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے ورودِ مدینہ سے متصلاً قبل اوس اور خزرج کے مابین اس بات پر اتفاق رائے ہو چکا تھا کہ عبداللہ بن اُبی بن سلول کو بادشاہ مان کر مدینے میں باقاعدہ ایک بادشاہی نظامِ حکومت قائم کر دیا جائے۔ تاج تیار ہو چکا تھا' لیکن جب آنحضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو ظاہر بات ہے کہ خورشیدِ رسالت کے طلوع ہونے کے بعد اب نہ ابو عامر راہب کی نیکی اور دینداری کا چراغ جل سکنے کا کوئی امکان موجود تھا اور نہ ہی اب وہ صورت برقرار رہی کہ کسی کے سر پر یہاں تاجِ شاہی رکھا جا سکے۔ اب وہاں دینی و مذہبی ہی نہیں سیاسی اعتبار سے بھی سیادت و قیادت محمد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہو گئی تھی۔

اس مرحلے پر یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے اور اس سے قبل بھی اس جانب توجہ دلائی جا چکی ہے کہ آنحضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان جان بچا کر مکّہ سے مدینہ نہیں آئے تھے' یہ فرار نہیں تھا (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ) بلکہ یہ ایک اہم مقصد کے لئے ایک ایسے مرکز (Base) میں جمع ہونے کا ایک عمل تھا کہ جو اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ اور مسلمانوں کو عطا فرمایا تھا' تاکہ غلبہ دینِ حق کے اس اہم مقصد کی طرف پیش قدمی کی جا سکے جس کے لئے نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ مدینے کو دار الہجرت اسی

اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

آنحضورﷺ کی دُوراندیشی کا شاہکار

نبی اکرمﷺ نے مدینے تشریف لاتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ آپ کی دوراندیشی اور معاملہ فہمی کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے فوری طور پر ایک نقشہ کار تیار کیا کہ جس کے مختلف تقاضے آپ کے سامنے اس وقت پوری وضاحت کے ساتھ موجود تھے' چنانچہ اس کے مطابق عملی اقدامات کا آغاز فرما دیا۔ مدینہ تشریف لاتے ہی آپؐ نے پہلا کام یہ کیا کہ یہودیوں سے معاہدے کر لئے۔ اور اس طرح انہیں معاہدوں میں جکڑ لیا کہ بعد کے نو دس سالوں کے دوران ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہود ان معاہدوں کی وجہ سے ایک عجیب مشکل میں گرفتار ہو گئے تھے۔ نبی اکرمﷺ اور مسلمانوں کے خلاف شدید جذبات رکھنے کے باوجود وہ کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کے قابل نہیں رہے تھے اور خود کو بے دست و پا محسوس کرتے تھے' ہاں درپردہ سازش اور ریشہ دوانی کرنے کی کوششیں انہوں نے ضرور کیں اور بعض مواقع پر مشرکین مکّہ کو اشتعال دلا کر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی لیکن وہ براہِ راست اور کھلم کھلا نبی اکرمﷺ کے مقابلے میں نہیں آ سکے۔ یہی معاہدے کہ جو اُن کے پاؤں کی بیڑیاں بنے تھے بالآخر اُن کے گلے کا طوق بھی بنے۔ اور انہی معاہدوں کو توڑنے کی پاداش میں وہ تینوں قبیلے باری باری اپنے انجام کو پہنچے۔ ان میں سے دو قبیلوں کو مختلف مراحل پر مدینہ بدر کیا گیا اور ایک کو اُن کی بدعہدی کی سخت ترین سزا دی گئی کہ ان کے تمام لڑائی کے قابل مَردوں کے سر قلم کئے گئے۔

مسلمانوں کی جنگ دفاعی نہیں تھی!

اس حوالے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اس دَور میں ہمارے بعض دانش وروں اور اہلِ علم نے سیرتِ طیبہ کے ان غزوات کے معاملے میں جو معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا ہے کہ یہ صرف دفاعی جنگ تھی ورنہ اسلام اپنے غلبے کے لئے جنگ اور خون ریزی کے راستے کو اختیار نہیں کرتا' یہ درست نہیں ہے۔ مغرب سے یہ بات دراصل کچھ اس انداز میں طعنے کے طور پر ہمارے بارے میں کہی گئی اور یہ الزام کچھ اس شدت کے ساتھ لگایا گیا کہ ع ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے'' کہ ردّعمل کے طور پر ہمارے ہاں سے ایک نہایت معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا اور یہ انداز بالخصوص ان طبقات نے اختیار کیا جو مغرب کی مادّی اور سائنسی ترقی سے ذہنی طور پر مرعوب تھے۔

اس میں تو ہرگز کوئی شک نہیں کہ ابتداء بہر حال اہل مَکّہ کی طرف سے ہوئی' لیکن وہ ابتداء ان معنوں میں تھی کہ انہوں نے مَکّہ میں مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ ڈالے اور انہیں ان کے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا۔ اس اعتبار سے گویا کہ مشرکین مَکّہ کی طرف سے تو جنگ کا اعلان پہلے سے تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ مَکّی دَور میں اہل ایمان کے ہاتھوں کو باندھ دیا گیا تھا۔ انہیں حکم تھا: ﴿کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ﴾ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر پابندی تھی اور انہیں اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ وہ اجازت آ گئی۔ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' دورانِ سفرِ ہجرت سورۃ الحج کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۨ ﴿۳۹﴾ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ﴾ (آیت ۴۰)

''آج اجازت دی جا رہی ہے ان کو کہ جن پر جنگ ٹھونسی گئی تھی' اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا تھا۔ (اب وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے (جو گھر بار کو چھوڑ کر ترکِ وطن پر مجبور کر دیئے گئے) صرف اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے یہ کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے۔''

گویا کہ اس معنی میں اگر کہا جائے کہ آغاز مشرکینِ مَکّہ کی طرف سے ہوا تو بات غلط نہیں ہے' لیکن اگر اس کے معنی یہ سمجھے جائیں کہ مدینے پر حملہ بھی یک طرفہ طور پر انہی کی جانب سے تھا اور مسلمانوں نے مدافعانہ جنگ لڑی ہے تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو تمکن عطا فرمایا اور مسلمانوں کو ایک مرکز میسر آ گیا تو آپؐ نے مَکّے کی طرف اقدام کا آغاز کر دیا۔ مَکّے کی جانب آنحضور ﷺ کی اوّلین پیش قدمی کس طور سے ہو سکتی تھی' اسے اس واقعے کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ عمرے کے لئے مَکّے تشریف لے جاتے ہیں۔ وہاں وہ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر سے پہلے کا ہے۔ ابوجہل پوچھتا ہے یہ کون صاحب ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ سعد بن معاذؓ ہیں۔ تو وہ بپھر کر غصے میں کہتا ہے کہ تم نے ہمارے بھگوڑوں کو پناہ دی ہے اور اگر تم لوگوں نے انہیں اپنے ہاں سے نکال باہر نہ کیا تو ہم بیت اللہ میں تمہارا داخلہ بند کر دیں گے۔ اس کا فوری جواب جو حضرت سعد بن معاذؓ نے دیا وہ یہ تھا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمہاری اس تجارتی شاہراہ کو بند کر دیں

گے جو تمہاری رگِ جاں کی حیثیت رکھتی ہے اور جو مدینے کے قریب سے ہو کر گزرتی ہے۔ ابوجہل کی دھمکی کے جواب میں فوری طور پر حضرت سعد بن معاذؓ کا ذہن اس جانب منتقل ہو گیا۔ آنحضور ﷺ نے قریش مکّہ کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔

غزوۂ بدر کا ایک اہم سبب...... کفارِ مکّہ کی معاشی ناکہ بندی

جدید اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مکّے والوں کا Economic Blockade کر دیا' ان کے تجارتی راستوں کو مخدوش بنا کر ان کی معاشی ناکہ بندی کا سامان کر دیا۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں یہ حقائق محفوظ ہیں کہ غزوۂ بدر سے قبل آنحضور ﷺ نے ان تجارتی راستوں کو مخدوش بنانے کے لئے آٹھ مہمیں روانہ کیں' جن میں سے بعض میں آپؐ نے خود بھی شرکت فرمائی۔ انہی میں سے ایک مہم کے دوران مسلمانوں کے ہاتھوں ایک قرشی کافر مارا بھی گیا' گویا اس معاملے میں پہل مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مکّے والوں کی معاشی ناکہ بندی کرنا درحقیقت سانپ کو بل سے نکلنے پر مجبور کر دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ ابوجہل اور اس کے وہ ساتھی جو قریش میں سے Hawks کی قسم کے تھے اور کسی نہ کسی بہانے سے بہرصورت مدینے پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے' انہیں اس حوالے سے ایک موقع مل گیا۔ انہوں نے جس چیز کو بنیاد بنایا وہ یہی تھی کہ مسلمانوں نے ہمارے تجارتی قافلوں پر حملے شروع کر دیئے ہیں' ہمارا ایک آدمی قتل کر دیا ہے اور اب ہمارا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ جو مال و اسباب سے لدا پھدا شام سے واپس آ رہا ہے' اسے محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے شدید خطرہ لاحق ہے۔ ان باتوں کو بنیاد بنا کر کیل کانٹے سے لیس ہو کر ایک ہزار کا لشکر مکّے سے نکلا۔ ادھر نبی اکرم ﷺ کو بھی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ آپؐ نے اپنے طور پر بھی گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے اور کفارِ مکّہ کے ردّعمل کا جائزہ لینے کے لئے خبریں حاصل کرنے کا ایک مؤثر نظام تشکیل دیا ہوا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ کے لئے تو خبر کا ایک دوسرا اور معتبر ترین ذریعہ وحیٔ الٰہی کی صورت میں بھی موجود تھا۔

غزوۂ بدر سے قبل آنحضور ﷺ کی مشاورت

آپؐ تین سو تیرہ جاں نثار ساتھیوں کی معیت میں مدینہ سے نکلے اور ذرا باہر نکل کر اور ایک رائے کے مطابق مدینہ کے اندر ہی (یہ کچھ اہم تاریخی واقعات ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے) ایک

مجلس شوریٰ منعقد کی اور وہاں مسئلہ یہ رکھا کہ ایک طرف تو قافلہ ہے جو قریش کے سردار ابوسفیانؓ (جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) کے زیر قیادت شام سے آ رہا ہے' اس کے ساتھ کل پچاس محافظ ہیں' اور دوسری جانب ایک لشکر ہے جو مکّے سے نکلا ہے' اب تم لوگ سوچ کر مشورہ دو کہ ہمیں کس طرف کا رخ کرنا چاہئے' کس کی طرف بڑھنا چاہئے۔ یہ انداز درحقیقت آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے عزم و ہمت (morale) کا اندازہ کرنے کے لئے اختیار فرمایا تھا کہ ان کے اندر اللہ کی راہ میں سرفروشی اور جانفشانی کا جذبہ کس درجے میں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس موقع پر تقریر فرمائی۔ یہ تقریر جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت سے لبریز تھی۔ آنحضورﷺ نے ایک خاص سبب سے اس تقریر کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے تقریر فرمائی' آپؐ نے اُدھر بھی کوئی خصوصی التفات نہیں فرمایا۔ اس کے بعد حضرت مقدادؓ نے تقریر کی۔ ان کی تقریر اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اے اللہ کے رسولﷺ! ہمیں آپ اصحابِ موسیٰ ؑ پر قیاس نہ کیجئے کہ جنہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ: ﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ﴾ آپؐ جدھر کا بھی ارادہ رکھتے ہوں بسم اللہ کیجئے! کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ذریعے سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے...... لیکن آنحضورﷺ پھر بھی ابھی کچھ منتظر سے تھے۔ اس پر حضرت سعد بن عبادہؓ کھڑے ہوئے جو رؤساءِ انصار میں نمایاں مقام کے حامل تھے۔ وہ چونکہ خزرج کے سردار تھے لہٰذا مدینے میں گویا کہ ان کی حیثیت سب سے بڑھ کر تھی۔ انہوں نے اس بات کو بھانپتے ہوئے کہ آنحضورﷺ کس چیز کے انتظار میں ہیں' کھڑے ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔

اس معاملہ کا پس منظر جان لینا چاہئے کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ہونے والا وہ قول وقرار جو آنحضورؐ اور اہل مدینہ کے درمیان ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں مدینہ دار الہجرت بنا' اس میں یہ شق تو موجود تھی کہ مدینے پر اگر کوئی حملہ آور ہوگا تو انصار آنحضورﷺ کا ساتھ دیں گے اور آپؐ کی طرف سے مدافعت کریں گے' لیکن ایسی کوئی صورت کہ مدینے سے باہر نکل کر کہیں اگر جنگ کا معاملہ پیش آ جائے تو اس میں آنحضورﷺ کا ساتھ دینے یا نہ دینے کی بات اس قول وقرار میں زیر بحث نہیں آئی تھی اور کوئی معاہدہ اس بارے میں طے نہیں پایا تھا۔ یہی وہ بات تھی کہ جس کی وجہ سے نبی اکرمﷺ کی نگاہیں بار بار انصار کی طرف اٹھ رہی تھیں اور آپ انتظار میں تھے کہ ان کی طرف سے بھی کوئی بات

اس موقع پر سامنے آئے...... اس پس منظر میں حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں، ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مانا ہے۔ یہ گویا ان کی جانب سے اس حقیقت کا اظہار تھا کہ یہ چیز اب اہمیت کی حامل نہیں رہی کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں یا ثانیہ میں کیا طے ہوا تھا اور کیا طے نہیں ہوا تھا۔ صورت حال یہ ہے کہ ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے، آپؐ کو رسول مانا ہے، اب آپ ﷺ جدھر کا بھی حکم دیں گے ہم حاضر ہیں۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے کہ ہم اپنی سواریوں سمیت سمندر میں چھلانگ لگا دیں تو ہم حاضر ہیں، اور اگر آپ ہمیں برک الغماد تک چلنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنے اونٹوں کو مسلسل دوڑاتے اور لاغر کرتے ہوئے وہاں تک پہنچا دیں تو ہم ان شاء اللہ آپ کے اس حکم کی بھی تعمیل میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔ آنحضور ﷺ نے جب حضرت سعد بن عبادہؓ کی یہ جذبات پرور تقریر سنی تو آپ ﷺ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ یہ درحقیقت اصحاب رسول ﷺ کی جانب سے جاں نثاری اور دین کے لئے سرفروشی اور جانفشانی دکھانے کے عزم کا اظہار تھا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کے مشن کی تکمیل کی خاطر اپنی جان و مال کو قربان کر دینا باعث سعادت سمجھتے تھے۔

اللہ اور مسلمانوں کے مابین بیع ومبایعت

آج گفتگو کے آغاز میں سورۂ براءۃ کی جس آیت کی تلاوت کی گئی تھی اس میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ گویا ایک بیع وشراء ہو چکا ہے، ایک سودا طے پا چکا ہے۔ اس جسم و جان اور مال ومنال کی حیثیت ایک امانت کی ہے کہ جیسے ہی مطالبہ ہو، حاضر کر دیں۔ چنانچہ اس آیت کے یہ الفاظ خاص طور پر لائق توجہ ہیں: ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ﴾ کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، قتل کرتے بھی ہیں اور خود قتل ہوتے بھی ہیں۔ یعنی میدانِ جنگ میں پامردی اور جانفشانی سے کام لیتے ہوئے جہاں اللہ اور اس کے رسول کے باغیوں کی گردنیں اڑاتے ہیں وہاں خود اپنی جانوں کا نذرانہ بھی بارگاہِ ربّانی میں پیش کر کے سرخرو ہونے کو باعث اعزاز جانتے ہیں۔ اس کے بعد اہل ایمان کی تسلی کے لئے فرمایا کہ: ﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ﴾ جو معاہدہ ہوا ہے، جو بیع وشراء ہوا ہے، اب اس کا پورا کرنا اللہ کے ذمے ہے۔ یعنی اہل ایمان اگر اس معاہدے کو نبھائیں گے تو اللہ کا یہ پختہ وعدہ ہے کہ اس کی قیمت وہ جنت کی شکل میں اہل ایمان کو ضرور ادا کرے گا۔ یہ وہ پختہ وعدہ ہے جو تورات میں بھی ہوا، انجیل میں بھی ہوا اور انتہائی موثق اور مؤکد انداز میں

قرآن میں بھی ہوا۔مزید تسلی کے لئے فرمایا: ﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ اوراللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا وفا کرنے والا اور کون ہوگا؟ ﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ﴾ تو اے اہل ایمان! خوشیاں مناؤ اس بیع کی جوتم نے کی ہے۔ وہ سودا جوتم نے کیا ہے اس سے زیادہ کامیاب اوراس سے زیادہ نفع بخش سودا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ ﴿وَذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ ''اور یہی تو ہے اصل اور بڑی کامیابی''!

قتال فی سبیل اللہ کا اصل ہدف

اس قتال فی سبیل اللہ کا قرآن حکیم نے جو ہدف معین کیا ہے وہ بھی واضح طور پر ہمارے سامنے رہنا چاہئے۔ اس سے پہلے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۳ کے درج ذیل الفاظ کے حوالے سے بھی یہ مضمون ہمارے مطالعے میں آ چکا ہے کہ ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ اے مسلمانو! جنگ کرو اِن کفار اور مشرکین سے' یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔ یہی بات انتہائی مؤکد ہوکر قدرے مزید تفصیل کے ساتھ سورۃ الانفال میں بھی آئی ہے کہ جس میں غزوۂ بدر کے حالات وواقعات کا تفصیلی ذکر موجود ہے' جو نقطۂ آغاز ہے اس سلسلۂ قتال کا۔ وہاں فرمایا: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ اوران کفار اور مشرکین کے ساتھ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ زندگی کے بعض گوشوں میں اللہ کی اطاعت ہو رہی ہو اور بعض گوشوں میں اپنے نفس کی یا زمانے کے چلن کی یا کسی باطل نظام کی پیروی کی جا رہی ہو۔ زندگی کا ہر گوشہ اور بالخصوص اجتماعی نظام جب تک اللہ کے تابع نہیں ہوتا تمہاری یہ جنگ جاری رہنی چاہئے۔

سورۃ الصّف کی مرکزی آیت جب ہمارے زیرِ مطالعہ تھی کہ جس کے الفاظ یہ ہیں: ﴿هُوَ الَّذِىْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تو اُس وقت عرض کیا گیا تھا کہ یہاں پر ''الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' سے کل کا کل نظامِ زندگی مراد ہے۔ اس کے لئے سورۃ الانفال کی یہ آیت درحقیقت ''اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' (قرآن اپنے ایک حصے کی تفسیر دوسرے حصے سے کرتا ہے) کے اعتبار سے ایک یقینی دلیل کی حیثیت رکھتی ہے کہ ''الدِّين'' کے لئے بدل کے طور پر ''كُل'' کا لفظ یا تو سورۃ الصّف کی اس آیت میں آیا ہے جو قرآن حکیم میں دو اور مقامات پر بھی وارد ہوئی ہے اور یا سورۃ الانفال کی اس آیت میں آیا ہے کہ: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾

اور یہاں کل دین کا ترجمہ تمام ادیان کرنا ممکن نہیں۔ پورا نظامِ زندگی بحیثیت کل اللہ کے دین کے تحت آ جائے' یہ ہے مقصد بعثت محمد رسول اللہ ﷺ کا۔

غزوۂ بدر...... یوم الفرقان

سورۃ الانفال' جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' تقریباً پوری کی پوری غزوۂ بدر ہی سے متعلق ہے۔ بعض ایسے مسائل جو غزوۂ بدر کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے' مثلاً مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ' ان کا حل بھی اس سورۃ میں تجویز کیا گیا اور اس غزوے کے دوران جو حالات پیش آئے اور مسلمانوں سے اگر کہیں کسی کوتاہی کا صدور ہوا' ان سب پر اللہ کی طرف سے ایک نہایت جامع تبصرہ اور آئندہ کے لئے اصولی ہدایات بھی اس سورۂ مبارکہ میں شامل ہیں۔ گویا پوری سورۃ غزوۂ بدر کے گرد گھومتی ہے۔ غزوۂ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان قرار دیا' یعنی حق و باطل کے مابین تمیز والا دن۔ اس دن معلوم ہو گیا کہ اللہ کی نصرت وحمایت کس کے ساتھ ہے' ان کفارِ مکّہ کے ساتھ کہ جو ایک ہزار کی تعداد میں ہر طرح کے ہتھیار سجا کر میدانِ بدر میں آئے تھے یا اِن تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمانوں کے ساتھ جن کا رسالہ کل دو گھوڑوں پر مشتمل تھا اور جن میں سے سب کے پاس ہتھیار بھی مکمل نہ تھے۔ کسی کے پاس تلوار تھی تو نیزہ نہ تھا اور اگر نیزہ کسی کے پاس تھا تو تلوار نہ تھی' اور ایسے بھی تھے جو نیزہ اور تلوار دونوں سے تہی تھے۔ پھر یہ کہ ان بے سروسامان مسلمانوں کی عظیم اکثریت ان انصار پر مشتمل تھی کہ جن کو قریش جنگجو قوم ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے بارے میں قریش مکّہ کا یہ خیال تھا کہ یہ کاشت کار لوگ ہیں' لڑنے بھڑنے سے انہیں کیا سروکار! وہ تین سو تیرہ ایک ہزار کے کیل کانٹے سے لیس ہر طرح سے مسلح لشکر سے ٹکرا گئے اور اسے ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔ یوں سمجھئے کہ مکّے نے اپنی اصل طاقت کو وہاں اگل دیا تھا' اس کی کُل جمعیت میدانِ بدر میں موجود تھی۔ عتبہ بن ربیعہ اور ابوجہل جیسے بڑے بڑے سردار کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی مانند میدانِ بدر میں پڑے تھے۔ وہ دن واقعی یوم الفرقان تھا' اس نے حق و باطل کے مابین تمیز کر دی' دودھ کا دودھ پانی کا پانی جدا کر دیا۔ اس شاندار فتح سے مسلمانوں کا مورال یقیناً بہت بلند ہوا۔ پورے علاقے پر مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ اس طرح ہجرت کے دو ہی سال بعد صورتِ حال ایک دم اس طرح تبدیل ہو گئی کہ وہ کسمپرسی اور مظلومیت کا دَور گویا کہ ختم ہوا اور مسلمانوں کی دھاک پورے علاقے پر بیٹھ گئی۔ صورتِ حال کی یہ ساری تبدیلی دراصل نتیجہ تھا غزوۂ بدر کا جسے اللہ تعالیٰ نے بجا طور

پر یوم الفرقان قرار دیا تھا!

بندۂ مؤمن کی تصویر کے دو رُخ

غزوۂ بدر کے جن حالات اور واقعات پر تبصرہ سورۃ الانفال میں آیا ہے ظاہر بات ہے کہ اس مختصر گفتگو میں اس کی اہم باتوں کی طرف بھی اشارہ ممکن نہیں ہے' البتہ سورۃ الانفال کے آغاز و اختتام پر وارد شدہ چند آیات کے حوالے سے بطورِ یاددہانی ایک ایسی حقیقت کی طرف توجہ مناسب رہے گی کہ جو ہمارے اس منتخب نصاب کے لئے گویا کہ عمود اور اس کے مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے بالکل شروع میں اور پھر اس کے اختتام پر ایسی آیات وارد ہوئی ہیں کہ جنہوں نے سورۃ الحُجُرات کی آیت ۱۵ کی مانند حقیقی ایمان کی تعریف کو بہت مختصر اور جامع الفاظ میں اپنے اندر سمولیا ہے اور ایمان کے دونوں اجزاء (یعنی یقینِ قلبی اور جہاد فی سبیل اللہ) کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ الگ الگ نمایاں کیا ہے۔ ایمانِ حقیقی کے کچھ اثرات تو وہ ہیں جن کا تعلق باطنی کیفیات کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ کی یاد اگر دل میں تازہ ہو' اس کی عظمت اور دبدبہ وجلال سے اگر انسان کو کسی قدر آگاہی ہو اور ہر دم یہ احساس اگر اس کے دامن گیر ہو کہ اس کا ہر عمل اللہ کی نگاہ میں ہے تو اس کا طرزِ عمل ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتا ہے' اس کے صبح وشام کے انداز میں ایک خاص تغیر واقع ہوتا ہے جو اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ جھوٹ موٹ کا مدعیٔ ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان اس کے دل میں راسخ ہو چکا ہے۔ اور ایمانِ حقیقی کا دوسرا رکنِ رکین وہ ہے جس کے لئے سورۃ الحُجُرات میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے الفاظ آئے ہیں اور جس کا ذکر اس کے بعد سورۃ الصّف میں بھی ہمارے مطالعے میں آ چکا ہے۔ سورۃ الانفال میں ایمان کے ان دونوں ارکان کو ایک اچھوتے انداز میں جمع کیا گیا ہے۔ آغاز میں آیات ۲ تا ۴ میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَاِذَا تُلِیَتۡ عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُہٗ زَادَتۡہُمۡ اِیۡمَانًا وَّعَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳﴾ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَہُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَمَغۡفِرَۃٌ وَّرِزۡقٌ کَرِیۡمٌ ﴿۴﴾﴾

''مؤمن تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز اٹھیں اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جائیں تو اس سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے' اور وہ اپنے ربّ پر

توکل کرتے ہیں ۔ وہ لوگ کہ جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے لگاتے اور کھپاتے ہیں ۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جو حقیقتاً مؤمن ہیں ۔ ان کے لئے ان کے ربّ کے پاس اعلیٰ درجات اور بخشش اور نہایت اعلیٰ رزق ہے ۔‘‘

بندۂ مؤمن کی زندگی کا ایک رُخ ‘ یا یوں کہئے کہ بندۂ مؤمن کی شخصیت کی تصویر کا ایک پہلو اِن تین آیات میں آ گیا ۔ اسی تصویر کا دوسرا رُخ وہ ہے جو سورۃ الانفال کے بالکل آخر میں آیت ۷۴ میں آ رہا ہے ۔ یہاں ذہن میں رکھئے کہ اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت کے بعد وہ تین آیات آئی ہیں جن کا مطالعہ ابھی ہم نے کیا ‘ جن میں بندۂ مؤمن کی تصویر کا ایک دوسرا رُخ سامنے آتا ہے اور اس سورۃ کی آخری آیت سے پہلی (Last but one) آیت میں دوسرے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے جس کا اب ہمیں مطالعہ کرنا ہے ۔ فرمایا:

﴿وَالَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾﴾

’’اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی ‘ یہ ہیں وہ لوگ کہ جو حقیقی مؤمن ہیں ۔ ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور بہت اعلیٰ رزق بھی ۔‘‘

معلوم ہوا کہ بندۂ مؤمن کی تصویر کے یہ دو رُخ ہیں اور ان دونوں کے مجموعے سے ہی بندۂ مؤمن کی تصویر مکمل ہوتی ہے ۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں اس سے پہلے سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع میں اہلِ ایمان کی زندگی کا ایک نقشہ سامنے لایا گیا تھا اور وہاں ہجرت اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ والے پہلو کو اُجاگر کیا گیا تھا ۔ یہ وہی بات ہے جس کا تذکرہ یہاں سورۃ الانفال کے آخر میں آیا ہے ۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت کے الفاظ ذرا ذہن میں تازہ کیجئے :

﴿فَالَّـذِيْـنَ هَـاجَـرُوْا وَاُخْـرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا ......﴾ (آیت ۱۹۵)

دوسرا نقشہ یا بندۂ مؤمن کی تصویر کا دوسرا رُخ وہ ہے جو اس سے قبل ہمارے زیر مطالعہ آ چکا ہے ۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿رِجَـالٌ لَّا تُـلْهِيْهِـمْ تِـجَارَةٌ وَّلَا بَيْـعٌ عَنْ ذِكْـرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ ۙ

یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴾ (النور:۳۷)

اب دونوں کو جمع کرنے سے بندۂ مؤمن کی شخصیت کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ ع ''اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' کے مصداق ایک ہی حقیقت کو مختلف اسالیب میں بیان کیا جاتا ہے۔قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیات اس کی واضح مثال کا درجہ رکھتی ہیں۔

غزوۂ اُحد—فتح کے بعد وقتی شکست

سورۃ الانفال کی ان ابتدائی اور آخری آیات کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے اوّل وآخر کے مابین بڑا گہرا معنوی ربط موجود ہے اور اس سے اس جانب بھی رہنمائی ملتی ہے کہ یہ پوری سورۂ مبارکہ بیک وقت ایک مربوط خطبے کی حیثیت سے نازل ہوئی۔آگے چلئے! غزوۂ بدر سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ آس پاس کے قبائل پر مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم ہو گیا اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔لیکن اگلے ہی سال صورتِ حال اس کے برعکس ہوگئی۔اہل مَکّہ نے بدر کی شکست کے بعد مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے اپنی پوری قوّتوں کو جمع کیا۔انتقام لینا عربوں کی گھٹی میں شامل ہے۔اپنے ستر سربرآوردہ لوگ جن کی لاشوں کو وہ میدانِ بدر میں چھوڑ آئے تھے' ان کے انتقام کی آگ قریش مَکّہ کے سینوں میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔پورے اہتمام اور پوری تیاری کے ساتھ اگلے ہی سال ۳ ہجری کے ماہِ شوال میں تین ہزار کا لشکر جرار اب براہِ راست مدینے پر حملہ آور ہوتا ہے۔لشکر کی خبر سن کر آنحضورﷺ مشاورت طلب فرماتے ہیں۔حضورﷺ کا اپنا رجحان یہ تھا کہ مدینہ منورہ کے اندر محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔حسن اتفاق کہئے یا سوئے اتفاق کہ یہی رائے منافقین کے سردار عبداللہ بن اُبی کی تھی۔لیکن مسلمانوں میں سے کچھ نوجوان جن کے دل شوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد سے معمور تھے' ان کا جوش اور جذبہ اس درجے تھا کہ انہوں نے اس پر زور دیا اور اصرار کیا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کی جائے۔ نبی اکرمﷺ نے ان کے اس جذبۂ ایمانی کا لحاظ رکھا اور اپنی رائے پر ان کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ صادر فرما دیا۔دامنِ اُحد میں مقابلہ ہوا۔اس موقع پر پہلی مرتبہ نفاق کا عملی ظہور ہوتا ہے۔اگرچہ غزوۂ بدر کے بیان میں بھی قرآن مجید نشان دہی کرتا ہے کہ اُس وقت بھی ایسے کچھ لوگ موجود تھے جو یہ چاہتے تھے کہ لشکر کفار کا مقابلہ کرنے کی بجائے ابوسفیان جس قافلہ کو لے کر شام سے آ رہے تھے اس کا تعاقب کیا جائے۔چنانچہ اس پر قرآن مجید نے اسی اعتبار سے تنقید

بھی کی کہ ان لوگوں کو شاید دنیا زیادہ عزیز تھی' یا پھر اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینا ان کے نزدیک کچھ اتنا زیادہ خوش آئند نہ تھا' لیکن یہ ابھی ابتداء تھی اور مرضِ نفاق ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوا تھا۔

ابھی تک جو معاملہ صرف ضعف ایمان کا تھا اگلے سال غزوۂ اُحد کے موقع پر وہ نفاق ایک ادارے کی حیثیت سے پوری طرح سامنے آتا ہے کہ عین اس وقت جب نبی اکرم ﷺ ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ منورہ سے نکلے اور ابھی میدانِ جنگ تک نہیں پہنچے کہ عبداللہ بن اُبی بن سلول اسی بات کو بہانہ بنا کر تین سو اشخاص کو لے کر مدینہ واپس چلا جاتا ہے کہ چونکہ میری رائے پر عمل نہیں ہوا' مدینے کے اندر رہ کر چونکہ مقابلہ نہیں کیا جا رہا لہٰذا ہم ساتھ نہیں دیں گے۔ اور اب دامنِ اُحد میں محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہزار کی نفری میں سے سات سو افراد باقی رہ جاتے ہیں۔ اس جنگ کی تفصیل بیان کرنا یہاں ہمارے پیش نظر نہیں ہے' صرف بعض واقعات اور ان کے نتائج کی جانب مختصر اشارہ مقصود ہے۔ پہلے ہی ہلے میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگئی' کفار میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے' لیکن پھر نبی اکرم ﷺ کے ایک حکم کی خلاف ورزی جو بعض مسلمانوں سے صادر ہوئی' اس کا ایک فوری نتیجہ یہ سامنے آیا کہ فتح عارضی طور پر شکست میں تبدیل ہوگئی۔ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم کا شہید ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ان ستر میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب بھی شامل تھے اور حضرت مصعب بن عمیر بھی' رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ وہ مصعب کہ جن کی دعوت و تبلیغ اور قرآن مجید کی تعلیم و تدریس کے نتیجے میں اہل یثرب کی ایک بڑی تعداد ایمان لے آئی تھی اور مدینہ منورہ کو دارالہجرت بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ستر صحابہؓ نے میدانِ اُحد میں جامِ شہادت نوش کیا۔ خود آنحضور ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' آپؐ پر کچھ دیر کے لئے غشی طاری ہوئی۔ یہ بات اڑا دی گئی کہ آنحضور ﷺ شہید ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کی ہمتیں جواب دے گئیں یہاں تک کہ حضرت عمر ﷺ نے بھی تلوار پھینک دی۔ ان سارے حالات و واقعات کا ظاہر بات ہے کہ تفصیلاً بیان یہاں ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید نے غزوۂ اُحد کے حالات پر بڑا مفصل تبصرہ فرمایا ہے۔ ان میں سے بعض آیات کا مطالعہ ہم ان شاء اللہ ابھی کریں گے۔ اس جنگ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ غزوۂ بدر کے بعد قبائل عرب پر مسلمانوں کی جو دھاک بیٹھ گئی تھی وہ جاتی رہی۔ میدانِ بدر میں تین سو تیرہ کو جو فتح مبین حاصل ہوئی تھی اس کا وہ تاثر برقرار نہ رہا' اس لئے کہ غزوۂ اُحد کے بعد صورت یہ سامنے آئی کہ وہاں (بدر میں)

اگر ستّر کفار قتل ہوئے تھے تو یہاں (دامنِ اُحد میں) ستّر مسلمان شہید ہو گئے۔ اس طرح وہ دبدبہ اور رعب جو مسلمانوں کا قائم ہوا تھا' وہ اب جاتا رہا۔ قریش مکّہ آس پاس کے لوگوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ یہ فتح وشکست کا معاملہ تو اتفاق ہوتا ہے' کبھی کوئی ایک فریق غالب آ جاتا ہے اور کبھی فتح دوسرے کا مقدر بنتی ہے' اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ محمد ﷺ واقعتاً اللہ کے رسول ہیں اور ان کو اللہ کی خصوصی تائید حاصل ہے۔ تو غزوۂ اُحد کے بعد کے ایک دو سال مسلمانوں کے لئے بڑی ہی آزمائش کے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اطراف و جوانب میں سب لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں پر حملے ہو رہے ہیں' تاخت و تاراج ہو رہا ہے' ان پر چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ وقت بڑی سختی کا تھا اور اس سختی کا نقطۂ عروج ہے غزوۂ احزاب جو غزوۂ اُحد کے دو سال بعد پیش آیا۔

غزوۂ اُحد کا ذکر قرآن حکیم میں

غزوۂ اُحد پر نہایت مفصل تبصرہ سورۂ آل عمران کی آیات ۱۲۱ تا ۱۸۰ میں وارد ہوا ہے۔ ان میں سے صرف چند آیات کا رواں ترجمہ اس وقت کر لینا مناسب ہوگا تا کہ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو جو وقتی شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کے جو اثرات مسلمانوں پر مرتب ہو رہے تھے' ان کے حوالے سے یہ بات سامنے آ جائے کہ ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کو کیا رہنمائی عطا فرمائی گئی۔ یہ سورۂ آل عمران کی آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸ ہیں کہ جن کا ترجمہ میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

''اے مسلمانو! نہ بددل ہو اور نہ ہی غمگین' اگر تم ایمان پر ثابت قدم رہے تو بالآخر غالب تم ہی ہو گے' تم ہی سر بلند ہو گے''۔

اگلی آیت میں تسلی کے انداز میں فرمایا:

﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ﴾

''اگر تمہیں ایک زخم لگا ہے (تمہیں اگر کوئی چرکا لگا ہے) تو سوچو تمہارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی چرکا لگ چکا ہے''۔

گویا کہ بات یہ فرمائی جا رہی ہے کہ وہ اگر اس چرکے سے بددل نہ ہوئے اور اپنے معبودانِ باطل کے لئے ان کی سرفروشی کا عالم یہ ہے کہ تمہارے ہاتھوں ایک نہایت کاری زخم کھانے کے باوجود اگلے ہی

سال وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے پھر تم پر حملہ آور ہو گئے تو تم کیوں اپنا دل تھوڑا کر رہے ہو۔

ابتلاء و آزمائش کی حکمت

اس کے بعد آیت کے اگلے ٹکڑے میں واضح فرما دیا کہ حالات کی یہ تبدیلی اور فتح و شکست کا یہ الٹ پھیر بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾

''یہ تو وہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے مابین الٹتے پلٹتے رہتے ہیں''۔

یہ اونچ نیچ کا معاملہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ کے تحت کرتا ہے۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۭ﴾

''تا کہ اللہ تعالیٰ دیکھے کہ کون ہیں واقعتاً اہل ایمان اور تا کہ وہ تم میں سے بعض کو گواہ بنا لے۔ (کچھ کو مرتبہ شہادت عطا فرما دے)''۔

ابتلاء و آزمائش کی یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تمہیں پرکھا جائے گا۔ ان امتحانات کے ذریعے تمہارے ایمان کو جانچنا مقصود ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ العنکبوت کے درس میں ہمارے زیر مطالعہ آ چکا ہے' بلکہ سورۃ البقرۃ کی بعض آیات کے حوالے سے بھی سامنے آ چکا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ تم میں سے بعض جاں نثاروں کی جان کا نذرانہ قبول کر کے وہ تم میں سے کچھ کو گواہ بنا لینا چاہتا ہے' انہیں شہادت سے سرفراز فرمانا چاہتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جس کے بارے میں عرض کیا گیا تھا کہ پورے قرآن حکیم میں صرف یہ وہ آیت ہے کہ جہاں ''شہید'' کے معنی مقتول فی سبیل اللہ لینے کا امکان ہے۔ گویا مسلمانوں کے لئے خوشخبری ہے کہ اللہ ان میں سے بعض سرفروشوں کو کہ جو اپنی جان دے کر اللہ کی گواہی دیں' اس بلند مرتبے اور مقام پر فائز کرنا چاہتا ہے جس کا نام مرتبۂ شہادت ہے۔ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ''اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا''۔

کہیں شیطان تمہارے ذہن میں یہ خیال نہ ڈال دے کہ اللہ نے اگر کفار کو کچھ فتح دے دی ہے تو شاید وہ اب کفار سے محبت کرنے لگا ہے!

اگلی آیت میں اس حکمتِ ابتلاء کو مزید واضح فرمایا گیا: ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''تمحیص'' کا لفظ کسی چیز کو چھان پھٹک لینے کے مفہوم میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں اردو بول چال میں

بحث وتمحیص کی ترکیب عام استعمال ہوتی ہے۔ بحث کے معنی ہیں کریدنا اور تمحیص سے مراد ہے کہ جو کچھ کرید کر حاصل ہوا ہے اس کو چھان پھٹک کر اس میں سے جو چیز مطلوب ہے' اسے نکال لینا۔ تو ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اور تا کہ اللہ اہل ایمان کی چھانٹی کرے'' یعنی اللہ چاہتا ہے کہ اس طرح کے کٹھن امتحانات سے اہل ایمان کو گزار کر انہیں جانچ لے کہ ان میں سے کون واقعتاً اللہ' اس کے رسول ﷺ اور آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں اور کون ہیں کہ جو نام نہاد مؤمن ہیں اور محض روایتی طور پر اور دوسروں کی تقلید میں دائرۂ اسلام میں شامل ہو گئے ہیں' کہ چونکہ قبیلے کے سردار نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا لہٰذا وہ بھی اس کی پیروی میں ایمان لے آئے۔ ﴿وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ ''اور تا کہ اللہ کافروں کو مٹا دے''۔ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ وہ کافروں کو تو بالآخر مٹا کر چھوڑے گا' البتہ اس درمیانی عرصے میں یہ اونچ نیچ اس غرض سے ہوتی ہے کہ امتحان' ابتلاء اور آزمائش کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ اس کے بعد آتی ہے وہ آیت جس کا اس سے پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

''کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تو اللہ نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ کون ہیں تم میں سے واقعتاً جہاد کرنے والے (جو جہاد کا حق ادا کرنے والے ہیں) اور ابھی اس نے دیکھا ہی نہیں کہ کون ہیں تم میں سے جو واقعتاً صبر کرنے اور جھیلنے والے ہیں''۔

لفظ ''صابرین'' کو یہاں خاص طور پر نوٹ کیجئے۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں قرآن حکیم کے جو مقامات آج کل ہمارے زیر مطالعہ ہیں وہ ''تواصی بالصبر'' ہی کی تفاصیل پر مشتمل ہیں۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۨ﴾

''اور تم موت کی تمنا کیا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرتے''۔

یہاں اس جذبۂ شوقِ شہادت کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار بعض مسلمانوں کی طرف سے اس مشاورت کے دوران ہوا تھا جو آنحضور ﷺ نے غزوۂ اُحد سے قبل منعقد فرمائی تھی۔ آرزو کرنا اس وقت تک بہت آسان ہوتا ہے کہ جب تک موت سامنے نہ آ کھڑی ہو۔ لیکن جب موت سے آنکھیں چار ہوتی ہیں تو معاملہ بڑا مختلف ہوتا ہے۔

﴿فَقَدۡ رَاَیۡتُمُوۡہُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ﴾
''تو اب تم نے اس موت کو دیکھ لیا ہے اور اس سے آنکھیں چار کر لی ہیں''۔

مسلمانوں کے لئے تنبیہہ

اگلی آیت میں قدرے تنبیہہ کا انداز ہے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ﴾ اور اے مسلمانو! یہ تمہیں کیا ہوا تھا کہ آنحضور ﷺ کی شہادت کی خبر سن کر تمہاری ہمتیں جواب دے گئیں! تمہارا تعلق محمد (ﷺ) سے ہے یا اللہ سے ہے؟...... تمہیں سوچنا چاہئے کہ تمہارا تعلق تو اللہ کے ساتھ ہے جو سب کا خالق و مالک ہے۔ ''محمد ﷺ تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک رسول ہیں''۔ ﴿قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ؕ﴾ ''ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں۔ تو کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے''۔ ﴿وَمَنۡ یَّنۡقَلِبۡ عَلٰی عَقِبَیۡہِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیۡئًا ؕ﴾ ''اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ گیا تو وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا''۔ ﴿وَسَیَجۡزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ اپنے شکر گزار بندوں کو (حق ماننے والوں کو) عنقریب جزا عطا فرمانے والا ہے''۔

یاد رہے کہ یہی وہ آیت ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تلاوت فرمائی تھی حضور ﷺ کے انتقال کے وقت، جبکہ نبی اکرم ﷺ سے جدائی کا صدمہ مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس صورتِ حال سے اس درجے متاثر تھے کہ ننگی تلوار لے کر بیٹھ گئے کہ جس نے کہا کہ محمد ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اب ظاہر بات ہے کہ جلال فاروقی رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی کو دم مارنے کا یارا نہ تھا۔ ہاں، یہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی تھے کہ جنہوں نے اس صورتِ حال کو سنبھالا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے، سیدھے حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا میں گئے، بیٹی کا گھر تھا، جاتے ہی آنحضور ﷺ کی پیشانی سے چادر ہٹائی، بوسہ دیا، واپس آئے اور پھر خطبہ دیا:

> مَنۡ کَانَ یَعۡبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدۡ مَاتَ ، وَمَنۡ کَانَ یَعۡبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَّا یَمُوۡتُ
> ''لوگو! جو کوئی بھی محمد کی پرستش کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد کا انتقال ہو گیا (ﷺ) اور جو کوئی اللہ کا پرستار ہے، اللہ کی پرستش کرنے والا ہے، اسے مطمئن رہنا چاہئے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے جس پر کبھی موت وارد ہونے والی نہیں''۔

یہ اصولی بات ارشاد فرمانے کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴾

اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی گردن جھکتی چلی گئی اور آپؓ نے تلوار کو نیام میں ڈال لیا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے۔

اب اگلی آیت کے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجئے: ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ کسی ذی نفس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے اذن کے بغیر اس کی موت واقع ہو جائے۔ ﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ﴾ وہ تو ایک معین وقت ہے جو لکھ دیا گیا ہے۔ ﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ﴾ تو اس مہلت عمر میں کہ جو انسان کو ملی ہے، جو کوئی دنیا کا بدلہ چاہتا ہے، جس کی سعی و جہد محض اس دنیا کے لئے ہے، اسے ہم اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں، مال و اسبابِ دُنیوی میں سے کچھ اسے عطا کر دیتے ہیں۔ ﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ﴾ اور جو کوئی آخرت کا طالب ہے، جس کے پیش نظر اپنی جدوجہد کا وہ نتیجہ ہے کہ جو آخرت میں نکلنے والا ہے تو ہم اسے اس میں سے عطا فرمائیں گے، اس کے لئے آخرت کا اجر محفوظ ہوگا۔ ﴿وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴾ اور ہم بہت جلد شکر کرنے والوں کو بدلہ عطا کریں گے۔

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ﴾ اور کتنے ہی ایسے نبی گزرے ہیں کہ بہت سے اللہ والوں نے ان کے ساتھ ہو کر جنگ کی ﴿فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ﴾ تو اللہ کی راہ میں جو تکلیفیں بھی اُن پر آئیں اس پر وہ بددل نہیں ہوئے، سست نہیں پڑے، انہوں نے تکالیف کے مقابلے میں کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی وہ باطل کے آگے سرنگوں ہوئے۔ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ اور اللہ تعالیٰ تو ایسے ہی صبر کرنے والوں اور ثابت قدم رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اس کی محبوبیت کا مقام تو انہی کو حاصل ہوتا ہے جو ہر چہ بادا باد کی کیفیت سے اللہ کی راہ میں ڈٹ جانے والے ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ اور ان کی بات تو بس یہی تھی، ان کی عرض داشت تو بس اتنی تھی کہ وہ یہ التجا کرتے رہے کہ اے ہمارے ربّ! ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ ﴿وَاِسْرَافَنَا فِىْٓ اَمْرِنَا﴾ اور ہم سے اپنے معاملات میں جو بھی زیادتی ہوئی ہے اس کو بخش دے ﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ اور ہمارے قدموں کو جما دے ﴿وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾

اور ہمیں کافروں پر فتح عطا فرما۔﴿فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کا بدلہ بھی عطا فرمایا اور آخرت کا بھی بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ بدلہ دیا۔﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ اور اللہ ایسے ہی احسان کرنے والوں سے‘ حسنِ عمل کا مظاہرہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

غزوۂ اُحد کے حالات پر جو طویل تبصرہ قرآن حکیم میں وارد ہوا ہے ان میں سے چند آیات کا ہم نے سطورِ بالا میں مطالعہ کیا ہے جس سے اس بات کی طرف واضح رہنمائی ملتی ہے کہ اہل ایمان کو ابتلاؤں اور آزمائشوں سے دوچار کرنے کی اصل حکمت کیا ہے۔ اور وہ حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کی چھانٹی ہو جائے‘ سچے مسلمانوں اور نام نہاد مسلمانوں کے درمیان تمیز ہو جائے‘ پھر یہ کہ یہ آزمائشیں اہل ایمان کی مزید تربیت کا ذریعہ بھی بنتی ہیں کہ آزمائش کی ان بھٹیوں سے گزر وتو کندن بن کر نکلو۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ حالات کو ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ وہ چاہتا تو تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچتی‘ کوئی تمہیں گزند نہ پہنچا سکتا‘ لیکن پھر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوتا کہ تمہاری صفوں میں ابھی کہاں کہاں کمزوری موجود ہے۔ تمہاری جمعیت کے اندر کون کون سے گوشے ایسے ہیں کہ جہاں ابھی مزید استحکام کی ضرورت ہے۔ آئندہ کے کٹھن تر مراحل سے نبرد آزما ہونے کے لئے تمہارا اپنی تمام کمزوریوں پر متنبہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ تبھی تمہارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ اپنی صفوں کو از سر نو ترتیب دے کر انہیں تطہیر کے عمل سے گزار سکو اور اس طرح اپنی ہمت کو مجتمع کر کے آئندہ آنے والے مراحل کے لئے مناسب تیاری کر سکو!

غزوۂ احزاب کا پس منظر

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے‘ غزوۂ اُحد کے بعد صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی۔ اُحد کے میدان میں مسلمانوں کو جو دھچکا لگا تھا اس سے طبعی طور پر مسلمانوں کی ہمتیں کچھ پست ہوئیں اور دشمنوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ اگر کچھ مزید تیاری کے ساتھ ایک مجتمع کوشش کی جائے اور مل جل کر زور لگایا جائے تو اس پودے کو اکھاڑا جا سکتا ہے‘ مسلمانوں کو فیصلہ کن شکست دے کر یہ جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ غزوۂ اُحد کے دو سال بعد ۵ھ میں اسلام کے چراغ کو گل کرنے کی خاطر عرب کی پوری مشرکانہ قوت مجتمع ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئی۔ اس واقعے کو ہم غزوۂ احزاب کے نام سے جانتے ہیں۔ اسے غزوۂ احزاب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جو لوگ حملہ

آور ہوئے تھے وہ کسی ایک قبیلے یا کسی ایک گروپ سے متعلق نہیں تھے بلکہ بے شمار قبائل' جن میں عربوں کے علاوہ یہود کے قبائل بھی شامل تھے' متحد ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ وہ مشرق سے بھی آئے اور مغرب سے بھی آئے' ان علاقوں سے بھی آئے جو بلندی پر واقع ہیں اور اس جانب سے بھی آئے جو مدینہ کے مقابلے میں نشیب میں واقع ہے' کم و بیش بارہ ہزار کا لشکر جرار مسلمانوں کے خلاف مجتمع ہوا۔ ان حملہ آوروں میں بنوقینقاع بھی شامل تھے جو غزوۂ بدر کے بعد اپنی عہد شکنی کے باعث جلا وطن کئے گئے تھے' اور بنونضیر بھی تھے کہ جنہیں ۴ھ میں مدینہ سے نکال باہر کیا گیا تھا اور وہ خیبر میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ مدینہ کے مشرق میں نجد کی طرف سے بنوغطفان چڑھائی کرتے ہوئے آئے جبکہ نیچے کی طرف سے یعنی مَکّہ سے قریش کی فوجیں حملہ آور ہوئیں۔ گویا آس پاس کے تمام مشرک قبائل مجتمع ہو گئے۔ مدینے کی چھوٹی سی بستی پر جس میں چند سو گھر آباد ہوں گے' اتنا بڑا حملہ ایک نہایت غیر معمولی بات تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کہیں چٹیل میدان میں کوئی چراغ جل رہا ہو اور اس کو بجھانے کے لئے ہر طرف سے جھکڑ چل رہے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران مسلمانوں کی اجتماعی ابتلاء وآزمائش کے اعتبار سے یہ کٹھن ترین مرحلہ تھا۔ اس موقع پر اہل ایمان کا ایمان پوری طرح آزما لیا گیا' اور جن کے دلوں میں نفاق کا مرض تھا ان کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی' جس کے نتیجے میں ان کا نفاق پورے طور پر ظاہر ہو گیا' وہ نفاق جو دلوں میں پوشیدہ تھا منافقین کی زبانوں پر جاری ہو گیا۔ بعد میں یہ غزوہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اس انقلابی جدوجہد میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔

غزوۂ احزاب کا ذکر قرآن حکیم میں

قرآن حکیم میں اس غزوے کا ذکر سورۃ الاحزاب کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں ہے۔ وہاں اس صورت حال کی مکمل نقشہ کشی کر دی گئی ہے کہ یہ موقع مسلمانوں کے لئے ابتلاء اور آزمائش کا نقطۂ عروج تھا۔ جس طرح ذاتی سطح پر طائف کے دن محمد رسول اللہ ﷺ پر مصائب اور تکالیف کا معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا' بعینہٖ اسی طرح کا معاملہ بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے لئے غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اس غزوہ کا ذکر جن آیات میں آیا ہے ان میں سے چند آیات کا یہاں ترجمہ کر لینا مفید ہوگا تاکہ اس صورت حال کی صحیح تصویر خود آیاتِ قرآنی کے ذریعے سے ہمارے

سامنے آ جائے جس سے اہل ایمان دوچار تھے۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡکُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ جَآءَتۡکُمۡ جُنُوۡدٌ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ رِیۡحًا وَّجُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا ؕ وَکَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرًا ۙ﴾

اس پہلی آیت میں قرآن مجید نے اپنے مخصوص اسلوب کے مطابق اس پورے غزوے کے دوران جو حالات وواقعات پیش آئے اور اس کا جو نتیجہ نکلا ان سب کی طرف نہایت جامعیت کے ساتھ اشارہ کر دیا ہے:

''اے اہل ایمان! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب تم پر لشکر حملہ آور ہوئے تھے تو ہم نے ان پر آندھی بھیج دی اور ایسے لشکر بھیجے کہ جنہیں تم نہیں دیکھتے تھے' اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے اسے دیکھ رہا تھا''۔

ابتلاء وآزمائش کا نقطۂ عروج

اگلی آیت سے صورتِ حال کی نقشہ کشی شروع ہوتی ہے: ﴿اِذۡ جَآءُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ وَمِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡکُمۡ﴾ ذرا یاد تو کرو جب وہ لشکر تم پر حملہ آور ہوئے نیچے سے بھی اور اوپر سے بھی۔ مدینہ منورہ کے داہنی جانب کا علاقہ اونچا ہے اور بائیں جانب سے نیچائی ہے۔ بائیں طرف سے یعنی مغرب کی جانب سے جو لشکر آئے ان کے بارے میں فرمایا: ﴿مِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡکُمۡ﴾ اور جو دائیں جانب سے آئے ان کے لئے یہاں ﴿مِنۡ فَوۡقِکُمۡ﴾ کے الفاظ آئے۔ آیت کے اگلے ٹکڑے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزمائش کس درجے شدید تھی: ﴿وَاِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ﴾ اور جبکہ نگاہیں کج ہوگئی تھیں۔ ہم اپنے محاورے میں یوں کہیں گے کہ جب آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ﴿وَبَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ﴾ اور دل ہنسلیوں میں آ کر پھنس گئے تھے۔ گویا خوف ودہشت سے کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔ ﴿وَتَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوۡنَا ۟﴾ اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کر رہے تھے۔ طرح طرح کے وسوسے تمہارے دلوں میں پیدا ہو رہے تھے۔ وہ نصرت کے وعدے کیا ہوئے؟ اللہ کی مدد کا وہ تاکیدی وعدہ کہاں گیا جو بار بار قرآن میں آیا ہے؟ وہ یقین دہانیاں جو ہمیں کرائی گئی تھیں کہ تمہیں غلبہ حاصل ہوگا' عرب اور عجم کے خزانے تمہارے قدموں میں آئیں گے' کیا وہ محض ہمیں دھوکہ دینے کے لئے تھیں؟ ﴿هُنَالِکَ ابۡتُلِیَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَزُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِیۡدًا ۟﴾ یہ وقت وہ تھا جبکہ اہل ایمان کی صحیح معنوں میں آزمائش ہوگئی اور انہیں ہلایا گیا بڑی شدت کا ہلایا جانا۔ حالات انتہائی نامساعد تھے۔ قحط کا وہ عالم کہ کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ فصلیں تیار تھیں لیکن انہیں اجاڑ دیا گیا' ساری فصل دشمنوں نے تباہ کر

دی۔ بھوک کی شدت کے باعث پیٹ پر پتھر باندھ لئے گئے کہ فاقے کی وجہ سے کہیں کمر دوہری نہ ہو جائے۔ اس عالم میں خندق کھودی جا رہی ہے' پھاوڑے چل رہے ہیں۔ اُس وقت محمد ﷺ کے ساتھیوں کی زبان پر یہ ترانہ رواں ہے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا

عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

''کہ ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمد (ﷺ) کے ہاتھ پر بیعت کی ہے' اس بات کی بیعت کہ جہاد کرتے رہیں گے جب تک کہ جان میں جان ہے''۔

بہرحال' صورت حال اتنی خوفناک تھی اور ایسی تباہی نگاہوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی کہ بظاہر احوال خاتمہ یقینی نظر آتا تھا۔ بلاشبہ یہ سخت ترین آزمائش کی گھڑی تھی جس سے اہل ایمان دوچار تھے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

❁❁❁
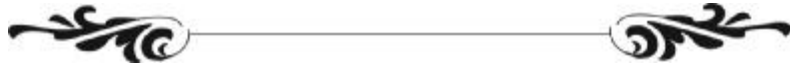
درس 24

فتح و نصرت کا نقطۂ آغاز
صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان

سُوْرَةُ الفَتْح کے آخری رکوع کی روشنی میں!

درس ۲٤

فتح ونصرت کا نقطۂ آغاز

صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾

سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی روشنی میں

نحمدهٗ ونصلّي علٰى رَسولهِ الكريم ...... امَّا بَعد:

فَاَعُوذ بِاللّٰه مِنَ الشَّيطٰن الرَّجيم ۔ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾ ...... صدق اللّٰه العظیم

یہ سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی آیات ہیں۔ سورۃ الفتح کے بارے میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ وہ تقریباً کُل کی کُل صلح حدیبیہ کے گرد گھومتی ہے۔ سیرتِ مطہرہ میں یہ ایک اتنا اہم واقعہ تھا کہ اس پر ایک پوری سورۂ مبارکہ نازل ہوئی جس کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو ایک کھلی فتح عطا فرمائی۔''

عام طور پر سطح بین لوگوں کے لئے فتح مَکّہ کا واقعہ زیادہ اہم ہے' لیکن قرآن مجید پر اگر غور کیا جائے' حالات کے اصل رُخ کو سمجھا جائے اور حالات کی رفتار کی نبض پر اگر ہاتھ ہو تو واقعتاً یہ بات سامنے آتی ہے کہ فتح عظیم اور فتح مبین دراصل صلح حدیبیہ ہی تھی کہ جس کے بعد حالات اس تیزی سے مسلمانوں کے حق میں تبدیل ہوئے کہ یہ صلح درحقیقت فتح مَکّہ کی تمہید ثابت ہوئی' جس کے نتیجے میں سرزمین عرب پر اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

غزوۂ احزاب ۵ ھ میں واقع ہوا۔ یہ درحقیقت مشرکین عرب کی جانب سے نبی اکرم ﷺ کا راستہ روکنے کی ایک متحدہ کوشش تھی۔ اس کے لئے اتنی بھرپور تیاری ہوئی تھی' اتنا اہتمام ہوا تھا' اتنے مختلف گروہ اور اتنی مختلف قومیں اس میں جمع ہوئی تھیں کہ اس کا دوبارہ پھر اسی اہتمام کے ساتھ اعادہ تقریباً ناممکن تھا۔ نبی اکرم ﷺ کا دست مبارک حالات کی نبض پر تھا۔ آپؐ نے صورتِ حال کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے تائیدِ غیبی اور معجزانہ امداد کے ذریعے اس غزوہ میں فتح عطا فرمادی اور دشمنوں کے لشکروں کو بے نیل ومرام واپس لوٹنا پڑا تو حضور ﷺ نے یہ خبر دے دی کہ: ((لَنْ يَّغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا)) اے مسلمانو! اب قریش دوبارہ تم پر حملہ آور نہیں ہوں گے۔ گویا آپؐ نے مسلمانوں کو صاف الفاظ میں فرمادیا کہ کفار کی قوّت اب ٹوٹ چکی ہے' ان کی ہمت جواب دے چکی ہے' یہ آخری بار تھی کہ انہوں نے اپنی ہمت کو مجتمع کر کے اتنا بھرپور حملہ کیا تھا۔ ساتھ ہی آپؐ نے یہ نوید بھی سنائی: ((وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) کہ اب صورتِ حال تبدیل ہو چکی ہے (Tables have been turned) اب تم اقدام کرو گے' آئندہ آغاز تمہاری جانب سے ہو گا۔ اس سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ حالات کی رفتار پر نبی اکرم ﷺ کی پوری نگاہ تھی' پوری صورتِ حال آپؐ کے سامنے عیاں تھی۔ چنانچہ اگلے ہی سال نبی اکرم ﷺ نے عمرے کے ارادے سے مَکّہ کا سفر اختیار فرمایا۔

مسلمانوں کا سفرِ عمرہ۔ مشرکین مَکّہ کی طرف سے مزاحمت

چشمِ تصور سے دیکھئے' مسلمان احرام باندھے ہوئے ہیں' ہتھیار اگرچہ ساتھ لئے ہیں لیکن نمایاں نہیں ہیں' تلواریں نیاموں کے اندر ہیں' ہدی کے جانور ساتھ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محوِ سفر ہیں' مَکّہ کی طرف منزل بہ منزل سفر طے ہو رہا ہے۔ ادھر مَکّہ میں خبر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ مسلمانوں کو عمرے کے لئے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ یہ چودہ سو مسلمان کس ارادے سے آ رہے ہیں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اہل مَکّہ کے لئے ایک عجیب اور پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو گئی۔

مسلمانوں کو مکّہ میں داخلے کی اگر اجازت دیتے ہیں تو یہ گویا شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ انہیں اگر روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو اپنی حالت بھی نگاہوں کے سامنے ہے کہ اب اتنے طاقتور نہیں رہے کہ محمدﷺ اور ان کے ساتھیوں کو روک سکیں۔ لیکن بہر حال جو بھی قوت تھی اسی پر انحصار کرتے ہوئے اپنی ہمت کو مجتمع کر کے انہوں نے یہ طے کیا کہ جس طرح بھی ہو اِس وقت تو ہم محمد (ﷺ) کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

حضورﷺ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ سلسلۂ جنبانی کا آغاز ہوتا ہے۔ سفارتیں آنی شروع ہوئیں' ادھر مکّہ سے کچھ لوگ آئے' انہوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو مرعوب کریں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود مرعوب ہو کر واپس لوٹے۔ سہیل بن عمرؤ قریش مکّہ کا ایک بہت بڑا خطیب جا کر لوگوں کو خبر دیتا ہے کہ لوگو! میں نے بڑے بڑے شہنشاہوں کے دربار دیکھے ہیں' لیکن جس طرح محمد (ﷺ) پر ایمان لانے والے اُن پر پروانہ وار نچھاور ہونے کو تیار ہیں وہ عزت واحترام اور وہ محبت میں نے کبھی کسی انسان کی انسانوں کے دلوں میں نہیں دیکھی۔ لیکن بہر حال کفارِ مکّہ اس طرح فوری طور پر اپنی آن سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ مسلمانوں کے کیمپ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر کی حیثیت سے بھیجا جاتا ہے۔ ان کی واپسی میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ خبر اڑتی ہے کہ شاید وہ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ اس پر حضورﷺ بیعت لیتے ہیں' جسے سیرت کی کتابوں میں بیعتِ رضوان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چودہ سو صحابہ نبی اکرمﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کا عزم کرتے ہیں۔ اس واقعے کا ذکر اسی سورۂ مبارکہ میں موجود ہے:

﴿ لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ یُبَایِعُوۡنَکَ تَحۡتَ الشَّجَرَۃِ ﴾ (آیت ۱۸)

''اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان اہلِ ایمان سے جنہوں نے (اے نبیﷺ!) آپ کے ہاتھ پر بیعت کی درخت کے نیچے۔''

اور:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ﴾ (آیت ۱۰)

''(اے نبیﷺ!) جن لوگوں نے آپ سے بیعت کی ہے انہوں نے درحقیقت اللہ سے بیعت کی ہے' ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے''۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر بے بنیاد تھی۔

صلح کی یک طرفہ شرائط۔مسلمانوں کی ہیجانی کیفیت

بہر حال اس دو طرفہ گفت وشنید کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک مصالحت ہو جاتی ہے۔ وہ مصالحت کہ جو بظاہر نبی اکرمﷺ کی طرف سے کسی قدر دب کر ہو رہی ہے' بظاہر کفر کو اس میں ایک غالب حیثیت حاصل ہے۔ طے ہو رہا ہے کہ آپ اس سال عمرہ نہیں کریں گے' اسی طرح واپس چلے جائیں گے' ہاں اگلے سال عمرہ ادا کرنے کے لئے آ سکتے ہیں۔ آئندہ دس سال کے لئے جنگ بندی کا معاہدہ (No War Pact) ہو رہا ہے۔ اس میں کفار کی طرف سے یہ شرط بھی رکھی جاتی ہے کہ اگر کوئی مسلمان مکّے سے بھاگ کر مدینے پہنچا تو آپ کو واپس کرنا ہوگا اور اگر مدینے سے کوئی مسلمان مرتد ہو کر مکّے میں آ جاتا ہے تو ہم اس کو واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ آنحضورﷺ اس شرط کو بھی تسلیم فرما لیتے ہیں۔ یہ ساری شرطیں مُنہ سے بول رہی ہیں کہ نبی اکرمﷺ کی طرف سے کچھ دب کر صلح کی جا رہی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اضطراب و بے چینی ہے۔ وہ بے چینی خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ پریشان ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے' کیوں ہو رہا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اگر حق پر ہیں تو پھر ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟ یہی سوال وہ کسی قدر نامناسب لہجے میں خود نبی اکرمﷺ سے بھی کرتے ہیں جس میں شدتِ جذبات کا رنگ غالب تھا' جس پر کہ پھر ساری عمر وہ کفِ تأسف ملتے رہے اور افسوس کرتے رہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ انداز درحقیقت حمیّت وغیرتِ ایمانی کا مظہر تھا۔

وہی حمیّت وغیرتِ ایمانی ایک اور انداز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی اُس موقع پر ظاہر ہوئی جب معاہدہ لکھا جا رہا تھا۔ حضورﷺ املاء (dictate) کروا رہے ہیں اور حضرت علیؓ لکھ رہے ہیں: ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' قریش کا نمائندہ اعتراض کرتا ہے کہ نہیں' جو پرانا انداز تھا اسی کو اختیار کیا جائے۔ ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کی بجائے ''بِاسْمِكَ اللّٰھُمَّ'' کے الفاظ لکھے جائیں جو ہماری پرانی روایت کے مطابق ہیں۔ حضورﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ آگے لکھا جاتا ہے: ''یہ ہے وہ معاہدہ جو محمد رسول اللہ اور قریش کے مابین ہوا''۔ اس پر نکتۂ اعتراض بلند کیا جاتا ہے کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے' اگر رسول مان لیں تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے' لہٰذا یوں لکھا جائے کہ: ''یہ محمد بن عبداللہ اور قریش کے مابین معاہدہ ہے''۔ حضورﷺ مسکراتے ہوئے حضرت علیؓ سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو۔ حضرت علیؓ عرض کرتے ہیں کہ حضور! میرے اندر اس کی تاب نہیں

ہے۔ گویا کہ یہاں بظاہر حکم عدولی ہورہی ہے لیکن یہ بھی درحقیقت غیرت وحمیت ایمانی کا اظہار تھا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے دکھاؤ وہ الفاظ کہاں ہیں! اور پھر اپنے دست مبارک سے ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹادیتے ہیں۔

اس پورے پس منظر میں جو بات دراصل سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ بظاہر دب کر جو صلح کی جارہی تھی وہ کچھ ہی عرصے کے بعد ایک کتنی بڑی فتح مسلمانوں کے حق میں ثابت ہوئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کا رُخ کس درجے محمد رسول اللہ ﷺ پر روشن تھا۔ اس صلح کو بلاشبہ آپؐ کے تدبر کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔

تمام مسلمانوں کی ذہنی وجذباتی کیفیت اُس وقت کم وبیش وہی تھی جس کی کسی قدر عکاسی حضرت عمر اور حضرت علی (رضی اللہ عنہما) کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ کفارِ مکّہ کی ہر شرط حضور ﷺ قبول کئے جارہے ہیں، ان پر شدید اضطرابی کیفیت طاری تھی۔

اس سلسلے کا یہ واقعہ بھی بڑا عجیب ہے کہ جب صلح کی بات مکمل ہوگئی تو حضور ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ اب احرام کھول دو اور قربانی یہیں دے دو، لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ آپؐ نے دوبارہ یہی بات ارشاد فرمائی، لیکن اب بھی کوئی نہیں اٹھ رہا۔ یہاں تک کہ تیسری مرتبہ فرمانے پر بھی کسی کو جنبش نہیں ہوئی۔ اس پر حضور ﷺ کچھ ملول ہوکر اپنے خیمے میں تشریف لے جاتے ہیں اور اپنی زوجہ محترمہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی قدر شکوے کے انداز میں کہتے ہیں کہ میں نے تین مرتبہ مسلمانوں سے احرام کھولنے کو کہا لیکن کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھا۔ حضرت اُمّ سلمہؓ مسلمانوں کی جذباتی حالت کے پیشِ نظر مشورہ دیتی ہیں کہ حضور! آپ کسی سے کچھ نہ کہئے، بس اتنا کیجئے کہ خود اپنا احرام کھول دیجئے اور قربانی دے دیجئے، آپ سے آپ معاملہ ٹھیک ہوجائے گا۔ اور بعینہٖ یہی ہوا۔ جیسے ہی حضور ﷺ نے اپنا احرام کھولا اور قربانی دی، یوں محسوس ہوا گویا کہ بند کھل گئے اور سب صحابہؓ نے آپؐ کی پیروی کی۔

صلح کے اثرات۔ مسلمانوں کے حق میں

یہ صلح اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کو دو سال کا عرصہ ایسا ملا جس میں آپؐ نے کئی محاذوں پر اپنے کام کو وسعت دی۔ جنگ وجدال کا خاتمہ ہوگیا۔ قریش کے ہاتھ گویا کہ بندھ گئے اور محمد ﷺ کے ہاتھ کھل گئے۔ دعوت وتبلیغ کا عمل پوری شدت کے ساتھ جاری ہوگیا۔ وہ

اصحابِ صفہ جن کی تربیت مسجد نبویؐ میں ہو رہی تھی اب ان کے وفود تشکیل دیئے جا رہے ہیں' جزیرہ نمائے عرب کے طول وعرض میں تبلیغی سرگرمی اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہے۔ یہی وہ دَور ہے کہ جس میں نبی اکرم ﷺ نے یہود کی قوّت پر آخری اور بھرپور وار کیا۔ اُس وقت تک یہود کے تینوں قبیلے مدینہ منورہ سے نکل چکے تھے۔ بنوقینقاع کو غزوۂ بدر کے فوراً بعد ۲ھ میں اور بنونضیر کو ۴ھ میں دیس نکالا دیا گیا تھا' جبکہ بنوقریظہ کو ان کی عہد شکنی کی پاداش میں سخت ترین سزا دی گئی تھی۔ ان کے جنگ کے قابل تمام مَرد قتل کئے گئے تھے اور ان کا مال واسباب مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں لے لیا تھا۔ بہرحال یہود کی ساری بچی کھچی قوّت اب خیبر میں مجتمع ہو چکی تھی اور یہ اب یہود کے جلاوطن قبائل کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ۷ھ میں اس پر حملہ کیا اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز

اسی دو سال کے عرصے میں نبی اکرم ﷺ نے پہلی بار اپنی دعوت کو آس پاس کے علاقوں میں وسعت دینے کے لئے قدم اٹھایا۔ یہ معاملہ سیرت میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل سورۃ الجمعۃ کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت صرف عرب کے لئے نہ تھی بلکہ آپؐ پوری نوعِ انسانی کی جانب رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ لیکن دیکھئے کہ دعوت میں جو تدریج نبی اکرم ﷺ نے ملحوظ رکھی وہ کس قدر منطقی اور معقول ہے۔ تیرہ برس تک نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت وتبلیغ کو صرف مکّے تک محدود رکھا۔ صرف ایک سفر کا ذکر ملتا ہے' یعنی طائف کا سفر۔ اور انہی دنوں میں ایک اور سفر بھی آپؐ نے کیا اور وہاں سے بھی آپؐ کو بظاہر ناکام ہی لوٹنا پڑا۔ تیرہ برس کے عرصے میں اہل مکّہ نے جب اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ اس دعوت کے لئے اب یہاں مزید کوئی امکانات نہیں ہیں تب آپؐ مدینہ تشریف لائے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی مسلسل سات برس تک آپؐ نے اپنی تمام مساعی کو اندرونِ ملک عرب مرکوز رکھا۔ حالانکہ آپؐ عرب اور عجم دونوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے' آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے تھی۔ چنانچہ نظری طور پر اس کا امکان تھا کہ جب آپؐ نے مکّے میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اسی وقت آپؐ قیصر روم کو' کسریٰ فارس کو' مقوقس شاہِ مصر کو اور نجاشی شاہِ حبشہ کو بھی خطوط لکھ دیتے اور ان کی طرف ایلچی روانہ کر دیتے۔ لیکن نہیں' یہ بات ایک تدریج ہی کے ساتھ ہو سکتی تھی اور اس تدریج ہی میں معنویت پنہاں تھی۔ چنانچہ ۷ھ میں جب کہ اندرونِ ملک عرب نبی اکرم ﷺ کی قوّت کو تسلیم کیا جا چکا تب آپ نے بیرونِ ملک عرب اپنے خطوط اور ایلچی بھیج

کر اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز فرمایا۔ صلح حدیبیہ درحقیقت اس بات کی علامت (symbol) تھی کہ قریش نے نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا کہ اب آپؐ بھی ملک عرب کی ایک اہم طاقت ہیں۔ جب اس حد تک جزیرہ نمائے عرب کے اندر ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی تب آپؐ نے اپنی دعوت و تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا۔ یہی زمانہ ہے جب کہ آپؐ نے دعوتی خطوط بھیجے۔ یہی وہ وقت ہے جب آپؐ کے ایلچی آپ کے نامہ ہائے مبارک لے کر ہرقل روم کے دربار میں بھی گئے اور شاہِ ایران اور مقوقس مصر کے دربار میں بھی پہنچے۔ اسی طرح اطراف و جوانب کے جتنے بھی حکمران تھے اُن کی طرف آپؐ نے دعوتی خطوط بھیجے۔ یوں سمجھئے کہ صلح حدیبیہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کے دو رُخ ہو گئے۔ ایک جانب ابھی اندرونِ ملک یعنی جزیرہ نمائے عرب کے اندر اس انقلاب کی تکمیل کے لئے جدوجہد جاری ہے تو دوسری جانب بیرونِ عرب بین الاقوامی سطح پر پیغامِ محمدی، دعوت و تبلیغ اسلام کا آغاز ہو رہا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ان آخری سالوں کے دوران آپؐ کی جدوجہد کے ان دونوں رُخوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، آیئے کہ پہلے ایک نگاہ ان آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ڈال لیں جن سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا، یعنی سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی آیات۔

آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ایک نظر

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَـہُ الرُّءْ یَا بِالْحَقِّ﴾ ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔'' حضورؐ نے عمرے کی غرض سے جس سفر کا ارادہ فرمایا تھا اس سے پہلے آپؐ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ آپؐ عمرہ ادا فرما رہے ہیں۔ نبی کا خواب ایک نوع کی وحی ہوتا ہے، چنانچہ آپؐ نے اسی کی بنیاد پر سفر اختیار فرمایا۔ جب صلح حدیبیہ کے بعد یہ طے ہو گیا کہ عمرہ اس سال نہ ہو سکے گا تو بعض حضرات نے یہ خیال کیا کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ خواب جھوٹا ہو گیا! نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ !! حضور ﷺ نے یہ وضاحت فرما کر اُن کے اس مغالطے کو دُور کیا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ خواب اسی سال ضرور پورا ہو گا، ہم عمرہ ان شاء اللہ ضرور کریں گے، یہ خواب غلط نہیں ہے۔ کم از کم اس سفر کا یہ فائدہ تو ہوا کہ مشرکین مَکّہ نے مسلمانوں کی حیثیت کو تسلیم کر لیا اور آئندہ سال کے لئے طے ہو گیا کہ مسلمان عمرہ ادا کریں گے اور مشرکین ان کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اگلے سال کے ذوالقعدہ ۷ ھ میں وہ عمرہ ہوا جسے عمرۂ قضاء کہتے ہیں۔ تو یہاں دراصل اسی بات کی طرف اشارہ کیا

جا رہا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔

﴿لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَ لَا تَخَافُوۡنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ فَتۡحًا قَرِيۡبًا﴾

''تم یقیناً داخل ہو گے مسجدِ حرام میں' ان شاء اللہ پورے امن کی حالت میں' اپنے سروں کو مونڈتے ہوئے بھی اور بال ترشوائے ہوئے بھی' اس حالت میں کہ تمہیں کسی کا خوف نہ ہوگا۔ تو اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم نہیں جانتے' پس اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایک قریبی فتح کا سامان کر دیا۔''

یعنی یہ کہ یہ صلح اب تمہارے لئے کامیابیوں کے نئے نئے دروازے کھولنے کا باعث بنے گی۔ تم بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ صلح کے جس معاہدے کو قریش مکّہ اپنی فتح سمجھ رہے تھے وہ ان کی شکست تھی۔ چنانچہ وہ عمومی تاثر کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے دب کر صلح کی ہے' غلط ثابت ہوا اور یہ صلح مسلمانوں کے حق میں ایک فتحِ عظیم ثابت ہوئی۔

اس کے بعد یہاں سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں بھی وہی آیۂ مبارکہ وارد ہوئی ہے جو آنحضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے بیان کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین آیت ہے۔ (واضح رہے کہ یہ آیت اس سے قبل سورۃ الصّف کے درس کے ضمن میں ہمارے مطالعے سے گزر چکی ہے) اس آیت کو اگر پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ؕ﴾: ''وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول (محمد ﷺ) کو مبعوث فرمایا الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق دے کر' تاکہ غالب کر دے اسے پورے کے پورے دین (یعنی نظامِ زندگی) پر'' ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا﴾ ''اور کافی ہے اللہ گواہی دینے والا۔'' اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ہو کر رہے گا' اور یہ دعوت درحقیقت اپنی اس منزل سے قریب ہوا چاہتی ہے' کامیابی اس کے قدم چوما چاہتی ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ﴾ ''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔'' ﴿وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو اُن کے ساتھ ہیں۔'' یعنی آپؐ پر ایمان لانے والے آپؐ کے صحابہؓ' آپؐ کے جاں نثار' آپؐ کے دست و بازو' آپؐ کے اعوان و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ مقامِ عظمتِ صحابہ کے بیان کے ضمن میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ﴾ ''اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلے میں بڑے سخت اور آپس میں انتہائی نرم ہیں۔'' انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ مقابلے میں ان کا باپ ہے یا بیٹا۔ ان کا

رشتہ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ہے۔ ان کی تمام محبتیں اس معیار پر اور اسی ایک بنیاد پر از سرِ نو استوار ہو چکی ہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ)) ''جس نے کسی سے محبت کی تو اللہ کے لئے کی' کسی سے بغض اور عداوت رکھی تو اللہ کے لئے رکھی' کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا اور کسی سے کچھ روکا تو صرف اللہ کے لئے روکا' تو وہ ہے کہ جس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس معیار پر کاملتاً پورے اُترتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں چشمِ فلک نے وہ نظارہ دیکھا کہ باپ اِدھر ہے اور بیٹا اُدھر' ماموں اِدھر ہے تو بھانجا اُدھر' بھتیجا اِدھر ہے تو چچا اُدھر۔ اِدھر حضور ﷺ ہیں اور اُدھر عباس بن عبدالمطلب ہیں جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ اِدھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور اُدھر اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن۔ اور ایمان لانے کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہما) نے جب اپنے والدِ محترم حضرت ابوبکر صدیقؓ سے یہ کہا کہ ابا جان! میدانِ بدر میں آپ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے لیکن میں نے آپ کا لحاظ کیا تو جواب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیٹے' یہ اس لئے تھا کہ تمہاری جنگ حق کے لئے نہیں تھی' خدا کی قسم! اگر کہیں تم میری زد میں آ جاتے تو میں بالکل نہ چھوڑتا۔ اس لئے کہ یہاں معاملہ بالکل بدل چکا ہے۔ تاہم دوسری طرف وہ آپس میں انتہائی نرم اور مہربان ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹنے والے' ایک دوسرے کے دکھ اور درد کو اپنے باطن میں محسوس کرنے والے' اس شان کے حامل جس کی تعبیر علامہ اقبال نے ایک شعر میں اس طرح کی ہے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

اور جس کا نقشہ سورۃ المائدۃ میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ ''ان سے اللہ محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں' اہلِ ایمان کے حق میں بہت ہی نرم ہیں لیکن کافروں کے لئے بہت سخت ہیں۔'' کفار کے مقابلے میں ان کے موقف میں کہیں کسی کمزوری کا اظہار نہیں ہوتا۔ ﴿يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ ''اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں (جان اور مال لگاتے کھپاتے ہیں) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔''

اب ہم سورۃ الفتح کی آخری آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فرمایا: ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا

﴿يَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا﴾ ''تم انہیں دیکھتے ہو رکوع کرتے اور سجدہ کرتے ہوئے' وہ اپنے ربّ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں''۔ ذہن میں رکھئے کہ بندۂ مؤمن کی شخصیت کے یہ دو رُخ ہیں جن کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ ایک رُخ محبتِ خداوندی' جذبۂ عبودیت اور اس کی کیفیات سے متعلق ہے جبکہ دوسرا جہاد و قتال اور ایثار و قربانی سے عبارت ہے۔ یہاں ان الفاظ میں پہلے رُخ کا بیان ہے کہ: ﴿تَرٰهُمۡ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا﴾ ان کی زندگی کا یہ نقشہ تمہارے سامنے ہے کہ وہ اللہ کی جناب میں رکوع اور سجود کرنے والے ہیں' وہ اپنے ربّ کے فضل کے طالب اور اس کی رضا کے جویا ہیں۔ ان کا نصب العین بس رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ﴿سِيۡمَاهُمۡ فِىۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ﴾ ''ان کی نشانی ہے ان کے چہروں میں (ان کی پیشانیوں میں) سجدوں کے اثرات سے''۔ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِى التَّوۡرٰىةِ وَمَثَلُهُمۡ فِى الۡاِنۡجِيۡلِ﴾ ''یہ ان کی مثال ہے تورات میں اور ان کی یہ تمثیل ہے انجیل میں بھی''۔ تورات اور انجیل کے بارے میں یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں پیشین گوئیاں ان کتابوں میں موجود تھیں جن میں سے بہت سی کھرچ دی گئیں' نام و نشان مٹانے کی ہر ممکن سعی کی گئی پھر بھی کہیں کہیں کوئی کوئی پیشین گوئی باقی رہ گئی۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ صرف حضور ﷺ کی نہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی علامات کا بیان بھی تورات اور انجیل میں تھا' ان کی شخصیتوں کے نمایاں اوصاف اور خدوخال بھی ان میں درج تھے۔ وہ مشہور واقعہ اس بات کی تائید کرتا ہے جو بیت المقدس کی فتح کے ضمن میں تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے کہ جب مسلمان افواج یروشلم کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں اور محاصرہ بھی بہت طول پکڑ گیا تو وہاں محصور عیسائی رہنماؤں نے کہا کہ ایک درویش بادشاہ کی علامات ہماری کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں جس کے ہاتھوں یہ شہر فتح ہوگا۔ بعد میں ثابت ہوا کہ وہ درویش بادشاہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لئے کہ وہ جب بیت المقدس تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں نے اپنی کتابوں سے حضرت عمرؓ کا حلیہ ملانے کے بعد شہر کے دروازے مسلمانوں کے لئے یہ کہتے ہوئے کھول دیئے کہ یہی وہ شخص ہے جس کی علامات ہماری کتابوں میں درج ہیں!

آگے فرمایا: ﴿كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰى عَلٰى سُوۡقِهٖ﴾ ''اس کھیتی کے مانند جو پہلے اپنی سوئی نکالتی ہے' پھر اس کی کمر کو مضبوط کرتی ہے' پھر ذرا موٹی ہوتی ہے' پھر کھڑی ہو جاتی ہے اپنی نال پر'' ﴿يُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيۡظَ بِهِمُ الۡكُفَّارَ﴾ ''کاشت کار کو وہ بڑی بھلی لگتی ہے

(اُس کا دل اس کھیتی کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے) تاکہ دلوں میں جلن پیدا ہو جائے کفار کے''۔ یہاں کھیتی سے مراد صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے۔ یہ پودا جو شروع میں بڑا نرم و نازک اور کمزور تھا اب ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کاشت کار کون ہے؟ خود اللہ تبارک وتعالیٰ جس کی یہ کھیتی ہے' یا پھر وہ ذاتِ گرامی ﷺ جس نے اپنے خونِ جگر سے اس کھیتی کو سینچا ہے! آپؐ کا دل اس شاندار فصل کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کفار و منافقین جن کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض تھا' ان کی کامیابیوں پر اپنے دل میں جلن اور گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ ﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّاَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۲۹﴾﴾ ''ان لوگوں میں سے جو ایمان اور عملِ صالح کے معیار پر پورا اتریں' اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے''۔ دنیا میں بھی فتح و کامرانی ان کے قدم چوم رہی ہے اور آخرت کے اعتبار سے وہ کامیاب و کامران ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان صاحب ایمان اور نیکوکار لوگوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

صلح کے ٹوٹنے پر قریش کی جانب سے تجدید کی سر توڑ کوشش

صلح حدیبیہ کے بعد کہ جسے قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا' واقعتاً کامیابیوں نے مسلمانوں کے قدم چومنے شروع کئے اور اس فتح و نصرت کا اظہار دو پہلوؤں سے ہوا۔ ایک یہ کہ جیسا کہ اس سے قبل ایک موقع پر اشارہ کیا جا چکا ہے' اندرونِ عرب دو سال تک یہ صلح قائم رہی اور نبی اکرم ﷺ کو دعوت و تبلیغ کا بھرپور موقع میسر آیا۔ اس دوران بہت سے قبائل نے اسلام قبول کیا اور اسلام کا دائرۂ اثر عرب کے کونے کونے تک پہنچ گیا۔ اور دوسرے یہ کہ اسی عرصے میں آپؐ نے بیرونِ ملک عرب اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز فرمایا' آس پاس کے حکمرانوں کی طرف اپنے سفیر بھیجے اور نامہ ہائے مبارک کے ذریعے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔

قریش کی ایک غلطی سے یہ صلح ختم ہوئی۔ انہوں نے ایک قبیلے کے خلاف کہ جو مسلمانوں کا حلیف تھا' اپنے ایک حلیف کی مدد کی۔ اس طرح گویا خود انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا اور یوں صلح ٹوٹ گئی۔ لیکن اس کے فوراً بعد سردارانِ قریش کو یہ احساس ہو گیا کہ ان سے بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی ہے۔ چنانچہ فوراً ہی ان کی جانب سے تجدیدِ مصالحت کی کوششوں کا آغاز ہو گیا کہ کسی طرح صلح دوبارہ ہو جائے۔ ابوسفیان جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور قریش کی سرداری کا منصب انہیں حاصل تھا' صلح کی تجدید کے لئے خود چل کر مدینے آئے۔ اس ضمن میں نہایت دلچسپ

اور عجیب واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ابوسفیان مدینے آتے ہیں اور اپنی صاحبزادی حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا جو آنحضورﷺ کی زوجۂ محترمہ ہیں' کے پاس جاتے ہیں کہ وہ ان کے لئے اپنے شوہر (یعنی نبی اکرمﷺ) سے سفارش کریں۔ وہاں یہ عجیب معاملہ پیش آتا ہے کہ گھر میں داخل ہوکر جب چارپائی پر بیٹھنے لگتے ہیں تو اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ذرا رکئے! باپ کو روک کر پہلے وہ بستر تہہ کرتی ہیں اور پھر فرماتی ہیں کہ اب بیٹھئے! قریش کا وہ مدبر سردار جس نے ایک دنیا دیکھ رکھی تھی اور جسے بڑے بڑے درباروں میں حاضر ہونے اور وہاں کے رکھ رکھاؤ اور آداب کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا' فوراً پوچھتا ہے: ''بیٹی! یہ بستر میرے لائق نہ تھا یا میں اس بستر کے لائق نہ تھا؟'' اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ ابّا جان! آپ مشرک ہیں' ناپاک اور نجس ہیں اور یہ بستر محمد رسول اللہﷺ کا ہے' لہٰذا آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے......!

نبی اکرمﷺ کی فراست اور معاملہ فہمی کی ایک نہایت اعلیٰ مثال یہاں بھی سامنے آتی ہے کہ آپؐ نے تجدیدِ صلح کے لئے کی جانے والی ان کوششوں کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا اور مشرکین کے ساتھ صلح کی تجدید پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اس لئے کہ نہ جنگ آپؐ کا اصل مقصود تھی نہ صلح۔ آپؐ کی سعی وجُہد کا اصل ہدف اور مقصود تھا دین کا غلبہ......! جب اس ہدف کے حصول اور دین کی مصلحت کے لئے صلح بہتر تھی تو آنحضورﷺ نے بظاہر احوال دب کر بھی صلح کر لی۔ (صلح حدیبیہ کی شرائط بالکل یک طرفہ محسوس ہوتی ہیں کہ ان سے بظاہر سارا فائدہ مشرکین کو پہنچ رہا تھا۔) لیکن اب چونکہ صلح کو مزید جاری رکھنے اور صلح کی تجدید کرنے کے معنی یہ ہوتے کہ کفر کو بلاجواز ایک مہلت (Lease of Existence) دے دی جاتی' لہٰذا آنحضورﷺ نے صلح کی تجدید نہیں فرمائی۔ آپؐ صحیح طور پر اندازہ فرما چکے تھے اور جان چکے تھے کہ اب اِن کفارِ قریش اور مشرکین مکّہ میں کوئی قوّتِ مدافعت موجود نہیں ہے۔ غلبہ واقامتِ دین کی منزل اب بہت قریب ہے' آپؐ کی انقلابی جدوجہد اب کامیابی سے ہمکنار ہوا چاہتی ہے' لہٰذا آپؐ نے صلح کی تجدید سے انکار کیا۔

تکمیلِ انقلاب کا عنوان ...... فتح مکّہ

اس کے کچھ ہی عرصے بعد رمضان المبارک ۸ھ میں آپؐ دس ہزار صحابہؓ کی معیت میں مکّے کی جانب پیش قدمی فرماتے ہیں۔ اب کسی میں دم نہیں تھا کہ مسلمانوں کی قوّت کے سامنے ٹھہر سکتا۔ بعض زیادہ سرپھرے اور جذباتی لوگوں کی طرف سے کچھ تھوڑی سی مزاحمت ہوئی' صرف چند جانیں تلف

ہوئیں اور محمد رسول اللہ ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکّے میں داخل ہو جاتے ہیں۔اس موقع پر انبیاء کرامؑ کی سیرت و کردار کا وہ مشترک پہلو سامنے آتا ہے کہ جس کی اس مقدس جماعت سے باہر کوئی دوسری مثال پیش کرنا ناممکن ہے۔ وہ خون کے پیاسے کہ جن کے ظلم وستم کے باعث آٹھ ہی سال پہلے نبی اکرم ﷺ اور ان کے جاں نثار ساتھی اپنی آبائی سرزمین مکّہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے اور بمشکل اپنی جان سلامت لے جا سکے تھے‘ وہی لوگ مغلوبیت کی حالت میں آپؐ کے سامنے تھے اور پورے طور پر آپؐ کے رحم وکرم پر تھے۔ لیکن بجائے اس کے کہ انہیں کوئی لعنت ملامت اور سرزنش کی جاتی‘ لسانِ نبوت سے یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے ان بھائیوں سے کہی تھی جنہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ دشمنی والا معاملہ کیا تھا‘ یعنی ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ ”آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں“۔ ”اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ“ ”جاؤ! تم سب کے سب آزاد ہو۔“

اندرونِ ملکِ عرب انقلاب کی تکمیل
اور بیرونِ ملک دعوتی وانقلابی جدوجہد کا آغاز

فتح مکّہ کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اندرونِ ملک عرب یہ گویا کہ نبی اکرم ﷺ کے فیصلہ کن غلبے اور اقتدار کی علامت ہے۔اس لئے کہ عرب میں خواہ کوئی با قاعدہ مرکزی نظام موجود نہ تھا‘ کوئی باضابطہ مرکزی حکومت نہ تھی‘ بہر حال اس خطے میں ”اُمّ القریٰ“ ہونے کا مقام مکّے ہی کو حاصل تھا۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مکّہ معظّمہ کو مذہبی اور سماجی اعتبار سے ہی نہیں‘ معاشی اور سیاسی اعتبار سے بھی ملک عرب کے صدر مقام ہونے کی حیثیت حاصل تھی‘ جس پر اللہ تعالیٰ نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو غلبہ اور تمکن عطا فرما دیا اور یوں اندرونِ ملک عرب آپؐ کی انقلابی جدوجہد تکمیل سے ہمکنار ہوئی۔

غزوۂ حنین ......مشرکین عرب کی جانب سے آخری کوشش

اس کے بعد صرف ایک مزاحمت ہوئی‘ اور وہ ہوازن اور ثقیف کے لوگوں کی طرف سے تھی۔ یہ قبیلے بڑے زوردار تھے۔ فتح مکّہ کے بعد یہ اہل کفر اور شرک کی طرف سے گویا آخری کوشش تھی۔ جب آنحضور ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ اِدھر جنگ کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں‘ جمعیت فراہم کی جا رہی ہے‘ تو آپؐ نے جوابی اقدام کے طور پر اگلے ہی مہینے شوال ۸ ھ میں ان کی سرکوبی کے لئے لشکر کشی کی۔ اس

مہم کو غزوۂ حنین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بارہ ہزار کا لشکر آپؐ کے ہمراہ تھا۔ ان میں دس ہزار وہ تھے کہ جو مدینہ سے حضور ﷺ کے ساتھ فتح مکّہ کے وقت آئے تھے اور مزید دو ہزار مکّہ سے شریک ہوئے جن میں کچھ وہ بھی تھے جو فتح مکّہ کے بعد ایمان لے آئے تھے اور کچھ وہ بھی تھے جو ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن اب ان کی حیثیت حلیفوں کی تھی۔ بارہ ہزار کا لشکر لے کر آنحضور ﷺ مکّہ مکرمہ سے روانہ ہوئے اور وادیٔ حنین میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ توبہ میں سرزنش کے انداز میں آیا ہے:

﴿وَيَوۡمَ حُنَيۡنٍ اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡكُمۡ شَيۡـًٔا وَّضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ﴾

''اور یاد کرو حنین کے دن کو جبکہ تمہیں اپنی کثرت پر کچھ ناز ہو گیا تھا تو وہ کثرت تمہارے کسی کام نہ آ سکی اور زمین اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی''۔

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ بعض حضرات کے ذہن میں یہ خیال آ گیا ہو گا کہ ایک وقت تھا کہ ہم تین سو تیرہ تھے تب ہم نے مار نہ کھائی' تو آج تو بارہ ہزار ہیں' آج ہمیں کون شکست دے گا......!!! اللہ تعالیٰ نے فوراً گرفت فرمائی اور مسلمانوں کو سبق سکھا دیا۔ ہوازن کے لوگ بڑے ماہر تیر انداز تھے۔ وہ گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مسلمان جیسے ہی آگے بڑھے اُدھر سے تیروں کی زبردست بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ایسی بھگدڑ مچی کہ تقریباً پورا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ بعض روایات کے مطابق گنتی کے چند صحابہ آنحضور ﷺ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ لیکن بعض روایات اور غالباً صحیح تر روایات کی رو سے چند سو صحابہ آپؐ کے ساتھ رہے۔ بارہ ہزار میں سے محض چند سو افراد کا باقی رہ جانا بھی بہر حال ایک بہت بڑی بھگدڑ سے کم نہیں! اُس وقت نبی اکرم ﷺ کی ذاتی شجاعت کا ایک عجیب مظاہرہ سامنے آیا۔ آپ سواری سے اترے' علم اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

((اَنَا النَّبِیُّ لَا كَذِبَ اَنَا ابۡنُ عَبۡدِ الۡمُطَّلِبِ))

''جان لو کہ میں نبی ہوں اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں' اور جان لو کہ میں عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہوں''۔ یعنی میرے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر ہو تب بھی نبی ہوں اور خواہ کوئی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو تب بھی نبی ہوں۔ میری نبوت کا دار و مدار میرے ماننے والوں کی قلت و کثرت پر نہیں ہے اور یہ کہ میں عبدالمطلب کا بیٹا میدان میں موجود ہوں۔ پھر آپؐ نے صحابہ کو پکارا: ''يَا اَصۡحَابَ الشَّجَرَةِ'' اے وہ لوگو جنہوں نے میرے ہاتھ پر ایک درخت کے نیچے بیعت کی تھی' آؤ میرے جھنڈے تلے جمع

ہو جاؤ! اسی طرح مختلف لوگوں کو نام لے کر پکارا۔ حضور ﷺ کی پکار پر لوگ جمع ہوئے اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرما دی۔ یہ غزوۂ حنین گویا علامت بن گیا اس بات کی کہ اندرونِ ملک عرب اب کوئی ایسی طاقت موجود نہیں رہی جو خم ٹھونک کر مسلمانوں کے مقابلے میں آ سکے۔ چنانچہ اس طرح جزیرہ نمائے عرب پر دینِ حق کا غلبہ مکمل ہو گیا۔

آنحضور ﷺ کے حسنِ تدبیر کا ایک اہم واقعہ

غزوۂ حنین کا ذکر نامکمل رہے گا اگر ایک اہم واقعے کا ذکر نہ کیا جائے جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سارے معاملات کس طرح بالکل انسانی سطح پر ہوئے۔ وہ ساری پیچیدگیاں اور وہ تمام مشکلات جو دنیا کی کسی بھی اجتماعی جدوجہد اور انقلابی عمل میں پیش آ سکتی ہیں، نبی اکرم ﷺ کو بھی ان کا سامنا کرنا پڑا۔ غزوۂ حنین میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اس کی تقسیم میں نبی اکرم ﷺ نے تالیفِ قلب کو مدنظر رکھتے ہوئے مکّہ کے لوگوں کو کہ جو ابھی نئے نئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، دوسروں کی نسبت زیادہ حصّہ دیا۔ منافقین کو آنحضور ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کا موقع مل گیا۔ باتیں کہی گئیں اور دھڑلے سے کہی گئیں۔ صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ فی الواقع جنگل کی آگ کی طرح وہ باتیں پھیل گئیں۔ اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بے لگام ہو گئیں اور کھلے عام یہ کہا جانے لگا کہ ''جب جان دینے اور خون نچھاور کرنے کا وقت آتا ہے تو ہم لوگ یاد آتے ہیں اور جب مال کی تقسیم کا معاملہ ہوا تو اب اپنے بھائی بند اور اپنے ہم قبیلہ یاد آ گئے، مال کی تقسیم میں انہیں ترجیح دی گئی ہے''۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ بات ایسی تھی کہ بظاہر کچھ ایسی خلافِ واقعہ بھی نہیں تھی۔ اس واقعہ کو صحیح پس منظر میں بھی دیکھا جا سکتا تھا اور غلط رُخ بھی دیا جا سکتا تھا۔ بات پھیلتے پھیلتے حضور ﷺ کے کانوں تک بھی پہنچی۔ نبی اکرم ﷺ کا تدبر دیکھئے۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مجتمع کیا۔ تمام انصار ایک بڑے خیمے میں جمع ہوئے۔ آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے اپنے احسانات کا، یا یوں کہئے کہ اللہ کے احسانات کا، جو آپؐ کے طفیل انصار پر ہوئے، تذکرہ فرمایا۔ اے معشر انصار! کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم گمراہی پر تھے، اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اللہ نے میرے ذریعے تمہارے اندر محبت اور اتفاق پیدا کیا؟ انصار جواباً کہتے رہے: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!! حضور ﷺ! بالکل ایسا ہی ہے۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ بالکل صحیح کہتے

ہیں۔اس کے بعد آپؐ نے خطاب کا رُخ بدلا۔ ہاں اے معشرِ انصار! تم یہ کہو کہ اے محمد تمہیں تمہاری قوم نے اپنے گھر سے نکال دیا تھا‘ ہم نے تمہیں پناہ دی۔تمہاری قوم تمہارے خون کی پیاسی تھی‘ ہم نے تمہاری حفاظت کی۔اور میرا جواب ہوگا کہ ہاں‘ تم یہ صحیح کہہ رہے ہو‘ درست کہہ رہے ہو۔تو اے معشرِ انصار! کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ لوگ بھیڑیں‘ بکریاں‘ اونٹ اور دُنیوی مال واسباب لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمد رسول اللہ (ﷺ) کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹو......!!! انصار کی چیخیں نکل گئیں۔بے اختیار ان کی زبانوں سے نکلا: رَضِیْنَا‘ رَضِیْنَا!......ہم راضی ہیں اس پر‘ ہم راضی ہیں۔ اس طرح آپؐ کے حسنِ تدبیر کی بدولت ایک نہایت تشویش ناک صورتِ حال بالکل تبدیل ہوگئی اور مسلمانوں میں جوش وخروش اور جذباتِ ایمانی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔بہرحال غزوۂ حنین کے بعد جیسا کہ عرض کیا گیا‘ اندرونِ ملک عرب انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل ہوگئی۔

حج کے انتظامات......آنحضور ﷺ کی حکمت عملی

غلبۂ دینِ حق کی تکمیل کے بعد بھی آپؐ نے حج کے معاملے میں خصوصی حکمت عملی اختیار فرمائی۔ ۸ ھ میں جب حج کا موقع آیا تو آپؐ نے سابق انتظام کو برقرار رکھا۔مشرکین کو نہ صرف یہ کہ حج کرنے کا پورا موقع دیا بلکہ حج کا پورا انتظام بھی انہی کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔اگلے سال یعنی ۹ ھ کے حج میں ایک تبدیلی کی گئی۔مشرکین کو بھی اگرچہ اہل ایمان کے ساتھ حج کرنے کی اجازت برقرار رکھی گئی لیکن حج کے انتظامات کی ذمہ داری اب مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ نے امیر الحج مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ آپؓ کی زیرِ امارت سن نو ہجری کا حج ادا ہوا۔اسی موقع پر سورۂ براءۃ (سورۃ التوبۃ) کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں مشرکین مکّہ کو آخری الٹی میٹم دیا گیا تھا۔ان آیات کے نزول سے قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ قافلۂ حج لے کر روانہ ہو چکے تھے۔حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ میرے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے اجتماع میں ان آیات کو پڑھ کر سناؤ اور اللہ کی جانب سے مشرکین سے براءت کا اعلان کردو۔حضرت علیؓ جب حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے حضرت علیؓ سے جو پہلا سوال کیا وہ ہمارے لئے بظاہر بڑا عجیب ہے۔لیکن اس کا ذکر یہاں اسی لئے کیا جارہا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ حضور ﷺ نے جو اجتماعی نظام تشکیل دیا تھا اس میں ڈسپلن کی اہمیت کس قدر تھی۔حضرت علیؓ کو دیکھتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے پہلا سوال یہ کیا کہ: ''اَمِیْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟'' (امیر بن کر آئے ہو یا بطورِ مامور

آ ئے ہو؟) یعنی کیا حضورؐ نے آ پؓ کو قافلۂ حج کا امیر معین کر کے بھیجا ہے یا امارت کی ذمہ داری بدستور مجھ پر ہے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ امیر آپ ہی ہیں' میں مامور کی حیثیت سے آیا ہوں' تاہم بات صرف اتنی ہے کہ حضورؐ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے اس اجتماعِ حج میں یہ آیاتِ براءۃ میں پڑھ کر سناؤں گا۔اس خدمت پر مجھے نبی اکرم ﷺ نے مامور فرمایا ہے۔

﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾ (التوبۃ:۱)

مشرکین عرب کے لئے آخری الٹی میٹم

سورۂ براءۃ کی یہ ابتدائی آیات درحقیقت اس بات کا اعلانِ عام ہے کہ اب جزیرہ نمائے عرب میں کفر اور شرک کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔اب تو صورت یہ ہے کہ : ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ ''حق آ گیا اور باطل نیست و نابود ہو چکا ہے''۔ چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ اَشہرِ حرم کے ختم ہوتے ہی مشرکین کا قتلِ عام شروع کر دیا جائے:﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ ''پس جب محترم مہینے ختم ہو جائیں تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی انہیں پاؤ!'' اب اس جزیرہ نمائے عرب میں کفر اور شرک کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔صرف اہلِ کتاب کو یہ ایک اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو چھوٹے ہو کر رہ سکتے ہیں:﴿يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ ۝﴾ ''وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے ہو کر رہیں''۔یعنی وہ اگر چاہیں تو اپنے مذہب پر عمل پیرا رہیں' اپنے نجی معاملات میں وہ نصرانیت یا یہودیت پر برقرار رہنا چاہیں تو رہیں' لیکن اب یہاں اللہ کا دین غالب ہوگا اور انہیں اس کی بالادستی کو قبول کرنا ہوگا۔مشرکین عرب یعنی بنی اسماعیل کو یہ رعایت نہیں دی گئی' اس لئے کہ حضور ﷺ ان ہی میں سے تھے۔آپؐ کی اوّلین بعثت ''اُمّیین'' ہی میں تھی۔انہی کی زبان بولتے ہوئے آپؐ تشریف لائے' آپؐ اسی قوم میں سے تھے۔گویا کہ مشرکین عرب پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت بدرجۂ آخر اور بتمام وکمال ہو چکا' لہٰذا ان کے لئے اب کوئی رعایت اور کوئی گنجائش نہیں!!

ہجرت کے دسویں سال نبی اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس فریضۂ حج ادا فرمایا اور ہجرت کے بعد یہی آپؐ کا پہلا اور آخری حج ہے۔اس میں آپؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو تاریخ کے اوراق میں نمایاں طور پر ثبت ہے۔عرب کے کونے کونے سے آئے ہوئے سوا لاکھ سے زائد افراد میدانِ عرفات میں جمع تھے۔گویا آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ کمر توڑ دینے والی مساعی کا حاصل آپؐ کے سامنے گوش بر آواز تھا۔

اس موقع پر آپؐ نے حاضرین سے یہ گواہی بھی لے لی کہ میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا' تبلیغ کا جو بارِ گراں مجھ پر ڈالا گیا تھا میں نے اس کا حق ادا کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے بھی یہ عرض کر کے کہ ''اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ'' (اے اللہ! تو بھی گواہ رہ کہ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا) آپؐ نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ آپؐ کے کاندھوں سے اتر گیا۔

سورۃ الفتح کی آخری آیات کے درس میں یہ مضمون ہمارے مطالعے سے گزر چکا ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾

آیت کے آخری الفاظ کہ ''اور کافی ہے اللہ بطورِ گواہ'' کا ربط جڑ جاتا ہے حضور ﷺ کے اس فرمان سے کہ ''اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ'' کہ اے اللہ' تو گواہ رہ کہ اس جزیرہ نمائے عرب پر تیرے دین کا غلبہ مکمل ہو گیا۔

بیرونِ عرب دعوتی سرگرمیاں

یہ تو معاملہ تھا اندرونِ ملک عرب کا' اب آیئے اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ بیرونِ عرب صورتِ حال کیا تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے' آنحضور ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ آپؐ کی بعثت خصوصی اہلِ عرب کی طرف تھی اور بعثت عمومی پوری نوعِ انسانی کی طرف. ﴿اِلَى النَّاسِ كَآفَّةً﴾ اس بعثت عمومی کے ضمن میں بھی نبی اکرم ﷺ نے اپنے فرائض کی ادائیگی کا آغاز اپنی حیاتِ طیبہ میں فرما دیا تھا اور پھر اُن فرائض کو اُمت کے حوالے کر کے آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے' جبکہ بعثت خصوصی کی ذمہ داری کُل کی کُل آپؐ نے بنفسِ نفیس ادا فرمائی۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر اس کی تکمیل کا اعلان بھی اللہ کی جانب سے ہو گیا۔

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾

بعثت عمومی کے ضمن میں آغازِ کار کے طور پر آنحضور ﷺ نے جو اقدامات کئے ان کا ایک خاکہ ذہن میں جما لیجئے! صلح حدیبیہ ۶ ھ میں ہوئی' اور اس کے بعد آپؐ نے آس پاس کے حکمرانوں کی طرف دعوتی خطوط لکھے۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کا نامۂ مبارک لے کر خسرو پرویز کے دربار میں پہنچے۔ اس بدبخت نے آپؐ کے نامۂ مبارک کو چاک کر دیا اور انتہائی گستاخی کی روش اختیار کی۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ عرب کا سارا علاقہ اس کی سلطنت میں شامل ہے اور عرب میں رہنے والے سب اس کی رعیت ہیں۔ چنانچہ اس نے یمن کے ایرانی گورنر کو حکم بھیجا کہ (معاذ اللہ'

نقل کفر' کفر نباشد) یہ کون گستاخ شخص ہے جس نے مجھے خط لکھنے کی جرأت کی ہے' اس کو فوراً گرفتار کر کے میرے دربار میں حاضر کرو!...... وہاں سے دو اشخاص خسرو پرویز کے حکم کی تعمیل میں آپؐ کے پاس مدینہ پہنچے کہ ہمارے بادشاہ نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تمہاری بات کا جواب کل دوں گا۔ اگلی صبح آپؐ نے ان دونوں کو بلا کر فرمایا کہ جاؤ تمہارا ربّ (بادشاہ) قتل ہو چکا ہے۔ اور فی الواقع اسی رات وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ آپؐ کے یہ الفاظ بھی تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں کہ خسرو پرویز نے میرا خط چاک نہیں کیا' اپنی سلطنت کے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں۔ اور وہ سلطنت واقعتاً نسیاً منسیا ہو کر رہی۔

قیصر روم ہرقل کے دربار میں آپؐ کا نامۂ مبارک لے کر حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہنچے۔ وہ شخص اہلِ کتاب میں سے تھا' نصرانی تھا' صاحبِ علم تھا۔ اس کو یہ پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی رسول ہیں جس کے ہم منتظر تھے۔ لیکن حکومت اور سلطنت کی بیڑیاں اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھیں لہٰذا وہ ایمان لانے سے محروم رہا۔ تاہم اس نے بھرپور کوشش کی کہ پوری سلطنت اسی طرح اجتماعی طور پر اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام لے آئے جیسے اس سے قبل ایک بار اپنے شہنشاہ کی پیروی میں پوری سلطنت نے عیسائیت کو اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے دربار لگایا۔ ان دنوں بیت المقدس کے نزدیک غزہ شہر میں حضرت ابوسفیان جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے' تجارتی قافلہ لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ انہیں قیصر روم کے دربار میں طلب کیا گیا۔ بھرے دربار میں جو گفتگو ہوئی اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قیصر چاہتا کیا تھا! ہرقل نے اپنے سوالات کے ذریعے یہ کوشش کی کہ ان کے جواب سن کر درباریوں پر یہ بات واضح ہوتی چلی جائے کہ آپؐ نبی برحق ہیں' آپ ہی رسول آخر الزماں ہیں۔ (یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حضرت ابوسفیان نے جو اُس وقت مشرکین کے قافلے کے سردار تھے' ہر سوال کے جواب میں صحیح بات بتائی اور غلط بیانی سے گریز کیا) لیکن اس کے درباریوں اور خاص طور پر بطارقہ یعنی عیسائی پادریوں کا ردّعمل نہایت مخالفانہ تھا۔ طیش کے عالم میں ان کے نتھنوں میں سے خرخراہٹیں نکل رہی تھیں۔ ہرقل نے محسوس کیا کہ اس طرح تو اس کا تختِ اقتدار ڈول جائے گا' لہٰذا ایمان سے محروم رہا۔

اسی طرح مصر کا حکمران مقوقس بھی عیسائی تھا۔ اس کے پاس جب آپ ﷺ کا نامۂ مبارک پہنچا تو اسے بھی پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے جان لیا کہ آپؐ نبی برحق ہیں۔ اس نے آپؐ کے ایلچی کا

احترام کیا' کچھ تحفے تحائف بھی حضورؐ کی خدمت میں بھیجے۔لیکن ایک شخص شرحبیل بن عمرو نے جو رؤساء شام میں سے تھا اور قیصر روم کے زیر اثر سمجھا جاتا تھا' گستاخی کی انتہا کر دی۔اس کی جانب حضرت حارث بن عمیرؓ حضور ﷺ کے ایلچی کے طور پر آپؐ کا نامۂ مبارک لے کر گئے۔شرحبیل بن عمرو نے انہیں شہید کر دیا۔یہ واقعہ مملکت روم کے ساتھ اسلامی ریاست کے تصادم کی بنیاد بن گیا۔

سلطنتِ روم کے ساتھ تصادم کا آغاز

سفیر کا قتل بین الاقوامی اخلاقیات میں ایک بہت بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے قصاص کے لئے تین ہزار کا ایک لشکر تیار کیا اور اسے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیر کمان شام کی طرف روانہ کیا۔ یہاں سے گویا اب بیرونِ عرب تصادم کا آغاز ہو گیا۔ آنحضور ﷺ نے پیشگی طور پر یہ ہدایت دے دی تھی کہ اگر حضرت زیدؓ شہید ہو جائیں تو پھر کمان حضرت جعفر طیارؓ کے ہاتھ میں ہو گی' وہ بھی اگر شہید ہو جائیں تو پھر عبداللہ بن رواحہؓ لشکر کے امیر ہوں گے۔ادھر سے شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کی فوج کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ یہاں اب مشورہ ہوا' تین ہزار کا ایک لاکھ کے ساتھ مقابلہ ہے' جنگی نقطہ نگاہ سے کوئی نسبت اور تناسب نہیں بنتا۔ آیا لوٹ جائیں یا آگے بڑھیں اور ٹکرا جائیں ....!! مسلمانوں کا ذوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد غالب آیا۔ فیصلہ ہوا کہ نہیں' فتح و شکست کے بارے میں سوچنا ہمارا کام نہیں' ہمیں تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔مقابلہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے حضرت زید بن حارثہ' حضرت جعفر طیار اور حضرت عبداللہ بن رواحہ تینوں شہید ہو گئے' رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین۔اور پھر کمان ہاتھ میں لی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور ایک نہایت خونریز جنگ کے بعد جیسے بھی بن پڑا' بڑی حکمت اور مہارت کے ساتھ اس لشکر کو دشمن کے نرغے سے نکال کر لے آئے۔ جب یہ لشکر مدینے واپس پہنچا تو بعض لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ بھگوڑے ہیں اور جان بچا کر میدانِ جنگ سے بھاگ آئے ہیں' لشکر پر باقاعدہ خاک پھینکی۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا' بلکہ اس لشکر کے دفاع میں سورۃ الانفال ہی کے الفاظ کا حوالہ دیا کہ یہ بھاگ کر آنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کا یہ عمل تو ﴿مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ﴾ (یعنی جنگی حکمتِ عملی کے تحت دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے پیچھے ہٹنا) کے زمرے میں آئے گا' اس لئے کہ یہ لوگ اپنی جماعت کی طرف لوٹ کر آئے ہیں تا کہ ایک نئی تیاری کے ساتھ اور پورے اہتمام کے ساتھ از سرنو حملہ کیا جا سکے۔

غزوۂ تبوک ۔ نہایت کٹھن آزمائش

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے نفیر عام کا اعلان فرما دیا۔ اعلانِ عام کر دیا گیا کہ اب وقت ہے کہ سب لوگ اللہ کے راستے میں نکلیں۔ اللہ کے دین پر ایک کٹھن مرحلہ آ گیا ہے‘ وقت کی عظیم ترین قوّت سلطنتِ روما کے ساتھ تصادم درپیش ہے۔ آج کی اصطلاح میں ہم یوں کہیں گے کہ سپر پاورز میں سے ایک کے ساتھ تصادم ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہر شخص اللہ کی راہ میں نکلے۔ سیرت میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح نفیر عام کی گئی۔ یہ ہجرت کا نواں سال تھا۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ تبوک کی جانب پیش قدمی کرنی تھی جو مدینہ سے چھ سات سو میل کی مسافت پر تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ قحط کا سا عالم تھا اور اب کھجور کی فصل پک کر تیار تھی۔ اندیشہ تھا کہ اگر سب لوگ یہاں سے چلے گئے تو ان فصلوں کو اتارنے والا کوئی نہ ہوگا اور یہ برباد ہو جائیں گی۔ پھر یہ کہ ٹکراؤ کس سے ہے؟ سلطنتِ روما سے! اب تک تو مسلمانوں کا مقابلہ اپنے ہم پلہ عربوں کے ساتھ تھا۔ مسلمان خود عرب تھے اور ان کے مقابلے میں بھی عرب قوّت تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ افواج کی تعداد اور سامان حرب کے لحاظ سے ایک اور دس کی نسبت تھی۔ لیکن یہ کہ عرب کا تصادم سلطنتِ روما کے ساتھ......! کوئی نسبت تناسب بنتا ہی نہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران اہلِ ایمان کے ایمان کی آخری اور سب سے کڑی آزمائش ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ میں تفصیل کے ساتھ اس سفر تبوک میں پیش آنے والے حالات وواقعات کا ذکر بھی ہے اور ان پر ایک مفصل تبصرہ بھی وارد ہوا ہے۔ سیرتِ طیبہ میں اس غزوے کو جہاد وقتال فی سبیل اللہ کا نقطۂ عروج قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تیس ہزار کا لشکر لے کر محمد رسول اللہ ﷺ مدینہ سے روانہ ہوئے اور ایک نہایت طویل اور پُر صعوبت سفر طے کر کے تبوک پہنچے۔ (سیرت کی کتابوں میں اس مہم کو ’’جیش العُسرۃ‘‘ یعنی ’’نہایت سختی اور تنگی کا لشکر‘‘ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) تبوک میں آپؐ نے بیس دن قیام فرمایا۔ ہرقل قیصر روم وہاں سے کچھ دور زیادہ فاصلے پر نہیں تھا‘ قریب ہی موجود تھا۔ لاکھوں کی تربیت یافتہ افواج (standing armies) اس کے ساتھ تھیں۔ لیکن وہ مقابلے کی ہمت نہ کر سکا‘ بلکہ طرح دے گیا‘ مقابلے پر آنے سے گریز کیا۔ یہ ایک سوالیہ نشان ہے مؤرخین کے سامنے کہ اس کی وجہ کیا ہوئی؟ نبی اکرم ﷺ بیس دن تک تبوک میں مقیم رہے۔ پورے علاقے پر آپؐ کی دھاک بیٹھ گئی۔ مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم ہو گیا۔ آس پاس کے رؤساء نے آکر اطاعت قبول کی اور اس طرح گویا کہ بیرونِ ملک عرب اسلام کی دعوت اور
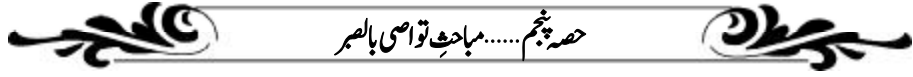
اس کے پھیلاؤ کا نقطہ آغاز ہو گیا' لیکن ہرقل سامنے نہیں آیا۔ اس کی واحد وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ جانتا تھا کہ مقابلے پر اللہ کے رسولؐ ہیں' ان کے ساتھ ٹکرانے کا نتیجہ اس پر خوب عیاں تھا' لٰہذا وہ طرح دے گیا اور مقابلے میں نہ آیا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

❁❁❁

حصہ ششم
جامع سبق
درس 25 تا درس 31

چند تمہیدی امور☆

خصوصاً نظمِ قرآن کے حوالے سے!

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:
اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس سے قبل کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار لفظ بہ لفظ مطالعہ شروع کریں' حسب معمول چند تمہیدی امور کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ مصحف میں اس سورۂ مبارکہ کا مقام کیا ہے۔ ایک جملے میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کے مکی و مدنی سورتوں پر مشتمل جو سات گروپ ہیں' ان میں سے چھٹے گروپ کی مدنی سورتوں میں اوّلین اور جامع ترین سورۃ' سورۃ الحدید ہے۔ لیکن اس ایک جملے کی کسی قدر وضاحت کی ضرورت ہے۔

سورتوں کی گروپ بندی

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ قرآن حکیم کی سورتیں تعداد میں ۱۱۴ ہیں۔ یہ ۱۱۴ سورتیں دو طرح کے گروپس میں تقسیم کی گئی ہیں۔ ایک تقسیم تو وہ ہے جو قدیم ہے' دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ سے اس تقسیم کا ذکر موجود ہے۔ یہ قرآن مجید کی سورتوں کی سات منزلوں یا سات احزاب میں تقسیم ہے' جبکہ مختلف گروپس میں قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک تقسیم اور ہے جس کی طرف قرآن میں تدبر کرنے والے بعض حضرات کی توجہ ماضی قریب ہی میں منعطف ہوئی ہے' اور وہ یہ ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں کے بھی قرآن مجید میں سات گروپس ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ قرآن حکیم میں پہلے تمام مکی سورتیں اور پھر تمام مدنی سورتیں آ گئی ہوں' یا اس کے برعکس پہلے تمام مدنی سورتوں کو جمع کر لیا گیا ہو اور پھر تمام مکی سورتوں کو جمع کر لیا گیا ہو۔ اگرچہ بعض اعتبارات سے یہ ترتیب تو نظر آتی ہے کہ طویل سورتیں پہلے ہیں اور چھوٹی سورتیں بعد میں ہیں' لیکن اس میں بھی کوئی معین قاعدہ کلیہ نہیں ہے' بلکہ

☆ اس مقام سے اُس حصے کا آغاز ہوتا ہے جس کو جناب خالد محمود خضر صاحب نے مرتّب کیا ہے۔

مختلف مقامات پر فرق وتفاوت نظر آ تا ہے۔تو اب یہ مکی اور مدنی سورتوں کے جو مختلف گروپس بنتے ہیں ان پر جب غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی تعداد میں سات ہی ہیں۔

جہاں تک سات منزلوں یا سات احزاب کا تعلق ہے وہ گویا حجم کے اعتبار سے پورے قرآن حکیم کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے کہ جو شخص ہر ہفتے میں ختمِ قرآن کر لینا چاہتا ہو' جیسا کہ بہت سے صحابہ ﷡ کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اس کا التزام کرتے تھے' تو سہولت رہے کہ ہر روز اگر ایک حزب یا ایک منزل کی تلاوت ہوتی رہے تو ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم ہو جائے۔اس تقسیم میں چونکہ سورتوں کو پورا پورا شامل کیا گیا ہے اس لیے یہ سات منزلیں حجم میں بالکل مساوی نہیں ہیں۔پہلی منزل سوا پانچ پاروں کی ہے' باقی ہر منزل کم وبیش چار پاروں پر مشتمل ہے۔اس تقسیم میں چونکہ سورتوں کی فصیلیں نہیں توڑی گئیں لہٰذا کچھ فرق وتفاوت ہے۔البتہ دَورِ نبویؐ کی اس تقسیم میں ایک حسن نظر آ تا ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے بعد پہلی منزل میں تین سورتیں' دوسری منزل میں پانچ' تیسری میں سات' چوتھی میں نو' پانچویں میں گیارہ اور چھٹی منزل میں تیرہ سورتیں ہیں' جبکہ ساتویں منزل ''حزبِ مفصل'' کہلاتی ہے جو ٦٥ سورتوں پر مشتمل ہے۔

اس تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبویؐ میں سورتوں کو ایک وحدت کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی طرف بڑی توجہ تھی اور سورتوں کا توڑنا پسندیدہ نہیں تھا۔اِس وقت جو ہمیں قرآن مجید تیس پاروں میں منقسم نظر آ تا ہے' جنہیں ''سی پارے'' (تیس ٹکڑے) کہا جاتا ہے' یہ دورِ صحابہؓ کی شے نہیں ہے' بلکہ بعد کی تقسیم ہے۔جب مسلمانوں میں تلاوت کا ذوق وشوق کم ہو گیا اور مسلمانوں نے سمجھا کہ اگر ہر مہینے ایک قرآن مجید ختم کر لیا جائے تب بھی بڑی بات ہے تو غالباً کسی مصحف کے صفحات گن کر اسے تیس حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔اور چونکہ یہ بعد کا کام ہے لہٰذا اس تقسیم میں دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ والا حسن برقرار نہیں رہ سکا اور سورتوں کی فصیلیں ٹوٹ گئی ہیں' بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک سورت کی ایک آیت ایک پارے میں ہے اور بقیہ پوری سورت اگلے پارے میں چلی گئی ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ الحجر (پارہ ١٣+ ١٤) کے ساتھ یہ حادثہ ہوا ہے۔

سات احزاب کے علاوہ قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک گروپ بندی اور بھی ہے۔قرآن مجید میں ہمیں مکی اور مدنی سورتیں گڈمڈ نظر آتی ہیں' لیکن ان میں بڑی معنویت پنہاں ہے۔چنانچہ ایک ترتیب میں آنے والی مکی اور مدنی سورتوں کو جمع کر کے اگر گروپ بندی کی جائے تو اس طرح بھی

سات گروپ وجود میں آتے ہیں۔ اس طرح سے وجود میں آنے والے ہر گروپ کا آغاز ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے ہوتا ہے اور اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر۔ یہ گروپ بندی معنوی لحاظ سے ہے، چنانچہ اس میں حجم کا لحاظ نہیں ہے۔ کوئی گروپ بہت طویل ہے اور کوئی بہت مختصر۔ لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں کے اجتماع سے وجود میں آنے والے ہر گروپ کا کوئی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جسے اس گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتیں مل کر مکمل کرتی ہیں۔ اس مضمون کا ایک رُخ اس گروپ کی مکی سورتوں میں بیان ہوتا ہے تو دوسرا رُخ اسی گروپ کی مدنی سورتوں کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ یوں دونوں مل کر اُس مضمون کی تکمیل کرتے ہیں۔

پہلے اور آخری گروپ میں ایک عجیب عکسی (reciprocal) نسبت ہے کہ پہلے گروپ میں مکی سورت صرف ایک ہے، یعنی سورۂ فاتحہ جو نہایت مختصر سورۃ ہے اور کُل سات آیات پر مشتمل ہے، جبکہ مدنی سورتیں چار ہیں جو بہت طویل ہیں اور تقریباً سات پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں، یعنی البقرۃ، آل عمران، النساء اور المائدۃ۔ اس کے بالکل برعکس ہے آخری گروپ جو آخری دو پاروں پر محیط ہے۔ اس کا آغاز سورۃ الملک سے ہوتا ہے اور تقریباً یہ پورے دونوں پارے مکی سورتوں پر ہی مشتمل ہیں، صرف آخر میں چھوٹی چھوٹی چند سورتیں مدنی ہیں۔ یہ تو تھا معاملہ پہلے اور آخری گروپ کا، درمیانی گروپوں میں بھی بڑا توازن نظر آتا ہے۔

دوسرا گروپ اور آخری سے دوسرا یعنی چھٹا گروپ اس پہلو سے نہایت متوازن ہیں کہ ان میں مکی اور مدنی سورتوں کا تناسب تعداد اور حجم کے اعتبار سے قریباً مساوی ہے۔ چنانچہ دوسرے گروپ میں الانعام اور الاعراف مکیات ہیں، جبکہ الانفال اور التوبۃ مدنیات۔ جبکہ چھٹے گروپ میں سات سورتیں مکی ہیں جو تقریباً ایک پارے یا اس سے قدرے زائد پر پھیلی ہوئی ہیں، اور دس سورتیں مدنی ہیں جو حجم کے اعتبار سے تقریباً سوا پارہ بنتی ہیں۔ گویا کہ وہی توازن جو دوسرے گروپ میں تھا یہاں چھٹے گروپ میں بھی موجود ہے۔ اس گروپ کے بارے میں یہ بات بڑی نمایاں ہے کہ اس کی مکیات فصاحت و بلاغت، ترکیبِ الفاظ اور صوتی آہنگ (rhythm) کے اعتبار سے قرآن مجید میں منفرد مقام اور نمایاں مرتبے کی حامل ہیں، یعنی سورۃ قٓ، سورۃ الذاریات، سورۃ الطّور، سورۃ النجم، سورۃ القمر، سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ۔ چنانچہ ان میں ایک سورۃ وہ بھی ہے، یعنی سورۃ الرحمٰن، جسے نبی اکرم ﷺ نے ''عروس القرآن''، یعنی قرآن کی دلہن قرار دیا ہے۔ گویا لفظی اور ادبی اعتبار سے قرآن مجید کا

حسین ترین حصّہ یہی ہے جو اِس گروپ کی مکیات پر مشتمل ہے۔

اس گروپ کی مدنیات بھی دو اعتبارات سے نمایاں مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔ ایک تو اس پہلو سے کہ مدنی سورتوں کا اتنا بڑا اکٹھ قرآن حکیم میں اور کہیں نہیں ہے' اور دوسرے اس پہلو سے کہ ان سورتوں میں اہم مضامین کے خلاصے آ گئے ہیں جن کی ہمارے نقطۂ نگاہ سے بڑی اہمیت ہے۔ قرآن مجید کے بہت سے اہم موضوعات بالخصوص وہ کہ جو مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمتِ مسلمہ متعلق ہیں اور جو طویل مکی اور مدنی سورتوں میں تفصیل کے ساتھ آئے ہیں' ان سب کے خلاصے گویا ان دس چھوٹی سورتوں کی شکل میں ہمیں عطا کر دیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دس میں سے چھ سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں' جن میں سے پانچ کا مطالعہ اس سے قبل ہم کر چکے ہیں' یعنی سورۃ الصّف' سورۃ الجمعۃ' سورۃ المنافقون' سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم' جبکہ چھٹی سورۃ (الحدید) ہمارے زیر مطالعہ ہے۔

ان دس سورتوں میں سے پانچ کی اضافی امتیازی شان یہ ہے کہ ان کا آغاز تسبیحِ باری تعالیٰ کے ذکر سے ہوتا ہے' ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ﴾ یا ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰہِ﴾ کے الفاظِ مبارکہ سے۔ چنانچہ ان کے لیے ایک مجموعی نام ''اَلْمُسَبِّحات'' تجویز کیا گیا ہے۔ یہ پانچ سورتیں سورۃ الحدید' سورۃ الحشر' سورۃ الصّف' سورۃ الجمعۃ اور سورۃ التغابن ہیں' جن میں سوائے سورۃ الحشر کے بقیہ چاروں سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔

سورۃ الحدید۔ اُمُّ الْمُسَبِّحات

اس گروپ کی پہلی سورۃ' سورۃ الحدید ہے' جو اس سلسلۂ سُوَر کی طویل ترین سورۃ ہے اور چار رکوعوں میں پھیلی ہوئی ہے' جبکہ بقیہ نو سورتوں میں سے دو سورتیں تین تین رکوعوں کی ہیں اور باقی سات دو دو رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ سورۃ الحدید کو اس پہلو سے اس گروپ کی جامع ترین سورۃ قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ اُن تمام مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو بقیہ سورتوں میں الگ الگ زیر بحث آئے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر اسے ''اُمُّ الْمُسَبِّحَات'' کہا جائے تو بات غلط نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُمت کے نام قرآن کا جو پیغام ہے' یا دوسرے لفظوں میں قرآن حکیم جو کچھ اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بحیثیتِ اُمت کہنا چاہتا ہے' اس کا خلاصہ اس ایک سورۂ مبارکہ میں پورے طور پر موجود ہے۔

سورۃ الحدید کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا تجزیہ اصلاً تو سلسلہ وار درس میں آئے گا' تاہم آغاز میں اس کے مضامین کا ایک اجمالی تجزیہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

اس کا پہلا حصہ چھ آیات پر مشتمل ہے۔ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے بیان پر یہ چھ آیتیں میرے علم کی حد تک قرآن حکیم کا جامع ترین مقام ہے۔اور یہی وہ اصل علم ہے جس کو ''العلم'' کہا جائے گا' اس لیے کہ دین کی جڑ بنیاد ایمان ہے اور ہم حقیقتِ ایمان پر بڑی مفصل بحثیں کر چکے ہیں۔[1] اگرچہ ایمانیات میں تعدّد ہے' اللہ پر ایمان' آخرت پر ایمان' رسالت پر ایمان' کتابوں پر ایمان' فرشتوں پر ایمان' لیکن اصل ایمان ''ایمان باللہ'' ہے۔اسی لیے ایمان مجمل میں صرف ایمان باللہ ہی کا ذکر ہے:

'' آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ''.

چنانچہ مجملاً ایمان نام ہے ایمان باللہ کا۔اور ایمان باللہ کا خلاصہ کیا ہے؟ اللہ کی معرفت! اور اُس کی معرفت ذات وصفات کے حوالے سے ہوگی۔ جامعیت کے اعتبار سے اور فہم وشعور کی اعلیٰ ترین سطح (Highest level of consciousness) پر ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کا بیان ان چھ آیات میں ہے جو سورۃ الحدید کے شروع میں وارد ہوئی ہیں۔اس کی کچھ جھلک ہمیں سورۃ التغابن میں ملتی ہے' کچھ جھلک مکی سورتوں میں اور پھر سورۃ الشوریٰ میں ملتی ہے' لیکن اس ضمن میں جامع ترین اور بلندترین بحث ان چھ آیتوں میں ہے۔

سورۃ الحدید کا دوسرا حصہ پانچ آیات (۷تا۱۱) پر مشتمل ہے۔ یہاں بھی جامعیت کی انتہا ہے کہ دین کے کُل تقاضے صرف دو الفاظ ''ایمان'' اور ''اِنفاق'' کے حوالے سے آ گئے ہیں:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ۝﴾

یعنی اگر تم یہ دونوں تقاضے پورے کرتے ہو تو تمہارے لیے اجرِ کبیر ہے۔اور اگر نہیں کرتے ہو تو پھر ملامت ہے' زجر ہے اور ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ہے کہ: ﴿وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ۚ﴾ ''تمہیں کیا ہو

(۱) جواب ''حقیقت ایمان'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں رکھتے!'' کیوں تمہارا اعتماد اور توکل اللہ کی ذات پر قائم نہیں ہے؟ ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے!'' تم اپنا مال اللہ کے راستے میں کیوں نہیں کھپاتے' کیوں نہیں لگاتے؟

تیسرا حصہ چار آیات (۱۲ تا ۱۵) پر مشتمل ہے جس میں اس تقسیم کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو میدانِ حشر میں ہو جائے گی۔ جن لوگوں نے بھی اس معاملے (ایمان اور انفاق) میں گریز کی راہ اختیار کی تھی وہ منافق قرار پائیں گے اور اہل ایمان سے اس طرح الگ کر دیے جائیں گے جیسے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ میدانِ حشر میں ایک خاص مرحلہ ایسا ہے کہ جس میں مؤمنین صادقین اور منافقین میں تقسیم ہو جائے گی۔ ایک تقسیم تو مسلمان اور کافر کی ہے' جبکہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں پھر تفریق ہو گی کہ کون مؤمنین صادقین ہیں اور کون منافقین! مؤمنین صادقین کو اُن کے قلبی ایمان کی گہرائی کی نسبت سے نور عطا کیا جائے گا' جو کسی کو کم اور کسی کو زیادہ ملے گا۔ حضورﷺ نے خبر دی ہے کہ اس نور میں اتنا فرق و تفاوت ہو گا کہ کسی کو اتنا نور ملے گا کہ جیسے اس کی روشنی مدینہ منورہ سے صنعاء تک پہنچ جائے اور کسی کو اتنا نور ملے گا کہ جس سے صرف اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے۔ اس کی سادہ سی مثال ٹارچ کی ہے۔ اگر اندھیری رات میں آپ کسی پگڈنڈی پر چل رہے ہوں اور آپ کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ ہو تو وہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اس روز جو نور انبیاءِ کرام علیہم السلام کو ملے گا یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عطا ہو گا اُس کا تو کیا ہی کہنا ہے! ظاہر ہے کہ اس نور میں اور ایک عام مسلمان کے نور میں بہت فرق و تفاوت ہو گا۔ بہرحال جن کے دلوں میں کچھ بھی ایمان ہو گا وہ ایک طرف اور جو ایمان سے بالکل خالی ہوں گے' یعنی منافق' وہ دوسری طرف ہو جائیں گے اور ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ پھر اسی ضمن میں نفاق کی حقیقت اور نفاق کے مختلف مراحل بھی اسی حصے میں بیان ہوئے ہیں کہ کیسے یہ مرض آگے بڑھتا ہے۔ اس ضمن میں یہ جامع ترین مقام ہے۔

سورۂ مبارکہ کا چوتھا حصّہ بھی چار آیات (۱۶ تا ۱۹) پر مشتمل ہے۔ اس میں اصلاح کی ترغیب دی گئی ہے اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ اگر تم اپنے باطن میں جھانکو اور محسوس کرو کہ ایمانِ حقیقی موجود نہیں ہے تو بھی گھبراؤ نہیں' ابھی مہلت ہے' کمر ہمت کسو اور اصلاحِ احوال کی کوشش کرو' ایمان کے حصول کی کوشش کرو۔ اس کے لیے راستہ اور طریقہ بھی بتا دیا گیا۔ یوں سمجھئے کہ ان چند آیات میں ''سلوکِ

قرآنی'' جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

پھر پانچواں حصّہ پانچ آیات (۲۰ تا ۲۴) پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ اُخروی کا تقابل آیا ہے اور انسانی زندگی کے مختلف مراحل یعنی بچپن' اس کے بعد نوجوانی اور پھر جوانی کا دَور' پھر ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپا' ان کو بڑی خوبصورت تمثیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ہر انسان کو بہرحال ان مراحل سے گزر کر لامحالہ قبر میں جا اترنا ہے۔ یہ زندگی ان مراحل سے گزر کر بہرحال ختم ہو جائے گی اور ایک ابدی زندگی آخرت کی ہے' جس میں انسان کو دو انجاموں میں سے کسی ایک انجام سے دوچار ہونا ہے۔ اس اعتبار سے حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ اُخروی کا تقابل آ گیا۔ اور پھر یہ کہ حیاتِ دُنیوی میں انسان کو جو کچھ مصائب اور ناگوار حالات سے سابقہ پیش آتا ہے' اس کی اصل حقیقت کھول کر دکھائی گئی۔

اس سورۂ مبارکہ کا چھٹا حصّہ صرف ایک آیت پر مشتمل ہے اور وہ ہے آیت ۲۵' جس کے بارے میں میرا یہ قول بہت سے احباب کے علم میں پہلے سے ہوگا کہ پوری دنیا کے تمام انقلابی لٹریچر میں اتنا ''عریاں'' انقلابی جملہ آپ کو نہیں مل سکتا جو سورۃ الحدید کی اس آیت میں ہے۔ یہاں اس انقلابِ عظیم اور اس کے تمام مراحل کا ذکر ہے جو قرآن برپا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے انبیاء کو بھیجا' کتابیں نازل کیں' شریعت اتاری اور پھر یہ میزان نازل فرمائی' آخر کس لیے؟ اس لیے تاکہ عدل اور انصاف قائم ہو۔ اب عدل و انصاف کو قائم کرنے کے لیے انقلاب لانا پڑے گا۔ اس کے لیے جہاں ترغیب ہے' تشویق ہے' دعوت ہے' تعلیم ہے' وہاں لوہے کی طاقت بھی استعمال کرنی پڑے گی۔ ﴿وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اتارا''۔ اسی آیت کے حوالے سے اس سورت کا نام سورۃ الحدید ہے۔ طاقت کے بغیر کبھی بھی نظام نہیں بدلا کرتا۔ اس کے بغیر عدل و انصاف قائم نہیں ہوسکتا۔ طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے' جانیں دینی پڑتی ہیں۔ اور درحقیقت اللہ تعالیٰ اپنے ان جان نثار بندوں کا امتحان لے رہا ہے جو ایمان کے دعوے دار ہیں کہ آیا وہ اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر اور لوہے کی قوت ہاتھ میں لے کر میدان میں آتے ہیں یا نہیں! کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بات بالکل واضح کر دی گئی کہ انقلابی عمل میں لوہے کی طاقت بھی استعمال کرنی پڑے گی' اس کے بغیر vested interest کبھی بھی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دلیل سے قائل ہو جاتے ہیں۔ ایسے سلیم الفطرت لوگ ہر معاشرے اور ہر طبقے میں ہوتے ہیں' لیکن بحیثیت مجموعی ہر نظام

میں مستکبرین اور مترفین پر مشتمل جو مراعات یافتہ طبقہ ہوتا ہے وہ کسی صورت اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا' اس کے لیے طاقت کا استعمال لازمی ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کا ساتواں اور آخری حصّہ چار آیات (۲۶ تا ۲۹) پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں جہاد و قتال اور انقلاب کے اینٹی کلائمکس یعنی رہبانیت کا ذکر ہے ؎

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو' اللہ ہو' اللہ ہو!

اس رہبانیت کی نفی بھی کر دی گئی ہے کہ اگرچہ کچھ نیک دل لوگ اِدھر راغب ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ راستہ جس پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے وفادار بندے چلیں' وہ رہبانیت کا راستہ نہیں ہے۔

سورۃ الحدید سے میری ذہنی و قلبی مناسبت

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں اپنا ایک تأثر تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ بالکل آغاز میں جبکہ ابھی میں اپنے اس مشن کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا' اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سورۂ مبارکہ کے حوالے سے خصوصی انشراح عطا فرمایا تھا اور اس سے مجھے ایک خصوصی ذہنی و قلبی نسبت اور مناسبت عطا فرما دی تھی۔ یہ میں ۵۷۔۱۹۵۶ء کی بات کر رہا ہوں۔ اُس وقت سے میں مختلف مواقع پر اس کے دروس دیتا رہا ہوں۔

۱۹۵۸ء کا ذکر ہے کہ میں نے کراچی کی ایک محفل میں سورۃ الحدید کا درس دیا۔ اس محفل میں میرے اعزہ میں سے ایک صاحب موجود تھے جو مجھ سے عمر میں بڑے ہیں' ان کی جماعت اسلامی کی رکنیت قبل از تقسیم ہند سے ہے۔ اس سے پہلے وہ علماءِ دیوبند میں سے خاص طور پر تھانوی حلقے سے وابستہ تھے۔ گویا کہ مذہبی اور دینی مزاج شروع سے ہے۔ انہوں نے جب میرا درس سنا تو اُس وقت کہا تھا کہ آپ کو اللہ نے قرآن مجید کے ساتھ جو مناسبت عطا کی ہے اس کے پیشِ نظر آپ میڈیکل پریکٹس اور دوسرے سارے دھندے چھوڑیں اور اب صرف دین کے پڑھنے اور پڑھانے میں لگ جائیں' آپ کے سارے اخراجات میرے ذمہ رہیں گے۔ بہرحال میں نے تو اس بات کو اُس وقت ہنس کر ٹال دیا تھا' لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اصل میں انسان کو قرآن مجید کی جو نعمت بھی ملتی ہے وہ محض پڑھنے پڑھانے سے نہیں ملتی' بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قرآن حکیم کی جو تھوڑی بہت سمجھ دے دی

ہوا ُس پر وہ عمل کر رہا ہوتو پھر اس پر مزید دروازے کھلتے ہیں اور فہم قرآن کے کچھ اور پہلو منکشف ہوتے ہیں‘ پھر آدمی جب اپنے عمل میں اضافہ کرتا ہے تو پھر اور چیزیں سامنے آتی ہیں۔ اس طرح یہ درجہ بدرجہ انکشاف ہوتا ہے۔

مولانا مودودی مرحوم نے تفہیم القرآن کے مقدمہ میں بڑی پیاری بات لکھی ہے کہ قرآن مجید ایسی کتاب نہیں ہے جسے کوئی شخص اپنی لائبریری میں آرام کرسی پر بیٹھ کر لغت کی کتابوں اور ریفرنس بکس کی مدد سے سمجھ لے۔ قرآن اپنے آپ کو اس طور سے reveal کرتا ہی نہیں۔ وہ تو آپ کو جس جدوجہد میں لگانا چاہتا ہے اس میں آپ بالفعل لگ جایئے اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کا مطالعہ بھی کرتے رہیے اور اس کا درس بھی دیتے رہیے‘ تو واقعہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ پھر یہ گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور نئے نئے مضامین کا انکشاف ہوتا ہے۔ گویا ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے!

میرے بہت سے احباب نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ آپ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں۔ میں نے ان سے صاف صاف کہا ہے کہ میرا یہ مقام ہی نہیں ہے۔ آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ مقام نہیں ہے۔ البتہ سورۃ الحدید کے بارے میں میرے دل میں ایک آرزو پوشیدہ ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ موقع دے دے تو میں اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو اور جو بھی اس کے مختلف حقائق ودقائق مجھ پر منکشف ہوئے ہیں‘ قلم بند کر دوں۔ آپ بھی دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے اس کی توفیق عطا فرمائیں!

تمہیدی امور میں سے آخری بات یہ کہ مجھے اس سورۂ مبارکہ کے درس کے آغاز کے موقع پر ایک خوف بھی محسوس ہو رہا ہے‘ اور یہ خوف دو اعتبارات سے ہے‘ ایک تو طوالت کا خوف ہے کہ ہوسکتا ہے بات بڑھتی چلی جائے۔ میں حتی الامکان کوشش کروں گا کہ بات ایک حد تک رہے اور میری کوشش یہی ہوگی کہ بارہ نشستوں میں اس سورۂ مبارکہ کی تکمیل ہو جائے‘ لیکن میں اس کا یقین نہیں رکھتا‘ اللہ تعالیٰ جو چاہے گا وہی ہوگا۔ مزید برآں مجھ پر اس کی عظمت کا رعب بھی ہے‘ خاص طور پر اس کے پہلے حصے کو بیان کرنا واقعتاً آسان کام نہیں ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انشراح عطا فرمائیں! اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار درس شروع کر رہے ہیں۔
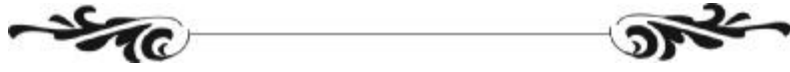
درس 25

ذات وصفات باری تعالیٰ کا بیان
جامع ترین انداز
اور بلند ترین علمی
اور فلسفیانہ سطح پر

سُوْرَةُ الْحَدِيْد کی آیت ۱ تا ۶ کی روشنی میں!

درس ۲۵

ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کا بیان

جامع ترین انداز اور بلند ترین علمی اور فلسفیانہ سطح پر

سورۃ الحدید کی آیت ۱ تا ۲ کی روشنی میں

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱﴾ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۚ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲﴾ ھُوَالۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالۡبَاطِنُ ۚ وَھُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳﴾ ھُوَالَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا یَخۡرُجُ مِنۡھَا وَمَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعۡرُجُ فِیۡھَا ؕ وَھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۴﴾ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۵﴾ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّھَارِ وَیُوۡلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیۡلِ ؕ وَھُوَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۶﴾﴾

پہلی آیت ۔ تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم

سورۃ الحدید کا پہلا حصہ ابتدائی چھ آیات پر مشتمل ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا آغاز اِن پُرشکوہ الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے''۔ اس کا پہلا لفظ ''سَبَّــــحَ'' ہے۔ اس لفظ پر گفتگو اگرچہ سورۃ الصّف' سورۃ الجمعہ اور سورۃ التغابن کے ضمن میں ہو چکی ہے' لیکن بہرحال اب جبکہ ہم اس کا مطالعہ کر رہے ہیں تو میں تیزی کے ساتھ چند باتیں دہرا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا ترجمہ ہم کرتے ہیں ''اللہ کی تسبیح کرتی ہے' پاکی بیان کرتی ہے ہر شے جو آسمان اور زمین میں ہے''۔ لیکن جان لینا چاہیے کہ لغوی طور پر لفظ ''سَبَّحَ'' کا مفہوم کیا ہے! سَبَحَ یَسْبَحُ عربی زبان میں آتا ہے کسی شے کے تیرنے کے لیے۔ تیرنا پانی میں بھی ہو سکتا ہے' ہوا میں بھی اور خلا میں بھی۔ یعنی کوئی شے اپنی سطح پر برقرار رہے' نیچے نہ گرے۔ اگر پانی کی سطح پر ہے تو گویا کہ وہ تیر رہی ہے' اگر نیچے جائے گی تو ڈوب جائے گی۔ اسی طرح کوئی شے اگر خلا میں یا فضا میں حرکت کر رہی ہے' لیکن اپنے مدار پر برقرار ہے' اپنی سطح پر قائم ہے تو یہ ہے سَبَحَ یَسْبَحُ یعنی تیرنا۔ یہ فعل لازم ہے۔ اس سے باب تفعیل میں ''سَبَّحَ یُسَبِّحُ'' آتا ہے' یعنی کسی شے کو تیرانا۔ یہاں پر اب یہ فعل متعدی بن گیا۔ کسی شے کو اس کی اصل جگہ پر' اس کی سطح پر برقرار رکھنا' اسے نیچے نہ گرانا یا نیچے نہ گرنے دینا۔ یہ اس لفظ کا لغوی مفہوم ہے۔

اللہ کی تسبیح کے کیا معنی ہیں؟ اللہ کا جو مقامِ بلند ہے' اسے اس پر برقرار رکھا جائے۔ کوئی ایسا تصور اُس کی ذات یا صفات کے ساتھ شامل نہ ہو جائے جو اُس کے شایانِ شان نہ ہو اور اس کے مقام سے فروتر ہو۔ اللہ کو اس کے اصل مقامِ رفیع پر برقرار رکھنا اللہ کی تسبیح ہے۔ اس کو اب ہم اس طور سے بیان کرتے ہیں کہ تسبیح سے مراد یہ کہنا ہے کہ اللہ پاک ہے' اعلیٰ ہے' ارفع ہے' ہر عیب سے مبرّا ہے' منزّہ ہے' نہ اس میں کسی اعتبار سے کوئی عیب ہے نہ کسی لحاظ سے کوئی نقص ہے۔ نقص اور عیب میں یہ فرق ہے کہ عیب وہ شے ہے جو کہ ناپسندیدہ ہے اور نقص صرف کمی کا نام ہے۔ نہ کسی اعتبار سے اسے کوئی احتیاج لاحق ہے' جس کو ہم اپنی زبان میں کہیں گے کہ اس کی کَنّی کسی سے دبتی نہیں ہے' وہ مستغنی ہے' اس کو کسی کی کوئی احتیاج نہیں۔ تو اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر احتیاج سے' ہر عیب سے' ہر نقص سے' ہر کوتاہی سے اعلیٰ' ارفع' منزّہ اور مبرّا ہے' یہ تسبیح ہے۔

تسبیح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تسبیحِ قولی ہے۔ جو ہم کہتے ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ' سُبْحَانَ رَبِّیَ

الْعَظِيْمِ، سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى، یہ تسبیحِ قولی ہے۔ یعنی زبان سے اللہ کی پاکی کا اور اللہ کے ہر اعتبار سے ایک ہستی کامل ہونے کا اقرار کرنا۔ جبکہ ایک تسبیحِ حالی ہے کہ کائنات کی ہر شے گویا اپنے وجود سے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے کہ میرا خالق، میرا صانع، میرا ڈیزائنر، میرا Creator ایک ہستی کامل ہے کہ جس کے علم میں، قدرت میں، حکمت میں کہیں کوئی کمی نہیں۔ اس لیے کہ تصویر حقیقت میں اپنے مصور کے کمالِ فن یا نقصِ فن کا مُنہ بولتا ثبوت ہوتی ہے۔ اگر اس کے فن میں کوئی کمی ہے تو اس کی غمازی بھی تصویر کر دے گی۔ اور اگر اس کا فن کمال پر ہے، نقطۂ عروج پر ہے تو بھی اس کی تصویر زبانِ حال سے بول رہی ہوگی۔ تو یہ کُل کائنات اس معنی میں اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔

تسبیحِ حالی کا یہ مفہوم تو بالکل سمجھ میں آ جاتا ہے، لیکن قرآن مجید کے بعض مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو کوئی زبان بھی دے رکھی ہے جس سے وہ اُس کی تسبیح کر رہی ہے۔ یہ بات اگرچہ ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن ایک تو قرآن مجید میں صراحت سے مذکور ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام حمد کے ترانے الاپتے تھے تو اس میں پہاڑ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے اور پرندے بھی شامل ہو جاتے تھے۔ یہ قرآن مجید کی نصِ قطعی ہے۔ مزید برآں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں ارشاد ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَـهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ﴾ ''اللہ کی تسبیح تو ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان آسمانوں اور زمین میں ہے، سب کر رہے ہیں''۔ اب یہ تو مثبت پہلو ہوا، منفی طور پر پھر فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰـكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ''نہیں ہے کوئی شے مگر وہ تسبیح کر رہی ہے اس کی تحمید کے ساتھ، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے''۔ تو تسبیحِ حالی تو ہماری سمجھ میں آ رہی ہے، معلوم ہوا کہ کائنات کی ہر شے تسبیحِ قولی میں بھی مشغول ہے۔

قرآن مجید کے ایک اور مقام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو قیامت کے دن لوگوں کے اعضاء کو بھی زبان دے دے گا، اور ان کے ہاتھ، ان کے کان، ان کی آنکھیں، ان کے اپنے اعضاء و جوارح اور ان کی اپنی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔ اور جب وہ کہیں گے: ﴿لِمَ شَهِـدْتُّمْ عَلَيْـنَا﴾ ''(ہمارے اپنے اعضاء ہو کر) تم ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہو؟'' تو یہ اعضاء و جوارح جو جواب دیں گے قرآن مجید میں وہ قول نقل ہوا ہے: ﴿قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ۲۱) ''وہ کہیں گے کہ آج ہمیں بھی نطق اور گویائی عطا فرما دی ہے اللہ نے جس نے ہر شے کو نطق اور گویائی عطا فرمائی ہے''۔

یہ مختلف مقامات ہیں جن کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے کو اللہ نے کوئی زبان بھی دی ہوئی ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ حیوانات کی اپنی زبان ہے' آخر وہ ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ آخر ایسے جانور بھی ہیں جو کالونیاں بنا کر مل جل کر رہتے ہیں' ان کا پورا نظام ہے' ان کا پورا کا پورا سِوِک (civic) سسٹم ہے' چاہے چیونٹیاں ہوں یا شہد کی مکھیاں ہوں' تو کیسے ممکن ہے کہ ان کی باہم گفتگو نہ ہوتی ہو! تو اس اعتبار سے یہ تسبیح' تسبیحِ حالی بھی ہے اور تسبیحِ قولی بھی۔

یہاں ''سَبَّحَ'' صیغۂ ماضی ہے۔ اس کے بعد دو اور سورتوں یعنی سورۃ الحشر اور سورۃ الصّف میں یہ لفظ اسی طرح آیا ہے' لیکن پھر سلسلۂ مُسَبِّحات کی آخری دو سورتوں (الجمعہ اور التغابن) میں یہ لفظ مضارع کے صیغے ''یُسَبِّحُ'' میں ڈھل گیا۔ ''یُسَبِّحُ'' کا لفظ ایک بار سورۃ الحشر کے اختتام پر بھی آیا ہے۔ اس طرح ان سورتوں میں تسبیح کا ذکر تین مرتبہ فعل ماضی میں ہوا اور تین ہی مرتبہ فعل مضارع میں۔

قرآن مجید ''مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' یعنی ''آسمانوں اور زمین میں'' کے الفاظ کُل کائنات کی تعبیر کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ہم فلسفیانہ زبان میں اس کے لیے کون و مکاں' کُل کائنات' The Total Universe جیسے مختلف الفاظ استعمال کریں گے' لیکن قرآن مجید نے اپنا اسلوب بہت سادہ رکھا ہے' کیونکہ اس کے مخاطبِ اوّل ایک ایسی قوم کے افراد تھے کہ جن کے ہاں پڑھنے لکھنے کا کوئی رواج نہیں تھا' فلسفہ اور منطق تو ان کے لیے بہت ہی بعید شے تھی۔ اس حوالے سے قرآن نے وہ انداز اختیار کیا جو فطرت کے بالکل قریب ترین اور سادہ ترین انداز ہے۔ چنانچہ آپ کو قرآن مجید میں کہیں کائنات کا لفظ نہیں ملے گا' جب بھی قرآن کُل کون و مکاں کہنا چاہتا ہے ''مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے' تاکہ ایک عام بدو بھی اس کو سمجھ لے' لیکن اس سے مراد کُل کائنات ہے' جس کے لیے ہم اگر زیادہ فلسفیانہ لفظ استعمال کریں تو ''کون و مکاں'' ہے' یعنی یہ جو بھی ٹائم اینڈ سپیس کمپلیکس (Time & Space Complex) موجود ہے اس میں ہر شے اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے۔

اختیارِ مطلق اور حکمتِ کاملہ

آیت کے آخری ٹکڑے پر غور کیجیے: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ ''اور وہ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں اسماء اِن سورتوں میں بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۃ الصّف کے شروع میں بھی آئے' سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت کا اختتام بھی ان دونوں اسماء کے ساتھ ہوا۔ سورۃ الحشر تو اس اعتبار سے بہت عجیب ہے کہ اس کے آغاز میں بھی تسبیح ہے' آخر میں بھی تسبیح ہے۔ پہلی

آیت کے الفاظ ہیں: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝﴾ اورآخری آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہو رہا ہے: ﴿یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝﴾ یعنی پہلی اور آخری دونوں آیتوں کے آخری الفاظ ''وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ'' ہیں۔ اسی طرح سورۃ التغابن کا اختتام بھی انہی الفاظ پر ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اَسماء وصفات جو قرآن مجید کی اکثر آیات کے آخر میں آتے ہیں' یعنی جن پر آیات کا اختتام ہوتا ہے' بالعموم جوڑوں کی صورت میں آتے ہیں' جیسے وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ، وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ، وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۔تو یہ مختلف جوڑے آپ کو ملیں گے۔ یہ اگر الف لام کے ساتھ ہوں تو اسماء شمار ہوں گے اور بغیر الف لام کے' تنوین کے ساتھ ہوں' جیسے غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تو صفات شمار ہوں گے۔تو یہاں فرمایا: ﴿وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾ ''وہ زبردست ہے' حکیم ہے''۔

ان دونوں اسماء کی باہم مناسبت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کو جوڑا گیا ہے تو کسی مناسبت کی وجہ سے جوڑا گیا ہے۔ ان دونوں اسماء میں بہت گہرا ربط ہے۔ ''عزیز'' کہتے ہیں ایسی ہستی کو جس کا اختیار مطلق ہو' جس کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو' آخری اختیار اُس کے پاس ہو۔ لفظ ''حکیم'' کے دو مفہوم ہیں۔ ''ح ک م'' مادہ سے لفظ حکمت بھی بنا ہے اور اسی سے حکومت اور حاکم بھی بنا ہے' تو لفظِ حکیم اپنے اندر بہت سے معنی رکھتا ہے۔ لیکن یہاں پر عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے: حکمت والا' دانا۔ ہمارے عام مشاہدے اور انسان کے عمومی تصور سے یہ بات سامنے آتی ہے' خاص طور پر پولیٹیکل سائنس میں یہ بحث بڑی تفصیل کے ساتھ آتی ہے کہ جہاں بھی اختیار ہوگا اس کے ناجائز استعمال کا احتمال ہوگا۔

> *"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."*

یہی وجہ ہے کہ دستور سازی میں سب سے اہم اور سب سے پیچیدہ مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ جہاں کوئی اتھارٹی ہو وہاں کوئی روک تھام اور احتساب کا نظام بھی ہونا چاہیے' ورنہ یہ کہ اگر صاحبِ اختیار بدعنوان ہو جائے' جہاں کسی کی ذات میں زیادہ اختیارات مرکوز ہو جائیں اور اس کے دماغ کے اندر خناس پیدا ہو جائے تو وہ لامحالہ ان اختیارات کا ناجائز استعمال کرے گا۔ لہٰذا checks & balances ہونے چاہئیں۔ چنانچہ مملکتوں کے جو دستور بنتے ہیں ان میں سب سے نازک مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ اختیارات میں ایک توازن ہو' بیلنس ہو' اور جہاں اختیار ہو وہیں پر کوئی احتساب کا نظام بھی

موجود ہو۔لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے اس تصور سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اس کا اختیارِ مطلق حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ البتہ جہاں وہ اختیارِ مطلق کا مالک ہے وہیں الحکیم بھی ہے' اس کی حکمت بھی کامل ہے۔اس کا اختیارِ مطلق الل ٹپ استعمال نہیں ہوتا' حکمتِ کاملہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔کسی زمانے میں تو میں اس مفہوم کو ادا کرنے میں ذرا غیر محتاط الفاظ استعمال کر جاتا تھا کہ ''اس کا اقتدار اس کی حکمت کے تابع ہے''۔ یا یہ کہ ''اس کا اختیارِ مطلق حکمت کاملہ کے تحت استعمال ہوتا ہے''۔لیکن یہ الفاظ ہمیں استعمال نہیں کرنے چاہئیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اپنی جگہ پر مطلق ہیں' کوئی صفت کسی دوسری صفت کے تابع نہیں ہے۔اس لیے کہ جو تابع ہوئی وہ پھر مطلق نہ رہی' بلکہ محدود ہوگئی۔اس لیے یہاں تعبیر کا بہتر انداز یہ ہوگا کہ جہاں اس کے اندر اختیارات کا ارتکاز ہے اس کے ساتھ ہی حکمت کاملہ بھی موجود ہے۔تو اس کا اختیار حکمت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یہ ہے درحقیقت ان دونوں اسماء میں باہمی ربط۔

اُمت مسلمہ کی سب سے بڑی ذمہ داری

ان سورتوں (مُسَبِّحات) میں خطاب اُمت مسلمہ سے ہے اور اُمت مسلمہ کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسا سیاسی نظام یعنی نظامِ حکومت قائم کریں جس میں اللہ تعالیٰ کا دین بتمام وکمال قائم ہو جائے۔اسی حوالے سے ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے ان دو اسماء (اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ) کو بار بار لایا گیا ہے۔اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ ان چھ آیات میں دو مرتبہ یہ الفاظ آ رہے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے''۔یہ الفاظ دوسری آیت میں بھی آئے ہیں اور پھر چھٹی آیت میں بھی۔ درحقیقت اللہ کی بادشاہت کا یہ تصور ہمارے دورِ زوال میں مسلمانوں کے ذہنوں سے نکل گیا۔عقائد اور عبادات کی اہمیت تو پیش نظر رہی لیکن اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظام قائم کرنے کا تصور خلافت راشدہ کے بعد رفتہ رفتہ ذہنوں سے محو ہوتا گیا۔ اس لیے کہ جب خلافت ختم ہوئی تو ملوکیت کا آغاز ہو گیا۔ اُس وقت اللہ کی حاکمیت کے قیام کے لیے کچھ کوششیں ہوئیں' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوشش کی' حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کوشش کی' اس کے بعد اس سلسلے میں کئی اور کوششیں ہوئیں' لیکن یہ سب کوششیں دُنیوی اعتبار سے ناکام ہوگئیں' اگرچہ یہ سب لوگ اپنی جگہ پر اُخروی اعتبار سے کامیاب ہیں۔ جب یہ تمام کوششیں ناکام ہوگئیں تو مسلمانوں نے ذہناً تسلیم کر لیا کہ اب یہ حکومت اور ریاست کا معاملہ تو عصبیت کے بل پر چلے گا۔کوئی قبائلی عصبیت

مضبوط ہے تو وہ قبیلہ آ کر حکومت کر لے گا۔ کوئی شہنشاہ بابر آئے گا اور ہندوستان کے تخت پر متمکن ہو جائے گا اور اس طرح مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑ جائے گی۔ یہ چیزیں تو قبائلی عصبیت اور قوت کی بنیاد پر تسلیم کر لی گئیں، تو اس کے نیچے نیچے اب دین کیا رہ گیا؟ اب دین میں عقائد ہیں، عبادات ہیں اور کچھ نکاح وطلاق کے مسائل ہیں، اللہ اللہ خیر صلاّ۔

دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد نظامِ حکومت میں جو تبدیلی آ چکی تھی اس کا اندازہ ذرا صحیح بخاری کی اس حدیث سے کیجیے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں: ''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کیے۔ ان میں سے ایک برتن سے تو میں نے خوب تقسیم کیا، لیکن اگر دوسرے برتن کا مُنہ بھی کھول دوں تو میری گردن اڑا دی جائے گی''۔ اور حضرت ابوہریرہؓ کا تو ۵۹ھ میں انتقال بھی ہو گیا تھا جبکہ ابھی حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت تھی۔ گویا ابھی ننگی ملوکیت کا دَور تو آیا بھی نہیں تھا۔ حضرت معاویہؓ کے دورِ حکومت کو اگرچہ ہم دورِ خلافت راشدہ میں شامل نہیں سمجھتے، لیکن آپؓ بہرحال صحابیٔ رسولؐ ہیں، کاتبِ وحی ہیں، اپنی ذات کے اعتبار سے ایک صحابی کی حیثیت سے جو اُن کا منصب ہے اس پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ اس کے باوجود اُن کے دورِ حکومت میں نظام کی تبدیلی اس درجے آ چکی تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ کہہ رہے ہیں کہ اگر میں دوسرے برتن کا مُنہ بھی کھول دوں تو میری گردن اڑا دی جائے گی۔

اس کے بعد تو معاملہ یہاں تک پہنچا کہ رفتہ رفتہ اللہ کی حکومت کا تصور ہی مسلمانوں کے ذہن سے نکل گیا اور دین کا تصور صرف یہ رہ گیا کہ اللہ کو ایک مانو، اللہ کے لیے نماز پڑھو، اللہ کے لیے روزے رکھو، اللہ کے لیے حج کرو۔ یہ ساری چیزیں تو برقرار رہیں مگر اللہ کی حکومت کو قائم کرنا ہمارے ذہنوں سے نکل گیا۔ لیکن ان سورتوں میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اسماء ''اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' بار بار لائے جا رہے ہیں۔ اور ''اَلْحَکِیْمُ'' کا دوسرا مفہوم ذہن میں رکھیے تو اس کے معنی حاکم کے ہو جائیں گے۔ گویا العزیز بھی حاکم، الحکیم بھی حاکم۔ حاکم اور حکیم میں وہی نسبت ہو گی جو عالم اور علیم میں ہے۔ عالم اسم فاعل ہے، علیم اسی سے صفتِ مشبّہ ہے۔ اسم فاعل میں کوئی فعل وقتی طور پر ہوتا ہے اور اگر وہی فعل کسی کے اندر دائم ہو جائے تو پھر وہ صفت مشبّہ بن جاتا ہے۔ عالم: کسی شے کا جاننے والا اور علیم: جس میں یہ صفت مستقل اور پائیدار ہو گئی ہو۔ اسی طرح حاکم وہ ہے جس کی حکومت قائم ہے، اور حکیم جس کی حکومت میں دوام ہے،

(۱) صحیح بخاری کتاب العلم، باب حفظ العلم ص ٤٥٦

استقلال ہے' ہمیشگی ہے' پائیداری ہے۔ تو اس اعتبار سے یہ دونوں الفاظ مترادف ہو جائیں گے اور ''وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' کا مفہوم ہوگا کہ وہ زبردست ہے اور وہ حاکمِ حقیقی ہے۔

اقتدار واختیار اللہ کا

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۲﴾

''اسی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی' وہ زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے' اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

آیت کے آغاز میں جو حرفِ جار ''ل'' آیا ہے یہ عربی میں بہت سے معنوں میں آتا ہے' لیکن ایسے مقامات پر یہ اکثر و بیشتر دو معنوں کا حامل ہوتا ہے۔ یہ لام تملیک کے لیے بھی ہوسکتا ہے اور استحقاق کے لیے بھی۔ تملیک کا مفہوم ہے ''کسی شے کا مالک ہونا'' جیسے ھٰذَا الْقَلَمُ لِیْ ''یہ قلم میرا ہے'' یعنی میں اس کا مالک ہوں' یہ میری ملکیت ہے۔ اور استحقاق یہ ہے کہ کسی کو اُس کا حق پہنچتا ہو۔ اسی کو آپ انگریزی میں کہتے ہیں: de facto & de jure۔ چنانچہ ﴿لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کا مفہوم ہوگا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت اور بادشاہی de facto بھی اسی کی ہے اور

de jure بھی اسی کی ہے۔ اسی کو حاکمیت کا حق پہنچتا ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک ہو اور بالفعل بھی وہی مالک ہے۔

اب دیکھئے کہ یہ لفظ ''ملك'' بھی دونوں معنی دیتا ہے۔ ''م ل ک'' ہی سے ملکیت اور مالک ہے' اور اسی سے مُلک ہے' یعنی حکومت' بادشاہی۔ اسی لیے سورۃ الفاتحہ کی قراءت میں بھی ''مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' اور ''مَلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' دونوں قراءتیں موجود ہیں۔ ''مَلِک'' بادشاہ ہے اور ''مَالِک'' کسی شے کی ملکیت کا حق رکھنے والا۔ اور دونوں میں منطقی ربط یہی ہے کہ جو کسی شے کا مالک ہے اسی کو اختیار حاصل ہے کہ اسی کی مرضی کے مطابق اس میں تصرف ہو۔ اس پہلو سے اللہ کی بادشاہی ''مُلک یا ملوکیت'' اور اللہ کی ملکیت دونوں باہم لازم وملزوم ہیں۔ اور ''لَہٗ'' میں یہ دونوں پہلو ہیں۔

دورِ حاضر کا سب سے بڑا شرک

میں اپنے ''خطباتِ خلافت'' اور دیگر خطابات میں یہ بات بڑی تفصیل سے واضح کر چکا ہوں کہ غیر

اللہ کی حاکمیت کا تصور اِس دَور کا سب سے بڑا شرک ہے۔ بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے۔ اور اسی کی بہترین تعبیر علامہ اقبال نے اس طرح کی ہے ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی ' باقی بتانِ آزری!

چاہے وہ فردِ واحد ہو' جو فرعون یا نمرود بن گیا ہو اور چاہے وہ حاکمیت جمہور کا تصور ہو۔ یہ بات سمجھانے کے لیے میں نے بارہا یہ تمثیل دی ہے کہ گندگی کی کوئی ٹنوں وزنی گٹھری خواہ ایک شخص کے سر پر رکھی ہو اور خواہ اسے تولہ تولہ' ماشہ ماشہ تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے' گندگی تو گندگی رہے گی۔ فرعونیت اور نمرودیت یہ تھی کہ ایک فرد اقتدارِ اعلیٰ کا مدعی تھا۔ فرعون نے کہا تھا: ﴿اَلَيۡسَ لِىۡ مُلۡكُ مِصۡرَ وَهٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِىۡ﴾ (الزخرف:۵۱) ''کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟'' یعنی یہ آب پاشی اور آب رسانی کا سارا نظام میرے اختیار میں ہے' جس کو چاہوں پانی دوں' جس کا چاہوں موگہ بند کر دوں۔ یہ تھا فرعون کا دعویٰ جس کو قرآن مجید نے تعبیر کیا کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا: ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى﴾ — لیکن یہی معاملہ آج یہ صورت اختیار کر چکا ہے کہ خدائی کا دعویٰ تقسیم ہو گیا ہے' اسے تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ نظری اعتبار سے سب حاکم ہیں۔ عوام کی حاکمیت (Popular Sovereignty) ہے' لیکن جان لیجیے کہ اسلام کے نزدیک حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ ﴿لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ آسمانوں اور زمین کی حاکمیت کا حق' حکومت کا حق صرف اُسی کو حاصل ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔

انسانی اختیار کی اصل حقیقت

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو تھوڑا سا اختیار دیا ہے اور وہ اسی کے بل بوتے پر حاکم بن کر بیٹھ گیا ہے' حالانکہ اگر آپ حقیقت کے اعتبار سے غور کریں تو معاملہ بالکل وہی نظر آتا ہے جس کو محاورے میں کہا جاتا ہے کہ چوہے کو ہلدی کی گانٹھ مل گئی تھی اور وہ پنساری بن کر بیٹھ گیا تھا۔ کیا حکومت ہے انسان کی! اپنے وجود پر تو اس کا اختیار چل نہیں رہا۔ اس کے اپنے جسم کا پورا نظام اللہ کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ اگر چاہے کہ میرے جسم کے فلاں حصے پر بال نہیں اگنے چاہئیں تو اسے اس کا بھی اختیار نہیں۔ وہ تو اگیں گے' آپ ان کو روک نہیں سکتے۔ آپ کی انتڑیوں کے اندر حرکت آپ کے

اختیار میں نہیں ہے' وہ تو کوئی اور ہی قانون ہے' کسی اور ہی کی مرضی ہے جس کے تحت ان میں حرکت ہوگی۔ آپ کا دل آپ کے اختیار میں نہیں ہے' جب بند ہو جائے گا تو پھر آپ کی مرضی سے دھڑ کنے والا نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ہمارا اپنا پورا وجود اسی قانونِ خداوندی کے اندر جکڑا ہوا ہے۔ اذنِ ربّ کے بغیر پتا تک نہیں ہلتا۔ ہمارے اپنے وجود کے اندر بھی پورے کا پورا نظام اسی قانون کے شکنجے میں ہے۔ لیکن اللہ نے بس ایک اختیار دے رکھا ہے: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ یعنی چاہو تو شکر گزاری کی راہ اختیار کرو اور چاہو تو ناشکری کی روش اختیار کرو۔ یہ اسی کی دی ہوئی آزادی ہے' لیکن ہم نے ہلدی کی اس گانٹھ کے برتے پر اپنی بادشاہی کا تخت جما لیا ہے۔

ملحدین کے تصورِ موت وحیات کی تردید

آگے فرمایا: ﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾ ''وہی زندہ رکھتا ہے اور مارتا ہے۔'' نوٹ کیجیے کہ زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے' اگر میں یہ کہتا ہوں ''ہم مرتے ہیں' ہم جیتے ہیں۔'' گویا کہ موت اور زندگی کی نسبت ہم اپنی طرف کر رہے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ محجوبیت ہے' یعنی ہم پردے میں آ گئے' اوٹ میں آ گئے' اور یہی گمراہی ہے' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے اور وہ جب چاہے گا ہم پر موت وارد کر دے گا۔ یہ کمالِ معرفت ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے ''مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد'' اسی طرح ہدایت میں اور ضلالت میں فرق صرف اتنا ہی ہے کہ ''اللہ جلاتا ہے' اللہ مارتا ہے'' اور ''ہم جیتے ہیں' ہم مرتے ہیں''۔ چنانچہ قرآن مجید میں کفار و مشرکین کا ایک قول نقل ہوا ہے' جسے ہم کہیں گے کہ یہ آج کے مادہ پرست ملحد انسان کا موقف ہے۔ فرمایا: ﴿وَقَالُوْا مَاهِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجاثیۃ: ۲۴) ''اور انہوں نے کہا زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے' ہم خود ہی جیتے اور خود ہی مرتے ہیں اور ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ''۔ یہاں ''نَمُوْتُ وَنَحْيَا'' میں نسبت اپنی طرف ہے کہ ہم جیتے ہیں' ہم مرتے ہیں۔ اگر نسبت بدل کر یہ کہا جائے کہ ﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾ ''وہی زندہ کرتا ہے (یا زندہ رکھتا ہے) اور وہی موت وارد کرتا ہے'' تو اس فعل کی نسبت اللہ کی طرف ہوگئی اور یہی ہدایت ہے' یہی معرفت ہے' یہی توحید ہے۔

آیت کے آخر پر فرمایا: ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ''اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔''

مؤمن کا مطلوب و مقصود۔معرفتِ ربّ

میں نے عرض کیا تھا کہ معرفتِ الٰہی ہی درحقیقت انسان کی سب سے زیادہ مطلوب و مقصود شے ہونی چاہیے'اس لیے کہ جتنی معرفت ہوگی اتنا ہی درحقیقت ہمارا عملی رویہّ بھی درست ہوگا۔ جتنا اللہ کی عظمت کا انکشاف ہو جائے گا اتنی ہی ہمارے اندر اللہ کے سامنے فروتنی اور سرافگندی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی ۔کسی شاعر نے کہا ہے ع ''ان کا غرور دیکھ کر بن گئے خاکسار ہم!'' یہاں لفظ ''غرور'' تو مناسب نہیں' ''ان کا عروج دیکھ کر'' کہہ لیجیے۔ جتنا اللہ کی عظمت کا انکشاف ہوگا اتنا ہی انسان کے اندر تواضع' فروتنی اور گردن جھکا دینے کی کیفیت پیدا ہوگی۔اس اعتبار سے اصل شے جو مطلوب و مقصود کے درجے میں ہے وہ معرفت ربّ ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں بہت سے مفسرین اور صوفیاء نے ''عبادتِ ربّ'' اور ''معرفتِ ربّ'' کو مترادف قرار دیا ہے۔چنانچہ وہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ کی جو تفسیر کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْرِفُوْنِ'' یعنی ''میں نے نہیں پیدا کیا ہے انسانوں کو اور جنوں کو مگر اس لیے کہ میری معرفت حاصل کریں''۔اس لیے کہ معرفت حاصل ہو جائے گی تو اس کا منطقی نتیجہ عبادت کی صورت میں نکلے گا۔اگر کسی شخص کو اللہ کے حسن و جمال کی کوئی جھلک کبھی نصیب ہو جائے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی اور کے حسن کا گرویدہ ہو! کسی اور کی محبت اس کے دل میں کیسے گھر کرے گی! ابن سینا کا ایک بڑا پیارا جملہ ہے ''اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات میں سے تمہیں کوئی حصہ ملے تو تمہیں اپنی خلوتوں میں ریاضت کرنی پڑے گی' توجہ کرنی ہوگی' لو لگانی ہوگی' مراقبے کرنے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کبھی کوئی کرن تمہیں بھی نصیب ہو جائے''۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان کو کبھی حقیقی معرفتِ ربّ کی کوئی چمک اور اس کی کوئی جھلک اگر مل جائے تو پھر اس کے لیے کسی اور سے دل لگانے اور کسی اور کی محبت میں گرفتار ہونے کا کوئی سوال نہیں۔تو اس معنی میں ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ اور ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْرِفُوْنِ'' میں کوئی فرق نہیں ہے۔معرفت حقیقی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اسی کی محبت میں گرفتار ہیں' اسی کی رضاجوئی میں اپنی پوری زندگی صرف کر دیں گے' اسی کی یاد سے آپ کے دل کو راحت اور سکون و اطمینان نصیب ہوگا۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾.

اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ضمن میں اب ایک بات اور نوٹ کیجیے۔معرفتِ ربّ کو دو حصوں میں تقسیم

کیجیے' ایک معرفتِ ذات اور ایک معرفتِ صفات۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا کوئی تصور کسی انسان کے لیے قطعاً ممکن نہیں۔ یہ ہمارے لیے out of bounds ہے۔ اس پر سے پردہ آخرت میں اٹھے گا۔ چنانچہ آخری نعمت جو اہل جنت کو نصیب ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا۔ گویا حور و قصور اور جنت کی جنتی نعمتوں کا بھی تذکرہ ہے' ان سب سے کہیں بڑھ کر اور آخری شے اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ بہرحال معرفتِ ذات ہمارے لیے ناممکن ہے' ہم اُس کی ذات کی کنہہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس ضمن میں ایک بات کہی تھی' اور وہ چونکہ شعریت میں ڈھلا ہوا جملہ تھا' لہٰذا اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گرہ لگا کر شعر بنا دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی طرف یہ قول منسوب ہے: ''**العجز عن درك الذات ادراكٌ** '' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہو جانے کا جب انسان کو احساس ہو جائے تو یہی ادراک ہے۔ یعنی معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد! یہی درحقیقت علم ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کی ذات کا کوئی تصور' کوئی تخیل اور کوئی فہم ہمارے لیے ممکن نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے مذکورہ بالا قول پر حضرت علیؓ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: ''**والبحث عن كنه الذات اشراكٌ** '' یعنی اللہ کی ذات میں اگر کھوج کرید کرو گے تو کہیں نہ کہیں شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس لیے کہ جب کھوج کرید کرو گے تو جو تمہارا اپنا ذہنی تصور ہے اس کا کوئی نہ کوئی ہیولا قائم کرو گے' اور وہ اللہ تو نہیں ہے' اللہ تو تمہارے تصور سے ماوراء ہے' تم نے کوئی تصور قائم کیا تو تم نے گویا خود اپنا ایک خدا بنا لیا' اور یہی تو شرک ہے۔ ایک بُت تراش نے جو بُت بنایا ہے تو اپنے خیال میں تو خدا بنایا ہے' مگر بُت کو وہ اپنے خیال کے مطابق ایک انسانی صورت دے رہا ہے۔ اس پر بُت اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

مرا بر صورتِ خویش آفریدی	برونِ خویشتن آخر چہ دیدی؟

یعنی تُو نے تو ایک خدا بنانا چاہا تھا' لیکن تو نے اپنی ہی شکل میں مجھے بھی ڈھال دیا۔ تیرے دو ہاتھ تھے' میرے بھی دو ہاتھ بنا دیے' تیرے دو پاؤں تھے' تو نے میرے بھی دو پاؤں بنا دیے' تیری دو آنکھیں تھیں' تو نے میری بھی دو آنکھیں بنا دیں۔ تو نے اپنے سے باہر بھی کچھ دیکھا؟ تو واقعہ یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں بھی یہ اعتراف کہ وہ ہماری رسائی سے ماوراء' وراء الوراء' ثم وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہے' یہی علم اور معرفت ہے۔ خاص طور پر حضرت مجددِ الف ثانیؒ کے جو مکاتیب یعنی خطوط ہیں ان مکتوباتِ شریفہ میں یہ الفاظ بار بار آتے ہیں۔ اس لیے کہ واقعتاً تصوف کے وہ گوشے جو اِس کھوج کرید کی طرف لے جاتے ہیں' وہ گمراہی اور شرک کی طرف لے جاتے ہیں' جبکہ **والبحث عن**

کنه الذات اشراکٌ۔

اب رہ گیا ہمارے پاس صرف ایک معاملہ کہ ہم اللہ کو صرف اس کے اسماء وصفات کے حوالے سے پہچان سکتے ہیں۔ اسماء بھی درحقیقت اللہ کے صفاتی نام ہیں۔ یہ بحث ہم سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں کیا کرتے ہیں کہ ایک رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ''اللہ'' ہے اور باقی تمام کے تمام اسماء صفاتی ہیں۔ رحیمٌ صفت ہے' جبکہ الرحیم اس کا ایک نام بن گیا۔ اسی طرح علیمٌ صفت ہے' العلیم اس کا نام ہو گیا۔ قادرٌ صفت ہے اور القادر اس کا نام ہو گیا۔ چنانچہ تمام اسماءِ حسنیٰ صفاتی نام ہیں' بلکہ میری رائے تو ان حضرات کے ساتھ ہے جو ''اللہ'' کو بھی صفاتی نام سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اِلٰـــــہٌ سے ''الالٰـہ'' اور اس سے ''اللہ'' بنا ہے۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کے تمام کے تمام اسماء صفاتی ہیں۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی معرفت کا جو بھی خزانہ ہے یا اس کا جو بھی ذریعہ ہے وہ صرف اسماء و صفات ہیں۔ چنانچہ ایمان مجمل کے الفاظ یاد کیجیے: آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ ''میں ایمان لایا اللہ پر (میں نے مانا اللہ کو) جیسا کہ وہ اپنے اسماء وصفات سے ظاہر ہے''۔ یہی ایمان باللہ ہے۔ باقی اُس کی ذات سے کوئی بحث نہیں۔

صفاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت وکمیت؟

اب تیسرے درجے میں ایک بات اور ہے۔ اللہ کی صفات کی بھی ہم نہ تو کمیت کو جانتے ہیں نہ کیفیت کو۔ یہ ہمارے علم اور فہم کی محدودیت ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اللہ قادر ہے —— لیکن کتنا قادر ہے؟ ہمارے ذہن کے اندر اس کا کوئی تصور نہیں آ سکتا' اس لیے کہ سنار کی ترازو ماشے تولے ہی تول سکتی ہے' ٹنوں کا وزن نہیں تول سکتی۔ چنانچہ اللہ کی قدرتِ مطلق کا ہمارا ذہن کیا تصور کر سکتا ہے؟ اسی طرح ہم یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ''البصیر'' ہے' دیکھنے والا ہے' وہ ''السّمیع'' ہے' سننے والا ہے۔ لیکن وہ کیسے سنتا ہے' یہ ہم نہیں جانتے۔ کیا اس کے کوئی کان ہیں؟ معاذ اللہ! کیا وہ ہماری طرح sound waves کا محتاج ہے کہ waves آ کر کان کے پردے سے ٹکرائیں تو کچھ سنائی دے گا؟ معاذ اللہ! تو وہ کیسے سنتا ہے؟ دیکھنے کے لیے کیا وہ کسی روشنی کا محتاج ہے کہ اس کے ذریعے آنکھ کے پردے (retina) کے اوپر جا کر عکس بنتا ہے؟ معاذ اللہ! تو وہ کیسے دیکھتا ہے؟ نہ ہم کمیت جان سکتے ہیں' اس لیے کہ وہ تو ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ وہ علیم ہے تو کتنا علیم ہے؟ کتنا علم ہے اس کا؟ ہم کیسے ناپیں گے' کیسے تولیں گے؟ پھر وہی بات کہوں گا کہ سنار والی ترازو پر یہ ٹنوں وزن کیسے تولا جائے گا! اس

حوالے سے یہ ہماری درماندگی ہے۔قرآن کریم ہماری اس درماندگی کا علاج لفظ''کُل'' سے کرتا ہے۔ ﴿وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾. ہمارے پاس اس کے سوا کوئی لفظ ہے ہی نہیں کہ ''وہ ہر شے پر قادر ہے''۔اور آگے چل کر آئے گا: ﴿وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ''وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے''۔بس''ہر'' کے لفظ میں یا''کُل'' کے لفظ میں پناہ لینے کے سوا ہمارے پاس کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔نہ ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اس کی قدرت کتنی ہے' نہ ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اس کی قدرت کی کیا کیفیت ہے۔اس کا علم کتنا ہے؟ ہم نہیں جان سکتے۔اس کے علم کی نوعیت کیا ہے؟ معاذ اللہ' ہم کیا جانیں!

زیرِ مطالعہ آیت کے اختتام پر الفاظ آئے ہیں: ﴿وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲﴾﴾ اور اس سے اگلی آیت ان الفاظ پر ختم ہو رہی ہے: ﴿وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳﴾﴾ اور ان دو صفات (علم اور قدرت) کو یوں کہنا چاہیے کہ یہ''اُمّ الصفات'' ہیں۔اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماءِ صفتِ علم ہی سے متعلق ہیں۔مثلاً اللہ تعالیٰ خبیر ہے' سمیع ہے' بصیر ہے۔اور یہ سب علم ہی کے تو شعبے ہیں۔اسی طرح القابض' الباسط' الرافع' الخافض' یہ سب درحقیقت''وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' ہی کی تو شرح ہیں۔بس ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی شے کے بارے میں اگر ہمارے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو جائے کہ اللہ یہ کیسے کرے گا؟ تو معلوم ہوا کہ''وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' پر ہمارا ایمان نہیں ہے۔اس کی قدرت تو مطلق ہے' boundless اور limitless ہے۔کوئی شے اس کے لیے مشکل نہیں۔اسی طرح ہر شے اس کے علم میں ہے۔اور صفتِ علم کو تو آپ دیکھیں گے کہ اگلی آیات میں کیسے دہرا دہرا کر لایا گیا ہے: ﴿یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ط وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۴﴾﴾ یہ وہی اس کی صفتِ علم ہی تو چلی آ رہی ہے اور ﴿وَھُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۶﴾﴾ میں بھی اسی صفتِ علم ہی کا تو تذکرہ ہو رہا ہے۔

انہی دو صفات (علم اور قدرت) کے حوالے سے جان لیجیے کہ ایمانیات میں تقدیر پر ایمان ((وَاَنْ تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ)) درحقیقت انہی دونوں صفات پر ایمان کا منطقی نتیجہ ہے۔اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔اب اگر میں یہ سمجھوں کہ میں اس پیالے کو اللہ کے اِذن کے بغیر اٹھا سکتا ہوں تو گویا میں نے اپنی قدرت کو اللہ کی قدرت کے مقابلے میں لا کھڑا کر دیا اور یہی شرک ہو جائے گا۔میں نے ارادہ ضرور کیا ہے کہ اس پیالے کو اٹھا لوں' لیکن جب تک اذنِ ربّ نہ ہو' اس کی توفیق اور اس کی تیسیر نہ ہو' میں اسے نہیں اٹھا سکتا۔گویا کہ اللہ کی قدرت تمام قدرتوں کے اوپر محیط ہے' حاوی ہے' ان کے اوپر مستولی ہے'

چھائی ہوئی ہے۔اسی طرح کل مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔وہ عالمِ ما کان وما یکون ہے۔ ہر شے اس کے علم میں ہے۔اس کے لیے ماضی‘ حال‘ مستقبل ہے ہی نہیں ۔ یہ زمانے تو ہمارے لیے ہیں‘اس کا علم تو بسیط ہے۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چونکہ جو کچھ میں کل کرنے والا ہوں وہ اللہ کے علم میں ہے ‘لہٰذا میں مجبور ہوں کہ وہ کروں۔ یہ جبر و قدر کی بحث ہے‘اس کو علیحدہ کر لیجیے۔ یہ اُس کا Pre-knowledge ہے‘ جو Pre-determination کو مستلزم نہیں ہے۔ اللہ ہر شے کو جانتا ہے اور ہمیشہ سے جانتا ہے۔ ہر شے جو ہونے والی ہے وہ اُس کے علم کامل کے اندر ازل سے موجود ہے‘ لیکن اس کے معنی جبر کے نہیں ہیں‘ لہٰذا Pre-Determination کو Pre-Knowledge سے علیحدہ کر لیجیے۔ عام طور پر ذہنوں کے اندر جو اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ان دونوں چیزوں کو لازم وملزوم سمجھ لیا جاتا ہے۔

تیسری آیت — مشکل ترین مقام

سورۃ الحدید کی تیسری آیت قرآن حکیم کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے۔ ذات وصفات باری تعالیٰ کی بحث یہاں اعلیٰ ترین علمی سطح پر آئی ہے۔فرمایا:

﴿هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝۳﴾

’’وہی ہے اوّل (پہلا) اور وہی ہے آخر (پچھلا)‘ وہی ہے ظاہر (انتہائی نمایاں بھی اور غالب بھی) اور وہی ہے باطن (انتہائی مخفی اور چھپا ہوا)۔‘‘

یہ آیت مبارکہ ہے جس کے بارے میں امام رازی کی پوری بحث کا تفصیل سے مطالعہ کیا جائے تو واقعتاً محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس آیت کی عظمت کے سامنے کھڑے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔اور انہوں نے الفاظ بھی ایسے پیارے لکھے ہیں: ’’**اِعۡلَمۡ اَنّ هٰذَا المَقام مقامٌ غامضٌ عمیقٌ مهیبٌ**‘‘۔یعنی ’’جان لو کہ یہ مقام بڑا غامض ہے‘ عمیق ہے‘ مہیب ہے‘‘۔ اس کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔اس آیت کے مفہوم و معنی پر تو ان شاء اللہ اگلی نشست میں بحث ہوگی۔اس وقت میں چاہتا ہوں کہ اس سے متعلق چند بنیادی باتیں آپ ذہن نشین کر لیں۔ یہ درحقیقت فلسفۂ وجود سے متعلق آیت ہے اور فلسفے کا سب سے مشکل مسئلہ ماہیّتِ وجود ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ماہیّتِ زمان اور ماہیّتِ وجود‘ یہی فلسفے کے دو ایسے مسئلے ہیں جو لاینحل ہیں اور مشکل ترین ہیں اور چونکہ بہت سے حضرات کو اس کا ذوق نہیں ہوتا لہٰذا وہ اس موضوع پر گفتگو کو بھی وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔لیکن چونکہ یہ الفاظ قرآن

میں آئے ہیں' لہٰذا ان پر غور وفکر ضروری ہے۔قرآن مجید صرف عوام کے لیے ہدایت نہیں ہے' خواص کو بھی تو ہدایت یہیں سے ملے گی اور جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عقل ودیعت ہوئی ہے وہ جاننا چاہتے ہیں کہ کائنات کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وجود کی حقیقت کیا ہے؟ وجود کی ماہیّت کیا ہے؟ یہ سوالات ہیں جن پر انسان غور کرتا چلا آ رہا ہے' اور اس بارے میں مختلف آراء بنی ہیں' مختلف فلسفے وجود میں آئے ہیں' جن میں وحدت الشہود بھی ہے' وحدت الوجود بھی ہے' پھر ثنویت بھی ہے اور تثلیث بھی ہے۔اس پر تو بعد میں گفتگو ہوگی' اس وقت جو بات میں نوٹ کرانا چاہتا ہوں وہ صرف ظاہری الفاظ کے حوالے سے ہے۔

تین امتیازی فرق

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اسماء عام طور پر جوڑوں کی شکل میں آتے ہیں ۔جیسے وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ' اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔اس ضمن میں صرف تین استثناءات ہیں اور وہ تینوں انہی سورتوں میں ہیں۔یہاں چار اسماء اکٹھے آ رہے ہیں: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ ۔اسی طرح سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت میں بھی چار اسماء اکٹھے آئے ہیں :﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ ۔ تیسرا استثناء سورۃ الحشر کی آخری تین آیات ہیں' جن میں سے درمیانی آیت تو یوں سمجھئے کہ قرآن مجید میں اسماء باری تعالیٰ کا عظیم ترین اور حسین ترین گلدستہ ہے:﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ یہاں آٹھ اسماء تسلسل کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔

دوسرا فرق یہ نوٹ کیجیے کہ عام طور پر اسماء باری تعالیٰ آیات کے آخر میں آتے ہیں' لیکن یہاں آیت کی اصل جو main body ہے وہ درحقیقت انہی اسماء پر مشتمل ہے۔اس کی کوئی اور مثال قرآن مجید میں نہیں ہے۔

تیسرا فرق جو اہم ترین ہے' وہ نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید میں اس ایک مقام کے سوا کہیں بھی اسماءِ باری تعالیٰ کے درمیان حرفِ عطف نہیں آیا۔سورۃ الحشر کی مذکورہ بالا آیت میں آٹھ اسماءِ حسنیٰ آئے ہیں لیکن درمیان میں کہیں حرفِ عطف نہیں ہے' کوئی فصل نہیں ہے' ''اَلْمَلِكُ وَالْقُدُّوْسُ'' نہیں ہے۔قرآن مجید میں ہر جگہ ''وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' ہی آیا ہے' کہیں ''وَهُوَ الْعَزِيْزُ وَالْحَكِيْمُ'' نہیں آیا۔مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے بڑی پیاری بات کہی ہے۔

جیسے کہ میں نے ایک بات عرض کی تھی کہ اللہ کے تمام اسماء وصفات مطلق ہیں' کوئی کسی کا تابع نہیں' ایسے ہی دوسری بات نوٹ کر لیجیے جو مولانا فراہیؒ نے لکھی ہے کہ اللہ کی تمام صفات اس کی ذات میں بیک وقت موجود ہیں' جبکہ واؤ باہم فصل کر دیتا ہے' واؤ سے تو مغائرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نحو کا قاعدہ ہے کہ عطف، معطوف اور معطوف الیہ میں مغائرت کا سبب بنتا ہے۔ اور دنیا میں ہم یہ جانتے ہیں کہ صفات عموماً جمع نہیں ہوتیں۔ ایک شخص ایک ہی وقت میں منتقم اور غفور تو نہیں ہوسکتا۔ یہ کیفیات تو مختلف ہوں گی۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں یہ تمام شانیں بیک وقت اور بتمام وکمال موجود ہیں۔ اسی لیے کہیں فصل نہیں ہے' کہیں حرفِ عطف نہیں لایا گیا' سوائے اس مقام کے۔

اسماء باری تعالیٰ کے ضمن میں اس آیت مبارکہ میں بقیہ تمام قرآن مجید سے یہ تین امتیازی فرق ہیں' ان کو نوٹ کر لیجیے۔ باقی اس آیت مبارکہ پر مفصل گفتگو ان شاء اللہ آگے آئے گی!

تکملۂ مباحث

گزشتہ نشست میں اگرچہ ہماری گفتگو تیسری آیت تک پہنچ گئی تھی لیکن پہلی دونوں آیتوں کے بارے میں بھی بعض اہم باتیں رہ گئی تھیں۔ آج ہمیں پہلے ان کا قرض ادا کرنا ہے' پھر آگے بڑھنا ہے۔

پہلی آیت مبارکہ جو اِس سورۃ کا ''مطلع'' ہے' اس میں یہ بحث تو مکمل ہوگئی کہ سَبَّحَ یُسَبِّحُ اور سَبِّحَ یُسَبِّحُ کا لغوی مفہوم کیا ہے اور اللہ کی تسبیح سے کیا مراد ہے۔ پھر یہ کہ یہ تسبیح قولی بھی ہے اور حالی بھی' اور قرآن حکیم میں یہ فعل مضارع میں بھی آئی ہے اور فعل ماضی میں بھی۔ گویا اس کائنات کی ہر شے ہر آن اللہ کی تسبیح کر رہی ہے' ہمیشہ سے کرتی چلی آ رہی ہے اور ہمیشہ کرتی رہے گی۔ یہ مضمون تو سامنے آ گیا' لیکن غور کرنا ہوگا کہ اس مضمون کی اہمیت کیا ہے؟ اس قدر اہتمام اور شدّ ومد کے ساتھ پانچ سورتوں کے آغاز میں جو یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے' اس کا کیا سبب ہے؟

جان لیجیے کہ اصل میں یہ الفاظ حصولِ معرفتِ ربّ کے ذریعے اور طریقے پر بحث کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' انسان کے لیے اللہ کی معرفت ہی اصل مطلوب ومقصود ہے' جب صحیح معرفت حاصل ہو جائے گی تو اس کا ظہور اعمال سے خود بخود ہونا شروع ہو جائے گا اور انسان حق عبادت بھی ادا کر سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ معرفت کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

اللہ کی معرفت کے حصول کے دو راستے ہیں:

(۱) عقلی اور منطقی راستہ (Rational Approach)

(۲) قلب اور روح کے ذریعے اللہ کو پہچاننا (Mystic Approach)

اگرچہ ہمارے صوفیاء کا اصل میدان تو مؤخر الذکر ذریعہ ہی ہے، لیکن قرآن مجید نے اسے زیادہ نمایاں نہیں کیا، اگرچہ اس کو تسلیم کیا ہے اور اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا ایک عام اسلوب ہے کہ بعض چیزوں پر زیادہ زور دیتا ہے اور انہیں زیادہ نمایاں کرتا ہے اور بعض سے وہ سرسری طور پر گزرتا ہے۔ اس میں بھی یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے اور کوئی سبق مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اور تمہارے وجود میں بھی (ہماری نشانیاں ہیں)، کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟'' کبھی اپنے باطن میں جھانکو تو سہی! اقبال نے اس کی تعبیر اس طرح کی ہے ع ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!''

حقیقت کا ادراک اور معرفتِ ربّ انسان اپنے باطن سے کر سکتا ہے۔ اسی کے لیے meditation اور مراقبے ہیں۔ صوفیاء نے جو راستے اختیار کیے ان کو قرآن نے اصولاً مانا ہے۔ ایک حدیث، جو اگرچہ محدثین کے نزدیک مستند نہیں ہے، مگر صوفیاء اسے تسلیم کرتے ہیں، اس میں یہ مضمون اس طرح آیا ہے: ((مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ)) ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا''۔ اور قرآن مجید میں یہ مفہوم موجود ہے۔ اسی سلسلۂ سُوَر میں یعنی سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں ہے کہ:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۹)

''اور تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تب اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

گویا اللہ کی معرفت کا نتیجہ معرفتِ نفس ہے۔ اپنے آپ کو بھی انسان تبھی پہچانے گا اگر اللہ کو پہچانے گا۔ اسی کا عکس (converse) یہ ہے کہ اگر آپ اپنے آپ کو پہچانیں گے تو اللہ کو پہچانیں گے۔ گویا یہ بات دونوں طرف سے صحیح ہے۔ اس لیے کہ روحِ انسانی کا ذاتِ باری تعالیٰ سے ایک خاص ربط و تعلق ہے جس کے لیے قریب ترین تمثیل یا تشبیہہ یہ ہے کہ سورج اور اس کی شعاعیں کروڑوں میل کا سفر کر کے زمین تک پہنچ رہی ہیں، بلکہ آگے بھی نامعلوم کہاں تک جاتی ہیں، لیکن ہر شعاع کا تعلق سورج کے ساتھ برقرار ہے۔ تو ارواحِ انسانیہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک ربط و تعلق رکھے ہوئے ہیں۔ گویا اللہ کو پہچاننے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی روح کی گہرائیوں اور پہنائیوں

میں غور وفکر کرے۔

تاہم جیسا کہ میں نے عرض کیا' قرآن مجید میں معرفت ربّ کے عقلی ومنطقی ذریعے کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ لیکن پھر استدلال اور منطق کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱) استخراجی منطق (Deductive Logic): اس میں آدمی ایک ایک قدم آگے بڑھا کر دلیل کے حوالے سے فہم وشعور حاصل کرتا ہے۔

۲) استقرائی منطق (Inductive Logic): اس میں انسان کائنات میں موجود تنوّع کے بارے میں اپنے مشاہدات جمع کرتا ہے اور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ قرآن مجید نے induction ہی کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ہر شے کو اللہ کی آیت قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾ (آل عمران)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ہوش مند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔''

یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں پوری تفصیل کے ساتھ آیا ہے:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرۃ)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے' پھر اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے' ہواؤں کی گردش میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' ان لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یہ استقراء ہے۔ اقبال نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے: ؎

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

ہمارے متکلمین اور فلاسفہ کا طریقہ استخراجی منطق (Deductive Logic) کا تھا اور اب اس کا دور گزر چکا۔ چونکہ سائنس کی بنیاد بھی استقراء (induction) ہے لہٰذا اسی کے حوالے سے اقبال نے اپنے لیکچرز میں کہا ہے کہ ''عہد حاضر کے سائنٹیفک کلچر کا Inner Core قرآنی ہے''۔ اس لیے کہ قرآن مشاہدے کی دعوت دیتا ہے:

﴿اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ﴿۱۷﴾ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ﴿۱۸﴾ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ﴿۱۹﴾ وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ ﴿۲۰﴾﴾ (الغاشیة)

''بھلا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟''

یہ تمام اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان مشاہدات کے ذریعے معرفتِ ربّ حاصل کرو۔ قرآن مجید میں اصل زور آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی کے مشاہدے پر ہے:

﴿سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ﴾

(حٰمٓ السجدة:۵۳)

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔''

اس لیے کہ حضور ﷺ کے زمانے کے بعد Scientific Era شروع ہونے والا تھا۔ (سائنس کی موجودہ ترقی کوئی بہت قدیم نہیں ہے' بلکہ دو تین سو برس کے اندر ہی یہ بہت بڑا دھماکہ ہوا ہے) ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید اس سائنسی دَور کا فاتح ہے کہ اس نے انسانوں کو غور وفکر کی دعوت دی ہے:

﴿وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۶﴾﴾ (بنی اسراء یل)

''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ' کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔''

یعنی تم اپنے موقف کی بنیاد توہّمات پر نہ رکھو' بلکہ عقل سے استدلال کرو' سمع وبصر سے کام لو اور نتیجہ اخذ

کرو۔قرآن مجید میں اس پر جو زور دیا گیا ہے‘ وہ دو وجوہ سے ہے:

۱) عرب جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے‘ ان کا ذوق منطقی اور فلسفیانہ نہیں تھا۔ وہ ایک اُمّی قوم تھی‘ جس میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ قوّتِ کار اور قوّتِ کردار کے مالک تھے۔ خاص طور پر مکہ کے لوگوں کا معاملہ یہ تھا کہ جب تک کوئی دشمن تھا تو جانی دشمن تھا‘ لیکن جب کوئی ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا تھا تو وہی ''وَلِیٌّ حَمِیْمٌ'' بن جاتا تھا۔ ان کے یہاں کسی قسم کی منافقت نہیں تھی‘ بلکہ کردار کی بڑی پختگی تھی کہ جو کہہ رہے ہیں وہی کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ اور منطق ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس حوالے سے بھی قرآن مجید نے Inductive Logic کو نمایاں کیا‘ اور اس اعتبار سے بھی کہ اب Scientific Era کا آغاز ہونا تھا۔

بہرحال قرآن کا ایک اسلوب وہ ہے جو میں نے بیان کیا کہ ہر شے اللہ کی نشانی ہے‘ اسے دیکھو اور اس کے ذریعے اللہ کو پہچانو ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرے ہوشیار
ہر ورقے دفتر است از معرفتِ کردگار

گویا درخت کا ہر پتا اللہ کی معرفت کا دفتر ہے۔ اسی مضمون کو قرآن نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے وجود سے اپنے خالق اور صانع اور موجد کے ایک ہستیٔ کامل ہونے کا اعتراف اور اقرار و اعلان کر رہا ہے اور اسی کے ذریعے سے تم اللہ کی معرفت حاصل کر سکو گے۔ یہ ہے اس مضمون کی اہمیت جو اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں بیان ہوا:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾

دوسری آیت کے مرکزی مضمون (اللہ تعالیٰ کے اختیار و اقتدار) پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ بات دوبارہ نوٹ کر لیجیے کہ یہ بہت اہم مضمون ہے۔ چنانچہ ان چھ آیات میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔ پہلی آیت کا اختتام ہوا: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''وہ غالب‘ حکمت والا ہے''۔ پھر یہ الفاظ ان آیات میں دو مرتبہ آئے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے''۔ اس کے علاوہ آج ہم پڑھیں گے کہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ ''پھر وہ عرش پر متمکن ہوا''۔ یعنی اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد وہ کہیں الگ تھلگ ہو کر نہیں بیٹھ گیا کہ اسے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو‘ جیسا کہ بعض فلاسفہ کا خیال ہے‘ بلکہ وہی ہے جو تختِ حکومت پر متمکن ہے۔ ان چھ

آیات کے اندر چار مرتبہ emphasise کیا گیا کہ اس کائنات کا شہنشاہِ مطلق اللہ ہے اور پوری کائنات میں اسی کی حکومت بالفعل قائم ہے۔ اس وسیع وعریض کائنات کے ایک گوشے میں موجود انسانی زندگی کی اس کائنات کے ساتھ کیا نسبت تناسب بنے گی؟ اور اس میں بھی انسان کی زندگی کا تھوڑا سا حصہ ہے جس میں اسے آزادی (Free Will) دی گئی ہے۔ اور اس ہلدی کی گانٹھ کو لے کر آدمی حاکم (sovereign) بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر بغاوت کرتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ ......﴾ (الروم:۴۱)
''خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔''

اور درحقیقت اس سورۂ مبارکہ میں جو زور دے کر کہا جا رہا ہے کہ لگا دو، خرچ کر دو اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں، تو کس کام کے لیے؟ تاکہ اللہ کی حکومت قائم کی جائے! جسے بائبل کی Lord's Prayer میں اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ:

Thy Kingdom come,
Thy Will be done on earth
as it is in heavens.

یعنی اے ربّ! تیری مرضی جس طرح آسمانوں میں نافذ ہے اسی طرح زمین پر بھی تیری حکومت قائم ہو جائے! یہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے، اسی کا نام اقامتِ دین ہے، اسی کا نام غلبۂ دینِ حق ہے، اسی کا نام تکبیرِ ربّ ہے۔ ان سورتوں میں سارا زور اسی پر ہے کہ ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہی اس لیے ہے کہ اللہ کے دین کو پورے کے پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دے۔ یہی مقصدِ بعثتِ محمدیؐ ہے۔ یہی وہ مقصد ہے (نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنا) جس کے لیے تمام رسول بھیجے گئے۔ اب ظاہر ہے اس کے لیے جان کھپانی ہوگی، مال خرچ کرنا ہوگا، وقت پڑنے پر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنا ہوگا اور گردنیں کٹوانی ہوں گی۔

اب آیئے تیسری آیت کی طرف! جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا یہ فلسفۂ وجود سے بحث کرتی ہے جو کہ فلسفے کا مشکل ترین موضوع ہے۔ اس ضمن میں دو باتیں بنیادی طور پر سمجھ لیجیے۔

ایک یہ کہ قرآن دقیق فلسفیانہ مسائل ضمنی طور پر زیر بحث لاتا ہے اور اُن پر زیادہ بحث نہیں کرتا، لیکن لاتا ضرور ہے۔ اس کے بھی دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہی بات جو پہلے کہی جا چکی ہے کہ قرآن کے

اوّلین مخاطب امّی تھے' لیکن رسول اکرم ﷺ کی بعثت تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے: ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ (سبا:۲۸) ''اور (اے نبیؐ!) ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے''۔ اور نہ صرف آپؐ اپنے دَور کے تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے بلکہ تا قیامِ قیامت آپؐ ہی کا دورِ رسالت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ بنی نوعِ انسان میں ہر طرح کے آدمی ہیں۔ عوام بھی ہیں' خواص بھی ہیں' جاہل بھی ہیں' علماء بھی ہیں' فضلاء بھی ہیں' فلاسفہ بھی ہیں' ہر ذہنی سطح کے لوگ ملیں گے' ہر طرح کی تہذیب اور تمدن سے واسطہ پڑے گا۔ ان سب کی طرف رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ کے تحت جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ ہے کہ پہلے ایک قوم کا انتخاب کیا اور اس کے ذہن' فکر' عمل اور اخلاق و کردار کے اندر ایک عظیم انقلاب برپا کیا اور اسے instrument بنایا کہ اب بقیہ نوعِ انسانی تک یہ پیغامِ رسالت تم پہنچاؤ۔ اس میں ظاہر ہے کہ پہلی مخاطب قوم کی ذہنی سطح کو اگر ملحوظ نہ رکھا جاتا تو یہ پیغام خود اُس قوم کی ذہنی سطح سے بالاتر رہتا۔ اس حوالے سے قرآن مجید کا بڑا حصہ اُس قوم کے عقل وشعور کی سطح کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ البتہ چونکہ قرآن حکیم ہمیشہ کے لیے ہدایت ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے جس میں علماء وحکماء بھی ہوں گے' لہٰذا قرآن حکیم دقیق فلسفیانہ مسائل کو بھی touch کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ بڑے بڑے فلسفیوں کو بھی تو آخر ہدایت یہیں سے نصیب ہونی تھی' بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسے نابغہ عصر کی فکری پیاس بھی آخر اِسی چشمۂ حیواں سے بجھنی تھی' جس نے کہا کہ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی

مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!

مشرق ومغرب کے سارے فلسفے کھنگالنے کے بعد علامہ اقبال کو اگر آسودگی میسر آئی اور اگر سکون نصیب ہوا تو قرآن مجید کے دامن میں۔ چنانچہ اپنے فلسفۂ خودی کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ فلسفۂ قرآن سے اخذ کیا ہے۔ سید نذیر نیازی نے علامہ اقبال سے دریافت کیا تھا کہ آپ کے اس فلسفہ خودی کا ماخذ کیا ہے اور اس اعتبار سے آپ کس مغربی فلسفی کے خوشہ چین ہیں؟ تو علامہ نے ان سے فرمایا کہ کل فلاں وقت آ جانا' میں تمہیں لکھوا دوں گا۔ سید نذیر نیازی یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں میں بہت خوش تھا کہ مجھے یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ شاعر مشرق مجھے اپنے

فلسفۂ خودی کا source لکھوائیں گے۔لیکن جب سید نذیر نیازی علامہ اقبال کی خدمت میں پہنچے تو اقبال نے کہا کہ قرآن مجید نکال لو اور سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ کھول کر کہنے لگے کہ میرے فلسفۂ خودی کا ماخذ یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾

''اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

تو قرآن مجید میں یہ چیزیں بھی موجود ہیں' لیکن ضمنی طور پر آئی ہیں' اس طور سے کہ اس زمانے کا عرب اسے پڑھتے ہوئے ذرا سا تو ٹھٹکے' لیکن اس سے کوئی مفہوم اخذ کر کے آگے نکل جائے' رک نہ جائے' بلکہ گزر جائے۔البتہ کوئی ایسا شخص جس کے ذہن میں فلسفیانہ مسائل ہوں گے وہ جب آئے گا تو رک جائے گا کہ جا ایں جا ست! یہ ہے اصل جگہ۔ وہ اس مقام پر غور کرے گا اور اس کی ہدایت اسے وہاں سے مل جائے گی۔اور ظاہر ہے کہ جو خود فلسفی و حکیم ہے اسے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی' اس کے لیے تو اشارہ کافی ہے' اس کو راہنمائی کے لیے چند الفاظ مل گئے تو اس کی الجھن حل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل قرآن مجید میں موجود تو ہیں' لیکن اس طرح کہ جن لوگوں کا مزاج فلسفیانہ نہیں وہ وہاں سے گزر جائیں گے' لیکن جن کے ذہن میں سوالات ہیں وہ وہاں رک جائیں گے۔اب امام رازی' جو بہت بڑے منطقی' فلسفی اور متکلم ہیں وہ اس مقام پر رک گئے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہتے ہوئے تھر تھر کانپ رہے ہوں:

اِعْلَمْ اَنَّ هذا المقامَ مقامٌ غامضٌ عميقٌ مهيبٌ

''جان لو کہ یہ مقام بڑا عمیق اور گہرا مقام ہے' بڑا پُر ہیبت مقام ہے!''

اور آج کے دَور میں مثلاً مولانا اصلاحی صاحب یہاں سے ایسے گزر گئے جیسے یہاں کچھ ہے ہی نہیں۔اپنی تفسیر کے اندر وہ حدیث کا سہارا بہت کم لیتے ہیں۔ان کا اپنا ذوق اور مزاج تفسیر القرآن بالقرآن کا ہے۔ چنانچہ بعض معاملات میں تو انہوں نے متفق علیہ احادیث کو بھی لائق اعتناء نہیں سمجھا اور اٹھا کر پھینک دیا — لیکن یہاں صرف ایک حدیث کا سہارا لے کر گزر گئے جیسے اس آیہ مبارکہ میں اور کچھ ہے ہی نہیں۔ بہرحال یہ اصولی بات ذہن میں رکھیے کہ قرآن مجید میں دقیق فلسفیانہ مسائل پر مفصل بحث نہیں ہوتی' بلکہ صرف اشارہ ہوتا ہے۔

فلسفۂ وجود اور اس کی مختلف تعبیرات

یہ بات خاص طور پر یہ نوٹ کیجیے کہ فلسفۂ وجود فلسفے کا دقیق ترین مسئلہ ہے' اور اس کے بارے میں مجھے قطعاً یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں فلسفے کا طالب علم ہوں' نہ یہ میرا مقام ہے کہ میں اس پر authoritative انداز میں کوئی گفتگو کر سکوں' لیکن اس کے باوجود مَیں اس پر کیوں گفتگو کرتا ہوں' اسے سمجھ لیجیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر و اسلاف میں سے بہت سے حضرات وحدت الوجود کے قائل ہیں اور عام اہل مذہب کی جو ذہنی سطح ہے وہ وحدت الوجود کو کفر سمجھتے ہیں۔ اس طرح ایک بہت بڑا عقدۂ لاینحل (dilemma) پیدا ہو گیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ابنِ عربی کو تو خیر چھوڑ دیجیے کہ ان کی حیثیت کسی مفسر' محدث یا فقیہہ کی نہیں ہے' اگرچہ مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ جو اُن کے سب سے بڑے ناقد ہیں اور ان کے فلسفے کے جواب میں انہوں نے وحدت الشہود کے نام سے فلسفہ پیش کیا ہے' وہ ابنِ عربی کے علمی اور روحانی مقام کے زبردست قائل ہیں۔ وہ اپنے مکتوبات کے اندر یہ بھی کہتے ہیں کہ میں انہیں (اپنے کشف کے ذریعے) خاصانِ خداوند کے اندر دیکھتا ہوں۔ اور ایک جگہ یہ الفاظ آئے ہیں کہ ''من زَلّہ بردارِ خوانِ ایشانم' لٰـکن چہ کنم مسئلۂ صفاتِ باری تعالیٰ است!'' (میں تو ان کے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑے کھانے والوں میں سے ہوں' لیکن چونکہ معاملہ صفاتِ باری تعالیٰ کا ہے اور مجھے ان سے اختلاف ہے لہٰذا میں اپنا اختلاف پیش کرنے پر مجبور ہوں)۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ کسی کو ابنِ عربی سے سوءِ ظن ہو' کوئی انہیں مرتد سمجھے یا جو چاہے کہے اس سے کوئی بہت بڑا فرق واقع نہیں ہوتا' لیکن شاہ ولی اللہؒ کو اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ مشرک تھے یا مرتد تھے یا ضال اور مُضِل تھے تو یہ بات بڑی تشویش کی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری اور بہت بڑی بڑی شخصیات وحدت الوجود کی قائل ہیں۔ اس حوالے سے میں اپنے درس میں کوشش کیا کرتا ہوں کہ کم سے کم اس درجے تک بات واضح ہو جائے کہ ان حضرات سے سوءِ ظن نہ رہے۔ کوئی فلسفہ ہے' اس سے آپ اختلاف کریں' آپ کو بڑے سے بڑے انسان سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے' لیکن یہ سمجھنا کہ یہ حضرات گمراہی اور کفر میں مبتلا ہو گئے (معاذ اللہ) بہت بڑی غلطی ہے۔ اس طرح تو پھر ہمارے لیے اپنے اسلاف میں کوئی سہارا نہیں رہے گا۔ اس حوالے سے میں اس موضوع پر گفتگو کیا کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ موضوع بہت مشکل ہے اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ خود مجھ پر ایک دہشت کی کیفیت ہے کہ میں اسے بیان کر سکوں گا یا نہیں!

میں اس مسئلہ کو پہلے کچھ مقدمات کے حوالے سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ جہاں تک خالق کی ایک ہستی کا تعلق ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے' یہ فطرتِ انسانی کے اندر نقش ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط﴾ (ابراھیم: ۱۰) ''کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہوسکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟'' معلوم ہوا کہ خدا کو ماننا کہ کوئی خالق ہستی موجود ہے' یہ گویا فطرتِ انسانی کے اندر پہلے سے نقش ہے' اسے ہر انسان مانتا ہے چاہے اسے کوئی نام دے دے۔

Call the rose by any name, it will smell as sweet.

اس ضمن میں عوامی سطح پر لوگوں کی گمراہی یہ رہی ہے کہ جب وہ خالق کی ہستی کا قیاس کرتے ہیں تو اپنے بڑے سے بڑے انسان کے تصور سے اوپر نہیں جاسکتے۔ مثلاً کوئی بہت بڑا شہنشاہ ہے تو اس کے بھی کچھ نائبین سلطنت ہوتے ہیں' اس نے انہیں کچھ نہ کچھ اختیارات دیے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بڑی سے بڑی شخصیت کے کچھ لاڈلے اور پیارے ہوتے ہیں جن کی بات وہ ردّ نہیں کرسکتا۔ یہ تصورات انسان نے اپنے ذہن کے حوالے سے اُس خالق کے ساتھ بھی چسپاں کر دیے ہیں کہ اللہ تو وہی ہے' لیکن آلِھَة بھی ہیں' چھوٹے چھوٹے معبود بھی ہیں۔ ''مہادیو'' تو ایک ہی ہے لیکن دیوتا اور دیویاں بھی ہیں جنہیں اس نے اختیارات دے رکھے ہیں' اس لیے کچھ بندگی اور ڈنڈوت ان کی بھی کروتا کہ وہ بھی راضی ہو جائیں۔ دیوی دیوتاؤں کا تصور اصل میں ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ ملائکہ نورانی مخلوق ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ ﴿یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ ''وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے''۔ قرآن مجید میں حضرت جبرائیلؑ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿لَهٗ مَابَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِكَ ج﴾ (مریم: ٦٤)

''جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے (یعنی ہمارا اپنا وجود) ہر چیز کا مالک وہی ہے''۔

تو یہ اپنے وجود کے بھی مالک نہیں ہیں' یہ بھی اللہ کے اختیارِ مطلق میں ہے۔ یہ ہے درحقیقت وہ تصور جس نے ہمیں شرک سے بچالیا' ورنہ اتنی برگزیدہ ہستیوں کو صاحب اختیار سمجھا جاسکتا تھا۔ قرآن حکیم میں حضرت جبرائیلؑ کی شان میں تو یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۞ ذُوْمِرَّةٍ ط﴾ (النجم: ٥،٦)

''ان (محمد ﷺ) کو زبردست قوت والے (جبرئیلؑ) نے تعلیم دی ہے' جو بڑا صاحب حکمت ہے''۔

دوسری جگہ یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝﴾ (التکویر)

''یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر (جبرئیل علیہ السلام) کا قول ہے جو بڑی طاقت کا مالک ہے' عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے' اس کا حکم مانا جاتا ہے' وہ با اعتماد ہے''۔

اگر ہمارے پاس ان کے اختیار کے بارے میں واضح تعلیمات نہ ہوتیں تو ہم بھی انہیں دیوتا مان سکتے تھے' اور فرشتوں کے بارے میں یہی کچھ ان تمام مذاہب میں ہوا ہے۔ لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس آفاقی کائنات کے کارندے ہیں لیکن ان کا اختیار کوئی نہیں ہے' یہ وہی کچھ کرتے ہیں جن کا حکم اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن مشرکین نے یہ تصور قائم کیا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور عیسائیوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ حضرت مسیحؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔ اس قسم کے تصورات سے شفاعت باطلہ کا تصور پیدا ہوا۔ چنانچہ اس عوامی سطح پر توحید اور معرفت ربّ کے ضمن میں کرنے کا کام یہ ہے کہ واضح کر دیا جائے کہ حاکم مطلق اللہ ہے اور اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے' اُس کی اجازت کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا' وہی تنہا معبودِ حقیقی ہے۔

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق!

اس سے ذرا بلند تر سطح پر آیئے تو وہی اللہ تمہارا مطلوب و مقصود ہونا چاہیے۔ ساری محبتیں اس کی محبت کے تابع ہونی چاہئیں۔ مطلوب اور مقصود کے درجے میں اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ گویا لا الٰہ الاّ اللہ ہی کی تعبیر ہے: **لا معبودَ اِلاَّ اللّٰہ، لا مقصودَ اِلاَّ اللّٰہ، لا مطلوبَ اِلاَّ اللّٰہ اور لا محبوب اِلاَّ اللّٰہ**۔ یہ ہے عوامی سطح پر توحید کا تصور۔ جو انسان یہاں تک پہنچ گیا اس کی توحید کامل ہوگئی۔

ایک اس سے بلند تر سطح ہے جس پر آکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالق کو تو ہم نے مان لیا لیکن اس خالق اور مخلوق (کائنات) میں نسبت کیا ہے؟ یعنی اسے دو حصّوں میں تقسیم کر لیجیے۔

۱) خالق نے اس مخلوق کو کیسے پیدا کیا؟

۲) اب خالق ومخلوق کے درمیان کیا ربط ہے؟ جسے فلسفیانہ اصطلاح میں ''ربط الحادث بالقدیم'' کہا جاتا ہے۔اس قدیم (اللہ) اور حادث (کائنات) میں ربط کیا ہے؟

یہ ہے فلسفۂ وجود کا وہ مسئلہ جس کے اعتبار سے مختلف مکاتیب فکر پیدا ہوئے۔ اس ضمن میں ہمارے ہاں دو بڑے نظریے ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' مشہور ہیں۔لیکن اس سے پہلے جو بڑی گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں اور انسان نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں ان کو سمجھ لیجیے۔ ایک تصور ہندو فلاسفی میں یہ دیا گیا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ایسا ہی ربط ہے جیسے ایک بڑھئی میز بنا دیتا ہے' لیکن بڑھئی کو میز بنانے کے لیے پہلے لکڑی درکار ہے۔یعنی پہلے مادۂ تخلیق موجود ہوگا تب ہی خالق اس سے کوئی چیز بنائے گا۔اب خالق تو ہے پر ماتما' جس نے یہ کائنات تخلیق کی' لیکن مادہ بھی پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں مادہ بھی قدیم ہے اور خدا بھی۔ گویا اب یہ ثنویت ہوگئی کہ خدا اور مادہ (matter) دونوں قدیم ہیں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کا ایک اور مکتبِ فکر ہے جو تین کو قدیم مانتا ہے' یعنی خدا بھی قدیم' مادہ بھی قدیم اور روح بھی قدیم۔ظاہر بات ہے کہ یہ تو بدترین شرک ہے' ہم اس کے بارے میں مزید گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ یہ ''تعددِ قدماء'' کے تصورات کہلاتے ہیں۔

خالق اور مخلوق کے مابین ربط وتعلق کی ایک دوسری شکل بعض لوگوں نے یہ تجویز کی ہے کہ درحقیقت خدا ہی نے اس کائنات کا روپ دھار لیا ہے' جیسے برف پگھل جائے تو پانی بن جاتا ہے۔اب آپ کہیں کہ پانی کہاں سے آیا اور برف کہاں گئی؟ تو دراصل برف ہی پانی ہے اور پانی ہی برف ہے۔چنانچہ اس نظریے کی رو سے یہ کائنات ہی خدا ہے۔ جب خدا ہی نے یہ شکل اختیار کر لی ہے تو گویا ہر شے خدا ہے اور ہر شے الوہیت کی حامل ہے۔اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا؟ یہ ہمہ اوست یا Pantheism کا نظریہ ہے۔

اب اس سے بھی آگے نکل آیئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خالق ومخلوق کے درمیان ساری نسبتیں جو ہماری عقل میں آ رہی ہیں یہ قابل قبول نہیں ہیں تو پھر ایک ہی وجود ماننا پڑتا ہے جو خالق کا وجود ہے۔ اس نظریہ کو ''توحید وجودی'' کہا جاتا ہے۔اس کی بہترین تعبیر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''الدّین القیّم'' میں کی ہے' جو اس آیۂ مبارکہ کی بہترین تعبیر ہے' کہ خالق اور مخلوق میں نسبت کو یوں سمجھو کہ کسی شے کا تصور اپنے ذہن میں قائم کرو۔فرض کریں آپ نے تاج محل دیکھا ہے' اب آپ

تاج محل کا تصور اپنے ذہن میں لائیے۔ آپ کے ذہن میں یہ تصور آپ کی توجہ سے قائم ہے۔ جب تک آپ کی توجہ مرکوز رہے گی یہ تصور ذہن میں رہے گا' جیسے ہی توجہ ہٹے گی اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا' وہ ختم ہو جائے گا۔ اور یہ جو آپ کی ذہنی تخلیق ہے' آپ ہی اس کے نیچے بھی ہیں' اوپر بھی' اوّل بھی اور آخر بھی۔ اس کا اپنا تو کوئی وجود ہے ہی نہیں' وجود تو درحقیقت آپ کا ہے' یہ آپ کا ایک تصور ہے جو آپ نے اپنے ذہن کے اندر تخلیق کیا ہے۔ بالکل یہی تعلق ہے اس کائنات اور خالق کا۔ یہ کائنات کوئی علیحدہ شے نہیں ہے۔ گویا اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔

اب اسی ''توحید وجودی'' کی ایک تعبیر شیخ احمد سرہندیؒ نے کی ہے۔ انہوں نے ایک بڑی پیاری مثال سے واضح کیا ہے کہ یہ کائنات ہمیں نظر تو آ رہی ہے لیکن حقیقت میں اس کا وجود نہیں ہے' وجود ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا وجود ہے۔ انہوں نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ آپ ایک لکڑی لے کر اگر اس کے ایک سرے پر کوئی کپڑا باندھ دیں اور مٹی کا تیل ڈال کر دیا سلائی سے آگ لگا دیں تو اب ایک مشعل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے ایک دائرے میں تیزی سے حرکت دیجیے تو دیکھنے والے کو ایک آتشیں دائرہ نظر آئے گا' جب کہ دائرے کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے ؏

ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے!

وجود تو صرف اس ایک شعلہ جوالہ کا ہے' باقی حرکت کی وجہ سے بہت کچھ نظر آ رہا ہے جو فی الواقع موجود نہیں ہے۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ ؎

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خَيَالٌ
اَوْ عُكُوْسٌ فِي الْمَرَايَا اَوْ ظِلَالٌ

یعنی ''اس کائنات میں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ حقیقی نہیں ہے۔ اس کی حقیقت تو بس وہم اور خیال کی ہے یا بس اتنی ہے جیسے سائے ہوتے ہیں یا جیسے آئینہ میں عکس ہوتا ہے''۔

وجود تو اُس شے کا ہے جس کا عکس ہے' خود عکس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے۔ یہ نظریہ وحدت الشہود ہے۔ اس میں یہ بات ماننی پڑے گی کہ یہ کائنات جو نظر آ رہی ہے حقیقی وجود کی حامل نہیں ہے۔ بقول غالبؔ ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

تو یہ کائنات درحقیقت اللہ کا تصور ہے' جو بڑا ٹھوس تصور ہے' جبکہ ہمارا تصور تو ایک ہوائی سا تصور ہوتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے مابین نسبت کی یہ بہترین تعبیر ہوگی۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾

اس کائنات کا اوّل بھی' آخر بھی' ظاہر بھی' باطن بھی وہی ہے۔

توحید وجودی کی ایک دوسری تعبیر بھی ہے' جو ابن عربی کی ہے۔ اور یہ بہت زیادہ دقیق تعبیر ہے' اس لیے کہ Pantheism اور ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود میں بہت باریک فرق ہے' جسے عام انسان کے لیے ملحوظ رکھنا آسان نہیں ہے۔ ابن عربی کا نظریہ یہ ہے کہ خالق اور کائنات کا وجود تو ایک ہی ہے' ماہیت کے اعتبار سے کائنات عینِ وجودِ باری ہے' لیکن جہاں تعین ہو جاتا ہے وہاں وہ غیر ہو جاتا ہے۔ جیسے سائنس آج ہمیں بتاتی ہے کہ تمام اجسام atoms کے بنے ہوئے ہیں۔ atoms سے مالیکیول بنے ہیں اور ان سے مختلف چیزیں وجود میں آئی ہیں۔ ایٹم کی مزید تقسیم کریں تو electrons اور protons ہیں' پھر اس سے بھی چھوٹے photons ہیں۔ اور حقیقت میں تو کچھ ہے ہی نہیں' صرف electric currents ہیں۔ انہی electric currents نے جو خاص شکل اختیار کی تو وہ شے وجود میں آ گئی۔ آپ کو یہ ہال خالی نظر آ رہا ہے مگر یہ خالی تو نہیں ہے' اس میں ہوا ہے' جو ہائیڈروجن اور آکسیجن کا ملغوبہ ہے اور اس کے اندر وہ سارے ایٹم لطیف صورت میں موجود ہیں۔ مختلف اشیاء میں مختلف formations میں ایٹم موجود ہیں۔ چنانچہ ماہیت کے اعتبار سے اس گھڑی اور عینک میں کوئی فرق نہیں' یہ انہی ایٹموں کی مختلف تراکیب ہیں۔ لیکن جب ایک خاص فارمولے کے تحت conglomeration of atoms نے یہ شکل اختیار کی تو یہ ایک دوسرے کا غیر ہیں۔ لہٰذا جہاں کسی وجود یا کسی ہستی کا تعین آ گیا وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا غیر ہے' اس کا جزو نہیں ہے' لیکن ماہیت وجود مشترک ہے۔ کل کائنات کے اندر وجود ایک ہی ہے اور وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے۔ اس کو کہا گیا ہے ''وحدت الوجود'' یعنی وجود کا ایک ہونا۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ گیارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم ہیں جبکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم ہیں' ان کے مابین قریباً سو سال کا فرق ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس ضمن میں جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندیؒ کے نظریۂ وحدت الشہود کے مابین صرف تعبیر کا فرق ہے' حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق

نہیں۔ اور اسے خود شاہ صاحبؒ نے ''توحید وجودی'' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وجود حقیقی ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا ہے' لیکن جہاں کسی شے کا علیحدہ تشخص ہو گیا وہ اللہ کا غیر ہے' وہ خدا نہیں ہے۔ تاہم ماہیت وجود خالق اور مخلوق کے درمیان ایک مشترک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا نظریہ جسے شاہ ولی اللہؒ نے ''توحید وجودی'' سے تعبیر کیا اور اسی کی تعبیر '' لا معبودَ الاَّ اللّٰہ '' اور بلند تر سطح پر ''لامقصودَ اِلاَّ اللّٰہ' لا مطلوبَ اِلَّا اللّٰہ اور لا محبوبَ اِلاَّ اللّٰہ'' ہے۔ مزید اوپر جا کر اسی کی تعبیر ''لا موجودَ اِلاَّ اللّٰہ '' سے کی جاتی ہے۔ یعنی اللہ کے سوا وجودِ حقیقی اور کسی کا نہیں' وجود حقیقی صرف اللہ کا ہے۔ البتہ جیسے سمندر کے اوپر بننے والی لہریں اگرچہ الگ نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت وہ سمندر ہی کا حصہ ہیں' اسی طرح وجود بسیط خالق اور مخلوق کے درمیان مشترک ہے' البتہ جب کوئی وجود معین ہو کر کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے تو وہ خالق کا غیر ہوتا ہے۔ یہاں یہ شے ہمہ اوست اور pantheism سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھیے' اس کے بعد جی میں آئے تو آپ اس نظریے کو اٹھا کر پھینک دیں' آپ کو وہ نا قابل قبول نظر آئے تو بالکل ٹھکرا دیں۔ ہمیں بڑے سے بڑے شخص سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اختلاف نہیں کر سکتے تو محمد رسول اللہ ﷺ سے نہیں کر سکتے' باقی ہر شخص سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ جن لوگوں نے اس کو مانا ہے ان کی توہین نہ ہو' ان کے بارے میں یہ سوئے ظن نہ ہو کہ (معاذ اللہ) وہ ہمہ اوست اور Pantheism کے قائل ہیں اور وہ مشرک ہو گئے' گمراہ ہو گئے۔

فلسفۂ وجود کے یہ جو دو shades ہیں جن میں وحدت کا معاملہ ہے' ان کے ضمن میں ہندوستان کے مکاتب فلسفہ میں شنکر اچاریہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور ایک دوسرا فلسفی رامانج وحدت الشہود کا قائل تھا۔ فلسفۂ وجود کی یہی دو interpretations ہو سکتی ہیں' حقیقت میں بات ایک ہی ہے کہ وجود صرف اللہ کا ہے' باقی کوئی شے وجودِ حقیقی کی حامل نہیں۔ یا یہ کہئے کہ ماہیت وجود کے اعتبار سے مخلوق کو خالق کے ساتھ قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے' لیکن تعین کے اعتبار سے وہ خدا کا غیر ہے۔

حدیث نبوی ﷺ سے راہنمائی

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ کے بارے میں ہمیں حدیثِ نبویؐ سے بھی راہنمائی

ملتی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح مسلمؒ اور مسند احمد بن حنبلؒ میں آئی ہے۔ نیز قاضی ابویعلیٰؒ نے اسے اپنی ''مسند'' میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ یہ اصل میں حضور ﷺ کی ایک دعا ہے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْآخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الظَّاھِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٌ

''اے اللہ! تو ہی وہ اوّل ہے جس سے پہلے کچھ نہیں۔ اور تو ہی وہ آخر ہے جس کے بعد کچھ نہیں ہوگا۔ تو ہی ظاہر ہے' تجھ سے بڑھ کر نمایاں یا بالاتر کوئی نہیں اور اے اللہ! تو ہی ایسا باطن ہے کہ تجھ سے زیادہ مخفی کوئی نہیں!''

آپ حدیث کے ان الفاظ پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ کی اس حدیث نے اس نہایت ثقیل' نہایت دقیق اور نہایت مشکل مضمون کو بہت سہل اور آسان بنا دیا۔ چنانچہ اس حدیث کے حوالے سے انسان بآسانی یہاں سے گزر جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ غور کرنے والے کے لیے اس میں اشکالات موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو الفاظ ہمارے پاس ہیں ان کا اپنا ایک connotation اور مفہوم ہوتا ہے اور یہ الفاظ چونکہ ہماری زبان کے ہیں' لہٰذا ان کا وجود ہمارے اپنے تصورات کے مطابق ہوتا ہے۔ جب ہم کسی شے کو کہتے ہیں کہ یہ پہلی چیز ہے' اس سے پہلے کچھ نہیں' تو اس کے بارے میں خواہ مخواہ ایک تصور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس شے کا گویا اپنا کوئی نقطۂ آغاز ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ پہلا مکان ہے' اس سے پہلے کچھ نہیں ہے' مگر اس سے پہلے خلا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہم یہ تصور قائم نہیں کر سکتے کہ اس کے وجود کا کوئی نقطۂ آغاز بھی ہے یا اس سے پہلے کوئی عدمِ محض تھا۔ لیکن اس کی تعبیر کے لیے ہم الفاظ کہاں سے لائیں؟ کسی ایسی ہستی کی تعبیر کے لیے جو ہمیشہ سے ہو' ہمارے پاس کوئی لفظ ہے ہی نہیں۔ اصطلاح میں ہم لفظ ''قدیم'' اختیار کرتے ہیں' لیکن قدیم کے عام معنیٰ پرانی شے کے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شہر بڑا قدیم شہر ہے' فلاں تہذیب بڑی قدیم تہذیب ہے' لیکن اس کے یہ معنیٰ تو نہیں ہو سکتے کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ یہ مفہوم تو ہمیں اضافی طور پر اصطلاح میں داخل کرنا پڑا' یہ ہماری مجبوری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری

زبان میں وہ الفاظ ہی موجود نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مطلق کی صحیح تعبیر کر سکیں۔

آپ حدیث کے الفاظ پر غور کیجیے۔فرمایا:"وَاَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَیْءٌ"
یہاں حضورﷺ نے لفظ''بَعْدَكَ''ارشاد فرمایا ہے'لیکن کیا اللہ کے بعد کا کوئی تصور ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ کے بعد کا کوئی تصور نہیں۔ اللہ تو ہمیشہ سے ہے' نہ کوئی لمحہ کبھی ایسا تھا کہ جب اللہ نہیں تھا اور پھر اس کے وجود کا کوئی آغاز ہوا ہو' اور نہ کوئی لمحہ کبھی ایسا آ سکتا ہے جب کہ اللہ کا وجود نہیں ہوگا' لیکن اس حقیقت کی تعبیر کے لیے سادہ اور عام فہم الفاظ وہی ہوں گے جو حضورﷺ نے اختیار فرمائے:

اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَیْءٌ

پھر ان الفاظ کے اندر ازخود ایک احتیاج موجود ہے' اوّل و آخر کے الفاظ کوئی اضافی نسبت طلب کرتے ہیں کہ کس کا اوّل؟ کس کا آخر؟ یہ الفاظ اس خطبے میں بھی آئے ہیں جو حضورﷺ نے شعبان کے آخری دن رمضان المبارک کے استقبال کے ضمن میں اس کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے دیا تھا۔ اس خطبے میں آپﷺ نے''اوّل و آخر'' کو رمضان المبارک کے مہینے کے ساتھ نسبت دی: ((اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ)) یعنی اس مہینے کا اوّل اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے' درمیانی حصہ اللہ کی مغفرت کا مظہر ہے اور اس کا آخری حصہ جہنم سے گلوخلاصی ہے۔

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے آ رہا ہے:﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ﴾ کہ جنت اور دوزخ کے مابین ایک فصیل حائل کر دی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا۔﴿بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ اس دروازے کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب۔ تو باطن کے لیے بھی نسبت درکار ہے کہ کس شے کا باطن' اور ظاہر کے لیے بھی نسبت درکار ہے کہ کس شے کا ظاہر!﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ میں اس شے کا ذکر نہیں کیا گیا' لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو وہ ایک ہی شے ہو سکتی ہے کہ کل سلسلۂ کون و مکاں' یہ کل تخلیق کا سلسلہ! اس سلسلہ کا اوّل بھی اللہ ہے' اس کا آخر بھی اللہ ہے' اس کا ظاہر بھی اللہ ہے اور اس کا باطن بھی اللہ ہے' لیکن چونکہ قرآن مجید فلسفیانہ انداز اختیار کرنا نہیں چاہتا' لہٰذا وہ الفاظ اختیار کیے گئے جن کو ایک عام آدمی' ایک بدو بھی پڑھ کر گزر جائے اور اسے کوئی اشکال نہ ہو۔ اور اگر اسے زیادہ ہی دقت ہو تو اس حدیث

نبویؐ کے حوالے سے اس کی مشکل حل ہو جائے گی اور وہ بڑی سہولت کے ساتھ یہاں سے گزر جائے گا:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْآخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الظَّاھِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٌ

لیکن حقیقت میں کائنات کے اس پورے سلسلۂ تخلیق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ربط یہ ہے کہ وہ اس کا غیر نہیں ہے۔

معیتِ الٰہی کا مفہوم

ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہمارے عوام کا ایک عام تصور یہ ہے کہ وہ کسی ایک خاص جگہ پر موجود ہے اور اس کا وجود کائنات میں ہر جگہ نہیں ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ کی اگلی آیت میں جو الفاظ آرہے ہیں: ﴿وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ﴾ ''اور وہ تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں کہیں تم ہو'' کے بارے میں بالعموم یہ تصور ہے کہ وہ صرف اپنی صفات کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے' ہمیں دیکھ رہا ہے' ہماری باتیں سن رہا ہے۔ یہ تو اس کی تاویل ہوگئی' جبکہ الفاظ تو یہ ہیں: ﴿وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ﴾ ''اور وہ خود تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو''۔ تو یہ تاویل درحقیقت ان الفاظ کا حق ادا نہیں کر رہی۔ وہ ہمارے ساتھ کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے' لیکن وہ ہمارے ساتھ ہر جگہ' ہر آن موجود ہے۔ اس کے لیے انگریزی میں جو Attributes of God آئے ہیں وہ بہت جامع ہیں۔ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے' Omnipotent ہے۔ وہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے' Omniscient ہے۔ جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے' Omnipresent ہے۔

﴿وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ﴾ یہ الفاظ بالکل واضح ہیں' ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ جیسے اللہ کا ہاتھ (یَدُ اللّٰہِ) ایک حقیقت ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ ہے' وہ ایسا ہاتھ نہیں ہے جیسے ہمارا' لیکن کوئی حقیقت تو ہے جس کو ''یَدُ اللّٰہِ'' سے تعبیر کیا گیا۔ اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے' یہ ہماری وہ مجبوری ہے جو اللہ کی ہر صفت کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ میں گزشتہ نشست میں بیان کر چکا ہوں' اللہ دیکھتا ہے' لیکن کیسے دیکھتا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے! ہمیں کیا پتہ کہ کیسے دیکھتا ہے! اس کی اس طرح کی آنکھیں تو نہیں ہیں جیسی ہماری۔ اس کا دیکھنا اس خارجی نور کا محتاج تو نہیں ہے جس کے ہم

محتاج ہیں۔ ہماری بصارت اگرچہ موجود ہو‘ آنکھ بھی درست ہو‘ لیکن اگر روشنی نہ ہو تو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے اور اس کے مابین لفظ ’’دیکھنا‘‘ مشترک ہے‘ کہ ہم بھی دیکھتے ہیں‘ وہ بھی دیکھتا ہے‘ لیکن اس کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گویا ع ’’چہ نسبت خاک را با عالم پاک!‘‘ ہمارے اور اس کے دیکھنے کی نوعیت میں کوئی آس پاس کا قرب ہے ہی نہیں۔ فارسی کے یہ اشعار ذرا ملاحظہ کیجیے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم!

’’اے وہ ذات تبارک وتعالیٰ جو ہمارے خیال‘ قیاس‘ گمان اور وہم ہر شے سے ماوراء ہے! جو کچھ ہم نے کہا‘ جو کچھ ہم نے سنا اور جو کچھ ہم نے پڑھا‘ ان سب سے تیری ذات بہت بلند اور اعلیٰ وارفع ہے۔ (ہمارے پاس وہ نطق اور وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جن سے ہم تیرے کسی وصف کو بیان کرسکیں۔) دفتر کے دفتر ختم ہوگئے اور اب ہماری عمر کا سفینہ بھی آخری سرحد کو پہنچا ہوا ہے‘ اس کے باوجود ہم ابھی تیری پہلی صفت ہی کے بارے میں متحیر اور پریشان ہیں (اور ہمیں اس کے بارے میں کوئی تصور اور ادراک نہیں ہوسکا)‘‘۔

متکلمین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفت اوّلین وجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی چھ سب سے اہم اور بنیادی صفات وجود‘ حیات‘ علم‘ ارادہ‘ قدرت اور کلام ہیں‘ بقیہ تمام صفات ان ہی صفات کی شرح ہیں۔ بعض لوگ ان میں سماعت اور بصارت کو بھی شامل کرتے ہیں‘ لیکن سماعت اور بصارت درحقیقت صفت علم ہی کی شرح ہیں۔ تو ان صفات میں سب سے پہلی صفت ’’وجود‘‘ ہے‘ جس کے بارے میں کہا گیا ’’ما ہم چناں در اوّل وصفِ تو ماندہ ایم!‘‘ یعنی ہم تو تیرے پہلے وصف کے بارے میں ہی متحیر ہیں‘ پریشان ہیں اور اس پر غور کرتے ہوئے ہماری عقل ہمارا ساتھ چھوڑ جاتی ہے ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں جو تشبیہات پیش کی گئی ہیں وہ میں آپ کے سامنے عرض کرچکا ہوں۔ آپ چاہیں تو توحید وجودی اور وحدت الوجود کو دماغ کا خلل قرار دیں‘ لیکن اسے کفر اور شرک نہ کہیں‘ اس لیے کہ نظریہ ’’وحدت الوجود‘‘ ہمہ اوست اور Pantheism کے مترادف نہیں ہے۔

علمِ الٰہی کی وسعت و جامعیت

آیت کے آخر میں الفاظ آئے:﴿ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴾ ''اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے''۔ جب ہر شے کا اوّل و آخر' ظاہر و باطن وہی ہے تو کائنات کے اندر وہ کہیں دُور نہیں ہے' بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ جیسے سورۂ قٓ میں فرمایا:﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ ''ہم تو انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہیں''۔ یہاں جو فرمایا گیا:﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ﴾ ''جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہے''، ہم اس کی کُنہہ کو نہیں پہنچ سکتے' اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے' لیکن ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہر جگہ' ہر آن موجود ہے' ہم جہاں کہیں بھی ہوں وہ ہمارے ساتھ ہے' وہ ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور جب وہ اتنا قریب ہے تو معلوم ہوا کہ ہر چیز کا گویا وہ خود ہی چشم دید گواہ ہے۔ فرشتے نامۂ اعمال کی صورت میں جو رپورٹیں تیار کر رہے ہیں اللہ ان کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تو ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ فرشتوں کی رپورٹیں تو اس لیے تیار ہو رہی ہیں کہ

Justice should not only be done, it should also appear to have been done.

نامۂ اعمال کی یہ فائلیں اس لیے تیار ہو رہی ہیں کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو چیلنج کرے تو اس سے کہا جائے کہ:

﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴾ (بنی اسراءیل)

''اپنی کتاب پڑھ لے! تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔''

یہ سب اتمامِ حجت کے لیے ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود سمیع' بصیر ہے' جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ موجود ہوتا ہے' اس حوالے سے وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ علم اور قدرت اللہ تعالیٰ کی دو بڑی بنیادی صفات ہیں' جن کے بارے میں قرآن حکیم میں بار بار آتا ہے: وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ' وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ لفظ کُل جو ہے یہ درحقیقت ہماری پناہ گاہ ہے۔ ہم اس کی قدرت اور اس کے علم کا کوئی اندازہ نہ تو کمیت کے اعتبار سے (quantitatively) کر سکتے ہیں اور نہ کیفیت کے اعتبار سے (qualitatively)۔ ہم نہ تو یہ جان سکتے ہیں کہ اسے کتنی قدرت حاصل ہے اور نہ ہی ہم اسے پہچان سکتے ہیں کہ اس کی قدرت کیسے exercise ہوتی ہے۔ اس کا علم کتنا ہے اور اسے کیسے حاصل ہوتا ہے' یہ ہم نہیں جان

سکتے۔ ان تمام چیزوں سے ہٹ کر ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ چنانچہ ان آیات میں بھی آپ دیکھیں گے کہ صفت علم کو کتنی مرتبہ دہرا کر لایا گیا ہے۔

تخلیق کائنات — چھ دن میں

آگے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾ ''وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں''۔ یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آسمان اور زمین قرآن کی مستقل تعبیر ہے کل سلسلۂ کون و مکان کے لیے۔ قرآن حکیم کون و مکان جیسی فلسفیانہ اصطلاحات استعمال نہیں کرتا' آسمان اور زمین کے مفہوم کو عام آدمی بھی سمجھتا ہے' لیکن اس سے مراد ہے کل سلسلۂ وجود' کل سلسلۂ مخلوقات' کل سلسلۂ کائنات۔ یہ سب اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں تخلیق فرمایا۔

آسمان و زمین کی چھ دنوں میں تخلیق کا مضمون قرآن مجید میں سات مرتبہ آیا ہے' جس طرح قصۂ آدم و ابلیس بھی قرآن مجید میں سات مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین چھ دنوں میں پیدا کیے۔ یہاں دن سے مراد کیا ہے؟ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اس سے ہمارا دن مراد نہیں ہے۔ ہماری زمین کی اپنے محور پر ایک گردش جو ہوتی ہے اس سے ہمارا چوبیس گھنٹے کا ایک رات دن وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح ہر سیارے (planet) کا دن دوسرے سے مختلف ہے۔ اب ہماری پوری کہکشاں (Galaxy) کا دن کیا ہوگا؟ کائنات کی ہر شے گھوم رہی ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ﴾ یہ بہت بڑی astronomical حقیقت ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اگر انسان واقعتاً ادراک کرے تو حیرت ہوتی ہے کہ قرآن حکیم میں چودہ سو برس قبل یہ الفاظ آئے ہیں۔ اُس وقت صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کا کیا مفہوم سمجھا ہوگا' ہم اس کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت انسان پر بتمام و کمال آج منکشف ہوئی ہے کہ ع'' سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں!'' کائنات کی کوئی شے ٹھہری ہوئی نہیں۔ ذرّہ (atom) کو دیکھیں تو اس میں بھی electrons مسلسل حرکت میں ہیں اور اسی طرح آپ اپنے نظامِ شمسی کو دیکھیں تو ہر سیارہ گردش میں نظر آتا ہے' جیسے زمین کے بارے میں کہا گیا ع

''یہ زمیں' یہ فضا کی رقاصہ!''

زمین گویا رقص کر رہی ہے' خود اپنے محور کے گرد بھی چکر کھا رہی ہے اور سورج کے گرد بھی طواف کر رہی ہے۔ پھر یہ سورج جو اپنے پورے خاندان کو لے کر کسی بہت بڑے star کے گرد چکر لگا رہا ہے' یہ

تیسری حرکت ہے۔ پھر ہماری پوری Galaxy حرکت میں ہے۔ چنانچہ ہر شے حرکت میں ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کر دیا: ﴿كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں ایک ہی لفظ ''کُل'' ہماری پناہ گاہ ہے اسی طرح یہاں بھی وہی لفظ ''کُل'' استعمال کیا گیا ہے۔ تو اب اس پوری کائنات کا دن کیا ہوگا؟ قرآن مجید میں کچھ اور دنوں کا بھی تصور ہے لیکن لازم نہیں ہے کہ وہ مقدار یہاں مراد سمجھی جائے۔ البتہ ایک اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا دن ہے۔ وہ ہماری اس دنیا کے معاملات کی تدبیر فرماتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں پانچ سالہ یا دس سالہ منصوبہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ایک دن کے لیے (جو ہمارے حساب سے ہزار برس ہوتے ہیں) تدبیر کا معاملہ طے ہو جاتا ہے' جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾(السجدۃ)

''وہ اپنے امر کی تدبیر کرتا ہے آسمان سے زمین کی طرف' پھر وہ امر اس کی طرف واپس لوٹتا ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے''۔

ایک ہزار برس کی اس مقدار کی غلط تعبیر کرتے ہوئے اکبر کے زمانے میں ابوالفضل اور فیضی جیسے بڑے جغادری علماء نے' جو اقبال کے الفاظ میں لغت ہائے حجازی کے قارون تھے' اکبر کے ایماء پر یہ شوشہ چھوڑا کہ شریعت محمدی کو آئے ہوئے ایک ہزار برس پورے ہو گئے ہیں' لہٰذا اب دینِ محمدیؐ کا دور ختم ہوا اور دینِ الٰہی کا دور شروع ہو رہا ہے۔

قرآن مجید میں پچاس ہزار سال کے برابر ایک دن کا ذکر بھی موجود ہے اور اس کے بارے میں گمان غالب ہے کہ وہ قیامت کا دن ہے۔ فرمایا: ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج: ٤) ''ملائکہ اور روح (جبرئیلؑ) اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے''۔ جہاں تک زمین و آسمان کی چھ دنوں میں تخلیق کا معاملہ ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تخلیق کے ایک دن کو ہم ایک ہزار برس کا قرار دیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ اسے پچاس ہزار برس کا قرار دیں۔ تخلیق کے ان چھ دنوں کی مقدار ہمیں معلوم نہیں ہے' یہ دراصل چھ ادوار ہیں جن کے لیے ہم millenniums یا eras کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

خالق بھی وہی، حاکم بھی وہی

آگے فرمایا: ﴿ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ﴾ ''پھر وہ عرش پر جلوہ افروز ہوا''۔ ایسا ہرگز نہیں کہ تخلیق فرما کر وہ کہیں علیحدہ بیٹھ گیا ہو، بلکہ وہ تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ بعض صوفیاء کا تصور بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات میں مگن ہے، اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ کائنات میں کیا ہو رہا ہے، وہ اس سے مستغنی ہے۔ چنانچہ مشائین (جو ارسطو کی منطق کے پیروکار رہیں) یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم کلیات ہے، عالم جزئیات نہیں ہے۔ یہی گمراہی اس وقت جدید سائنسی تصورات اور مادہ پرستی کے زیر اثر پھیل رہی ہے۔ دَورِ جدید کا سب سے بڑا شرک تو انسانی حاکمیت کا تصور ہے، جبکہ اس کے ساتھ دوسرا بڑا شرک مادّہ پرستی ہے۔ اس مادّہ پرستی نے انسانی ذہن کو اتنا گرفت میں لے لیا ہے کہ جو خدا کو مانتا ہے وہ بھی اس معنی میں مانتا ہے کہ کائنات کا خالق (Creator) تو وہ ہے، لیکن اس کی تخلیق کے بعد اس نے کچھ طبعی قوانین (physical laws) بنا دیے ہیں جن کے تحت یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ چنانچہ ہر لحظہ، ہر آن اللہ کا فیصلہ اور اس کا اِذن ان کے تصور سے ماوراء ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اسے ''اللہ کی تعطیل'' کہتے ہیں، یعنی اللہ کو معطل کر دینا۔ گویا کائنات کی تخلیق کے بعد اب وہ معطل ہے، اسے اس کائنات کی روز بروز اور لمحہ بہ لمحہ working سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس نے جو قوانین بنا دیے ان کے تحت کائنات کا نظام از خود چل رہا ہے، جیسے فٹ بال کا کوئی کھلاڑی فٹ بال کو ٹھوکر لگائے تو وہ گیند دوڑتی چلی جاتی ہے جب تک کہ کوئی مزاحمت اسے نہ روکے۔ اس گیند کو آگے بڑھانے میں اب اس کھلاڑی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جس نے اسے کک لگائی تھی۔ جبکہ ایمان اور قرآن ہمیں اللہ تعالیٰ کی یہ معرفت دیتے ہیں کہ وہ تخت حکومت پر متمکن ہے اور نظام کائنات کو کنٹرول کر رہا ہے، جیسا کہ ابھی ہم نے پڑھا: ﴿یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ﴾ یہاں تک کہ اس کے اِذن کے بغیر پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ یہ تصور جب تک نہ ہو تو انسان کو ایمان باللہ اور معرفت ربّ حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ مفہوم ہے جو یہاں دیا گیا ہے: ﴿ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ﴾

اللہ تعالیٰ عالمِ کلیات ہی نہیں عالمِ جزئیات بھی ہے

آیت کے اگلے الفاظ میں ان جہلاء کے نظریات کی نفی ہو رہی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کا عالم نہیں۔ قرآن نے یہ جو حقیقت بیان کی ہے اس سے فلسفہ و سائنس کی بہت سی گمراہیوں کا

ازالہ ہوجاتا ہے اور بہت سے عقدے حل ہوجاتے ہیں۔فرمایا: ﴿ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے''۔زمین میں داخل ہونے والی شے بارش کا وہ قطرہ بھی ہے جو جذب ہو رہا ہے اور وہ بیج بھی ہے جو کسی درخت کا پھل سوکھنے کے بعد اس سے نکلتا ہے اور زمین میں قرار پکڑ لیتا ہے۔ان دونوں کے نتیجے میں زمین سے جو کونپل پھوٹتی ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔اسی طرح زمین میں داخل ہونے والے مردے بھی ہیں جو زمین میں مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو رہے ہیں' لیکن پھر وہ یہیں سے زندہ کر کے نکالے جائیں گے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی ﴾ (طٰہٰ) ''اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے' اسی میں ہم تم کو واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے''۔ چنانچہ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی شے جو زمین میں داخل ہو رہی ہے اور جو اس سے نکل رہی ہے یا نکلے گی وہ اس کے علم میں ہے۔

﴿وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا﴾ ''اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے (وہ بھی اس کے علم میں ہے)''۔آسمان سے نازل ہونے والی بارش بھی ہے اور فرشتے بھی جو آسمان سے اترتے ہیں۔جیسے فرمایا: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ مِّنْ کُلِّ اَمْرٍ ﴾ ''اترتے ہیں اس رات میں فرشتے اور روح اپنے ربّ کے اِذن سے ہر حکم لے کر''۔تو فرشتے اللہ تعالیٰ کے احکام لے کر ان کی تنفیذ کے لیے اترتے ہیں اور یہاں سے رپورٹ لے کر اور نفوس وارواحِ انسانیہ کو لے کر اوپر جاتے ہیں۔پس جو کچھ یہاں ہو رہا ہے ہر شے اللہ کے علم میں ہے۔گویا کہ احاطہ کر لیا گیا کہ کوئی شے اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر اس کی وضاحت ان الفاظ میں آئی ہے: ﴿وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعْلَمُھَا وَلَا حَبَّۃٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴾ (الانعام) ''بحر و بر میں جو کچھ ہے وہ اس سے واقف ہے۔کسی درخت سے گرنے والا کوئی پتا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ صرف کلیات کا عالم نہیں بلکہ جزئیات کا بھی عالم ہے' زمین و آسمان اور بحر و بر کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس کے علم میں ہے۔ یہ بات اگرچہ ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتی' لیکن ایمان کا جزوِ لازم ہونے کی حیثیت سے اس پر ایمان رکھنا ناگزیر ہے۔

معیتِ الٰہی کی کیفیت؟

آ گے فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو''۔ سورۃ الحدید کی ان چھ آیتوں میں پہلی دو' درمیان کی دو اور آخری دو آیتوں پر مشتمل تین جوڑے ہیں اور ان کے اوّل و آخر میں ایک مناسبت ہے۔ درمیانی دو آیات (۳'۴) اہم ترین ہیں۔ تیسری آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ اور چوتھی آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو''۔ اس کا تعلق بھی فلسفۂ وجود سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے ہم جہاں کہیں بھی ہوں—لیکن کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ ہم اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے۔ بعض لوگوں نے اپنی ذہنی سطح کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں تجسیم کا تصور قائم کیا ہے کہ وہ کسی جہت' کسی مکان' کسی مقام پر محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ایسا تصور معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' بالکل درست نہیں ہے۔ وہ تو ہر آن' ہر جگہ موجود ہے' البتہ کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ اس کی ذات مطلق ہے' وہ کسی جگہ محدود نہیں ہے۔ جب کسی معاملے میں شدت آ جاتی ہے تو انسان ایک انتہا سے دوسری انتہا تک چلا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے! حدیث قدسی میں الفاظ آتے ہیں کہ رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ سمائے دنیا تک نزول فرماتے ہیں اور وہاں سے ندا لگتی ہے کہ:

هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاُغْفِرَ لَهٗ؟

هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَاُعْطِيَهٗ؟

''ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اسے معاف کروں؟ ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں؟''

ہمیں معلوم ہے کہ سات آسمان ہیں' ساتویں آسمان کے اوپر پھر عرش کی کرسی ہے' رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ عرش سے سمائے دنیا یعنی پہلے آسمان تک نزول فرماتا ہے۔ اس نزول کی کیفیت ہم نہیں جانتے۔

اب اس کے بارے میں کچھ لوگ اس انتہا پر ہیں کہ وہ اس کی مطلق نفی کر دیتے ہیں کہ اللہ کے نزول کا کیا سوال؟ اللہ کسی خاص جگہ پر محدود تو نہیں ہے کہ وہاں سے نیچے اترے! اور ایک انتہا وہ ہے جو ایک روایت میں وارد ہوئی ہے کہ امام ابن تیمیہؒ منبر پر کھڑے تقریر کر رہے تھے اور ان لوگوں کی نفی

کرتے ہوئے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اترے اور کہا کہ اللہ ایسے اترتا ہے جیسے میں اترا ہوں۔ یہ دوسری انتہا ہے۔ہم اپنے اترنے پر اللہ کے اترنے کو قیاس کریں تو یہ غلط ہے۔ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نزول فرماتا ہے لیکن ہم اس کی کیفیت معین نہیں کر سکتے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تجلیات کسی خاص مقام پر مرکوز ہوسکتی ہیں' اللہ کی ذات کسی مقام پر محدود نہیں ہے۔ اللہ کی تجلیاتِ خصوصی ہیں جو کرسی پر ہیں' جو عرش پر ہیں' جو ساتویں آسمان کے اوپر ہیں' جس کے بارے میں سورۃ النجم میں آیا ہے: ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾﴾ ''سدرۃ المنتہیٰ کے پاس' اس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے''۔ مکان اور مکانیت کی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے' ہم ذاتِ باری تعالیٰ سے ان چیزوں کو بالکل منقطع بھی نہیں کر سکتے' ورنہ تو ہم قرآن مجید کی ہر آیت کی تاویل کرتے چلے جائیں گے' پھر تو ہر چیز استعارہ بن کر رہ جائے گی' لیکن اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے کسی مقام پر محدود نہیں ہے' وہ اس کی خصوصی تجلی ہے جو کسی مقام پر مرکوز ہے۔ چنانچہ ان ہی انوار کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا: ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾﴾ ''جبکہ اس سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانپے ہوئے تھا' جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ ہم تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کیا ڈھانپے ہوئے تھا جس کے لیے قرآن مجید نے مبہم الفاظ استعمال کیے ہیں۔ تم کیا سمجھو گے کہ کیا ڈھانپے ہوئے تھا؟ تمہارے سامنے وہ بات بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس کا مشاہدہ حضور ﷺ نے اس شان کے ساتھ کیا کہ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾﴾ ''نگاہ نہ کج ہوئی نہ حد سے متجاوز ہوئی''۔ ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾﴾ ''اس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا''۔ وہ بیری کو ڈھانپنے والی اللہ ربّ العزت کی تجلیاتِ خصوصی تھیں' جو اُس وقت وہاں نزول فرما رہی تھیں اور حضور ﷺ نے ان کا مشاہدہ کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ خصوصی کا کعبۃ اللہ پر ارتکاز ہے۔ چنانچہ اللہ کی تجلی مختلف مقامات پر ہوسکتی ہے' لیکن جہاں تک ذاتِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے اس کے ساتھ اگر کسی جسمانیت' کسی جہت یا کسی مقام کا تصور کیا جائے تو میرے خیال میں یہ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''اور جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے''۔ اگرچہ ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کیسے ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے' معیت کو ہم جانتے ہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی ہم ہوتے ہیں

اعمالِ انسانی کا چشم دید گواہ

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾ ''اور جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے''۔ جب وہ ہر جگہ' ہر آن تمہارے ساتھ ہے تو جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اسے خود دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہارے سب اعمال کا چشم دید گواہ ہے۔ آگے چل کر دسویں آیت کے اختتام پر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝﴾ ''جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔ یہ دونوں جملے اسی ترتیب سے سورۃ التغابن میں بھی آئے ہیں۔ بصارت اور خبر کے متعلق ہمارا عمومی تصور یہ ہے کہ بصارت یقین کا آخری درجہ ہے' جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو گویا یقین کا آخری درجہ حاصل ہو گیا' لیکن قرآن مجید میں جو ترتیب آتی ہے اس میں ''بصیر'' کو ''خبیر'' سے مقدم کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے صفت بصارت کا ذکر آتا ہے' بعد میں صفت خبر کا۔ اس لیے کہ خبر اصل شے ہے' کیونکہ آنکھ بھی دھوکہ دے سکتی ہے ؏

ہر چہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب؟

آدمی بعض اوقات شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں واقعتاً صحیح دیکھ رہا ہوں؟ کچھ illusions بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصل خبر وہ ہے جو انسان کے باطن کے اندر پہنچ جائے۔ بہر حال خبر کی طرح بصارت بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بہت بڑا مظہر ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کے ضمن میں اہل ایمان کی ذمہ داری

پھر فرمایا: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ ''اسی کے لیے زمین و آسمان کی بادشاہی ہے''۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے ضمن میں جو بھی بڑے بڑے مسائل ہیں' جو بھی فلسفیانہ مشکلات ہیں اور جو بھی مغالطے ہیں وہ سب ان چھ آیات میں حل کیے گئے ہیں۔ ان چھ آیات میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اس سے اندازہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تصور کو قرآن مجید کتنا emphasize کرنا چاہتا ہے۔ سارا فساد تو اسی کا ہے کہ انسان خود حاکم بن کر بیٹھ گیا ہے اور اسی کا نام بغاوت ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ کی ہے اور زمین پر اس حکومت کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد میں اپنا تن من دھن لگا دینا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ماننے والوں کا فرضِ منصبی ہے۔ چنانچہ ان چھ آیات کے

بعد جب مطالبات آئیں گے تو اہل ایمان سے انفاقِ مال اور بذلِ نفس کا مطالبہ کیا جائے گا:

﴿اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ﴾

''ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے''۔

اللہ کی راہ میں لگا دو' کھپا دو اور خرچ کر دو ان تمام چیزوں میں سے جن پر ہم نے تم کو اختیار دیا ہے' تمہیں استخلاف عطا کیا ہے۔ لیکن یہ انفاق' لگانا' کھپانا' خرچ کرنا' جان کا کھپانا' مال کا خرچ کرنا' اپنی صلاحیتیں' اپنی ذہانت' اپنے اوقات لگا دینا' اپنے آپ کو ہمہ تن کھپا دینا کس لیے؟ تاکہ اللہ کا حق بحال (restore) کرایا جائے۔ اس کی حکومت کے اندر بغاوت ہوگئی ہے' انسان اپنی حاکمیت کے مدعی بن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ اس زمین کے بادشاہِ حقیقی کے خلاف عالمگیر بغاوت ہے۔ اور اب انسانی حاکمیت (Human Sovereignty) حاکمیت جمہور (Popular Sovereignty) میں تبدیل ہو چکی ہے اور یہ نجاست اب عالمی سطح پر جڑ پکڑ چکی ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿ظَھَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ﴾ یہ فساد بر و بحر کے اندر رونما ہو چکا ہے اور اب یہ نجاست ایک نظریہ کے طور پر تمام انسانوں کے اندر تقسیم کر دی گئی ہے۔ پہلے ایک شخص فرعون یا نمرود کی صورت میں حاکمیت کا دعویٰ کرتا تھا کہ ''اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی'' مگر آج وہ ٹنوں گندگی تولہ تولہ ماشہ ماشہ عام آدمی کو بھی پہنچا دی گئی ہے۔ یہ ہے اصل گمراہی' اصل بغاوت اور اصل فساد۔ اور جو اللہ کا وفادار ہے اس کا فرض قرار پاتا ہے کہ اس بغاوت کا قلع قمع کرے اور اللہ کا حق اس کو لوٹائے' تاکہ زمین پر اللہ کی حاکمیت بالفعل قائم ہو جائے۔

فیصلے کا اختیار اللہ کا!

اس سورۂ مبارکہ کی دوسری آیت میں ﴿لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ کے بعد ارشاد ہوا تھا:

﴿یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝﴾ ''زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے''۔ اس لیے کہ حکومت کے ساتھ ایک لازمی تصور قدرت و اختیار کا ہے۔ وہ حکومت ہی کیا جو مجرموں کو سزا نہ دے سکے اور وفاداروں کو بدلہ نہ دے سکے' انہیں کوئی انعامات نہ دے سکے! اگر کسی حکومت کو جزا و سزا کا اختیار نہیں اور وہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے قابل نہیں تو وہ حکومت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں اس پہلو کو نمایاں کیا گیا: ﴿وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ۝﴾ ''اور تمام معاملات (فیصلے

کے لیے) بالآخر اسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے''۔ اُس کے حضور میں پیش کر دیے جائیں گے۔ آخری فیصلے وہاں ہوں گے۔ اس روز یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ وہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ (جزا وسزا کے دن کا مالک) ہے۔ اس روز آنکھوں پر پڑے پردے ہٹ جائیں گے۔ اس روز کہا جائے گا: ﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾﴾ (ق) ''آج ہم نے تمہاری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا ہے اور آج تمہاری نگاہ خوب تیز ہے''۔ دیکھو آج کے دن کس کے لیے بادشاہی ہے؟ تم دنیا میں اپنی بادشاہی کے دعوے دار تھے۔ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾﴾ (المؤمن) آج کے دن بادشاہی صرف اس اللہ کے لیے ہے جو الواحد اور القہار ہے۔ تو یہاں فرمایا گیا: ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۵﴾﴾ ''اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے''۔ تُرْجَعُ فعل مجہول ہے۔ یہاں تَرْجِعُ نہیں ہے، یعنی خواہی نخواہی تمام معاملات اس کے حضور پیش کر دیے جائیں گے، تم چاہو یا نہ چاہو تمام معاملات اللہ کی طرف لوٹا دیے جائیں گے اور آخری فیصلے کے لیے اسی کی عدالت میں پیشی ہوگی۔

گردشِ لیل ونہار میں انسان کے لیے سامانِ معرفت

﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ﴾ ''وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں''۔ یہ قرآن مجید کی ایک صنعت لفظی ہے کہ ایک ہی مادے سے بننے والے الفاظ کا استعمال قریب قریب ملتا ہے۔ اسی کی ایک مثال یہاں ہے۔ چنانچہ ابھی ہم نے پڑھا: ﴿ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ ﴾ ''وہ جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتا ہے''۔ وَلَجَ، يَلِجُ ثلاثی مجرد سے ہے۔ اسی مادے سے بابِ افعال میں اَوْلَجَ، يُوْلِجُ اِيْلَاجًا ہے۔ یعنی کسی شے کو کسی میں داخل کرنا۔ فرمایا: ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ﴾ ''وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں''۔ اس کا اصل مفہوم سمجھئے۔ یہ مضمون بھی دراصل دوسری مرتبہ آ گیا ہے۔ پہلے ہم نے پڑھا: ﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ ''وہی مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے''۔ اگر ہم کہیں ''نَمُوْتُ وَنَحْيَا'' کہ ہم خود زندہ رہتے ہیں، خود مرتے ہیں تو یہ کفر ہے، مجوبیت ہے، غفلت ہے۔ گویا کہ اللہ سے بُعد ہے۔ یہ یقین کہ اللہ زندہ رکھتا ہے، اللہ ہی مارتا ہے، یہی معرفت، ہدایت اور ایمان ہے۔ سائنس کے زیر اثر ہماری سوچ یہ بن گئی ہے کہ رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آ رہے ہیں۔ گویا کہ خود بخود آ رہے ہیں۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ کائنات کا نظام خود بخود چل رہا ہے۔ بنانے والے نے ابتدائے

آ فرینش میں کچھ قوانین بنا دیے تھے‘ جن کے زیر اثر اب یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ اس تصور کی نفی کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّهَارِ﴾ ’’وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں‘‘ ﴿وَیُوۡلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیۡلِ﴾ ’’اور وہ داخل کرتا ہے دن کو رات میں‘‘۔ اس نے زمین‘ سورج اور چاند کی گردش کا پورا نظام قائم کیا جس کے نتیجے میں دن رات ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں۔

فرض کیجیے اگر سورج ایک جگہ کھڑا رہتا تو ہر چیز روشن ہوتی‘ لیکن شاید انسان کو یہ معلوم نہ ہوسکتا کہ روشنی سورج سے آ رہی ہے۔ اس لیے کہ ہر چہار طرف روشنی سے یہ مغالطہ ہوسکتا تھا کہ ہر شے از خود روشن ہے۔ یہ تو سورج حرکت کرتا ہے اور سایہ اس کے ساتھ گھٹتا بڑھتا ہے تو ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ روشنی اصل میں سورج کی ہے۔ جب سورج غروب ہو جاتا ہے اور روشنی ختم ہو جاتی ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ روشنی دراصل سورج کی روشنی ہے۔ یہی معاملہ ان چیزوں کا ہے جو بظاہر خود بخود ہو رہی ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہم کھانا کھاتے ہیں تو بھوک مٹ جاتی ہے۔ بھوک سے کمزوری محسوس ہو رہی تھی‘ کھانے سے توانائی آ گئی‘ ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کھانے میں یہ تاثیر ہے کہ اس سے جسم میں قوت آ جاتی ہے۔ اسی طرح پانی پیاس ختم کرتا ہے‘ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پانی کی تاثیر ہے کہ پیاس بجھ جاتی ہے۔ اب اللہ ہمارے ذہن سے نکل گیا اور ہم اللہ سے محجوب ہو گئے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ امام رازیؒ نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ جو عقولِ اعلیٰ یعنی بلند سطح کی عقول کے حامل لوگ ہیں‘ جن کو حقائق مستحضر رہتے ہیں‘ ان کا کہنا یہ ہے کہ:

مَا رَاَیۡتُ شَیۡئًا قَطُّ وَقَدۡ رَاَیۡتُ اللّٰہَ قَبۡلَهٗ

’’میں جس شے کو بھی دیکھتا ہوں مجھے اس سے پہلے اللہ نظر آتا ہے‘‘۔

اور جو عقولِ متوسطہ کے حامل ہیں وہ یہ کہتے ہیں:

مَا رَاَیۡتُ شَیۡئًا قَطُّ وَقَدۡ رَاَیۡتُ اللّٰہَ مَعَهٗ

’’میں نے جب بھی کسی شے کو دیکھا‘ مجھے اس کے ساتھ ہی اللہ نظر آیا۔‘‘

اور ایک قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی عقول ادنیٰ درجے کی ہوتی ہیں‘ وہ کہتے ہیں کہ

مَا رَاَیۡتُ شَیۡئًا قَطُّ وَقَدۡ رَاَیۡتُ اللّٰہَ بَعۡدَهٗ

’’جب بھی میں نے کسی شے کو دیکھا تو اس کے بعد مجھے اللہ نظر آیا‘‘۔

کسی شے کو دیکھنے کے بعد اللہ یاد آ جائے تو یہ گویا معرفت کی سب سے نچلی شکل ہے‘ لیکن اللہ کی تخلیق کو

دیکھتے رہیں اور اللہ نظر ہی نہ آئے تو یہ محجوبیت ہے‘ گمراہی ہے‘ یہ اللہ سے اوٹ میں ہو جانا ہے۔ سورۃ المطففین میں فرمایا:

﴿كَلَّآ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ۝۱۵﴾

’’بے شک یہ لوگ اُس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے اوٹ میں ہوں گے‘‘۔

قیامت کے دن وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محجوب رہ جائیں گے‘ محروم کر دیے جائیں گے‘ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ نہ کر پائیں گے‘ جس طرح اس وقت دنیا میں محجوب ہیں۔ وہ اشیاء کو دیکھ رہے ہیں لیکن اللہ کو نہیں دیکھ رہے ہیں‘ جبکہ حقیقت میں جس کے دل میں اللہ موجود ہے‘ معرفت کے کسی درجے میں اسے ایمان باللہ حاصل ہے‘ اسے اللہ ہر جگہ‘ ہر آن‘ ہر لحظہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن اللہ کا یہ تصور رکھتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے از خود نہیں ہو رہا‘ میرے اللہ کے کرنے سے ہو رہا ہے۔ یہ اُس کا فیصلہ ہے ع ’’ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!‘‘ میرے اللہ نے جو کچھ میری جھولی میں ڈال دیا ہے یہ اس کا لطف و کرم ہے‘ اس کی عطا ہے‘ اس کی دین ہے‘ اور اس میں یقیناً خیر ہی خیر ہے۔

اب دیکھئے کہ ﴿يُوۡلِجُ الَّيۡلَ فِي النَّهَارِ وَيُوۡلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيۡلِ﴾ کا مفہوم کیا ہے! ’’وہ پرو لاتا ہے رات کو دن میں اور پرولاتا ہے دن کو رات میں‘‘۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں پرونے کا مفہوم سمجھ لیجیے۔ ایک تصور تو یہ ہے کہ جیسے ایک دھاگے میں تسبیح کے دانے پروئے ہوئے ہیں اور ایک ایک دانہ گر رہا ہے۔ سیاہ دانہ گرا تو یہ رات ہے اور سفید دانہ گرا تو یہ دن ہے۔ گویا ع ’’میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!‘‘ اور ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کبھی دن بڑھتا ہے‘ رات گھٹتی ہے تو گویا دن رات میں داخل ہو رہا ہے اور کبھی دن گھٹتا ہے اور رات بڑھتی ہے تو گویا رات دن میں داخل ہو رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا جامع بیان

آیت کے آخری الفاظ ہیں: ﴿وَهُوَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۶﴾ ’’اور وہ سینوں کے پوشیدہ راز تک جانتا ہے‘‘۔ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے وہ اس کا جاننے والا ہے۔

سورۃ الحدید کی یہ چھ آیات اللہ تعالیٰ کے اسماءِ صفات اور اس کی معرفت کے بیان میں بہت اہم ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفت علم نہایت جامعیت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا:

﴿ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ﴾
''اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے''۔

پھر اگلی آیت میں اس وضاحت کے بعد کہ وہ صرف کلیات ہی کا عالم نہیں' جزئیات سے بھی پوری طرح واقف ہے' فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ ﴾
''اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے''۔

اور اب یہاں فرمایا کہ یہی نہیں' بلکہ:

﴿ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ ﴾
''وہ تو اسے بھی جانتا ہے جو تمہارے سینوں میں مخفی ہے''۔

اور آیت ۱۰ کے آخر میں آئے گا:

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ ﴾
''اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔

اس طرح اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں علم خداوندی کا ذکر کتنے مختلف اسالیب اور کتنے مختلف dimensions سے کیا گیا ہے۔

سورۂ تغابن میں اللہ تعالیٰ کے علم کو تین اسلوبوں سے ایک ہی آیت میں بیان کیا گیا ہے: ﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے'' ﴿وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ﴾ ''اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو''۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ ''اور اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے جو سینوں میں پوشیدہ ہے''۔ وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے' وہ علیمٌ بذاتِ الصُّدور ہے۔

آخری بات یہ نوٹ کیجیے کہ سلسلۂ مُسَبِّحات میں سے اوّلین سورۃ الحدید ہے' جسے ''اُمّ المُسَبِّحات'' کا درجہ حاصل ہے' جبکہ مُسبحات میں سے آخری سورۂ تغابن ہے' جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ سورۂ تغابن کا عنوان ہی ''ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات'' ہے۔ سورۃ الحدید کے جو مضامین ہم پڑھ چکے ہیں ان میں سے بعض مضامین وہاں تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علم' قدرت اور حکومت' تینوں کا وہاں ذکر ہے۔ البتہ فلسفیانہ مضامین صرف یہیں ہیں:

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾

اور:

یہ درحقیقت فلسفۂ وجود کی سطح پر معرفت خداوندی کی بلندترین منزل ہے اور یہ بحث قرآن مجید میں صرف اسی مقام پر آئی ہے۔

اسماءِ باری تعالیٰ کے درمیان حرفِ عطف کا مسئلہ

میں اگرچہ اپنے طور پر تو فیصلہ کر چکا تھا کہ سورۃ الحدید کے حصہ اوّل پر' جو چھ آیات پر مشتمل ہے' ہماری گفتگو اب مکمل ہوگئی ہے اور اب ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ لیکن گزشتہ درس کے بارے میں مجھ سے ایک استفسار کیا گیا ہے جس سے نشان دہی ہوئی ہے کہ میری گفتگو میں ایک خلا رہ گیا ہے جسے پُر ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وحدتُ الوجود کے ضمن میں اب تک ہونے والی گفتگو کے بارے میں مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ شاید میرا ذاتی موقف پورے طور پر واضح نہیں ہوسکا اور عین ممکن ہے کہ زندگی میں آخری مرتبہ ان آیات پر گفتگو ہو رہی ہو' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ وحدت الوجود کے بارے میں اپنا ذاتی موقف بھی پوری طرح وضاحت سے بیان کر دوں' مبادا کوئی مغالطہ باقی رہے اور غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ جن حضرات پر یہ بحث کچھ گراں گزر رہی ہو اُن سے میں معذرت خواہ ہوں۔ متذکرہ بالا دو اسباب کی بنا پر ہمیں ابھی اپنے سابقہ موضوع کو جاری رکھنا ہے۔

میں نے یہ کہا تھا کہ قرآن مجید میں صرف یہ ایک مقام ہے ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ جہاں اللہ تعالیٰ کے اسماء کے مابین حرف عطف آیا ہے۔ اور نحو کا قاعدہ یہ ہے کہ معطوف اور معطوف الیہ میں مغائرت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں اسی سلسلۂ سُوَر میں سورۃ الحشر کے آخر میں جو آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے وہاں تسلسل کے ساتھ اللہ کے آٹھ اسماء آئے ہیں' لیکن ان کے درمیان کہیں کوئی حرف عطف نہیں ہے۔

جبکہ یہ واحد مقام ہے جہاں حرف عطف آیا ہے۔ اس ضمن میں مجھ سے سوال کیا گیا ہے کہ اس مقام پر اسماء باری تعالیٰ کے درمیان حرفِ عطف کیوں آیا ہے؟

چنانچہ اس ضمن میں وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا' اوّل' آخر' ظاہر اور باطن یہ چاروں اسماء ایسے ہیں جو کسی نسبت اضافی کا تقاضا کرتے ہیں۔ جیسے اَوَّلُهٗ' آخِرُهٗ' ظَاهِرُهٗ' بَاطِنُهٗ۔ میں نے مثال دی تھی کہ حضور ﷺ نے شعبان کے آخری دن ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں رمضان المبارک کی عظمت کا بیان ہے۔ اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: ((اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهٗ

مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهُ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ)) ''اس (ماہِ مبارک) کا پہلا حصہ (عشرہ) رحمت ہے' دوسرا حصہ مغفرت ہے اور آخری (عشرہ) آگ سے نجات ہے''۔ اسی طرح ظاہر و باطن کے لیے اسی سورۃ کے دوسرے رکوع میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ط بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ یہاں باطن کی اضافت بھی ''ہٗ'' کی طرف ہے اور ظاہر کی اضافت بھی ''ہٗ'' کی طرف ہے۔ تو درحقیقت زیرِنظر آیت میں مراد یہ ہے کہ اس سلسلۂ کون و مکان' اس سلسلۂ تخلیق کا اوّل بھی اللہ ہے' آخر بھی اللہ ہے' اس کا ظاہر بھی اللہ ہے اور باطن بھی اللہ ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ اوّل و آخر میں تو لازماً مغائرت ہوگی۔ اگر درمیان میں کوئی فصل ہے' کوئی زمانی بُعد ہے تو اَوَّلُـهٗ وَاٰخِرُهٗ ایک وقت میں نہیں ہو سکتے۔ خود ان الفاظ کا تقاضا ہے کہ ان میں لازماً مغائرت ہونی چاہیے۔ یوں سمجھئے کہ ایک وقت تھا کہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ تھی' کائنات نہیں تھی۔ پھر کائنات کو وجود بخشا گیا تو اس کا اوّل یعنی نقطۂ آغاز اللہ ہے' جہاں سے یہ کائنات شروع ہو رہی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک وقت آئے گا کہ صرف اللہ کی ذات ہوگی' کائنات نہیں ہو گی۔ گویا کہ یہ اس کا آخر یا نقطۂ اختتام ہے۔ چنانچہ اس کائنات کا اوّل و آخر ذاتِ باری تعالیٰ ہے' درمیان میں یہ کائنات ہے۔ اور اس کائنات میں ظاہر و باطن کی dimensions پیدا ہوئیں تاکہ احاطہ ہو جائے کہ وہی وہ ہے۔ ظاہر و باطن تو یقیناً بیک وقت (simultaneous) ہیں' ان میں مغائرت نہیں ہو سکتی۔ کسی شے کا ظاہر و باطن تو ساتھ ہی ہوں گے۔ پہلے دو اسماء مغائرت اور فصل کے متقاضی ہیں اس لیے ان کے درمیان حرفِ عطف آ گیا' اسی مناسبت سے پھر پوری آیت کے اندر حرفِ عطف لایا گیا۔ اس سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت اس آیۂ مبارکہ کا موضوع حقیقت وجود ہے۔

''وحدت الوجود'' کے بارے میں میرا موقف

اب آیئے اس بات کی طرف کہ وحدت الوجود کے بارے میں میرا کیا موقف ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سن ۵۶۔۱۹۵۵ء میں' جبکہ میری عمر تینتیس' چونتیس برس تھی' میں اس مسئلے پر اپنا غور و فکر مکمل کر کے ایک حتمی رائے تک پہنچ چکا تھا' اور وہ حتمی رائے اُس وقت میرے ذہن میں کس انداز سے آئی تھی' اسے میں بیان کر رہا ہوں۔ جہاں تک ہمارے دین کی عملی حیثیت کا تعلق ہے اسے ہم شریعت اور طریقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ شریعت اس دین کے عمل کا ظاہری پہلو

ہے اور طریقت اسی کا باطنی پہلو ہے۔ شریعت (فقہ) بحث کرے گی کہ نماز کے ارکان کیا ہیں' اوقات کیا ہیں' مختلف نمازوں کی رکعتیں کتنی ہیں' ہر رکعت میں ارکان کیا ہیں اور ان کی ترتیب کیا ہے' وغیرہ ' جبکہ اسی نماز کا جو ایک باطنی پہلو مطلوب ہے کہ خشوع وخضوع ہو' حضورِ قلب ہو' انسان ہمہ تن متوجہ ہو' اپنی پوری شخصیت کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا ہوا کھڑا ہو' رکوع یا سجدہ میں ہے تو بھی پوری شخصیت جھک گئی ہو' یہ طریقت کا موضوع ہے۔ تو یہ جو دین کے عملی پہلو ہیں شریعت اور طریقت (یا ظاہر و باطن) ان دونوں کا تعلق یا ''ہمہ از اوست'' سے ہے یا ''ہمہ با اوست'' سے ہے۔ یعنی ان دونوں پہلوؤں کا تعلق یا تو اس سے ہے کہ سب کائنات اللہ کی ذات سے ہے' یا یہ کہ یہ سب سلسلۂ کون ومکان اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ ''ہمہ از اوست'' اور ''ہمہ با اوست'' کے مابین جو فرق ہے وہ میں بعد میں بیان کروں گا۔ ان کو اس درجہ میں سمجھ لیجیے کہ شریعت کا اوّلین درجہ ہے لَا اِلٰــــہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ یہاں معبود کو اس کے جامع مفہوم میں لیجیے کہ مطاعِ مطلق اللہ ہے' حاکم اللہ ہے' اسی کا حکم ماننا ہے اور درحقیقت رسول کا حکم بھی اسی کا حکم ہے' اُس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنی ہے ' اس کے بتائے ہوئے حلال وحرام پر قائم رہنا ہے' اُسی سے ڈرنا ہے' اُسی سے سوال کرنا ہے' اُمید اُسی سے رکھنی ہے۔ پھر یہ کہ رازق وہی ہے۔ اسی طرح حاجت روا و مشکل کشا وہی ہے۔ یہ دین کا بالکل بنیادی تصور ہے۔ تو گویا پہلا قدم ''لَا معبودَ اِلَّا اللّٰہ'' ہے۔

اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ۔ یعنی انسان کی زندگی میں مقصود ومطلوب کی حیثیت صرف اللہ کو حاصل ہو جائے' اس کا نصب العین صرف اللہ کی ذات ہو' محبوبِ حقیقی صرف اللہ ہو' باقی ساری محبتیں اس کی محبت کے تابع ہوگئی ہوں۔ یہ طریقت کی آخری منزل ہے۔ یہ وہ باطنی کیفیت ہے جو مطلوب ہے۔ ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا﴾ کے مصداق انسان یکسو ہو کر اللہ کی ذات کی طرف متوجہ ہو گیا ہو' وہی اس کا مطلوب ومقصود اور وہی اس کا محبوبِ حقیقی بن گیا ہو۔ ان دونوں کا تعلق یا ہمہ از اوست سے ہے یا ہمہ با اوست سے۔ لیکن جو حقیقت ہے وہ ہمہ اوست کی وہ تعبیر ہے جو شیخ ابن عربی نے کی ہے' یعنی وحدت الوجود۔ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے درمیان ایک باریک فرق ہے جو اگر ملحوظ نہ رہے تو بڑا خطرہ ہے ؏ ''ہشدار کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را!'' ذرا سی اگر بے احتیاطی ہو جائے تو انسان کفر اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ راستہ بہت خطرناک ہے۔ اور ویسے بھی اوّل تو اس

حد تک رسائی بہت کم لوگوں کی ہوتی ہے' پھر اگر کوئی پہنچ بھی جائے تو اسے یہ احساس ہضم کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے سلطان باہو کا وہ مصرعہ یاد آ رہا ہے کہ ؏ ''جان پھلن تے آئی ہُو!'' واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کو وحدت الوجود کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک ایسی کیفیت محسوس کرتا ہے کہ اس کو ضبط میں لے آنا اور اپنی شخصیت کو اپنے مقام پر برقرار رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر یا تو وہ ہوگا جو منصور الحلاج اور سرمد کے ساتھ ہوا تھا' کہ انہوں نے ''انا الحق'' کا نعرہ لگا دیا' یا ایک اور بڑی پیاری کیفیت ہے جس کا شیخ سعدی نے بڑے خوبصورت الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ؏

آن را کہ خبر شد خبرش بعد نیامد!

کہ ''جو شخص یہاں تک پہنچ گیا پھر اس کی خبر نہیں ملتی۔'' یعنی پھر وہ خاموش ہو جائے گا' کیونکہ زبان کھولنے میں خطرہ ہے' اندیشہ ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ جب یہ چیزیں کچھ شعراء کے ذریعے سے' خاص طور پر حافظؔ کے ذریعے سے عوام الناس میں آ گئیں تو اس سے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہوئے اور دین وشریعت کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔ پھر ''مسجد مندر ہکڑو نور'' کا فلسفہ پیش کیا گیا اور وحدتِ ادیان کا باطل نظریہ وجود میں آیا۔ اسی فتنہ کے سدباب کے لیے اور اس کا رُخ موڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندیؒ کو کھڑا کیا' جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

اُس وقت برعظیم پاک و ہند میں ملت اسلامیہ اور اُمت محمدؐ کا تشخص ختم ہو رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ درحقیقت ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے مابین باریک فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے باعث اور ان کا عوام کی سطح پر اشعار کے ذریعے سے آ جانے کے باعث ہوا' جس کے خلاف شیخ احمد سرہندیؒ نے علمِ جہاد بلند کیا۔ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے ساتھ علامہ اقبال کو بہت سے اعتبارات سے خصوصی نسبت حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے بھی برعظیم میں مسلم قومیت کے تشخص کو واضح کیا اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان کا فکر و فلسفہ اور ان کی عظیم شخصیت نہ ہوتی تو بیسویں صدی کے آغاز میں وحدتِ ادیان کا جو فلسفہ گاندھی کے ذریعہ بہت شد و مد کے ساتھ آیا تھا اس کے آگے بند باندھنا ممکن نہ رہتا۔ اور تو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی نابغہ شخصیت بھی اس رو میں بہہ گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس برعظیم پاک و ہند میں اُس وقت پھر وہی صورت حال پیدا ہو رہی تھی جو تین سو برس پہلے ہوئی تھی کہ جب

''دینِ الٰہی'' کی شکل میں ایک نیا دین گھڑ لیا گیا تھا اور دینِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے خاتمہ کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس بار اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کو اٹھایا۔ آپ ایک مفکر اور فلسفی تھے' ان کی بات میں وزن تھا' ان کا انداز لوگوں کے دل کو بھانے والا تھا۔ پھر وہی شخص تھا جو پنڈت نہرو سے بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔ ختم نبوت پر ان کی نہرو کے ساتھ بڑی مدلل ومفصل خط وکتابت ہوئی۔ ظاہر ہے کوئی عالم دین تو پنڈت نہرو کے ساتھ بحث وتکرار نہیں کر سکتا تھا۔ علماء کرام ختم نبوت پر قرآن وحدیث سے تو دلائل دے سکتے تھے' لیکن اس کی فلسفیانہ بحث علامہ اقبال کے سوا کسی نے نہیں کی۔ علامہ اقبال شروع میں حافظؔ کے شدید دشمن رہے اور اس فلسفے کی انہوں نے بڑی شدت کے ساتھ نفی کی۔

''سورج مکھی کے پھول بن جاؤ!''

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اُس زمانے (۵۶۔۱۹۵۵ء) میں' مَیں اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ طریقت اور شریعت دونوں کا تعلق ''ہمہ از اوست'' یا ''ہمہ با اوست'' سے ہے' جب کہ حقیقت ''وحدت الوجود'' ہے جو ''ہمہ اوست'' ہی کی ایک محتاط تعبیر ہے۔ اُس زمانے میں ایک تشبیہہ یا تمثیل بھی میرے ذہن میں آئی تھی کہ ''سورج مکھی کے پھول بن جاؤ!'' اس کی میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے کیا مراد ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سائنس کے نظریات میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس وقت یہ خیال بہت غالب تھا کہ ہماری یہ زمین درحقیقت سورج کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہے اور دوسرے سیارے جو سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں وہ بھی سورج ہی کے ٹکڑے ہیں۔ چنانچہ جس طرح سورج اپنے محور کے گرد حرکت کر رہا ہے اسی momentum کا نتیجہ ہے کہ اس سے ٹوٹنے والے ٹکڑے بھی اس کے گرد چکر لگانے لگے۔ تو گویا یوں سمجھئے کہ ابتدا میں ہماری زمین بھی آگ کا ایک بہت بڑا کُرہ تھی' پھر یہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوئی۔ اس کے ٹھنڈا ہونے کے دو نتیجے نکلے۔ ایک یہ کہ اس سے بخارات نکلے جو اوپر گئے تو انہوں نے فضا (کُرۂ ہوائی) کی صورت اختیار کی۔ دوسرے یہ کہ ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے خود زمین سکڑ گئی' جس کے نتیجے میں اس کی سطح پر کہیں بلندیاں پیدا ہو گئیں اور کہیں گہرے غار وجود میں آ گئے۔ فضا کا غلاف ہماری زمین کے گرد تیس پینتیس میل ہے۔ فضا میں جمع ہونے والی گیسوں کے نتیجہ میں بارش ہوئی اور نہ معلوم کتنے عرصہ تک بارش ہی ہوتی رہی' جس سے نشیبی علاقوں میں پانی جمع ہو گیا اور اس طرح سمندر وجود میں آئے۔ جو علاقے

اونچے تھے وہ خشکی قرار پائے۔ پھر جہاں یہ برّ و بحر آپس میں جڑے ہوئے تھے وہاں دلدلی علاقوں میں حیاتِ ارضی کا آغاز ہوا۔ یہ حیاتِ ارضی دو طرح کی تھی: ا۔ حیاتِ نباتاتی (Plant Kingdom) ۲۔ حیاتِ حیوانی (Animal Kingdom)۔

حقیقت کے اعتبار سے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس زمین پر جو بھی ہے وہ سورج ہی سے ہے (ہمہ از اوست)' یہ سب سورج ہی کا ظہور ہے۔ زمین بھی سورج ہی کا ٹکڑا تھی جو ٹھنڈا ہوا' پھر اسی میں سے gases نکلی تھیں' خارج سے تو کوئی شے نہیں آئی۔ ہوا بھی وہیں سے ہے' خشکی بھی وہیں سے ہے اور سمندر بھی وہیں سے ہیں۔ پھر وہیں کے امتزاج (interaction) سے اس دلدلی علاقے میں حیاتِ نباتاتی اور حیاتِ حیوانی کا آغاز ہوا۔ گویا زمین پر جو کچھ ہے اس کا ماخذ (origin) سورج ہے۔ گویا یہ تو ہوئی حقیقت۔ اصل طریقت اور شریعت کیا ہے؟ وہ سورج مکھی کے پھول کا طرزِ عمل ہے۔ جیسے ہی سورج طلوع ہوتا ہے وہ اپنا رُخ سورج کی طرف کر لیتا ہے' جیسے جیسے سورج گردش کرتا ہے اس کا رخ بدلتا جاتا ہے' جب سورج غروب ہوتا ہے تو پھول بھی مرجھا جاتا ہے۔ اگلی صبح جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ پھر تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ گویا کہ سورج مکھی کے پھول نے اپنے وجود کا مقصد اور اپنا نصب العین یہ مقرر کیا کہ وہ اپنے اصل مبدأ کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھے۔ یہی طرزِ عمل ایک بندۂ مؤمن سے مطلوب ہے: ﴿اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾ بجائے اس کے کہ سورج مکھی کا پھول اس سوچ بچار میں غلطاں و پیچاں رہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں' سورج کا ٹکڑا ہوں' میری زمینی حیات کا آغاز کیسے ہوا' کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اپنا رخ سورج کی طرف رکھو۔ اسی طرح ہمیں اس فکر میں غلطاں و پیچاں ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کہاں سے وجود میں آئے ہیں اور کیسے وجود میں آئے ہیں' ہمارے وجود اور ہماری زندگی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیے کہ: ﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ﴾ اور ﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ سورج مکھی کے پھول کی طرح ہمارے دل کی کلی کھلے تو اس سے کہ ہم اللہ کو یاد کر رہے ہیں' اللہ کے حضور میں حاضر ہیں۔ اور اگر کہیں بھی بندۂ مؤمن محسوس کرے کہ غیاب ہو گیا ہے' حضوری نہیں رہی' کوئی بُعد ہو گیا ہے' میری توجہ کسی اور طرف مبذول ہو گئی ہے' میں کچھ غافل ہو گیا ہوں تو فوراً اس پر پچھتاوے کی کیفیت طاری ہو اور وہ پھر اپنا رخ اسی کی طرف کر لے' جیسے سورج مکھی کا معاملہ ہے کہ سورج طلوع ہوتے ہی وہ کھل اٹھتا ہے اور پورا دن جدھر

سورج جاتا ہے ادھر ہی وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے' اور جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ بھی بجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے اصل میں حقیقت' طریقت اور شریعت۔ حقیقت تو یہی ہے کہ سورج مکھی بھی سورج سے نکلی ہوئی ایک شے ہے' لیکن ہماری توجہ اصلاً طریقت اور شریعت پر مرکوز ہونی چاہیے۔

وحدت الوجود' مجدّد الفِ ثانی اور علاّمہ اقبال

آج میں یہ بھی عرض کر دوں کہ لاہور منتقل ہونے کے بعد ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک قریباً چھ سال مجھے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا بڑا وافر اور مسلسل موقع ملا ہے۔ میرا کلینک کرشن نگر میں تھا جو اَب اسلام پورہ کہلاتا ہے۔ چشتی صاحب روزانہ شام کو میرے پاس آ جاتے تھے اور ان سے میرا تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ اس طرح میں نے دس بارہ سال قبل جو پختہ رائے قائم کر لی تھی' اس میں مجھے نہ صرف پختگی حاصل ہوئی بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرا گیا۔ اس ضمن میں مَیں ان کا احسان مند ہوں۔ اُس وقت تک میں نے نہ تو شیخ احمد سرہندی کی مکتوبات کا مطالعہ کیا تھا نہ علامہ اقبال کے فارسی کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا' لہٰذا یہ حقیقت مجھے درحقیقت ان کے ذریعے ہی معلوم ہوئی کہ شیخ احمد سرہندیؒ بھی اپنی زندگی کے آخری دَور میں وحدت الوجود کے قائل ہو گئے تھے۔ اس پر انہوں نے کلامِ اقبال کی شروحات میں بڑی مفصل تحریریں لکھی ہیں اور یہ بات ثابت کی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال نے بھی زندگی کے آخری دَور میں ''لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ'' کا نعرہ بڑے بلند آہنگ کے ساتھ بلند کیا تھا۔ ان کی ایک رباعی ملاحظہ کیجیے جو علامہ نے اپنی وفات سے کل تین ماہ قبل کہی تھی ؎

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب
بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب
چساں مؤمن کند پوشیدہ را فاش
ز لا موجودَ اِلاّ اللّٰہ در یاب!

''اے غافل! تو ایسا دل حاصل کر جو آگاہ ہو۔ جیسے تمہارے بزرگ خود راستہ تلاش کرتے رہے ہیں (اور غور و فکر کے ذریعے سے حقیقت تک پہنچتے رہے ہیں) اسی طرح تم بھی کوشش کرو (یعنی محض تقلید کی روش اختیار نہ کرو بلکہ تحقیق کا راستہ اختیار کرو۔) جس طرح مؤمن پوشیدہ کو رفتہ رفتہ فاش کرتا ہے تم بھی ''لاموجود الاّ اللّٰہ'' سے حقیقت تک رسائی حاصل کرو۔''

یہ گویا فکر انسانی کی آخری منزل ہے۔ تو حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی وہیں پہنچے تھے اور علامہ

اقبال بھی بالآخر وہیں پہنچے۔ بلکہ علامہ اقبال کے بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ تصوف اور ہمہ اوست کا عامیانہ تصور بھی ان کے یہاں موجود ہے۔لیکن میں اس وقت اس طرف نہیں جانا چاہتا کہ ان کی کیا تاویل کی جائے گی۔ میں نے اِس وقت صرف یہ بتایا ہے کہ سن ۵۶۔۱۹۵۵ء میں میری جورائے قائم ہو چکی تھی اس کے بعد ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک کے عرصہ میں اس میں پختگی پیدا ہوئی۔اب میں چاہتا ہوں کہ ذرا اس کی وضاحت کر دوں۔ جہاں تک ''ہمہ از اوست'' کا تعلق ہے یہ تمام مسلمان اہل سنت' متکلمین' ائمہ اور علماء دین کے نزدیک متفق علیہ بات ہے۔ یہ توحید کا کم سے کم تقاضا ہے کہ جو کچھ ہے اللہ سے ہے (ہمہ از اوست)' یعنی وہ خود بخود وجود میں نہیں آیا' بلکہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے۔ جیسے سورۃ الطّور میں فرمایا گیا:﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''کیا یہ خود بخود بن گئے (کسی کے بنائے بغیر) یا یہ خود اپنے آپ کو بنانے والے ہیں؟'' ظاہر بات ہے کہ بنانے والا اللہ ہے۔نہ از خود کوئی بنا ہے اور نہ یہ اپنے آپ کو بنانے والے ہیں۔قرآن مجید میں یہ مضمون دو مقامات پر آیا ہے۔سورۂ لقمان کی آیت ۱۱ میں یہ مضمون بایں الفاظ آیا ہے:

﴿هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَا ذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ﴾

''یہ سب اللہ کی تخلیق ہے' ذرا بتاؤ کہ اس کے سوا بھی کسی نے کچھ بنایا ہے؟''

''ہمہ از اوست'' توعقیدۂ توحید کی مبادیات میں سے ہے جس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ''ہمہ با اوست'' کیا ہے؟ یہ اصل میں وہ نظریہ ہے جو فلسفۂ وجود کی پہلی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔

ہمارے اسلاف میں ایک تو علاؤ الدین صمدانیؒ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش (enunciate) کیا اور پھر یہ زیادہ مشہور مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ وحدت الشہود کے نام سے ہوا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کائنات اور خالق دونوں کا وجود اپنی اپنی جگہ پر ہے۔اب ظاہر ہے کہ دونوں کا ساتھ ساتھ تو ثنویت ہے' پھر تو (خالق اور مخلوق) دو وجود ہو گئے! چنانچہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے ڈاکٹریٹ کا جو تھیسز لکھا تھا: "Mujaddid's Concept of Toaheed" وہ مجھے بہت پسند ہے۔اکثر لوگوں کی نظروں سے حضرت مجددؒ کا آخری موقف اوجھل ہے' لیکن عام طور پر جو چیز ان کی طرف منسوب ہوتی ہے وہ یہی ثنویت (Dualism) ہے' توحید وجودی نہیں ہے۔ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اسے واضح طور پر تسلیم کیا ہے۔ایک دیانت دارانہ تحقیق کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا جو بھی

نتیجہ نکل رہا ہے آدمی اسے بیان کرے۔ بہرحال یہ ثنویت ہے اور ایک اعتبار سے اسے شرک فی الوجود کہا گیا ہے۔

''ہمہ اوست'' اور اس کی مختلف تعبیرات

غالبؔ کا ایک شعر ہے۔

جاروبِ لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
با گردِ فرش و سینہ بایواں برابر است

یعنی ہمارا سینہ ایک ایوان کی مانند ہے اور یہ شرک فی الوجود (کہ وجود ہمارا بھی ہے اور اللہ کا بھی) اُس گرد کی مانند ہے جو اس ایوان پر آ گیا ہے۔ چنانچہ ''لا'' کی جھاڑ لاؤ اور اس سے اسے صاف کر دو۔ شرک فی الوجود کا خاتمہ توحید وجودی سے ہوتا ہے' جس کی ایک تعبیر ''ہمہ اوست'' ہے۔ دنیا بھر میں جو چوٹی کے نظریاتی (idealist) فلسفی ہیں وہ اسی کے قائل ہیں۔ ان کا نقطۂ آغاز افلاطون ہے۔ حکیم فلاطینوس کا تعلق سکندریہ (مصر) سے تھا جس کے نظریات ہمارے مسلمانوں کے تصوف میں سرایت کر گئے۔ اسی طرح ابن عربی اندلس سے متعلق تھے۔ اس ضمن میں دو بڑی شخصیتیں برعظیم میں مشہور ہوئیں۔ ایک ہندوؤں میں شنکراچاریہ اور دوسرے اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیدل' جو فارسی کے عظیم شعراء میں سے ہیں۔ یہ چار چوٹی کے لوگ ہیں جنہوں نے اس نظریئے کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ البتہ اس کے جو تین shades ہیں اور اس اعتبار سے اس کی جو تین تعبیرات ہیں انہیں علیحدہ علیحدہ identify کر لیجیے۔ اسی حوالے سے میں نے کہا تھا کہ ع

ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!

اس فرق کو اگر ملحوظ نہیں رکھیں گے تو شرک وکفر ہو جائے گا۔

ہمہ اوست کی ایک تعبیر Pantheism ہے۔ یعنی جب وجود ایک ہی ہے تو یہ کائنات گویا خدا کا حصہ ہے یا ہمہ تن خدا ہے' خود خالق ہی نے مخلوق کی شکل اختیار کر لی' جیسے برف پگھل کر پانی بن گئی اور پانی کو آپ نے ابالا تو وہ بھاپ بن گیا۔ اب پانی ہی برف بھی ہے اور بھاپ بھی ہے۔ اس نظریے میں کائنات کو حقیقی مانا گیا ہے کہ یہ درحقیقت واقعی ہے اور یہ خالق کا حصہ ہے یا خالق ہی ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ عظیم ترین کفر وشرک ہے اور اس کا اسلام کے ساتھ یا حقیقت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔

دوسری تعبیر وہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی زندگی کے آخری دَور میں اختیار کی کہ حقیقت میں وجود ایک ہی ہے جو اللہ کا ہے' جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ درحقیقت ہے ہی نہیں۔ اس کی مثال میں دے چکا ہوں کہ آپ ایک مشعل کو دائرے کی صورت میں حرکت دیں تو ایک آتشیں دائرہ نظر آئے گا جو حقیقت میں موجود نہیں ہے۔ یہ دراصل اس کائنات کی نفی ہے کہ اس کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ چنانچہ وجود صرف ایک ذاتِ باری تعالیٰ کا رہ گیا' جس سے شرک اور ثنویت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی کو غالبؔ نے یوں بیان کیا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

اور عربی شعر مَیں آپ کو پہلے بھی سنا چکا ہوں ؎

کل ما فی الکون وھمٌ او خیالٌ

او عکوسٌ فی المرایا او ظلالٌ

یعنی کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ محض وہم یا خیال ہے' یہ یا تو محض آئینوں میں نظر آنے والے عکس ہیں یا سائے ہیں۔ حقیقت میں تو صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود ہے اور کوئی شے حقیقتاً موجود نہیں ہے ع

ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے!

لیکن یہ بات کہ کائنات کا وجود ہے ہی نہیں' قابل قبول نظر نہیں آتی۔ یہ ایک شاعرانہ خیال یا فلسفیانہ توجیہہ تو ہو سکتی ہے' لیکن کائنات تو بڑی ٹھوس حقیقت ہے۔ آپ نے شرک فی الوجود کی نفی کرنے کے لیے کائنات ہی کی نفی کر دی؟

میرے نزدیک اس کا اصل حل وہ ہے جو شیخ ابن عربیؒ نے دیا ہے' جو مَیں بیان کر چکا ہوں' کہ حقیقت و ماہیت وجود کے اعتبار سے خالق و مخلوق کا وجود ایک ہے' کائنات میں وہی وجودِ بسیط سرایت کیے ہوئے ہے' لیکن جہاں تعین ہو گیا تو وہ پھر غیر ہے' اُس کا عین نہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ یہ کائنات کا وجود ایک اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا عین اور دوسرے اعتبار سے اس کا غیر ہے۔ یہ ابن عربی کا فلسفہ ہے۔ اور ابن عربی ہمارے دینی حلقوں کی سب سے زیادہ متنازعہ فیہ (controvercial) شخصیت ہیں۔ ان کی حمایت اور مخالفت دونوں انتہا کو پہنچی ہیں۔ ہمارے صوفیاء

(۱) یہ کتاب اب انجمن خدام القرآن سے شائع ہو رہی ہے۔

کی عظیم اکثریت انہیں شیخ اکبر کے نام سے جانتی ہے۔ان کی کتابیں ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحاتِ مکیہ'' تصوف کی بہت اہم کتابیں ہیں۔ دوسری طرف اختلاف بھی اتنا شدید ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے ان کو ملحد و زندیق قرار دیا ہے اور جو بھی شرعی گالی ہوسکتی تھی ان کو دی ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اگر شیخ اکبر کی کسی بات کی تائید کر رہا ہوں تو وہ ان کا صرف یہ نظریہ ہے' باقی میں نے نہ فصوص الحکم کا مطالعہ کیا ہے' نہ فتوحاتِ مکیہ کا۔ یہ بڑی دقیق کتابیں ہیں اور آدمی جب تک قدیم فلسفہ و منطق میں مہارتِ تامہ بہم نہ پہنچالے اس کے لیے ان کتابوں کا پڑھنا آسان کام نہیں ہے۔ ویسے بہت سی باتیں ان کی طرف غلط بھی منسوب کر دی گئی ہیں' جیسا کہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اپنی کتاب ''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش[1]'' میں بہت سی مثالیں دی ہیں کہ خاص طور پر ہمارے ہاں جو باطنی لوگ تھے (جو شیعیت کا ایک شیڈ تھا) انہوں نے اہل سنت کو گمراہ کرنے کے لیے صوفیاء کی طرف بہت غلط باتیں منسوب کی ہیں۔ انہوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بہت بڑے عالم اور صوفی کسی جگہ گئے تو وہاں ایک مسجد میں ان کی اپنی کتاب کا درس ہو رہا تھا' جسے سن کر انہوں نے کہا کہ توبہ توبہ میں نے یہ بات آج تک کبھی نہیں کی' بلکہ یہ بات تو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی۔

اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ بہت بڑی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم اس کتاب (القرآن) کے خود محافظ ہیں ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ کتابِ الٰہی کا محفوظ رہنا بھی آسان کام نہیں ہے جب تک کہ اللہ کا خصوصی فیصلہ نہ ہو۔ اسی لیے تو ایک دَور میں احادیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں موضوع روایات کا ایک ایسا طومار شامل کر دیا گیا تھا کہ پھر محدثین کو پوری پوری زندگیاں کھپانی پڑیں اور انہوں نے موضوع روایات کو الگ کیا اور صحیح وضعیف احادیث کو بھی علیحدہ علیحدہ کیا۔ اسی طرح اہل تصوف کی طرف بہت سی غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ میں نہ تو ابن عربی کا وکیل ہوں اور نہ ان کی ہر بات کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ ان کے ہاں جو تضاد موجود ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان ہی کی طرف یہ شعر بھی منسوب ہے کہ ؎

الرّب عبدٌ والعبد ربٌّ

یا لیت شعری من المکلّف!

''ربّ ہی عبد ہے اور عبد ہی ربّ ہے (یعنی خالق و مخلوق ایک ہی ہیں) تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس کو حکم دیا جا رہا ہے (کہ عبادت کرے اور کس کی عبادت کرے!)''

لیکن دوسری طرف ان ہی کا ایک شعر ہے ۔

الـــــرّبّ رَبٌّ وان تـــــنـــــزّل
والـــعـبـــد عبـــدٌ وان تـــرقّـــی

''اللہ اللہ ہی ہے' چاہے وہ کتنا ہی نزول فرما لے اور بندہ' بندہ ہی رہے گا چاہے جتنا بھی بلند ہو جائے''۔

حضورﷺ ساتویں آسمان تک گئے ہیں لیکن وہ معبود نہیں بن گئے' بلکہ عبد ہی رہے ہیں۔

میں نے اس مسئلہ کو ایک اور طریقے سے بہت ہی سادگی کے ساتھ حل کیا ہے۔ مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ میری گفتگو' میرا غور وفکر اور میرے اخذ کردہ نتائج بالکل mathematical اور الجبرا کے فارمولوں کی طرح ہوتے ہیں۔ آج سے ۳۵ سال پہلے میری جو رائے تھی وہ میں بیان کر چکا۔ آج اس ضمن میں میری کیا رائے ہے اور اس کا صغریٰ کبریٰ کیا ہے' یہ میں اب بیان کر رہا ہوں۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ﴾ کے حوالے سے میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہ رہا ہوں۔ ظاہر اور باطن کے اعتبار سے اس آیت کی کچھ مزید وضاحت ہونی چاہیے تھی جو نہیں ہو سکی۔ اس حوالے سے امام رازی کا ایک قول آپ کو سنانا چاہوں گا۔ اللہ تعالیٰ ظاہر بھی اتنا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی ظاہر نہیں' وہ self evident ہے' آفتاب آمد دلیل آفتاب! اس لیے کہ پوری کائنات درحقیقت اسی کا ظہور ہے۔

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہتاب و ماہی سب ہے ظہور تیرا!

تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظاہر کون ہوگا؟

ردائے لالہ و گل ' پردۂ ماہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے!

پوری کائنات کے اندر اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت' اس کے علم اور اس کی حکمت کا ظہور ہے۔

وفـــی کـــلّ شـــیءٍ لـــــہ آیۃٌ
تـــدلّ عـــلٰـــی انّـــــہ واحـــدٌ

ہر شے میں اُس کی نشانی موجود ہے جو یہ دلالت کرتی ہے کہ وہ اکیلا ہے' تنہا ہے۔ لیکن اپنی کُنہ کے اعتبار

سے اور اپنی ذات کے اعتبار سے وہ اس قدر باطن اور خفی ہے کہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ظاہر اور باطن ہونے میں امام رازی نے بڑی خوبصورت نسبت قائم کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ:

ان کمال کونہ ظاھرا سبب لکونہ باطنا' فسبحان من اختفٰی عن العقول لشدۃ ظھورہ واحتجب عنھا بکمال نورہ

''درحقیقت اس کے ظہور کی شدت اور کمال ہی اس کا سبب ہے کہ وہ نگاہوں سے چھپ گیا ہے (سورج جب نصف النہار پر چمک رہا ہو تو آپ آنکھ بھر کر اسے دیکھ نہیں سکتے' اس کی وجہ اس کی شدتِ ظہور ہے جس کے باعث آپ کی نگاہ چکا چوند ہو جاتی ہے۔) بس بڑی پاک ہے وہ ذات جو اپنے شدتِ ظہور کے باعث عقولِ انسانی سے چھپ گئی ہے اور اپنے نور کے کمال کے باعث عقول انسانی سے حجاب میں آ گئی ہے''۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ظاہر اور باطن ہونا تو بیک وقت (simultaneous) ہے اور ان دونوں میں جو گہرا رشتہ ہے اس کی اس طرح تاویل کی جا سکتی ہے جیسے امام رازی نے فرمائی ہے۔

شیخ ابن عربی کے بارے میں مَیں عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک حقیقت و ماہیتِ وجود کے بارے میں ان کی رائے کا تعلق ہے' میں اس سے متفق ہوں اور میرا مسلک بھی وہی ہے۔ البتہ اور بہت سی باتیں' خواہ انہوں نے لکھیں یا ان کی طرف غلط منسوب کر دی گئیں' ان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا میں نہ تو ان کے بارے میں جواب دہ ہوں' نہ ان کی وضاحت میرے ذمہ ہے اور نہ ہی مجھے ان کے وکیل کی حیثیت حاصل ہے۔ خود اس فلسفہ وجود کے بارے میں بھی مَیں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا تعلق نہ شریعت سے ہے نہ طریقت سے۔ اس فلسفہ کو جس کا جی چاہے قبول کرے اور جو اسے ردّ کرنا چاہے ردّ کر دے۔ اس کے نہ ماننے سے کسی اعتبار سے بھی دین میں کوئی کمی یا نقص واقع نہیں ہوتا۔ البتہ تنقید اور اختلاف کے معاملے میں دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کے نظریات پر آپ تنقید کر رہے ہیں پہلے اس کے اصل مسلک کو ضرور سمجھ لیں۔ شیخ ابن عربی کے فلسفہ وجود پر اکثر و بیشتر ناقدین' بالخصوص آج کل کے سلفی المزاج لوگ' جس انداز کی تنقیدیں کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو ان لوگوں نے اس مسئلہ کو سمجھا ہی نہیں' اور دوسرے یہ کہ جو باتیں شیخ ابن عربی نے کہی ہی نہیں وہ بھی ان سے منسوب کر دیتے ہیں۔ بہرحال اس مسئلے کو میں نے اپنے طور پر جس طرح حل کیا ہے وہ میں بیان کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت تو ہمارے لیے مطلوب و مقصود ہے اور اسی پر ہمارے طرزِ عمل اور دینی

رویئے کی ساری بنیاد ہے۔ معرفتِ ربّ جس قدر گہری ہوگی اسی قدر ہمارے عمل میں گہرائی ہوگی' معرفت میں جتنی زیادہ وسعت ہوگی ہمارے دینی رویئے اور دینی روش میں بھی اتنی ہی زیادہ وسعت ہو گی۔ گویا معرفتِ ربّ اور ہمارا دینی رویہ ایک دوسرے کے ساتھ راست متناسب (proportionate) ہوں گے—— میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دو حصے ہیں: (۱) ذاتِ باری تعالیٰ' اور (۲) صفاتِ باری تعالیٰ—ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں مَیں نے آپ کو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دو مقولوں پر مشتمل ایک شعر سنایا تھا:

الـعِـجـزُ عـن دَرکِ الـذّاتِ اِدراکٌ
والبَـحـثُ عـن کُـنہِ الذّاتِ اِشراکٌ

یعنی جب انسان کو اللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا احساس ہو جائے تو بس یہی ادراک ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ میں کھود کرید کرو گے تو شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ گویا معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!

شیخ سعدیؒ نے اس بات کو خوب بیان کیا ہے ؎

تواں در بلاغت بہ سُحباں رسید
نہ در کنہِ بے چونِ سبحاں رسید!

سُحباں ایک بہت ہی حکیم شخصیت کا نام ہے جو فصاحت و بلاغت کی معراج پر فائز تھے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ بلاغت و فصاحت اور خطابت میں تو انسان سحباں تک بھی پہنچ سکتا ہے' لیکن ذاتِ باری تعالیٰ سبحانہٗ کی کُنہ تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دوسرا حصہ صفات پر مشتمل ہے۔ معرفت ربّ کے بارے میں مَیں اپنی حدود و قیود (limitations) عرض کر چکا ہوں کہ ہماری ساری معرفت صفات کے حوالے سے ہے۔ ''ایمانِ مجمل'' کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ

''میں ایمان لایا اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور صفات سے ظاہر ہے''۔

لیکن صفات میں بھی ہم نہ اُن کی کمیت کا ادراک کر سکتے ہیں اور نہ کیفیت کا۔

صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہمارے ہاں علم کلام کا یہ مسئلہ متکلمین کے مابین ہمیشہ زیر بحث

رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کا عین ہیں یا غیر؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس مسئلے کی نشاندہی کی ہے ؎

ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات؟
اُمت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذات وصفات میں کیا نسبت ہے؟ ہمارے لیے تو صفت اضافی شے ہے۔ ایک وقت تھا کہ مجھے کچھ بھی علم حاصل نہیں تھا۔ آج مجھے تھوڑا یا زیادہ کچھ نہ کچھ علم حاصل ہے' اور ہوسکتا ہے کہ میں ارذل العمر تک پہنچ جاؤں اور وہ علم بالکل زائل ہو جائے (اعاذنا اللہ من ذٰلک) گویا کہ صفتِ علم ہمارے وجود پر ایک اضافی شے ہے' وہ ہمارے وجود کا حصہ نہیں ہے۔ لیکن کیا ہم اللہ کے بارے میں یہ تصور کر سکتے ہیں؟ اس مسئلہ پر بڑی طویل بحثیں ہوئی ہیں۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھے مولانا منتخب الحق صاحب سے استفادہ کا موقع ملا جو اِس دَور میں فلسفہ ومنطق کے قدیم مکتبِ فکر ''خیر آبادی اسکول آف تھاٹ'' کی آخری شخصیت تھے۔ جب میں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا تھا تو وہاں میں نے مولانا منتخب الحق صاحب سے استفادہ کیا اور یہ مسئلہ میری سمجھ میں آیا۔ میں یہاں وہ مسئلہ تو بیان نہیں کر رہا' لیکن اس کا سب کے نزدیک جو متفق علیہ حل ہے وہ ہے ''لا عینٌ ولا غیرٌ ''یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات نہ اس کی ذات کا عین ہیں اور نہ غیر۔ سمجھ میں آئے تب بھی یہ ماننا پڑتا ہے نہ آئے تب بھی ماننا پڑتا ہے' اس لیے کہ اگر عین مانیں گے تب بھی بہت سی ایسی چیزیں لازم آ جائیں گی جنہیں تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اگر غیر مانیں گے تب بھی ایسی بہت سی چیزیں لازم آ جائیں گی جن کا اللہ کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ''لا عینٌ ولا غیرٌ '' کی ایک تعبیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ''من وجہٍ عینٌ ومن وجہٍ آخر غیرٌ ''یعنی ایک اعتبار سے وہ غیر ہیں اور ایک اعتبار سے عین۔ یہ گویا دوسرا مقدمہ ہوا۔

اب آیئے تیسری بات کی طرف! ہر شخص جانتا ہے کہ یہ سلسلۂ کون ومکان اللہ تعالیٰ کے ایک امر ''کُن'' کا ظہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں دو مقامات (الکہف:۱۰۹ ولقمان:۲۷) پر آیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے کلمات کو گن نہیں سکتے۔ اگر کل روئے ارضی کے درخت قلم اور سارے سمندر سیاہی بن جائیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے' لیکن سیاہی ختم ہو جائے گی۔ اگر سیاہی کی اتنی ہی مقدار مزید لائی جائے تو وہ بھی اس مقصد کے لیے ناکافی ہوگی۔ ﴿لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ

رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا ﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات اللہ کے کسی نہ کسی کلمۂ کن کا ظہور ہیں۔ اب سمجھئے کہ ''کُن'' کیا ہے؟ کلام ہے' کلمہ ہے۔ اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ گویا کہ حرفِ ''کُن'' اللہ کی صفت ہے اور صفت کے بارے میں متکلمین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ''لا عینٌ ولا غیرٌ ''۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ کائنات نہ اللہ کا عین ہے اور نہ غیر ہے' اور یہی بات ہے جو شیخ ابنِ عربی کہہ رہے ہیں:

من وجہٍ عینٌ ومن وجہٍ آخر غیرٌ

ایک اعتبار سے یہ عین ہیں اور ایک اعتبار سے غیر ہیں۔ ماہیت وجود (essential being) میں اتحاد ہے' لیکن جہاں بھی تعین ہوگا اور مختلف چیزوں کا definite وجود مان لیا جائے گا تو وہ اللہ کا غیر ہے۔ یہی مسلک ابنِ عربی کا ہے اور یہی اس مسئلے میں میری توجیہہ ہے۔

اس سلسلہ میں آخری بات یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے حضرات کا شاید یہ ذوق نہ ہو' اس کے باوجود میں یہ مسئلہ اس لیے بیان کر دیا کرتا ہوں کہ ان بزرگوں اور اسلاف کے بارے میں سوئے ظن نہ رہے جو وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ اس سے ہمیں اپنے آپ کو بچا لینا چاہیے' کیونکہ یہ بہت بڑی محرومی ہے۔ کسی بھی شخص سے اختلاف کا حق ہر شخص کو حاصل ہے' یہاں تک کہ آراء کی حد تک ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی اختلاف کر سکتے ہیں۔ کوئی شخص یہ رائے رکھ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فلاں معاملہ میں یوں نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک عصمت خاصۂ نبوت ہے اور نبوت کے خاتمہ کے ساتھ عصمت ختم ہو چکی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اب کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔
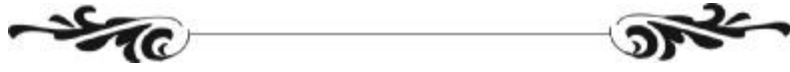
درس 26

خالق و مالک ارض وسماوات
اور
ذات اول وآخر وظاہر وباطن کے
انسانوں سے دو تقاضے
ایمان وانفاق

سُوْرَةُ الْحَدِيْد کی آیت ۷ تا ۱۱ کی روشنی میں!

درس ۲۶

خالق و مالکِ ارض وسماوات اور ذاتِ اوّل وآخر وظاہر وباطن کے انسانوں سے دو تقاضے:

ایمان واِنفاق

سورۃ الحدید کی آیات ۷ تا ۱۱

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ط فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَاَنۡفَقُوۡا لَہُمۡ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ﴿۷﴾ وَمَا لَکُمۡ لَا تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ ج وَالرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾ ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ط وَاِنَّ اللّٰہَ بِکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۹﴾ وَمَا لَکُمۡ اَلَّا تُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلِلّٰہِ مِیۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ط لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ الۡفَتۡحِ وَقٰتَلَ ط اُولٰٓئِکَ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیۡنَ اَنۡفَقُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَقٰتَلُوۡا ط وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۱۰﴾ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ ﴿۱۱﴾﴾

آیاتِ زیرِ درس کا رواں ترجمہ و مفہوم

اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ اس کے عملی پہلو پر مشتمل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے ان پانچ آیات کا ایک رواں ترجمہ سامنے آ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے پہلی ہی آیت بڑی عظمت کی حامل ہے اور ان پانچوں کو ایک کل کی حیثیت سے سامنے رکھیں گے تو نظر آئے گا کہ جہاں ایک طرف فصاحت و بلاغت کی معراج ہے وہیں جامعیت اور اس کے ساتھ ترتیب اور توازن کی بھی انتہا ہے جو آپ کو ان پانچ آیات میں ملے گی۔ پہلی آیت کا رواں ترجمہ یوں ہوگا:

> ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر (یا ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر) اور خرچ کر دو (لگا دو، کھپا دو) ان سب چیزوں میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ تو جو لوگ تم میں سے (دینِ متین کے یہ دو تقاضے پورے کر دیں۔ یعنی) ایمان لے آئیں اور انفاق کا حق ادا کر دیں تو ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے''۔

ایک آیت میں جامعیت کے ساتھ دین کے جملہ تقاضوں کو دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ حسنِ ترتیب اور حسنِ توازن ملاحظہ کیجیے کہ اب ان میں سے ہر ایک تقاضے پر دو دو آیات آ رہی ہیں، ایک ایک آیت میں ذرا سرزنش، ڈانٹ ڈپٹ، زجر اور ملامت کا انداز ہے اور ایک ایک آیت میں ترغیب اور تشویق ہے۔ فرمایا:

> ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے درانحالیکہ رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ اپنے ربّ پر ایمان رکھو اور وہ تم سے قول و قرار لے چکا ہے اگر تم واقعی مؤمن ہو''۔

اس آیت میں گویا کہ زجر و ملامت اور ایک طرح کی تنبیہہ اور سرزنش ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں تشویق و ترغیب آئی ہے کہ اگر تمہیں اپنے باطن میں جھانکنا نصیب ہو جائے، اپنے دلوں کو ٹٹولنے کی سعادت حاصل ہو جائے اور محسوس ہو کہ واقعتاً خانۂ دل ایمان سے خالی ہے تو بھی گھبراؤ نہیں۔ فرمایا:

> ''وہی ہے (اللہ) جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے پر روشن آیات، تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے''۔

اندھیرے شرک کے ہیں، کفر والحاد کے ہیں، مادیت کے ہیں، حرص و ہوا کی غلامی کے ہیں۔

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا!

یہ مختلف shades of darkness ہیں۔ قرآن مجید میں ''ظُلُمات'' ہمیشہ جمع کے صیغہ میں اور نور ہمیشہ واحد آیا ہے۔ نور کے اندر تعدّد بھی لایا گیا ہے تو بھی واحد کے صیغے میں: ﴿نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ﴾ جبکہ اندھیروں کا تذکرہ بایں الفاظ فرمایا: ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ﴾۔ تو اللہ نے یہ کتاب اتاری ہے' اس کی یہ آیاتِ بینات ہیں جو تمہیں ہر طرح کے اندھیروں سے نکال کر تمام ظلمات سے' ہر طرح کے shades of darkness سے روشنی میں لے آئیں گی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ رؤف ورحیم ہے۔ وہ تم پر بہت مہربان ہے' وہ تمہارا خیر خواہ ہے' تم پر رحم فرمانے والا ہے۔

تو یہ دو آیات ہو گئیں۔ اب اگلی دو آیات میں بھی یہی انداز ہے۔ ان میں سے پہلی آیت میں وہی سرزنش کا اسلوب ہے۔ فرمایا:

> ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (تم پر یہ بخل کیوں طاری ہو گیا؟ تم نے یہ سینت سینت کر رکھنے کی روش کیوں اختیار کر لی؟) حالانکہ آسمان وزمین کی وراثت تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ (تم سب دنیا سے چلے جاؤ گے اور یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے رہ جائے گا۔)
> برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق اور قتال کیا تھا۔ ان کے درجات بہت بلند ہیں اُن کے مقابلے میں جنہوں نے فتح کے بعد انفاق اور قتال کیا' اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔

فعل وہی ہے ''اِنفاق'' یعنی جان و مال کا کھپانا' لیکن جن حالات میں کوئی شخص کر رہا ہے اس اعتبار سے اس کی قدر و قیمت میں زمین وآسمان کا فرق وتفاوت واقع ہو جائے گا۔ جب دین غربت کی حالت میں ہے' پامال ہے' دین کا کوئی ساتھی نہیں' دین کا کوئی جاننے والا نہیں' ازروئے حدیث نبویؐ: ((بَدَاَ الۡاِسۡلَامُ غَرِیۡبًا وَسَیَعُوۡدُ غَرِیۡبًا کَمَا بَدَاَ' فَطُوۡبٰی لِلۡغُرَبَاءِ))[1] ''دین کی ابتداء حالت اجنبیت میں ہوئی اور عنقریب یہ دوبارہ ویسے ہی اجنبی ہو جائے گا جیسے ابتداء میں تھا۔ پس خوش خبری ہے ان اجنبیوں کے لیے''۔ تو اس حالت غربت میں جنہوں نے اسلام کا ساتھ دیا ان **السّٰبقون الاوّلون** کا اللہ کے ہاں جو مرتبہ ہے اس تک وہ لوگ ہرگز نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کو غلبہ حاصل ہونے کے بعد آئے اور قتال وانفاق کیا۔ اگر وہ حسن نیت سے آئے ہیں تو اُن کے اجر وثواب کی بھی اللہ کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے' لیکن درجے میں وہ اُن کے برابر کبھی نہیں ہو سکتے جنہوں

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان

نے حالتِ غربت میں اور حالتِ ضعف میں دین کا ساتھ دیا۔ ان سب سے اللہ کا بہت اچھا وعدہ ہے۔ جنت سب کو ملے گی‘ جو پہلے آئے ان کو بھی اور جو بعد میں آئے ان کو بھی‘ البتہ حسن نیت شرط ہے۔ پھر جنت کے درجات میں بھی بہت فرق و تفاوت ہوگا۔ حدیث میں آیا ہے کہ نچلے درجے والا جنتی اوپر کے درجے والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین سے آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ اس سے پہلے آیت۴ میں الفاظ آئے تھے: ﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ۝﴾ جبکہ یہاں فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ۝﴾ ’’بصیر‘‘ اور ’’خبیر‘‘ دونوں الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ قرآن مجید میں ترتیب کے لحاظ سے ’’بصیر‘‘ کو مقدم اور ’’خبیر‘‘ کو مؤخر کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ خبر اصل شے ہے‘ بصارت میں دھوکہ کھانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہ خبیر ہے‘ یعنی وہ تمہارے باطن سے بھی باخبر ہے‘ تمہاری نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں:

((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنۡظُرُ اِلٰی اَجۡسَادِکُمۡ وَلَا اِلٰی صُوَرِکُمۡ ، وَلٰکِنۡ یَنۡظُرُ اِلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَاَعۡمَالِکُمۡ)) (۱)

’’اللہ تعالیٰ نہ تمہارے تن و توش کو دیکھتا ہے اور نہ تمہاری صورتوں کو‘ بلکہ وہ تو تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے‘‘۔

آیت ۱۰ ذرا طویل آیت تھی جس میں سرزنش کا انداز تھا‘ اب اگلی آیت میں جو ترغیب کا انداز ہے واقعہ یہ ہے کہ غالب کے اس شعر کے بالکل مصداق ہے کہ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صَلا میرے بعد!

’’کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دینے کی ہمت کرے؟ پھر وہ اس کو اس کے لیے بڑھاتا رہے گا اور اس کے لیے بہترین اجر ہے‘‘۔

دنیا میں تمہارا قرضِ حسنہ کا تصور یہ ہے کہ صرف اصل زر واپس آئے گا‘ مزید کچھ نہیں ملے گا‘ لیکن تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اس کو بڑھاتا رہے گا اور انفاق کرنے والے کو اصل مال تو بڑھ کر دوگنا‘ چوگنا‘ سوگنا‘ بلکہ سات سوگنا تک ملے گا ہی‘ بہترین اجر و ثواب اضافی طور پر اس کے علاوہ ہوگا۔

(۱) متفق علیہ

یہ پانچ آیات ہیں جن پر اس سورۂ مبارکہ کا حصہ دوم مشتمل ہے‘ جس میں دین کے عملی تقاضوں کو نہایت فصاحت‘ بلاغت‘ خطابت اور غایت درجہ جامعیت اور حسن ترتیب اور حسن توازن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ان آیات میں جو ترتیب اور توازن موجود ہے واقعہ یہ ہے کہ میرے علم کی حد تک اس کی کوئی دوسری نظیر قرآن مجید میں نہیں ملتی۔

دعوتِ ایمان کے مخاطب کون؟

اب ہم ان آیات کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کرتے ہیں۔پہلی آیت میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خطاب کس سے ہو رہا ہے؟

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝﴾

’’ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور خرچ کرو اُس میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور انفاق کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے‘‘۔

اگر صرف اس آیت کے الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو امکان موجود ہے کہ یہ خطاب غیر مسلموں‘ یہود و نصاریٰ وغیرہ سے ہو‘ لیکن سیاق وسباق سے اور پوری پانچ آیات کے مطالعہ سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں اُن سے خطاب نہیں ہے‘ بلکہ یہ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ان سورتوں کا مجموعی تعارف کراتے ہوئے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ان سورتوں میں کفار ومشرکین‘ یہود و نصاریٰ وغیرہ سے خطاب ہے ہی نہیں‘ بلکہ روئے سخن کلیتہً مسلمانوں سے ہے۔

اب دوسرا سوال اٹھتا ہے کہ مسلمانوں میں سے کون لوگ اس کے مخاطب ہیں؟ وہ لوگ کہ جن کی حرارتِ ایمانی میں کچھ کمی ہے‘ معیارِ مطلوب پر نہیں ہے‘ جن کا جذبۂ انفاق جتنا ہونا چاہیے اتنا نہیں ہے‘ جن کا جوشِ جہاد اور ذوقِ شہادت جتنا ہونا چاہیے اتنا نہیں ہے‘ جن میں ضعف ہے اور ایمان اور اعمالِ صالحہ کا جو درجہ مطلوب ہے اس پر پورے نہیں اترتے۔یہ ہیں وہ لوگ جن سے یہ خطاب کیا جا رہا ہے۔اسی لیے ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کے دو ترجمے ہوں گے: ایک یہ کہ ’’ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر‘‘ اور دوسرا یہ کہ ’’ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر‘‘۔پہلے ترجمے میں یہ امکان موجود ہے کہ گویا کفار ومشرکین سے خطاب ہو رہا ہے‘ جبکہ دوسرے ترجمہ میں خطاب گویا مسلمانوں

سے ہے۔ میرے نزدیک درحقیقت یہاں خطاب ان کمزور اور ضعیف مسلمانوں سے ہے جن کے اندر حرارتِ ایمانی، جذبۂ جہاد اور جوشِ انفاق جتنا ہونا چاہیے نہیں ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں اس آیت کی ہم مضمون آیات کون سی ہیں۔ سب سے پہلے سورۃ النساء کی یہ آیت ملاحظہ کیجیے:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ (آیت ۱۳۶)

''اے اہل ایمان! ایمان لاؤ (یا ایمان رکھو) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اس نے اس سے پہلے نازل فرمائی تھی۔''

یعنی اے اہل ایمان! ایمان کا حق ادا کرو......اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! ویسے مانو جیسے ماننے کا حق ہے......اے ایمان کے دعوے دارو! ایمان لاؤ اور ایمان پختہ رکھو اللہ اور اس کے رسولؐ پر......الخ

سورۃ الصّف ہمارے منتخب نصاب کے حصہ چہارم کا مرکزی درس ہے۔ اس میں فرمایا:

﴿یٰۤـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾

''اے اہل ایمان! کیا تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان رکھو (یا ایمان لاؤ) اللہ اور اس کے رسولؐ پر، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔''

گویا کہ مخاطب بھی وہ ہیں جن کو ''یٰۤـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کہا گیا اور انہیں حکم بھی ایمان لانے کا دیا جا رہا ہے۔

اس ضمن میں تیسرا مقام سورۃ الحجرات (آیات ۱۴، ۱۵) کا ہے، جہاں یہ مضمون بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے منتخب نصاب کے حصہ سوم کی آخری سورت ہے۔ فرمایا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ

قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت۱۴)

''یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے (ہم مسلمان ہو گئے' ہم نے اطاعت قبول کر لی) جبکہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اور وہ حقیقی ایمان جسے اللہ کے ہاں تسلیم کیا جائے گا' وہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت اگلی آیت میں آ گئی۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

''حقیقی مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' پھر ہرگز شک میں نہیں پڑے (انہیں یقین کی کیفیت حاصل ہو گئی) اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

یہاں درحقیقت ایمانِ حقیقی کے دو اجزاء بیان کیے گئے ہیں: ایک یقین قلبی اور دوسرا عمل میں جہاد اپنے جان و مال کے ساتھ۔ اس یقین کے بارے میں علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

تو یہاں (سورۃ الحدید میں) درحقیقت اسی ایمانِ حقیقی کا ذکر ہے: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ یعنی ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر جیسا کہ ایمان کا حق ہے۔

''اِنفاق'' کا جامع مفہوم

اس کے بعد دین کا دوسرا تقاضا ان الفاظ میں بیان کر دیا گیا: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ﴾ ''اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اُس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے''۔ اس آیت میں چونکہ بہت مختصر الفاظ میں بات آ رہی ہے لہٰذا انفاق کے ساتھ ''فی سبیل اللہ'' مذکور نہیں' بلکہ مقدر (understood) ہے۔ اصل انفاق جو مقصود ہے وہ فی سبیل اللہ ہی ہے۔ اسے اگلی آیت میں کھول دیا گیا: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟'' انفاق سے عام طور پر مال کا خرچ کرنا مراد لیا جاتا ہے' حالانکہ یہ لفظ وسیع المفہوم ہے۔ اس

کی بحث سورۃ المنافقون میں ہو چکی ہے کہ نَفَقَ ۔ یَنْفُقُ جب ثلاثی مجرد سے آتا ہے تو اس کے معانی کسی چیز کے ختم ہو جانے' کھپ جانے اور صرف ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ اور یہ جاندار اور بے جان سب کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں کہ نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ (درہم ختم ہو گئے) اور نَفَقَ الْفَرَسُ (گھوڑا مر گیا)۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی جس حدیث میں آنحضور ﷺ نے جہاد کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی شخص کے اعمالِ صالحہ کے پلڑے میں کسی شے کا وزن اس گھوڑے یا سواری سے بڑھ کر نہیں ہو گا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے کام آ گئی' وہاں بھی لفظ ''نُفِقَ'' آیا ہے۔ گویا یہ لفظ بے جان اور جاندار دونوں کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ یہاں انفاقِ مال اور انفاقِ نفس دونوں مراد ہیں۔ انفاقِ نفس یہ ہے کہ آپ اپنی صلاحیت وقوت' محنت اور وقت صرف کر رہے ہیں۔ ایک انفاقِ مال ہے' کہ اللہ کے دیئے ہوئے وسائل آپ اس کی راہ میں خرچ کر رہے ہیں۔ لیکن دونوں پر اس لفظ ''انفاق'' کا اطلاق ہو گا۔ انفاقِ جان کی بلندترین منزل قتال ہے جب انسان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے۔ جو جنگ میں جاتا ہے موت کا خطرہ مول لے کر جاتا ہے۔ اگر لوٹ آئے تو گویا اسے ایک نئی زندگی ملی ہے' ورنہ جنگ میں جانے والا تو دراصل اپنی جان کی بازی لگانے کا فیصلہ کر کے گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں انفاق اور قتال دونوں لفظ آ گئے: ﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ﴾ ''برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے قبل انفاق کیا اور قتال کیا''۔ یہاں ''انفاق'' مال خرچ کرنے کے لیے اور ''قتال'' بذلِ نفس کے لیے آیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے جو عہد نامہ معین کیا ہے اس میں ''وَاُنْفِقَ مَالِیْ وَاَبْذُلَ نَفْسِیْ'' کے الفاظ شامل کیے ہیں۔ اس عہد نامہ کے پہلے حصے میں تو کلمۂ شہادت اور استغفار ہے۔ دوسرے حصے میں جو عہد ہے وہ بھی تنظیم سے نہیں ہے' نہ مجھ سے کوئی معاہدہ ہے' بلکہ اللہ سے ایک عہد ہے' اس لیے کہ یہ بیع وشراء تو اللہ اور بندے کے درمیان ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ﴾ ''اللہ نے خرید لیے ہیں اہل ایمان سے اُن کے مال بھی اور اُن کی جانیں بھی جنت کے عوض۔'' چنانچہ تنظیم کے ''عہد نامۂ رفاقت'' کا دوسرا حصہ یہ ہے:

اِنِّیْ اُعَاھِدُ اللّٰہَ عَلٰی اَنْ اَھْجُرَ کُلَّ مَا یَکْرَھُہٗ وَاُجَاھِدَ فِیْ سَبِیْلِہٖ جُھْدَ اسْتِطَاعَتِیْ '

وَاُنْفِقَ مَالِیْ وَاَبْذُلَ نَفْسِیْ لِاِقَامَةِ دِیْنِهٖ وَاِعْلَاءِ کَلِمَتِهٖ

''میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دوں گا جو اسے ناپسند ہے' اور اپنی استطاعت کی حد تک اس کی راہ میں جہاد کروں گا' اور اپنا مال بھی خرچ کروں گا اور اپنی جان بھی کھپاؤں گا اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے اور اس کے کلمہ کی سر بلندی کے لیے''۔

اس کے بعد یہ الفاظ آتے ہیں:

وَلِاَجْلِ ذٰلِكَ اُبَایِعُ ......

''اس مقصد کی خاطر میں بیعت کر رہا ہوں......''

اس مقصد کے لیے تنظیم میں شمولیت ہو رہی ہے' ورنہ یہ عہد معاہدہ' یہ قول وقرار' یہ میثاق اور یہ بیع وشراء تو ہر بندۂ مؤمن کا' اگر وہ حقیقتاً مؤمن ہے' اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اگر نہیں ہے تو یہ ہماری محرومی ہے۔

انفاق کتنا کیا جائے؟

اب اس آیت میں تیسری بات نوٹ کیجیے کہ ﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ ﴾ میں لفظ ''مِمَّا'' مِنْ اور مَا سے بنا ہے' اور مِنْ یہاں تبعیضیہ ہے۔ اللہ کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ اپنا سارا مال لگا دو۔ اللہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اپنے جسم اور جان کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں ہماری راہ میں لگا دو' بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جن جن چیزوں میں ہم نے تمہیں استخلاف عطا کیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں لگاؤ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''کتنا؟'' اس کا جواب سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَیَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط﴾ ''(اے نبیؐ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو''۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ بندۂ مؤمن اگر اس تقاضے کو واقعتاً کماحقہٗ ادا کرنا چاہتا ہے تو اس ضمن میں وہ کیا طرزِ عمل اختیار کرے! پہلے اپنی نیتوں کو صاف کیجیے' خالص کیجیے کہ جو بات سامنے آئے گی اس پر اگر دل گواہی دے گا کہ واقعتاً صحیح ہے تو قبول کریں گے۔ میرے نزدیک یہاں مِنْ تبعیضیہ اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ بندۂ مؤمن اپنے جان اور مال' اپنی صلاحیت' قوت' اوقات اور اپنی ذہانت وفطانت میں سے صرف اتنا حصہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے وقف کرے جو اُن کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے لازم ہے' جسے آپ subsistence level کہتے ہیں' اور وہ بھی اس لیے کہ زندہ رہنا ہے تاکہ ہم کام جاری رکھ سکیں۔ زندگی برائے زندگی نہیں' زندگی بجائے خود مطلوب ومقصود نہیں ہے' مطلوب ومقصود تو اللہ ہے۔ **لا مقصودَ الا اللّٰہ اور لا مطلوبَ الا اللّٰہ**۔ لیکن زندگی کو برقرار رکھنا ہے کہ یہ اللہ کی عطا کردہ

ایک نعمت ہے' اور اس لیے برقرار رکھنا ہے تا کہ اللہ کی راہ میں' اس کے دین کی اقامت اور سربلندی کے لیے' زمین پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کو بالفعل قائم کرنے کے لیے مسلسل محنت اور جدوجہد کی جا سکے۔ سائیں عبدالرزاق صاحب کا یہ قول میں متعدد بار بیان کر چکا ہوں کہ ''جو دم غافل سو دم کافر''۔ یعنی جو وقت اللہ کی یاد سے غفلت میں بیت گیا وہ گویا حالتِ کفر میں گزر گیا۔ اسی طرح جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہے اسے جمع کرنا حقیقت کے اعتبار سے کفر اور ضلالت ہے۔ سورۃ الھمزۃ ابتدائی مکی دَور کی سورت ہے۔ اس میں فرمایا گیا: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ ۝﴾ یعنی تباہی ہے' ہلاکت ہے' بربادی ہے' وَیل ہے ان لوگوں کے لیے جو ایک طرف اس اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں کہ لوگوں کی عیب چینی اور عیب جوئی کرتے ہیں' طنز وطعن کا کام کرتے ہیں اور دوسری طرف مال جمع کرتے ہیں اور اسے گنتے رہتے ہیں' اپنی مالی حیثیت کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ آج کی بیلنس شیٹ کیا ہے اور اس سال ہمارے اثاثوں (assets) میں کتنا اضافہ ہوا۔ ان کے دل کی کلی اسی سے کھلتی ہے۔ وہ یوں محسوس کرتے ہیں شاید اسی مال کی بدولت انہیں خلد اور دوام حاصل ہو جائے گا۔ ان تین آیات میں ایک پوری انسانی شخصیت کا ہیولیٰ اور ایک پوری ذہنیت کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے۔

مدنی قرآن میں انتہائی زمانے کی سورۃ التوبۃ کی آیات ۳۴' ۳۵ ملاحظہ کیجیے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝﴾

یعنی جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر رہے' اے نبی انہیں بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔ (طنز کیا گیا ہے کہ انہیں بشارت دے دیجیے)۔ ایک دن آئے گا کہ یہی سونا چاندی جہنم کی دہکتی آگ میں تپا تپا کر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا' لو اَب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو!

تو مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ سمجھ کر آسانی سے نہیں گزر جانا چاہیے' بلکہ یہ بڑا فکر انگیز مقام ہے۔ ہاں' آدمی کی ضروریات کتنی ہیں' یہ معاملہ ہر شخص پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لیے اس کا تعین خود کر لے۔ یہ

اس کی اپنی assessment ہے۔مختلف ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے حوالے سے سب کی ضروریات برابرنہیں ہوتی۔ایک چیز ایک شخص کے لیے luxury ہے‘ لیکن ہوسکتا ہے کہ دوسرے شخص کے لیے وہی چیز necessity ہو۔اس اعتبار سے کوئی لگا بندھا ضابطہ نہیں دیا جا سکتا۔البتہ ہر شخص اپنا جائزہ لے لے کہ درحقیقت ان تمام چیزوں میں سے جو اللہ نے اسے عطا کی ہیں‘اس قدر جتنا زندگی کے لیے‘ جسم اور جان کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے اور اپنے اہل وعیال کے لیے ناگزیر ہے وہ تو اس کا صحیح اور جائز حق ہے‘اس سے زائد جو کچھ ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔جیسا کہ اقبال نے کہا تھا ؎

جو حرفِ قُلِ العَفو میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

واقعہ یہ ہے کہ دین کی بہت سی باتوں پر بہت گہرے اور دبیز پردے پڑ گئے ہیں۔آپ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا وہ قول سن رکھا ہوگا کہ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وِعَائَیْنِ ...... حضرت ابوہریرہؓ کا انتقال سن ۵۷ یا ۵۸‘ یا زیادہ سے زیادہ ۵۹ ہجری میں حضرت امیر معاویہ ؓ کے دورِ حکومت میں ہوگیا تھا۔اس وقت بھی انقلابِ حال اس درجے ہو چکا تھا کہ فرماتے تھے:

حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وِعَائَیْنِ ‘ فَاَمَّا اَحَدُھُمَا فَبَثَثْتُہٗ فِیْکُمْ ‘ وَاَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُہٗ قُطِعَ ھٰذَا الْبُلْعُوْمُ (۱)

’’میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے (علم کے) دو برتن حاصل کیے تھے۔ان میں سے ایک کو تو میں نے تمہارے مابین خوب عام کیا ہے‘ لیکن اگر دوسرے میں سے پھیلانا شروع کر دوں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی‘‘۔

اس درجے انقلاب اُس وقت آ چکا تھا اور لوگوں کی سوچ میں اس قدر تبدیلی آ چکی تھی۔

حضرت ابوہریرہ ؓ کا ایک اور واقعہ بھی ہے کہ دِمشق کی جامع مسجد سے نکلے اور ناک صاف کرنے کی ضرورت پیش آئی تو رومی کتان‘ جو بہت قیمتی کپڑا ہوتا تھا‘اس کا رومال نکالا اور ناک صاف کر کے پھینک دیا اور پھر خود ہی کہنے لگے: اے ابوہریرہ! آج تمہارا حال یہ ہے‘ اور وہ دن بھی تھے جب تم پر فاقوں کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شاید مرگی کا دورہ پڑا ہے‘ تو پاؤں رکھ کر تمہاری گردن دباتے تھے۔اصحابِ صُفہ کا دَورعسرت اور تنگ دستی کا دَور تھا۔بعد میں

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب العلم‘ باب حفظ العلم

فتوحات کے نتیجے میں دولت کی ریل پیل ہوگئی۔ ظاہر بات ہے کہ جب اس طور سے دنیا عام ہوئی تو پھر لوگوں کے اندازِ فکر میں بھی تبدیلی آ گئی۔ حضورﷺ نے فرمایا تھا: ((لَا الْفَقْرُ اَخْشٰی عَلَیْکُمْ......)) ''اے مسلمانو! مجھے تم پر فقر اور احتیاج کا کوئی خوف نہیں ہے (فقر اور احتیاج میں تو اللہ یاد آتا ہے' اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے۔) مجھے اندیشہ ہے تو اس کا کہ دنیا کے خزانے تمہارے پاؤں میں آئیں گے اور پھر تم اس دنیا کی وجہ سے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹو گے''۔

ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خدا ست

﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ﴾ ''اور انفاق کرو اس میں سے جس پر اللہ نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے''۔ یہ الفاظ اس اعتبار سے بھی فکر انگیز ہیں کہ ان میں ہماری حیثیت معین کی گئی ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ تمہیں خلافت دی گئی ہے' اپنے آپ کو مالک نہ سمجھ بیٹھنا۔ نہ تم مَلِک ہو نہ مالِک ہو' مالک حقیقی بھی اللہ اور مَلِکِ حقیقی بھی وہی ہے۔ تمہیں تو خلافت دی گئی ہے' تم نائب ہو' تم custodian ہو' تم امین ہو' تم اللہ کے حکم کی تنفیذ کرنے والے ہو۔ یہ مفہوم لفظ ''استخلاف'' میں پنہاں ہے۔ پھر یہاں اسم مفعول کا صیغہ ''مُسْتَخْلَف'' آیا' کہ یہ خلافت بھی تم نے خود حاصل نہیں کی ہے' بلکہ اللہ نے تمہیں عطا کی ہے۔ مزید یہ کہ ﴿مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ﴾ میں ''مُسْتَخْلَفِیْنَ'' مفعول بہ بن کر آیا ہے' یعنی تم مجعول ہو۔ درحقیقت تمہاری تو کوئی حیثیت ہے ہی نہیں' اس نے تمہیں بنایا ہے خلافت دیئے ہوئے (مُسْتَخْلَفِیْن) اُن چیزوں میں جو کہ اس نے تمہیں دی ہیں۔ ان میں تمہارا جسم ہے' تمہاری توانائی ہے' تمہاری ذہانت و فطانت ہے' تمہاری دُور بینی اور دُور اندیشی ہے' تمہارا وقت ہے' تمہاری صحت ہے' تمہاری قوتِ کار ہے' تمہاری عمر ہے' خاص طور پر تمہاری جوانی کی عمر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حضور ابنِ آدم کے قدم اُس وقت تک اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے:

عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ؟ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ؟ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ؟ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ؟ (۱)

''(۱) اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں گنوائی؟ (۲) اس کی جوانی کے بارے میں کہ کہاں لٹائی؟ (۳) اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا؟ (۴) اور کہاں خرچ کیا؟ (۵) اور

(۱) (سنن الترمذی' فی صفة القیامة' باب ۱)

جو علم حاصل کیا اس پر کتنا کچھ عمل کیا؟''

دیکھئے عمر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں دو سوال ہیں۔ ''جو عمر ہم نے تمہیں دی تھی وہ کہاں گنوائی؟ اور خاص طور پر جوانی کہاں لگائی؟'' معلوم ہوا کہ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو اللہ نے ہمیں دی ہیں اور اُس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سب چیزوں میں سے اس کی راہ میں انفاق کریں۔

آگے فرمایا: ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝﴾ اب جب یہ دو تقاضے ''ایمان اور انفاق'' سامنے آ گئے تو جو بھی تم میں سے ان دونوں تقاضوں کو پورا کر دیں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں اجر کے ساتھ ''کبیر'' کی صفت آئی ہے۔ آگے چل کر گیارہویں آیت کے آخر میں، جس پر دوسرے حصے کی آیات ختم ہو رہی ہیں ''اَجْرٌ كَرِيْمٌ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اجر کی دو صفات ہیں، دو dimensions ہیں۔ یعنی ایک تو مقدار کے اعتبار سے یہ اجر بہت زیادہ ہوگا، دوسرے یہ کہ جب یہ اجر دیا جائے گا تو اس میں عزت افزائی کا پہلو بھی ہوگا۔ ورنہ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ ''اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى'' کے مصداق لینے والا محسوس کرتا ہے کہ میری حیثیت کچھ کم ہوئی ہے، گری ہے، لیکن نہیں! اللہ کی طرف سے جب اجر ملے گا تو اس میں اکرام اور اعزاز ہوگا۔ وہ اجر کبیر بھی ہوگا اور اجر کریم بھی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن چیزوں میں مُستخلَف بنایا ہے اگر یہ سب کچھ بھی ہم اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں تب بھی اس زعم میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نے کوئی بڑا تیر مارا ہے اور ہم کسی بہت بڑی بلندی تک پہنچ گئے ہیں، بلکہ اس پر بھی اللہ کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے ہمیں اس کی توفیق دی۔ اگر اس کی راہ میں سب کچھ بھی دے دیا تو یہ تمہارا اپنا تو تھا ہی نہیں، دیا ہوا اسی کا تھا۔ بقول غالب ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

اگر تم نے اسی کی دی ہوئی شے اس کو لوٹا دی اور اسی کا دیا ہوا مال اس کے قدموں میں ڈال دیا تو کیا کمال کیا؟ اس حوالے سے شیخ سعدیؒ کے دو اشعار بہت ہی خوبصورت ہیں ؎

شکرِ خدائے کن کہ موفّق شدی بخیر
ز انعام و فضلِ خود نہ معطّل بداشتت

یعنی اللہ کا شکر ادا کرو کہ خیر کے لیے تمہیں اس کی جانب سے توفیق ملی ہے۔ اللہ نے تمہیں اپنے انعام

اور فضل سے محروم نہیں کیا' معطل نہیں کیا۔

اس میں لفظ ''موفَّق'' توفیق سے اسم المفعول ہے' یعنی کہ تم موفَّق ہو' تمہیں توفیق بھی اسی کی دی ہوئی ہے۔

دوسرا شعر ہے: ؎

منّت منہ کہ خدمت سلطاں ہمیں کنی
منّت شناس از و کہ بخدمت بداشتت

تم بادشاہ پر اپنا احسان نہ دھرو کہ تم اس کی خدمت کر رہے ہو' بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع عطا کیا۔ ایسے ہی تم اللہ کے اوپر اپنا احسان نہ دھرو' بلکہ اس کا احسان مانو!

ایمان کی زوردار دعوت

آگے فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ ''تمہیں کیا ہوگیا ہے' تم ایمان پختہ کیوں نہیں رکھ رہے اللہ پر؟'' اب نوٹ کیجیے کہ یہاں ایمان کون سا درکار ہے۔ یہ بات میں پرکار کی مثال سے آپ کو سمجھاتا ہوں کہ جیسے ایک پرکار کے دونوں بازو باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح آیت ۷ میں ایمان اور انفاق کے الفاظ جڑ کر ایک جگہ آئے ہیں۔ آگے دو دو آیتوں میں انہیں کھولا گیا ہے' جیسے پرکار کے بازو کھل جاتے ہیں' چنانچہ دو آیتیں ایمان اور دو آیتیں انفاق پر آئی ہیں۔ یہی پرکار سورۃ التغابن میں مزید کھلتی ہے جو سلسلۂ مُسبحات کی آخری سورت ہے۔ وہاں یہی مضمون دس آیات میں آیا ہے۔ آیت ۸ سے وہاں یہی دعوت ایمان شروع ہوئی ہے بایں الفاظ: ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۸﴾ یہاں ایک آیت میں دعوتِ ایمان ہے جبکہ وہاں سورۃ التغابن میں یہ دعوت تین آیات میں ہے۔ اس کے بعد یہ سوال کہ کون سا ایمان درکار ہے' اس کی وضاحت وہاں پانچ آیتوں میں کی گئی ہے۔ پہلی بات یہ کہ اس میں تسلیم و رضا کی کیفیت ہو ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۱﴾ یہاں ان آیات کا ترجمہ اور وضاحت کیے بغیر صرف حوالے دیئے جا رہے ہیں' اس لیے کہ ہمارے منتخب نصاب کے دروس میں سورۃ التغابن پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ تو پہلی بات یہ کہ تسلیم و رضا والا ایمان ہو۔ اس ایمان کا دوسرا پہلو ہے اطاعت۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۱۲﴾ اگر اطاعت کاملہ نہیں تو ایمان کہاں

ہے! اللہ کو مانتے ہو اور اطاعت نہیں کرتے؟ رسول کو مانتے ہو اور اس کا حکم نہیں مانتے' اس کا اتباع نہیں کرتے؟ چہ معنی دارد؟ تیسری بات یہ کہ توکل صرف اسی پر ہو ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٣﴾﴾ چوتھی بات یہ کہ دنیا میں جن سے بھی فطری' طبعی اور جبلی محبتیں ہیں' یوں محسوس کرو کہ ان محبتوں میں تمہارے لیے دشمنی مضمر ہے' یہ potential enemies ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۴) یہی محبتیں ہیں جو اڑنگا لگاتی ہیں اور ان کی وجہ سے انسان اوندھے مُنہ گرتا ہے۔ یہی محبتیں ہیں جو اگر حد سے تجاوز کر جائیں تو انسان حرام میں مُنہ مارتا ہے' اللہ کے حقوق کو بھول جاتا ہے۔ ساری توانائیاں آل اور اولاد کے لیے کھپا دیتا ہے اور اللہ کے لیے تو اس کے پاس باقی کچھ رہتا ہی نہیں' کیا خرچ کرے گا' کیا کھپائے گا؟ اپنے وقت' اپنی صلاحیتوں اور اپنی قوتِ کار کی ساری پونجی تو صرف دنیا بنانے کے لیے اور اپنے اہل وعیال کے لیے بہتر سے بہتر سہولتیں حاصل کرنے کے لیے صرف ہو رہی ہے۔ اگلی آیت میں دوبارہ فرمایا: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''تمہارے اموال و اولاد تو (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں''۔ پانچ آیتوں میں اس ایمان حقیقی کے ثمرات بیان کرنے کے بعد پھر ایک آیت میں ان کو دوبارہ سمویا گیا اور اس کے ساتھ ہی انفاق کا ذکر بھی آ گیا۔ یوں سمجھئے کہ وہ پرکار اب پوری طرح کھل رہی ہے۔ چنانچہ پرکار کا دوسرا سرا کیا ہے! فرمایا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٦﴾ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٧﴾﴾

اسی طرح (سورۃ الحدید میں) ایمان اور انفاق پر مشتمل ساتویں آیت کی پرکار جو یہاں بند تھی' اگلی چار آیتوں میں ذرا کھل گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ تمہیں کیا ہو گیا ہے' تم کیوں نہیں ایمان رکھتے اللہ پر؟ وہ ایمان جو حقیقی ایمان ہے' اس پر تمہارا دل کیوں نہیں ٹھکتا؟ یہ زجر یا ملامت کا انداز ہے۔ آپ دیکھئے تین باتیں دہرائی گئیں: ﴿وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ﴾ اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو گی کہ بنفسِ نفیس اللہ کے رسول ؐ تمہیں دعوت دے رہے ہیں اور تم اس سے اعراض کر رہے ہو؟ ایک طرف تو یہی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے کہ اللہ کے رسول بذاتِ خود تمہیں دعوتِ ایمان دے رہے ہیں' لیکن اگر اس وقت بھی کوئی محروم رہ گیا تو بتائیے کہ

اس سے بڑا بدنصیب کون ہو گا؟ ظاہر بات ہے کہ مدینہ کے اندر منافق بھی موجود تھے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے بھی نہ متاثر ہوئے' نہ فیض یاب ہوئے۔ جو شے بجلی اور حرارت کے لیے غیر مُوصل (bad conductor) ہو' آپ کتنے ہی جتن کر لیں اس میں سے نہ حرارت گزرے گی نہ برقی رو گزرے گی۔ تو یہ بدنصیبی کی انتہا ہے۔ یہ وہی انداز ہے جو بعض احادیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((...... وَاَنَا بَیْنَ اَظْهُرِکُمْ)) ''درانحالیکہ ابھی میں تمہارے مابین موجود ہوں (پھر بھی تمہارا یہ حال ہے!)'' دوسرے یہ کہ رسول ﷺ کس بات کی دعوت دے رہے ہیں! ﴿لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ تمہارے اپنے ربّ پر ایمان کی دعوت دی جارہی ہے' کسی غیر پر ایمان کی دعوت تو نہیں دی گئی۔ تمہیں تمہارے اپنے پالن ہار' پروردگار' تمہارے خالق' تمہارے رازق پر ایمان کی دعوت دی جارہی ہے۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ ﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸﴾ ''اور وہ تم سے قول وقرار لے چکا ہے' اگر تم واقعتاً مؤمن ہو''۔

ان دونوں آیتوں کے بارے میں' جیسا کہ میں اس سے قبل بیان کر چکا ہوں' اگر ہم خطاب کے الفاظ پر نگاہ جمائیں گے تو اس خطاب میں مسلم وغیر مسلم دونوں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ اٰمِنُوْا ''ایمان لاؤ'' کے مخاطبین کمزور اہل ایمان بھی ہو سکتے ہیں اور کافر و مشرک بھی' جو ایمان سے بالکل محروم تھے۔ لیکن سیاق وسباق معین کر رہا ہے کہ یہاں گفتگو مسلمانوں سے ہے' غیر مسلموں سے نہیں ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی لفظی طور پر ''میثاق'' کے دو مفہوم مراد لیے جانے کا امکان موجود ہے۔ بالفرض اگر یہاں پر مخاطب کوئی غیر مسلم ہے' یا وہ شخص جو ابھی اپنے ایمان کا اعلان واعتراف نہیں کر رہا' تو یہاں ﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ﴾ سے ''میثاق الست'' مراد ہوگا' یعنی اس دنیا میں آنے سے پہلے وہ تم سے میثاق لے چکا' بایں الفاظ: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۚ﴾ (الاعراف: ۱۷۲)۔ اب یہاں ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ میں ایمان کا لفظ اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں لیا جائے گا' بلکہ ایمان کا لفظی معنی یعنی تصدیق مراد لیا جائے گا کہ اگر تم تسلیم کرو! اپنی فطرت کی گہرائیوں میں جھانکو تو تمہیں آثار نظر آجائیں گے۔ ایک مرتبہ اے کے بروہی صاحب نے ملاقات میں مجھے کسی فلسفی کا ایک قول سنایا تھا۔ وہ فلسفی گویا خالق کی طرف سے یہ تعبیر کر رہا ہے:

> *"You would not have searched for me unless you had possessed me in the very beginning".*

یعنی اگر بالکل آغاز ہی میں تمہارا میرے ساتھ ایک تعلق قائم نہ ہوا ہوتا تو تم مجھے ہرگز تلاش نہ کرتے۔

انسان میں فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی ایک طلب ہے' اس کی تلاش ہے۔ جیسے ایک دعا ہے ؎

مجھ کو ہے تیری جستجو' مجھ کو تری تلاش ہے
خالق مرے کہاں ہے تو مجھ کو تری تلاش ہے!

ہمارے ہائی سکول کے زمانے میں روزانہ صبح یہ دعا پڑھی جاتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی اس کا ثبوت دیتی ہے۔ کیسے کیسے لوگ جنگلوں اور صحراؤں کے اندر خاک چھانتے پھرتے رہے اور پہاڑوں میں جا کر تپسیائیں کرتے رہے۔ کس لیے؟ معلوم ہوا کہ فطرت انسانی میں کوئی طلب ہے' کوئی خواہش ہے' کوئی urge ہے۔ آپ کو بھوک لگتی ہے تو آپ کھانے کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو بھی کوئی طلب تھی جو انہیں کشاں کشاں لیے پھرتی رہی اور یہ طلب درحقیقت اس بات کا مکمل ثبوت ہے جو متذکرہ بالا قول میں بیان ہوئی ہے۔ عہدِ اَلست کو قرآن مجید تو ایک عظیم الشان واقعہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے: ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی﴾ لیکن جو بھی شخص اپنی فطرت کی گہرائیوں کے اندر جھانکے گا اسے اس عہدِ اَلست کے آثار نظر آئیں گے' چاہے وہ یاد نہ آئے۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ربّ سے وہ عہد کیا تھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ ارواح میں فرق و تفاوت تو ہے۔ وہ روح جو اللہ نے انہیں عطا کی تھی اس کے اندر وہ یادداشت برقرار رہی ہوگی۔ لیکن بہرحال اس وعدے کی یاد اگرچہ برقرار نہ رہی ہو' لیکن اس کے آثار اور اس کے اثرات فطرت انسانی میں موجود ہیں۔ ﴿وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ﴾ کے الفاظ میں اگر لفظی طور پر یہ امکان ہے تو اس کی وضاحت بھی میں نے کر دی' لیکن یہاں حقیقتاً وہ مراد نہیں ہے۔ یہاں اصل میں خطاب ان مسلمانوں سے ہے جو ضعیف الایمان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ آج کے مسلمانوں کے لیے یہ سورتیں قرآن مجید کا سب سے زیادہ قیمتی حصہ ہیں۔ اس لیے کہ نزولِ قرآن کے وقت کا تو ضعیف ایمان بھی ہمارے آج کے ایمان کے مقابلے میں بہت بلند و بالا' بہت پختہ اور مستحکم تھا۔ آج ہمارا جو حال ہے اس کے پیشِ نظر ہمیں تو بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ان آیات کو حرزِ جان بنالیں۔

﴿وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾﴾ ''وہ تم سے قول و قرار لے چکا اگر تم مؤمن ہو!'' یہاں پر اصطلاحی ترجمہ کیجیے کہ اگر تم مؤمن ہو' تم ایمان کے دعویدار ہو پھر تو تمہارا عہد و میثاق اور قول و قرار ہو چکا۔ یہاں سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ ذہن میں لائیے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ

اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ﴾ ''اللہ تو خرید چکا ہے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض''۔ اب یہ جان و مال ان کے ہیں کہاں؟ اب تو گویا ان کے پاس محض ایک امانت کے طور پر رکھے ہوئے ہیں کہ جیسے ہی مطالبہ ہو حاضر کر دیئے جائیں۔ یہ ہے درحقیقت وہ قول و قرار' کہ اگر تم مؤمن ہو پھر تو تم اپنی جان اور مال فروخت کر چکے' اب وہ تمہاری ملکیت ہے ہی نہیں۔ اوّلاً تو اصولی طور پر تم اس کے مالک نہیں' پھر یہ کہ اس قول و قرار سے اس کی مزید توثیق ہو گئی۔ اب یہ تمہارے پاس امانت ہے۔ بڑا پیارا شعر ہے:

وبالِ دوش ہے سرِ جسمِ ناتواں پہ مگر
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے

گویا Life is a liability۔ واقعہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ زندگی ایک بوجھ ہے' لیکن بندۂ مؤمن یہ سمجھتا ہے کہ مجھے صرف اللہ اور اس کے دین کے لیے یہ بوجھ اٹھائے رکھنا ہے۔ اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے بھی جو حق اسے میں دے رہا ہوں وہ صرف حضور ﷺ کی اس ہدایت کی بنا پر ہے کہ: ((وَاِنَّ لِنَفۡسِكَ عَلَيۡكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوۡجِكَ عَلَيۡكَ حَقًّا)) ''یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے''۔ مؤمن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا جو اصل مقصد ہے اور جو اُس کی اصل منشا ہے جس کے لیے وہ اسے preserve کر رہا ہے' وہ وقت آئے کہ وہ یہ دے کر فارغ ہو جائے' جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا: ﴿فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ ۖ﴾ (آیت ۲۳) ''ان میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے (شہید ہو چکے) اور باقی جو ہیں وہ منتظر ہیں (کہ کب موقع آئے اور ہم اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں دے کر سبکدوش ہو جائیں)۔''

ایمانِ حقیقی کا منبع و سرچشمہ — قرآنِ حکیم

اب اس کے بعد اگر دلوں کو ٹٹولیں اور محسوس ہو کہ واقعتاً وہ حقیقی ایمان تو موجود نہیں ہے' تو سوال ہے کہ کہاں جائیں؟ ع کس طرف جاؤں' کدھر دیکھوں' کسے آواز دوں؟ وہ کون سا بازار ہے جہاں سے ایمان کی جنس گراں مایہ ملتی ہے؟ اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا: ﴿هُوَ الَّذِىۡ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبۡدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخۡرِجَكُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ﴾ ''وہی تو ہے (اللہ) جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے پر روشن آیات تا کہ تمہیں نکال لائے اندھیروں سے روشنی کی طرف''۔ یہاں دیکھئے' بجائے

''رسول'' کے ''عبد'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ میں نے بارہا عرض کیا ہے' اس وقت صرف اشارہ کر رہا ہوں کہ جہاں بھی اللہ کا اپنے رسول کے لیے شفقت اور عنایت خصوصی کا انداز ہوتا ہے وہاں نسبتِ رسالت کی بجائے نسبتِ عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں فرمایا: ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾ اور سورۃ الکہف کا آغاز ہوا ان الفاظ مبارکہ سے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴾ وہی انداز یہ ہے: ﴿ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ﴾ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ ''عبدٌ'' (بندہ) اور چیز ہے اور ''عبدہٗ'' (اُس کا بندہ) اور چیز ہے۔ بقول اقبال ؎

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظَر!

کہنے کو تو ہم بھی کہتے ہیں کہ ہم اس کے بندے ہیں' نام بھی عبداللہ رکھ لیتے ہیں' لیکن عبدیت کا حق ادا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ تو فرمایا: ﴿ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ﴾ وہی ہے جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے (ﷺ) پر وہ آیات جو بیّن ہیں' روشن ہیں۔ بیّن اس شے کو کہتے ہیں جو ازخود واضح اور ازخود روشن ہو' اسے کسی اور وضاحت کی ضرورت نہ ہو' اسے کسی دلیل خارجی کی حاجت نہ ہو۔ جیسے ہم کہتے ہیں ع ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!'' یعنی سورج طلوع ہو گیا تو اب سورج کے وجود کے ثبوت کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو خود اپنے وجود پر سب سے بڑی برہان اور دلیل قاطع ہے۔ قرآن مجید اپنی آیات کے لیے اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ (روشن اور بیّن آیات) کی ترکیب استعمال کرتا ہے۔ سورۃ التغابن میں تو قرآن حکیم کے لیے لفظ ہی ''نور'' آیا ہے: ﴿فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ النُّوۡرِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلۡنَا ؕ﴾ ''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا''۔ یہ ازخود نور ہے اور درحقیقت اسی سے نورِ ایمان پیدا ہوتا ہے۔ یہ نورِ وحی' نورِ فطرت کے ساتھ مل کر نورِ ایمان پیدا کرتا ہے۔ ہمارے اس منتخب نصاب کے حصہ دوم میں سورۃ النور کی آیات کے ضمن میں یہ بحث تفصیل سے آئی ہے کہ ﴿نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ﴾ میں ایک نورِ فطرت ہے اور ایک نورِ وحی' ان دونوں کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے۔

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ قرآن مجید میں نور کا لفظ ہمیشہ واحد آتا ہے' جبکہ ''ظلمات'' ہمیشہ جمع کی صورت میں آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں بھی الفاظ آئے ہیں: ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُہَا فَوۡقَ بَعۡضٍ﴾

''اندھیرے ہیں تہہ بر تہہ''۔ اس لیے کہ نور ایک بسیط حقیقت ہے اور تاریکی (darkness) کے بے شمار shades ہیں، مثلاً کفر، شرک، الحاد، انسانی حاکمیت کا تصور، مادہ پرستی، شہوت پرستی، دولت پرستی، شہرت پرستی، قوم پرستی، خود پرستی، نفس پرستی اور اس طرح کی بے شمار پرستشیں۔ یہ سب ظلمات ہی کے مختلف سائے ہیں، یہ تمام اندھیرے ہیں اور ان تمام اندھیروں سے نکال کر نورِ ایمان میں لانے والی شے قرآن حکیم کی آیات بیّنات ہیں۔

یہاں آیات کے باہمی ربط، ان کی ترتیب اور سیاق و سباق کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ جو ایمان حقیقی مطلوب ہے اس کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ ایمان کے دعوے داروں سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے دلوں میں حقیقی ایمان کیوں موجود نہیں ہے جب کہ یہ ایمان کا منبع و سرچشمہ موجود ہے؟ عین کنویں کے کنارے پر کھڑے ہوئے پیاسے کیوں ہو؟ اور اس کنویں کی نشان دہی ان الفاظ میں کر دی گئی: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ اس سے واضح ہو رہا ہے کہ ایمان حقیقی کا منبع اور سرچشمہ قرآن مجید ہے۔

۱۹۹۱ء میں ''حقیقت ایمان'' کے موضوع پر محاضرات میں مَیں نے نظری اعتبار سے یہ بات مانی تھی اور آج بھی مانتا ہوں کہ ایک وہ ایمان ہے جس کے لیے آج کی اصطلاح blind faith ہے۔ یہ ایمان بھی اگر یقین کے درجے کو پہنچ جائے گا تو اس شخص متعلق کے لیے مفید ہوگا، مؤثر ہوگا۔ یہ blind faith انسان کو محض صحبت صالحہ سے بھی حاصل ہو جاتا ہے، جیسے آگ کے سامنے بیٹھیں گے تو آپ کو حرارت مل جائے گی، صاحب یقین کی صحبت ہوگی تو آپ کو یقین حاصل ہو جائے گا۔ اس میں آپ کے فہم اور شعور کا کوئی حصہ نہیں، یہ تو درحقیقت ایک طبعی عمل (physical phenomenon) ہے۔ اسی طرح ایک ایمان عمل سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ آپ دین کے جملہ احکام پر عمل شروع کر دیجیے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص نسلی مسلمان ہے، ابھی ایمانِ حقیقی اسے حاصل نہیں ہے، لیکن جو بھی فرائض دینی ہیں ان کو بجا لا رہا ہے تو اس سے بھی یقیناً ایک reflection ہوگی اور قلب میں یقین کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ تو عمل سے اور صحبتِ صاحبِ ایمان سے بھی ایمان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایمان کا ذکر جس سیاق و سباق میں ہو رہا ہے وہ درحقیقت حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے شرطِ اوّل ہے، یعنی انقلاب برپا کرنا اور افراد کو نہیں بلکہ نظام کو بدلنا ہے۔

اس کے لیے ایک اصول ذہین نشین کر لیجئے کہ انسانی زندگی کے اجتماعی نظام میں معاشرہ ایک شخص واحد کی طرح behave کرتا ہے۔ ایک فرد کے اعضاء و جوارح کو کنٹرول کرنے والی شے اس کا دماغ ہے۔ ہاتھ کسی شے کو پکڑ سکتا ہے' اس میں یہ طاقت ہے' لیکن کس شے کو پکڑے اور کس کو نہ پکڑے' اس کا فیصلہ ہاتھ خود نہیں کر سکتا' بلکہ ذہن کرتا ہے۔ اسی طرح پاؤں میں آپ کو لے کر چلنے کی صلاحیت ہے' مگر وہ کدھر کو جائے' کدھر کو نہ جائے' اس کا فیصلہ پاؤں خود نہیں کر سکتا' بلکہ ذہن کرتا ہے۔ اسی طرح ہر انسانی معاشرے میں ایک brain trust ہوتا ہے۔ یہ وہاں کی ذہین اقلیت (intelligentsia یا intellectual elite) ہے جو brain trust کی حیثیت رکھتی ہے اور اس معاشرے کا رُخ معین کرتی ہے۔ اگر یہ ''ذہین اقلیت'' دولتِ ایمان سے محروم رہتی ہے اور آپ نے کچھ افراد کو اِدھر اُدھر ایمان کی دولت دے بھی دی' کچھ اصلاح ہو بھی گئی تو بھی معاشرہ بحیثیت مجموعی اس رُخ پر تبدیلی اختیار نہیں کرے گا جو آپ چاہتے ہیں۔ چنانچہ معاشرے کی بحیثیت مجموعی اصلاح کے لیے وہ ایمان درکار ہے جو علیٰ وجہ البصیرت ہو۔ جیسے کہ سورۂ یوسف میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا: ﴿قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ﴾ ''کہہ دو (اے نبی ﷺ!) یہ ہے میرا راستہ' میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی''۔ میں اپنے راستے کی طرف علیٰ وجہ البصیرت بلا رہا ہوں۔ میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا ہوں' اور نہ صرف میں بلکہ وہ بھی جو میری پیروی کر رہے ہیں علیٰ وجہ البصیرت میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ تو دراصل ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جو انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ معاشرے کے brain trust کو transform کریں گے' اور جب اس کی قلب ماہیت ہوگی تو معاشرہ مجموعی طور پر تبدیلی قبول کرے گا' ورنہ نہیں کرے گا۔ اور اس شعوری ایمان کا منبع اور سرچشمہ صرف قرآن ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید ایک انسان کو ایک کل کی حیثیت سے' مجموعی حیثیت سے اپیل کرتا ہے۔ یہ انسان کے احساسات و جذبات کو بھی اپیل کرتا ہے اور اس کے تعقل و تفکر کو بھی۔ قرآن مجید بار بار تعقل و تفکر کی دعوت دیتا ہے: ﴿اَفَلَا تَتَفَكَّرُوۡنَ﴾ ''کیا تم غور نہیں کرتے؟ (تمہیں کیا ہو گیا ہے؟)'' ﴿اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴾ ''کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟'' قرآن مجید میں بڑے سے بڑے فلسفی کے لیے بھی ہدایت موجود ہے اور ایک عام انسان کے لیے' بھی اس میں ہدایت ہے۔ اس حوالے سے درحقیقت انقلاب کے لیے' حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے'

معاشرے کو بدلنے کے لیے جو ایمان درکار ہے اُس کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔

اس سلسلۂ کلام میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بایں الفاظ: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۹﴾ ''وہی ہے (اللہ تعالیٰ) جو اپنے بندے (محمدﷺ) پر واضح آیات نازل فرماتا ہے' تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لائے۔ اور یقیناً اللہ تمہارے حق میں رؤف بھی ہے' رحیم بھی ہے''۔ یہ دونوں صفات رء و ف اور رحیم اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۷ میں ''رأفة'' اور ''رَحمة'' کے الفاظ میں آئی ہیں۔ ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ﴾ ''اور جن لوگوں نے ان (عیسٰیؑ) کی اتباع کی ان کے دلوں میں ہم نے نرم دلی اور رحم ڈال دیا''۔ یہاں پر ذرا اچھی طرح جان لیجئے کہ لفظ ''رَءُ و ف'' قرآن مجید میں گیارہ مرتبہ آیا ہے اور ان میں سے نو مرتبہ لفظ ''رَحِیْمٌ'' ہی کے ساتھ جڑ کر آیا ہے۔ قرآن مجید میں کسی اور صفت کے ساتھ اس لفظ (رَءُ وْفٌ) کی combination نہیں ہے' البتہ بعض مقامات پر تنہا آیا ہے' جیسے ﴿رَءُ وْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾۔ یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ یہ دس مرتبہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے آیا ہے اور ایک مرتبہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۲۸ میں محمدٌ رسول اللہﷺ کے لیے آیا ہے بایں الفاظ: ﴿بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۲۸﴾ ''مؤمنوں پر نہایت مہربان اور رحم والا ہے''۔

''رأفت'' اور ''رحمت'' میں جو ایک نسبت اور رشتہ ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے جھجک محسوس کریں گے کہ اللہ تمہارا ہمدرد ہے' یہ لفظ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہے' لیکن رأفت کی اصل حقیقت ہمدردی ہی ہے۔ مشہور شعر ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

ایک سلیم الفطرت انسان کے دل میں کسی کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر جو احساس ہوتا ہے اور وہ اس کے درد کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے' اسی کو ہم رأفت یا ہمدردی کہتے ہیں۔ درحقیقت جس شخص کے اندر رأفت کا وصف ہوگا وہی اس مصیبت زدہ شخص کے لیے بھلائی کی کوشش کرے گا' اس کے لیے کوئی relief فراہم کرنے اور اسے کسی طریقے سے مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش کرے گا۔ پہلے ایک احساس ہوگا تب اس کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ تو ''رأفت'' اصل میں وہ عکس ہے کہ جو کسی کے دکھ اور درد کو

دیکھ کر باطن میں پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ ''رحمت'' ہے۔ اس احساس کے نتیجے میں اب اس کے درد کو رفع کرنے کے لیے' اس کے مسئلہ اور مشکل کو حل کرنے کے لیے جو کوشش ہوگی وہ درحقیقت رحمت کا مظہر ہے۔ گویا ''رأفت'' اور ''رحمت'' کا تعلق باہم sensory اور motor کا سا ہے' جو کہ فزیالوجی کی اصطلاح ہے۔ کسی بھی معاملے میں پہلے sensation ہوتی ہے۔ اگر کسی چیونٹی نے آپ کے ہاتھ پر کاٹا ہے تو پہلے sensation کے ذریعے دماغ کو اس کی اطلاع ملی اور وہاں سے motor کے ذریعے حکم آیا تو آپ نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا کہ یہاں تو کوئی چیز ہے جو تجھے تکلیف پہنچا رہی ہے۔ یہی معاملہ رأفت اور رحمت یا رؤف اور رحیم کے مابین ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہمیشہ لفظ رءوف لفظ رحیم سے پہلے آیا ہے۔ جیسے ہم نے ''العزیز'' اور ''الحکیم'' کی نسبت کو سمجھا تھا کہ ایک طرف اس کے پاس اختیارِ مطلق (authority) ہے' اس پر کوئی checks and balances نہیں ہیں' دوسری طرف اس کی حکمت کامل ہے' اور اس کا اختیارِ مطلق اس کی حکمتِ کاملہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ اپنی زبان میں ہم الفاظ استعمال کر سکتے ہیں کہ نہایت شفیق اور مہربان ہے۔

اب یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ اللہ کی رحمت کا مظہرِ اعظم اور مظہرِ اتم یہ قرآن ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی پہلی چار آیات میں دراصل اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۞ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ۞﴾ ''نہایت رحم والا ہے جس نے قرآن سکھایا''۔ اب دیکھئے ان میں کیا نسبت ہے! یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمانیت کا مظہر ہے کہ اس نے قرآن سکھایا۔ ''رَحۡمٰن'' ''فَعْلان'' کے وزن پر اسم مبالغہ ہے کہ جس میں کوئی بھی کیفیت پورے جوش وخروش کے ساتھ ہوتی ہے' ایک طوفانی کیفیت ہوتی ہے۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طوفانی اور ہیجانی کیفیت کا مظہرِ اَتم یہ قرآن ہے۔ اس لیے کہ یہ ہدایت ہے اور رحمت ہے۔ اسی سے تمہاری عاقبت یعنی آخرت کی زندگی سنورے گی جو کہ اصل اور ابدی زندگی ہے۔ یہی نور ہے' یہی راستہ دکھانے والا ہے۔ جیسے کہ حضور کریم ﷺ سے ایک بہت ہی پیاری اور جامع دعا مروی ہے جس میں ہم کہتے ہیں ...... وَاجۡعَلۡهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوۡرًا وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً کہ اے ہمارے پروردگار! اس قرآن مجید کو ہمارا امام بنا دے' اسے ہمارے لیے نور' ہدایت اور رحمت بنا دے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی زوردار دعوت

آگے فرمایا: ﴿وَمَالَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں'' ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''حالانکہ (تم خوب جانتے ہو کہ) آسمانوں اور زمین کی کُل میراث بالآخر اللہ کے لیے رہ جائے گی''۔ اگرچہ اس آیت پر اصل گفتگو تو اگلی نشست میں ہوگی' لیکن نوٹ کر لیجئے کہ ایک تو ہم پہلے سمجھ چکے ہیں کہ سورۃ الحدید کی آیت ۷ میں جو انفاق کا لفظ آیا ہے اس سے مراد ''انفاق فی سبیل اللہ'' ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے مراد ''انفاقِ مال'' بھی ہے اور ''بذلِ نفس'' بھی ہے۔ اب یہاں لفظ ''قتال'' کے حوالے سے اس کی تشریح آ رہی ہے۔ ایک حدیث نبویؐ کے حوالے سے لفظ ''میراث'' کو سمجھئے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ''ابن آدم کہتا ہے کہ میرا مال' میرا مال! لیکن اے ابن آدم! تمہارے مال میں سے تمہارا اس کے سوا اور کیا ہے کہ جو تم نے کھا لیا اور ختم کر دیا' یا پہنا اور پرانا کر دیا' یا پھر جو تم نے (اپنی زندگی میں) صدقہ کر دیا اور آگے بھیج دیا''۔ (مسلم' ترمذی' نسائی) مسلم کی ایک دوسری روایت میں الفاظ آئے ہیں کہ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اسے لوگوں کے لیے چھوڑ کر جانے والا ہے۔ یعنی باقی جو مال ہے وہ تمہارا نہیں' تمہارے وارثوں کا ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے سوال کیا: ((اَيُّكُمْ مَالُ وَارِثِهٖ اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنْ مَالِهٖ؟)) ''آپ لوگوں میں سے کون ہوگا جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ عزیز ہو؟'' صحابہ کرامؓ نے بالکل سادگی کے ساتھ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے خود اپنا مال (وارث کے مال سے) محبوب تر نہ ہو۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ((فَاِنَّ مَالَهٗ مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِهٖ مَا اَخَّرَ)) ''اس کا مال تو وہ ہے جو اُس نے آگے بھیج دیا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو اُس نے پیچھے چھوڑا''[1]۔ — یعنی تمہارا مال تو وہی ہے جو تم اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کے اندر خرچ کرتے ہو' باقی تمہارے وارث کا مال ہے جو تم جمع کر رہے ہو۔ دیکھئے خرچ کرنا ایک ضرورت ہے' اپنے آپ کو maintain کرنا ہے' اپنے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا ہے۔ سر چھپانے کے لیے کوئی ایک چھت بھی چاہیے' آپ کو کھانا بھی چاہیے۔ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا اپنی جگہ صحیح ہے۔ اور اگر آپ نے ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کے مصداق اپنے آپ کو اللہ کے لیے وقف کر دیا ہو تو درحقیقت یہ

(۱) صحیح بخاری

سب کچھ بھی فی سبیل اللہ شمار ہوگا۔ گویا جو کچھ آپ اپنی ضروریات پر صرف کر رہے ہیں وہ بھی اللہ کے لیے کر رہے ہیں۔ صرف یہ بات پیش نظر رہے کہ ضرورت سے زائد کو جمع نہ کریں۔ جمع صرف آسمان پر کریں' جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کے ایک وعظ کا مفہوم ہے کہ زمین پر جمع نہ کرو جہاں چوری کا بھی ڈر ہے' ڈاکے کا بھی اندیشہ ہے' کیڑا بھی خراب کرتا ہے' دیمک بھی لگ جاتی ہے' بلکہ آسمان پر جمع کرو' جہاں نہ چوری کا ڈر' نہ ڈاکے کا خوف' نہ کیڑا خراب کر سکے۔ اس لیے کہ میں تم سے صحیح کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہوگا وہیں تمہارا دل بھی ہوگا—— مال یہاں جمع کیا ہوا ہوگا تو ظاہر ہے دل بھی یہیں پر لگا ہوگا۔ دنیا سے جانے کو دل نہیں چاہے گا اور فرشتے دھکے دے دے کر لے کر جائیں گے۔ آدمی آگے جانے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ بلکہ حدیث میں الفاظ آتے ہیں کہ جیسے کانٹے دار سیخ کے اوپر سے کباب اتارا جاتا ہے اسی طریقے سے ایسے لوگوں کی روحیں کھینچی جائیں گی۔ ان کے برعکس ایک وہ ہیں جو جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ بقول اقبال ؎

نشانِ مَردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

اس لیے کہ وہ اپنا سب کچھ تو پہلے ہی آگے بھیج چکے ہیں۔ ان کے لیے تو موت گویا ایک خوشخبری ہے۔ انہوں نے تو زندگی بھر کی کمائی وہاں آسمانوں پر جمع کی ہوئی ہے۔ ان کے لیے تو موت ایسے ہوگی جیسے کہ ایک بند مشکیزے میں سے ایک بوند پانی کی ٹپک جائے۔ ان کے لیے یہاں سے نقل مکانی کرنے میں کوئی ناگواری نہیں ہوگی' کوئی سختی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ایسی موت عطا فرمائے۔ آمین!

مال و دولتِ دنیا کی حقیقت

دیکھئے' جس چیز کو ہم مال کہہ رہے ہیں حضور ﷺ نے مختلف احادیث مبارکہ میں اس کی حقیقت کھول کر بیان کر دی کہ مال کیا ہے؟ خرچ کیا ہے اور بچت کیا ہے؟ نفع کیا ہے اور نقصان کیا ہے؟ ''التغابن'' جو کہ ایک سورۃ کا نام ہے اس کا مطلب ہی نفع و نقصان اور ہار جیت کا فیصلہ ہے۔ سورۃ التغابن میں فرمایا گیا ہے: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ کہ وہ ہوگا نفع و نقصان اور ہار جیت کے فیصلے کا دن! جو قیامت کے دن جیتا وہ حقیقت میں جیتا اور جو اُس دن ہارا وہ درحقیقت ہارا۔ جو اُس دن کامیاب قرار پایا وہ اصل میں کامیاب ہے اور جو اُس دن ناکام قرار پایا وہ دراصل ناکام ہے۔

اس بارے میں ایک حدیث کا تذکرہ اس سے قبل ہمارے ان دروس میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک بکری ذبح ہوئی‘ اس کا سارا گوشت اصحابِ صفہ میں تقسیم کر دیا گیا سوائے ایک شانے کے جو حضور ﷺ کے لیے رکھ لیا گیا‘ کیونکہ اس کا گوشت حضور ﷺ کو بہت مرغوب تھا۔ تو جب حضور ﷺ تشریف لائے اور پوچھا: ((مَا بَقِيَ مِنْهَا؟)) ''بکری میں سے کیا بچا ہے؟'' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: مَا بَقِيَ مِنْهَا اِلاَّ كَتِفُهَا ''اس میں سے کچھ نہیں بچا سوائے ایک شانے کے''۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ((بَقِيَ كُلُّهَا غَيْرَ كَتِفِهَا)) (۱) ''بکری کا سارا گوشت (جو فی سبیل اللہ تقسیم کر دیا گیا ہے) بچ گیا ہے سوائے اس شانے کے'' کہ یہ ہم کھا لیں گے تو یہ استعمال ہو کر ختم ہو جائے گا۔ یہی بات حضور ﷺ نے اس طرح فرمائی کہ تم کہتے ہو میرا مال‘ میرا مال‘ میرا مال! تمہارا مال وہ ہے جو تم نے کھا لیا‘ یعنی وہ تمہارے وجود کا حصہ بنا‘ اس سے تمہاری ضرورت پوری ہوگئی تو واقعتاً وہ تمہارا تھا۔ اس کے علاوہ تمہارا مال وہ ہے جو تم نے پہنا اور اسے بوسیدہ کر دیا‘ پرانا کر دیا۔ یعنی جو چیز تمہاری ضرورت کی تھی وہ تم نے استعمال کی اور ختم کر دی۔ باقی تمہارا مال صرف وہ ہے جو تم اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں آگے بھیج دیتے ہو۔ اس کے علاوہ باقی سب مال وارثوں کا ہے!

سکندرِ اعظم کے بارے میں ایک کہانی سی بیان ہوتی ہے کہ اس نے یہ وصیت کی تھی کہ جب میرا جنازہ نکلے تو میرے دونوں ہاتھ کفن سے باہر نکلے ہوں‘ تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ اس کی فتوحات کا سلسلہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا‘ لیکن جب اس دنیا سے رخصت ہوا ہے تو اپنے دونوں ہاتھ خالی لے کر گیا ہے‘ کیونکہ مال سارے کا سارا اس دنیا میں ہی رہ جاتا ہے اور پھر وارثوں کو منتقل ہو جاتا ہے۔ بالآخر یہ سب کچھ اللہ ہی کی ملکیت ہے‘ اللہ ہی کے لیے رہ جاتا ہے۔

داخلی و خارجی حالات کے اعتبار سے درجات میں فرق و تفاوت

آگے فرمایا: ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ﴾ ''تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا (اور جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا) وہ برابر نہیں ہیں''۔ آیت کریمہ کا یہ حصہ بہت اہم ہے۔ ہر عمل کی ایک ظاہری شکل اور کمیت ہوتی ہے اور ایک اس کی باطنی کیفیت ہوتی ہے کہ کن حالات میں وہ عمل کیا گیا ہے۔ ان دونوں اعتبارات سے عمل کے اجر و

(۱) ترمذی‘ صفة القيامة والرقائق

ثواب میں اور اللہ کے ہاں درجے کے تعین میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ دیکھئے ایک انفاق اور قتال فتح سے پہلے ہوا ہے۔ اور یہاں اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ کم سے کم صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ میں حیران ہوا ہوں کہ دورِ حاضر کے بعض مفسرین نے اس سورۂ مبارکہ کے زمانہ نزول کے طور پر غزوۂ اُحد اور صلح حدیبیہ کے مابین کا کوئی زمانہ معین کیا ہے' حالانکہ اس آیہ مبارکہ کے متذکرہ بالا الفاظ معین کر رہے ہیں کہ یہ سورۂ مبارکہ فتح کے بعد نازل ہوئی ہے۔ فتح کا اطلاق ظاہری اعتبار سے تو فتح مکہ پر زیادہ ہوتا ہے' لیکن قرآن مجید نے چونکہ صلح حدیبیہ کو بھی ''فتح مبین'' کہا ہے لہٰذا صلح حدیبیہ سے قبل تو اس سورۂ مبارکہ کے نزول کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بہرحال فتح سے قبل اور بعد کی صورت حال میں بنیادی طور پر بہت زیادہ فرق ہے۔ اس بات کی وضاحت حضور ﷺ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ غَرِیْبًا فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) (مسلم' کتاب الایمان) ''اسلام کا آغاز ہوا تو وہ غریب تھا' اور عنقریب یہ دوبارہ اسی غربت کی حالت کو لوٹ جائے گا جیسے یہ شروع ہوا تھا' پس خوشخبری ہے ایسے اجنبیوں کے لیے''۔ غریب سے مراد قلاش اور مفلس نہیں ہے' بلکہ غریب عربی میں ایسی شے کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی نہ ہو' جس کا کوئی مونس و ہمدرد اور غمخوار نہ ہو۔ ہم عام طور پر کسی اجنبی کے لیے غریب الوطن کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک شخص اپنے وطن میں ہے تو لوگ اسے جانتے اور پہچانتے ہیں' اس کا وہاں اعتماد ہے' اس کے وہاں دوست اور رشتے دار ہیں' لیکن ایک شخص اگر اکیلا کہیں باہر چلا گیا ہے تو اب وہاں کوئی اس کا جاننے پہچاننے والا نہیں' کوئی ہمدرد نہیں' کوئی مونس و غمخوار نہیں۔ گویا یہ شخص غریب الوطن ہے۔ اسی طرح اسلام بھی ابتدا میں غریب اور اجنبی تھا۔ اس کے بعد اسلام پر ایک دور آیا کہ اللہ نے اس کو قوت اور غلبہ دیا۔ اب ظاہر بات ہے کہ جس شے کو غلبہ حاصل ہو اس کے جاننے پہچاننے والے' اس کے ہمدرد و غمخوار تو سبھی ہو جائیں گے' تو بہت سے لوگ اس کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ حضور ﷺ نے یہ خبر دی تھی کہ عنقریب یہ دوبارہ اسی حالتِ غربت کو لوٹ جائے گا جیسے کہ یہ شروع ہوا تھا۔

اس بات کو نوٹ کیجیے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور اقتدار اگرچہ بہت عرصے تک چلا ہے' لیکن اسلام تو بہت جلد غریب ہو گیا۔ یہ وہی دور ہے جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کیے تھے' ان میں سے ایک سے تو میں نے خوب علم بانٹا ہے' اسے خوب پھیلایا

اور عام کیا ہے‘ لیکن اگر دوسرے کا مُنہ بھی کھول دوں گا تو میری گردن اڑا دی جائے گی ۔(صحیح بخاری) تو واقعہ یہ ہے کہ اسلام بہت جلد غریب ہو گیا تھا البتہ مسلمانوں کا غلبہ‘ ان کی سطوت اور شان و شوکت بہت عرصے تک چلی ہے۔ پھر عربوں کا یہ دورِ عروج ختم ہوا تو دو تین صدیوں پر محیط ایک ایسا دَور آیا جو اُمت مسلمہ کے لیے بہت ہی زوال کا دور تھا۔ اس کے بعد پھر سے ترکوں کے ذریعے مسلمانوں کو ایک عظمت اور سطوت ملی‘ لیکن اسلام پھر بھی غریب کا غریب رہا۔ مغلِ اعظم کا دَور تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے لیے سب سے بڑی غربت کا دور تھا۔ اگرچہ برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی سیاسی حکومت نصف النہار پر تھی لیکن اسلام تو درحقیقت بالکل زیریں سطح پر پہنچ چکا تھا‘ بلکہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ اس برعظیم سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہاں پر ’’دینِ الٰہی‘‘ کے نام سے ایک نیا دین وجود میں آ چکا تھا۔

بہرحال یہ نوٹ کیجیے کہ جب اسلام حالت غربت میں ہو گا تو انفاق اور قتال کا درجہ اللہ کی نگاہ میں بہت بلند ہو گا‘ جبکہ وہی کام یعنی انفاق اور قتال اگر اسلام کے غلبے کے دور میں ہو گا تو اس کے مقابلے میں درجہ بہت کم رہ جائے گا‘ اگرچہ حسن نیت اگر ہے تو بہرحال سب کے لیے اللہ کا اچھا وعدہ ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ ’’اللہ تعالیٰ نے سب سے بہت عمدہ وعدہ کیا ہے‘‘۔ حسنٰی‘ احسن کا مونث ہے‘ یعنی اللہ کا سب اہل ایمان سے بہت عمدہ وعدہ ہے‘ لیکن جو لوگ بعد میں قتال اور انفاق کرنے والے ہیں ان کا وہ درجہ کبھی نہیں ہو سکتا جو وہ لوگ لے گئے جنہوں نے یہ کام فتح سے پہلے کیے۔ بقول شاعر ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

اب اجر و ثواب اور درجات کے تعین میں جو دوسرا عنصر ہے‘ یعنی عمل کی باطنی کیفیت‘ اس کو ذہن میں رکھئے! جس طرح خارجی حالات کے اعتبار سے ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں‘ جیسے ایک عمل اسلام کی غربت اور مغلوبیت کے دور میں ہے اور ایک اسلام کے غلبے اور اس کی قوت و سطوت کے دور میں ہے‘ اسی طرح داخلی اعتبار سے بھی ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں جن کے اعتبار سے عمل کی قدر و قیمت بڑھتی یا گھٹتی ہے۔ ایک ہے حسنِ نیت‘ جس کا معاملہ اکثر و بیشتر مشکوک رہتا ہے۔ ایک انسان تو وہ ہے جو شعوری طور پر ریاکاری کر رہا ہے۔ یہ شعوری ریاکاری تو شرک ہے اور ایک ایسی چیز ہے کہ جیسے کوئی

بڑی سے بڑی رقم صفر سے ضرب کھا کر صفر ہو جائے۔ بلکہ اس سے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ جیسے فرمانِ نبویؐ ہے: ((مَنْ صَلّٰی یُرَاءِ یْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ یُرَاءِ یْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَاءِ یْ فَقَدْ اَشْرَكَ))[1] ''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا''۔ لیکن یہ تو شعوری ریاکاری ہوئی' جبکہ ایک ہے تحت الشعور میں ریاکاری کا عنصر۔ جیسے سورۃ التغابن میں اللہ تعالیٰ کے علم کی تیسری جہت (third dimension) ان الفاظِ مبارکہ میں لائی گئی ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ کہ اللہ تو سینوں کی پوشیدہ باتوں سے بھی واقف ہے۔ بسا اوقات انسان کو خود اندازہ نہیں ہو پاتا کہ کس طرح غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر اس کی نیت کے اندر کہیں کسی درجے میں سُمعہ اور ریا کا حصہ شامل ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یقیناً عمل کے اجر وثواب اور اس کے مرتبے کے اندر کمی آ جائے گی' لیکن اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے' یہ تو اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں ہے۔

اس کے علاوہ ایک داخلی پہلو اور بھی ہے۔ اللہ نے تمام انسان ایک جیسے پیدا نہیں کیے' مختلف لوگوں کی جبلتیں مختلف ہیں۔ اس کو سورۂ بنی اسرائیل میں یوں بیان کیا: ﴿قُلْ كُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ ﴾ ''کہہ دیجیے (اے نبیؐ!) کہ ہر شخص اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کرتا ہے''۔ شاکلہ کہتے ہیں شکل دینے والی شے کو' جسے عام طور پر سانچہ (mould) کہا جاتا ہے۔ آپ لوہا یا کوئی اور دھات پگھلا کر کسی سانچے میں ڈال دیں تو اس کی شکل اس سانچے کے مطابق ہو جائے گی۔ تو یہ سانچہ جو ہے یہ شاکلہ ہے۔ ہر انسان کا ایک جداگانہ شاکلہ ہے۔ آج کے دور میں یہ بات جینز یا جینیٹکس کے حوالے سے بہت معلوم ومعروف ہے۔ ہمیں نا معلوم کہاں کہاں سے جینز ملے ہیں! نا معلوم کتنی پشتوں سے یہ جینز چلے آ رہے ہیں جو ہماری شخصیت کو ایک شکل دیتے ہیں۔ ہر شخص کا جو جینیٹک structure ہے اور جو اُس کی شخصیت کا شاکلہ ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ فرض کیجیے کسی شخص کے اندر اپنے شاکلہ کے اعتبار سے شہوت کا زیادہ زور ہے ہی نہیں' اب اگر ایسا شخص پاک دامن ہے تو اس نے کوئی بڑا تیر نہیں مارا۔ لیکن اگر کسی شخص کے اندر شہوت کا زور ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے ہے اور پاک دامن ہے تو یہاں اب دونوں کے اجر وثواب اور درجے میں فرق واقع ہو جائے گا۔ پاک دامنی دونوں کی برابر ہے' لیکن کس شخص نے کس حالت میں اپنے آپ کو کنٹرول کیا ہے' اس اعتبار سے فرق

(۱) رواہ احمد

واقع ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک شخص طبعاً بزدل ہے' اس کے اندر جرأت اور شجاعت نہیں ہے' لیکن اس کے باوجود وہ اللہ کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے تو اس کا مقام و مرتبہ اس شخص سے بہت بلند ہو گا جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی طبعاً جرأت مند بنایا ہے اور اس کے اندر سے خوف نکالا ہوا ہے اور وہ بھی اسی شخص کے مانند اللہ کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے۔ تو یہ ساری چیزیں ہیں کہ جن سے کسی کے عمل کی قدر و قیمت اور اس عمل کرنے والے کا درجہ متعین ہوتا ہے۔

اسی لیے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴾ ''اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو''۔ میں یہ بات پہلے نوٹ کرا چکا ہوں کہ اس سورۃ میں بھی اور سورۃ التغابن میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ''بصیر'' کا ذکر پہلے ہوا ہے اس کی صفت ''خبیر'' کے ذکر سے۔ اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۴ میں ہے: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے اس کو جو تم کرتے ہو''۔ سورۃ التغابن میں بھی یہی ترتیب ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت 'خبیر' میں بہت گہرائی ہے کہ وہ ہر شے سے خوب باخبر ہے۔ ہماری زبان میں بصارت کا لفظ عام طور پر ظاہری بصارت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر کسی بھی عمل کے ظاہر سے ہوتا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفت خبیر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس نے کیا عمل کس حالت میں کیا ہے' اس نے اس کام کی انجام دہی کے لیے اپنی کتنی اندرونی رکاوٹوں کے اوپر غلبہ حاصل کیا ہے اور اسے اس کے لیے کتنی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب باخبر ہے کہ کس شخص کے لیے یہ کام کتنا آسان ہے۔ لہٰذا حالاتِ خارجی اور حالاتِ داخلی (پھر داخلی حالات میں بھی نیت اور شاکلہ دونوں شامل ہیں) ان سب کے اعتبارات سے کسی بھی عمل کی قدر و قیمت کا تعین ہو گا۔ ہمارے بڑے سے بڑے کمپیوٹر کے لیے بھی یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ وہ ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھ کر کوئی معاملہ طے کر سکے۔ لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو صرف اللہ اس سے باخبر ہے۔ تمہارے ان اعمال کا ہر پہلو اس کے سامنے واضح ہے۔ ہر شخص کا درجہ اللہ تعالیٰ کے علم قطعی کے اعتبار سے معین ہو گا۔

قرضِ حسنہ کے لیے اللہ کی پکار

آگے فرمایا: ﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا ﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟'' یہاں للکارنے کا اور چیلنج کا انداز ہے کہ کون ہے وہ باہمت آدمی کہ جو اللہ کو قرض حسنہ دے؟ یہ بالکل وہی انداز ہے جو سورۃ الاحزاب میں اختیار کیا گیا: ﴿مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ رِجَالٌ

صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

''مؤمنین میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔ان میں سے کوئی تو اپنی ذمہ داری پوری کر چکا اور کوئی موقع کا انتظار کر رہا ہے اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی''۔غالب کا یہ شعر درحقیقت اسی اسلوب میں ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد!

اب دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اس اندازِ کلام سے کیا مراد ہے! اس آیت کے بین السطور درحقیقت یہی بات ہے کہ اللہ کے لیے جان و مال کا لگا دینا' کھپا دینا' آسان کام نہیں ہے۔اس کے لیے تو یقینِ کامل درکار ہے' وہ یقینِ کامل جس کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔جس نے وہاں سے کسبِ فیض کیا ہو وہ یہ کام کر سکتا ہے۔جیسے کہا جاتا ہے کہ آ ؤ یہ گوئے ہے اور یہ چوگان۔یعنی let him prove his worth——چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا معاملہ دیکھا کہ انہوں نے دو مرتبہ اپنا سب کچھ لا کر حضور ﷺ کے سامنے رکھ دیا۔اوّل تو وہ مکّہ میں ہی اپنا تقریباً سارا سرمایہ ان غلاموں اور کنیزوں کے آزاد کرانے میں لگا چکے تھے جو ایمان لائے تھے۔ آپؓ نے انہیں آزاد کرانے میں ان کے آقاؤں کو مُنہ مانگی قیمتیں ادا کیں۔اور جب حضور ﷺ کے ساتھ ہجرتِ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو اپنا بچا کھچا سارا مال ساتھ لے لیا اور اپنے اہل خانہ کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔آپؓ کے والد ابوقحافہ' جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور بعد میں ایمان لائے' بینائی سے محروم تھے' انہیں جب معلوم ہوا کہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تو چلے گئے ہیں تو اب وہ اپنی پوتیوں حضرت عائشہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور پوچھا کہ وہ کچھ چھوڑ کر بھی گیا ہے یا نہیں؟ تو پوتیوں نے کپڑے میں کچھ کنکر اور پتھر باندھ کر کہا کہ دیکھئے دادا جان! یہ سونے اور چاندی کی ڈلیاں ہیں جو ابا جان ہمارے لیے چھوڑ کر گئے ہیں' حالانکہ وہ کنکریوں اور پتھروں کے سوا کچھ نہ تھا۔اور پھر جب سن ۹ ھ میں غزوۂ تبوک کے لیے مال کے انفاق کا موقع آیا اُس وقت بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر میں جھاڑو پھیر کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ یہ وہی موقع ہے جب حضور ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر کو جو مقام حاصل ہے وہ نمازوں اور روزوں کی وجہ سے نہیں' ان کا مقام اس شے کی وجہ سے ہے جو اُن کے دل میں ہے''۔وہ درحقیقت یقینِ محکم تھا جو اُن کے دل میں تھا۔اور یہ درحقیقت اللہ کی ذات اور اس کے وعدوں پر یقین ہی ہے جو

انسان کو اپنا سب کچھ لگا دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ بصورت دیگر تو یہی ہوتا ہے کہ مال سینت سینت کر رکھے جاؤ، جائیدادیں بنائے جاؤ، اپنی اولاد کے لیے خوب مال و دولت چھوڑ کر مرو، البتہ ہر سال عمرہ ضرور کرتے چلو، حج پر حج کیے جاؤ اور اس کی گنتی بڑھاتے جاؤ۔ ہمارے ہاں تو نیکی کا تصور بس یہی رہ گیا ہے۔ اور وہ عمرے اور حج بھی ہو رہے ہیں حرام و حلال کی کمائی سے قطع نظر کہ وہ مال آیا کہاں سے ہے۔ یا پھر ہمارے ہاں نیکی کا تصور یہ رہ گیا ہے کہ کوئی لنگر کھول کر غریبوں کو کھلا دو، کہیں کوئی چندہ دے دو اور بس۔ جبکہ اصل محنت دنیا بنانے میں ہو رہی ہے۔ اپنا قیمتی وقت، اپنی جان، اپنی صلاحیتیں، اپنی ذہانت، یہ سب کچھ صرف ہو رہے ہیں صرف دنیا بنانے اور مال جمع کرنے میں۔

ان دو تصورات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایمان اگر دل میں جاگزیں ہو گا تو یہ تصور لائے گا کہ میرا سب کچھ خدا کا ہے، میں خود اسی کے لیے ہوں۔ ﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ''یقیناً میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے''۔ انسان اپنے مال میں سے اپنے لیے صرف اتنا رکھے جتنا جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہو، اور یہ اپنے آپ کو برقرار رکھنا بھی اللہ کے دین کی جدوجہد کے لیے ہو۔ فرمایا: ﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے''۔

ہمارے ہاں تو قرضِ حسنہ کا تصور یہ ہے کہ جو قرض دیا جائے بس صرف وہی واپس لینے کی امید ہو یا وعدہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ جس قرضِ حسنہ کا مطالبہ کر رہا ہے وہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے گا۔ قرضِ حسنہ کے ضمن میں حضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ کبھی کسی سے قرض لیتے تھے تو واپس کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیتے تھے۔ لیکن واپس کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر کچھ بڑھا دینا یہ ہدیہ کے درجہ کی شے ہے۔ اگر قرض میں پہلے سے کوئی اضافہ معین ہو تو وہ سود ہے اور حرامِ مطلق ہے۔ دین میں اس سے بڑی حرام چیز اور کوئی نہیں۔ عقائد میں شرک اور اعمال میں سود چوٹی کے گناہ ہیں۔ بہرحال اللہ کا قرضِ حسنہ کچھ اور ہے۔ جو شخص اللہ کو قرضِ حسنہ دے اللہ تعالیٰ اس کے لیے اسے بڑھاتا اور دوگنا کرتا رہے گا۔ واضح رہے کہ یہ صرف دوگنا کرنا نہیں، بلکہ دوگنا کرتے رہنا ہے۔ یعنی جو مال تم نے دیا ہے وہ تو واپس ملے گا ہی، ساتھ اضافی طور پر بھی بہت کچھ ملے گا۔ جیسے سورۃ المزمل کے آخر میں فرمایا: ﴿تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرًا وَّاَعۡظَمَ اَجۡرًا﴾ ''تم پاؤ گے وہ سب

کچھ (جو کچھ تم نے دیا ہے) اللہ کے پاس بہت بہتر حالت میں' اور بہت بڑھا ہوا (فزوں تر)''۔اللہ تعالیٰ نے یہاں ساتھ یہ بھی فرمایا: ﴿وَلَـهٗ اَجۡـرٌ كَـرِيۡمٌ ﴾ ''اوراس کے لیے بڑا باعزت (عزت افزائی کرنے والا) اجر ہے''۔آیت ۷ میں ''اجرٌ کبیرٌ '' کے الفاظ آئے تھے' یہاں ''اجرٌ کریمٌ '' فرمایا۔قرآن کریم میں اجر کے لیے ان دونوں dimensions کا ذکر ہوتا ہے کہ بہت بڑا اور باعزت اجر۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

درس 27

میدان حشر کی تاریکیوں میں اہل ایمان کے نور کی کیفیت اور ایمان کے دعویداروں کی اہل ایمان اور منافقین کے مابین تفریق

سُوۡرَۃُ الۡحَدِیۡد کی آیت ۱۲ تا ۱۵ کی روشنی میں!

درس ۲۷

میدانِ حشر کی تاریکیوں میں

اہلِ ایمان کے نور کی کیفیت

اور

ایمان کے دعوے داروں کی

اہل ایمان اور منافقین کے مابین تفریق

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿ یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ یَسۡعٰی نُوۡرُہُمۡ بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ بِاَیۡمَانِہِمۡ بُشۡرٰىکُمُ الۡیَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۲﴾ یَوۡمَ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الۡمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا انۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِکُمۡ ۚ قِیۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَکُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا ؕ فَضُرِبَ بَیۡنَہُمۡ بِسُوۡرٍ لَّہٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُہٗ فِیۡہِ الرَّحۡمَۃُ وَ ظَاہِرُہٗ مِنۡ قِبَلِہِ الۡعَذَابُ ﴿۱۳﴾ یُنَادُوۡنَہُمۡ اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی وَ لٰکِنَّکُمۡ فَتَنۡتُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ وَ تَرَبَّصۡتُمۡ وَ ارۡتَبۡتُمۡ وَ غَرَّتۡکُمُ الۡاَمَانِیُّ حَتّٰی جَآءَ اَمۡرُ اللّٰہِ وَ غَرَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ ﴿۱۴﴾ فَالۡیَوۡمَ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡکُمۡ فِدۡیَۃٌ وَّ لَا مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ مَاۡوٰىکُمُ النَّارُ ؕ ہِیَ مَوۡلٰىکُمۡ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۵﴾ ﴾

اس سورۂ مبارکہ کا تیسرا حصہ چار آیات (آیت ۱۲ تا ۱۵) پر مشتمل ہے۔ جیسے پہلے حصے کی آیت: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳﴾ فلسفے کی بلندترین چوٹی پر ہے اور فلسفۂ وجود کے عقدے کو حل کر رہی ہے اسی طرح اس تیسرے حصے میں ایک آیت ہے جو نفاق کی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ نفسیاتی سطح پر نفاق کے کیا مدارج اور مراحل ہیں؟ نفاق کہاں سے شروع ہوتا ہے' پھر اس کا دوسرا درجہ کیا ہے' تیسرا درجہ کیا ہے؟ نفسیاتی طور پر منافق کے اندر کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ وغیرہ۔ سورۃ المنافقون کے درس میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ نفاق کے تین درجے ہوتے ہیں' جیسے ٹی بی کے تین درجے (stages) ہوتے ہیں۔ نفاق کا پہلا درجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی راہ میں مال اور جان کے کھپانے کا حکم آتا ہے تو ایسا شخص اس جہاد و قتال اور انفاقِ مال سے بچنے کے لیے جھوٹے بہانے شروع کر دیتا ہے۔ لیکن جب محض جھوٹے بہانوں کا اعتبار نہیں رہتا تو پھر جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں' یہ نفاق کا دوسرا درجہ ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''انہوں نے اپنی (جھوٹی) قسموں کو ڈھال بنا لیا اور اللہ کے راستے سے رُکتے گئے!'' نفاق کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ جب سچے اہل ایمان اللہ کی راہ میں جان اور مال کی بازیاں لگا رہے ہوتے ہیں تو ان کے خلاف ان کے دلوں میں بغض اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ سچے اہل ایمان کو تو جب پکارا جاتا ہے تو وہ فوراً لبیک کہتے ہیں۔ بقول فیضؔ: ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں ' راحتِ تن ' صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی!

تو جن اہل ایمان کی یہ روش ہوتی ہے وہ اب منافقین کے دلوں میں کھٹکنے لگتے ہیں' کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے ہم نمایاں ہو رہے ہیں۔ ان کے خیال میں ان دیوانوں اور پاگلوں نے انہیں مصیبت میں ڈال رکھا ہوتا ہے۔ تو اب مؤمنین صادقین اور محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ' جو اُن کے امیر ہیں' ان کی دشمنی شروع ہو جاتی ہے ــــــ اور یہ نفاق کا تیسرا درجہ ہے۔

یہ تین مدارج تو علامات ہیں جو عمل میں ظاہر ہوتی ہیں' لیکن ذہن میں اور نفسیات کے اندر جو کھچڑی پک رہی ہوتی ہے وہ کیا ہے؟ اور یہ علامات درحقیقت کس اندرونی مرض کا ظہور ہیں؟ یہ اس

سلسلۂ آیات کا مرکزی مضمون ہے۔

میدانِ حشر میں اہل ایمان اور اہل نفاق کی کیفیات

ارشاد ہوا:

﴿یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُھُمْ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ بُشْرٰىکُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾﴾

''اس دن تم دیکھو گے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا' (اور ان سے کہا جائے گا) آج تمہیں ایسے باغوں کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے''۔

سچے اہل ایمان کے فوراً بعد منافقین کا تذکرہ آ رہا ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم کا تذکرہ simultaneous contrast کے طور پر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے برعکس کیفیت بیان فرمائی گئی:

﴿یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ ج قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَکُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ط فَضُرِبَ بَیْنَھُمْ بِسُوْرٍ لَّہٗ بَابٌ ط بَاطِنُہٗ فِیْہِ الرَّحْمَۃُ وَظَاھِرُہٗ مِنْ قِبَلِہِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾﴾

''اُس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے ذرا ہمیں مہلت دو اور ہمارا انتظار کرو' تاکہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کر سکیں' تو انہیں کہا جائے گا کہ پیچھے لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو' پھر اُن (اہل ایمان اور منافقین) کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا' اس کے اندر تو رحمت ہوگی اور باہر عذاب ہوگا''۔

قرآن مجید کے مختلف مقامات پر ہمیں میدانِ حشر کے مختلف نقشے ملتے ہیں اور مختلف مکالمات کا ذکر ہے۔ اس اعتبار سے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ میدانِ حشر کوئی ایک مرحلہ نہیں ہے' بلکہ اُس روز کے احوال مختلف مراحل سے گزر کر تکمیل تک پہنچیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرحلہ تو وہ ہے جہاں کافر اور مسلم جدا ہو جائیں گے۔ یعنی ایک بڑی چھلنی لگے گی جس سے کھلم کھلا باغی و منکر اور مدعیٔ ایمان جدا جدا ہو جائیں گے۔ گویا کافر اِدھر اور مسلم اُدھر ہیں۔ لیکن اب دنیا میں جو قانونی اعتبار سے مسلمان سمجھے جاتے تھے ان میں مؤمنین صادقین بھی تھے اور منافقین بھی تھے۔ تو اب ایک اور چھلنی لگے گی جس سے گویا دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ یہ مرحلہ سورۃ الحدید کی ان آیات میں مذکور ہے۔ اس

کے علاوہ یہی مضمون اس سلسلۂ سُور کی آخری سورۃ' سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی بیان ہوا ہے۔ وہاں ارشاد ہوا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ یَسْعٰى بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۸﴾﴾

''اے ایمان والو! اللہ کے حضور خالص توبہ کرو' کچھ بعید نہیں کہ تمہارا ربّ تم سے تمہاری برائیاں دُور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اس دن اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے' رسوا نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے اور دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا۔ وہ کہیں گے اے ہمارے ربّ! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر دے اور ہمیں بخش دے' یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے''۔

تو ان دو مقامات پر یہ مضمون آیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ آپ کو اہم مضامین کم سے کم دو جگہ ضرور ملیں گے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا مرحلہ لازماً ہو گا جس میں مؤمنین صادقین کو منافقین سے جدا کر دیا جائے گا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ سے جو شکل اختیار فرمائے گا وہ یہ ہے کہ جن کے دلوں میں ایمان موجود ہو گا ان کا نورِ ایمان ظاہر ہو جائے گا اور وہ ان کے سامنے کی طرف روشنی کرے گا۔ اور اس ایمان کے تحت جو اعمالِ صالحہ تھے' ان کا نور ان کے دائیں جانب ظاہر ہو گا' کیونکہ انسان کا دایاں ہاتھ اعمالِ صالحہ کا کاسب ہے۔ یوں سمجھئے کہ درحقیقت یہ ایمان ایک نور ہے۔ اس وقت تو نور قلب میں ہے' ہمیں نظر نہیں آ رہا ہے' جبکہ اس نور کی ایک اور صورت ہے جو وہاں ظاہر ہو گی۔ اسی طرح ہر نیکی کے اندر ایک نورانیت ہے اور یہ نور ہمیں یہاں نظر نہیں آ رہا' لیکن اس کی اصل ماہیت اور اصل حقیقت میدانِ حشر میں اس مرحلے پر واضح ہو جائے گی۔

میدانِ حشر کی تاریکیوں میں اہل ایمان کے نور کی کیفیت

میدانِ حشر میں ایک ایسا مرحلہ بھی ہے جسے ہماری زبان میں عام طور پر پل صراط کہا گیا ہے۔ یہ انتہائی گھپ اندھیرے میں جہنم کے اوپر بنا ہوا ایک راستہ ہے۔ سورۂ مریم میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ﴿۷۱﴾﴾ ''اور تم میں سے

کوئی ایسا نہیں جس کا اس (جہنم) پر گزر نہ ہو' یہ طے شدہ بات ہے جو تمہارے ربّ کے ذمہ ہے''۔تو یہ پل صراط ہے جس پر سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔ یہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا انتہائی تنگ راستہ ہے جسے ہم اپنی استعاراتی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز راستہ ہے۔اب جن کے پاس تو وہ نورِ ایمان اور نورِ اعمالِ صالحہ ہوگا وہ تو اس نور کی روشنی میں اس راستے کو دیکھ کر اس مرحلے سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائیں گے اور دوسرے جو اِس نور سے محروم ہوں گے وہ ٹھوکریں کھا کر جہنم کے اندر گریں گے۔ یہ ہے درحقیقت وہ چھلنی کہ جو میدان حشر میں کسی ایک مرحلے پر لگے گی۔

تو فرمایا:﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ یہاں پر یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے کہ لفظ ''یَوْمَ'' یہاں منصوب کیوں ہے۔اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اس سے ماقبل آیت کے آخر میں ''اَجْرٌ كَبِيْرٌ'' کا ذکر ہوا ہے' یہ اس کا ظرف ہے کہ وہ اجر کریم کب ظاہر ہوگا: ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ''(یہ اجر کریم ظاہر ہوگا) اُس دن کہ جب تو دیکھے گا مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا''۔تو اس رائے کے مطابق یہ ظرفیت کا نصب ہے۔اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ ''یَوْمَ'' سے پہلے ''اُذْكُرْ'' محذوف ہے کہ تصور کرو اس دن کا جس دن مؤمنوں پر یہ عنایت خاص ہوگی۔اس رائے کے مطابق یہاں سے پھر استیناف ہو جائے گا' یعنی یہاں سے ایک علیحدہ کلام شروع ہوگا۔ میں اسی دوسری رائے کو زیادہ قوی سمجھتا ہوں' لیکن دونوں رائیں ممکن ہیں۔تو فرمایا جا رہا ہے کہ ذرا تصور کرو اُس دن کا جس دن تم دیکھو گے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور دوڑتا ہوگا﴿ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ﴾ ''ان کے سامنے''۔ان کے آگے آگے۔ یہ میرے نزدیک ایمان کا نور ہے جو قلب میں ہے' اس کی جو بھی روشنی پڑے گی وہ سامنے کی طرف ہوگی۔﴿وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾''اور ان کے دائیں طرف''۔سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی یہی الفاظ ہیں: ﴿يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ سورۃ التحریم میں تو ان کی دعا کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔جن کا نور تھوڑا ہوگا' وہ پھر دعا کریں گے:﴿رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۸﴾﴾ کہ پروردگار! ہماری ان کوتاہیوں کو جن کی وجہ سے ہمارا یہ نور مدھم ہے' تو اپنے فضل وکرم سے معاف فرما کر ہمارے اس نور کا بھی اتمام فرما دے! گویا وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے پروردگار! جیسے تو نے حضرت ابوبکر صدیق اور

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کو نورِ کامل عطا فرمایا ہے ایسے ہی اپنے فضل و کرم سے ہمارے نور کا بھی اتمام فرما دے۔ اس لیے کہ حدیثِ نبویؐ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نور کے مختلف درجات ہوں گے۔ یہ گویا اس کا quantitative element ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان میں اور ایک عام آدمی کے ایمان میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ اور ہم سے کسی کو اگر کوئی رتی ماشہ ایمان نصیب ہو جائے تو اس کی کیا نسبت تناسب ہے حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کے ساتھ! اس حوالے سے حضور ﷺ کے الفاظ ہیں کہ کچھ لوگوں کو تو جو نور ملے گا وہ اتنا ہوگا کہ اس کی روشنی مدینے سے صنعا تک پہنچے گی۔ (یہ یمن کا ایک شہر ہے۔) یعنی اس کے اثرات اس قدر زیادہ ہوں گے۔ اور فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو بس اتنا نور ملے گا کہ وہ صرف ان کے قدموں کے سامنے روشنی کر رہا ہوگا۔ لیکن یہاں نوٹ کر لیجیے کہ اُس وقت وہ نور بھی بہت غنیمت ہوگا۔ اس کا کسی قدر اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص گھپ اندھیری رات میں سفر کر رہا ہو اور وہ پگڈنڈی بھی واضح نہ ہو جس پر جانا ہے تو اس موقع پر اگر اس کو کوئی معمولی ٹارچ بھی مل جائے تو وہ اس کے لیے بڑی قیمتی چیز ہوگی' اور اگر کسی کے پاس لالٹین ہو تو وہ بھی ایسے موقع پر بڑا خوش نصیب ہو گا۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

اندھیری شب ہے' جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل!

لیکن اگر کسی کو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما والا نور میسر آ جائے تو اس کے کیا کہنے۔ یہ فرق و تفاوت بہرحال ہوگا۔ حدیث نبویؐ میں یہ فرق و تفاوت اس حوالے سے بھی بیان ہوا ہے کہ چھوٹے اور کم تر درجے کا جنتی اپنے سے اوپر والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین پر بیٹھ کر آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہو۔ اس قدر فرق و تفاوت ہوگا!

آگے فرمایا:

''(ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لیے ان باغات کی جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''۔ یعنی آج کا دن تمہارے لیے بشارت کا دن ہے۔ تمہاری کلفتوں اور مشقتوں کا دور اب ختم ہوا۔ تم امتحان کے مختلف مرحلوں سے گزر آئے ہو اور اب تمہاری سختیاں اور تمہاری ابتلاء و آزمائش ختم ہوئی۔ آج سے تمہارے لیے بشارت ہے ان باغات کی جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ میں عام طور پر''

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ‘‘ کا ترجمہ ’’دامن میں ندیاں بہنا‘‘ زیادہ پسند کرتا ہوں‘ اس لیے کہ باغ کا جو فطری تصور ہوتا ہے وہ یہی ہے۔ ایک باغ تو لوگوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے جو وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بناتے ہیں‘ جس کے مختلف درجات (levels) ہوتے ہیں‘ جیسے کہ شالامار باغ ہے‘ جبکہ ایک باغ فطری ہوتا ہے۔ جیسے ایک وادی ہے‘ اس کے نشیب میں ایک ندی بہہ رہی ہے اور ندی کے دونوں اطراف میں ذرا بلندی پر درخت لگائے گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ پانی کے اثرات زمین کے دونوں طرف سرایت کر رہے ہوں گے جو اُن درختوں کے لیے زیادہ مفید ہیں۔ لہٰذا ﴿تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ باغات کے دامن میں ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ’’ایک آرزو‘‘ میں اس کا ایک خوبصورت نقشہ کھینچا ہے ؏ پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو! بہرحال یہ کہنا کہ ’’نیچے ندی بہہ رہی ہے‘‘ یا یہ کہنا کہ ’’دامن میں ندی بہہ رہی ہے‘‘ اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

مزید فرمایا: ﴿خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا﴾ ’’اس میں تمہیں رہنا ہے ہمیشہ ہمیش‘‘ ﴿ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۲﴾﴾ ’’یہی ہے اصل بڑی کامیابی‘‘۔ یہاں ’ذٰلِكَ‘ کے بعد هُوَ بھی آیا ہے اور یہ حصر کا اسلوب ہے کہ ’’یہی ہے اصل بڑی کامیابی‘‘۔ اس سے دراصل اس حقیقت کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے کہ اگرچہ دنیا میں بھی انسان چاہتا ہے کہ اپنی محنت کے کوئی نتائج دیکھ لے‘ لیکن یہ اصل کامیابی نہیں ہے۔ جیسے سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: ﴿وَاُخۡرٰی تُحِبُّوۡنَهَا نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتۡحٌ قَرِیۡبٌ﴾ کہ ایک اور وعدہ بھی تم سے کیا جا رہا ہے جو تمہیں بہت پسند ہے‘ اور وہ ہے اللہ کی طرف سے مدد اور فوری (دُنیوی) فتح۔ جبکہ اللہ نے تو یہ دنیا بنائی ہے صرف آزمائش کے لیے: ﴿خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوةَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (المُلك:۲) ’’اس نے تخلیق کیا ہے موت اور زندگی کو‘ تاکہ وہ تمہیں (اس کے ذریعے) آزمائے کہ کون ہے تم میں سے عمل کے اعتبار سے زیادہ بہتر‘‘۔ تو جو اِس آزمائش میں کامیاب ہو گیا بس وہی ہے اصل میں کامیاب‘ چاہے دنیا میں ایسے شخص کی سعی و جہد کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ یہ دُنیوی کامیابی اس اعتبار سے بالکل غیر اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کئی جلیل القدر رسول دنیا سے یوں ہی چلے گئے کہ انہیں کوئی پیروکار نہیں مل سکے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ساڑھے نو سو (۹۵۰) برس کی تبلیغ کے نتیجے میں صرف ستر یا بہتر افراد ملے‘ بلکہ ایک رائے تو یہ بھی ہے کہ اتنے بھی نہیں ملے۔ سوائے ان کے تین بیٹوں اور ان کے گھر والوں کے کوئی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ قرآن کے

الفاظ ہیں: ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلٌ﴾ (ھود: ۴۰) ''اور ایمان نہیں لائے اس کے ساتھ مگر تھوڑے ہی لوگ''۔ ساڑھے نو سو سال کا عرصہ بہت بڑا عرصہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناکامی کا اس کو چے میں گزر ہی نہیں۔ جو آپؑ کا فرض تھا وہ انہوں نے بطریق احسن ادا کیا اور حجت تمام کر دی۔

یہ نفسیاتی اعتبار سے بہت اہم مسئلہ ہے۔ خاص طور پر ہر اُس شخص کے لیے جو دین کی کسی خدمت کا بیڑا اٹھائے اور اس کے لیے کمر کس لے اس پر یہ بات پوری طرح واضح ہونی چاہئے کہ اس کا نصب العین سوائے آخرت کی فلاح اور اللہ کی رضا کے کوئی نہ ہو۔ کوئی اور شے اس کی نظر میں نصب العین کا درجہ اختیار نہ کر لے۔ اصل شے اپنے فرض کی ادائیگی ہے اور یہی اصل کامیابی ہے۔ چنانچہ سورۃ الصّف میں فرمایا: ﴿تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ‌ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝١١﴾ یعنی اگر تم یہ دو شرائط پوری کر لو کہ اللہ اور رسول (ﷺ) پر ایمان لے آؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو تو یہ چیز تمہارے لیے خیر ہے اگر تم جانو۔ اور وہ خیر کیا ہے! ﴿يَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ وَيُدۡخِلۡـكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ‌ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝١٢﴾ ''وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اور (تمہارے لیے) پاکیزہ مکانات ہوں گے رہائشی باغات میں۔ یہی ہے بڑی کامیابی''۔ آگے وہی بات کہی جا رہی ہے کہ ﴿وَاُخۡرٰى تُحِبُّوۡنَهَا‌ ؕ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتۡحٌ قَرِيۡبٌ‌ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝١٣﴾ ''اور وہ دوسری چیز بھی (تمہیں عطا کرے گا) جو تمہیں بہت پسند ہے' اللہ کی طرف سے مدد اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اور (اے نبیؐ!) اہل ایمان کو خوشخبری دے دیجیے!'' اب ظاہر بات ہے کہ یہ بات تو کہی جا رہی ہے سن ۶ ھ کے آس پاس۔ اس سے پہلے کتنے ہی صحابہؓ ہیں جو جامِ شہادت نوش کر چکے اور ابھی تو وہ نصرتِ خداوندی قریب بھی نہیں آئی تھی۔ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو مکے میں ہی شہید ہو گئے تھے جو اسلام کی مغلوبیت کا دور ہے۔ یوں کہیے کہ اسلام ابھی اپنی اجنبیت کے دور میں تھا۔ تو ذرا سوچئے کہ جو مکہ میں ہی شہید ہو گئے' کیا وہ ناکام ہیں؟ (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ) لہٰذا یہ بات ذہن میں بالکل واضح رہنی چاہیے۔ ورنہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ آدمی جب دیکھتا ہے کہ اس دنیا میں میری کوشش بار آور نہیں ہو رہی اور لوگوں کا رجوع میری طرف نہیں ہو رہا' لوگ میرا ساتھ نہیں دے رہے تو وہ by hook or by crook کے مصداق کوئی الٹا سیدھا طریقہ آزماتا ہے اور کوئی مختصر اور آسان راستہ (شارٹ کٹ)

اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں ہوتا ہے اگر ذہن میں یہ خناس پیدا ہو جائے کہ اصل کامیابی تو یہاں کی کامیابی ہے۔ جبکہ یہ بات ہرگز نہیں ہے' بلکہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٢﴾﴾ ''یہی ہے اصل بڑی کامیابی''۔

حصولِ نور کے لیے منافقین کی دہائی اور اس کا جواب

آگے ترجمہ کر لیجیے: ﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا﴾ ''اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اہل ایمان سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو!'' اب ذرا اس کو چشمِ تصور سے دیکھئے کہ جنہیں وہ نورِ ایمان اور نورِ اعمال صالحہ مل گیا وہ خوشی خوشی راستہ طے کر رہے ہیں اور جن کے پاس یہ نور نہیں ہے وہ انہیں باحسرت و یاس پکار رہے ہیں کہ ذرا ہماری حالت پر نظر کرو! ذرا ہمارا انتظار کرو! نَظَرَ ' يَنْظُرُ دیکھنے کے معنی میں آتا ہے اور اسی سے باب افتعال کا مصدر ''انتظار'' آتا ہے۔ انتظار کے معنی تو بالکل معین ہیں کہ کسی کا انتظار کرنا' کسی کی راہ دیکھنا' کسی کو ذرا مہلت دینا۔ تو ''اُنْظُرُوْنَا'' یہاں اسی معنی میں ہے کہ ذرا ہمیں مہلت دیجیے' ہمارا انتظار کیجیے! ﴿نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ ''تاکہ ہم آپ کے نور سے اقتباس کر لیں۔'' آپ کے نور سے ہم بھی کچھ فائدہ اٹھالیں' کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ یعنی ہم خود تو تہی دست ہیں' ہمیں نور نہیں ملا' آپ ذرا ہم پر عنایت کریں! یہ اقتباس کا لفظ بھی قَبَسَ سے باب افتعال کا مصدر ہے۔ قَبَسٌ کہتے ہیں چنگاری کو۔ آپ کسی کے چولہے سے چنگاری لے آئے اور اپنے چولہے میں آگ جلالی تو یہ اقتباس ہے۔ اردو میں ہم یہ لفظ quotation کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ آپ اپنا کوئی مضمون لکھ رہے ہیں اور اس میں آپ نے کسی اور کے مضمون سے کوئی شے لا کر شامل کی تو یہ اقتباس ہے۔ گویا آپ نے کسی کے چولہے سے ایک چنگاری لا کر اپنے چولہے میں شامل کی ہے۔ اس کی آپ نشان دہی بھی کر دیتے ہیں کہ یہ اقتباس (quotation) ہے جو فلاں کے مضمون سے لیا گیا ہے۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کو دورانِ سفر راستے میں جب آگ نظر آئی تھی تو انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات سے کہا تھا: ﴿امْكُثُوْا اِنِّيْ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿١٠﴾﴾ (طٰہٰ) ''ٹھہرو' مجھے آگ نظر آئی ہے' شاید میں وہاں سے آپ کے لیے کوئی انگارا لاسکوں یا مجھے اس آگ پر سے راستے کا ہی کچھ پتہ چل جائے''۔ تو یہاں منافقین کے قول میں بھی وہی لفظ آیا ہے: ﴿اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ کہ ذرا ہمیں مہلت دو' ہمارا انتظار کرو' ہمارے لیے ٹھہرو' کہاں قدم بڑھائے چلے جا رہے ہو' ذرا ٹھہرو کہ ہم تمہارے اس نور

سے استفادہ کرلیں، تاکہ ہم بھی کسی طور سے اس بڑی کٹھن منزل کو طے کرلیں۔

﴿قِيۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَ كُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا﴾ ''(تو ان سے) کہا جائے گا کہ (اگر ممکن ہے تو) اپنے پیچھے (واپس) چلے جاؤ، پھر (وہاں) نور تلاش کرو''۔ یہاں ذرا نوٹ کیجیے کہ لفظ ''قَالُوۡا'' کے بجائے ''قِيۡلَ'' آیا ہے۔ یعنی ان سے کہا جائے گا۔ اب جبکہ اس بُرے حال میں وہ اِن مؤمنین سے درخواست کریں گے تو اِن اہل ایمان کی مروّت، شرافت اور نجابت سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ انہیں جھڑک دیں اور تڑخ کر کہیں کہ جاؤ واپس دنیا میں جا کر نور تلاش کرو۔ لہٰذا مجہول کا صیغہ آیا ہے کہ ان سے کہا جائے گا۔ (قِيۡلَ) کوئی کہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ جیسے بشارتیں دینے والے ہاتفِ غیبی ہوں گے، کوئی ملائکہ ہوں گے، اسی طرح ان کو غیب سے کہا جائے گا کہ لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور تلاش کرو نور۔ لمس کہتے ہیں چھونے کو، تو التماس کا مطلب ہے کسی شے کو تلاش کرنا، ٹٹولنا، حاصل کرنا۔ ان الفاظ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ یہ نور یہاں سے نہیں ملتا، یہ دنیا میں حاصل کیا گیا تھا، یہاں تو بس ظاہر ہوا ہے۔ اہل ایمان نے دنیا میں ہی یہ نور کمایا تھا اور انہوں نے قرآن سے اقتباسِ نور کیا تھا۔ قرآن تمہارے پاس بھی تھا لیکن تم جان بوجھ کر اس سے محروم رہے، اور یہ اعمالِ صالحہ کا نور بھی یہ دنیا سے کما کر لائے ہیں جو یہاں ظاہر ہو رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا میں واپس لوٹنے کا کوئی سوال نہیں، اب دُنیا کی طرف رُجوع کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا ﴿ارۡجِعُوۡا وَرَآءَ كُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا﴾ کا ترجمہ ہم کریں گے کہ اگر ممکن ہے تو لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف (دنیا میں) اور حاصل کرنے کی کوشش کرو نور کو!

نفاق کی حقیقت اور مراحل و مدارج

آگے بڑھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نفاق کی حقیقت اور اس کے مراحل و مدارج (stages) کو سمجھ لیا جائے۔ نوٹ کیجیے کہ لفظ 'نِفَاق' اور 'اِنفاق' کا مادہ ایک ہی ہے، یعنی ''ن، ف، ق''۔ نَفَقَ، یَنۡفُقُ سے اِفعال کے وزن پر لفظ 'اِنفاق' بنا ہے جس کے معنی ہیں ختم ہو جانا، خرچ ہو جانا۔ جیسے کہا جاتا ہے: نَفَقَ الۡفَرَسُ ''گھوڑا مر گیا'' یا ''گھوڑا کام آ گیا''۔ اور نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ ''پیسے ختم ہو گئے!'' یہاں اس انفاق کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے، بایں الفاظ: ﴿اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَكُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِيۡنَ فِيۡهِ﴾ اور اسی مادے سے بابِ مُفاعلہ میں ''منافقت'' بنا ہے۔ ''نَفَقٌ'' سے مراد ہے زیر زمین راستہ یا سرنگ جس کے دو مُنہ ہوتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں بادشاہ عام

طور پر ایسے فوجی قلعے بنواتے تھے کہ ان میں محل بھی ہوتے تھے اور شکست کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لیے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنائی جاتی تھیں جو دُور کسی جنگل میں جا کر نکلتی تھیں‘ تا کہ دشمن اگر صدر دروازے سے داخل ہو ہی جائے تو وہ اس سرنگ کے ذریعے سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے فرار ہو سکیں۔ لہٰذا بچاؤ کے لیے یہ سرنگیں بنائی جاتی تھیں۔ اسی طرح گوہ جو ایک صحرائی جانور ہے‘ اس میں اللہ نے اتنی عقل رکھی ہے کہ وہ اپنے لیے زیرِ زمین جو بھٹ یا بل بناتا ہے اس کے دو مُنہ رکھتا ہے‘ تا کہ اگر ایک راستے سے شکاری کتے داخل ہوں تو وہ دوسرے راستے سے نکل کر اپنی جان بچا سکے۔ اس لیے کہ صحرائی لوگ اس کا شکار کر کے اس کا گوشت کھاتے تھے۔ گوہ کے بل کو نَــافِقَــاء کہتے ہیں۔ اسی ''نفق'' سے لفظ ''منافقت'' بنا ہے۔ تو منافقت کی اصل حقیقت یہی ہے کہ اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔ ایک تو صادق الایمان ہوتے ہیں جن کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ کھپا دینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ جیسے اقبال نے کہا: ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

لیکن منافقین کا رویہ اس کے برعکس ہوتا ہے کہ بچ بچ کر چلو‘ جان اور مال کو بھی بچاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ بھی چلو۔ بظاہر ایمان لے آنا ان کی مجبوری بن جاتا ہے‘ کیونکہ اگر سارا قبیلہ ایمان لے آیا ہے تو ان کا بھی ایمان لے آنا معاشرتی دباؤ کی بنا پر لازمی ہو جاتا ہے‘ ورنہ تو انہیں اپنے قبیلے سے کٹنا پڑتا ہے۔ تو وہ مسلمانوں میں تو شامل ہو جاتے ہیں مگر اپنے آپ کو بچا بچا کر چلتے ہیں۔ تو یہ اپنے آپ کو بچانا دراصل نفاق کی بنیاد ہے۔

اب جب اللہ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جہاد کا حکم ہوتا ہے تو مؤمنین صادقین کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو جاتے ہیں‘ لیکن منافقین اس سے گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں اور جھوٹے بہانے بناتے ہیں۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے حیلے بہانے سے اپنے آپ کو اس کٹھن صورتِ حال سے بچا تو لیا ہو‘ لیکن بعد میں اپنی غلطی اور کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے حضور ﷺ کے سامنے معذرت پیش کی ہو‘ تو اس کو نفاق نہیں کہیں گے‘ بلکہ یہ صرف ضعفِ ایمان ہے۔ لیکن جب ان بہانوں میں جھوٹ کا عنصر بھی شامل ہو گیا‘ جھوٹے بہانے بنانے شروع کر دیئے تو یہ نفاق کی پہلی سٹیج ہے۔ پھر ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب انسان سوچتا ہے کہ

اس کا تو اعتبار ہی ختم ہو گیا ہے تو اب وہ جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور یہ نفاق کا دوسرا درجہ ہے۔ اور تیسرا درجہ وہ ہے جب مؤمنین صادقین سے کد ہو جاتی ہے ان سے بغض ہو جاتا ہے کہ یہ تو پاگل اور جنونی لوگ ہیں جو نہ دائیں دیکھتے ہیں نہ بائیں دیکھتے ہیں نہ انہیں آگے کی فکر ہے نہ پیچھے کی فکر ہے کوئی مصلحتیں دیکھتے ہی نہیں۔ اب ان کا قول یہ ہوتا ہے: ﴿اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ ''کیا ہم اس طرح ایمان لے آئیں جیسے یہ بے وقوف ایمان لائے ہیں؟'' یہ تو جنونی ہیں یہ fanatics ہیں۔ تو جب مؤمنین صادقین سے دشمنی ہو گئی تو یہ نفاق کی تیسری سٹیج ہے۔ یہ نفاق دراصل انسان کی باطنی کیفیت ہے جو مختلف مراحل سے گزر کر انتہائی سٹیج کو پہنچتی ہے۔ یہاں اس کو بہت عمدگی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

نفاق کے بارے میں ایک مغالطے کا ازالہ

ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ دورِ نبوی ﷺ میں شعوری نفاق بہت شاذ اور کم تھا۔ عام مغالطہ یہ ہے کہ منافق وہی ہوتا ہے جو جان بوجھ کر منافق بنا ہوا ہو جبکہ درحقیقت یہ بات نہیں تھی۔ منافقین کی اکثریت وہ تھی جو ایمان تو خلوص کے ساتھ لائے تھے لیکن ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے جو ہمت درکار ہوتی ہے ان میں اس کا فقدان تھا۔ گویا ع ''ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم'' والی کیفیت نہیں تھی۔ جس شخص میں ایمان کی پختگی اور گہرائی اتنی نہیں ہوتی کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لگانے کے لیے تیار ہو جائے تو وہ ایک طرح کی پسپائی اختیار کرتا ہے اور ارتدادِ معنوی کا شکار ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر پیچھے ہٹنا شروع کرتا ہے۔ درحقیقت اسے یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں منافق ہو گیا ہوں بلکہ وہ سوچتا ہے کہ ان (سچے اہل ایمان) کو کیا ہو گیا ہے خواہ مخواہ یہ لوگ جنگ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں آخر صلح سے بھی تو کام چل سکتا ہے اور دشمن کو گڑ دے کر بھی تو مارا جا سکتا ہے جبکہ یہ لوگ ہر وقت جنگ ہی کی فکر رکھتے ہیں۔ غزوۂ بدر کے موقع پر ان کا موقف تھا کہ جب اللہ نے فرما دیا ہے کہ دو میں سے ایک پر تمہیں ضرور فتح مل جائے گی تو قریش کے قافلے کی طرف کیوں نہیں چلتے جہاں بہت سا مال و دولت ہے اور ان پچاس آدمیوں کے ہتھیار بھی ہمیں مل جائیں گے۔ مصلحت کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے اُدھر جائیں! تو اصل میں وہ لوگ یہ نہیں سمجھ رہے ہوتے کہ ہم جھوٹے ہیں یا ہم دھوکہ دے رہے ہیں بلکہ یہ اصل میں مسلمانوں کے اندر ہی گڈمڈ ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ المنافقون ہی میں فرمایا گیا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ یہ ایمان لائے پھر کفر میں چلے گئے''۔ یعنی یہ ایمان تو لائے

تھے خلوص کے ساتھ‘ نہ کہ دھوکہ دینے کے لیے‘ لیکن پھر رفتہ رفتہ ارتدادِ معنوی کا شکار ہو گئے اور پسپا ہوتے ہوتے کفر تک چلے گئے۔ یعنی ان کا یہ ارتداد اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ انہیں ایک قانونی تحفظ تو حاصل رہتا ہے۔ جیسے دیمک کسی چوکھٹ یا شہتیر کو اندر سے تو چٹ کر چکی ہوتی ہے لیکن اوپر ایک تہہ چھوڑ دیتی ہے تاکہ دیکھنے والوں کو پتہ نہ چل جائے کہ اندر اس چوکھٹ یا شہتیر کے ساتھ کیا قیامت گزر رہی ہے۔ تو نفاق بھی دراصل یہی ہے جو باطن میں شروع ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام معنی میں گناہگار اور اس قسم کے غیر شعوری منافق میں بس تعبیر کا فرق ہے۔ گناہگار بھی تو یہی ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ یہ شے اللہ نے حرام کی ہے‘ پھر بھی اس کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے۔ تو اس وقت وہ بھی ایمان سے تہی ہوتا ہے! اس اعتبار سے جان لینا چاہیے کہ گناہگار اور ایسے منافق میں حقیقت کے اعتبار سے باریک سا پردہ ہے۔ یہ بات میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ اس آیت میں ایک خاص اور اہم نکتہ ہے جو اِس کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اب آگے چلیے! جب اہل ایمان آگے نکل جائیں گے تو یہ منافق مرد اور عورتیں ان سے کہیں گے: ﴿انۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِکُمۡ ۚ﴾ کہ ذرا ہمیں مہلت دو‘ ہمارا انتظار کرو‘ تاکہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کر لیں‘ کچھ اقتباس کر لیں۔ ہم بھی اس سے فائدہ اٹھا کر پل صراط پر سے گزر جائیں۔ ﴿قِیۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَکُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا ؕ﴾ ”کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو“۔ یعنی اگر تمہارے لیے ممکن ہے تو پیچھے دنیا کی طرف لوٹ جاؤ اور نور تلاش کر کے لے آؤ! اس لیے کہ یہ نور یہاں نہیں دیا گیا‘ بلکہ یہ دنیا کی زندگی میں کما کر ساتھ لایا گیا ہے۔ دنیا میں ایمان کا بھی کسب کرنا ہوتا ہے اور اعمالِ صالحہ تو ہیں ہی سراسر کسب۔ تو اگر تمہارے لیے بھی ممکن ہو تو لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور یہ نور تلاش کرنے کی کوشش کرو۔

اہل ایمان اور منافقین کی تقطیب

آگے فرمایا: ﴿فَضُرِبَ بَیۡنَہُمۡ بِسُوۡرٍ لَّہٗ بَابٌ ؕ﴾ ”پھر ان کے مابین ایک فصیل حائل کر دی جائے گی‘ جس کا ایک دروازہ ہو گا“۔ یہ فصیل تو درحقیقت ایک فصل قائم کرنے کے لیے ہو گی۔ اہل ایمان آگے نکل گئے ہوں گے اور اِدھر یہ منافق پیچھے سے پکارتے ہی رہ جائیں گے۔ ان کے درمیان فاصلہ تو پہلے سے ہو گیا ہو گا‘ اب ان کے درمیان فصیل بھی حائل کر دی جائے گی۔ اس طرح اہل ایمان اور منافقین کی تقطیب (polarization) عمل میں آ جائے گی۔ اس درو دیوار کی کیفیت بایں الفاظ

بیان کی جارہی ہے: ﴿بَـاطِـنُہٗ فِیْہِ الرَّحْمَۃُ وَظَاھِرُہٗ مِنْ قِبَلِہِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾﴾ ''اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور اس کے باہر عذاب ہوگا''۔یعنی اس دیوار کے اندر کی طرف رحمت خداوندی کا نزول شروع ہوجائے گا' اہل ایمان کی ابتدائی مہمان نوازی کا سلسلہ شروع ہوجائے گا' جبکہ اس فصیل کے باہر کی طرف عذاب کا آغاز ہوجائے گا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بَاطِنُہٗ اور ظَاھِرُہٗ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ بہت سے حضرات نے اس سے دروازہ مراد لیا ہے کہ اس دروازے کے اندر کی جانب اللہ کی رحمت کا نزول اور اس کے باہر کی جانب عذابِ خداوندی کا ظہور شروع ہوجائے گا۔لیکن مجھے اس نقطۂ نظر میں کافی تامل تھا۔اس مقام پر غور وفکر کے نتیجے میں میری جو رائے بنی ہے اس کی تائید مجھے امام رازی سے مل گئی ہے کہ اس ضمیر کی نسبت دروازے کی طرف نہیں ہے' بلکہ سُوْر (فصیل) کی طرف ہے۔(واللہ اعلم!) یعنی اس فصیل کے اندر کی طرف اللہ کی رحمت ہوگی اور اس فصیل کے باہر کی طرف اللہ کا عذاب ہوگا۔

اہل سنت کے ایک عقیدے کی قرآنی بنیاد

اس مقام پر ایک خیال سا آتا ہے کہ اس فصیل میں دروازے کی کیا ضرورت ہوگی؟ لیکن آج مجھے اس پر انشراح ہوا ہے کہ یہاں دروازے کا تذکرہ کیوں ہے۔ یہ درحقیقت ہمارے اہل سنت کے ایک مجمع علیہ عقیدے کے لیے بنیاد ہے' جس کے لیے قرآن مجید میں اس کے علاوہ کہیں اور ذکر نہیں ہے۔اہل سنت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ جس شخص کے دل میں ایمان کی کچھ رمق بھی ہوگی وہ اپنے گناہوں کی سزا پاکر بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔جہنم میں خُلود صرف ان کے لیے ہے جن کے دلوں میں سرے سے ایمان کی کوئی رمق نہیں ہوگی۔

جن غیر شعوری منافقین کا میں نے تذکرہ کیا ہے ان کے اور عام گناہگاروں کے مابین درحقیقت صرف ایک تعبیر کا فرق ہے' ورنہ جو تضاد اُن کی زندگیوں میں ہے وہی تضاد اِن کی زندگیوں میں بھی ہے۔اس بارے میں مَیں سائیں عبدالرزاق صاحب کا یہ قول سنایا کرتا ہوں: ''جو دم غافل سو دم کافر!'' اور ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ (المائدۃ) ''اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ نہ کیا جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی تو کافر ہیں''۔ ہماری عدالتوں میں ہر روز نہ معلوم کتنے فیصلے قرآن وسنت کے خلاف ہو رہے ہیں۔ پورے ملک اور پوری اُمت مسلمہ کی سطح پر جو فیصلے ہو رہے ہیں وہ سب کے سب اللہ کی شریعت کے خلاف ہو رہے

ہیں ۔قرآن کے فتوے کے مطابق تو ہم سب کے سب کافر ہیں ۔لہٰذا غیر شعوری منافق اور گناہگار میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو فصیل حائل کر دی جائے گی وہ ابدی نہیں ہے' بلکہ ان میں سے بھی جن کے اندر ایمان کی کچھ رمق ہو گی ان کو بہر حال وہاں سے نکلنا ہے ۔اس لیے یہاں پر صراحت کے ساتھ دروازے کا ذکر کیا گیا ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا کوئی اور محل نہیں ہے ۔جن لوگوں نے اس مقام پر زیادہ غور وفکر نہیں کیا وہ کہتے ہیں کہ اہل ایمان اُس دروازے کے ذریعے سے جنت میں داخل ہوں گے' حالانکہ اس مرحلے کی پوری تصویر جب سامنے آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فصل تو پہلے سے قائم ہو چکا ہو گا' کیونکہ جن کے پاس نور ہو گا وہ تو آگے نکل جائیں گے اور دوسرے انہیں پکارتے رہ جائیں گے کہ ذرا ٹھہرو' اور پھر ان کے مابین فصیل قائم کر دی جائے گی ۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ میں ''ف'' تاکید کے لیے ہے ۔لہٰذا یہ دروازہ اہل جنت کے جنت میں داخلے کے لیے نہیں ہے' بلکہ درحقیقت یہ دروازہ اب آئندہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں میں ایمان کی کچھ نہ کچھ رمق اور روشنی ہو گی' لیکن وہ مجموعی طرزِ عمل کے اعتبار سے اس سزا کے مستحق ہو چکے ہوں گے ۔لہٰذا وہ اپنے گناہوں کے بقدر سزا پا کر باہر نکل آئیں گے ۔ یہ اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے ۔

اب قرآن کریم میں کہیں اور اس کا تذکرہ کیوں نہیں ہے' اسے بھی سمجھ لینا چاہیے ۔ دراصل بعض چیزیں عقلی اعتبار سے اتنی بلند ہوتی ہیں کہ عام لوگوں کے سامنے ان کو بیان کرنا اُن کے لیے فتنے کا سبب بن سکتا ہے' لہٰذا اعلیٰ ترین فلسفیانہ مسائل کو قرآن حکیم نے بہت ہی خفیہ اور فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ سمجھنے والا سمجھ جائے گا' عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے' لیکن عام آدمی اس مقام پر سے یہ سمجھ کر گزر جائے گا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے ۔اگر یہ بات بڑے اہتمام کے ساتھ آئی ہوتی تو عام آدمی بھی رک جاتا اور غور کرنے پر مجبور ہو جاتا' جبکہ اس کے اندر اس کی استعداد اور صلاحیت نہیں ہوتی ۔قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' جس میں سب کے لیے راہنمائی موجود ہے اور اس میں سب کی ضروریات کا احاطہ کیا گیا ہے' جبکہ دین کے بعض حقائق ایسے ہیں کہ ان کو زیادہ عام کر دیا جائے تو لوگوں میں بے عملی پیدا ہو جائے گی ۔ ویسے تو یہ تصور کرنا بھی ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی جہنم کا داخلہ کس درجے شدائد اور مصائب کا ذریعہ بن جائے گا' لیکن اگر آدمی یہ سمجھ لے کہ ایمان کی کوئی رمق بھی ہوئی تو بالآخر جہنم سے نکل جائیں گے تو اس سے خواہ مخواہ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑتے ہیں اور اس کے اندر عمل کا جذبہ کمزور پڑتا ۔لہٰذا یہ مضمون قرآن مجید میں شرح وبسط کے ساتھ نہیں آیا ۔اسی طرح سورۃ الفرقان میں ایک مقام ایسا آیا ہے کہ

اس سے قرآن مجید میں عذابِ قبر کا ثبوت مل جاتا ہے' ورنہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ عذابِ قبر کا تذکرہ نہیں ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے: ﴿یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ ''دوگنا کیا جائے گا اس کے لیے عذاب قیامت کے دن''۔ معلوم ہوا کہ قیامت سے پہلے بھی عذاب کی کوئی شکل ہے' جب ہی تو وہ دوگنا کیا جائے گا۔

مسلمان معاشرے میں منافق کا قانونی ودستوری سٹیٹس؟

اب ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ اہل ایمان آگے نکل گئے' منافقین اِدھر رہ گئے اور درمیان میں فصیل حائل ہوگئی۔ ﴿یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ﴾ ''وہ انہیں پکار کر کہیں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟'' یہ اس امرِ واقعہ کی تعبیر ہے کہ دنیا میں منافق اور مؤمن' گناہگار اور متقی سب گڈمڈ ہیں' سب قانونی طور پر مسلمان ہیں' بلکہ مسلمان معاشرے میں منافق اور مؤمن کے اور متقی اور فاسق کے قانونی اور دستوری حقوق بالکل برابر ہیں۔ دنیا میں ان کے مابین معاشرتی' سیاسی اور دستوری حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے کہ قانونی تقسیم تو بہرحال ایک ہی ہے' سب مسلمان شمار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے کہ: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ یعنی ایمان تو زبانی اقرار کا نام ہے' جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ ان کی مراد حقیقی ایمان نہیں بلکہ قانونی ایمان ہے' جو انسان کو ایک قانونی و دستوری status دیتا ہے' اور وہ گھٹتا یا بڑھتا نہیں ہے' بلکہ جامد ہے۔ جبکہ حقیقی ایمان کا فیصلہ اللہ کے حضور جا کر ہوگا اور اس کا نور میدانِ حشر میں ظاہر ہوگا۔ کوئی متقی ہے تو اللہ کے ہاں اجر لے گا' فاسق ہے تو وہاں سزا بھگتے گا۔ یہاں تو مسلمان کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے

''اَلْمُسْلِمُ كُفُوٌّ لِكُلِّ مُسْلِمٍ'' یعنی تمام مسلمان آپس میں مرتبہ اور سٹیٹس کے اعتبار سے بالکل ہم پلہ ہیں' قانونی اور دستوری حیثیت سب کی برابر ہے۔

میدانِ حشر میں جب چھلنی لگے گی اور حقیقی مؤمن اور محض نام کے مسلمانوں کے مابین تفریق ہو جائے گی تو یہ لوگ حقیقی اہل ایمان کو پکار پکار کر کہیں گے کہ کیا دنیا میں ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ آج تمہارے اور ہمارے مابین اتنا فرق وتفاوت کیوں ہے؟ کیا ہم بھی مسجد نبویؐ میں تمہارے ساتھ نمازیں ادا نہیں کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان میں گڈمڈ تھے۔ یہ تو جب اُحد کا موقع آیا تو معلوم ہوا کہ کون کیا ہے' جب رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی تین سو آدمیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے واپس آ گیا۔ معلوم ہوا کہ جب تک آزمائش نہ ہو دنیا میں اصل اہل ایمان اور جھوٹ موٹ کے مسلمان کے

ما بین تمیز نہیں ہو سکتی۔ ورنہ تو دنیا میں وہ برابر تھے۔ یہاں تک کہ حضورﷺ نے عبداللہ بن اُبی کی نماز جنازہ ادا کی ہے اور اس کی تدفین کے لیے اپنا کرتہ عنایت کیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بن اُبی مؤمن صادق تھے‘ انہوں نے آ کر درخواست کی کہ حضور! میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے‘ آپ اپنا کرتہ عنایت فرما دیں تو میں اسے اس کا کفن دے دوں۔ حضورﷺ نے کرتہ عنایت فرما دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضورؐ! آپ اس منافق کے لیے کرتہ دے رہے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''عمر! میرا کرتہ اسے خدا کے عذاب سے بچا نہیں سکے گا''۔ رسول اللہﷺ کی مروّت اور شرافت سے بعید تھا کہ آپؐ ایک مؤمن صادق کی درخواست ردّ کر دیتے۔ گویا مرنے کے بعد بھی قبر میں اترنے تک اسے ''مسلم'' کا لیگل سٹیٹس حاصل رہا۔

راہِ ''نفاق'' کے سنگ ہائے میل اور فتنے کی تین نسبتیں

منافقین کی پکار کے جواب میں اہل ایمان کا جواب نقل ہوا: ﴿قَالُوْا بَلٰی﴾ ''(اہل ایمان) کہیں گے: کیوں نہیں!'' اب آگے جو الفاظ آ رہے ہیں وہ علم و معرفت اور تفقہ کا بہت بڑا خزانہ ہیں۔ فرمایا: ﴿وَلٰــكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا''۔ اب اہل ایمان جواب دے رہے ہیں کہ دنیا میں تو تم ہمارے ساتھ ہی تھے‘ اس میں کوئی شک نہیں‘ لیکن تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا۔

فتنے کی تین نسبتیں ہیں جنہیں اچھی طرح نوٹ کر لینا چاہیے۔ کہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تمہیں فتنے میں ڈالا۔ مثلاً: ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (العنکبوت:۳) ''اور ہم نے فتنے میں ڈالا ہے ان کو جو اِن سے پہلے تھے''۔ اللہ تعالیٰ اپنی طرف نسبت فرما رہا ہے کہ جو اِن سے پہلے تھے انہیں بھی ہم نے فتنے میں ڈالا تھا۔ یہ ہمارا قاعدہ رہا ہے کہ ہم آزما کر ظاہر کر دیں کہ کون کھرا ہے‘ کون کھوٹا ہے‘ کون حقیقتاً مؤمن ہے اور کون جھوٹ موٹ کا مدعیٔ ایمان ہے۔ تو اصل امتحان اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن مکہ میں اہل ایمان کا یہ امتحان کن کے ہاتھوں آ رہا تھا؟ ابوجہل اور دیگر کفار کے ہاتھوں! تو گویا دوسری نسبت ان کفار کی طرف ہو گئی جو مسلمانوں کو ستا رہے تھے اور انہیں فتنے میں ڈال رہے تھے۔ جیسا کہ سورۃ البروج میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝﴾ ''وہ لوگ جنہوں نے اہل ایمان مَردوں اور عورتوں کو فتنوں میں مبتلا کیا اور پھر اس سے توبہ نہیں کی یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب اور جلائے جانے

کی سزا ہے''۔ جو لوگ اہلِ ایمان کو آزمائشوں میں ڈالتے ہیں' انہیں ستاتے اور تکالیف میں مبتلا کرتے ہیں' اگر مرنے سے پہلے پہلے انہوں نے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے تب تو پچھلا کیا دھرا سارا معاف ہو جائے گا' ورنہ ان کے لیے عذابِ جہنم ہے۔

تیسری نسبت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اہل و عیال اور مال و متاعِ دُنیوی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی محبت کو اللہ کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں وہ اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ سورۃ التغابن میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۴) ''اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' ان سے ہوشیار رہو''۔ مزید فرمایا: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''یقیناً تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے لیے) فتنہ ہے''۔ یعنی اگر تم اپنے اہل و عیال سے اللہ کی محبت کے ماتحت رہتے ہوئے محبت کرو تو ٹھیک ہے' یہ بھی فطری محبتیں ہیں اور دُنیوی ضرورت ہے' لیکن جہاں ان میں سے کسی ایک کی محبت بھی اللہ کی محبت سے بالا ہو گئی تو گویا تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں مبتلا کر دیا۔ یہ انسان کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔ تو حقیقی اہلِ ایمان منافقین کو جواب دیں گے: ﴿وَلٰکِنَّکُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَکُمْ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا''۔ ﴿وَتَرَبَّصْتُمْ﴾ ''اور پھر تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے''۔

تَرَبُّص کے معنی ''انتظار'' کے بھی ہیں کہ آدمی کسی جگہ پر ٹھٹک کر کھڑا ہو جائے۔ کوئی تو ایسا ہوتا ہے کہ جس کی ہر چہ بادا باد والی کیفیت ہوتی ہے' جبکہ کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ چلوں نہ چلوں؟ آگے بڑھوں نہ بڑھوں؟ یہ اصل میں تَرَبُّص ہے۔ یہ لوگ ''تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو!'' کے مصداق حالات کا انتظار کرتے ہیں کہ حالات میں کیا تبدیلی آتی ہے۔ تمام صورتوں کو دیکھ بھال کر' دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھتے ہوئے' اچھی طرح سوچ سمجھ کر' سنبھل کر اور بچ بچ کر چلتے ہیں۔ جیسے کہا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ ۚ﴾ (الحج: ۱۱) ''لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی بندگی کرتا ہے کنارے کنارے''۔ یہ لوگ منجدھار میں نہیں کودنا چاہتے۔ ﴿فَاِنْ اَصَابَہٗ خَیْرُ ۨاطْمَاَنَّ بِہٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْہُ فِتْنَۃُ ۨانْقَلَبَ عَلٰی وَجْھِہٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ؕ﴾ ''پھر اگر اسے کوئی خیر پہنچے تو اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش (تکلیف) پہنچے تو اپنے چہرے

کے بل واپس پلٹتا ہے۔ اس نے دنیا اور آخرت (دونوں) کا خسارہ اٹھایا''۔ یعنی یہ لوگ بیچ بیچ کر اور کنارے کنارے چلنا چاہتے ہیں' منجدھار میں نہیں جانا چاہتے۔ اگر بس خیر رہے تو مطمئن ہیں اور اگر کہیں کوئی امتحان آ گیا' آزمائش آ گئی تو اوندھے مُنہ گر پڑتے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ دنیا اور آخرت دونوں کے خسارے کا سودا ہے۔ تو یہاں فرمایا گیا کہ جب تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا اور مال واولاد' اہل وعیال' علائق دُنیوی' جائیداد' پروفیشنز' ان تمام چیزوں کی محبت تم پر غالب آ گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم تَـرَبُّص اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے کہ آگے بڑھیں یا نہ بڑھیں! کہیں ایسا نہ ہو جائے' کہیں ویسا نہ ہو جائے! یہ حقیقت ہے کہ انسان کے اندر نیکی کا جذبہ بھی موجود ہے' لیکن وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ بقول غالب : ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

منافقین کی اس کیفیت کے لیے سورۃ النساء میں الفاظ آئے ہیں: ﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ کہ یہ مذبذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور سورۃ التوبۃ میں فرمایا: ﴿فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴾ ''وہ اپنے شکوک وشبہات میں متردّد ہو کر رہ گئے''۔ یہاں آگے فرمایا: ﴿وَارْتَبْتُمْ﴾ ''اور تم شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گئے''۔ یعنی اپنے آپ کو فتنے میں ڈالنے کا تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ ایمان کی جو پونجی تمہیں نصیب ہوئی تھی اس میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھنے شروع ہو گئے کہ ہم اپنا سب کچھ یہاں کھپا دیں اور معلوم نہیں کہ اس کا کچھ بدلہ بھی ملے گا یا نہیں! پتہ نہیں آخرت ہو گی بھی یا نہیں۔ یقین تو نہیں ہے' کسی نے دیکھا تو نہیں۔ اس لیے کہ یہ سارا ادھار کا سودا ہے۔ جیسے سورۃ التوبۃ میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ''اہل ایمان سے اللہ نے ان کے مال اور جانیں خرید لیے ہیں جنت کے عوض''۔ جنت تو ملے گی آخرت میں' یہاں تو نہیں ملے گی۔ یہ تو ادھار کا سودا ہے اور ادھار کے سودے پر آدمی کچھ نہ کچھ تو متردّد ہوتا ہے۔ اگر نقد سودا ہو تو ٹھیک ہے کہ ہاتھ سے ایک چیز دی اور دوسری لے لی' مبادلہ فوراً ہو گیا' لیکن یہ تو ادھار کا سودا ہے۔ تو اس تَـرَبُّص کے نتیجے میں ایمان کی پونجی برف کی طرح پگھلنا شروع ہو گئی۔

اپنے آپ کو فتنے میں ڈالنے کے سبب جو تَـرَبُّص پیدا ہوتا ہے اس حوالے سے سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ بڑی اہم ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ

اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اپنے باپ' اپنے بیٹے' اپنے بھائی' اپنی بیویاں' اپنے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے (اور جمع کیے) ہیں' اور وہ کاروبار جن کے کساد (اور مندے) کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے (جو بڑی مشقت سے تم نے جمائے ہیں) اور وہ رہائش گاہیں (جائیدادیں' بلڈنگیں' حویلیاں اور کوٹھیاں) جو تمہیں بڑی پسند ہیں' (یہ آٹھ چیزیں) اگر محبوب تر ہیں (تین چیزوں سے) اللہ سے' اللہ کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے' تو جاؤ انتظار کرو' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ (عذاب) لے آئے' اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

یہ گویا ایک ترازو ہے جسے ہر شخص اپنے باطن میں نصب کر لے۔ ایک پلڑے میں آٹھ چیزیں ڈالیں جن میں سے پانچ علائق دُنیوی ہیں' یعنی باپ' بیٹا' بھائی' بیوی اور رشتہ دار ـــــ باقی ہر انسان تو اس کے بعد ہی آتا ہے ـــــ اور تین چیزیں دُنیوی مال و اسباب میں سے ہیں' نقد مال و دولت' کاروبار اور اثاثہ جات یعنی بلڈنگ یا جائیداد وغیرہ۔ اور ترازو کے دوسرے پلڑے میں تین کی محبت ڈالیں' یعنی اللہ کی محبت' رسولؐ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت۔ پھر دیکھیں کہ کون سا پلڑا بھاری ہے! اگر یہ آٹھ والا پلڑا بھاری ہے تو اس صورت میں ''فَتَرَبَّصُوْا'' جاؤ' انتظار کرو! یہ وہی لفظ تَرَبُّص ہے جو زیر درس آیت میں ہے۔ اب تَرَبُّص اور گومگو کی کیفیت تو لازماً ہوگی کہ چلوں نہ چلوں۔ اس آیت میں مذکور علائقِ دُنیوی کو اقبال نے ایک شعر میں جمع کیا ہے ؎

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں ' لا الٰہ الا اللہ!

جان لیجیے کہ یہ تَرَبُّص اور اِرتیاب ایک دن میں نہیں ہو جاتا' بلکہ یہ رفتہ رفتہ اور تدریجاً پسپائی کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ آدمی ایمان سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ جیسے سورۃ المنافقون میں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ وہ پہلے ایمان لے آئے' پھر کفر میں چلے گئے''۔ یا یہ کہ ایمان اتنا کمزور رہ جاتا ہے کہ وہ عمل پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس صورت میں پھر عمل میں تناقض اور تضاد ہوتا ہے۔ آدمی کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ جیسے سورۃ الصّف کی آیت ۲ میں فرمایا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾﴾

''اے اہل ایمان! وہ کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں ہو''۔ یعنی قول و فعل میں تضاد۔

یہاں مختلف کیفیات کے مابین حرفِ عطف آیا ہے۔ عطف میں مغائرت تو ہوتی ہے لیکن لازمی نہیں ہوتا کہ اس میں زمانی ترتیب بھی ہو۔ البتہ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ترتیبِ زمانی بھی ہے' اور وہ اس طرح کہ ایک چیز کے نتیجے میں دوسری چیز واقع ہو رہی ہے' دوسری چیز کے نتیجے میں تیسری چیز اور پھر تیسری چیز کے نتیجے میں چوتھی چیز واقع ہو رہی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کی درحقیقت یہی عظمت ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۰ میں بھی یہی انداز ہے اور وہ بھی اس سورۂ مبارکہ کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ یہاں فرمایا گیا: ﴿وَلٰـكِنَّـكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں مبتلا کیا''۔ یعنی تم نے علائق دُنیوی اور مال و اسباب دُنیوی سے تعلق جائز حد تک نہیں رکھا' بلکہ اس کو حد سے بڑھنے دیا۔ ﴿وَتَـرَبَّـصْتُمْ﴾ ''اور (اس کے نتیجے میں) تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے''۔ تم تردّد اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ ﴿وَارْتَبْتُمْ﴾ ''اور (اس تذبذب کے نتیجے میں) تمہارے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے''۔

جیسے یہ ایک حقیقت ہے کہ عمل صالح سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور ایمان سے عمل صالح میں اضافہ ہوتا ہے بالکل ایسے ہی برائی کا معاملہ ہے کہ ایک برائی کے نتیجے میں ایک اور برائی جنم لیتی ہے اور پھر اس کے نتیجے کے طور پر برائی اور خرابی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ تو یہاں بھی درجہ بدرجہ پسپائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایمان کی جتنی تھوڑی بہت پونجی حاصل تھی اس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھنے شروع ہو گئے۔ درحقیقت ایمان لانے کے بعد پھر ثابت قدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں ایک مؤمن صادق کی تعریف یوں کی گئی ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ ''حقیقی (اور سچے) مؤمن تو صرف وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے' پھر شک میں نہیں پڑے''۔ ﴿وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے''۔ ﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾ ''یہی لوگ ہیں سچے (اپنے دعوائے ایمان میں)''۔

خوشنما عقائد و خواہشات' شیطان کی پُر فریب چالیں

آگے فرمایا: ﴿وَغَـرَّتْـكُمُ الْاَمَانِيُّ﴾ ''اور تمہیں آرزوؤں نے دھوکے میں ڈالے رکھا''۔ یہ چوتھا مرحلہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کچھ من گھڑت اور خوشنما عقائد سے بہلاتا ہے۔ اَمَانِیُّ لفظ

اُمْـنِیَّـــۃٌ کی جمع ہے اور اسی مادے سے لفظ ''تمنا'' بنا ہے' یعنی خواہشات' آرزوئیں۔ انگریزی میں انہیں ''wishful thinkings'' کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں یہود کے عقائد میں موجود ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے: ﴿سَیُغْفَرُ لَنَا﴾ ''عنقریب ہمیں معاف کر دیا جائے گا''۔ اللہ ہمیں بخش دے گا' وہ بخشنہار ہے' ہمیں تو بخش ہی دیا جائے گا۔ ہم میں سے بھی ایک گروہ ہے جو کہتا ہے آخر کچھ بھی ہیں کلمہ گو ہیں' کچھ بھی ہیں محمد ﷺ کے نام لیوا تو ہیں۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے: ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ ''ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن'' اور ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ﴾ ''ہم تو (گویا) اللہ کے بیٹے اور اس کے بڑے چہیتے ہیں''۔ آخر ہم ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں' تو کیا اللہ تعالیٰ ابراہیمؑ کا بھی کچھ لحاظ نہیں کرے گا جس کو کہ اُس نے اپنا دوست کہا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰـہُ اِبْرٰھِیْمَ خَـلِیْلًا ﴿﴾﴾ ''اور اللہ نے ابراہیم کو دوست بنا لیا''۔ تو کیا اللہ اپنے دوست کی اولاد کی کوئی فکر نہیں کرے گا؟ ہمارے ساتھ عام لوگوں والا معاملہ نہیں ہوگا' بلکہ خاص معاملہ ہوگا۔ تو یہ سب ان کی اَمَـانِـی ہیں۔ قرآن جہاں کہیں ان کے عقائد نقل کرتا ہے تو ساتھ ہی فرماتا ہے: ﴿تِـلْکَ اَمَـــانِیُّھُـمْ﴾ کہ یہ ان کی wishful thinking ہیں' یہ ان کے من گھڑت خیالات ہیں۔ ﴿قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿﴾﴾ ''(اے نبی! ان سے) کہئے کہ لاؤ دلیل اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو''۔ کہیں تورات میں اللہ نے یہ گارنٹی تمہیں دی ہے؟ تو یہ انسان کی اَمانی اور من گھڑت عقائد اسے طفل تسلیاں دیتے ہیں۔

آخری بات یہ فرمائی: ﴿حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ﴾ ''یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا''۔ یہ وہی الفاظ آ گئے ہیں جو سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ میں ہیں: ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ﴾ ''جاؤ' انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے''۔ یعنی یہ جو حق و باطل کی کشمکش ہو رہی ہے اس کے ضمن میں اللہ کا فیصلہ آ جائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا فیصلہ موت بھی ہے' اللہ کا فیصلہ قیامت بھی ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَغَرَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دیتا رہا''۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ یہ لفظ 'غَـــرور' 'غ' کے زبر (َ) کے ساتھ ہے اور یہ فَعُول کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے' جس کا مطلب ہے بہت بڑا دھوکے باز۔ اس کے علاوہ ایک لفظ 'غُرور' ہے جو 'غ' کے پیش (ُ) کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم اردو میں بھی غُرور کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ اسے بڑا غُرور ہے۔ اور مغرور اس سے اسم الفاعل ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ ''تمہیں خوب دھوکہ دیا اس بہت بڑے دھوکے باز نے''۔ اس سے شیطان لعین مراد ہے۔ یہ شیطان لعین بھی انسان کو مزید لوریاں دے دے

کر سلاتا ہے۔ اور اس کی لوری یہ ہے کہ اللہ بڑا غفور ہے‘ وہ کہاں سزا دے گا! وہ تو لوگوں کو ایسے ہی ڈرانے کے لیے کہتا ہے تاکہ وہ سیدھے ہو جائیں۔ ورنہ کیا ماں اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں جہنم میں ڈال سکتی ہے؟ تو جو خالق و مالک ہے وہ یہ کیسے کر سکتا ہے! یہ تو صرف کہنے کی باتیں ہیں‘ ہونے والی باتیں نہیں ہیں! یہ عقائد ہمارے ہاں بھی ملنگ قسم کے صوفیوں میں موجود ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کا صرف ڈراوا ہی ہے‘ وگرنہ ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ تو بڑا کریم ہے‘ بڑا نکتہ نواز اور بندہ نواز ہے‘ وہ بڑا ہی غفور اور رحیم ہے‘ لہٰذا اس کے بارے میں یہ گمان نہ کرو کہ وہ تمہیں عذاب دے گا۔ سورۃ الانفطار پوری کی پوری ان کے اسی عقیدے کی تردید میں ہے۔ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝﴾ ”اے انسان! کس شے نے تجھے دھوکہ دیا ہے اپنے ربّ کریم کے بارے میں؟“ وہ کریم بھی ہے‘ اس میں کوئی شک نہیں‘ لیکن وہ عَزِيزٌ ذوانتقام (انتقام لینے میں سخت) بھی ہے۔ وہ قہار بھی ہے‘ وہ شَدِيدُ الْعِقَاب (سخت سزا دینے والا) بھی ہے۔ اس کی تو تمام شانیں ہیں اور ان تمام شانوں کو اپنے سامنے مستحضر رکھنا ضروری ہے۔

بندۂ مؤمن کا معاملہ اللہ کے ساتھ ”بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ“ والا رہنا چاہیے کہ اس کی شانِ غفاری سے امید بھی ہو کہ اللہ بخش دے گا‘ لیکن اس کی سزا کا اندیشہ اور خطرہ بھی رہے۔ اس طرح رویہ متوازن رہے گا۔ اگر ذرا سا بھی رویہ غیر متوازن ہو گیا اور اللہ کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری پر تکیہ زیادہ ہو گیا تو نتیجتاً تم ڈھیلے ہو جاؤ گے‘ تمہارے اعصاب ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ اس لیے کہ پھر آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ کاہے کو زیادہ کھکھیڑ مول لے‘ کاہے کو زیادہ قربانیاں دے‘ کاہے کو زیادہ مشقتیں جھیلے‘ کاہے کو پیٹ پر پتھر باندھے‘ کاہے کو اپنی معاش کے دروازے تنگ کرتا چلا جائے‘ کاہے کو اپنے لیے دُنیوی ترقی کے راستے مسدود کرے؟ ظاہر بات ہے یہ سب کچھ تو وہی کرے گا جو سمجھے گا کہ مسئولیت لازماً ہونی ہے‘ ورنہ اللہ کی طرف سے پکڑ اور عذاب کا شدید خطرہ ہے۔

یہ مضمون اتنا اہم ہے کہ سورۂ لقمان اور سورۂ فاطر میں اس پر پوری پوری آیتیں آئی ہیں۔ سورۂ لقمان میں فرمایا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝﴾

”اے لوگو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف

سے کوئی بدلہ (فدیہ' کفارہ وغیرہ) نہیں دے سکے گا' اور نہ ہی کوئی بیٹا اپنے باپ کے کسی درجے میں کام آ سکے گا۔ (یادرکھو!) یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے۔تو (دیکھنا) تمہیں دنیا کی زندگی دھوکہ نہ دینے پائے' اور (دیکھنا) تمہیں اللہ (کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری) پر دھوکہ نہ دے یہ بڑا دھوکے باز (شیطانِ لعین)''۔

اس کا خلاصہ سورۂ فاطر میں یوں ذکر ہوا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ٚ وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۵﴾

''اے لوگو! اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے (شدنی ہے' جزا وسزا ہو کر رہے گی)۔تو (دیکھنا) تمہیں یہ دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور (دیکھنا) وہ بہت بڑا دغا باز (شیطان لعین) تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ نہ دینے پائے''۔

ایک اور جگہ قیامت کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ﴾ کہ قیامت لازماً آ کر رہے گی اور حساب وکتاب ہو کر رہے گا۔اور: ﴿وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ﴾ کہ جزا وسزا واقع ہو کر رہیں گے' اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

بہرحال یہ نفاق کے وہ پانچ مدارج ہیں جن میں ایک صاحب ایمان مبتلا ہو سکتا ہے۔یعنی یہ اُس آدمی کا نفاق نہیں ہے جو دھوکہ دینے کے لیے ہی ایمان لایا ہو' بلکہ یہ ایسا نفاق ہے کہ آدمی ایمان تو لاتا ہے خلوصِ دل سے' لیکن پھر اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا' بلکہ بچ بچ کر چلنا چاہتا ہے' جبکہ ایمان تو قربانیاں مانگتا ہے۔ ع ''جس کو ہو جان ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!'' بچ بچ کر چلنے والوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ع ''مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!'' چنانچہ وہ ایک طرح کی باطنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بقول غالبؔ ع ''کعبہ مرے پیچھے ہے' کلیسا مرے آگے!''

منافق کا حسرت ناک انجام

اب اس نفاق کا انجام کیا ہے! فرمایا: ﴿فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ﴾ ''تو آج کے دن نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ کافروں سے''۔یہ بہت پیارا انداز ہے۔یہاں منافقوں کو کافروں کے ساتھ بریکٹ کر دیا گیا ہے۔اصل میں یہ جواب ہے ان کے اس قول کا کہ: ﴿اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ﴾ ''کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟'' تو فرمایا جا رہا ہے کہ دنیا میں تم یقیناً اہل ایمان کے ساتھ تھے' چونکہ تم قانونی طور پر مسلمان تھے لہٰذا ان کے ساتھ شامل رہے' یہاں تک

کہ حضور ﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ لیکن یہاں تم انجام کے اعتبار سے کفار کے ساتھ شامل ہو۔ دراصل یہی نفاق ہے کہ قانوناً تو ایسا شخص دنیا کی زندگی میں مسلمان سمجھا جاتا ہے، جبکہ حقیقتاً ' عاقبت اور انجامِ کار کے اعتبار سے وہ کفار کے ساتھ ہے۔ آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿مَاْوٰىكُمُ النَّارُ﴾ ''تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے''۔ نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں طنز کا پہلو بھی ہے۔ آوٰی، یُـؤْوِیْ، اِیْـوَاءً کا مطلب ہے ''کسی کو پناہ دینا''۔ اس سے لفظ ''مَاْوٰی'' بنا ہے جس سے مراد ہے پناہ گاہ، جس کی طرف انسان کسی خطرے سے بچنے کے لیے دوڑتا اور لپکتا ہے۔ طوفان سے بچنے کے لیے اگر کسی نے پہاڑ کے اندر کوئی جگہ تلاش کر لی تو وہ اس کے لیے ''ماوٰی'' ہے۔ تو فرمایا: ﴿مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ط﴾ کہ اب تمہاری پناہ گاہ یہی آگ ہے۔ ﴿هِیَ مَوْلٰىكُمْ ط﴾ ''یہی تمہاری خبر گیری کرنے والی ہے''۔ یہاں 'مولیٰ' کا لفظ بھی طنزاً استعمال ہوا ہے۔ مولیٰ کا مطلب ہے ہمدرد، غم گسار، مددگار، دوست، پشت پناہ، ساتھی وغیرہ۔ لہٰذا فرمایا: ﴿هِیَ مَوْلٰىكُمْ ط﴾ کہ یہی آگ تمہاری ہمدرد اور غمگسار ہے، دکھ درد کہنا ہے تو اس سے کہو، نالہ وشیون ہے تو اسی سے کرو۔ مزید فرمایا: ﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور یہ بہت ہی بری ہے لوٹنے کی جگہ''۔ ''مَصِیْر'' کا مطلب ہے جانے کی جگہ، وہ جگہ جہاں انسان انجامِ کار پہنچا دیا جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

❁❁❁
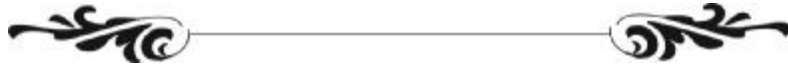
درس 28

مسلمانوں کو آمادۂ عمل
کرنے کے لیے
ترغیب وترہیب اور
سلوکِ قرآنی
منزل بہ منزل

سُوْرَةُ الْحَدِيْد کی آیت ۱۶ تا ۱۹ کی روشنی میں!

درس ۲۸

مسلمانوں کو آمادۂ عمل کرنے کے لیے ترغیب وترہیب
اور
سلوکِ قرآنی......منزل بمنزل
سورۃ الحدید کی آیات ۱۶ تا ۱۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَ لَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡہِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۱۶﴾ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ الۡمُصَّدِّقِیۡنَ وَ الۡمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقۡرَضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَہُمۡ وَ لَہُمۡ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ ٭ۖ وَ الشُّہَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ وَ نُوۡرُہُمۡ ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۹﴾﴾

سورۃ الحدید کا چوتھا حصہ چار آیات (۱۶ تا ۱۹) پر مشتمل ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے قبل ان کا ایک رواں ترجمہ کر لیجیے:

''کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے اہل ایمان کے لیے کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے اور (وہ تسلیم کر لیں اس سب کو) جو حق میں سے نازل ہوا ہے؟ اور نہ ہو جائیں ان لوگوں کے مانند جنہیں کتاب دی گئی تھی پہلے' تو ان پر ایک طویل مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے' اور ان میں بہت سے فاسق و فاجر ہیں۔ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد از سرِ نو زندگی عطا فرما دیتا ہے۔ ہم نے تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح کر دیا ہے تا کہ تم عقل

سے کام لو۔ یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں' اور جو قرض دیں اللہ کو قرض حسنہ' ان کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہی ہیں صدّیق اور شہید اپنے ربّ کے پاس۔ ان کے لیے محفوظ ہے ان کا اجر بھی اور ان کا نور بھی۔ اور جنہوں نے کفر کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی تو وہی ہیں جہنم والے''۔

تأخیر و تعویق = شیطان کا ایک اور وار!

سورۃ الحدید کا یہ حصہ بھی میرے نزدیک اپنے مضمون کے اعتبار سے قرآن مجید کا نقطۂ عروج ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ جو حقائق درجہ بدرجہ منکشف ہوئے ہیں' اس کے بعد اگر کسی کو اپنے گریبان میں جھانکنا نصیب ہو اور اپنی ایمانی کیفیت اور حقیقت کو دیکھنے اور ٹٹولنے کی توفیق میسر آ جائے (اللہ کرے کہ ایسا ہو!) اور وہ اپنی اصلاح کا ارادہ کر لے تو اس پر بھی شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔ اُس وقت شیطان کا حملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو تأخیر اور تعویق میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسان خیال کرتا ہے کہ ٹھیک ہے مَیں اپنا رویہ صحیح کر لوں گا' لیکن پہلے ذرا یہ کام کر لوں' ذرا یہ ذمہ داریاں ادا ہو جائیں' ابھی ذرا ملازمت سے ریٹائر ہو لوں پھر اپنی اصلاح اور دین کا کام کروں گا۔ یا پھر یہ کہ ذرا بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں' ذرا بچوں کے مستقبل کا معاملہ ہے۔ اسی طرح بچوں کے بعد پھر بچوں کے بچے سامنے آئیں گے اور ان کے مسائل شروع ہو جائیں گے۔ ع ''کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد!'' تو جان لیجیے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد تو انسان کے ہاتھ میں کچھ رہ ہی نہیں جاتا کہ وہ کچھ کر سکے۔ سرکار کھو کھلا کر کے ہی تو چھوڑتی ہے۔ اس وقت تک تمام توانائیاں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔

اس تأخیر و تعویق کی حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بہترین تاویل کی ہے۔ یہ ان تین صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک ہیں جو غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ غزوۂ تبوک میں نفیر عام تھی کہ ہر صاحب ایمان اللہ کی راہ میں نکلے' تو منافقین نے تو آ کر جھوٹے بہانے بنا کر معذرت کر لی اور اجازت لے لی' کچھ بغیر اجازت لیے بھی بیٹھے رہے' لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس آئے تب وہ قسمیں کھا کھا کر کہنے لگے کہ حضور! میں تو لشکر کے ساتھ جانے کے لیے بالکل تیار تھا' مَیں نے تو سواری بھی تیار کی ہوئی تھی' لیکن عین وقت پر یہ مصیبت آ گئی کہ میں رک گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادتِ ثانیہ تھی کہ ایسے جھوٹوں سے زیادہ اعتناء نہیں فرماتے تھے' بس کہہ دیتے کہ جایئے! لیکن یہ تین صحابہ جن میں سے ایک حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں' اگرچہ مؤمنین صادقین میں سے تھے مگر اس لشکر کے ساتھ نہیں

جا سکے تھے۔ واپسی پر جب حضورﷺ کی طرف سے باز پُرس ہوئی تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ حضرت کعب بن مالک ؓ نے اس موقع پر عرض کیا: حضور! زبان میرے پاس بھی ہے' طلاقت لسانی مجھے بھی حاصل ہے' میں بھی جھوٹے بہانے بنا کر اس وقت آپؐ کی پکڑ سے اپنے آپ کو بچا سکتا تھا' لیکن مَیں صاف اعتراف کرتا ہوں کہ جتنا صحت مند مَیں اِس زمانے میں تھا پہلے اتنا کبھی نہیں رہا' اور جتنا غنی مَیں اس زمانے میں تھا اتنا پہلے کبھی نہیں رہا۔ یعنی نہ تو میرے پاس وسائل کی کمی تھی اور نہ میں بیمار تھا۔ بس ہوا صرف یہ کہ میں تأخیر وتعویق میں پڑ گیا۔ میرے نفس نے مجھے یہ دھوکہ دیا کہ رسول اللہﷺ تو تیس ہزار کا لشکر لے کر چلیں گے' جبکہ تمہاری اونٹنی بڑی صحت منداور تیز رفتار ہے' چنانچہ حضورﷺ کو لشکر لے کر روانہ ہو جانے دو' اس کی حرکت قدرے آہستہ ہوگی' تم ذرا دو چار دن کے بعد تیزی کے ساتھ منزل پر منزل طے کرتے ہوئے حضورﷺ کے ساتھ مل جانا۔ تو میں اس دھوکے میں آ گیا اور سوچتا رہا کہ شدید گرمیوں کا موسم ہے اور صحرا کا سفر ہے' ذرا گھر میں تھوڑا عرصہ مزید آرام کرلوں اور ٹھنڈی چھاؤں سے لطف اندوز ہولوں۔ (گویا ع ''تپتی راہیں مجھ کو پکاریں' دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!'') تو میں اسی طرح ایک ایک دن کر کے ٹالتا رہا۔ ایک دن اچانک مجھے احساس ہوا کہ اب تو چاہے میں کتنی ہی تیز رفتاری سے جاؤں آپؐ کے ساتھ نہیں مل سکتا' بس میرے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ حضورﷺ نے سزا کے طور پر ان کا سماجی مقاطعہ کر دیا کہ کوئی مسلمان ان سے بات تک نہ کرے۔ یہ ان کے لیے بڑی سخت سزا تھی۔ یہ بخاری شریف کی بڑی پیاری حدیث ہے اور طویل ترین احادیث میں سے ایک ہے۔ ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

تو یہ تأخیر وتعویق اصل میں شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جیسے اقبال نے کہا: ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ ''اِنَّ الْمُلُوْكَ''

سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر

پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری!

تو یہاں پر اب اس تعویق وتأخیر سے ٹوکا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ''کیا اہل ایمان کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کے ذکر میں اور اُس (قرآن) کے آگے جو نازل شدہ حق ہے''۔ یہ ایک طرح سے

جھنجھوڑنے کا انداز ہے کہ کس امید پر تم یہ تأ خیر وتعویق کر رہے ہو؟ تمہیں کل کی زندگی کا بھی یقین ہے کہ تمہیں کل کا سورج دیکھنا نصیب ہو گا؟ جبکہ تمہارے منصوبے تو طول طویل ہیں اور تم سالوں کا حساب بنا رہے ہو کہ اس کام سے فارغ ہو جاؤں' یہ ذمہ داریاں ادا کرلوں' یہ معاملہ طے ہو جائے تو پھر میں دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دوں گا۔ لیکن قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ: ﴿اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِكۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ﴾ ''کیا وقت آ نہیں گیا ہے اہل ایمان کے لیے کہ جھک جائیں ان کے دل اللہ کے ذکر سے اور اُس کے سامنے جو نازل ہوا حق میں سے''۔ خَشَعَ ' یَـخۡشَـعُ کا مطلب ہے جھک جانا۔ ایک آیۂ کریمہ میں میدانِ حشر کا ایک نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ﴾ ''(قیامت کے دن میدانِ حشر میں) ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ذلت اُن پر چڑھی آ رہی ہو گی''۔ یعنی تباہی و بربادی کو اپنے سامنے دیکھ کر شرمندگی سے کافروں کی نگاہیں نیچے زمین میں گڑی ہوں گی اور انہیں نہایت شرمناک سلوک کا سامنا ہو گا۔ تو اہل ایمان کو جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ اب بھی تم تأ خیر وتعویق میں پڑے ہوئے ہو؟ کیا وہ وقت آ نہیں گیا ہے کہ تم جھک جاؤ اللہ کی یاد کے آگے اور اس حق کے سامنے جو اللہ کی طرف سے نازل ہو چکا ہے۔ اس حق نے جہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دیا ہے' حق و باطل کو ممیّز کر دیا ہے' تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں آنا نصیب فرما دیا ہے' اسی حق نے تمہیں کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی ہیں' اسی کلامِ الٰہی نے تمہارے فرائض بھی معین کیے ہیں' اس نے تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ دین تم سے کیا چاہتا ہے' دین کا تقاضا کیا ہے۔ تمہارے فرائض کیا ہیں۔ تو کب تک تم اس تأ خیر اور تعویق میں پڑے رہو گے؟

اہل کتاب کا عبرت آموز تذکرہ

آ گے فرمایا: ﴿وَلَا یَكُوۡنُوۡا كَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ﴾ ''اور نہ ہو جائیں وہ ان لوگوں کے مانند جن کو کتاب دی گئی تھی پہلے''۔ اِن سورتوں (الـمُسبّحات) میں اہل کتاب کا تذکرہ بطورِ نشانِ عبرت ہے کہ مسلمانو! تم سے پہلے بھی ایک اُمت مسلمہ (بنی اسرائیل) تھی' جسے اب معزول کر دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قرآن میں جیسے الفاظ سابقہ اُمت مسلمہ کے لیے آئے ہیں ہمارے لیے نہیں آئے۔ اُن سے فرمایا گیا تھا: ﴿وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ''اور یہ کہ میں نے تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا کی''۔ ذرا ان الفاظ کی گھمبیرتا کا تصور کیجیے! ٹھیک ہے' ہمیں بھی دو مرتبہ خیر اُمت اور اُمت وسط کہا گیا ہے' لیکن ان کے لیے فضیلت اور برتری کے جو

الفاظ آئے ہیں وہ ہمارے لیے نہیں آئے۔ ان میں تو چودہ سو برس تک نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں۔ ان میں سلسلۂ نبوت و رسالت شروع بھی ہوا تو دو نبیوں حضرات موسٰی اور ہارون علیہما السلام سے اور پھر چودہ سو برس کے بعد اس سلسلۂ انبیاء کا خاتمہ ہوا تو بھی دو نبیوں حضرات عیسٰی اور یحیٰی علیہما السلام پر۔ ان کو کتابیں بھی تین دی گئیں۔ صحیفے تو بے شمار دیے گئے' کیونکہ بے شمار نبی مبعوث ہوئے اور ہر ایک پر وحی آتی رہی' اور یہ انہی انبیاء کی کتابیں ہیں جو ''Old Testament'' میں جمع ہیں۔ قرآن مجید میں بھی ان کے لیے تین کتابوں تورات' زبور اور انجیل کا تذکرہ ہے۔ لیکن وہی قوم اب نشانِ عبرت ہے۔ اسی قوم کے لیے فرما دیا گیا کہ: ﴿ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ﴾ ''ان پر (اللہ کی طرف سے) ذلت اور مسکنت مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب (عذاب) میں گھر گئے''۔ انہی پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برسے ہیں۔ انہیں بخت نصر کے ہاتھوں تباہ و برباد کیا گیا۔ پھر کبھی رومیوں کے ہاتھوں ان کی پٹائی ہوئی اور کبھی یونانیوں کے ہاتھوں' یہاں تک کہ پچھلی صدی میں دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ہٹلر کے ہاتھوں ان کے ساتھ جو عبرت ناک سلوک ہوا اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اس دوران ساٹھ لاکھ یہودی قتل ہوئے ہیں۔ بخت نصر کی بات تو خیر اڑھائی ہزار سال پرانی ہو گئی ہے' لیکن یہ تو ماضی قریب کا واقعہ ہے۔ حالانکہ ان یہودیوں کا یہ قول رہا ہے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ﴾ ''ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں''۔ ان کے اس ادّعا پر قرآن کا تبصرہ یہ ہے: ﴿فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ﴾ ''تو وہ تمہیں سزا کیوں دیتا ہے تمہارے گناہوں کی پاداش میں؟'' تم اگر اپنے خیال میں اللہ کے ایسے ہی لاڈلے اور چہیتے ہو تو اللہ تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیتا رہا ہے؟ اس نے دنیا میں تمہیں بری طرح پٹوایا ہے تو آخرت میں بھی تم پر عذاب کے کوڑے برسیں گے۔

ان تمام حوالوں سے مسلمانوں کو عبرت دلائی جا رہی ہے کہ دیکھو مسلمانو! کہیں تم بھی ان کے مانند نہ ہو جانا! چنانچہ فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْھِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُھُمْ﴾ ''اور وہ نہ ہو جائیں ان لوگوں کی مانند جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی' تو اُن پر جب ایک مدت مدید گزر گئی تو اُن کے دل سخت ہو گئے''۔

تأخیر و تعویق کا نتیجہ: قساوتِ قلبی

نوٹ کیجیے کہ ایک تو صرف شدتِ تأثر کے لیے قساوتِ قلبی کا لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ

روایات میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی مذکور ہے۔ جب آپؓ کے پاس اہل یمامہ کا ایک وفد آیا اور ان کے سامنے قرآن پڑھا گیا تو ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو اس موقع پر خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''هٰكَذَا كُنَّا حَتّٰى قَسَتِ الْقُلُوْبُ'' کہ یہی حال کبھی ہمارا بھی ہوتا تھا' یہاں تک کہ ہمارے دل سخت ہو گئے۔ لیکن یہ صرف شدتِ تأثر ہے۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: ((اِنَّـهٗ لَيُغَـانُ عَـلٰى قَلْبِىْ)) ''بے شک میرے دل پر بھی کبھی کبھی کوئی حجاب سا طاری ہو جاتا ہے''۔ اس سے کہیں آپ لفظی اشتراک کی وجہ سے دھوکہ نہ کھا جائیں کہ ہمارے دلوں کے حجاب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کے حجاب کی نوعیت کوئی ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ (نعوذ باللہ) ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک!

اسی قساوتِ قلبی کے بارے میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۴ ہے:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَـارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾﴾

''پھر (ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی) تمہارے دل سخت ہو گئے' پتھروں کی طرح سخت' بلکہ سختی میں ان سے بھی کچھ بڑھے ہوئے' کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں' اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھٹتا ہے تو اس میں سے پانی نکلتا ہے' اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے''۔

اس آیت کا حوالہ قساوتِ قلوب کے ضمن میں بہت ضروری ہے۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان کا دل سخت ہوتا ہے تو پھر کسی چٹان اور پتھر کی سختی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور یہ تو ہمارے عام مشاہدے کی بات ہے کہ کوئی بھیڑیا بھی ایسی درندگی نہیں کر سکتا جو انسان انسان کے ساتھ کرتا ہے۔ کوئی درندہ جب بھوکا ہو تو وہ ضرور اپنی درندگی کا مظاہرہ کرتا ہے' لیکن آج انسان قومیت پرستی کے بھوت میں اندھا ہو کر درندگی کا جو مظاہرہ کر رہا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ آج بوسنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے' تقسیمِ ہند کے وقت مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہوا تھا' کبھی مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا تھا اسے کون بھلا سکتا ہے! افسوس کہ مسلمانوں کے ہاتھوں بھی یہ ظلم و ستم ہوا ہے۔ کراچی میں مسلمانوں نے مسلمانوں کے ساتھ ظلم و ستم کی جو داستانیں رقم کی ہیں وہ کوئی درندہ بھی نہیں کر سکتا۔ گھروں میں آگ لگائی گئی ہے اور پھر بچوں کو اٹھا اٹھا کر اُس میں پھینکا گیا ہے۔ تو ایسی

قساوتِ قلبی کسی درندے کے اندر بھی نہیں ہوگی۔ انسان جب گرتا ہے تو اسفل سافلین میں ہو جاتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾﴾ (التین) ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا''۔ تو انسان جب گرتا ہے تو پھر نیچوں میں بھی سب سے نیچے چلا جاتا ہے۔ تو فرمایا کہ اس تأخیر و تعویق کے باعث تمہارے دل سخت ہوتے چلے گئے اور سختی میں پتھروں کے مانند ہو گئے' بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔ اس لیے کہ پتھروں میں تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اور ایسے پتھر بھی ہیں جو شق ہو جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکل آتا ہے۔ بڑی بڑی چٹانیں اللہ کے خوف سے منہدم ہو جاتی ہیں' اللہ کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ اور تمہارے یہ کرتوت اللہ سے ڈھکے چھپے ہرگز نہیں ہیں۔ درحقیقت یہ قساوتِ قلبی اور فسق و فجور اسی تعویق و تأخیر کا نتیجہ ہے۔ اس آیت میں یہودیوں کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اُس وقت یہود کی سیرت و کردار اور ان کے تمام معاملات مسلمانوں کے سامنے تھے اس لیے ان کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی تھا۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَ کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں''۔

اُمید کی روشن کرن

اس ترہیب اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اب اگلی آیت میں تشویق و ترغیب اور حوصلہ افزائی کا انداز ہے۔ کسی بھی قسم کی تربیت و تعلیم کے لیے یہ دونوں چیزیں لازم ہیں۔ یعنی ڈانٹ ڈپٹ' زجر و تنبیہ اور تہدید بھی ضروری ہے' لیکن پھر ساتھ ہی تھپکی بھی دی جانی چاہیے' حوصلہ بھی بڑھایا جانا چاہیے کہ گھبراؤ نہیں' اگر واقعتاً تمہیں محسوس ہو جائے کہ دل سخت ہو گئے ہیں' دلوں کے اندر ایمان کے بجائے ویرانی ہے' ہم کسی مغالطے میں ہیں کہ ہم مؤمن ہیں' تو یہ احساس بھی بہت قیمتی ہے' اس کو بھی بڑی مضبوطی کے ساتھ تھامو! کہیں یہ لمحہ بھی نہ جاتا رہے۔ اپنے اندر سے تمہارا نفس یا شیطانِ لعین تمہیں کوئی تھپکی دے کر سلا نہ دے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ﴾ ''جان لو! اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتا ہے''۔ تمہارے دلوں کی زمین اگر ویران ہو گئی ہے' اگر تم محسوس کرتے ہو کہ نورِ ایمان سے خانۂ دل خالی ہو گیا ہے تو بھی گھبراؤ نہیں' مایوس نہ ہو۔ ﴿لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جانا''۔ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ بے آب و گیاہ زمین پر' جہاں زندگی کے آثار نہ ہوں' ویرانی ہی ویرانی ہو'

بارش برستی ہے تو وہیں پر سبزہ اگ آتا ہے۔ ع ''مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی۔''(۱)

آپ کو معلوم ہے کہ جہاں ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ ہو اور موت کا سماں ہو تو کوئی پرندہ بھی وہاں نہیں جاتا۔ وہ کاہے کو وہاں جا کر چہچہائے؟ کون ہے اس کی آواز سننے والا؟ لیکن جب اسی جگہ پر بارش برستی ہے تو ہریالی ہی ہریالی ہوتی ہے۔ اب پرندے بھی وہاں ڈیرے ڈال لیتے ہیں' حشرات الارض بھی رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ساری حیات کہاں سے آ گئی؟ تو اگر اللہ تعالیٰ مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے تو پھر تمہارے لیے بھی مایوس ہونے کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جیسے مُردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے اسی طرح وہ تمہارے دلوں کی مُردہ زمین کو بھی حیاتِ تازہ عطا کر دے گا اور ایمان کے نور سے منور کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایمان کی لہلہاتی ہوئی فصل تمہاری اسی کشتِ قلوب کے اندر پیدا ہو جائے گی۔ آگے اس کے لیے راہنمائی بھی کی جا رہی ہے کہ: ﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۱۷﴾ ''ہم نے (اپنی) آیات تمہارے لیے واضح کر دی ہیں تا کہ تم عقل سے کام لو''۔ تا کہ تم اس سے سبق حاصل کرو۔ مایوس ہونے کی بات نہیں ہے' تم اپنی اصلاح کے لیے کمر ہمت کس لو۔

سلوکِ قرآنی کی پہلی منزل

اب اگلی آیت سلوکِ قرآنی سے متعلق ہے۔ یعنی جب دلی کیفیت کا ادراک ہو جائے اور آدمی اپنے باطن میں جھانک کر محسوس کرے کہ دل نورِ ایمان سے خالی ہے تو بھی مایوس نہ ہو' اسی زمین میں ایمان کی فصل لہلہا سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ہل چلانا ضروری ہے۔ وہ ہل کون سا ہے؟ فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۸﴾ ''یقیناً صدقہ دینے والے مَرد اور صدقہ دینے والی عورتیں' اور جو قرض دیں اللہ کو قرضِ حسنہ' اُن کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہے''۔ ہم اسی سورۃ میں وہ آیت بھی پڑھ چکے ہیں کہ: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟'' سورۃ التغابن میں بھی یہی بات ارشاد فرمائی گئی: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ

(۱) جگر مراد آبادی نے جب پینے پلانے سے توبہ کر لی تھی تو انہوں نے ایک ساقی نامہ کہا تھا۔ اس میں ایک شعر ہے:

رگوں میں بھی کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی!

یعنی کبھی ہماری رگوں کے اندر شراب گردش کرتی تھی' مگر اب زندگی گردش کر رہی ہے۔

لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٧﴾ ''اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ اور اللہ بڑا قدر دان اور بردبار ہے''۔

اس آیت کا ایک تو فلسفہ سمجھ لینا چاہئے۔ دیکھئے دنیا کی محبت دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک علائق دُنیوی کی محبت اور ایک مال و اسبابِ دُنیوی کی محبت۔ ان دونوں کو یکجا کریں گے تو دنیا کی محبت میں سب سے زیادہ علامتی حیثیت جس چیز کو حاصل ہے وہ مال کی محبت ہے۔ اس لیے کہ مال سے ہی دنیا ہے۔ مال سے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت اور بڑی سے بڑی آسائش حاصل کی جا سکتی ہے۔ تو اصل میں مال کی محبت ہے جو قربِ الٰہی کے راستے کی رکاوٹ بنتی ہے اور یہ گویا بریک کا کام کرتی ہے۔ جب تک یہ بریک نہ کھلے گاڑی نہیں چلتی' چاہے آپ ایکسیلیٹر دباتے رہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ''تم نیکی تک ہرگز رسائی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ خرچ نہ کرو وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے''۔ یعنی وہ چیز نہیں جو دل سے اُتر چکی ہو' بلکہ محبوب شے اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ عربی زبان میں ''لَــــنْ'' کے ساتھ جو نفی آتی ہے اِس سے زیادہ تاکید ممکن نہیں ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ''تم ہرگز رسائی حاصل نہیں کر سکتے نیکی تک''۔ یعنی بخل اور نیکی ساتھ ساتھ ہوں' یہ ناممکن ہے۔ آپ زاہد ہو جائیں گے' عابد ہو جائیں گے' لیکن جب تک بخل کا بریک لگا ہوا ہے آپ نیک نہیں ہو سکتے۔ اللہ کے نزدیک نیکی اور شے ہے۔ اسی طرح آپ محدث ہو سکتے ہیں' مفتی ہو سکتے ہیں' مفسر ہو سکتے ہیں' بڑے عالم ہو سکتے ہیں' لیکن نیک نہیں ہو سکتے اگر یہ بریک لگی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ دل سے مال کی محبت کو نکالنا ہوگا۔ یہ سلوکِ قرآنی کی شرطِ اوّل ہے' یہ ہل تو چلانا ہی پڑے گا۔

اسی کی درحقیقت وضاحت ہے جو سورۃ البلد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑے شکوے کے انداز میں گلہ کر رہے ہیں کہ ہم نے انسان کو کیا کیا نعمتیں دیں! ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ﴿٨﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ﴿٩﴾ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿١٠﴾﴾ ''کیا ہم نے اسے (انسان کو) دو آنکھیں' اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور (نیکی اور بدی کے) دونوں نمایاں راستے اسے (نہیں) دکھا دیے؟'' آگے فرمایا: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾﴾ ''پس یہ گھاٹی کو عبور نہیں کر سکا''۔ ہم نے اسے کیسی کیسی نعمتیں دی ہیں' مگر یہ کم ہمت' تھڑ دلا دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ تو یہ ایک طرح کی گھاٹی ہے جسے میں بریک کہہ رہا ہوں۔ اس گھاٹی سے نکل جائیں گے تو آگے راستہ کھلا ہے' لیکن گھاٹی اوکھی ہے۔ پنجابی

شاعر عبداللہ شاکر کے بقول ع ''اوکھی گھاٹی مشکل پینڈا عشق دیاں اسواراں دا!'' تو اس اوکھی گھاٹی کو عبور کرنا مشکل ہے۔ آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾﴾ ''اور تم کیا جانو کہ وہ گھاٹی کیا ہے''۔ ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾﴾ ''کسی (غلام کی) گردن کو غلامی سے آزاد کرا دینا ہے''۔ ﴿اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿١٦﴾﴾ ''یا کھانا کھلانا کسی قرابت دار یتیم یا خاک نشین مسکین کو (جو مٹی میں مل رہا ہے) فاقے کے دن''۔ یعنی قحط کے دن کسی یتیم یا فاقہ کش مسکین کو کھانا کھلانا جب اپنے بھی لالے پڑ رہے ہوں۔ اگر اپنے گودام اناج سے بھرے ہوئے ہیں تب آپ نے لنگر کھول دیا تو یہ اور بات ہے' لیکن جب اپنے بھی لالے پڑے ہوئے ہوں تب کسی بھوکے کو کھانا کھلانا' یہ ہے دراصل مشکل گھاٹی۔ اس گھاٹی کو اگر عبور کر لیا تو کامیابی ہے۔ یہ بہت اہم مقام ہے اور بہت کم لوگوں نے اس کا گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾﴾ ''پھر (اس کے بعد یہ کہ) آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی''۔ یعنی اس گھاٹی میں سے گزر کر جو ایمان لایا ہے دراصل وہ ہے کہ جس کے لیے آگے راستے کھلے پڑے ہیں۔ دیکھئے ایک ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں جو اِس حال میں ایمان لائے ہیں کہ وہ مال کی محبت سے پہلے سے بری ہیں۔ جبکہ ایک شخص وہ ہے جو دل میں مال کی محبت لیے ہوئے ایمان لایا ہے۔ لہٰذا جب تک وہ اپنے دل کو مال کی محبت سے' جو کہ نجاست ہے' پاک نہیں کرے گا تو سوائے نفاق کے اس کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

''انفاق فی سبیل اللہ'' اور ''صدقات'' میں فرق کی نوعیت!

ہمارے اس سلسلۂ درس میں اب تک ایک تو ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح آئی ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔ دوسری اصطلاح آئی ہے اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ اور ﴿وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ جبکہ اب ایک اصطلاح ''صدقات'' کی آئی ہے۔ صدقہ کس کو کہتے ہیں؟ ہم عام طور پر جو صدقے کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ کسی اچھے معنوں میں نہیں ہوتا۔ جبکہ صدقہ اصل میں صدق سے بنا ہے۔ دراصل یہ انسانیت کی صداقت کا ثبوت ہے کہ آپ کسی انسان کو بھوکا دیکھیں تو اسے کھانے میں شریک کریں' اسے کسی تکلیف میں دیکھیں تو اگر آپ اس کی تکلیف کا ازالہ کر سکتے ہوں تو اُدھر متوجہ

ہو جائیں اور اس کی تکلیف رفع کریں۔ اگر کسی میں یہ رأفت اور رحمت نہیں ہے تو وہ پھر حقیقی انسان ہی نہیں ہے۔ اسی لیے حضورﷺ نے فرمایا: ((مَنْ يُّحْرَمِ الرِّفْقَ فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهُ)) ''جو شخص دل کی نرمی سے محروم ہو گیا وہ گویا کل کے کل خیر سے محروم ہے''۔ اس کے پاس خیر کہاں سے آئے گا! کسی کٹھور دل اور سنگدل انسان کے پاس خیر آ ہی نہیں سکتا۔ چاہے کوئی شخص اپنے اوپر تقویٰ اور دینداری کے لاکھ لبادے اوڑھ لے' مسجدوں کو قالین بھی فراہم کر دے اور بڑے بڑے چندے بھی دے' لیکن جب تک وہ دل کی نرمی سے محروم ہے وہ کُل کے کُل خیر سے محروم ہے۔

لہٰذا اب مال خرچ کرنے کی دو اقسام سامنے آئی ہیں جنہیں الگ الگ شناخت کرنا ضروری ہے۔ ایک ہے ابنائے نوع کی دادرسی میں اور ان کی تکلیف دور کرنے میں مال خرچ کرنا۔ یعنی فقراء' مساکین' بیواؤں' یتیموں اور مقروضوں وغیرہ کے لیے مال خرچ کرنا۔ یہ ''صدقہ'' ہے۔ زکوٰۃ کا بڑا مصرف بھی یہی ہے۔ اگرچہ زکوٰۃ کے مصارف میں ''فی سبیل اللہ'' بھی ہے لیکن وہ آٹھ مدّات میں سے ایک ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ کے مصارف پر سورۃ التوبۃ میں جو آیت آئی ہے اس میں لفظ ''زکوٰۃ'' آیا ہی نہیں' ''صدقات'' آیا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ...... الخ﴾ تو صدقہ اور زکوٰۃ کو ایک طرف کر لیجیے۔ جبکہ ایک ہے اللہ کی حکومت قائم کرنے کے لیے' اللہ کے پیغام کو عام کرنے کے لیے' اللہ کے دین کی جدوجہد کے لیے ساز و سامان فراہم کرنے کے لیے مال خرچ کرنا۔ یہ ہے ''انفاق فی سبیل اللہ'' اور یہی ہے اللہ کے لیے قرضِ حسنہ۔ اس لیے کہ یہ تو اللہ کا ذاتی معاملہ ہے۔ سورۃ الحدید ہی میں آگے جا کر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾ ''اور تاکہ اللہ جان لے (ظاہر کر دے) کہ کون ہے جو مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے''۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو اللہ اپنا مددگار قرار دیتا ہے جو اُس کی حکومت قائم کرنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر حاضر ہو جاتے ہیں۔

ذرا غور کیجیے' ہندوستان میں شیعیت کب آئی ہے! ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے پورے تین سو برس بعد تک شیعیت کا نام و نشان نہیں تھا۔ یہ خالص سنی مسلمان ملک تھا۔ لیکن جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا تو اب وہ ایران گیا اور وہاں شہنشاہ طہماسپ سے فوج لے کر آیا۔ یہ جو قزلباش کہلاتے ہیں یہ اس وقت ایران سے آئے تھے اور ان کے ساتھ ہی شیعیت آئی ہے۔ اب ظاہر بات ہے وہ تو ہمایوں کے مددگار اور محسن تھے جنہوں نے

اسے دوبارہ تخت دہلی لے کر دیا‘ جنہوں نے حکومت ہند اسے دوبارہ دلوائی تو ان سے بڑا محسن کون ہوگا! یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد سے مغلیہ دربار پر اہل تشیع کو غلبہ حاصل ہوا اور ہندوستان کے اندر شیعیت پھیلتی چلی گئی۔ اب آپ اسی کے اوپر قیاس کیجیے! اس وقت دنیا میں اللہ کی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ اگر آپ اللہ کے وفادار بن کر دنیا میں اس کی حکومت قائم کرنے کے لیے اپنا تن‘ من‘ دھن لگا رہے ہیں تو آپ لازماً اللہ کے مددگار ہوئے۔ اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی اور عظیم ترین آیت انہی الفاظ پر ختم ہو رہی ہے: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾ ’’اللہ دیکھنا چاہتا ہے کون ہیں (اس کے وفادار بندے) جو غیب میں ہونے کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں‘‘۔ سورۃ الصّف کی آخری آیت کا مضمون بھی یہی ہے: ﴿يٰٓـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ﴾ ’’اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو! جیسے عیسٰی ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون میرا مددگار ہے اللہ کی طرف؟‘‘ تو اللہ کے راستے میں جان و مال کھپانے والے اللہ کے بھی مددگار ہیں اور رسول کے بھی مددگار ہیں۔

خرچ کی ان دو مدوں کی علیحدہ علیحدہ شناخت کرنا ضروری ہے۔ ایک ہے غرباء‘ مساکین‘ یتیموں‘ بیوائیوں‘ مقروضوں‘ غلاموں اور دیگر محتاجوں کی مدد کے لیے‘ ان کی احتیاج اور تکلیف کو دور کرنے کے لیے خرچ کرنا۔ یہ ہے صدقہ اور خیرات‘ اور ایک ہے انفاق فی سبیل اللہ یا اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔ اس آیت میں ان دونوں کو جمع کیا گیا: ﴿اِنَّ الْـمُـصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ﴾ ’’یقیناً صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں۔‘‘ ﴿وَاَقْـرَضُـوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ ’’اور جنہوں نے اللہ کو قرضِ حسنہ دیا ہے‘‘۔ اب یہاں پر ’’وَالَّـذِيْـنَ‘‘ محذوف ماننا پڑے گا کہ ’’وَالَّـذِيْـنَ اَقْـرَضُـوا اللّٰـهَ قَـرْضًـا حَسَـنًـا‘‘۔ اس لیے کہ اسم پر فعل کا عطف براہِ راست نہیں آتا۔ ’’اور وہ لوگ کہ جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں‘‘۔ یعنی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے‘ اقامت دین کے لیے‘ غلبۂ دینِ حق کے لیے‘ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے‘ نظامِ خلافت کو برپا کرنے کے لیے۔ آگے فرمایا: ﴿يُضٰعَفُ لَهُـمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۸﴾ ’’ان کے لیے دوگنا کیا جائے گا (اجر) اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہے‘‘۔ اللہ کو قرض حسنہ دینے کا مطالبہ اس سورۃ میں پہلے بھی بایں الفاظ آیا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّـذِيْ يُقْـرِضُ اللّٰـهَ قَرْضًا حَسَـنًـا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۱﴾ اور سورۃ التغابن میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰـهَ قَرْضًـا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۷﴾ کم و بیش وہی الفاظ یہاں

ہیں کہ: ﴿يُضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾ کہ ان کے لیے اجر میں بڑھوتری ہوتی رہے گی' اضافہ ہوتا رہے گا' اور اضافی طور پر جو اجر کریم دیا جائے گا وہ اس پر مستزاد ہے۔ تمہارا اصل مال تو تمہیں بہت بڑھا ہوا ملے گا ہی' مزید اللہ کی طرف سے بہت باعزت بدلہ' بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ملے گا۔

مراتبِ صدّیقیت وشہادت کا حصول

فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہی ہیں صدّیق اور شہید اپنے ربّ کے پاس''۔ ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ﴾ ''ان کے لیے محفوظ ہے ان کا اجر بھی اور ان کا نور بھی''۔ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴾ ''اور جنہوں نے کفر کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی تو وہ جہنم والے ہیں۔''

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' تربیت اور تعلیم کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ ایک طرف زجر و ملامت' سختی' تنبیہہ اور تہدید ہو' لیکن ساتھ ہی حوصلہ افزائی بھی ہو' تھپکی بھی دی جائے' شاباش بھی ہو۔ دل کی اُن ہمتوں کو از سرنو سہارا دیا جائے جو کمزور پڑ رہی ہوں۔ ان چار آیات کے لیے میں نے ''سلوکِ قرآنی'' کا عنوان تجویز کیا ہے۔ پہلی آیت میں جھنجھوڑنے کا انداز ہے کہ کیا ہو گیا ہے؟ کیوں تأخیر و تعویق میں پڑے ہوئے ہو؟ ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہو لیکن اس کے حقوق ادا کرنے کو تیار نہیں ہو! ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ ''کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟'' اور اس کے ساتھ ہی تہدید اور تنبیہہ بھی ہے کہ دیکھ لو! تم سے پہلے بھی ایک اُمت تھی' اور بعض اعتبارات سے تو اس کی بڑی فضیلت تھی' ان کے ہاں بیسیوں نبی مبعوث ہوئے۔ ظاہر بات ہے کہ چودہ سو برس تک اُن میں نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں' تو یقیناً بیسیوں نبی آئے ہوں گے۔ بہرحال انہیں بھی کتابیں دی گئی تھیں۔ ایک کتاب کا یہاں جو خاص طور پر ذکر ہو رہا ہے وہ تورات ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ ﴾ ''اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جائیں جنہیں کتاب دی گئی تھی پہلے''۔ اگر ''الکِتاب'' میں ''ال'' کو لامِ جنس مانا جائے تو یہاں پر تین کتابیں مراد ہو سکتی ہیں' تورات' انجیل اور زبور۔ تو یہاں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی انجام سے دوچار ہو جاؤ جس انجام سے وہ دوچار ہو چکے ہیں اور وہ نشانِ عبرت بن چکے ہیں۔

اگلی آیت میں حوصلہ افزائی ہے کہ گھبراؤ نہیں‘ مایوس نہ ہو جانا۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ﴾ (یوسف: ۸۷) ’’اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہونا‘‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت ہے کہ وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی اس مُردہ کھیتی کو ایمان‘ عمل صالح اور انفاق فی سبیل اللہ کی فصل سے آباد کر دے گا۔ البتہ اس کے لیے تمہیں ہل چلانا ہوگا‘ دل سے حبّ مال کی نجاست کو نکالنا ہوگا۔ حبِّ دُنیا کے لیے علامت (symbol) مال کی محبت ہے۔ اسے ہر دو طریقوں پر دل سے نکالنا ہوگا‘ محتاجوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کر کے بھی اور اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لیے بھی۔ مَیں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ یہ حبّ مال ایک طرح کا بریک ہے۔ یہ بریک کھلے گا تو گاڑی چلے گی‘ ورنہ ایکسیلیٹر دباتے رہو گے گاڑی حرکت نہیں کرے گی۔ اس کے لیے دونوں مدّیں بیان کر دی گئیں۔ ایک مدّ صدقہ اور خیرات ہے کہ غرباء‘ مساکین‘ یتیموں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کرنا‘ بھوکوں کو کھانا کھلانا‘ جو بیمار ہیں اُن کے علاج معالجے کی صورت پیدا کرنا‘ مقروضوں کا قرض ادا کرنا۔ اور دوسری مدّ ہے اللہ کے دین کے لیے قرضِ حسنہ دینا‘ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے‘ اس کی حکومت قائم کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر مال صرف کرنا۔ اس سے دل کی نجاست دُور ہو جائے گی۔ اسی کا نام ’’تزکیہ‘‘ ہے۔ ’’زکوٰۃ‘‘ کا لفظ اسی مالی عبادت کے لیے اسمِ علم ہے۔ اس لیے کہ اس سے تزکیہ ہوتا ہے‘ اس سے دلوں کے اندر کی نجاست دھلتی ہے‘ اور وہی درحقیقت ایمان کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

تزکیہ کا مفہوم ایک مثال سے سمجھئے! دیکھئے ایک باغبان نے اپنے باغ میں کچھ پودے اور درخت تو خود لگائے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ پودے یا درخت پروان چڑھیں۔ لیکن کچھ خودرو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ اِدھر اُدھر اُگ آئی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ خودرَو نباتات (unwanted plants) ہوا میں سے آکسیجن کو بھی جذب کر رہی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو پوری کی پوری آکسیجن جو مہیا ہے وہ اس پودے اور درخت کے لیے ہوگی کہ جو باغبان چاہتا ہے کہ پروان چڑھے۔ اسی طرح زمین کے اندر جو بھی قوتِ نمو ہے اس میں سے بھی یہ کھینچ رہے ہیں‘ ورنہ یہ ساری قوتِ نمو اُس پودے کے لیے ہوگی جو پودا باغبان چاہتا ہے کہ پروان چڑھے۔ لہٰذا باغبان کُھرپہ ہاتھ میں لے کر اِن سب کو صاف کر کے پھینک دیتا ہے‘ تاکہ اصل پودا یا درخت بڑھے اور پروان چڑھے۔ یہ تزکیہ ہے۔ اسی طرح انسان کی اصل نشوونما کے لیے بھی ضروری ہے کہ مال کی محبت‘ جو اصل میں علامت ہے دنیا کی

محبت کی‘ اس کی گرفتاری سے اسے نجات ملے۔ یہ بند اور بریک کھلے گا تب ہی اس کی نشو ونما کا راستہ آسان ہوگا۔

آیات ۱۸ و ۱۹ کا باہمی ربط

اب ہم اس چوتھی آیت کا تفصیلاً اور بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ دراصل دو حجابات کی وجہ سے اس کی اصل عظمت منکشف نہیں ہو پا رہی۔ سورۃ البلد کی آیات مَیں نے آپ کے سامنے پیش کی تھیں‘ وہاں لفظ ”ثُمَّ“ آ گیا ہے جو کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ فرمایا: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴾ ”انسان گھاٹی کو عبور نہ کر پایا“۔ ﴿وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴾ ”اور تم نہیں جانتے کہ وہ گھاٹی کون سی ہے“۔ ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴾ ”کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا‘ یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی“۔ اب اس لفظ ”ثُمَّ“ نے وہاں پر موجود اصل مفہوم کے خزانوں کو کھول دیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ پہلے اگر آپ نے زمین تیار کی ہے‘ ہل چلایا ہے‘ پھر بیج ڈالا ہے تو وہ بیج بارآور ہوگا اور فصل اگے گی۔ لیکن آپ نے اگر زمین پہلے تیار نہیں کی‘ ہل چلایا ہی نہیں اور جا کر بیج ڈال دیا تو بیج بھی صاف ظاہر ہے ضائع ہو جائے گا۔ اسی طرح آپ نے اگر اپنے نفس کی یا باطنی شخصیت کی زمین میں ہل چلا لیا ہے‘ مال کی محبت یہاں سے نکال دی ہے تو اب جو ایمان کا بیج پڑے گا تو اس میں پوری فصل لہلہائے گی۔ چنانچہ سورۃ البلد میں فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴾ ”پھر وہ شامل ہو اُن لوگوں میں جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی مرحمت کی تاکید کی“۔

سورۃ العصر کا مضمون بھی بالکل یہی ہے۔ سورۃ العصر کے الفاظ ہیں:

﴿وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾

”قسم ہے زمانے کی‘ یقیناً تمام انسان خسارے میں ہیں‘ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق بات کی تاکید اور صبر کی تلقین کی“۔

فرق صرف یہ ہے کہ ترتیب بدل گئی ہے۔ سورۃ العصر میں پہلے ایمان ہے‘ پھر عمل صالح ہے‘ پھر تواصی

بالحق ہے اور پھر تواصی بالصبر ہے۔ جبکہ یہاں دونوں جوڑوں میں ترتیب الٹ گئی ہے۔ عمل صالح پہلے آیا ہے اور ایمان بعد میں۔ پہلے فرمایا: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝﴾ ''کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا' یا فاقے کے دن کسی قرابت دار یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔'' یہ عمل صالح ہے۔ آگے فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''پھر وہ شامل ہوا اُن لوگوں میں جو ایمان لائے''۔ یہاں ایمان بعد میں آ رہا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق بعد میں آ رہا ہے اور تواصی بالصبر پہلے آ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝﴾ ''اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی مرحمت کی تاکید کی''۔ یہاں ''تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ'' گویا ''تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ'' کی جگہ ہے۔ لیکن عمل صالح اور ایمان کو جوڑنے والی جو چیز ہے وہ لفظ ''ثُمَّ'' ہے' جس نے کہ حقائق کے خزانے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہاں (سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ اور ۱۹ کے مابین) چونکہ ایسا کوئی لفظ نہیں ہے لہٰذا یہاں تدبر کی ضرورت ہوگی کہ ان دونوں آیتوں میں ربط کیا ہے۔

ان دونوں آیات کا ترجمہ یوں ہے: ''یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو لوگ اللہ کو قرضِ حسنہ دیں' ان کے لیے ان کا دیا ہوا مال بڑھایا جاتا رہے گا اور ان کو اجر ملے گا بہت ہی باعزت۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہ صدّیق اور شہید ہیں''۔ ان دونوں آیات کے درمیان بھی گویا لفظ ''ثُمَّ'' محذوف ہے۔ اور یہ آپ کی سمجھ میں اُس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک یہ دو اصول سامنے نہ ہوں۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید کی آیات کے مابین بڑا گہرا ربط ہے۔ اس کی اہمیت بھی بہت کم لوگوں کے سامنے آئی ہے اور بہت کم لوگوں نے اس پر توجہ کی ہے کہ آیاتِ قرآنی باہم مربوط ہونی چاہئیں۔ اگر آپ نے علیحدہ علیحدہ آیت پر غور کر کے کچھ علم' معرفت' فہم اور ہدایت حاصل کی اور اس پر اکتفا کر لیا تو یقیناً وہ بھی بہت بڑی قیمتی متاع ہے' لیکن آیات کے باہمی ربط سے اس کے حسنِ معنوی کے کچھ اور پہلو بھی نمایاں اور منکشف ہوتے ہیں' جو یہاں لفظ ''ثُمَّ'' کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے ہیں۔

دوسرا اصول یہ سامنے رہنا چاہئے کہ ''اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ اس اصول کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں' لیکن اس کا انطباق اور اس کا

حق ادا کرنا' یہ اپنی جگہ پر ایک دوسرا مرحلہ ہے۔ لہٰذا یہاں پر اِن دونوں اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے لفظ ''ثُمَّ'' کو محذوف سمجھئے۔ یعنی وہ لوگ جو صدقات کے ذریعے اور اللہ کو قرضِ حسنہ دے کر اپنے دلوں سے مال کی محبت اور اس کی نجاست کو دھو ڈالتے ہیں' پھر وہ جب ایمان لاتے ہیں تو اب ان کے لیے مقامِ صدّیقیت اور مرتبۂ شہادت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ اب گویا وہ بریک کھل گئی' اب آگے بڑھنے کے لیے راستے کھلے ہیں۔ آگے بڑھنے کے اعتبار سے یہاں صدّیقیت اور شہادت کے مراتب کا تذکرہ ہوا ہے۔ بدقسمتی سے ان اصطلاحات پر بھی توجہ بہت کم ہوئی ہے۔ میں آج آپ کے سامنے ان چیزوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا۔

قرآنی اصطلاح کے طور پر ''شہید'' کا مفہوم

اب دوسرے حجاب کو سمجھئے۔ لفظ ''شہید'' کے عام طور پر دو مفہوم ہیں۔ ان میں سے قرآن مجید کے اعتبار سے جو مفہوم زیادہ اہم ہے وہ کچھ اور ہے' وہ مَیں آگے چل کر بیان کروں گا۔ لیکن بدقسمتی سے دوسرا مفہوم جو اِس لفظ کا شاذ مفہوم ہے اور قرآن میں تقریباً ذکر ہی نہیں ہوا' وہ عام اور رائج ہو گیا ہے۔ وہ مفہوم اس آیت کے اصل فہم میں پردہ اور حجاب بن گیا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں شہید کے معنی ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا'' لیے جاتے ہیں۔ پورے قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں کہیں نہیں آیا سوائے سورۂ آل عمران کی ایک آیت کے' جہاں صرف امکان ہے کہ وہ معنی لیے جا سکیں۔ ورنہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کے لیے بھی لفظ مقتول فی سبیل اللہ آیا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط﴾ (البقرۃ:۱۵۴) ''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں مُردہ مت کہو!'' اور ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ط﴾ (آل عمران:۱۶۹) ''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں' مُردہ مت گمان کرو!'' قرآن میں نبیوں اور رسولوں کے لیے بھی قتل کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔ جیسے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ ط﴾ (آل عمران:۱۴۴)

''اور محمد (ﷺ) نہیں ہیں مگر ایک رسول' ان سے پہلے بھی کئی رسول گزرے ہیں' تو کیا اگر اُن پر موت آ جائے یا وہ قتل کر دیے جائیں (اللہ کی راہ میں) تو تم لوٹ جاؤ گے اپنی ایڑیوں کے بل؟''

قرآن مجید کے کسی مقام پر بھی یہ لازم نہیں آتا کہ مقتول فی سبیل اللہ کے لیے لفظ ''شہید'' ہی ترجمہ کیا جائے۔ سورۂ آل عمران کی ایک آیت میں صرف امکان ہے کہ مقتول فی سبیل اللہ کے لیے

لفظ ''شہید'' ترجمہ کیا جائے۔ اس آیت میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾ (آیت ۱۴۰) ''اللہ چاہتا ہے (ان آزمائشوں کے ذریعے) کہ تم میں سے کچھ کو اپنا گواہ بنا لے'' یا ''تم میں سے کچھ کو اللہ اپنی راہ میں قتل ہونے کا مرتبہ عطا کر دے''۔ ذہنوں میں اس لفظ ''شہید'' کا مفہوم یہ بیٹھ گیا ہے کہ ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا''۔ اگرچہ حدیث میں یہ لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے لیے آیا ہے لیکن وہ بابِ اِستفعال سے ''اُسْتُشْهِدَ'' کی صورت میں ہے کہ اس کی شہادت قبول کر لی گئی' اس کو شہادت کا مرتبہ دے دیا گیا۔ لیکن عام طور پر ہماری زبانوں پر یہ لفظِ شہید اُس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گیا ہو۔

اس غلط فہمی کے نتیجے میں اس آیت کی قراءت کا بھی فرق پڑ گیا ہے۔ چنانچہ اب اس آیت ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ کے ظاہری مفہوم سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہو گیا ہے کہ کیا سب کے سب مؤمن صدّیق ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں پر؟ اگر آپ اس آیت کو پچھلی آیت سے کاٹ کر یہاں استیناف سمجھیں گے اور پچھلی آیت سے اس کا ربط پیش نظر نہیں ہوگا تو اس کا مطلب تو یہی ہوگا کہ جو لوگ بھی ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہ صدّیق ہیں! پھر چونکہ شہید صدّیق سے الگ ایک علیحدہ مفہوم کا لفظ سمجھا جا رہا ہے یعنی ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا'' تو اس بنا پر اکثر حضرات نے ''هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ'' پر وقف کر کے ﴿وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ﴾ کو ایک علیحدہ جملہ مانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں قرآن مجید میں ''الصِّدِّيْقُوْنَ'' اور ''وَالشُّهَدَآءُ'' کے مابین وقف کی علامت لگی ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اسلاف میں سے حضرت مجاہدؒ جو تابعی ہیں اور علم قرآن اور علم تفسیر کی بڑی بڑی شخصیتوں اور بزرگوں میں سے ہیں' ان کی رائے یہ ہے کہ یہاں پر ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ کلامِ مسلسل ہے' لہٰذا اسے بغیر وقف کیے رواں پڑھا جائے گا۔

اب آپ سمجھئے کہ اس لفظ ''شہید'' کا اصل مفہوم کیا ہے؟ دیکھئے ''صِدِّيْق'' اور ''شَهِيْد'' قرآن کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں۔ اصطلاحات میں صرف لغوی معانی معتبر نہیں ہوا کرتے' بلکہ لغوی مفہوم کی بنیاد پر اصطلاحی مفہوم کو سمجھنا ہوتا ہے۔ جیسے ''اَمن'' سے ''اِیمان'' بنا ہے' اب ''اِیمان'' نے جب اصطلاح کی شکل اختیار کی تو اس کے معنی ہیں: اَلتَّصْدِيْقُ بِمَا جَآءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ اسی طرح صِدِّيْق' فِعِّيْل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ لہٰذا صِدِّيْق سے مراد ہے انتہائی

راست گو' راست باز' راست رو انسان' کہ جو ہر اچھی بات کی تصدیق کے لیے ہر وقت آمادہ رہے۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں کہ جن کے لیے نبی کی دعوت ہرگز اجنبی نہیں ہوتی۔ جیسے ہی نبی کی دعوت اُن کے کانوں تک پہنچتی ہے انہیں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

اُن کی فطرت اپنی سلامتی پر برقرار ہوتی ہے۔ وہ غور و فکر اور سوچ بچار کرنے والے لوگ ہوتے ہیں' انہیں خود اپنے اندر سے وہ گواہی ابھرتی ہوئی نظر آ رہی ہوتی ہے' لہٰذا جیسے ہی نبی کی دعوت اُن تک پہنچتی ہے فوراً تصدیق کر دیتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں' جن کے بارے میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس کے سامنے بھی اپنی دعوت رکھی ہے اس نے کچھ نہ کچھ تأمل ضرور کیا ہے سوائے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے۔ انہوں نے ایک لحظہ کی تأخیر کے بغیر تصدیق کی ہے تو یقیناً یہ صرف اس لیے ہوا ہے کہ یہ چیز پہلے سے ان کی فطرت میں موجود تھی' ورنہ تو یہ بہت بڑا دعویٰ تھا' نبوت و رسالت کا دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ تو نہیں ہے۔

اسی طرح اب لفظ ''شہید'' پر غور کیجیے! ''شہید'' کے لغوی معنی ہیں ''جو موجود ہو''۔ شَهِدَ' يَشْهَدُ کا مطلب ہے موجود ہونا۔ شاہد و غائب کے الفاظ ہماری عام بول چال میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ شاہد اسے کہتے ہیں جو موجود ہو اور غائب وہ جو موجود نہ ہو۔ اب اسی لغوی معنی سے اس میں دو اضافی مفہوم پیدا ہوئے۔ غور کیجیے کہ جو شخص کسی وقوعہ کے وقت موجود ہو تو اُسی کی گواہی معتبر ہوتی ہے' لہٰذا جو موجود ہے وہ گواہ ہے۔ اگر کہیں کوئی حادثہ ہوا ہے' کسی کا قتل ہو گیا ہے' یا کوئی اور جرم ہوا ہے' تو جو اُس وقوعہ کے وقت موجود ہو گا وہی تو گواہی دینے کا اہل ہے۔ لہٰذا گواہی موجودگی کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور اسی لغوی معنی کی بنیاد پر اِس کے معنی مددگار کے بھی ہیں۔ اس لیے کہ جو کسی ضرورت کے وقت موجود ہو گا وہی مدد کر سکے گا۔ فرض کیجیے آپ کا کوئی بہت ہی جگری' وفادار اور مخلص دوست ہے' لیکن جب وہ وقوعہ پر موجود ہی نہیں ہے تو وہ آپ کی مدد کیسے کر سکے گا؟ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳ میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے:

﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾

''اگر تمہیں کوئی شک ہے اُس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر نازل کی ہے تو پھر تم بھی اس جیسی کوئی ایک سورۃ بنا کر لے آؤ اور اس کے لیے تم اللہ کے مقابلے میں اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (جس کو چاہو جمع کر لو اور اپنی ساری صلاحیت کو بھی مجتمع کر لو اور اُس کا مقابلہ کر لو) اگر تم سچے ہو۔''

یعنی فی الواقع تو تمہیں اِس کے اللہ کا کلام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' لیکن تم صرف بات بنا رہے ہو' تمہارا دل تو گواہی دے رہا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو وہاں ''اَلشُّهَـــدَآء'' کے معنی مددگار کے ہیں۔ بہرحال یہاں پر اصطلاحاً شہید سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ کی طرف سے اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے لوگوں پر دنیا میں گواہی قائم کرے' حجت قائم کرے اور پھر یہ کہ قیامت کے دن بھی کھڑے ہو کر وہ گواہی دے کہ اے اللہ! میں نے تیرے بندوں تک تیرا یہ پیغام پہنچا دیا تھا' لہٰذا اب یہ خود ذمہ دار ہیں۔ منصبِ رسالت کے لیے قرآن مجید میں یہ لفظ ''شہادت'' انتہائی کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ رسول دنیا میں حق کی گواہی دیتا تھا۔ (میں نے یہاں ماضی کا صیغہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اب یہ سلسلۂ نبوت و رسالت بند ہو چکا ہے۔) یہ فریضۂ منصبی بحیثیت مجموعی اُمت کو ادا کرنا ہے' اب یہ اُمت کا فریضۂ رسالت ہے۔ اب شخصی رسالت نبوت کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ نبی دنیا میں اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی دیتا تھا' وہ جو کہتا تھا کر کے دکھاتا تھا' تاکہ ثابت ہو جائے کہ جس بات کی طرف بلایا جا رہا ہے وہ ناقابلِ عمل نہیں ہے' یہ دعوت صرف لفّاظی نہیں ہے' بلکہ قابلِ عمل ہے۔ اور پھر یہ کہ حضور اکرم ﷺ نے تو اِس نظامِ حیات کو قائم کر کے دکھا دیا کہ یہ نظام قائم ہو سکتا ہے اور قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر حضور ﷺ نے یہ نظام چلا کر بھی دکھا دیا' تاکہ حجت اپنے آخری درجے کو پہنچ جائے۔ اسی کا نام اتمامِ حجت ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن رسول استغاثہ کے چشم دید گواہ (Prosecution witness) کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے اور گواہی دیں گے۔[1] ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ﴿۴۱﴾﴾ (النساء)

''پس اُس (قیامت کے) دن کیا حال ہو گا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے

(۱) ''قرآن کا فلسفۂ شہادت'' کے عنوان سے اس موضوع پر بڑی مفصل تقاریر کے کیسٹس موجود ہیں

اور آپ ﷺ کو بھی (اے محمد ﷺ) اِن لوگوں کے خلاف بطورِ گواہ کھڑا کریں گے!''

اس آیت سے متعلق ایک واقعہ بھی ہے جو ہمارے لیے بہت ہی عبرت انگیز اور سبق آموز ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضور! آپ کو قرآن سناؤں؟ آپ پر تو یہ نازل ہوا ہے۔ فرمایا: ''ہاں یہ ٹھیک ہے' لیکن مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور لذت حاصل ہوتی ہے''۔ اب انہوں نے امتثالاً للامر (حکم کی بجا آوری میں) سورۃ النساء کی پہلی آیت سے تلاوت شروع کی اور پڑھتے گئے۔ جب اِس آیت پر پہنچے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿٤١﴾﴾ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اب بس کرو!'' جب حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (یہ حدیث متفق علیہ ہے۔)

ہر اُمت کی طرف جو بھی رسول بھیجے گئے تھے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وہ رسول قیامت کے دن سرکاری گواہ کی حیثیت سے کھڑے ہو کر گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرا جو پیغام مجھ تک آیا تھا' میں نے ان تک پہنچا دیا۔ اب یہ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں' خود جواب دہ ہیں۔ متذکرہ بالا آیت کا اگلا حصہ ہے: ﴿وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) آپ کو ہم لائیں گے ان کے خلاف گواہ کے طور پر''۔ نوٹ کیجیے ''علٰی'' کا صلہ جب بھی آتا ہے وہ مخالفت کے لیے ہوتا ہے۔ جیسا کہ بہت ہی مشہور حدیث ہے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ)) ''قرآن یا تو تمہارے حق میں حجت ہوگا یا تمہارے خلاف حجت بنے گا''۔ شہادت کسی کے حق میں ہوتی ہے اور کسی کے خلاف ہوتی ہے۔ ہر شخص جو گواہ کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے' اس کی گواہی کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف جاتی ہے۔ جب یہ گواہی ''لِ'' کے صلے کے ساتھ آتی ہے تو کسی کے حق میں جارہی ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہل ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے حق میں گواہی دینے کے لیے''۔ لیکن یہ خاص طور پر نوٹ کیجیے کہ اکثر و بیشتر اس کے ساتھ ''علٰی'' کا صلہ لگتا ہے۔ قیامت کے دن جب ہمارے اپنے اعضاء و جوارح ہمارے خلاف گواہی دیں گے تو ہم کہیں گے: ﴿لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا﴾ ''تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دے دی؟'' ''تم ہمارے اپنے اعضاء و جوارح ہو کر ہمارے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ ہمارے یہ اعضاء و جوارح جواب میں کہیں

گے :﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ :۲۱) ’’آج اس اللہ نے ہمیں بھی گویائی عطا کر دی ہے جس نے ہر شے کو نطق و گویائی عطا کی ہے‘‘۔ جہاں بھی رسالت کی گواہی کے لیے یہ لفظ آیا ہے ’’علٰی‘‘ کے ساتھ آیا ہے۔سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا:﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾﴾ ’’(دیکھو لوگو!) ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف اپنا ایک رسول تمہارے خلاف گواہ کی حیثیت سے‘ جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا‘‘۔

رسول دنیا میں تو لوگوں کو حق کی دعوت دیتا ہے‘ وہ ان کے لیے جو اُس کی دعوت کو قبول کر لیں رحمتِ خداوندی کا مظہر بن جاتا ہے‘ لیکن جنہوں نے اس کی دعوت کو ردّ کر دیا اُن پر گویا حجت قائم ہو گئی۔ قیامت کے دن اب وہی رسول کھڑا ہو کر اُن لوگوں کے خلاف گواہی دے گا کہ اے اللہ! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا‘ میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے‘ جبکہ سوا لاکھ کا مجمع سامنے تھا‘ یہ سوال کر کے گواہی لے لی: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) ’’لوگو! میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟‘‘ میری طرف سے حق تبلیغ میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی؟ اور پورے مجمع نے یک زبان ہو کر کہا: ’’اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ‘‘ یعنی ’’ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق رسالت ادا کر دیا‘ حق امانت ادا کر دیا اور ہماری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا‘‘۔ بلکہ ایک روایت میں تو یہ تفصیل ہے: ’’اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ‘‘ یعنی ’’ہاں حضور! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے رسالت کا حق ادا کر دیا‘ امانت کا حق ادا کر دیا‘ اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور گمراہی کے اندھیروں کے پردے چاک کر دیے‘‘۔ اب حضور ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کیا: ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ‘ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ‘ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ)) ’’اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ!‘‘ انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ مَیں نے انہیں تیرا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ’’اب پہنچائے وہ جو یہاں ہے اُس کو جو یہاں نہیں ہے‘‘۔ یہ ہے اصل میں اُمت کا فریضۂ رسالت۔ اللہ نے بھیجا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو اور محمد ﷺ نے اپنا یہ فریضۂ منصبی اُمت کے حوالے کیا۔ اس لیے کہ حضور تو پوری نوعِ انسانی کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی :﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا

وَّنَذِيۡرًا ﴾ ’’اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر‘‘۔ اور حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں تو اتمامِ حجت اگر ہوا ہے تو صرف جزیرہ نمائے عرب کے مسلمانوں پر ہوا ہے‘ قیصر وکسریٰ کو تو آپ ﷺ کے ابھی صرف خطوط ہی گئے تھے‘ ایران کے لوگوں کو ابھی کیا معلوم تھا کہ وہ دعوت کیا ہے؟ رومیوں کو کیا پتہ تھا کہ وہ دعوت کیا ہے؟ اس کے دلائل کیا ہیں؟ دعوت کے اتمامِ حجت کی حد تک تو فریضہ ادا نہیں ہوا۔ تو یہ کام اب مسلمانوں نے کرنا ہے۔

اب نوٹ کیجیے کہ یہ ہے اصل میں شہادت! اور قرآن مجید میں دو جگہوں پر اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں یہ مضمون اِن الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا﴾ (آیت ۱۴۳) ’’اور اسی طرح ہم نے تمہیں اُمت وسط بنایا ہے تاکہ تم پوری نوعِ انسانی پر گواہی دو (حجت قائم کرو) اور ہمارے رسول تم پر گواہی قائم کریں (حجت قائم کر دیں)‘‘۔ یہ وہ گواہی ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہو جائے گی۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ﴿۴۱﴾﴾ ’’پس کیا حال ہوگا (اُس دن) جب ہم ہر اُمت میں ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو (اے نبیؐ!) کھڑا کریں گے ان کے خلاف بطورِ گواہ‘‘۔ اس کے بعد اگلی آیت میں فرمایا: ﴿يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَعَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ ؕ وَلَا يَكۡتُمُوۡنَ اللّٰهَ حَدِيۡثًا ﴿۴۲﴾﴾ ’’اُس دن جن لوگوں نے (اس دنیا میں) کفر وانکار کیا تھا‘ اور رسول (ﷺ) کی نافرمانی کی تھی‘ تمنا کریں گے کہ کاش وہ زمین میں دھنسا دیے جائیں! (اُن کے اوپر زمین برابر ہو جائے‘ نیست ونابود ہو جائیں‘ ان کا وجود ہی باقی نہ رہے) لیکن وہ وہاں کوئی بات اللہ سے چھپا نہیں سکیں گے‘‘۔

شہادت علی الناس کا یہی مضمون سورۃ الحج کے اخیر میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوۡا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ ’’اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے‘‘۔ اور یہ جہاد کس لیے ہوگا؟ ﴿هُوَ اجۡتَبٰكُمۡ﴾ ’’اس نے تمہیں چن لیا ہے‘‘۔ اپنے نصیب پر فخر کرو کہ یہ اُمت مسلمہ اس سلسلۂ رسالت میں ایک کڑی (link) کی حیثیت سے تا قیامِ قیامت جوڑ دی گئی ہے۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں پہلے یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اَللّٰهُ يَصۡطَفِىۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ ’’اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغام بر اور انسانوں میں سے بھی‘‘۔ اور اب اس کے بعد فرمایا ہے:

﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾ اس نے تمہیں چن لیا ہے، تمہیں پسند کر لیا ہے۔ اس فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ اب آخری رسول تو ہمارے محمد ﷺ ہیں اور باقی نوعِ انسانی پر تا قیامِ قیامت یہ شہادت کی ذمہ داری ادا کرنا تمہارے ذمہ ہے۔ اور ذرا آگے چل کر فرمایا کہ یہ محنت اس لیے کرنی ہے کہ: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''تا کہ رسول تم پر گواہ ہو جائیں اور تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ''۔ یہ ہے قرآن میں شہادت کا اصل مفہوم۔ یہی وجہ ہے کہ تمام رسولوں کو ''شہید'' کہا گیا' حالانکہ رسول تو قتل ہوئے ہی نہیں۔ انبیاء ضرور قتل ہوئے ہیں' لیکن کوئی رسول قتل نہیں ہوا۔ حضرت مسیح علیہ السلام رسول تھے' یہودیوں نے انہیں قتل کرنے کی کوشش کی تو اللہ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ ''انہوں نے نہ تو اسے قتل کیا اور نہ سولی دی''۔ بہرحال یہاں پر (سورۃ الحدید میں) شہید کا مفہوم عام لوگوں نے چونکہ ''مقتول فی سبیل اللہ'' لیا ہے تو اس کی وجہ سے وہ الجھنیں پیدا ہو گئیں جن کی بناء پر اس آیت کی اصل عظمت لوگوں پر منکشف نہیں ہوئی۔

صدّیقیت اور شہادت کی حقیقت

اب آپ ان دونوں اصطلاحات ''صدّیقیت'' اور ''شہادت'' کی اصل حقیقت کو سمجھئے! دیکھئے سورۃ الفاتحہ کی پانچویں آیت کے الفاظ ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ اور چھٹی آیت میں الفاظ آتے ہیں: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ''راستہ اُن کا جن پر تیرا انعام ہوا''۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا' اس کی وہاں پر کوئی وضاحت نہیں ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں بایں الفاظ کر دی گئی: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ ''جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حق ادا کر دے گا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جو اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا''۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ ﴿مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝﴾ ''یعنی انبیاء' صدّیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی خوب ہے ان کی رفاقت''۔ تو یہ منعم علیہم چار گروہ ہیں: انبیاء' صدّیقین' شہداء اور صالحین۔ ان میں نبوت سرفہرست ہے۔ ''صالحیت'' گویا ان چار مراتب کی base line ہے۔ اس کے اوپر شہداء' ان کے اوپر صدّیقین اور سب سے اوپر انبیاء ہیں۔ ظاہر بات ہے نبوت تو پہلے بھی ہمیشہ وہبی شے تھی' کسبی نہیں تھی' کوئی شخص اپنی محنت و مشقت' ریاضت و عبادت اور کسی سلوک کی منازل

طے کرنے سے نبوت حاصل نہیں کرسکتا تھا' یہ خالص وہبی شے تھی' جس کا دروازہ اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا۔ تو گویا عام انسانوں کے لیے تین درجے کھلے ہوئے ہیں: صالحین' شہداء اور صدّیقین۔

صدّیق اور شہید کے مابین فرق کیا ہے' یہ جان لیجیے۔ ذرا نوٹ کیجیے' سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیہما السلام کے بارے میں ﴿صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا﴾ جبکہ حضرت موسٰی اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے بارے میں ﴿رَسُوۡلًا نَّبِيًّا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ قرآن کریم کا ایک خاصا مشکل مقام ہے کہ ان کے درمیان فرق کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی شخصیت کے جو سانچے (personality patterns) بنائے ہیں ان میں دو تقسیمیں بہت نمایاں ہیں۔ جدید سائیکالوجی میں آپ انہیں دروں بیں (introvert) اور بیروں بیں (extrovert) کہتے ہیں۔ مقدم الذکر لوگ غور وفکر کرنے والے' سوچ بچار میں منہمک' تنہائی پسند اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں' جبکہ مؤخر الذکر لوگ فعّال قسم کے' بھاگ دوڑ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ باہر کی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور انہیں اپنے باطن میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ خوب گفتگوئیں ہو رہی ہیں' مجلسوں میں خوب بحث ہو رہی ہے' خوش گپی ہو رہی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ حقائق کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتے۔ ان دو کے علاوہ بہت شاذ لوگ (ambivert) ہوتے ہیں کہ جن کے اندر دروں بینی اور بیروں بینی کی دونوں صلاحیتیں موجود ہوں اور توازن کے ساتھ ہوں۔ بلکہ اکثر و بیشتر یہ دو چیزیں اگر کسی میں جمع ہو بھی جائیں تو پھر اُس کا توازن پر قائم رہنا چونکہ مشکل ہوتا ہے اس لیے ambivert کا لفظ بالعموم اچھے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا۔ آدمی یکسو اور یک رخا ہوگا تو وہ زیادہ مستحکم (stable) رہے گا' جبکہ ambivert کے اندر عدمِ استحکام (instability) کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔

کسی شخصیت میں دونوں چیزیں موجود ہوں اور توازن کے ساتھ برقرار ہوں تو اس کی کامل مثال تو ایک ہی ہے اور وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ باقی آپ کو انبیاء میں بھی دو درجہ بندیاں ملیں گی' جیسا کہ آپ کو صحابہ کرام ؓ میں دو درجہ بندیاں ملتی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدّیق ؓ کی طبیعت کے اندر شروع ہی سے رقیق القلبی موجود تھی۔ کسی کو دکھ میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے' ہر کسی کی تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش کرتے۔ پھر یہ کہ سلیم الفطرت تھے' کیسے ممکن تھا کہ کسی بُت کو سجدہ کریں! اور یہ توحید تو فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے' وہ جو ''اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ؟ قَالُوۡا بَلٰی!'' کا عہد کر کے آئے تھے اس

کے اثرات اس حیاتِ دُنیوی میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر الصدّیق رضی اللہ عنہ نے کبھی بھی کسی بُت کو سجدہ نہیں کیا، کبھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا، کبھی بدکاری نہیں کی۔ گویا کہ ایک پاک طینت، صاف باطن شخصیت ہیں۔ یعنی اندر سے فطرت بھی پاک اور سلیم، اور کردار و اخلاق بھی بہت عمدہ۔ تو ایسے شخص کے سامنے جب نبی کی دعوت آتی ہے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی تاخیر ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقامِ صدّیقیت میں اُمت میں سب سے بلند مرتبہ ہیں اور صدّیق ثانی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت سے جو لوگ ایمان لائے ان میں سرفہرست حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔

دوسری طرف حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما ہیں، جن کا مزاج حضراتِ ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو چھ برس بیت جاتے ہیں اور ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے دو مثالیں اس لیے دی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی ایسی قرابت داری نہیں تھی، ہوسکتا ہے کہ کچھ اور بھی عوامل کارفرما ہوں، لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، خالہ زاد بھائی ہیں، دودھ شریک بھائی ہیں، ساتھ کے کھیلے ہوئے ہم جولی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت کرتے ہیں۔ بتائیے کون سا حجاب ہے؟ کیوں نہیں ایمان لائے چھ برس تک؟ اس لیے کہ اُدھر توجہ ہی نہیں ہے۔ سیر و شکار سے فرصت نہیں ہے، کئی کئی دن تک تیر کمان لے کر صحرا کے اندر شکار میں مصروف ہیں۔ غور و فکر اور سوچ بچار والا مزاج ہی نہیں ہے۔ ادھر توجہ ہی نہیں ہے کہ یہ کائنات کیا ہے، اس کا بنانے والا کون ہے اور اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ صرف عدم توجہی ہے، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عناد ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ کوئی منفی عامل سرے سے موجود ہی نہیں ہے سوائے عدم توجہی کے۔ چنانچہ چھ برس بعد ایمان لائے ہیں اور وہ بھی جذباتی طور پر۔ شکار سے واپس آئے تو کنیز (حضرت فوزیہ رضی اللہ عنہا) نے کہا کہ آج تو ابوجہل نے آپ کے بھتیجے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر بڑی زیادتی کی ہے، بہت گستاخی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ پس وہ جو دل میں محبت تھی اس نے جوش مارا اور سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے جہاں وہ اپنی پارٹی کو لے کر بیٹھا ہوا تھا، جاتے ہی کمان اس کے سر پر دے ماری جس سے سر پھٹ گیا۔ اس سے کہنے لگے کہ تمہاری یہ ہمت کہ تم نے میرے بھتیجے کے ساتھ یہ معاملہ کیا! اور پھر اسی وقت کہا کہ اچھا میں اس پر ایمان لاتا ہوں، آؤ مقابلہ کرو! یہ شان ہے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ایمان کی۔ تو اس کو ذرا اچھی طرح

سمجھئے۔ اِن دو شخصیتوں کا فرق اگر نہیں سمجھیں گے' اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانوں کے مختلف مزاج بنائے ہیں ان کا جب تک فہم وشعور نہ ہوگا یہ آیت سمجھ میں نہیں آئے گی' اور یہ کہ صدّیقیت اور شہادت کسے کہتے ہیں' یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ شہید کے معنی صرف مقتول فی سبیل اللہ ہی ذہن میں رہ جائیں گے اور یہ جو قرآن مجید کے اصل حقائق ومعارف ہیں ان سے محرومی رہے گی۔

یہی معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ ان کے ہاں تو معاملہ اس سے آگے بڑھ کر عصبیت جاہلی کا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہمارے آبائی دین اور آبائی عقائد کی نفی کر رہے ہیں' یہاں تک کہ بالآخر وہ دشمنی اس انتہا کو پہنچ گئی کہ گھر سے تلوار لے کر یہ فیصلہ کر کے نکلے ہیں کہ آج میں ان کا کام تمام کر دوں گا۔ کفارِ مکہ درحقیقت یہ دیکھ رہے تھے کہ بنو ہاشم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پشت پناہی کر رہے ہیں' اب اگر ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی گزند پہنچا دیا تو بنو ہاشم ان کے انتقام کے لیے کھڑے ہو جائیں گے' اس طرح ہمارا آپس کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا' عرب کے اندر ہماری حیثیت مجروح ہو جائے گی' بلکہ ہماری قبائلی جنگ شروع ہو جائے گی۔ ان کے لیے رکاوٹ صرف یہی تھی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اب تو پانی سر سے گزر رہا ہے' گھر گھر میں لڑائی ہو رہی ہے' بھائی بھائی سے کٹ گیا ہے' بیوی شوہر سے جدا ہو رہی ہے' شوہر بیوی سے کٹ گیا ہے' والدین سے اولاد علیحدہ ہو گئی ہے تو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق عمر بن خطاب نے فیصلہ کر لیا کہ اب تو جو ہو سو ہو' میں تو انہیں قتل کر دوں گا۔ چنانچہ سیف بدست نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں حضرت حذیفہؓ بن عتبہ ملے' وہ ایمان لا چکے تھے' لیکن عمر کو معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ عمر کیا بات ہے؟ اتنے جوش وجلال کے ساتھ کہاں چلے؟ کہا کہ میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ آج یہ جھگڑا ختم کر کے رہوں گا' میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ انہوں نے بڑی حکمت سے یہ کہہ کر ان کا رخ موڑ دیا کہ تمہارے تو اپنے بہن اور بہنوئی ایمان لا چکے ہیں! اب غصے میں آگ بگولہ ہو کر اپنی حقیقی بہن فاطمہ بنت خطاب اور بہنوئی سعید بن زید (رضی اللہ عنہما) کے ہاں پہنچے اور غصہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اندر قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ وہاں حضرت خباب بن اَرت رضی اللہ عنہ انہیں قرآن پڑھانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیات نازل ہوئی تھیں اور وہ آکر انہیں سنا رہے تھے۔ عمر کی آواز سن کر انہوں نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو تو چھپا لیا۔ عمر نے گھر میں داخل ہو کر بہنوئی حضرت سعیدؓ کو مارنا شروع کیا۔ بہن درمیان میں آئیں تو اُن کو بھی ایک ایسا تھپڑ لگایا کہ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ لیکن بہن کی زبان سے یہ جملہ نکلا: عمر! چاہے تم ہمیں

جان سے ماردو' اب ہم اس دین کو چھوڑیں گے نہیں جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ ان کا یہی جملہ تھا جو عمر بن خطاب کے انقلاب کی وجہ بنا ع

دگرگوں کرد تقدیر عمر را!

عمر سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ صنفِ نازک میں یہ ہمت اور یہ حوصلہ کیونکر پیدا ہوا! یوں سمجھئے کہ اندر تو سب کچھ تھا' اوپر خول آیا ہوا تھا۔ بس اس خول کے اندر سوراخ ہو گیا' لیکن کسی دلیل و منطق سے نہیں' غور وفکر سے نہیں' یہ ہوا ہے جذباتی طور پر (emotionally)۔ تو اس اُمت کے دو عظیم ترین شہداء ہیں حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما۔ اور اِس اُمت کے دو عظیم ترین صدّیق ہیں حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما۔ یہ مضمون معارفِ قرآن حکیم کا ایک اہم باب ہے۔ اس پر بدقسمتی سے جتنی توجہ ہونی چاہیے تھی میرے علم کی حد تک اتنی توجہ نہیں ہوئی۔

بعض اہم دینی اصطلاحات کے مابین ربط و تعلق

اب آپ کے سامنے ایک نقشہ پیش کیا جا رہا ہے' جو دین کی بعض اہم اصطلاحات کے مابین ربط و تعلق کے لیے بہت مفید ہے۔
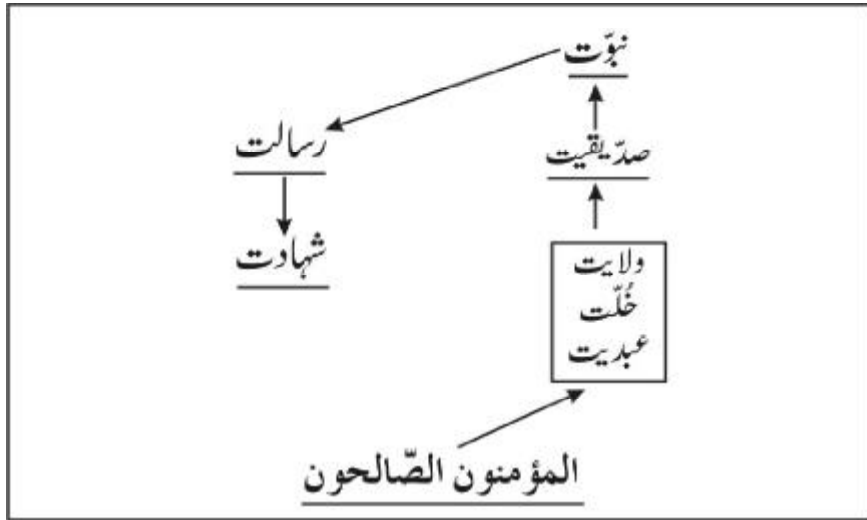
اس نقشے میں دائیں اور بائیں دو انتہائیں وجود میں آ رہی ہیں۔ ایک طرف عروج ہے اور دوسری طرف نزول ہے' یعنی ایک عروجی کیفیت ہے اور ایک نزولی کیفیت ہے اور ان کے مابین base

line ''عبدیت'' اور ''صالحیت'' ہے۔ ''عبدیت'' کی اصطلاح قرآن میں سب سے زیادہ استعمال ہوئی ہے۔سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ﴾ ''اے لوگو! اپنے ربّ کی بندگی اختیار کرو''۔لیکن سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں ''صالحین'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں چونکہ base line ہیں اس لیے ان دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔جس شخص نے فیصلہ کر لیا ہو کہ میں اللہ کا بندہ بن کر ہی زندگی گزاروں گا' وہ صالحین میں شامل ہو گیا۔

اب اس کے اوپر کے درجات کے لیے تین اصطلاحات ہیں اور یہ تینوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ایک ہے ''ولایت'' یعنی اللہ کی دوستی۔اس کی تفصیل سورۃ حٰمٓ السجدۃ میں بایں الفاظ آئی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ......﴾

''جن لوگوں نے کہا ہمارا ربّ اللہ ہے پھر اُس پر ثابت قدم رہے......''

یعنی جن کو بھی اس عبدیت پر استقامت حاصل ہو گئی' جن کا بھی ایمان پر دل ٹھک گیا اور انہیں اللہ کے ساتھ تسلیم و رضا کی کیفیت حاصل ہو گئی' ان کا توکّل کُل کا کُل اللہ کی ذات پر مرکوز ہو گیا اور وہ اطاعتِ کلی پر کار بند ہو گئے' تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ (یونس)

''آگاہ ہو جاؤ! یقیناً اللہ کے دوست تو وہ ہیں کہ جن پر (قیامت کے دن) نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے پرہیزگاری کی روش اختیار کی۔''

اس دوستی کے لیے ایک لفظ ''خُلّت'' بھی ہے اور یہ خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنا لیا''۔تو یہ ''ولایت'' اور ''خُلّت'' دو اصطلاحات ہیں۔لیکن ایک اعتبار سے ''صدّیقیت'' کی اصطلاح بھی ان کے ہم پلہ ہے۔صدّیق وہ شخص ہے جو نیک سرشت ہو' جو طبعًا نیک' راست باز' راست گو' راست رو ہو اور وہ ہر اچھی بات کی تصدیق کرنے کے لیے تیار اور آمادہ رہتا ہو۔یہ ہے وہ مرتبہ جس کے اُوپر عروج کی آخری منزل ''نبوت'' ہے۔میں نے اسی لیے

''رسالت'' کو نیچے رکھا ہے کہ میں ان حضرات کی رائے سے متفق ہوں جو رسالت کو مقامِ ''نزول'' میں سمجھتے ہیں' اس لیے کہ اصل عروج نبوت ہے۔ اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ اب اللہ کا پیغام لے کر لوگوں کی طرف جاؤ! یہ مقام رسالت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا تھا: ﴿اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۲۴﴾﴾ (طٰہٰ) ''جاؤ فرعون کی طرف! یقیناً وہ سرکشی پر اتر آیا ہے''۔ یہ نزول اس اعتبار سے بھی بہت خوبصورت لفظ ہے کہ حضور ﷺ پر وحی نازل ہوئی جبکہ آپ جبلِ نور پر غارِ حرا میں تشریف فرما تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہو رہا ہے: ﴿اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۲۴﴾﴾ جبکہ آپؑ کوہِ طور پر اللہ سے ہم کلامی پر مشرف ہوئے۔ کہا جا رہا ہے کہ اب اس بلندی سے نیچے اترو اور جاؤ اللہ کا پیغامِ ہدایت لے کر لوگوں کی طرف۔

اس کیفیت کو علامہ اقبال نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ایک قول کے حوالے سے اپنے چوتھے خطبے میں بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کا ایک جملہ ہے: ''محمد عربیؐ بالائے آسمان رفت و باز آمد' بخدا اگر من رفتمے باز نہ آمدمے'' یعنی محمد عربی ﷺ ساتویں آسمان پر چلے گئے اور پھر واپس آ گئے' خدا کی قسم! اگر میں وہاں پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

> *"This is the difference between prophetic experience and mystic experience."*

دراصل صوفی اللہ کے ساتھ لو لگا کر بیٹھ رہتا ہے۔ اس کیفیت میں جو سرور و کیف ہے اس سے تو ظاہر ہے کہ وہی شخص آگاہ ہے جس کو یہ کیفیت نصیب ہو جائے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''لذّتِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی ۔'' چنانچہ جس نے کبھی اس چیز کو چکھا نہ ہو وہ اس کے اندر جو سرور و کیف ہے اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ کے ساتھ لو لگی ہوئی ہے تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ع ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے''۔ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ہی ایک اور واقعہ بھی روایات میں ملتا ہے کہ ایک بار مراقبے میں بیٹھے ہوئے تھے ــــ اُس وقت جو بھی کیفیت ہوگی ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے ــــ کہ اچانک اقامت کی آواز آ گئی: قَدۡ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ ۔ اُس وقت انہیں کھڑے تو ہونا پڑا' لیکن کہا یہ کہ ''حضوری سے نکال کر دربانی میں کھڑا کر دیا''۔ یعنی مراقبے میں تو مجھے حضوری کی کیفیت حاصل تھی۔ لیکن بہرحال نماز کے لیے کھڑے ہو گئے' اس لیے کہ حکم خداوندی ﴿وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ﴾ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جماعت

میں شریک ہونا لازم ہے۔

تو ظاہر بات ہے جو اللہ کا بندہ اس مقامِ بلند پر پہنچ گیا ہو اَب اسے کہا جائے کہ جاؤ تبلیغ کرو تو اس پر یہ گراں تو گزرے گا! تبلیغ دین میں تو لوگوں کی جلی کٹی سننی پڑتی ہیں۔ جیسے حضورﷺ سے کوئی کہتا پاگل ہو گئے ہیں' کوئی کہتا دماغ خراب ہو گیا ہے' کوئی کہتا یقیناً اس سے ان کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے' یہ کوئی لیڈری چاہتے ہیں' یہ چاہتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کے نام کی مالا جپیں۔ قرآن نے ان کے الفاظ نقل کیے ہیں: ﴿اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ﴾ کسی نے کہا جادوگر ہیں' کسی نے کہا شاعر ہیں۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ نقل کفر کفر نباشد! تو اس سے حضورﷺ کے دل پر جو بیت رہی تھی قرآن خود اُس پر اِن الفاظ میں تبصرہ فرماتا ہے: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ﴾ ''(اے نبیؐ!) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپؐ کا سینہ بھنچتا ہے (آپ کو صدمہ پہنچتا ہے)''۔ اسی لیے کہا گیا: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ﴾ ''صبر کیجیے اس پر جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں''۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ اس سے آپ کو تکلیف پہنچ رہی ہے' کوفت ہو رہی ہے' لیکن صبر کیجیے! اور یہ معاملہ صرف زبانی ایذاء تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے بعد جسمانی ایذائیں بھی شروع ہو گئیں۔ تو رسالت میں تو یہ ساری مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ جبکہ نبوت و ولایت کے مقام پر آدمی آرام وسکون سے بیٹھا ہوتا ہے۔ صوفیاء تو صرف اُسے تذکیر کریں گے جو اُن کی خانقاہوں میں آئے گا' وہ دربدر تو نہیں جائیں گے' انہیں کسی کی کوئی کڑوی کسیلی بات نہیں سننی پڑے گی۔ خانقاہ تو گویا ایک ہسپتال ہے۔ جیسے کوئی مریض علاج کی غرض سے ہسپتال میں آتا ہے اسی طرح جس کے اندر احساس بیدار ہو گیا ہے اور وہ تزکیئے کا خواہاں ہے تو وہ خانقاہ میں حاضر ہو جائے گا اور اس کو جو بھی حکم دیا جائے گا وہ مانے گا۔ اس میں تزکیہ کرنے والے صوفی کو مشقت نہیں اٹھانا پڑتی' جبکہ رسول کا معاملہ اس کے برعکس ہے' وہ دردر جا رہے ہیں اور کہیں کچھ سن رہے ہیں' کہیں کچھ سن رہے ہیں۔

اس مقامِ عروج ونزول کو مولانا رومؒ نے عالمِ جسمانی کی ایک مثال کے ذریعے بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے کہ جب سمندر میں سورج کی حرارت اور تمازت اثر انداز ہوتی ہے تو سمندر کا پانی بخارات کی شکل میں اوپر جا رہا ہوتا ہے۔ یہ بالکل صاف وشفاف مقطّر پانی (distilled water) ہوتا ہے' اس میں کثافتیں (impurities) نہیں ہوتیں۔ یہی بخارات اوپر جا کر بادل کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر بارش بن کر برستے ہیں۔ بخارات کا اوپر جانا عروج ہے اور بارش کا برسنا نزول ہے۔ جب وہی پانی بارش کی شکل میں برستا ہے تو سب سے پہلے فضا کو صاف کرتا ہے' پھر زمین کو

صاف کرتا ہے۔ یعنی وہی پانی فضا اور زمین کی گندگیوں اور کثافتوں کو اپنے اندر لے کر نالوں اور دریاؤں سے ہوتا ہوا دوبارہ سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ گویا عروج اور نزول کا ایک سلسلہ ہے۔ اللہ کے نبیؐ جب رات کے وقت کھڑے ہوتے تھے تو وہ عروج کی کیفیت ہوتی تھی۔ یہ مقامِ عبدیت ہے' جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی ہو رہی ہے۔ اور دن کے وقت جب دعوت و تبلیغ کے لیے گلیوں میں پھر رہے ہیں' گھر گھر جا رہے ہیں' لوگوں سے بات کر رہے ہیں اور ان کی جلی کٹی باتیں سننی پڑ رہی ہیں تو طبیعت میں ایک انقباض ہوتا ہے' کثافت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ﴾ ''ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو باتیں یہ کہہ رہے ہیں ان سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے''۔ لیکن آپ اندازہ کیجیے کہ کتنے لوگ ہیں جو اُس دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں پاک صاف ہو گئے؟ کتنوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ خود بھی عروج کی کیفیت حاصل کریں۔ تو دراصل رسالت مرتبۂ نزول میں ہے۔

قرآن مجید میں رسالت کے قریب ترین لفظ شہادت ہے۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾﴾

''(لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول (یعنی موسیٰ علیہ السلام) بھیجا تھا۔''

سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۴۵﴾﴾

''اے نبی (ﷺ)! یقیناً ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر اور خوش خبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر''۔

یہاں تین صفات میں سب سے پہلے شاہد کا لفظ آیا ہے کہ ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ یہ گواہی ہمیں اپنے قول سے بھی دینی ہے' جیسے ہم زبانی اقرار کرتے ہیں: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ پھر ہمارا عمل بھی گواہی دے کہ واقعتاً ہم اللہ کے بندے ہیں اور ہم واقعتاً محمد ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ پھر اِس گواہی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ لوگوں کو جمع کرو اور ایک اجتماعی نظام قائم کرو' جو پوری دنیا کے اوپر گواہ بن جائے کہ بہترین نظام وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے سے عطا کیا ہے۔ اب ظاہر بات ہے اس کے لیے عملی جدوجہد درکار ہے۔ چنانچہ اس شہادت کے لیے اب ان لوگوں کی اہمیت زیادہ ہو جائے گی جن کے اندر قوتِ کار اور بھاگ

دوڑ کی صلاحیت زیادہ ہے۔ جبکہ تصدیق کرنے میں وہ لوگ پیش قدمی کر جائیں گے جو سلیم الفطرت اور رقیق القلب ہیں۔ یہ ہیں اصل میں ''صدّیقین'' اور ''شہداء'' کے دو مزاج۔ بیروں بین (extroverts) شہداء بنیں گے اور دروں بین (introverts) صدّیق بنیں گے' ان کو تصدیق کرنے میں دیر نہیں لگے گی' پیش قدمی کر جائیں گے۔ لیکن اس کے بعد عملی جدوجہد میں نبی کے دست و بازو بننے میں شہداء پیش پیش ہوں گے' جو بھاگ دوڑ کرنے والے ہیں۔ حضراتِ ابوبکر وعثمان رضی اللہ عنہما اور نہ معلوم کتنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے کہ ان کے ایمان لانے کے بعد بھی مسلمانوں کو کھلم کھلا حرم میں جا کر نماز پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن جس سال حضرات حمزہ وعمر رضی اللہ عنہما ایمان لے آئے تو اَب مسلمانوں نے ڈنکے کی چوٹ حرم میں جا کر نماز پڑھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا بڑا پیارا قول ہے: ''کتنے ہی ہیں جو بعد میں آتے ہیں لیکن پہلوں سے آگے نکل جاتے ہیں''۔ حضور ﷺ نے جن کو حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے بعد عظیم ترین انسان معین کیا ہے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں جو پیغامِ ہدایت پہنچنے کے تقریباً چھ سال بعد ایمان لائے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ آپؐ سے پہلے چھ سالوں میں کم از کم تیس چالیس افراد تو ایمان لا چکے ہوں گے' لیکن وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس لیے کہ آپؓ فعّال انسان ہیں' آپ کے قوائے عملیہ زیادہ چاق و چوبند ہیں۔ جبکہ ایک وہ ہیں جن کے قوائے فکریہ و علمیہ کی حیثیت زیادہ ہے۔ تو اس اعتبار سے ''صدّیقیت'' بلند ترین منزل ہے اور ''شہادت'' اس سے نیچے ہے۔

سورۃ النساء میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾﴾

''جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے' یعنی انبیاء اور صدّیقین اور شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھی ہے ان لوگوں کی رفاقت۔''

یعنی جو کوئی بھی معنوی طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر کاربند ہو جائے گا اسے ان لوگوں کی ایک معیت و رفاقت حاصل ہو گی جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے۔ ان میں سب سے پہلے انبیاء ہیں' ان سے نیچے صدّیقین ہیں' ان سے نیچے شہداء کا رتبہ ہے اور پھر سب سے نیچے صالحین ہیں جو base line ہے۔ یہ ہے درحقیقت وہ ربط و تعلق جو اِن الفاظ کے مابین ہے۔

فریضۂ شہادت علی الناس —— قرآن حکیم کی روشنی میں

قرآن مجید میں ''شہید'' درحقیقت گواہ کے معنی میں آتا ہے۔ دنیا کی زندگی میں یہ گواہی دعوت و تبلیغ اور عملی شہادت کے ذریعے سے ہے۔ اور یہی لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں استغاثہ کے گواہ(Prosecution Witness) کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے کہ اے اللہ! ہم نے تیرا پیغام انہیں پہنچا دیا تھا۔قرآن مجید میں اہم مضامین دومرتبہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون بھی دومرتبہ آیا ہے کہ حضورﷺ تم پرگواہی دیں گے اورتم بقیہ لوگوں پرگواہی دو گے کہ اے اللہ! تیرے نبیؐ نے تیرا جو پیغام ہم تک پہنچایا تھا' وہ ہم نے انہیں پہنچا دیا تھا۔سورۃ الحج کی آخری آیت میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖ﴾ (الحج :٧٨)

''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے'اس نے تمہیں چن لیا ہے'(حق کی پاسبانی اور اشاعت کے لیے)اور نہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی۔ پیروی کرو اپنے باپ ابراہیم کے دین کی۔اللہ نے تمہارا نام مسلم (سر اطاعت خم کرنے والا) رکھا ہے اس سے پہلے'اور اس قرآن میں بھی (تمہارا یہی نام ہے)' تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم بقیہ نوعِ انسانی پر گواہ بنو!''

سورۃ الحج اور سورۃ البقرۃ اس اعتبار سے ایک دوسری کے ساتھ منسلک ہیں کہ ہجرت سے متصلاً قبل سورۃ الحج اور ہجرت کے فوراً بعد سورۃ البقرۃ نازل ہوئی ہے۔یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں بھی بایں الفاظ آیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (آیت ١٤٣)

''اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمت وسط بنایا ہے' تا کہ تم لوگوں پر بطورِ گواہ کھڑے ہو اور رسول تم پر بطورِ گواہ کھڑا ہو۔''

اس گواہی کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ یہاں پر آخرت کو خاص طور پر نمایاں نہیں کیا گیا' لیکن وہ اس میں implied ہے۔ دنیا میں تم گواہی دو گے دعوت وتبلیغ اور اتمامِ حجت کے ذریعے اور قیامت کے دن اسی گواہی کا ظہور ہو جائے گا جبکہ تم اللہ کی عدالت میں کھڑے ہو کر

گواہی دو گے۔تو یہ مضمون بھی قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ایک سورۃ النحل میں' جو ہجرت سے متصلاً قبل نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔سورۃ النحل کی آیت ۸۹ میں ہے:

﴿وَيَوۡمَ نَبۡعَثُ فِيۡ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيۡدًا عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَجِئۡنَا بِكَ شَهِيۡدًا عَلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ ؕ﴾

''اوراس دن (کا تصور کیجیے اے نبیؐ!) جس دن ہم ہر اُمت میں سے ایک گروہ گواہ بنا کر کھڑا کریں گے ان ہی میں سے'اورآپؐ کو گواہ بنا کر کھڑا کریں گے اِن (اہل عرب) پر''۔

اس ضمن میں دوسرا مقام سورۃ النساء آیت ۴۱ ہے' جس کا ذکر گزشتہ نشست میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کے حوالے سے ہو چکا ہے۔وہاں فرمایا:

﴿فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ شَهِيۡدًا ﴿۴۱﴾﴾

پھر اُس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو بھی (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) ان لوگوں کے خلاف بطور گواہ کھڑا کریں گے''۔

نوٹ کیجیے' ' عـلٰـی '' کا صلہ مخالفت کے لیے آتا ہے۔یعنی وہاں گواہی ان کے خلاف پڑے گی۔اس لیے کہ اگر کوئی قوم اس پوزیشن میں ہو کہ یہ کہہ سکے کہ اے اللہ! تیرا پیغام ہم تک تو آیا ہی نہیں' تو اس چیز کا انہیں اللہ کے ہاں کریڈٹ ملے گا اور انہیں رعایت دی جائے گی۔'' Ignorance of law is no excuse '' دنیا کا قاعدہ ہے جبکہ اللہ کے ہاں ان لوگوں کو رعایت ملے گی جن تک بات نہیں پہنچی۔اُن کا جرم اِن کے کھاتے میں جمع ہوگا جن کے ذمہ تھا کہ پہنچائیں لیکن انہوں نے نہیں پہنچایا۔بہرحال جن لوگوں تک بات نہیں پہنچی ان کے لیے تو وہ عذر ہو گیا' لیکن جن تک بات پہنچا دی گئی ان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں۔سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّـرِيۡـنَ وَمُـنۡـذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُـوۡنَ لِـلـنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعۡدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَـانَ الـلّٰـهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۱۶۵﴾﴾ ''ہم نے اپنے رسولوں کو مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا تا کہ رسولوں کے آنے کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہ جائے لوگوں کے حق میں اللہ کے (محاسبہ کے) خلاف''۔تا کہ وہ یہ عذر نہ پیش کر سکیں کہ اے اللہ! تو ہم سے کس بات کا حساب لے رہا ہے' ہم تک تو تیرا پیغام پہنچا ہی نہیں۔

اس بات کو ایک سادہ ترین مثال سے سمجھئے! آپ کسی شخص کے ذریعے سے اپنے کسی دوست اور عزیز کو اپنا پیغام بھیجتے ہیں کہ فلاں کام کل شام تک ضرور ہو جانا چاہیے ورنہ میرا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔فرض کیجیے وہ کام نہیں ہوا۔اب آپ غصے میں بھرے ہوئے اس دوست یا عزیز کے پاس

جائیں گے جس تک آپ نے اپنا پیغام بھجوایا تھا اوراس سے کہیں گے کہ میں نے آپ تک یہ پیغام بھیجا تھا' آپ نے میرا وہ کام نہیں کیا اور مجھے اتنا بڑا نقصان ہوگیا' اس کا کون ذمہ دار ہے؟ اب اگر وہ صرف ایک جملہ کہہ دے کہ بھائی مجھےتو آپ کا پیغام ملا ہی نہیں' تو اس صورت میں آپ کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا' آپ اس سے شکوہ نہیں کر سکیں گے اور اب آپ کا سارا غصہ پیغام بر کی طرف جائے گا۔آپ جا کر اس کی گردن ناپیں گے کہ اللہ کے بندے! میں نے تجھے اتنا اہم پیغام دے کر بھیجا تھا' تم نے میرا پیغام کیوں نہیں پہنچایا؟ تو اگر پیغام بر نے پیغام پہنچا دیا تو وہ بری ہو گیا' اب ساری ذمہ داری اس کی ہے جسے پیغام پہنچ گیا' لیکن اگر پیغام بر نے پیغام پہنچانے میں کمی کی ہے تو ساری ذمہ داری پیغام بر کی ہے اور جس کے پاس پیغام پہنچنا تھا اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا:﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٦﴾﴾ ''ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔'' ہم رسولوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے کہ تم نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں۔ وہ کہیں گے اے اللہ! ہم نے پہنچا دیا تھا اور ہم نے فریضہ رسالت کی ادائیگی پر لوگوں سے گواہی بھی لے لی تھی۔ خطبۃ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا:((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''لوگو! کیا میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے؟'' اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یک زبان ہو کر کہا: "اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ" ''ہم گواہ ہیں (اے اللہ کے رسولؐ!) آپ نے یقیناً فرض رسالت ادا کر دیا' اور امانت کا حق ادا کر دیا' اور امت کی نصیحت کی ذمہ داری ادا کر دی اور آپ نے (گمراہی کے) تمام اندھیروں کو زائل کر دیا''۔ تو اللہ کے رسول اپنی اپنی ذمہ داریوں سے بری ہو جائیں گے' اب ساری ذمہ داری ان کی ہو گی جن تک اللہ کا پیغام پہنچ گیا ہوگا۔ یہ ہے اصل میں شہادت!

صدّیقیت وشہادت کے مراتب کھلے ہیں

ظاہر بات ہے کہ اہل ایمان میں بھی مختلف قسم کی شخصیتیں ہیں۔ کچھ لوگ اگر دروں بیں قسم کے ہیں' یعنی غور وفکر کرنے والے' سوچ بچار کرنے والے' سلیم الفطرت' رقیق القلب لوگ ہیں تو وہ صدّیقیت کے مقام پر جا پہنچیں گے اور جن کا مزاج ایسا نہیں ہے وہ کم سے کم شہادت کے مرتبے تک پہنچ جائیں گے۔ یہ دونوں راستے ان لوگوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے باطن سے مال

کی محبت کا بریک کھول دیا ہے۔ لیکن اگر یہ بریک لگا ہوا ہے تو وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے' ان کے لیے کوئی ترفع اور ترقی نہیں ہے' وہ تو بس نام کے مسلمان ہیں جو جیسے بھی ہیں چل رہے ہیں۔ لیکن اگر کسی نے دل سے مال کی محبت کو کھرچ دیا ہو اور پھر اللہ پر ایمان لایا ہو تو وہ مرتبہ صدّیقیت پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ اور ۱۹ میں ہے۔

البتہ اس میں یہ مغالطہ ہرگز نہ آنے پائے کہ جس شخص کو نبیؐ کی دعوت براہِ راست پہنچی ہو اور اس نے اس پر لبیک کہا ہو صرف وہی مرتبہ صدّیقیت پر فائز ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہم میں سے بھی ہر شخص یہ رتبۂ خاص حاصل کر سکتا ہے۔ ہم نسلی طور پر مسلمان ہیں' عقیدۃً ایمان ہمارے پاس ہے' لیکن شعوری ایمان نہیں ہے۔ تو آج بھی ہم اس کی تحصیل کر سکتے ہیں۔ تجدید ایمان اسی کا نام ہے۔ ہر گناہ کے بعد جب انسان توبہ کرتا ہے تو وہ تجدید ایمان ہے۔ سورۃ الفرقان کا آخری رکوع ہمارے اس منتخب نصاب کے حصہ سوم میں شامل ہے۔ اس میں آیات ۶۸ تا ۷۰ میں توبہ کا مضمون بڑے خوبصورت انداز میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّـذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٨﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ اِلَّا مَنْ تَـابَ وَاٰمَنَ وَعَـمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٧٠﴾﴾

''اور (رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے' اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو کوئی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب دوگنا کر دیا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا' اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔''

درحقیقت تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد ہم معنی الفاظ ہیں [1]۔ بہرحال آج بھی مرتبۂ صدّیقیت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہے۔ یہ جان لیجیے نبوت کا دروازہ بند ہے' پہلے بھی وہ وہبی تھی' کسبی نہیں تھی'

(۱) یہ تین الفاظ ہم نے تنظیم اسلامی کی دعوت کی بنیاد کو واضح کرنے کے لیے اختیار کیے تھے اور ہماری بہت سی مطبوعات پر یہ بلاک شائع ہوتا ہے: ''تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت: تجدیدِ ایمان' توبہ اور تجدید عہد''۔

لیکن اب تو اس کا دروازہ مستقلاً بند ہے‘ البتہ ’’صِـدّیـقیّت‘‘ اور ’’شہادت‘‘ کے مراتب کھلے ہیں۔ افتادِ طبع کے اعتبار سے انسان ترقی کر کے ان مراتب عالیہ کی تحصیل کر سکتا ہے۔ اور صالحین کا درجہ تو base line کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو ان دونوں آیات (الحدید: ۱۸‘۱۹) کے ربط سے واضح ہوا کہ جو لوگ اس مشکل گھاٹی کو عبور کر جائیں‘ یعنی مال کی محبت سے نجات حاصل کر لیں اور پھر ایمان کے زیور سے آراستہ ہوں تو اُن کے لیے مرتبۂ صدّیقیت یا مرتبۂ شہادت تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ کھلا ہے۔

ولایت اور نبوت کا باہمی تعلق

اس سلسلے میں چند اور باتیں وضاحت طلب ہیں۔ ہمارے تصوف کے حلقوں میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ’’ولایت‘‘ ’’نبوت‘‘ سے افضل ہے۔ ظاہر کے اعتبار سے یہ بات بالکل غلط ہے‘ البتہ اس کے اندر بھی حقیقت کا ایک عنصر ہے‘ اگرچہ اصطلاحات غلط استعمال ہو رہی ہیں۔ ان کے ہاں دو نسبتیں ’’نسبتِ ولایت‘‘ اور ’’نسبت نبوت‘‘ مستقلاً مذکور ہیں۔ دراصل مقام ’’نبوت‘‘ ولایت‘ خلت اور صدّیقیت سب سے بلند ترین مقام ہے۔ لغوی اعتبار سے نبوت کی اصل یا تو ’’نَبَأٌ‘‘ ہے‘ جس سے ’’نبی‘‘ کا مفہوم ہے ’’خبر دینے والا‘‘ اور یا پھر ’’نَبْـــوٌ‘‘ ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ تو اس سے اُونچا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ رسالت‘ نبوت کے ساتھ منتھی ہے اور نبوت رسالت سے افضل ہے۔ عام طور پر ہمارا تصور یہ ہے کہ رسالت نبوت سے افضل ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ رسالت مقامِ نزول میں ہے اور نبوت مقام عروج میں ہے۔ اصل حیثیت مقامِ نبوت کی ہے‘ لیکن جب کسی نبی کو کسی معین جگہ پر بھیجا جاتا ہے تو اسے رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے‘ جیسے حضرت لوط علیہ السلام کو سدوم اور عامورہ کی بستیوں کو خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا‘ حضرت ہود علیہ السلام کو قومِ عاد کی طرف بھیجا گیا‘ حضرت صالح علیہ السلام کو قومِ ثمود کی طرف بھیجا گیا‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور آلِ فرعون کی طرف معین کر کے بھیجا گیا۔ تو یہ رسالت دراصل ’’مقامِ نزول‘‘ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نبوت رسالت سے افضل ہے۔

نبوت کا رشتہ درحقیقت ولایت‘ خُلت اور صدّیقیت سے ہے۔ اور وہ کس اعتبار سے ہے‘ اسے جان لینا ضروری ہے۔ یہ بڑے اہم مضامین ہیں۔ یہ بات پوری اُمت کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے۔ یعنی ہر رسول تو لازماً نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہے۔ انہی

چیزوں کی وجہ سے یہ تصور ذہن میں قائم ہوگیا کہ رسالت نبوت سے افضل ہے۔لیکن درحقیقت یہ افضل نہیں ہے بلکہ ان میں خاص اور عام کی نسبت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے لیکن رسول نہیں تھے۔انہوں نے نہ تو اپنے آپ کو ماننے کی دعوت دی اور نہ کوئی مطالبہ کیا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہِ مصر کے خواب کی درست تعبیر بتائی جس کی بنا پر وہ جیل سے رہا ہوئے اور پھر انہوں نے اس قوم کو قحط سے بچنے کی تدبیر بتائی جو اُن پر آنے والا تھا تو شاہِ مصر نے آپؑ کو وزارتِ مالیات جیسا بڑا عہدہ پیش کیا جسے آپؑ نے قبول کرلیا لیکن بادشاہ تو بہرحال وہی شخص تھا۔قرآن مجید سے اس کے ایمان کا ثبوت بھی نہیں ملتا البتہ وہ نیک انسان تھا۔ جیل کے لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو 'صدّیق' کہہ کر پکارا تھا کہ: ﴿يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ﴾ ''یوسف اے صدّیق!''

نبی اپنی ذاتی شخصیت کے اندر ولایت کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔اور جب اس پر اللہ کی طرف سے وحی اترتی ہے تو اسے نبوت سے سرفراز کردیا جاتا ہے۔ ہمارے آج کل کے قلندر قسم کے لوگوں سے قطع نظر جو شخص واقعتاً اللہ کا دوست خلیل وفادار اور مخلص ہے اس پر اگر وحی آجائے تو وہ نبی ہے اور اگر وحی نہیں ہے تو وہ بس اللہ کا ولی اور برگزیدہ ہے۔حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت یوسف علیہ السلام میں یہی تو فرق ہے کہ حضرت یوسفؑ پر وحیٔ نبوت نازل ہوئی۔ ورنہ شخصیت کے اجزائے ترکیبی جو عبدالقادر جیلانیؒ کے ہیں وہی حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہیں۔ نبی سیرت و کردار کے حوالے سے ایک مکمل انسان ہوتا ہے وہ لوگوں کو حق کی طرف دعوت بھی دے رہا ہوتا ہے لیکن وہ اللہ کی طرف سے اس طرح سے مامور ہوکر نہیں آیا ہوتا کہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت قبول کرو۔ جبکہ رسول تو لوگوں سے جا کر کہتا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو اور میرا حکم مانو میری اطاعت کرو مجھے ماننا پڑے گا! سورۃ الشعراء میں تمام رسولوں کی یہی دعوت نقل ہوئی ہے کہ: ﴿اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾ ''یقیناً میں تمہاری طرف ایک رسولِ امین (مبعوث ہوا) ہوں پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!'' تو یہ رسالت ہے۔

نبوت اور رسالت کا فرق

نبوت اور رسالت کا فرق Simultaneous Contrast کے اعتبار سے حضرت یحییٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) کے تذکرہ میں بہت نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے۔حضرات یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا دَور ایک ہی ہے۔حضرت یحییٰ علیہ السلام صرف نبی تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے۔ دو

سورتوں سورۂ مریم اور سورۂ آل عمران میں اِن دونوں حضرات کا تقابل وارد ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران میں حضرت یحیٰی علیہ السلام کی مدح اور ان کی شخصیت اور سیرت و کردار کے بارے میں بہت سے تاریخی کلمات کے بعد آخر میں یہ بات کہی گئی: ﴿وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ ''وہ نبی ہے صالحین میں سے''۔ نوٹ کیجیے مرتبۂ صالحیت base line ہے اور انسان اسی سے عروج حاصل کرتے ہوئے نبوت تک پہنچتا ہے۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ﴾ ''اور وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف''۔ یہی وجہ ہے کہ چونکہ نبی قتل بھی ہوسکتا ہے اس لیے حضرت یحیٰی علیہ السلام قتل کر دیے گئے۔ بادشاہِ وقت نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر جلاد کے ذریعے آپؑ کا سر قلم کروایا اور طشت میں رکھ کر اُس رقاصہ کو پیش کر دیا۔ قرآن کریم آپؑ کے سیرت و کردار کا ذکر ان الفاظ میں کر رہا ہے:

﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝﴾ (مریم)

''اے یحیٰی! کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے۔ ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم سے نوازا' اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی' اور وہ بڑا پرہیزگار اور والدین کا حق شناس تھا' اور وہ جبار نہ تھا اور نہ نافرمان۔''

دیکھئے قرآن میں آپؑ کی یہ عظمت بیان ہو رہی ہے' لیکن دنیا میں یہ حال سامنے آ رہا ہے کہ ایک آبرو باختہ عورت کی فرمائش پر قتل کر دیے گئے۔ دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ اللہ کے رسول تھے' اللہ کی طرف سے مقرر کردہ تھے لہٰذا قتل نہیں کیے گئے' اس لیے کہ رسول قتل نہیں کیا جا سکتا۔

ان دونوں مراتب ''نبوت و رسالت'' کو ایک مثال سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں CSP ایک کاڈر (cadre) ہے۔ وہ CSP اگر کہیں جا کر ڈپٹی کمشنر لگ گیا ہے تو یہ اس کی تقرری (appointment) ہے۔ اسی طرح جب کوئی صرف نبی ہے تو گویا نبی کی حیثیت سے اس کا ایک کاڈر معین ہو گیا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے بہت سے CSP حضرات کی تقرری نہیں ہو پاتی۔ جو شخص سرکاری یونیفارم میں نہیں ہے اس کے خلاف اقدام عام سی بات شمار ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص فوجی یونیفارم میں ملبوس ہے تو گویا وہ حکومت کا نمائندہ ہے اور اس کے خلاف اقدام کرنا حکومت کو چیلنج کرنا ہے۔ بعینہٖ جب نبی مامور من اللہ ہو کر کسی قوم کی طرف بھیج دیے جاتے تھے تو وہ اللہ کی نمائندگی

کررہے ہوتے تھے اوران کوقتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔اللہ تعالیٰ کا رسولوں کے بارے میں یہ وعدہ ہے:
﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ﴾ (المجادلہ:۲۱)''اللہ نے یہ لکھا ہوا ہے(طے کیا ہوا ہے) کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے''۔یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تھی: ﴿اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾''(پروردگار!) میں تو مغلوب ہوا جا رہا ہوں' پس میری مدد کیجیے!'' ان سے انتقام لیجیے! تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کو رہتی دنیا تک کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا۔اس لیے کہ رسول کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور فتح یابی لازم ہے۔اور اگر قوم نے بحیثیت مجموعی رسول کی دعوت کو ردّ کر دیا ہو تو قوم کا ہلاک کیا جانا لازم ہے۔جیسے قومِ نوحؑ' قومِ لوطؑ' قومِ صالحؑ' قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون انکارِ رسالت کی پاداش میں ہلاک کر دیے گئے' بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔لیکن نبی کے انکار کے جرم میں دنیا میں ہلاکت لازم نہیں ہے' اس کا حساب کتاب آخرت میں جا کر ہوگا' اس لیے کہ اللہ کی طرف سے اس کی تقرری نہیں ہوئی۔وہ تو یوں سمجھئے کہ ایک ولی اللہ ہے جس کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آ رہی ہے۔تو درحقیقت نبوت و رسالت کا یہ فرق ہے اور اس کو سمجھنے ہی سے سارے عقدے حل ہوتے ہیں۔

حضرات ابراہیم اور ادریس علیہما السلام کی شخصیات کے مطالعے سے بھی اس عقدے کو حل کرنے میں راہ نمائی ملتی ہے۔حضرت ادریس علیہ السلام کے تفصیلی حالات تو ہم نہیں جانتے' قرآن مجید میں اُن کا بس اتنا تذکرہ ہے کہ: ﴿وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾''اور ہم نے انہیں بھی بہت اونچا مقام و مرتبہ عطا فرمایا''۔یہ غالباً حضرت نوح اور حضرت آدم علیہما السلام کے مابین کی شخصیت ہیں۔جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تفصیلی حالات ہمیں معلوم ہیں۔آپؑ سلیم الفطرت انسان تھے۔شروع ہی سے سوچ بچار اور غور وفکر کی خو تھی۔وہ سوچتے تھے کہ ان سورج' چاند اور ستاروں کا کیا مقام ہے جن کو پوجا جا رہا ہے! مظاہر فطرت اور ان کی تخلیق پر غور وفکر کرتے کرتے وہ توحید تک پہنچ گئے اور بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: ﴿اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾''میں نے یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور (اے پروردگار!) میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں''۔یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ہے۔اسی لیے ان کو کہا گیا: ﴿صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ یعنی آپ صدّیق نبی تھے۔آپ نبوت عطا ہونے سے پہلے مقامِ

صدّیقیت پر فائز ہیں' جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھنے والے صدّیق کہہ رہے ہیں ۔ ﴿یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ﴾ ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفتِ شہید سے متصف تھے۔ آپؑ بہت قوی الجثہ انسان تھے۔ ان کی طاقت کی کیفیت یہ تھی کہ قبطی کو بس ایک تھپڑ یا گھونسا رسید کر کے اس کی جان نکال دی۔ قرآن مجید میں اُن کے بارے میں سوچ بچار کی کوئی روداد نہیں آئی۔ وہ تورات کے وقت بیوی بچوں سمیت وطن واپس آ رہے تھے' جبکہ شدید سردی اور اندھیرا تھا' دُور سے کہیں آگ نظر آئی' خیال گزرا کہ شاید کوئی کٹیا ہے جہاں سے راستہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ گھر والوں سے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو' میں وہاں سے آگ کی چنگاری لے کر آتا ہوں تاکہ تم لوگ آگ تاپ سکو۔ (قرآن مجید میں ''بِشِهَابٍ قَبَسٍ'' یا ''جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ'' کے الفاظ ہیں) لیکن وہاں اللہ تعالیٰ نے نبوت سونپ دی۔ گویا گئے تھے آگ لینے کو' مل گئی نبوت۔ جبکہ کہاں محمد رسول اللہ ﷺ کا معاملہ ہے کہ آپؐ غارِ حرا کے اندر جا کر بیٹھتے اور کئی کئی دن متواتر غور و فکر کرتے۔ روایات میں الفاظ ملتے ہیں: ''کَانَ صِفَةُ تَعَبُّدِهٖ فِیْ غَارِ حِرَاءَ التَّفَکُّرُ وَالْاِعْتِبَارُ'' ''غارِ حراء میں آپ ﷺ کی بندگی غور و فکر اور عبرت حاصل کرنا تھی''۔ ان دونوں شخصیات کی سیرت کے مطالعہ سے ان کے مابین فرق نمایاں ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿رَسُوْلًا نَّبِیًّا﴾ ''آپ رسول نبی تھے''۔ یہاں رسول ''شہید'' کے معنی میں ہے۔ ان دونوں الفاظ (رسالت اور شہادت) میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ آپ علیہ السلام مزاجاً شہداء میں سے ہیں اور شہادت سے ہو کر نبوت تک پہنچے ہیں' یعنی صالحیت و شہادت سے ہو کر رسالت اور پھر نبوت۔ اسی لیے آپؑ کو ''رَسُوْلًا نَّبِیًّا'' کہا گیا ہے۔

یہی معاملہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بھی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں بھی کتبِ سیرت میں وہی واقعات ملتے ہیں جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہیں۔ دو مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے چل کر اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملنے آئے لیکن آپؑ شکار کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ اُن کے گھر میں دو دن مقیم رہنے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُن سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی نے ان کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کچھ شکوہ کیا کہ ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں' بڑی تنگی ہے' تو آپؑ

جاتے ہوئے کہہ گئے کہ جب میرے بیٹے آئیں تو ان سے کہہ دینا گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ (یعنی وہ بیوی کہ جو شا کی ہے وہ اس لائق نہیں ہے کہ تیرے گھر میں رہے) وہ واپس آئے تو انہیں بیوی نے پیغام دیا اور آپؑ نے اپنے والد محترم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیوی کو طلاق دے دی۔ تو حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اور حضرت اسماعیلؑ کی شخصیت کے مابین یہی نمایاں فرق ہے۔ اس لیے انہیں ﴿رَسُوۡلًا نَّبِیًّا﴾ کہا گیا ہے۔

قرآن مجید میں دو رسولوں کے لیے ﴿صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا﴾ آیا ہے اور دو کے لیے ﴿رَسُوۡلًا نَّبِیًّا﴾ لیکن ہمارے مفسرین کی بے توجہی کا عالم یہ ہے کہ کسی نے بھی ان مقامات پر تدبر کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں نے عہد حاضر کے ایک بہت بڑے مفسر سے سوال کیا کہ قرآن مجید میں دو رسولوں کے بارے میں ''صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا'' کے الفاظ آئے ہیں اور دو کے بارے میں ''رَسُوۡلًا نَّبِیًّا'' کے' اس میں کیا حکمت ہے؟ تو انہوں نے پوچھا واقعی کہیں ''رَسُوۡلًا نَّبِیًّا'' آیا ہے؟ میں نے سورۂ مریم کی آیات پڑھ کر سنائیں کہ یہ وہ مقامات ہیں۔ اس کا سبب دراصل قلتِ تدبر ہے کہ آدمی بغیر توجہ کیے گزر جاتا ہے کہ 'رسول' کے بعد 'نبی' کا کیا مطلب ہو سکتا ہے' جبکہ رسالت تو نبوت کے بعد ملتی ہے۔ تو یہاں درحقیقت رسول شہید کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مختلف شخصیتوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ ہماری اُمت میں ایک طرف حضرات ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما ہیں جو صحابہ کرام ﷺ میں سب سے چوٹی کے صدّیقین ہیں' دوسری طرف حضرات حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں جو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں شہداء کی بہت نمایاں مثال ہیں۔ جبکہ انبیاء و رسل میں سے حضرات ابراہیم اور ادریس علیہما السلام ''صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا'' ہیں اور موسیٰ اور اسماعیل علیہما السلام ''رَسُوۡلًا نَّبِیًّا'' ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کی قدرے وضاحت ضروری تھی۔

مقامِ صدّیقیت کے اجزائے ترکیبی

مقامِ صدّیقیت کے اجزائے ترکیبی کی قدرے وضاحت مفید مطلب ہے۔ مقامِ صدّیقیت کے یہ اجزائے ترکیبی سورۃ اللیل میں Simultaneous Contrast کے اعتبار سے بیان ہوئے ہیں۔ [1] اس سورۂ مبارکہ میں تین اوصافِ حمیدہ مقامِ صدّیقیت پر فائز شخصیت کے بیان ہوئے ہیں اور تین ہی اوصافِ رذیلہ اس کے برعکس شخصیت کے بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا:

(۱) میرا ''شہید مظلوم'' کے نام سے ایک کتابچہ موجود ہے جس میں بنیادی طور پر یہ مضامین آ گئے ہیں۔

﴿وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى ۝١ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝٢ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰٓى ۝٣ اِنَّ سَعۡيَكُمۡ لَشَتّٰى ۝٤﴾

''گواہ ہے رات جبکہ وہ ڈھانپ لیتی ہے' اور (گواہ ہے) دن جبکہ وہ روشن ہو جاتا ہے' اور وہ نر اور مادہ جو اللہ نے تخلیق کیا۔ یقیناً (اے لوگو!) تمہاری کوششیں بھی مختلف قسم کی ہیں''۔

پہلے تو اللہ تعالیٰ نے قسموں کی صورت میں استشہاد کیا ہے کہ اے لوگو! جیسے رات کی تاریکی اور دن کی روشنی میں اور نر اور مادہ (اور مَرد وعورت) میں فرق وتفاوت ہے' اسی طرح تمہاری کوششوں اور سعی و جہد میں اور تمہارے انجام میں بھی فرق وتفاوت ہے۔ آگے وہ صفات بیان کی جارہی ہیں:

﴿فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰى وَاتَّقٰى ۝٥ وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰى ۝٦ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡيُسۡرٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰى ۝٨ وَكَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰى ۝٩ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡعُسۡرٰى ۝١٠﴾

''تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور (اللہ کی نافرمانی سے) پرہیز کیا' اور بھلائی کو سچ مانا' اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا' اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے''۔

صدّیق کا پہلا وصف یہ ہے کہ اس میں عطا اور جُود وسخاوت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کی مشکلات کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے' بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ دوسرا وصف یہ ہے کہ اس کے اندر تقویٰ ہوتا ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتا' کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا' کسی پر دست درازی اور تعدی نہیں کرنا چاہتا۔ اور تیسرا وصف یہ کہ وہ ہر اچھی بات کی تصدیق کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس کے اندر تعصب نہیں ہوتا' عصبیت' ضد اور ہٹ دھرمی نہیں ہوتی۔ اس کے سامنے جب کوئی ایسی بات آتی ہے کہ اس کا دل گواہی دے کہ بات صحیح ہے تو اسے فوراً تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ دوسرے کی بات مان لینے سے اس کی جیت اور میری ہار ہو جائے گی۔ ہونا بھی یہی چاہیے کہ صحیح اور حق بات جس کی صحت پر دل بھی گواہی دے رہا ہو' فوراً قبول کر لی جائے۔ تو جس شخص میں یہ تین اوصاف جمع ہو جائیں تو وہ مقام صدّیقیت پر فائز ہے۔ جیسے اقبال نے کہا ؏
''یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان''۔ امام رازیؒ نے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ سورتِ صدّیق اکبر ہے' یعنی حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کی سورت ہے۔ اس لیے کہ اِس اُمت میں سب سے زیادہ متقی شخص وہی ہیں' جن میں یہ تینوں اوصاف بتمام وکمال جمع ہو گئے تھے۔
اس کے برعکس جو شخص اِن تینوں اوصاف سے خالی ہو وہ بدترین مخلوق ہے۔ اُس میں صفتِ عطا

کے برعکس بخل، اور تقویٰ کے برعکس اللہ سے استغناء اور بے پروائی ہوتی ہے۔ اسے حلال وحرام کی فکر ہی نہیں ہوتی۔ اس کا جہاں ہاتھ پڑتا ہے، حلال وحرام سے بے نیاز ہوکر، اسے حاصل کرلیتا ہے۔ جس کا چاہتا ہے استحصال اور حق تلفی کرتا ہے، جس پر چاہتا ہے ظلم کرتا ہے، جس کا چاہتا ہے دل دکھاتا ہے اور جس کی عزت پر چاہے حملہ کرتا ہے۔ یہ استغناء اور بے نیازی ہے۔ تیسرے درجے میں وہ صحیح وعمدہ بات اور سچائی وصداقت کی تکذیب کرتا ہے۔ اس شخص کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ ''تو ہم رفتہ رفتہ اسے العُسریٰ (تنگی) تک پہنچا دیں گے''۔ یعنی جہنم تک، جو بڑی تنگی اور سختی کی جگہ ہے۔

صدّیقۂ کبریٰ کون؟

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ چونکہ نبوت عورتوں کو نہیں دی گئی —— اس لیے کہ یہ بہت بھاری ذمہ داری ہے —— لہٰذا خواتین کے لیے سب سے اونچا مقام صدّیقیت ہے۔ حضرت مریم سلامٌ علیہا کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾ ''ان (حضرت عیسیٰؑ) کی والدہ (حضرت مریمؑ) صِدّیقہ تھیں''۔

سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا اِس اُمت میں بھی کوئی صدّیقہ ہے؟ دیکھئے عام طور پر تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ لفظ ''صِدّیقہ'' استعمال ہوتا ہے، لیکن درحقیقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عمر کے اعتبار سے دوسری نسل سے تعلق رکھتی ہیں، اگرچہ آپؓ حضور ﷺ کی زوجۂ محترمہ ہونے کی حیثیت سے اُمّ المومنین ہیں۔ جیسے حضرت علی اور ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے مراتب میں فرق وتفاوت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضوان اللہ علیہم سے تقابل کرنا درحقیقت قیاس مع الفارق کے مترادف ہے۔ ان کی تو نوعیت ہی مختلف ہے۔ حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے تقریباً ہم عمر لوگوں میں سے ہیں۔ حضرت ابوبکر آپ ﷺ سے دو اڑھائی برس چھوٹے ہیں، حضرت عمر چھ برس اور حضرت عثمان پانچ برس چھوٹے ہیں۔ یہ تو آپؐ کے برابر کے ہیں اور آپ ﷺ کے ساتھی اور دست وبازو ہیں۔ کسی قبیلے یا قوم کے اندر ایسے لوگ ''مَــــلَأ'' کہلاتے ہیں اور پٹھانوں کے ہاں ''مشران'' کہلاتے ہیں۔ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو دوسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور حضور ﷺ کے مقابلے عمر کا بہت فرق

وتفاوت ہے' اگرچہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بہت اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔ حضورﷺ کے بعد صحابہ کرام میں ambivert حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہے۔ تو جامعیت کے اعتبار سے اُن کا مقام اور ہے' لیکن کمیت کے اعتبار سے حضرت علیؓ خلفاء ثلاثہ کے آس پاس بھی نہیں آتے' اگرچہ ترتیب میں چوتھے ہیں۔ تو بالکل اسی طرح کا معاملہ حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ ان کا مقام بہت بلند ہے' فقہاء صحابہ میں سے ہیں' حضورﷺ کی محبوب زوجۂ محترمہ ہیں' لیکن صدّیقیتِ کبریٰ کے مقام پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا فائز ہیں۔ اسی لیے ان کے نام کے ساتھ لفظ ''کبریٰ'' لگا ہوا ہے۔ جس طرح حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے حضورﷺ کے قدموں میں اپنی ساری دولت نچھاور کر دی اسی طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی اپنی پوری دولت حضورﷺ کے قدموں میں ڈال دی کہ جس طرح چاہیں اور جہاں چاہیں استعمال کیجیے۔ حضور اکرمﷺ کی تصدیق میں جیسے حضرت ابوبکرؓ نے ایک لحظہ کا توقف بھی نہیں کیا ایسے ہی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے بھی لحظہ بھر کے توقف کے بغیر آپؐ کی تصدیق کی۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ حضورﷺ پر پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکرؓ ہیں یا حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ! میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں۔ اس لیے کہ غارِ حرا سے اتر کر حضورﷺ پر جو خوف کی کیفیت تھی اور لرزہ طاری تھا' تو یہ پہلا تجربہ آپؐ نے اپنی زوجہ محترمہ کو ہی بتایا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے جا کر پہلے اپنے کسی دوست یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بتایا ہو۔ بلکہ آپؐ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ کہتے ہوئے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور انہوں نے تسلی دی کہ نہیں' اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ تو درحقیقت اُمت کی عورتوں میں سب سے اونچا مقام حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کی ہم پلہ شخصیت وہی ہیں۔

سورۃ الحدید کے چوتھے حصے میں جو سلوکِ قرآنی بیان ہوا ہے' اس کی وضاحت کے لیے یہ ڈائیگرام ملاحظہ کیجیے۔ صالحین' صدّیقین' شہداء اور نبوت و رسالت جیسی اصطلاحات پر اگرچہ کافی گفتگو ہو چکی ہے' لیکن میں چاہتا ہوں کہ بات مزید واضح ہو جائے' اس لیے کہ یہ وہ مضامین ہیں کہ لوگوں نے شاذ ہی ان سے بحث کی ہے: (ڈایاگرام اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

سلوکِ قرآنی

سورۂ حدید کی آیات ۱۶تا۱۹ کی روشنی میں!

نبوّت

رِسالت

صدیقاً نبیّاً

رسولؐ نبیؐ

شہادت

صِدّیقیت

بھاگ دوڑ اور سیر وشکار کے عادی
Extroverts

غور و فکر اور سوچ بچار کے عادی (Introverts)
اور زندہ اخلاقی حس کے حامل لوگ

آیت ۱۸: کثرتِ صدقہ وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے

دل سے دنیا اور مال — صَالِحین — کی محبت کا ازالہ

نتیجہ: اصلاح کا ارادہ — اور عمل کا عزمِ مصمّم!

مُرید

آیت ۱۷: اصلاحِ حال اور آمادۂ عمل ہونے کی ترغیب اور حوصلہ افزائی

آیت ۱۶: نسلی، روایتی، غافل اور بے عمل مسلمانوں کو تنبیہہ وملامت

خاص طور پر سابقہ اُمتِ مسلمہ کے انجام سے سبق حاصل کرنے کی ترغیب

اس چارٹ کو سمجھنے کے لیے نیچے سے اوپر چلیے ۔ آیت نمبر ۱۶ ہے:

﴿ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾

اس آیت کا حاصل ہے: ''نسلی، روایتی، غافل اور بے عمل مسلمانوں کو تنبیہہ اور ملامت ۔ خاص طور پر سابقہ اُمتِ مسلمہ کے انجام سے سبق حاصل کرنے کی ترغیب''۔

پھر اگر اپنے باطن میں جھانکو اور محسوس کرو کہ حقیقتِ ایمان تو ہمیں حاصل نہیں تو مایوس نہ ہو جاؤ ۔ ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ گویا اس آیت کا حاصل ہے: ''اصلاحِ حال اور آمادۂ عمل ہونے کی ترغیب اور حوصلہ افزائی''۔ اس میں حوصلہ افزائی بھی ہے، ترغیب بھی ہے، تشویق بھی ہے کہ کمر ہمت کسو، ارادہ کرو!

اس کا جو نتیجہ ہے وہ اب تیسری لائن میں ہے: ''اصلاحِ حال کا ارادہ اور عمل کا عزمِ مصمم''۔ ارادہ کے بعد بریکٹ میں لفظ ''مُرِیْد'' لکھا ہے ۔ اصل میں یہ اَرَادَ، یُرِیْدُ، اِرَادَةً (باب افعال) سے اسم الفاعل ہے، یعنی ''ارادہ کر لینے والا''۔ گویا کہ ان دونوں آیات (۱۶، ۱۷) کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص کے اندر ارادہ اور عمل کا عزمِ مصمم پیدا ہو جائے ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ جو حضرات بھی اس حلقۂ درس میں شرکت فرما رہے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت تک پہنچا دیا ہو اور وہ ایک عزمِ مصمم کر لیں کہ دین کے جو بھی تقاضے اور مطالبات ہیں وہ ان کو ادا کریں گے ۔

اب اس سے اوپر آیئے! آیت نمبر ۱۸ کے الفاظ ہیں: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ﴿۱۸﴾﴾ اس آیت کا حاصل ہے: ''کثرتِ صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے دل سے دنیا اور مال کی محبت کا ازالہ''۔ یہی نجاست ہے، اور اس کو اگر دور نہیں کریں گے تو قربِ الٰہی کی منازل طے نہیں ہو سکیں گی ۔ اسی کو میں تعبیر کرتا ہوں کہ یہ بریک ہے، اگر یہ نہیں کھلے گا تو آگے ترقی اور پیش رفت نہیں ہو سکتی ۔

جو لوگ اس پر کار بند ہو جائیں وہ گویا زمرۂ ''صالحین'' میں شامل ہو گئے۔ یہ صالحین وہ لفظ ہے کہ جو سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں گویا base line کا کام دیتا ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؀﴾

یعنی جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت پر کار بند ہو گیا اسے معنوی معیت اور رفاقت حاصل ہو جائے گی ان کی جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے' یعنی انبیاء' صدّیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں! تو جو شخص ارادہ کر چکا ہو اور ارادہ کر کے اپنی کشت قلب میں انفاق اور صدقہ و خیرات کا ہل چلا لے وہ صالحین میں شامل ہو جائے گا۔ اگر ارادہ کرنے کے باوجود معطل رہ گیا' عملاً کوئی پیش قدمی نہیں کی تو اُس کا وہ مقام نہیں ہے۔ اسی لیے چوتھی لائن میں علیحدہ سے واضح کیا ہے کہ صالحین وہ ہیں کہ جو کثرت صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے دل سے دنیا اور مال کی محبت کا ازالہ کریں۔

اب اس سے اوپر دو شاخیں بنائی گئی ہیں۔ یہ وہ دو اَقسام ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی عظیم اکثریت کو پیدا کیا ہے۔ تیسری قسم یعنی Ambiverts بہت شاذ ہوتے ہیں۔ لوگ عام طور پر یا تو بیرون بین (Extroverts) ہوتے ہیں یا دروں بین (Introverts)۔ داہنی طرف Introverts ہیں: ''غور و فکر اور سوچ و بچار کے عادی' اور زندہ اخلاقی حس کے حامل لوگ''۔ ان کے اندر سلامتیٔ فکر بھی ہے' سلامتیٔ عقل بھی ہے اور سلامتیٔ فطرت بھی ہے۔ ان کی اخلاقی حس بھی زندہ ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کا امتیاز تو فطرتِ انسانی میں ودیعت کر دیا ہے۔ ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو مرتبۂ ''صِدّیقیت'' تک رسائی حاصل ہو جائے گی۔ یہ انبیاء سے نیچے' سب سے اونچا مقام ہے جس تک انسان رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری طرف دوسرے قسم کے لوگ ہیں: ''بھاگ دوڑ اور سیر و شکار کے عادی لوگ''۔ یہ Extroverts ہیں۔ انبیاء کرامؑ میں سے آپ حضرت موسٰی اور حضرت اسماعیل (علیہما الصلوٰۃ

والسلام) کو ذہن میں رکھیے اور صحابۂ کرام میں سے حضرات عمر اور حمزہ (رضی اللہ عنہما) کو سامنے رکھئے۔ ان کا یہی مزاج تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو پہلوان قسم کے آدمی تھے' اور انہیں غور و فکر اور سوچ بچار سے طبعی مناسبت بھی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آبائی حمیتیں اور آبائی عصبیتیں ان کے دل میں بڑی گہری اتری ہوئی تھیں۔ اسی لیے مسلمانوں سے دشمنی تھی' حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی سخت ناراضگی تھی' یہاں تک کہ انتہائی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب تو میں چراغِ نبوت کو گل کر کے ہی گھر واپس آؤں گا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حالانکہ قرابت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ترین ہیں' نہایت محبت بھی کرتے ہیں' عزیز رکھتے ہیں' محبت ہی کے جوش مارنے کی وجہ سے تو ایمان لائے ہیں' لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو چھ برس بیت گئے اور انہیں اپنے سیر و شکار سے فرصت ہی نہیں ہے۔ ادھر توجہ ہی نہیں ہے۔ تو یہ ہیں Extroverts کی مثالیں۔

دوسری طرف Introverts کی مثالیں دیکھئے۔ جیسے کہ میں نے عرض کیا' قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاملہ غور و فکر اور سوچ بچار کے حوالے سے ممتاز نظر آتا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمین پر غور و فکر ہو رہا ہے' ہستیٔ باری تعالیٰ کے بارے میں سوچ بچار ہے۔ اور پھر سلیم الفطرت ہیں۔ اس ضمن میں دوسری جو مثال قرآن مجید میں نمایاں ہے وہ حضرت ادریس علیہ السلام کی ہے۔ جبکہ صحابۂ کرام میں سے حضرت ابوبکر الصدیق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما اور خواتین میں سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' یہ وہ لوگ ہیں جو صدّیقیت کے مزاج کے حامل ہیں۔ چنانچہ مرتبہ ''صالحیت'' کے بعد جو ارتقاء ہوگا' انسان سلوک کی منازل میں آگے بڑھے گا' ترقی ہوگی تو افتادِ طبع کے اعتبار سے یہ دو لائنیں علیحدہ ہو جائیں گی۔ یہ نسبت واضح ہوگئی اس آیت کی طرف ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾﴾

اس کے بعد اگرچہ یہاں لفظ ''ثُمَّ'' موجود نہیں ہے' لیکن مَیں ''القرآنُ یفسِّر بعضُه بعضًا'' کے اصول پر سورۃ البلد کے حوالے سے بتا چکا ہوں کہ آیت ۱۸ اور آیت ۱۹ کے درمیان ''ثُمَّ'' کو محذوف سمجھئے' مقدر مانیے! ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ﴾ یعنی جب یہ کام (صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ) کر کے لوگ آگے بڑھیں گے' ان کے دل سے دنیا اور مال کی محبت کا ازالہ ہو جائے گا' بریک کھل جائے گا' ترقی ہوگی' ارتقاء ہوگا'

جو اعلیٰ معیارات اور مقامات ہیں، ان تک رسائی ہو گی تو انسان یا صدّیقین کے مقام تک پہنچ سکے گا یا شہداء کے مقام تک۔

اس سے اوپر کا جو معاملہ ہے وہ میں نے مزید واضح کیا ہے کہ نبوت اوپر ہے، رسالت نیچے ہے، کیونکہ میں ان لوگوں سے متفق ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت کا رتبہ رسالت سے اونچا ہے، بایں معنی کہ نبوت درحقیقت مقامِ عروج میں اور رسالت مقامِ نزول میں ہے۔ نبوت کا رُخ اللہ کی طرف ہے اور رسالت کا رُخ بندوں کی طرف ہے۔ اس اعتبار سے میں نے نبوت کو رسالت سے اوپر رکھا ہے۔ لیکن اصل میں صدّیقیت کی اصطلاح رسالت ہی کے لفظ سے واضح ہوتی ہے۔ یعنی جیسے ہی رسول کی دعوت کسی صدّیق کا مزاج رکھنے والے شخص کے کان میں پہنچے گی وہ فوراً لبیک کہے گا، اسے کوئی دیر نہیں لگے گی، اس لیے کہ یہ اُس کی سلامتیٔ عقل اور سلامتیٔ فطرت کا تقاضا ہے۔ وہ خود پہلے سے گویا تیار ہے۔ میں تو اِس کی مثال دیا کرتا ہوں جیسے کوئی شخص وضو کر کے گھر میں بیٹھا ہو اور اذان کی آواز آئے تو یقیناً وہ مسجد کا رُخ کرے گا۔ صدّیقین کی شخصیت میں بالکل اس طرح کی آمادگی پہلے سے موجود ہوتی ہے۔

دوسری قسم کے لوگوں یعنی شہداء کو اگرچہ قبولِ حق میں دیر تو لگ جاتی ہے، جیسے حضرات عمر اور حمزہ رضی اللہ عنہما کو بھی چھ سال لگ گئے، لیکن چونکہ وہ فعال اور طاقتور قسم کے لوگ تھے، ان کی ہیبت تھی، لہٰذا ان سے مسلمانوں کو تقویت حاصل ہوئی۔ حالانکہ اس سے پہلے صدّیقین ہی کی جماعت تھی جو حضور ﷺ پر ایمان لائی، لیکن شہداء اپنی فعالیت کی وجہ سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اپنی شخصیت کے ایک خاص مزاج کے اعتبار سے وہ قوی ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے ایمان لانے کے بعد مسلمان دھڑلے کے ساتھ کھلم کھلا حرم میں نمازیں پڑھنے لگے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم جب ہجرت کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو چھپ کر نکلتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو، خواہ مخواہ کوئی مزاحم ہو گا یا کسی اور طرح کی مشکل پیش آ جائے گی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان یہ ہے کہ جب ہجرت کے لیے نکلے تو سب کے سامنے حرم میں آ کر دو رکعت نماز پڑھی اور اعلان کیا کہ میں ہجرت کر کے جا رہا ہوں اور جس کا ارادہ ہو کہ اس کی ماں اسے روئے وہ آ جائے اور میرا راستہ روک لے! یہ الفاظ کہہ کر ڈنکے کی چوٹ ہجرت کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔ تو رسالت کا جو اصل منصب ہے یعنی دین کو قائم کرنے کی سعی و جدوجہد، اس میں یہ لوگ زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں اور آگے نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شجاعت غزوۂ بدر میں ظاہر ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں سننے میں نہیں آئے گا کہ کسی کے

ساتھ اس طرح کا دو بدو مقابلہ ہوا ہو۔ اگرچہ وہ بات تو آتی ہے کہ آپؓ کے بیٹے عبدالرحمٰنؓ نے اسلام لانے کے بعد جب یہ کہا کہ ابا جان! آپ غزوۂ بدر میں میری زد میں آ گئے تھے' لیکن میں نے آپ کی رعایت کی' تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بیٹے! تم نے یہ اس لیے کیا کہ تم باطل کے لیے جنگ کر رہے تھے' خدا کی قسم! اگر کہیں تم میری زد میں آ گئے ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا۔ صدّیقیت کا مقامِ نبوت سے قریب تر ہوتا ہے۔ چنانچہ جو مقام و مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس سے بالکل ملحق مقام و مرتبہ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اس طرح اب سورۃ النساء کی آیت ۶۹ ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾﴾ آپ کے سامنے پورے طور پر واضح ہو گئی۔

البتہ اس ضمن میں دو باتیں ابھی اور سمجھ لیجیے! ایک یہ کہ میں نے dotted line کے ساتھ جو نسبت ظاہر کی ہے وہ ہے ''صِدِّيْقًا نَّبِيًّا'' اور ''رَسُوْلًا نَّبِيًّا''۔ قرآن حکیم میں مختلف رسولوں کے لیے یہ دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ انبیاء و رُسل کے انتخاب کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾﴾ (آل عمران) ''اللہ نے (اپنی رسالت کے لیے) پسند فرما لیا' آدمؑ کو اور نوحؑ کو اور آلِ ابراہیمؑ کو اور آلِ عمران کو' تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر''۔ رسالت اور نبوت کے لیے یہ انتخاب ظاہر ہے کہ انسانوں میں سے ہی ہوا ہے۔ اور انسانوں میں اس نے عام طور پر یہ دو مزاج بنائے ہیں' ایک وہ مزاج جس کی مناسبت صدّیقیت کے ساتھ ہے اور دوسرے وہ مزاج جس کی مناسبت شہادت کے ساتھ ہے۔ تو حضرت ابراہیم اور ادریس (علیہما الصلوٰۃ والسلام) دونوں کے بارے میں قرآن مجید میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿﴾﴾ (مریم: ۴۱ و ۵۶) اور یہ نسبت مَیں نبوت کی طرف قائم کر رہا ہوں' رسالت کی طرف نہیں۔ رسول کی دعوت کے قبول کرنے میں صدّیقین اور شہداء میں فرق ہو گا۔ داعی کی حیثیت سے تو رسول سامنے آئے گا' لیکن داعی کا معاملہ رسالت کے ساتھ متعلق ہے۔ اور رسول کی دعوت کے ردّعمل کے اعتبار سے فرق یہ ہو گا کہ صدّیق کو قبول کرنے میں دیر لگے گی ہی نہیں' وہ تو جیسے پہلے ہی سے منتظر تھے۔ جبکہ شہداء کو وقت لگے گا' دیر لگے گی۔ اس لیے کہ ان کی توجہ ہی ادھر نہیں ہے —— لیکن یہ کہ صدّیقیت اور شہادت کی نبوت کے ساتھ نسبت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جن انسانوں کو شرفِ نبوت کے لیے چنا ہے تو ظاہر بات ہے یا تو وہ صدّیقی مزاج کے حامل تھے یا شہیدی مزاج کے حامل تھے۔ تو

دوسروں کو کہا گیا ﴿رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴾ (مریم:۵۱و۵۴) کیونکہ شہادت کی نسبت رسالت کے ساتھ زیادہ ہے۔اسی لیے ڈائیگرام میں ''رَسُوۡلًا نَّبِیًّا '' والی dotted line رسالت تک پہنچائی گئی ہے۔اور پھر رسالت سے آگے نبوت کا مرتبہ ہے۔گویا شہیدی مزاج کے حامل مرتبۂ رسالت سے ہو کر مرتبۂ نبوت پر فائز ہوئے' جبکہ صدّیقین براہِ راست نبوت سے سرفراز کیے گئے۔

ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ جو بھی اوپر والے درجے پر فائز ہے اس میں نیچے والے کے تمام اوصاف بتمام وکمال لازماً موجود ہیں۔صدّیق کا اپنا مزاج تو وہ ہے جو میں بیان کر چکا ہوں' لیکن عزم وارادہ کے اعتبار سے اس کے اندر شہداء والی پوری شخصیت بھی موجود ہے۔اس کا ظہور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا ہے۔ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جو مزاج سامنے تھا اس کے اعتبار سے آپ نہایت رقیق القلب اور نحیف الجثہ انسان تھے۔وہ اس طرح کے انسان محسوس ہوتے ہی نہیں تھے جیسے بعد میں ظاہر ہوئے۔جب حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر خلافت کی ذمہ داری کا بوجھ آیا تو حالات نہایت critical اور مخدوش تھے۔اتنی بڑی بغاوت برپا ہوگئی تھی کہ دارالاسلام دو شہروں تک محدود ہو گیا تھا۔﴿ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ﴾ کی کیفیت تھی۔متعدد مدعیانِ نبوت کھڑے ہو گئے تھے اور لاکھوں آدمی ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ مسیلمہ کذاب کے ساتھ لاکھوں آدمی تھے۔جنگ یمامہ میں کئی سو حفاظ شہید ہو گئے تھے۔تبھی تو حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کو تشویش ہوئی کہ اگر اسی طرح حفاظ صحابہ کرام شہید ہوتے رہے تو کہیں قرآن مجید گم نہ ہو جائے' لہٰذا اسے کتابی شکل میں مرتب کر لینا چاہیے۔دوسری طرف مانعین زکوٰۃ کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر revolution کے بعد جو ایک counter revolution کا مرحلہ آیا کرتا ہے وہ انقلابِ محمدیؐ کے بعد بھی آیا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں انقلاب کی تکمیل ہوگئی۔انقلاب کی تکمیل کے مرحلے پر مخالف قوتیں جب دیکھتی ہیں کہ اب ہم بے بس ہو چکے ہیں تو پھر وہ دبک جایا کرتی ہیں اور منتظر رہتی ہیں کہ پھر کوئی موقع آئے گا تو ہم کوئی اقدام کریں گے۔چنانچہ باطل قوتیں اُس وقت دبک گئیں۔اس کے بعد جیسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو ان باطل قوتوں نے یک دم سر اُٹھایا۔اُس وقت مسلمان صدمے اور غم سے نڈھال تھے اور ان کا مورال کچھ نہ کچھ کم ہو گیا تھا۔اس وقت یکا یک فتنوں نے سر اٹھایا۔ایک طرف مانعینِ زکوٰۃ کھڑے ہو گئے' دوسری

طرف مدعیانِ نبوت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسلامی ریاست تو یوں سمجھئے تقریباً مکہ اور مدینہ تک محدود ہوکر رہ گئی۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ اسلامی ریاست کو reclaim کیا ہے اور یہ کام فولادی عزم اور کوہ ہمالیہ جیسی عزیمت کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ ذرا مصلحت کو پیشِ نظر رکھیے۔ آپ یہ جو پے بہ پے محاذ کھولتے جا رہے ہیں یہ قرین مصلحت نہیں۔ آپؓ نے جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کو بھی نہیں روکا۔ لوگوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا ہے' اب یہ لشکر نہ بھیجا جائے۔ لیکن آپؓ نے فرمایا: جس لشکر کی تیاری محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو مَیں اس کو کیسے روک دوں؟ چنانچہ جیشِ اسامہؓ روانہ کر دیا گیا۔ دوسری طرف جو مدعیانِ نبوت کھڑے ہو گئے ان کا ارتداد تو بالکل الم نشرح تھا' لہٰذا ان کے خلاف تو جنگ کرنی ہی تھی' اس میں تو کسی مشاورت کی ضرورت ہی نہیں تھی' لہٰذا اس کا محاذ بھی کھول دیا گیا۔

اس کے بعد جب مانعین زکوٰۃ کا مسئلہ سامنے آیا کہ نہ تو انہوں نے کسی نئی نبوت کا اقرار کیا اور نہ ارکانِ اسلام کا انکار کر رہے تھے۔ وہ نماز کا انکار بھی نہیں کر رہے تھے اور زکوٰۃ کا بھی انکار نہیں کر رہے تھے' بلکہ صرف یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اپنی زکوٰۃ حکومت کو نہیں دیں گے' ہم اسے اپنے طور پر تقسیم کریں گے جس طرح چاہیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا کہ آپ ان کے معاملے میں کچھ نرمی برتیں' لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُس وقت اُن کو بھی ڈانٹ پلائی کہ عمر! تم دورِ جاہلیت میں تو بہت سخت تھے' اسلام میں آ کر نرم ہو گئے ہو؟ خدا کی قسم! اگر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ اُن کو باندھنے والی رسیاں بھی دیتے تھے تو اب اگر یہ اونٹ دینے کو تیار ہوں اور رسیاں دینے سے انکار کریں تب بھی مَیں ان سے جنگ کروں گا۔ اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟ ''کیا دین کے اندر ترمیم ہو جائے گی جبکہ میں ابھی زندہ ہوں؟'' تو یہ عزیمت ہے۔ اور پھر یہ کہ واقعتاً اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عزم' ولولے اور حوصلے کا نتیجہ بھی ظاہر کر دیا۔ آپؓ کا زمانۂ خلافت پورے اڑھائی برس بھی نہیں' بلکہ دو سال چار ماہ ہے۔ اس قلیل عرصے میں ان تمام انقلاب مخالف قوتوں (counter revolutionary movements) کو ختم کیا اور میدان بالکل صاف کر کے حضرت عمرؓ کے حوالے کیا۔ اب چونکہ اندرونِ عرب تو ہر طرح کے فتنوں کا قلع قمع ہو چکا تھا' لہٰذا دورِ فاروقی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فوجیں مشرق' مغرب اور شمال کی طرف نکلیں اور دس برس کے اندر اندر کرۂ ارضی کا بہت بڑا حصہ پرچم اسلام کے زیرنگیں آ گیا۔ تو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جو بھی بالاتر طبقہ ہے اس کے اندر نیچے

والے طبقے کے سارے اوصاف موجود ہوتے ہیں' اگرچہ dormant رہتے ہوں۔ وہ ظاہر تب ہی ہوں گے جب ایسا کوئی مرحلہ آئے گا' جب کوئی محاذ درپیش ہوگا۔ تو اِن حقائق کو اگر آپ سامنے رکھیں تو نبوت و رسالت' صدّیقیت' شہادت اور صالحیت کی درجہ بندی سمجھ میں آسکے گی۔

جہاں تک بعض صوفیاء کے اس قول کا تعلق ہے کہ نسبتِ ولایت افضل ہے نسبتِ نبوت سے' اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی اور رسول یعنی جس شخصیت میں نبوت اور رسالت دونوں نسبتیں جمع ہیں اس کی نسبتِ نبوت نسبتِ رسالت سے افضل ہے۔ اب نسبت نبوت کو اصل مناسبت نسبت ولایت کے ساتھ ہے اور نسبت رسالت کو اصل مناسبت نسبت شہادت کے ساتھ ہے۔ تو نبی کی جو ولایت ہے وہ نبی کی رسالت سے افضل ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہ تصور کہ کوئی ولی جو غیر نبی ہے وہ کسی نبی سے افضل ہوسکتا ہے' یہ ایک غلط اور باطل تصور ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

سورۃ الحدید کی زیر مطالعہ آیت نمبر ۱۹ کا کچھ حصہ رہ گیا تھا' اسے ہم مکمل کر لیتے ہیں۔ فرمایا:
﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ﴾ ''عِنْدَ رَبِّهِمْ '' یہاں ''اَلشُّهَدَآءُ'' کے بعد آیا ہے۔ یہ صرف ''اَلشُّهَدَآءُ'' کے لیے بھی ہوسکتا ہے اور ''اَلصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ'' کے لیے بھی۔ ''عِنْدَ رَبِّهِمْ '' کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ''اللہ کے نزدیک'' یا ''اللہ کے پاس''۔ چنانچہ پہلا ترجمہ ہوگا ''وہ اپنے ربّ کے نزدیک صدّیق اور شہید ہیں''۔ جیسے ہم کہتے ہیں: میرے نزدیک اس کا مقام یہ ہے۔ تو یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے نزدیک مراتب صدّیقیت اور مراتب شہادت پر فائز ہوں گے۔ اس طرح ''عِنْدَ رَبِّهِمْ '' کا اطلاق دونوں پر ہوگا۔ لیکن میرے نزدیک دوسری بات زیادہ صحیح ہے کہ ''عِنْدَ رَبِّهِمْ '' کا اطلاق صرف ''اَلشُّهَدَآءُ'' پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ گواہی اصل میں اللہ کے ہاں جا کر دینی ہے' جیسا کہ میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔ دنیا میں جب کوئی اللہ کا بندہ دعوت دیتا ہے اور دعوت اس حد تک پہنچا دیتا ہے کہ اتمامِ حجت ہو جائے تو اب وہی ہوگا جو اللہ کی عدالت میں گواہِ استغاثہ کی حیثیت سے کھڑا ہوگا اور سب سے پہلے وہ testify کرے گا کہ پروردگار! تیرا پیغام جو میرے پاس آیا تھا میں نے ان تک پہنچا دیا تھا۔ تو ''اَلشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ '' کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ عدالتِ خداوندی میں' عدالتِ اُخروی میں' اللہ کے ہاں محاسبۂ اُخروی کے وقت گواہ ہوں گے' اللہ کی طرف سے حجت قائم کرنے والے ہوں گے۔ اسے ہمارے ہاں کی عدالتی زبان میں گواہِ استغاثہ یا سرکاری گواہ (prosecution witness) کہتے

ہیں۔ استغاثہ کے وکلاء بھی ہوتے ہیں‘ انسپکٹرز بھی ہوتے ہیں اور گواہ بھی۔ فوجداری مقدمات میں کوئی ملزم جب عدالت میں پیش ہوتا ہے تو پہلے اس پر فردِ جرم عائد کی جاتی ہے اور یہ چارج شیٹ اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہے‘ اس لیے کہ اس نے ریاست کے قانون کو توڑا ہے۔ تو اس حوالے سے اللہ کے ہاں اِن ''شہداء'' کی حیثیت استغاثہ کے گواہ کی ہوگی۔ انبیاء ورُسل وہاں پر شہادت دینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔

اب دیکھئے‘ صدّیقیت تو شہادت سے بلند تر رتبہ ہے‘ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ جو صدّیق ہے وہ دعوت نہیں دے گا! چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر عشرۂ مبشرہ میں سے چھ حضرات ایمان لائے ہیں۔ تو اوپر والے میں نیچے والے کے سارے اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ تو اس اعتبار سے اس آیت کا ایک ایک لفظ اُجاگر ہو کر ہمارے سامنے آ گیا ہے اور ہم نے دیکھا کہ یہاں کوئی لفظ بھی ایسے ہی نہیں آ گیا۔ قرآن حکیم میں برائے بیت یا برائے وزن کوئی شے نہیں ہے۔ ہر شے نہایت معنی خیز ہے اور اپنی جگہ پر ہیرے کی طرح جڑی ہوئی ہے۔ ہر حرف اپنی جگہ پر اِس کے حسنِ معنوی کے اندر اضافہ کر رہا ہے۔

صدّیقیت اور شہادت کے ضمن میں ایک بات مزید عرض کر رہا ہوں کہ اگرچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صدّیقین میں سے ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شہداء میں سے ہیں‘ لیکن جب ہم مراتب شمار کرتے ہیں تو حضرت ابوبکرؓ کے بعد عمرؓ ہیں اور پھر عثمانؓ ہیں۔ اس طرح ذہنوں میں ایک اشکال پیدا ہوسکتا ہے‘ تو اس کو بھی سمجھ لیجیے کہ اپنی جگہ پر تو صدّیقیت بلند تر مقام ہے مرتبہ شہادت سے‘ لیکن کمیت (quantity) کا مسئلہ اور ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ سونا چاندی کی نسبت زیادہ قیمتی دھات ہے‘ لیکن فرض کیجیے سونا چند تولے ہے اور چاندی منوں کے حساب سے رکھی ہوئی ہے تو ظاہر بات ہے منوں چاندی قیمت کے اعتبار سے چند تولے سونے سے بڑھ جائے گی‘ اگرچہ اپنی جگہ پر یہی کہا جائے گا کہ سونا‘ چاندی سے قیمتی ہے۔ یہ تمثیل بھی اس حدیث پر مبنی ہے کہ حضور ﷺ نے خود فرمایا ہے کہ: ((اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ)) یعنی ''انسانوں کا معاملہ بھی معدنیات کی طرح ہے''۔ کوئی معدنیات زیادہ قیمتی اور کوئی کم قیمتی ہوتی ہیں۔ ایک روایت میں آگے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ((کَمَعَادِنِ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ)) ''جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں''۔ سونا‘ چاندی‘ تانبا اور لوہا سب معدنیات ہی ہیں‘ لیکن ان کی اپنی اپنی حیثیت ہے۔ فرمایا: ((خِیَارُھُمْ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُھُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقُھُوْا)) (متفق علیہ) ''ان میں سے جو لوگ (اسلام سے قبل) جاہلیت میں بہتر تھے وہی پھر

اسلام لا کر بھی بہتر ہوئے' جب انہوں نے دین کی سمجھ حاصل کر لی''۔

یوں سمجھئے کہ سونا جب آپ زمین سے نکالتے ہیں تو یہ کچ دھات (ore) کی صورت میں ہوتا ہے' اس میں کچھ کثافتیں ملی ہوئی ہوتی ہیں ۔ اسے صاف کرتے ہیں تو وہ سونا بن جاتا ہے۔ اسی طرح چاندی کی ore ہے' اس کے اندر بھی impurities ہیں' صاف کریں گے تو وہ چاندی بنے گی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ چاندی کی کچ دھات کو صاف کریں تو وہ سونا بن جائے۔ چاندی کی ore سے تو چاندی ہی وجود میں آئے گی۔ اسے آپ جتنا زیادہ صاف کریں گے اسی قدر خالص چاندی آپ کو مل جائے گی۔ اسی طرح سونے کی ore ہے تو خوب صاف کرنے سے آپ کو بہت عمدہ زرِ خالص عیار مل جائے گا۔ لیکن جب مقدار کا پہلو آ جائے گا تو چاندی کی زیادہ مقدار سونے کی قلیل مقدار سے زیادہ قیمتی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہی معاملہ صدّیقیت اور شہادت کا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی جگہ پر مزاجاً شہید تھے' لیکن پھر اس کے اندر انہوں نے جو مقام حاصل کیا ہے اس quantitative عنصر کے اعتبار سے ان کا رتبہ بحیثیت مجموعی صحابہؓ کی جماعت کے اندر تمام صدّیقین سے بڑھ گیا' سوائے صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ کے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے افضل ترین ہونے میں کوئی شک نہیں' **افضلُ البشرِ بعدَ الانبیاء بالتحقیق ابوبکرٍ الصِّدّیق**' دوسرے نمبر پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ' تیسرے نمبر پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور چوتھے نمبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اگرچہ جہاں تک مزاج کا تعلق ہے حضرت علیؓ مزاجاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج سے قریب ترین ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ambiverts بہت شاذ ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ میں آپ دیکھئے ایک طرف ادب ہے' فصاحت و بلاغت ہے' چوٹی کے شاعر ہیں اور آپؓ نے عربی گرامر کے اصول وقواعد معین کیے ہیں۔ ''نہج البلاغۃ'' میں آپؓ کے خطبات دیکھئے کہ فصاحت و بلاغت کا کیا عالم ہے! اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں بہت سی چیزیں جھوٹی بھی شامل کر دی گئی ہیں' لیکن حضرت علیؓ کی فصاحت و بلاغت اور علم سے کون انکار کر سکتا ہے؟ آپؓ کا شمار چوٹی کے فقہاء صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف آپؓ مردِ میدان ہیں' تلوار کے دھنی ہیں۔ غزوۂ احزاب میں جب عمرو بن عبدوَدّ نے آگے بڑھ کر چیلنج کیا تو وہاں کسی کو اُس کے مقابل جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ ۱۰۰ آدمیوں کے برابر قوت رکھنے والا شخص ہے۔ حالانکہ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا' لیکن اتنا جری اور قوی ہیکل شخص تھا کہ اس کی شجاعت اور شہ زوری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت علیؓ میدان میں آئے تو

کہنے لگا اگر کوئی آخری خواہش ہے تو بیان کرو! حضرت علیؓ نے پہلے یہ خواہش ظاہر کی کہ مسلمان ہو جاؤ' جب اس نے اسے ردّ کر دیا تو دوسری خواہش یہ بیان کی کہ جنگ کے میدان سے واپس چلے جاؤ اور جب اس نے اسے بھی ردّ کر دیا تو کہا کہ میری آخری خواہش یہ ہے کہ یا تو تم میرے ہاتھوں جہنم پہنچو یا تم مجھے جنت میں پہنچا دو! اس پر وہ ہنسا کہ میں نے آج تک اپنی پوری زندگی میں کسی شخص کو نہیں دیکھا جو مجھے مقابلے کی دعوت دے رہا ہو۔ پھر وہ مشتعل ہو کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ حضرت علیؓ نے دست بدست جنگ میں اسے جہنم رسید کر دیا۔ پھر حضرت علیؓ فاتح خیبر ہیں۔ خیبر کا قلعہ کسی کے ہاتھوں فتح نہیں ہو رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا: میں کل جھنڈا ایک ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے اور جس سے اللہ اور رسولؐ محبت کرتے ہیں۔ صبح آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عطا فرمایا اور آپؓ کے ہاتھوں خیبر فتح ہوا۔ تو یہ جو توازن اور combination ہے کہ ایک طرف شجاعت و بہادری اور دوسری طرف فصاحت و بلاغت' ادبیت' شاعری' اس اعتبار سے حضرت علیؓ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں چوٹی کے آدمی ہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک صحابہ کرام میں جامعیت کبریٰ حضرت علیؓ کو حاصل ہے' اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

لیکن جب ہم صحابہ کرامؓ کے اندر درجہ بندی کریں گے' تو جیسا کہ میں نے اس سے پہلے ایک موقع پر عرض کیا تھا' حضرت علیؓ کا شمار صف دوم میں ہو گا۔ اس لیے کہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم جیسے کبار صحابہ تو لگ بھگ رسول اللہ ﷺ کے ہم عمر قسم کے لوگ تھے' آپؐ کے اعوان و انصار تھے' جبکہ حضرت علیؓ تو گویا حضور ﷺ کی گود میں پروان چڑھے ہیں' وہ آپ ﷺ کے گھر میں پلے بڑھے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر واضح ہے کہ تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا شاہکار تو یقیناً حضرت علیؓ ہیں' اس لیے کہ جس قدر صحبت کا فیض اٹھانے اور حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت سے حصہ حاصل کرنے کا موقع حضرت علیؓ کو ملا کسی اور کے لیے اس کا امکان ہی نہیں ہے۔ لیکن وہ جو حضور ﷺ کے ساتھی تھے' جو اعوان و انصار اور دست و بازو تھے' جو آپؐ کے ہم عمر اور آس پاس تھے ان کی صف ہی علیحدہ ہے' حضرت علیؓ اس میں جگہ نہیں پاتے۔ اس اعتبار سے جو لوگ ان کے درمیان تقابل کرنے کی کوشش کرتے ہیں میرے نزدیک وہ قیاس مع الفارق کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دو چیزوں میں تقابل اور موازنہ وہاں کیا جاتا ہے جہاں نوعیت ایک ہو۔ اگر نوعیت مختلف ہو تو اُن میں موازنہ کیا ہو گا؟ البتہ مزاج کے اعتبار سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے قریب ترین ہیں۔

دنیا کی کامل ترین متوازن شخصیت (بالفاظ دیگر ambivert) تو صرف حضور ﷺ کی ہے کہ ایک طرف قوائے ذہنی وفکری بھی انتہا پر ہیں اور دوسری طرف قوائے عملی بھی انتہا پر ہیں۔ ان دونوں کا امتزاج اگر بتمام وکمال ہوا ہے تو وہ خود محمد عربی ﷺ ہیں۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب ''The 100'' میں اس کے ہم وزن بات لکھی ہے۔ دیکھئے' اس شخص نے جب یہ کتاب مرتب کرنے کا فیصلہ کیا تو گویا یہ فیصلہ کیا کہ میں نسل انسانی کے پہلے سو (۱۰۰) عظیم ترین انسانوں کا انتخاب کروں گا جنہوں نے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑا اور اس کے رُخ کو معین کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا' پھر میں ان میں درجہ بندی کروں گا کہ اِن سو میں بلند ترین مقام پر کون ہے جس نے سب سے زیادہ فیصلہ کن انداز میں تاریخ کے دھارے پر اپنا اثر ڈالا ہے اور اس کے رُخ کو موڑا ہے۔ پھر اس اعتبار سے دوسرے اور تیسرے نمبر پر کون آئے گا! ظاہر ہے کہ اس کے لیے اس نے تاریخ انسانی کا گہرا مطالعہ کیا ہوگا اور خوب سوچ بچار کیا ہوگا۔ اس کے بعد وہ کتاب مرتب کرنے بیٹھا ہے تو نمبر ایک پر لایا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ آج تک بھی عیسائی ہے۔ نہ تو ابھی اس کے مرنے کی خبر آئی ہے نہ اسلام لانے کی خبر آئی ہے۔ اس کی یہ کتاب دنیا میں بہت عام ہوئی ہے' لیکن اشاعت کے بعد وہ بہت جلد نایاب ہوگئی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ شاید کسی سازش کے تحت اسے غائب کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اس کتاب میں حضرت مسیحؑ کو نمبر تین پر رکھا اور حضور ﷺ کو نمبر ایک پر لایا' اور یہ بات عیسائی دنیا کے لیے قابل قبول اور قابل برداشت نہیں تھی۔ اس نے لکھا ہے:

> *"My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."*

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے نزدیک انسانی زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ میدان ہیں۔ ایک ہے مذہب' اخلاق اور روحانیت کا میدان' جبکہ ایک ہے تمدن' تہذیب' سیاست اور معاشرت کا میدان' اور ان دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب (Supremely successful) انسان ایک ہی ہے اور وہ ہیں محمد ﷺ۔ وہی بات میں کہہ رہا ہوں۔ یہ جو introverts اور extroverts کے درمیان ایک ایسی جامع شخصیت جو سرفہرست ہے وہ نبی اکرم ﷺ ہیں' اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں پھر

اس اعتبار سے حضرت علی ؓ کا مزاج آپؐ سے بہت قریب تر ہے۔

صدّیقین اور شہداء کے ذکر کے بعد فرمایا: ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ﴾ ''ان کے لیے ان کا اجر اور اُن کا نور محفوظ ہے''۔ اس سورۂ مبارکہ میں لفظ نور بہت کثرت کے ساتھ بار بار آ رہا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ فرمایا کہ قرآن مجید انسانوں کو اندھیروں سے نکال کر نور میں لاتا ہے۔ یہ آیاتِ بینات پر مشتمل ہے۔ پھر یہ کہ نورِ ایمان قیامت کے دن ظاہر ہوگا اور منافقین اس سے محروم اور تہی دست ہوں گے۔ اہل ایمان کا نور اُن کے سامنے اور اُن کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا۔ میرے نزدیک اس کی سادہ ترین توجیہہ یہ ہے کہ جو دل کا نور ہوگا اس کا ظہور سامنے کی طرف ہو رہا ہوگا اور اعمالِ صالحہ کا نور دائیں طرف ہوگا۔ اس لیے کہ اعمالِ صالحہ کا کاسِب دایاں ہاتھ ہے۔ لہٰذا انسان کسی کو کچھ دیتا ہے تو داہنے ہاتھ سے دیتا ہے۔ سارے اچھے کام ہم داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ تو اعمال کا نور داہنی طرف اور ایمان کا نور سامنے کی طرف ہوگا۔ تو وہاں بھی نور کا تذکرہ آیا۔ یہاں بھی فرمایا: ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ﴾ یہ لام لامِ تملیک بھی ہے اور لامِ استحقاق بھی۔ میں نے ترجمہ میں لفظ ''محفوظ'' کا اضافہ کیا ہے ''ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور محفوظ ہے''۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجرِ عظیم بھی ہے اور ان کے لیے ان کا نور بھی محفوظ ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو کفر کریں اور ہماری آیات کی تکذیب کریں وہی دوزخ والے ہیں''۔ میں ان دونوں الفاظ (کفر اور تکذیب) کی یہاں وضاحت کرتا چلوں کہ یہ جو الفاظ آئے ہیں یہ ایسے ہی نہیں آئے جیسے ہم صرف اضافے کے لیے الفاظ لاتے ہیں' جیسے گورا چٹا' بلکہ ان کی معنویت ہے۔ کفر کا حقیقی اور لغوی مفہوم ہے چھپا دینا۔ اسی سے لفظ ''کفارہ'' ہے۔ آپ سے کوئی گناہ' کوئی غلطی ہوگئی تو اب اس کا کفارہ ہوگا کہ جو اُس کے اثر کو زائل کر دے گا۔ آپ کفارہ ادا کر دیں گے تو وہ گناہ گویا آپ کے نامۂ اعمال سے حذف کر دیا جائے گا' یا دھو دیا جائے گا' چھپا دیا جائے گا۔ تو اس کفر کے لفظ کو اچھی طرح سمجھ لیجیے اور یہ لفظ شکر کے مقابلے میں کیوں آتا ہے؟ سلیم الفطرت انسان کے ساتھ جب بھی کوئی احسان کرتا ہے' حسن سلوک کرتا ہے' اس کی کوئی خدمت کرتا ہے' اسے کوئی قیمتی شے دیتا ہے تو اس کے قلب کی گہرائیوں میں احسان مندی کے جذبات اُبھرتے ہیں جو زبان پر آ کر شکریے کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ لیکن ایک بدطینت ناشکرے انسان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ

محسن ومنعم کا شکرادا کرے‘ وہ ان جذباتِ تشکر کو دبا تا ہے۔یہی معاملہ ایمان اور کفر کا ہے۔اس لیے کہ ایمان تو درحقیقت اس روح ربانی کے اندر موجود ہے جو ہمارے وجود میں پھونکی گئی ہے۔جیسے فرمایا: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ تو درحقیقت ’’نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ‘‘ کے مصداق نورِ فطرت اور نورِ وحی کے جمع ہونے سے ایمان وجود میں آتا ہے۔کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہوتی ہے‘ فطرت کے سوتے خشک ہو چکے ہوتے ہیں‘ لیکن جس شخص کے اندر ذرا سی بھی فطرت کی سلامتی باقی ہے اس کے سامنے جیسے ہی نبی کی دعوت آتی ہے تو اس کے اندر سے اس کی تصدیق ابھرتی ہے کہ ہاں یہ بات صحیح ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ’’ہی‘‘ میرے دل میں ہے!

لیکن فرض کیجیے کہ کوئی تعصب اور عصبیت ہے‘ کوئی ضد اور تکبر ہے‘ کوئی حسد ہے‘ تو فطرت کی اس آواز کو دبایا جائے گا۔ یہود کے علماء نے حضورﷺ کا جو انکار کیا تو اس کی وجہ قرآن نے یہ بیان کی: ﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ کہ یہ اپنے اندر کے حسد کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں‘ ورنہ یہ کہ ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ ’’یہ تو محمد (ﷺ) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں‘‘۔تو اگر پہچان بھی لیا‘ دل نے گواہی بھی دے دی‘ لیکن اس کے باوجود کوئی انکار کر رہا ہے‘ تو درحقیقت یہ دو مرحلے ہیں۔ایک اپنے اندر کی تصدیق کو دبانا‘ بجائے اس کے کہ اسے ظاہر ہونے دیں‘ اور دوسرے زبان سے تکذیب کرنا‘ جھٹلانا۔ یہ گویا کہ دو مظاہر (phenomenons) ہیں کہ ان دونوں کو ملا کر بات مکمل ہوتی ہے۔باطن میں سے اُبھرنے والی تصدیق کو دبا دینا کفر ہے‘ جس کے لیے یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور پھر نبیؑ کی دعوت کو جھٹلانا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں غلط کہہ رہے ہیں‘ یہ تکذیب ہے اور یہ گویا جرم بالائے جرم ہے‘ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا مصداق ہے۔تو فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ وہ لوگ کہ جو کفر کرتے ہیں‘ اندر کی حقیقتوں کو‘ اپنے باطن اور روح کی گواہیوں کو اور شہادتوں کو دباتے اور چھپاتے ہیں اور جب ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کی تکذیب کرتے ہیں‘ انہیں جھٹلاتے ہیں۔ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۹﴾ ’’یہی تو جہنم والے ہیں‘‘۔ یہ جہنم میں داخل ہو کر رہیں گے۔

مضامین کے اعتبار سے ہم نے سورۃ الحدید کی آیات کو سات حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ آیت ۱۹ پر اِس کا چوتھا حصہ ختم ہو رہا ہے۔ یہ حصہ اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ میں نے اِس کی وضاحت کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ بعض مفسرین نے ان آیات میں بہت سے اشکال پیدا کر دیے ہیں' چنانچہ آپ مختلف تفاسیر دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے مفسرین کس طرح مختلف بحثوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ یہ صرف دو چیزوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ آیت ۱۸ اور ۱۹ کے درمیان جو ربط ہے وہ لفظی طور پر موجود نہیں ہے' لہٰذا ''اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا '' کے مصداق یہاں سورۃ البلد سے استشہاد کر کے ''ثُمَّ '' محذوف ماننا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ لفظ شہید کا ایک ہی تصور ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے اور وہ یہ کہ جو بھی اللہ کی راہ میں قتل ہو جائے وہ شہید ہے۔ حالانکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ لفظ قرآن میں اس معنی میں نہیں آتا۔ صرف ایک مقام سورۂ آل عمران کا ہے جہاں یہ معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ وہاں پر بھی دوسرا مفہوم مراد ہو سکتا ہے' لیکن مقتول فی سبیل اللہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ البتہ حدیث میں یہ لفظ اس معنی میں آیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کچھ تصورات کا غلبہ اس طرح کا ہو جاتا ہے کہ اصل حقیقت اس کے پیچھے محجوب ہو جاتی ہے اور اس کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین
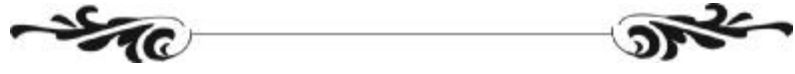
درس 29

حیات دنیوی کے ناگزیر مراحل
اور
حیات دنیوی اور حیات اخروی
کا تقابل

سُوۡرَةُ الۡحَدِیۡدِ کی آیت ۲۰ تا ۲۴ کی روشنی میں !

درس ۲۹

حیاتِ دُنیوی کے ناگزیر مراحل

اور

حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ اُخروی کا تقابل

سورۃ الحدید کی آیات ۲۰ تا ۲۴ کی روشنی میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّلَہۡوٌ وَّزِیۡنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَتَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیۡثٍ اَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ حُطَامًا ؕ وَفِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضۡوَانٌ ؕ وَمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۲۰﴾ سَابِقُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَجَنَّۃٍ عَرۡضُہَا کَعَرۡضِ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ۙ اُعِدَّتۡ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ؕ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۲۱﴾ مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَہَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ﴿۲۲﴾ لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِ ﴿۲۳﴾ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَیَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ﴿۲۴﴾﴾

سورۃ الحدید کا پانچواں حصہ ان پانچ آیات پر مشتمل ہے۔ پہلے ہم ان آیات مبارکہ کا ایک رواں ترجمہ کرتے ہیں:

''خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ

جانے کی کوشش کرنا ہے۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات نے کاشت کاروں کو خوش کر دیا۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی' پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔ دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین جیسی ہے' جو تیار رکھی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اللہ کے رسولوں پر ایمان لائے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (یعنی نوشتۂ تقدیر) میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہے) تاکہ جو کچھ بھی تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے اس پر دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں۔ جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اکساتے ہیں۔ اور جو کوئی روگردانی کرتا ہے تو (وہ جان لے کہ) اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے''۔

دنیا کی زندگی کس اعتبار سے کھیل تماشا ہے؟

اس حصے کی سب سے پہلی آیت بھی میرے نزدیک قرآن کریم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ میرے مشاہدے کی حد تک اس آیت کی بھی اصل حقیقت تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوسکی ہے۔ اس لیے کہ یہاں پانچ الفاظ جس حسنِ ترتیب کے ساتھ آئے ہیں اس میں ایک بہت بڑی حکمت مضمر ہے جس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ یہ مضمون کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا ہے اور دھوکے کی ٹٹی ہے' یہ اس اعتبار سے ہے کہ اگر دنیا خود مطلوب ومقصود بن جائے اور آخرت سے غافل کر دے۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰﴾ ''دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں''۔ کوئی شخص اگر غریب الوطنی کی کیفیت یعنی حالت مسافرت میں ہو اور اپنا اصل گھر' اصل وطن اور اصل منزل بھول جائے تو معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی بدنصیب شخص ہے۔ تو دنیا اگر اس طریقے سے کسی انسان کو اپنے اندر جذب کر لے' متوجہ کر لے کہ اس کی اصل زندگی پس پردہ چلی جائے تو اس اعتبار سے دنیا کی زندگی سراسر دھوکے کا سامان ہے۔ اس مضمون کو سورۃ

العنکبوت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾

''یہ دنیا کی زندگی تو کھیل کود اور تماشے کے سوا کچھ نہیں' اصل زندگی تو آخرت کے گھر کی زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا۔''

تو اگر حیاتِ دُنیوی انسان کو آخرت سے غافل کر دے تو اس سے بڑا دھوکے کا سامان کوئی نہیں۔ اس معنی میں بہت سی جگہوں پر قرآن مجید میں یہ مضمون آیا ہے' بلکہ ''لَهْوٌ وَّلَعِبٌ'' اور ''لَعِبٌ وَّلَهْوٌ'' دونوں ترکیبوں کے ساتھ آیا ہے' لیکن جس شان سے یہاں سورۃ الحدید میں آیا ہے اور پھر اس پر جو اضافہ ہے' میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ یہ قلت تدبر ہی ہے کہ اس پر لوگوں نے غور ہی نہیں کیا کہ یہ الفاظ کس ربط کے ساتھ آ رہے ہیں۔ فرمایا: ﴿اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ﴾ ان الفاظ کی ترجمانی یوں ہوگی کہ ''جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی تو بس یہی کچھ ہے کہ کھیل ہے' کچھ لذت حاصل کرنا ہے' کچھ زینت اور بناؤ سنگھار ہے' کچھ آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے اور کچھ مال اور اولاد کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش ہے''۔ یہ پانچ الفاظ جو یہاں آئے ہیں ان کو اسی ترتیب سے رکھ کر یہ مضمون بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی جو اصل عظمت ہے وہ اس حوالے سے ہے کہ یہ اصل میں حیاتِ انسانی کے پانچ ادوار ہیں جو اِس ترتیب سے آئے ہیں۔ ہمارے اردو یا عربی کے محاورے میں عام طور پر ''لہو ولعب'' کا لفظ آتا ہے' لیکن یہاں پر ''لَعِبٌ وَّلَهْوٌ'' کی ترکیب آئی ہے' تو یہ ویسے ہی نہیں ہے بلکہ بڑی حکمت کی حامل ہے!

انسانی زندگی کے پانچ ادوار —— آئینۂ قرآنی میں

انسانی زندگی کے پانچ ادوار ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جبکہ زندگی صرف کھیل سے عبارت ہے۔ بچپن اور لڑکپن میں کوئی فکر' تشویش اور اندیشہ نہیں' اپنے کھانے پینے کی بھی فکر نہیں' وہ والدین کے ذمہ ہے' بھوک لگے گی تو ماں کھلائے گی' پلائے گی۔ بچے کے لیے زندگی صرف کھیل ہے۔ اِلّا یہ کہ تکلیف ہو گی تو وہ رو لے گا' کوئی احتیاج ہوگی تو مُنہ بسورے گا اور والدین کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ باقی اس کو کسی اور شے کی کوئی فکر نہیں۔ یہ کھیل ابھی خالص معصومانہ کھیل ہوتا ہے' اس میں کوئی تلذّذ کا عنصر نہیں

ہوتا۔ بچے کی سوچ اور سارے کے سارے فکر کا مرکز کھیل (لعب) ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:﴿اِعۡلَمُوۡٓا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ......﴾

اس کے بعد ایک سٹیج آتی ہے جسے ''teen ager stage'' کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا نہایت خطرناک دور ہوتا ہے۔ اب یہاں کھیل صرف کھیل نہیں رہ جاتا' اس میں کچھ نہ کچھ تلذّذ (sensual gratification) شامل ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں آدمی بہت سی غلط قسم کی آوارگیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ ''لَھۡو'' ہے جو 'لَعِب'' کے بعد ہے۔

تیسری سٹیج ہے ''زِیۡـــنَۃٌ'' یعنی بناؤ سنگھار۔ اٹھارہ سے بیس برس کے نوجوانوں اور خاص طور پر لڑکیوں کے ذہن پر جو چیز سب سے زیادہ سوار ہوتی ہے وہ فیشن ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لباس اور وضع قطع بالکل فیشن کے مطابق ہوں۔ اگر تنگ موری والی پینٹ کا رواج ہے تو کوئی نوجوان چوڑی موری والی پینٹ پہننے کو ہرگز تیار نہیں ہوگا اور اس کے برعکس چوڑے قسم کے پائنچوں والی پتلون کا رواج ہے تو وہ دوسری قسم کی پتلون نہیں پہنے گا۔ گویا کہ ان کے سارے سوچ وفکر' احساسات اور نفسیات کے اندر سب سے نمایاں شے یہی بناؤ سنگھار اور زینت ہوتی ہے۔

اس کے بعد چوتھا دور آتا ہے ''تَـفَـاخُرٌ بَیۡنَکُمۡ'' کا۔ یہ دور دراصل ۲۵ سال کی عمر سے لے کر ۳۵ یا ۴۰ سال کی عمر تک کا دور ہے۔ اس میں اصل شے تفاخر ہے کہ انسان فخر میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ فخر مختلف چیزوں پر ہوتا ہے۔ فخر علم پر بھی ہوسکتا ہے' اپنے زہد وعبادت گزاری پر بھی ہوسکتا ہے اور مال و دولت پر بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے پٹھانوں کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ اگر مدمقابل کے گھر پر نئے ماڈل کی کار آ گئی ہے تو پٹھان چاہے اپنی زمین گروی رکھے یا کچھ اور کرے بہرحال اسی ماڈل یا اس سے بہتر قسم کی کار جب تک اس کے دروازے پر نہیں آئے گی اسے چین نہیں آئے گا۔ اسی طرح اپنی نسل اور عصبیت پر بھی فخر ہوسکتا ہے۔ یعنی اپنی قبائلی برتری کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ ''تَفَاخُرٌ بَیۡنَکُمۡ'' کا دور ہے۔

چالیس برس کے بعد جب عمر ڈھلنی شروع ہوتی ہے تو ''تَـکَـاثُـرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ'' والا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اب انسان کو کثرت کی فکر ہو جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال جمع ہو جائے' بلکہ میں یہ الفاظ استعمال کیا کرتا ہوں کہ ''تفاخر'' کے دور میں تو آدمی مونچھ اونچی رکھتا ہے' چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ مونچھ نیچی نہیں ہونے دیتا' لیکن ''تکاثر'' کے دور میں آدمی سوچتا ہے کہ مونچھ چاہے مونڈ بھی

دی جائے لیکن پیسہ ملے۔ اس کے پیشِ نظر اصل شے پیسہ اور دولت ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح اس کے پاس آ جائے' چاہے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔ آدمی اس دور میں گویا بڑا حقیقت پسند (realistic) ہو جاتا ہے کہ اب بناؤ سنگھار اور تفاخر جیسی چیزوں پر کیوں خواہ مخواہ اپنی دولت ضائع کی جائے۔ بس پیسہ سنبھالو اور دولت سینت سینت کر رکھو!

یہاں قرآن مجید میں کثرت کی خواہش میں اولاد کا ذکر بھی موجود ہے۔ آج میڈیا کے گمراہ کن پروپیگنڈے کے زیر اثر کثرتِ اولاد کو باعثِ عار سمجھا جانے لگا ہے' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کثرتِ اولاد ہمیشہ فخر کی علامت رہی ہے۔ خاص طور پر جس کے جوان بیٹے ہوں اس کو یقیناً ایک تقویت حاصل ہوتی ہے۔ قبائلی زندگی میں تو دراصل انسان کی ذاتی عزت و وجاہت اسی بنیاد پر تھی۔ آج بھی دیہاتی زندگی میں یہ عنصر موجود ہے۔ میرے ایک کلاس فیلو ڈاکٹر سلیم صاحب' جو ایک ڈاکے میں قتل کر دیے گئے تھے' مثال دیا کرتے تھے کہ باجوہ فیملی کے ایک شخص کے' جو فیصل آباد کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا' گیارہ بیٹے تھے جو سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو گئے۔ کوئی کہیں پر ڈی سی لگ گیا' کوئی کسی اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گیا' جبکہ گاؤں میں کوئی بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ وہاں پر تو اس کا مقابلہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا اور وہاں اس کے پاس کوئی بھی بیٹا نہیں تھا جو اُس کا دست و بازو بنتا اور اس کی طرف سے مدافعت کرتا۔ تو وہ کہا کرتا تھا کہ کوئی میرے گیارہ پڑھے ہوئے لے لے اور مجھے ایک اَن پڑھ دے دے۔ اس لیے کہ یہاں پر تو جس کے پاس لاٹھی ہے اس کی عزت ہے' گاؤں میں تو سر اٹھا کر وہی چل سکتا ہے جس کے جوان بیٹے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیں اور میرے بیٹے تو پڑھ لکھ کر سب کے سب چلے گئے' لہٰذا میرے لیے عزت و وجاہت کی کوئی بنیاد موجود نہیں[1]۔ یہاں خاص طور پر نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید خاص قبائلی پس منظر میں نازل ہو رہا تھا اور اس کے اوّلین مخاطب وہی تھے جن کا سارا نظام قبائلی تھا۔ آج کی دنیا میں تو ضبطِ تولید اور فیملی پلاننگ کا معاملہ ہے' لیکن فطرت سے قریب تر جو معاشرہ ہوتا تھا' اور اب بھی جو ہوگا وہاں کثرت کی محبت میں مال کے ساتھ اولاد بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ چنانچہ ہمارے دیہاتوں کے اندر اب بھی ''تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔

---

(۱) پنجابی زبان کا مشہور محاورہ ہے: ''ویراں باجھ نہ جوڑیاں تے پتراں باجھ نہ مان!'' یعنی بھائیوں کے بغیر جوڑی (جتھہ بندی) نہیں بنتی اور بیٹوں کے بغیر فخر کی کوئی بنیاد نہیں۔ (مرتب)

درحقیقت ان پانچ الفاظ کے مابین جو ربط ہے وہ بڑا اہم اور حکمت پر مبنی ہے۔ اصل بات جو بتائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی تو لامحالہ ان ادوار میں سے ہو کر گزرے گی۔ بچپن بھی آئے گا، نوجوانی کا دور بھی آئے گا، جوانی اور بڑی قوت والی زندگی کا دور بھی آئے گا۔ پھر ادھیڑ عمر کے مرحلے کو بھی انسان پہنچے گا اور اسے بڑھاپا بھی آ کر رہے گا۔ ان مراحل میں سے کسی کو بھی انسان روک نہیں سکتا۔ یہ تو گویا وقت کی رفتار ہے، جس کا روکنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ اب آخرت سے اس کا تقابل کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ﴾ ''اور آخرت میں یا تو سخت عذاب ہے اور یا پھر اللہ کی مغفرت اور خوشنودی ہے''۔ آخرت کی زندگی میں ابدی طور پر نوع انسانی کے دو حصے ہو جائیں گے، یا اللہ کی طرف سے رضوان اور مغفرت ہو گی یا شدید عذاب ہو گا۔ ﴿وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں''۔ یہ دنیا کی زندگی کہیں تمہیں اپنے اندر گم نہ کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کو ہی مطلوب و مقصود سمجھ بیٹھو۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

دُنیوی زندگی بھرپور طریقے سے گزارنی ہے لیکن ع ''بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں!'' کے مصداق اس کو مطلوب و مقصود نہیں سمجھنا۔ ایک حدیث نبویؐ ہے: ((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ))[1] ''دنیا میں اس انداز سے رہو گویا کہ اجنبی (غریب الوطن) ہو یا راہ چلتے مسافر''۔ یہ بات سامنے رہے کہ یہ تمہارا گھر اور منزل نہیں ہے، یہاں تمہیں ہمیشہ نہیں رہنا، تم راہ چلتے مسافر ہو۔ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ سخت قسم کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے جس سے آپؐ کی پیٹھ مبارک پر نشان پڑ گئے تھے۔ کسی صحابیؓ نے عرض کیا کہ حضور (ﷺ)! آپ کے لیے آرام دہ بستر کا انتظام نہ کر لیا جائے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَالِیْ وَمَا لِلدُّنْیَا، مَا اَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَهَا))[2] ''مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میں تو اس دنیا میں بس اس طرح

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ: کُن فِی الدُّنْیَا ...... وسنن الترمذی، کتاب الزھد، باب ما جاء فی قصر الامل۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب الزھد، باب ما جاء فی اخذ المال بحقہٖ۔ وسنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب مثل الدنیا۔

ہوں جیسے کوئی سوار (گھوڑ سوار یا اونٹنی پر سوار) کسی درخت کے سائے میں رُکتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے آرام کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے (اور اپنی اصل منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے)''۔ وہ درخت اس کا گھر' وطن اور منزل نہیں ہے' وہ اسے چھوڑ کر اپنا راستہ لیتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا کو بس اتنی سی دیر کے لیے قیام گاہ سمجھو' اس سے زیادہ نہیں۔

ایک بات اور نوٹ کیجیے کہ یہاں جو پانچویں چیز ''تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' بیان کی گئی ہے' اس کی وضاحت یا تکمیل سورۃ التکاثر میں بایں الفاظ ہو رہی ہے: ﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝﴾ ''تمہیں کثرت کی محبت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ تم قبروں تک جا پہنچے''۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ انسان کے پاس چاہے دولت کے انبار ہوں اور اتنی دولت ہو کہ کئی نسلوں کے بارے میں اطمینان ہو کہ وہ آرام سے بیٹھ کر اسے کھا سکتی ہیں' لیکن پھر بھی دولت کی بہتات کی طلب ختم نہیں ہوتی۔ صاف نظر آ رہا ہوتا ہے کہ ایک شخص قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے' لیکن دولت کی حرص ختم نہیں ہوتی۔ تو یہی وہ کیفیت ہے جسے تکاثر سے موسوم کیا گیا ہے۔

نباتاتی سائیکل اور اس کی حیاتِ انسانی سے مماثلت

حیاتِ انسانی کے متذکرہ بالا پانچ ادوار کے بعد ایک بڑی پیاری تمثیل آ رہی ہے۔ فرمایا: ﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ﴾ ''اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے' پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی' پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے''۔ جس طرح انسانی زندگی کا سائیکل ہے کہ بچپن ہے' پھر نوجوانی ہے' پھر پوری طاقت اور شدت کو پہنچتا ہے' اس کے بعد ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپا ہے' اسی طرح ایک نباتاتی سائیکل چل رہا ہے۔ ﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ﴾ ''جیسے مثال ہے بارش کی''۔ ﴿اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ ''کاشت کاروں کو اس کی نباتات بھلی لگیں''۔ ''کفر'' کے لغوی معنی ہیں دبا دینا' چھپا دینا اور مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ یہاں ''کفار'' سے مراد وہ اصطلاحی کافر نہیں ہیں جو اللہ یا اس کے رسولؐ یا آخرت یا قرآن کا انکار کریں' بلکہ یہاں کفار سے مراد کاشت کار ہیں۔ اس لیے کہ کاشت کار بھی زمین میں بیج کو دبا تا ہے کہ پھر وہاں سے کھیتی ابھرے گی اور لہلہائے گی۔ سورۃ الفتح کے اخیر میں کاشت کار کے لیے ''زُرّاع'' کا لفظ آیا ہے ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ جب بارش ہوتی ہے تو کھیتی اپنی سوئی نکالتی ہے' چھوٹی چھوٹی پتیاں نمودار ہوتی ہیں تو کاشتکار

کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

﴿ثُمَّ یَھِیْجُ﴾ ''پھر وہ کھیتی اپنی پوری قوت پر آتی ہے''۔ ھَاجَ' یَھِیْجُ کسی چیز کے بھڑ کنے' برانگیختہ ہونے اور جوش مارنے کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ''ھَاجَ الدَّمُ'' (خون نے جوش مارا) اور ''ھَاجَ الْفَحْلُ'' (نراونٹ جوش میں آیا' بپھر گیا)۔ اسی سے باب تفعیل میں ھَیَّجَ ' یُھَیِّجُ' تَھْیِیْجًا آتا ہے' جس کا مطلب ہے کسی شے کو جوش دلانا۔ اور ''ہیجان'' کا لفظ تو اردو میں بھی مستعمل ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ بارش ہوئی تھی تو اب بے آب و گیاہ مٹی میں سبزہ نمودار ہو گیا ہے۔ پھر وہ فصل لہلہاتی ہے' پوری قوت کو آتی ہے' جوش مارتی ہے۔ آگے فرمایا: ﴿فَتَرٰهُ مُصْفَرًّا﴾ ''پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئی''۔ کچھ عرصے کے بعد اب وہ فصل یا گھاس زرد پڑ جائے گی۔ بالفرض گیہوں کی فصل ہے تو شروع میں تو بڑا ہریالی کا منظر نظر آتا ہے' لیکن جب فصل پکنے پر آتی ہے تو وہ زرد پڑ جاتی ہے۔ ﴿ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا﴾ ''پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے''۔ اب اگر فصل ہو تب بھی وہ کٹنے کے بعد بھس بن جاتی ہے اور اگر چراگاہ ہو تب بھی اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ چراگاہیں بھی بڑے بڑے رقبوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پورے وسطی ایشیا کے جو ہموار علاقے ہیں ان کے بڑے بڑے رقبے چراگاہوں پر مشتمل ہیں۔ یہ سطح مرتفع کی ڈھلوانیں ہوتی ہیں جن پر سب سے زیادہ قوی لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ منگولز بھی سطح مرتفع کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح ہندوستان کے اندر جو مرہٹے پائے جاتے ہیں وہ بھی سطح مرتفع دکن کے لوگ ہیں۔ ان کے ہاں یہی ہوتا تھا کہ بارش کے بعد سبزہ اُگ آتا تو اب ان کے جانور وہاں چرتے پھر رہے ہوتے اور یہ خود گھوڑوں پر سوار ہو کر پھر رہے ہوتے۔ یہی قبائل تھے کہ جب گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو پھر دنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا' وہ اٹیلا ہو یا چنگیز ہو۔ چنگیز کہاں سے چل کر کہاں پہنچا ہے! یہ تمام تاریخی حقائق ایچ جی ویلز نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیے ہیں۔

بہرحال یہاں پر یہ دیکھیے کہ اس کے بعد وہ سبزہ بھی کچھ عرصہ کے بعد دھوپ کی وجہ سے جل جائے گا' زرد ہو جائے گا' پھر وہ بھربھرا سا ہو کر پاؤں تلے روندا جائے گا اور کچھ عرصہ کے بعد مٹی ہو کر مٹی میں مل جائے گا' اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہو گا۔ گویا وہ سبزہ' ہریالی اور تر و تازگی ختم ہوئی' اور معلوم ہوا کہ وہی سبزہ اب خاک بن کر اڑ رہا ہے۔ اب وہاں پھر وہی ویرانی ہے اور ریگزار کا ایک منظر ہے۔ چونکہ قرآن مجید کے اوّلین مخاطبین عرب تھے لہٰذا یہ عرب کا پورا کا پورا پس منظر واضح ہو گیا۔ تو جیسے اس دنیا میں چند مہینوں کا نباتاتی سائیکل ہے کہ باقاعدہ بیج ڈالا' فصل تیار ہوئی' اب کٹنے کے بعد اُس کے

تنکے ہوا میں اڑتے پھر رہے ہیں' بعینہٖ انسانی زندگی کا ایک سائیکل ہے۔ جس گھر میں بھی کوئی نئی ولادت ہوتی ہے' بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشی کے شادیانے بجائے جاتے ہیں۔ پھر وہ بچہ بڑا ہوتا ہے' پھر اس میں طاقت آتی ہے' وہ جوانی کو پہنچتا ہے' اب اس کی امنگیں ہیں' اس کے ولولے ہیں۔ اس میں تفاخر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کی ایک ڈھلوان آتی ہے۔ اب چہرے پر بھی زردی آتی ہے' چہرے پر جھریاں پڑ رہی ہیں' بال اب سیاہ نہیں رہے بلکہ سفید ہو رہے ہیں۔ آخر کار بڑھاپا آتا ہے' پھر موت آتی ہے اور وہ قبر میں اتار دیا جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد مٹی ہو کر مٹی میں مل جاتا ہے۔

نباتاتی سائیکل (Botanical Cycle) اور انسانی زندگی کا سائیکل (Human life Cycle) دونوں میں بڑی گہری مناسبت ہے' اور اس آیت کریمہ کا جو اصل معنوی حسن ہے وہ اسی میں مضمر ہے۔ یہ انسانی زندگی کے مختلف مراحل ہیں جن سے ہر کسی کو گزرنا ہے۔ یہ ہر ایک کے ساتھ ہونا ہے' بادشاہ کے ساتھ بھی ہونا ہے اور فقیر کے ساتھ بھی۔ محلوں میں رہنے والوں کے ساتھ بھی ہونا ہے اور جھونپڑیوں والوں کے ساتھ بھی۔ فقیروں اور گداگروں کی زندگی بھی بالآخر ختم ہو گی' وہ بھی مٹی میں مل کر مٹی ہوں گے اور بادشاہوں اور محلات میں رہنے والوں کی زندگی بھی ختم ہو گی اور یہ بھی مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے۔

لیکن آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ﴾ ''اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور (یا پھر) اللہ کی رحمت اور رضامندی ہے''۔ آخرت میں دوام اور مستقل زندگی ہے۔ وہاں یا تو عذاب ہے بہت سخت اور یا پھر دوسری شکل ہے کہ اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضا ہے۔ ﴿وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰﴾ ''اور دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کے سامان کے کچھ نہیں ہے''۔ البتہ یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے رہے کہ دنیا اس اعتبار سے تو دھوکے کا سامان ہے اگر یہ آپ کو آخرت سے غافل کر دے' لیکن اگر خوش قسمتی سے آخرت آپ کی منزل ومقصود کے طور پر مستحضر رہے تو دنیا کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے' اس لیے کہ اسی سے آخرت بنانی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ)) ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔'' یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے۔ یہاں اگر بویا ہی کچھ نہیں تو وہاں کاٹو گے کیا! فصل کہاں سے ملے گی؟ اس اعتبار سے زندگی بہت قیمتی شے ہے۔ یہ liability نہیں ہے' بہت بڑا اثاثہ ہے' لیکن اس حوالے سے کہ اگر آخرت سامنے رہے اور مقصود ومطلوب وہی ہو۔ اور اگر اس دنیا نے انسان کو غافل کر دیا' اپنے اندر گم

کر لیا تو پھر یہ دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔ مؤمنوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ رہتے تو اس دُنیا میں ہیں' لیکن دنیا کے باسی نہیں ہیں' دنیا کے طالب نہیں ہیں' دنیا ان کے علم کا مبلغ نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہماری منزل تو آخرت ہے' ہم وہاں جارہے ہیں۔ یہ تو ایک عارضی سفر ہے' عارضی قیام گاہ ہے۔ اگر یہ کیفیت ہے تو دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے' اس سے اگر صحیح استفادہ کیا جائے تو اسے ''امر'' بنایا جاسکتا ہے۔

مسابقت الی الجنّة کی دعوت

اب اگر یہ حقیقت واضح ہوگئی تو فرمایا: ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے ربّ کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے''۔ ''سَابِقُوْا'' باب مفاعلہ سے ہے جس کا مطلب ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا۔ یہ لفظ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ تم دنیا کے طالب بن جاتے ہو تو دنیا میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہو۔ ﴿تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ﴾ والا نقشہ ہوتا ہے۔ اب اگر آخرت منزل مقصود بن گئی تو اس کے لیے بھی دوڑ لگاؤ۔ اس کے لیے بھی ایک دوسرے سے آگے نکلو۔ یہ نہ ہو کہ دنیا کے لیے تو تمہارے اندر جوش وخروش اور حرکت ہے' مگر آخرت کہنے کی حد تک تو مطلوب ومقصود ہے' لیکن اس کی طرف سے بڑی قناعت ہے' اس کے لیے کوئی بھاگ دوڑ اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں ہے۔ مسابقت کا جذبہ فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے۔ ایڈلر نے کہا ہے کہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی خواہش (The urge to dominate) ایک فطری جذبہ ہے۔ انسان کے اندر مسابقت کا جذبہ موجود ہے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آپ اس کے میدانِ کار کو بدل دیجیے۔ مسابقت مال ودولت میں نہ کیجیے' بلکہ خیرات میں کیجیے۔ سورۃ البقرۃ میں بھی یہ مضمون آیا ہے:

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴾ ''ہر ایک شخص کا کوئی نہ کوئی ہدف مقرر ہے جس کی طرف وہ پیش قدمی کر رہا ہے' تو (اے مسلمانو!) تم نیکیوں کے لیے مسابقت کرو!'' تمہاری مسابقت اور استباق کا مرکز خیرات وحسنات' نیکیاں' بھلائیاں اور انصاف ہو۔ تم جہاد فی سبیل اللہ میں آگے سے آگے بڑھ کر سرفروشی کرو' ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ تو دین کے معاملے میں یہ مسابقت ناپسندیدہ شے نہیں ہے' بلکہ قابل تعریف ہے۔

اس مسابقت کی مثالیں ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ملتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دین کے لیے بڑا کڑا وقت آ گیا ہے' اب جو کچھ بھی لا سکتے ہو لاؤ' پیسے اور مال کی اشد ضرورت ہے' اس لیے کہ اسلحہ فراہم کرنا ہے' سواریوں اور زادِ راہ کا بندوبست کرنا ہے' تو اتفاقاً اُس وقت میرے پاس بہت دولت تھی۔ [''اتفاقاً'' کا لفظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ مہاجرین سب کے سب تاجر تھے اور تاجر کے پاس کبھی کبھار ہی نقد رقم موجود ہوتی ہے' ورنہ تو سارا مال تجارت میں ہی invest رہتا ہے۔] حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ اس موقع پر تو میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بازی لے ہی جاؤں گا۔ میں نے اپنے سارے اثاثے کے دو حصے کیے اور ایک حصہ لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں حاضر کر دیا۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو کچھ لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ عرض کیا کچھ نہیں چھوڑا' جو کچھ تھا لے آیا ہوں۔ ؏ ''صِدّیق ؓ کے لیے ہے خدا کا رسول ؐ بس!'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اُس روز میں نے جان لیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔ نوٹ کر لیجیے یہاں پر کمیت (Quantity) کا اعتبار نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا کُل کا کُل مال لے آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے سارے مال کا نصف لے آئے۔ یہاں یہ تفصیل زیر بحث نہیں کہ کمیت کے اعتبار سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مال کتنا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مال کتنا تھا۔ لیکن کیفیت کے اعتبار سے حضرت صدیق اکبر ؓ حضرت عمر ؓ سے آگے بڑھ گئے' اس لیے کہ نصف تو بہرحال نصف ہوتا ہے' وہ کُل کے برابر تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس تفصیل کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی مسابقت کا جذبہ تھا جو اِس واقعہ سے ظاہر ہو رہا ہے' لیکن وہ مسابقت فی الخیرات تھی۔ لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس ضمن میں نہایت سنہرا اصول یہ ہے کہ: ''دنیا کے معاملے میں اس کو دیکھا کرو جو تم سے پیچھے ہو' اور دین کے معاملے میں اس پر نگاہ رکھو جو تم سے آگے ہو''۔ اس لیے کہ دین میں اپنے سے آگے والے کو دیکھنے سے دل میں عمل کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ابھرے گا کہ یہ آدمی اگر اتنا کچھ کر رہا ہے تو میں بھی کر سکتا ہوں' وہ بھی تو میری طرح کا انسان ہے۔ اور جو دین میں خود سے پیچھے ہے اس کو دیکھنے سے آدمی سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں بہت ہے' اس لیے کہ اس نے تو یہ بھی نہیں کیا' تو اس سے دین میں ترقی رک جائے گی۔ اس کے برعکس دنیا داری میں آگے والے کو دیکھنے سے جذبہ اُبھرے گا

کہ آپ دنیا کمانے کے لیے مزید محنت کریں اور پیچھے والے کو دیکھنے سے قناعت پیدا ہوگی کہ آخر اس کا بھی تو ان آسائشات کے بغیر گزارا ہو رہا ہے' آخر وہ بھی تو اسی دنیا میں رہ رہا ہے' تو اتنی محنت کر کے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو دنیا کے لیے قناعت چاہئے۔ جیسا کہ مرزا عبدالقادر بیدل کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

حرص قانع نیست بیدؔل ورنہ درکارِ حیات
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست!

یعنی اے بیدؔل! یہ تو محض ہماری حرص ہے کہ ہمارے پاس یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو' یہ بھی ضروری ہے اور وہ بھی ضروری ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ہم جن چیزوں کو زندگی گزارنے کے لیے لازمی سمجھتے ہیں ان میں اکثریت ایسی چیزوں کی ہے کہ جو حقیقت میں درکار نہیں ہوتیں۔ تو دنیا میں اس کو دیکھو جو تم سے پیچھے ہے' تا کہ جو بھی تمہیں حاصل ہے اس پر قناعت پیدا ہو اور اللہ کے شکر کا جذبہ ابھرے۔ اور دین میں اس کو دیکھو جو تم سے آگے ہے' تا کہ تمہارے اندر بھی آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو۔[1] تو یہاں فرمایا جا رہا ہے ''اس جنت کے حصول کے لیے دوڑ لگاؤ جس کا پھیلاؤ' جس کی پہنائی آسمان اور زمین جتنی ہے''۔ یہی مضمون سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ (آیت ۱۳۳) ''دوڑو اپنے ربّ کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کے برابر ہے''۔

ان دونوں آیات میں لفظ ''عرض'' آیا ہے' اسے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اردو زبان میں ہم عرض' طول کے مقابلے میں استعمال کرتے ہیں اور عرض کم ہوتا ہے اور طول زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں ''عرض'' کسی شے کی مجرد وسعت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر الفاظ آئے ہیں: ﴿ذُوْ دُعَاۗءٍ عَرِيْضٍ﴾ ''لمبی لمبی دعائیں کرنے والا''۔ (حٰم السجدۃ:۵۱) یعنی جب انسان کو کوئی تکلیف آتی ہے تو بڑی لمبی چوڑی دعائیں مانگنا شروع کر دیتا ہے اور جب

(۱) اس ضمن میں یہ حدیث نبویؐ بھی بہت پیاری اور سبق آموز ہے کہ: ''اِذَا نَظَرَ اَحَدُكُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْيَنْظُرْ اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ (متفق علیہ) یعنی ''جب تم میں سے کسی کی نظر ایسے شخص پر پڑے جس پر اللہ کا فضل مال اور جسم میں تم سے زیادہ ہوا ہے تو اسے چاہیے کہ ایسے شخص کو بھی دیکھے جو (ان چیزوں میں) اس سے نیچے ہو''۔

ہماری طرف سے نعمت مل جاتی ہے تو ہمیں بھول جاتا ہے‘ اسے یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ کبھی وہ اپنے پروردگار کو پکارتا بھی تھا‘ کبھی اس سے دعائیں بھی کرتا تھا۔ تو آدمی جب احتیاج میں ہوتا ہے تو اللہ کو پکارتا ہے۔ تو یہاں عرض سے پھیلاؤ مراد ہے کہ تم جنت کا تصور کر ہی نہیں سکتے۔

قرآن مجید سائنس اور فلسفے کی اصطلاحات استعمال نہیں کرتا‘ بلکہ عام انسانی ذہن کی سطح کے برابر آ کر بات کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں قرآن نے کائنات کی وسعت کے لیے بھی آسمان اور زمین کے الفاظ استعمال کیے ہیں‘ اس لیے کہ کائنات کے بارے میں ہمارا کل تصور یہی ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جنت کتنی بڑی ہوگی تم اس کا تصور نہیں کر سکتے‘ تمہارا تو اپنا ذہن بھی بہت مختصر ہے۔ آج کے ترقی یافتہ اور سائنسی دور کے انسان کو بھی ابھی کچھ پتا نہیں کہ یہ کائنات کتنی طویل وعریض ہے‘ کہاں سے شروع ہو رہی ہے اور کہاں ختم ہو رہی ہے۔ ٹیلی سکوپ جتنی بڑی ہوتی جا رہی ہے کائنات بھی اتنی ہی مزید پھیلتی نظر آ رہی ہے۔ بہرحال کسی ٹیلی سکوپ نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ اس جگہ پر کائنات ختم ہوتی ہے اور وہاں تک ہماری رسائی ہوگئی ہے۔ تو اس اعتبار سے قرآن مجید وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جسے عرب کا عام بدو بھی سمجھ لے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ کہ اس جنت کی پہنائی اور وسعت تم کیا سمجھو گے؟ بس یوں سمجھو آسمانوں اور زمین جتنی۔

دخولِ جنت کے لیے کیسا ایمان درکار ہے؟

آگے فرمایا: ﴿اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ﴾ ’’یہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور ان کے رسولوں پر‘‘۔ اَعَدَّ (باب افعال) کسی شے کو اہتمام کے ساتھ تیار کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ جنت فراہم کی گئی ہے‘ تیار کی گئی ہے‘ سنواری گئی ہے‘ پورے طریقے سے اس کو بنایا گیا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اب یہاں نوٹ کر لیجیے کہ سورۃ الحدید کی اس آیت میں بھی اور انیسویں آیت میں بھی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے آگے کسی شے کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ انیسویں آیت میں سلوکِ قرآنی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ﴾ ’’اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر‘ وہی صدیقین ہیں‘‘۔ اس میں نہ تو انفاق کا تذکرہ ہے‘ نہ قتال کا اور نہ ہی اعمالِ صالحہ کا۔ لیکن مراد یہ ہے کہ جب واقعتاً حقیقی معنی میں ایمان موجود ہوگا تو یہ اعمال بھی لازماً موجود ہوں گے۔ یہ گویا کہ از خود وہاں پر مندرج ہیں‘ understood ہیں۔ اس ایمان کے ساتھ انفاق بھی

ہوگا‘ جہاد بھی ہوگا‘ قتال بھی ہوگا‘ اعمالِ صالحہ بھی ہوں گے‘ نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ یہ سب کچھ ہوں گے۔ لہٰذا یہاں پر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ مجرد ایمان کی بات ہو رہی ہے۔ تو یہاں مراد یہ ہے کہ یہ جنت تیار کی گئی ہے‘ اس کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر حقیقتاً ایمان رکھنے والے ہوں گے۔

محض اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخلہ ممکن نہیں

آگے ارشاد ہے: ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰـهِ يُؤْتِيْـهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ’’یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہے گا دے گا‘‘۔ ’’فضل‘‘ سے مراد ہے اللہ کی طرف سے بغیر استحقاق کے دی جانے والی شے۔ اس کے بالمقابل اجرت اور اجر کے الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں جو باہم مترادفات ہیں اور ان کا مطلب ہے بدلہ‘ جو کسی محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں جہاں بھی جنت کا تذکرہ آیا ہے وہاں ’’فضل‘‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ گویا قرآن مجید کا تصور یہی ہے کہ انسان مجرد اپنے عمل کے ذریعے سے جنت کا مستحق نہیں بن سکتا‘ جب تک کہ فضل خداوندی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اس بارے میں ایک بڑی پیاری حدیث ہے:

> عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَنْ يُّدْخِلَ اَحَدًا مِّنْكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ)) قَالُوْا : وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((وَلَا اَنَا اِلاَّ اَنْ يَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ مِنْهُ بِفَضْلٍ وَرَحْمَةٍ)) (۱)
>
> حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم میں سے کسی کا عمل بھی اسے جنت میں داخل نہیں کر سکے گا‘‘۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیا آپ کو بھی نہیں یا رسول اللہ ﷺ؟ آپؐ نے فرمایا: ’’ہاں مجھے بھی نہیں‘ اِلاّ یہ کہ مجھے اللہ اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے‘‘۔

اللہ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے گا تو جنت میں میرا داخلہ ہوگا۔ یہ ایک اضافی بات ہے جو حضور ﷺ نے اپنے بارے میں بھی فرما دی‘ لیکن دراصل بات یہ سمجھانی مقصود ہے کہ کبھی بھی جنت کو اپنا استحقاق نہ سمجھئے‘ اپنی امکانی حد تک کام کر کے پھر بھی فضل خداوندی کا ہی سہارا لیجیے۔ قرآن مجید میں اہل جنت کا ترانہ نقل ہوا ہے‘ جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب المرضی‘ باب تمنی المریض الموت۔ وصحیح مسلم‘ کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار‘ باب لن یدخل احد الجنۃ بل برحمۃ اللہ تعالیٰ۔

هَـدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ (الاعراف:۴۳) ''اُس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے' اور ہم یہاں نہ پہنچ پاتے اگر اللہ ہی ہمیں نہ پہنچاتا''۔ تو لفظ ''فضل'' کے حوالے سے اس بات کو نوٹ کر لینا چاہیے۔ آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ ''اللہ بہت بڑے فضل کا مالک ہے''۔

ہر مصیبت اللہ کی جانب سے ہے

اب اگلی آیات میں جو مضمون آ رہا ہے یہ اس سے پہلے سورۃ التغابن میں بڑی وضاحت سے آ چکا ہے۔ یہاں اگرچہ لفظاً زیادہ تفصیل ہے' لیکن وہاں کم الفاظ میں معناً یہ بات آ چکی ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں انسان مختلف حوادث اور آفاتِ ارضی وسماوی سے بہت متاثر ہوتا ہے' جو بسا اوقات بڑے پیمانے پر آ جاتی ہیں۔ کبھی زلزلہ آ جاتا ہے تو ہزاروں انسان اس میں ختم ہو جاتے ہیں' مکانات دھنس جاتے ہیں' یا سیلاب آتا ہے تو بڑے پیمانے پر لوگ ڈوب جاتے ہیں' ان کے گھر ختم ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے رقبے پر کھڑی فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں' یا انسان کے اپنے اندر بیٹھے بٹھائے اچانک کوئی بیماری جنم لے لیتی ہے جبکہ اسے اس کا کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ کینسر ہے یا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی شریانیں اتنے فیصد blocked ہیں۔ بعض اوقات انسان بیٹھے بٹھائے کسی مقدمے میں پھنس جاتا ہے۔ اب ان چیزوں کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ ''نہیں نازل ہوتی کوئی نازل ہونے والی زمین میں اور نہ تمہارے اپنے نفسوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں''۔ یہاں پر لفظ ''مُصِيْبَة'' کی لغوی تشریح سمجھ لیجیے! اَصَابَ' يُصِيْبُ (آ پڑنا' نازل ہونا) سے اسم الفاعل مُصِيْب ہے اور اس کی مؤنث مُصِيْبَة ہے' جس کے معنی ہیں نازل ہونے والی شے' آ پڑنے والی شے۔ یعنی جو بھی کوئی کیفیت آپ پر یا مجھ پر وارد ہوتی ہے' چاہے وہ اچھی ہو چاہے بری ہو' چاہے تکلیف دہ ہو' چاہے مسرت بخش ہو اُس پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ گویا جہاں تک اس لفظ کا لغوی تعلق ہے تمام حوادث' واقعات' کیفیات جو ہم پر وارد ہوتی ہیں' وہ سب کی سب اس میں شامل ہو جائیں گی' لیکن عام طور پر یہ لفظ تکلیف دہ' ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت میں ﴿فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ کے الفاظ لا کر مصائب کی بھی تقسیم کر دی گئی

ہے۔ مصیبتیں دو قسم کی ہیں۔ یا تو سماوی یا آفاقی مصیبتیں ہیں جو زمین پر بڑے پیمانے پر نازل ہوتی ہیں یا انسان کی اپنی جانوں میں کوئی مصیبت آن پڑتی ہے' مثلاً کوئی بیماری یا کوئی اور عارضہ لاحق ہوگیا ہے' آدمی کا کوئی عضو کٹ گیا ہے یا کوئی اور حادثہ پیش آ گیا ہے۔ تو فرمایا:﴿اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ﴾ ''مگر وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں'' اس کو وجود میں لائیں' اس کو خلعتِ وجود سے سرفراز کریں۔

تخلیق اور ظہورِ تخلیق کا فرق

اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں فلسفۂ وجود سے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے' البتہ اس آیت میں وارد لفظ ''نَبۡـرَاَ '' کے حوالے سے بات سمجھ لینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک اسم گرامی ''البــارِیٔ'' ہے' جیسے کہ سورۃ الحشر کی آخری آیت میں اسماءِ حسنیٰ بیان ہوئے: ﴿هُـوَ اللّٰـهُ الۡخَـالِقُ الۡبَـارِئُ الۡمُصَوِّرُ لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ﴾ ''باریٰ'' کے مفہوم کو سمجھنے سے پہلے لفظ ''خالق'' کو سمجھ لینا چاہیے۔ عام طور پر جب لفظ ''خالق'' کے ساتھ لفظ ''باریٰ'' آتا ہے تو اکثر لوگوں نے اس کا یہ نقشہ پیش کیا ہے کہ خـلـق کہتے ہیں ذہنی طور پر کسی شے کی منصوبہ بندی اور نقشہ بندی کرنے کو اور بـرأ کا مطلب ہے اُس شے کو ایک ظاہری شکل عطا کر دینا۔ ہماری انسانی تخلیق میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔ کوئی مصور پہلے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بناتا ہے' پھر اسے صفحۂ قرطاس یا کینوس پر لاتا ہے۔ کوئی موجد ہے تو اس کے ذہن میں بھی پہلے اس ایجاد کا تصور آتا ہے' پھر عملاً یہ شے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ بارئ کے لفظ میں اصولی طور پر یہ بات موجود ہے۔ بَـــرَءَ ' یَبۡـرَءُ کا لغوی معنی ہے کسی شے سے علیحدہ ہو جانا۔ اسی سے بـراء ت اور تبـرّأ وغیرہ الفاظ بنے ہیں جن کا یہی مطلب ہے کہ علیحدہ ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے بارے میں بھی فلاسفہ نے یہی دو مراحل بیان کیے ہیں کہ ایک ہے کسی شے کا وجودِ علمی جو اللہ کی ہستی اور اس کے علم میں تھا' وہ شے ہمیشہ سے اللہ کے علم میں تھی' بس اس کا خارجی وجود نہیں تھا۔ اب وہ خارجی طور پر وجود میں آتی ہے تو یہ ہے بَـرَءَ ' یَبۡـرَءُ اور اس کے حوالے سے اللہ تعالیٰ اَلۡبَـارِئُ ہے۔ جو بھی حوادث اس کائنات میں آنے والے ہیں علم خداوندی میں تو پہلے سے موجود ہیں۔ وہ ''عَـالِمُ مَا کَانَ وَمَـا یَـکُوۡنُ '' ہے۔ جو ہوا ہے اور جو ہونا ہے سب اس کے علم میں ہے۔ تو جہاں تک کسی شے کے وجودِ علمی کا تعلق ہے تو ہر شے ہمیشہ سے اللہ کے علم میں ہے۔ جیسے اللہ کی ذات قدیم ہے ایسے ہی اس کی صفات اور اس کا علم بھی قدیم ہے۔ ہر شے کا ایک وجودِ علمی اللہ کی ذات کے ساتھ پہلے سے قائم تھا۔

اس کو کہا گیا: ﴿اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ﴾ کتاب سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا علم۔ تو اللہ کے علم میں وہ شے پہلے سے موجود تھی۔ آگے الفاظ آ رہے ہیں: ﴿مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا﴾ ''اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کر دیں''۔ اب گویا کہ وہ شے وجودِ علمی سے وجودِ خارجی میں منتقل ہو رہی ہے۔

علامہ اقبال کا ایک بہت اونچا شعر ہے' البتہ اس پر بہت زیادہ قیاس نہ کیجیے گا۔ فرمایا:

بضمیرت آرمیدم تو بہ جوشِ خود نمائی
بہ کنارہ برفگندی دُرِ آبدارِ خود را!

یعنی اے اللہ! میں تو تیرے وجود کے اندر بڑے آرام سے تھا۔ یعنی علامہ اقبال جو ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے یا اس سے بھی نو مہینے پہلے ان کی والدہ محترمہ کے رحم کے اندر ان کا جو استقرارِ حمل ہوا اس سے لاکھوں کروڑوں سال پہلے بھی تو ان کا وجود اللہ کے علم میں تھا' تو اس اعتبار سے وہ کہہ رہے ہیں کہ میں تیرے وجود کے اندر یعنی تیرے علم میں بڑے آرام میں تھا۔ مجھے تو کوئی چنتا' کوئی تشویش' کوئی فکر نہیں تھی' تو نے خود ہی اپنی خلاّقی کے ظہور کے لیے مجھے اپنے وجود سے باہر کیا۔

یہاں علامہ اقبال بڑی پیاری تمثیل لائے ہیں کہ سیپی کے اندر موتی پروان چڑھ رہا ہوتا ہے' جب موتی بن جاتا ہے تو سیپی از خود کھلتی ہے اور موتی کو باہر پھینک دیتی ہے۔ گویا کہ اس کے وجود میں جو قیمتی شے پروان چڑھ رہی تھی وہ تو ظہور چاہتی ہے' اگر سیپی کے اندر ہی وہ موتی گم رہے تو ظاہر بات ہے اس کا حسن کس نے دیکھا۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا! اس سیپی کے اندر اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی موتی پڑا ہوا ہے تو اسے کس نے دیکھا! کون اس کے حسن کی تعریف کرے گا؟ تو سیپی خود کھلتی ہے اور اس میں سے وہ موتی باہر نکلتا ہے جس کو پھر ہمارے غوّاص (غوطہ خور) سمندر کی تہہ سے نکال لاتے ہیں۔ تو اقبال اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہیں کہ تو نے خود ہی سیپی کی طرح مجھے اپنے وجود سے باہر کیا' یعنی مجھے یہ مادی وجود عطا کیا جو اس وقت میں علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ولد شیخ نور محمد کے نام سے دنیا میں ہوں۔ اصل میں اقبال یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلاقی کے ظہور کے لیے اس کائنات کو پیدا کیا۔ تو اس پورے فلسفے کو سمجھ لینے سے لفظ بَرَءَ کے حوالے سے یہ پوری حقیقت واضح ہو جائے گی۔ بدقسمتی سے ان چیزوں پر غور کا حق ادا نہیں کیا گیا۔

﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیۡرٌ ﴿۲۲﴾﴾ ''یہ چیز اللہ کے لیے بڑی آسان ہے''۔ یہ تمہیں تو بڑی مشکل بات معلوم ہوگی کہ یہ ساری چیزیں ہی کسی کے علم میں موجود ہوں' لیکن یہ اللہ کی بات ہو رہی ہے۔ تم

جس طرح اللہ کے وجود اور ذات کو نہیں سمجھ سکتے اسی طرح اس کی صفات کی کیفیت اور کمیّت کو بھی نہیں جان سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت اور کمیت دونوں ہمارے احاطۂ ذہنی سے خارج ہیں۔

ہر حال میں مطلوب طرزِ عمل — تسلیم و رضا

آ گے فرمایا: ﴿ لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ ﴾ ''تا کہ تم افسوس نہ کرو اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے''۔ اللہ کی طرف سے جو حوادث سامنے آتے ہیں وہ امتحان کے لیے ہیں۔ تکلیف آ جائے تو صبر کرو' اللہ کچھ دے دے تو اس کا شکر کرو۔ فوت ہو جانا اردو میں بھی مستعمل ہے۔ یہاں فوت ہونا اس معنی میں ہے کہ کوئی موقع تھا جو ہاتھ سے نکل گیا' کوئی اور شے تھی جو آپ کے ہاتھ سے جاتی رہی' آپ کا کوئی عزیز فوت ہو گیا' آپ کا کوئی بچہ آپ کے سامنے دم توڑ رہا ہے اور آپ بہر حال اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ سورۃ الواقعۃ میں ارشاد ہوا: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''اور ہم تمہاری نسبت اس (فوت ہونے والے) کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم دیکھ نہیں پاتے''۔ تمہاری نگاہوں کے سامنے سے ہم تمہارے محبوبوں کو لے جاتے ہیں اور تم کچھ نہیں کر سکتے' بس دیکھ رہے ہوتے ہو۔ تو کوئی شخص یا چیز فوت ہو جائے تو اس پر بھی افسوس نہ کیا کرو۔ اس لیے کہ وہ شے گئی کہاں ہے؟ اسی کائنات میں ہے۔ بس اس کی حالت تبدیل ہوئی ہے اور اللہ نے تمہارے امتحان کے لیے ایک صورت پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ ﴾ ''اور جو کچھ اللہ دے دے اس پر اترایا مت کرو''۔ اس لیے کہ یہ بھی امتحان کے لیے ہی ہے' یہ بھی بغرضِ آزمائش ہے۔ اگر اس نے تمہیں دولت دی ہے تو اس کا حساب بھی تو تمہیں دینا ہوگا۔ جس کے پاس دولت زیادہ ہے اس کا حساب بھی بہت بھاری ہو جائے گا۔ جیسے دولت مندوں کو انکم ٹیکس کی زیادہ فکر ہوتی ہے' جو شخص hand to mouth ہے اس سے انکم ٹیکس کے کسی افسر کو کیا سروکار! تو وہاں جب حساب دینا ہوگا تو پتہ چلے گا کہ ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہے۔ اسی لیے بیلنس شیٹ جب بنتی ہے تو سرمائے کو liabilities کے کھاتے میں ڈالتے ہیں کہ تمہیں اس کا حساب دینا ہے کہ اسے کن کن مدّات میں خرچ کیا اور اس کے ذریعے کمایا کیا؟ اس حوالے سے ایک بہت پیاری حدیث ہے جس میں پانچ سوالوں کا تذکرہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهِ فِيْمَ

اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَ اَبْلَاهُ وَمَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَمَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ؟))(۱)

''ابنِ آدم کے قدم قیامت کے روز اپنے ربّ کے حضور ہرگز نہیں ہل سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کن کاموں میں کھپائی' اور (خاص طور پر) اس کی جوانی کے بارے میں کہ کن کاموں میں گلائی اور اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کن جگہوں پر خرچ کیا' اور یہ کہ علم کے مطابق کتنا عمل کیا۔''

تو معلوم ہوا کہ جو چیز اللہ دے دے اس پر اِتراؤ مت! اور جو اللہ چھین لے اس پر غم و افسوس نہ کرو! مؤمن کی کیفیت تو وہ ہونی چاہیے جیسے سورۃ التغابن میں بیان کیا گیا ہے: ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ ؕ﴾ ''نہیں آن پڑتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے حکم سے' اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔'' یعنی تسلیم و رضا کی ہدایت کہ اللہ کی مرضی یہی تھی' اللہ کا فیصلہ یہی تھا۔ مؤمن مطمئن رہتا ہے کہ اسی میں میرے لیے خیر ہوگا' چاہے وہ خیر مجھے نظر آئے یا نہ آئے!

زیرِنظر آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ تکالیف و مصائب انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ انسان اگر کسی جدوجہد میں حصہ لیے بغیر Passive زندگی بسر کر رہا ہو تب بھی ان سے سابقہ پیش آ سکتا ہے۔ آدمی کو ہارٹ اٹیک ہوسکتا ہے' کینسر ہوسکتا ہے' کوئی اور مصیبت آ سکتی ہے' کوئی حادثہ ہوسکتا ہے' اور اس طرح اس کی جان جاسکتی ہے۔ یہ جان تو ہر حال میں جانی ہی ہے اور مصیبتوں سے بچنے کی یہاں پر کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے' تو کیوں نہ انسان کسی اعلیٰ تر نصب العین کے لیے اپنی زندگی actively کھپائے اور اس کے لیے فی الواقع خطرات کا رسک لے۔ تو یہ تین آیتیں (۲۲ تا ۲۴) مضمون کے اعتبار سے ماقبل دو آیتوں کے ساتھ بھی ملتی ہیں اور اپنے بعد آنے والی آیت ۲۵ کے ساتھ بھی مربوط ہیں۔

اس حوالے سے ان آیات پر دوبارہ غور کر لیجیے' اگرچہ ہم ان کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ فرمایا: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ﴾ ''نہیں پڑتی کوئی پڑنے والی (کوئی مصیبت' کوئی بھی ناگوار یا تکلیف دہ صورت حال)' نہ زمین میں (کسی بڑے پیمانے پر) نہ ذاتی اعتبار سے تمہاری جانوں میں' ﴿اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ؕ﴾ ''مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے

(۱) سنن الترمذی' کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع' باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔

اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں''۔ کتاب سے مراد اللہ کا علم قدیم ہے۔ اللہ کے علم میں پہلے سے معین ہے کہ یہ ہونا ہے۔ اس کے حوالے سے میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ کے علم قدیم میں ہر شے پہلے سے موجود تھی' یہ وجودِ علمی ہے۔ جب وہ شے ظاہر ہوتی ہے' خارج میں آ جاتی ہے تو وہ گویا اس کا وجود ہے جس کو ہم مادی یا عملی وجود کہتے ہیں: ﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾﴾ ''یقیناً اللہ کے لیے تو یہ بات بڑی آسان ہے''۔

اب اس کا نتیجہ کیا نکلنا چاہیے؟ ﴿لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ﴾ ''تاکہ تم افسوس نہ کرو اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے''۔ ''لَا تَاْسَوْا'' أسِىَ يَاْسَى (افسوس کرنا' غمگین ہونا) سے فعل نہی ہے۔ سورۃ التغابن کے درس میں میں نے بڑی وضاحت کے ساتھ عرض کیا ہے کہ ایک تو طبعی اثر ہوتا ہے۔ کسی چیونٹی کے کاٹنے پر آپ کے ہاتھ میں جنبش ہوئی اور آپ نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا کہ یہ کیا ہوا' یہ reflex action ہے۔ اس درجے میں انسان پر کسی شے کا کوئی فوری ردِعمل طاری ہو جائے تو یہ بات تسلیم و رضا کے منافی نہیں ہے۔ جیسے کہ آنحضور ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ جب عالم نزع میں تھے تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال بھی کیا کہ حضور آپ کی آنکھوں میں آنسو؟ آپؐ نے فرمایا: یہ تو اللہ تعالیٰ کی اُس رحمت کا ظہور ہے جو اُس نے انسان کے دل میں رکھی ہوئی ہے' لیکن ہم کہیں گے وہی کچھ جو اللہ کو پسند ہے' ہم اس کی رضا پر راضی ہیں۔ یہ تسلیم و رضا کا مقام ہے' یعنی راضی برضائے رب رہنا۔ کوئی شکوہ اور شکایت کا کلمہ زبان پر نہ آئے۔ ؎

رضائے حق پہ راضی رہ' یہ حرفِ آرزو کیسا؟
خدا مالک' خدا خالق' خدا کا حکم' تو کیسا!!

علامہ اقبالؔ اس مقامِ رضا کے بارے میں کہتے ہیں ؎

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!

اللہ کی رضا پر راضی رہنے کا معاملہ درحقیقت ایمان کے ثمرات میں سے چوٹی کا ثمرہ ہے۔ اگر کوئی تکلیف آئی ہے تو اس کا طبعی اثر تو یقیناً ہوگا' لیکن اس سے زیادہ آپ کے اعصاب پر اور آپ کے احساسات پر اس کی چھاپ نہ پڑنے پائے۔ آپ کا طرزِ عمل یہ ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس سے یقیناً اللہ کو کوئی نہ کوئی خیر ہی منظور ہوگا۔ ہم short sighted ہیں' ہم نہیں دیکھ سکتے۔ دعائے

استخارہ میں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ الفاظ سکھائے ہیں: فَاِنَّکَ تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ ''یقیناً تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا'' وَتَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ ''تجھے ہر شے کی قدرت حاصل ہے' مجھے قدرت حاصل نہیں ہے''۔ جو بھی تیرا فیصلہ ہے میں اس پر راضی ہوں ع ''ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!'' جو بھی کچھ میرے ساقی نے میرے پیالے میں ڈال دیا ہے وہ عین اس کا لطف و کرم ہے۔ اس کو انسان صبر و شکر کے ساتھ قبول کرے۔

نزولِ مصیبت کے وقت ﴿لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ﴾ ''جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے اس پر افسوس نہ کیا کرو'' کی تلقین کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دے دی گئی: ﴿وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰکُمۡ ؕ﴾ ''اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جایا کرو''۔ ''فَرِح'' کہتے ہیں خوشی سے پھولے نہ سمانا۔ ایک ہے طبعی خوشی ہونا۔ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو آپ کے جی کو پسند ہے' اس پر فوری طور پر ایک خوشی کا اظہار ہو جانا' یہ بھی تسلیم و رضا کے منافی نہیں ہوگا۔ لیکن اس سے انسان اس حد تک تاثر لے لے کہ خوشی سے پھولا نہ سمائے اور اس پر اتراتا پھرے تو یہ معاملہ درحقیقت فرح ہے' جس سے روکا گیا ہے۔ ''فرح'' کے لفظ کے اندر ہی یہ چیز موجود ہے جیسے کوئی چیز پھٹ رہی ہو' ''فرج'' کہتے ہیں سوراخ' رخنے یا خلاء کو' یعنی کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو۔ اسی طرح ''فرق'' کاٹنے والی اور علیحدہ کر دینے والی شے کو کہا جاتا ہے۔ عربی میں جو مادّے لفظی طور پر بہت قریب ہوں وہ مفہوم کے اعتبار سے بھی قریب ہوتے ہیں۔ تو فرح کہتے ہیں خوشی سے آپے میں نہ رہنا' پھولے نہ سمانا۔

اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ کردار

﴿وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِۣ ﴿ۙ۲۳﴾﴾ ''اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ اکڑنے والوں کو اور شیخی خوروں کو پسند نہیں کرتا''۔ ''لَا یُحِبُّ'' اگرچہ نرم الفاظ ہیں لیکن اصل میں مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ اللہ کو بہت ناپسند ہیں۔ یہ قرآن کا اپنا ایک اسلوب ہے کہ کسی شے کی نفی بسا اوقات سادہ انداز میں ہوتی ہے اور بسا اوقات اس کے اندر ایک زور (emphasis) ہوتا ہے۔ مُختال کا لفظ خَیل سے بنا ہے' جس کا مطلب ہے اعلیٰ نسل کا گھوڑا۔ گھوڑے کی چال کے اندر ایک تمکنت ہوتی ہے۔ جتنی اعلیٰ نسل کا گھوڑا ہوگا اس کی چال میں تمکنت اتنی زیادہ ہوگی۔ تو ''اِختَال'' کا لفظ وہاں سے لیا گیا ہے۔ آدمی کی چال ڈھال سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے' یہ کسی زعم میں ہے' اونچی

ہواؤں میں ہے' اس کو کوئی غرور ہے۔ تو یہ اختیال ہے۔ اور فخر وہی لفظ ہے جو ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ ''تَفَاخُرٌ بَیۡنَکُمۡ''۔ یہ فخر کرنا نسل پر ہے' حسب ونسب پر ہے' مال پر ہے' علم پر ہے' زہد وتقویٰ پر ہے۔ پھر اس کو بیان کرتے رہنا' اس کا اظہار کرنا' اللہ کو یہ چیزیں بالکل پسند نہیں ہیں۔

﴿الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَیَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ ؕ﴾ ''جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں''۔ یہ آیت دراصل اس طرزِ عمل اور اس ذہنیت کا منطقی نتیجہ بیان کر رہی ہے۔ اگر دنیا میں انسان کو نعمتیں ملی ہیں تو ان پر فرح' پھر اختیال اور اس کے بعد فخر' یہ تینوں چیزیں درحقیقت اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ انسان کی نظروں میں اصل قدر و قیمت اس دنیا کے مال و اسباب کی ہے۔ تب ہی تو وہ اس پر فخر کر رہا ہے۔ سورۃ الھمزہ میں ایک برے کردار کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ﴿الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾ یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾﴾ ''جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام عطا کر دے''۔ مال و دولت پر جو یہ دار و مدار اور انحصار ہے تو ظاہر بات ہے کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ میرا سرمایۂ افتخار میری دولت ہے تو وہ اس دولت کو سنبھال کر رکھے گا' خرچ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ اسی سے تو وہ لوگوں کے اوپر رعب جھاڑ رہا ہے' اسی سے تو اس کی عزت ہے۔ ہمارے اس معاشرے میں خاص طور پر یہ لعنت انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ امیر غریب کا فرق تو پہلے بھی ہوتا تھا۔ دولت مند بھی تھے اور غریب بھی ہوتے تھے' لیکن عزت کی بنیاد دولت نہیں بلکہ کردار تھا۔ مسلمان معاشرے کے اندر وہ کیفیت ہوتی تھی کہ ایک فقیر اور درویش جو کہیں بیٹھا ہوتا تھا لوگوں کا رجوع اس کی طرف ہوتا تھا۔ اسی طرح علماء کی طرف رجوع ہوتا تھا۔ ہارون الرشید کی محبوب ملکہ زبیدہ نے حج کے موقع پر ایک بہت بڑی دینی شخصیت (جو غالباً اہل بیت میں سے تھے) کی طرف لوگوں کا التفات دیکھ کر ہارون الرشید سے کہا تھا کہ اصل حکومت تو ان کی ہے جو دلوں پر حکومت کر رہے ہیں' تمہاری حکومت تو محض لوگوں کے جسموں پر ہے۔

یہ اَقدار (values) جس معاشرے کے اندر موجود ہوں تو چاہے وہاں کچھ اونچ نیچ بھی ہو' اخلاق کا دیوالہ اس طرح سے نہیں نکلتا جیسے کہ ہمارے معاشرے میں نکل گیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ جانتے ہوئے بھی کہ فلاں کے پاس حرام کی دولت ہے' ہیروئن کی کمائی ہے' رشوت کا پیسہ ہے یا سود خوری کا معاملہ ہے' جس کے پاس دولت ہے اس کے لیے عزت ہے۔ اس کے سامنے لوگ جھکے جا رہے ہیں' بچھے جا رہے ہیں اور اچھے اچھے لوگوں کا طرزِ عمل یہی ہے تو اس سے درحقیقت معلوم ہوا کہ

ہمارے ہاں اخلاق کا دیوالہ نکل گیا' اقدار (values) کا بیڑا غرق ہوگیا۔ تو یہاں ﴿اَلَّـــذِیْـــنَ یَبْخَلُوْنَ﴾ کے الفاظ میں دراصل یہ بات بیان ہورہی ہے کہ چونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عزت کی بنیاد پیسہ ہے لہٰذا وہ بخل کرتے ہیں اور پیسے کو سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ وہ اگر پیسہ خرچ کریں گے تو گویا اپنی عزت اور فخر کی بنیاد کو ڈھائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی دوسری بات یہ کہ ﴿وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ ''اور وہ دوسروں کو بھی بخل کرنے پر اکساتے ہیں''۔ جو شخص خود بخل کرے گا وہ دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک تو بہر حال لوگوں کی نگاہ میں وہ اپنا بھی تو کوئی بھرم قائم رکھنا چاہتا ہے اور اپنے طرزِ عمل کے لیے Justification چاہتا ہے۔ ''امر'' کا لفظ یہاں حکم کے معنی میں نہیں' بلکہ مشورہ کے معنی میں آیا ہے۔ دوسروں کو بخل کا مشورہ دینے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ بھائی کچھ عقل کے ناخن لو' کچھ سوچو' تم نے تو اپنے دونوں ہاتھ کھلے رکھے ہوئے ہیں' تمہارے ہاتھ میں تو معلوم ہوتا ہے کوئی سوراخ ہے کہ کوئی شے تمہارے پاس رکتی ہی نہیں ہے۔ تمہیں چاہیے کہ کچھ آگے کی فکر کرو' بچوں کی فکر کرو' بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں' بچوں کے لیے جائیداد بنانی ہے۔ تو بڑے ہی ناصحانہ اور خیر خواہانہ انداز میں بخل کا مشورہ دیا جاتا ہے تاکہ ہمارا بخل بھی ڈھکا چھپا رہے۔

بخل اور نفاق میں مشابہت کا ایک پہلو

یہ بالکل وہی نفسیاتی بات ہے جو میں حقیقت نفاق کے ضمن میں بارہا بیان کر چکا ہوں کہ نفاق جب اپنی تیسری منزل کو پہنچتا ہے تو پھر ان مؤمنین صادقین سے بغض اور دشمنی ہو جاتی ہے جو دیوانہ وار جان و مال کھپا رہے ہوتے ہیں۔ منافقین یہ سوچتے ہیں کہ ان کے اس دیوانہ وار اپنی جان و مال کی بازی لگانے سے ہماری بزدلی اور ہمارا بخل نمایاں ہورہا ہے۔ اگر پکار آتی اور سب بیٹھے رہتے' کوئی بھی جنبش نہ کرتا تو سب برابر تھے۔ سیرتِ طیبہ میں ایک موقع پر ایسا بھی ہوا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب صلح ہوگئی ہے' اس کی شرائط طے ہوگئی ہیں' اب اٹھو اور یہیں پر قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو تو صحابہ کرام ؓ میں سے کوئی ایک بھی نہیں اٹھا۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے اور میرے لیے تو تا حال ایک عقدہ ہے کہ حضرت ابوبکر ؓ کی بھی صراحت نہیں ہے کہ وہ بھی اٹھے ہوں۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تو آپؐ دل گرفتہ اور رنجیدہ ہو کر اپنے خیمے میں چلے گئے۔ وہاں حضرت اُمّ سلمہ ؓ ساتھ تھیں جو بہت مدبر خاتون تھیں۔

حضور ﷺ نے ان سے جا کر کہا کہ میں نے مسلمانوں سے تین دفعہ کہا ہے کہ اب اٹھو' احرام کھول دو اور قربانی دے دو' لیکن کوئی نہیں اٹھ رہا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آپؐ انہیں کچھ نہ کہئے' بس آپ قربانی دے دیجیے اور اپنا احرام کھول دیجیے۔ جب آپؐ نے باہر آ کر یہ کام کیا تو سب کھڑے ہو گئے اور آپ ﷺ کی اتباع میں قربانی کے جانور ذبح کرنے لگے اور احرام کھولنے لگے۔ میری تاویل یہ ہے کہ وہ کچھ حالت منتظرہ میں تھے کہ شاید ابھی کوئی نئی صورت پیدا ہو جائے' شاید اللہ ابھی ہمارا امتحان ہی لے رہا ہو! اس لیے ایک عجیب سی حالت منتظرہ طاری ہو گئی تھی کہ کوئی بھی نہیں اٹھا۔ لیکن اِس وقت یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ جب کوئی نہیں اٹھا تو سب برابر ہو گئے۔ اگر کچھ لوگ اٹھ جاتے اور کچھ بیٹھے رہ جاتے تو جو اٹھ گئے ہوتے اُن کا ایک مرتبہ واضح ہو جاتا کہ یہ نبی ﷺ کی پکار پر فوراً لبیک کہنے والے ہیں اور جو بیٹھے رہ گئے وہ گویا کہ تربّص و انتظار میں ہیں۔

منافقین کو یہی غصہ آتا تھا کہ جب اللہ کی راہ میں نکلنے کا حکم آتا ہے' ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾ کی پکار آتی ہے تو یہ بے خوف وخطر نکل پڑتے ہیں۔ یہ کچھ سوچتے ہی نہیں' اپنا نفع و نقصان دیکھتے ہی نہیں' کوئی اندیشے' کوئی خطرات ان کے پاؤں کی بیڑی نہیں بنتے۔ موسم کو نہیں دیکھ رہے کہ شدید ترین گرمی کا موسم ہے۔ یہ نہیں دیکھ رہے کہ شیر کے منہ میں جا رہے ہیں' سلطنت روما کے ساتھ ٹکر لے رہے ہیں ؏ ''بازی بازی باریش بابا ہم بازی!'' غزوۂ تبوک سے پہلے جو بھی جنگیں ہوئی تھیں وہ اندرونِ ملک عرب ہوئی تھیں' لیکن اب سلطنت روما کے ساتھ ٹکراؤ تھا جس کی لاکھوں کی Standing Armies تھیں۔ اور غزوۂ موتہ کے اندر بھی یہی ہوا کہ تین ہزار گئے تھے جن کا ایک لاکھ سے ٹکراؤ ہو گیا جبکہ ایک لاکھ فوج مزید موجود تھی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ دو لاکھ کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا۔ بہر حال غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نفیر عام آئی تو جن میں ایمان صادق تھا وہ نکل کھڑے ہوئے اور منافقین کا نفاق ظاہر ہو گیا۔ تو دراصل یہ حقیقت ہے کہ جو شخص خود بخل کرتا ہے وہ دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دے گا۔ جو خود آگے نہیں بڑھنا چاہتا وہ دوسروں کو بھی نہ صرف آگے بڑھنے کا مشورہ نہیں دے گا بلکہ انہیں آگے بڑھنے سے روکے گا۔ سورۃ الاحزاب میں جنگ کے کام میں رکاوٹیں ڈالنے والے منافقین (اَلْمُعَوِّقِیْنَ) کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ﴿هَلُمَّ اِلَيْنَا﴾ ''آؤ ہمارے پاس!'' بس یہیں پر بیٹھے رہو! کہاں جا رہے ہو؟ کیوں خطرات مول لیتے ہو؟ تو یہ ہے وہ بات کہ وہ خود بھی بخل سے

کام لیتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل ہی کا مشورہ دیتے ہیں۔

اللہ غنی اور حمید ہے

﴿وَمَنۡ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ۞﴾ ''اور جو کوئی پیٹھ دکھائے گا (روگردانی کرے گا' یہ سب کچھ سن کر بھی نہ انفاق پر آمادہ ہوگا نہ جہاد کے لیے تیار ہوگا) تو (وہ سن رکھے کہ) اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے''۔ وہ غنی ہے' اسے کسی کی احتیاج نہیں ہے' کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ شریک نہیں ہو گا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ اسے کسی کی حمد وثنا کی بھی کوئی احتیاج نہیں ہے' وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔ اللہ تو غنی اور حمید ہے۔ اگر تم نہیں آؤ گے تو اللہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔ ﴿اِنۡ تَتَوَلَّوۡا يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ثُمَّ لَا يَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ ۞﴾ اس آیت پر سورۂ محمدؐ ختم ہوتی ہے۔ ''اگر تم روگردانی کرو گے' پیٹھ دکھاؤ گے تو اللہ تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے''۔ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔

تو یہاں وہ پانچ آیات مکمل ہو گئیں جن کو میں نے قبل ازیں ایک حصہ قرار دیا تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیسرے رکوع کی پہلی دو آیات (۲۰'۲۱) کو ایک مستقل حصہ مانا جائے' جن میں حیاتِ دنیوی کے ناگزیر مراحل' حیاتِ دنیوی کی اصل حقیقت' انسانی زندگی کے سائیکل کی نباتاتی سائیکل سے مشابہت ومماثلت اور آخرت کی اصل اہمیت بیان کرنے کے بعد مسابقت الی الجنت کی دعوت دی گئی۔ وہ اپنی جگہ ایک مکمل مضمون تھا۔ اس کے بعد ان تین آیات میں یہ مضمون آ گیا کہ دنیوی مصائب ومشکلات اور تکالیف سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ؎

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب!
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے!

اس منتخب نصاب کے حصہ پنجم میں سورۂ آلِ عمران کی آیات کے درس میں یہ بحث آ چکی ہے کہ یہ مشکلات ومصائب اور آزمائشیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لیے آتی ہیں کہ ایک تو تمہارے اندر اگر کہیں کوئی کھوٹ ہے تو وہ دھل جائے' تم پاک وصاف ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ تمہیں پورے طریقے سے زرِخالص بنا دے۔ ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾ (آل عمران:۱۴۱) ''اور تاکہ اللہ اہل ایمان کو بالکل پاک وصاف کر دے''۔ پھر یہ کہ تمہارے جوہر اسی سے نمایاں ہوں گے۔ معلوم ہو جائے گا کہ Who is Who? کس کے اندر کتنا جذبہ اور شوقِ جہاد تھا' کس کے اندر کتنا جذبۂ انفاق تھا! اس
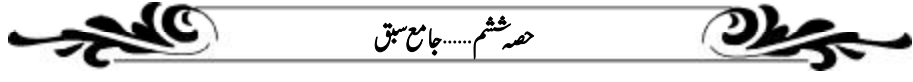
کے بغیر کیسے معلوم ہوتا کہ حضرت ابوبکر صدیق ﷛ اور حضرت عمر فاروق ﷛ کا مقام کیا ہے۔ انہی آزمائشوں سے ان کے جوہر کھلے ہیں، نکھرے ہیں، نمایاں ہوئے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین
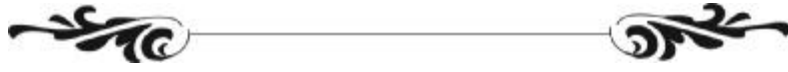
درس 30

قرآن حکیم کی عظیم ترین
انقلابی آیت
ارسال رُسل اور انزال کتاب
ومیزان کی غرض وغایت
قیام عدل وقسط

سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ کی آیت ۲۵ کی روشنی میں!

درس ۳۰

قرآن حکیم کی عظیم ترین ’’انقلابی‘‘ آیت

ارسالِ رُسل اورانزالِ کتاب و میزان کی غرض وغایت: ’’قیامِ عدل وقسط‘‘

سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کی روشنی میں!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾﴾

اب اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۵ زیرِ مطالعہ آئے گی جسے میں ایک مستقل حصہ قرار دے رہا ہوں اور یہ درحقیقت اس پوری سورۂ مبارکہ کا نقطۂ عروج ہے۔ انقلاب جس شے کا نام ہے اس کی connotation کو آپ اچھی طرح سمجھ لیجیے! انقلاب کہتے ہیں کسی اجتماعی نظام کو بدل دینا۔ ظاہر بات ہے کہ جو رائج الوقت Politico-Socio-Economic System ہے اس کو تلپٹ کریں گے‘ اس کا تختہ الٹیں گے تو کوئی اور نظام آئے گا۔ اس کے بغیر کسی دوسرے نظام کے لیے Existing System جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوگا۔ انقلابی عمل میں وعظ‘ نصیحت‘ تلقین‘ تعلیم‘ تبلیغ‘ یہ سب اپنی جگہ پر بہت ضروری ہیں‘ اس کا نقطۂ آغاز یہی ہے‘ لیکن اس کے بعد ایک مرحلہ آتا ہے جہاں طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ تلقین وتعلیم‘ وعظ ونصیحت اور دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں تمام طبقات سے نیک سرشت لوگ تو بلاشبہ کھنچ آئیں گے‘ جیسے کہ مقناطیس لوہ چون کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے‘ اور برادہ باقی رہ جائے گا۔ لیکن یہ ’’برادہ‘‘ وہ لوگ ہیں جن کے رائج الوقت نظام کے ساتھ

مفادات وابستہ ہیں۔ ہمارے معاشرے میں جاگیردار کا ایک اپنا مقام ہے‘ وہ پورے علاقے کا مالک اور بادشاہ سمجھا جاتا ہے اور وہاں پر بسنے والے باقی لوگ اس کے کمّی کاری ہیں‘ وہ اس کی رعیت شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جاگیردار کبھی بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ جاگیردارانہ نظام ختم ہو جائے۔ اس کے لیے ظاہر بات ہے کہ بالآخر طاقت کا استعمال ناگزیر ہے۔ دراصل یہ بات کہتے ہوئے انسان جھجکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قتل وخون ریزی اور غارت گری کوئی اچھی بات نہیں ہے‘ طاقت اور اسلحہ کا استعمال کوئی مستحسن کام نہیں ہے‘ بس ٹھنڈی ٹھنڈی بات ہو جائے‘ اور بڑی ہی آسانی کے ساتھ صرف دعوت وتبلیغ سے کوئی انقلاب آ جائے تو بہت اچھا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اس آیت مبارکہ میں اس تلخ حقیقت کو بالکل عریاں انداز میں بیان کر دیا ہے‘ تاکہ کوئی اشتباہ نہ رہ جائے‘ بات بالکل واضح ہو جائے۔ پورا انقلابی عمل آپ کو اس ایک آیت کے اندر مل جائے گا۔

سورۃ الصّف کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

اس آیہ مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے سے قبل یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ سورۃ الصّف کی چودہ آیات درحقیقت اس ایک آیت کی شرح اور تفصیل پر مشتمل ہیں۔ سورۃ الصّف چونکہ ہم پڑھ چکے ہیں لہٰذا اس کے مضامین کو ذہن میں تازہ کیجیے۔ اس کے شروع میں ڈانٹ ڈپٹ آئی ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝﴾

’’اے اہل ایمان! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ طرزِ عمل سخت ناپسندیدہ (اور اللہ کے غضب کو بھڑکانے والا) ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر جنگ کرتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔‘‘

اس سورت کا آغاز ہی قتال سے ہوا ہے۔ پھر چند آیات میں اہل کتاب کا تذکرہ آیا ہے۔ یہ گویا سورۂ حدید کے ان الفاظِ مبارکہ کی شرح ہوئی: ﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ چنانچہ وہاں وضاحت آ گئی کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا تھا‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انہوں نے کیا کیا‘ اور جب محمد رسول اللہ ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد آیت آ گئی:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ غالب کرے اسے کل کے کل دین پر۔ (پورے نظامِ زندگی پر یا تمام ادیان پر) چاہے یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار اور ناپسند ہو''۔

ان کی ناگواری کے علی الرغم یہ کرنا ہے! لیکن کریں گے کیسے؟ اہل ایمان میدان میں آئیں گے اور اُنہیں اپنی جانوں کا نذرانہ دینا ہوگا۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

''اے اہل ایمان! کیا میں ایسی تجارت کی طرف تمہاری رہنمائی کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا لے؟'' پختہ ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پرؑ اور جہاد کرو اس کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ہو''۔

اگلی دو آیات میں پھر اس بہتری کی وضاحت کی گئی۔ ایک تو اللہ کے جو اخروی وعدے ہیں وہ بیان کر دیئے گئے:

﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

''وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں رواں ہوں گی، اور ابدی قیام کی جنتوں میں تمہیں بہترین گھر عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی''۔

اصل کامیابی تو یقیناً وہی ہے، اس لیے کہ مقصودِ اصلی تو آخرت ہے، اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے، البتہ ایک اضافی وعدہ یہ بھی ہے:

﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''اور وہ دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے (وہ بھی تمہیں دے گا) اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبیؐ! اہل ایمان کو بشارت دے دیجئے!''

آخری آیت میں اللہ کی نصرت کی پکار ان الفاظ میں آئی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۭ﴾

''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو' جیسا کہ عیسٰی ابن مریم (علیہا السلام) نے حواریوں سے خطاب کر کے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟ (جواب میں) حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!''

رسولوں کے ساتھ بھیجی گئی تین چیزیں

اب ہم اس آیہ مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔فرمایا:﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ''ہم نے ہی بھیجا اپنے رسولوں کو بیّنات کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی''۔سورۃ الصّف کی آیت ۹ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ اور سورۃ الحدید کی زیر مطالعہ آیت میں اسلوب کا یہ فرق ہے کہ وہاں واحد کے صیغے میں' تعین کے ساتھ محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی رسالت کا مقصد بیان ہو رہا ہے' جبکہ یہاں اللہ تعالیٰ کا عمومی قانون اجتماعی طور پر تمام رسولوں کے بارے میں بیان ہو رہا ہے۔ یہاں ایک رسول کی بات نہیں ہو رہی ہے' بلکہ یہ ایک قاعدہ کلیہ اور قانون ہے۔﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا﴾''ہم ہی نے بھیجا اپنے رسولوں کو''۔

اب یہاں تین چیزیں بیان کی گئی ہیں جو رسولوں کے ساتھ بھیجی گئیں:﴿بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ یعنی ہم نے اپنے رسولوں کو یہ تین چیزیں دے کر بھیجا: (۱) بیّنات (۲) کتاب' اور (۳) میزان۔ان میں سب سے پہلی چیز ''بینات'' ہے۔ یہ لفظ اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے حصے میں بھی آ چکا ہے۔﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ﴾ (آیت ۹) ''وہی ہے جو اپنے بندے پر آیاتِ بینات نازل کر رہا ہے''۔اس کی میں وضاحت کر چکا ہوں کہ بیّن کہتے ہیں اُس شے کو جو اَز خود ظاہر ہو' خود نمایاں ہو' جس کو کسی اور دلیل کی حاجت نہ ہو' جس کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ع ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!'' یہ لفظ عام طور پر رسولوں کے تذکرے میں معجزات کے لیے آتا ہے۔ کسی رسول کو جو معجزہ دیا جاتا تھا وہ گویا بالکل واضح کر دیتا تھا کہ یہ بات کسی انسانی صلاحیت اور طاقت سے وجود میں نہیں آ سکتی' یقیناً یہ اللہ کی طرف سے ہے۔جیسے کہ قومِ ثمود کو ان کے مطالبے پر ایک معجزہ دیا گیا تھا۔انہوں نے کہا تھا کہ اے صالح! ہم تم پر ایمان لے آئیں گے اگر تم سامنے کی چٹان

سے ایک گا بھن اونٹنی برآمد کرا لو۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ یہ ماننے کو تیار ہیں' لہٰذا انہیں یہ معجزہ دکھا دیا جائے۔ اس پر چٹان شق ہوئی اور گا بھن اونٹنی برآمد ہوگئی' جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی اونٹنی (نَاقَةُ اللّٰہِ) قرار دیا' لیکن اس ناہنجار قوم نے پھر بھی نہیں مانا۔ چنانچہ وہ قوم ہلاک کر دی گئی' برباد کر دی گئی۔ معجزے کے آنے کے بعد بھی اگر قوم ایمان نہ لائے تو پھر اس کی ہلاکت ایک طے شدہ امر ہے۔

''میزان'' کا قرآنی تصور

''بینات'' کے ذکر کے ساتھ ہی فرمایا کہ ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ دو چیزیں مزید اُتاریں:
﴿وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ﴾ ''اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری اور میزان بھی''۔ کتاب کا لفظ تو عام فہم ہے' بالکل واضح ہے' سب سمجھ جائیں گے' جیسے حضرت موسٰیؑ کو تورات دی گئی۔ لیکن یہاں میزان سے مراد کیا ہے؟ میزان ''وزن'' سے اسم آلہ ہے۔ اصل میں یہ ''مِفعال'' کے وزن پر ''مِوْزان'' ہے۔ ''و'' یہاں پر ''ی'' کی شکل اختیار کر گیا اور ''میزان'' ہو گیا۔ وزن کرنے کا آلہ یعنی ترازو کو میزان کہا جاتا ہے۔ لیکن توازن کئی قسم کا ہے۔ یہاں کس قسم کا توازن مراد ہے جسے قائم کرنے کے لیے میزان اتاری گئی ہے؟ سورۂ رحمٰن کے درس کے دوران میں نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا کہ اس کائنات کے اندر ایک آفاقی توازن ہے۔ تمام اجرامِ فلکی کے درمیان ایک بیلنس قائم ہے جس کا ذکر وہاں بایں الفاظ کیا گیا: ﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الۡمِیۡزَانَ ۝ اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ ۝﴾ ''آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو''۔ درحقیقت یہاں مراد وہ بیلنس ہے جو تمام اجرامِ فلکی کے درمیان ہے۔ یہ تمام ستارے اور سیارے جو فضا کے اندر گردش میں ہیں ان کے مابین کشش ان کے باہمی فاصلوں کی نسبت سے ہے۔ چنانچہ یہ ایک دوسرے کو اپنی طرف اس انداز سے کھینچتے ہیں کہ ہر کُرہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔[1]

اسی طرح انسان کو زندگی گزارنے کا جو نظام اللہ عطا فرماتا ہے وہ نظام ایک میزان ہے' جس میں حقوق و فرائض کا توازن ہوتا ہے کہ فلاں کا یہ حق ہے اور یہ اس کا فرض یا اس کی ذمہ داری ہے۔ حقوق و فرائض کے بارے میں ایک عمومی اصول یہ ہے کہ جہاں زیادہ ذمہ داری ہوگی وہاں اختیار بھی زیادہ

(۱) اجرامِ فلکی کے باہمی توازن کے بارے میں علامہ اقبال نے کیا خوبصورت بات کہی ہے ؎

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں! (مرتب)

ہوگا۔ چنانچہ حقوق اور فرائض میں اگر توازن ہوگا تو وہ معاشرہ صحیح رہے گا' اور اگر اس کے اندر عدم توازن راہ پا گیا تو اسی کا نام ظلم' عدوان' زیادتی اور ناانصافی ہے۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ نے جو شریعتیں نازل فرمائیں ان سب کا مقصد یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں حقوق و فرائض کا توازن قائم رہے۔ مثلاً تین چیزوں کے اندر توازن کا معاملہ ایسا ہے کہ انسان کے لیے اس کا حصول آسان نہیں ہے۔

ان میں قدیم ترین مسئلہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان توازن کیا ہو۔ ظاہر بات ہے دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں' عورت مرد کی محتاج ہے اور مرد عورت کا محتاج ہے' لیکن ان کے مابین حقوق و فرائض کا توازن نہیں ہو پاتا۔ یا تو عورت کو ملکیت بنا لیا جاتا ہے' جوتی کی نوک سمجھا جاتا ہے' اسے یہ حیثیت دی جاتی ہے کہ نہ تو اس کے کوئی حقوق ہیں اور نہ ہی اس کا کوئی مقام و مرتبہ ہے —— اور یا پھر عورت مرد کے بالکل شانہ بشانہ ہو کر اپنی حدود سے تجاوز کر جاتی ہے' بلکہ قلوپطرہ کی صورت اختیار کر کے پورے پورے ملکوں کی قسمت کی نیّا ڈبو دیتی ہے۔ چنانچہ ان کے مابین توازن کی ضرورت ہے۔ عورت بھی یقیناً انسان ہے' اس کے حقوق بھی ہیں' اس کے احساسات بھی ہیں۔ اس کا اپنا ایک مقام ہے' معاشرے کے اندر اس کی ایک حیثیت ہے۔ وہ ماں' بہن' بیٹی اور بیوی ہے' اس کی عزت بھی ہونی چاہیے' لیکن اسے اس طرح کی آزادی نہیں دی جا سکتی کہ خاندانی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ بلکہ حقوق و فرائض میں توازن پر مبنی ایسا معاشرتی نظام ہونا چاہیے کہ فیملی ایک منظم' مستحکم اور integrated ادارہ ہو' اس کے اندر نظم و ضبط ہو۔ اس لیے کہ پورے معاشرے کے امن و سکون کا انحصار اسی ادارے پر ہے۔ معاشرہ خاندانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ دس ہزار' بیس ہزار' دس لاکھ یا بیس لاکھ خاندان ہیں جن کا نام معاشرہ ہے۔ معاشرے کی اس عمارت کے اندر اگر ہر اینٹ مستحکم نہیں ہے' اگر ہر خاندان کا ادارہ منظم نہیں ہے تو معاشرے میں انتشار اور chaos ہوگا۔

لیکن یہ سب کیسے ہو؟ یہ کون طے کرے کہ عورت کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا ہیں؟ اسی طرح مرد کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا ہیں؟ یہ آسان کام نہیں ہے۔ اس عقدے کا حل کرنا آسان نہیں۔ اگر مرد نظام بنائے گا تو ظاہر بات ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کو سامنے نہیں رکھ سکتا۔ اس کی تو اپنی نفسیات ہے۔ اسے صرف اپنے احساسات معلوم ہیں' لہٰذا وہ لازمی طور پر اپنا پلڑا بھاری رکھے گا اور اگر عورت کو موقع مل جائے تو ظاہر بات ہے اس کو صرف اپنے احساسات کا پتہ ہے' وہ مرد کی حیثیت سے سوچ ہی نہیں سکتی' وہ اس کی کیفیات کو محسوس کر ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا وہ اپنا نظام بنائے گی۔ چنانچہ انسان

محتاج ہے کہ وہ ایک متوازن نظام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے جو سب کا خالق ہے۔

دوسرا پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ انفرادیت اور اجتماعیت میں کیا توازن ہو؟ دنیا میں کہیں تو ملوکیت اور آمریت کے زیر اثر totalitarian society قائم ہو جاتی ہے۔ کوئی آمر مطلق اقتدار پر مسلط ہے اور لوگوں کو کوئی حقوق حاصل نہیں۔ نہ وہ اظہارِ خیال کر سکتے ہیں' نہ جماعت بنا سکتے ہیں۔ اس طرح کی آمریت اور ملوکیت میں فرد کچلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس معاملہ یہ ہوتا ہے کہ مکمل انفرادی آزادی ہوتی ہے جو آج مغرب میں ہے کہ جو چاہے کرو' چاہے ننگے ہو کر بازاروں میں نکل آؤ۔ دو مرد باہم شادی کرنا چاہیں تو انہیں اس کی آزادی ہے۔ ہم جنسیت (Homo sexuality) کے حق میں دلائل کے انبار لگائے جا رہے ہیں اور لمبے چوڑے قوانین وضع کیے جا رہے ہیں۔ یہ دوسری انتہا ہے کہ فرد کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے اور آپ کو اس کی آزادی میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ وہ جس طرح سے چاہتا ہے اپنی جنسی خواہش پوری کرے' آپ اسے روک نہیں سکتے۔ جب ایک مرد اور ایک عورت اپنی آزاد مرضی سے زنا کریں تو یہ جرم ہے ہی نہیں' البتہ اگر بالجبر زنا (rape) ہوا ہو تو وہ جرم ہے۔ ہر مرد و زن اپنے جسم کا مالک ہے' اسے اس پر پورا اختیار ہونا چاہیے' زیادہ سے زیادہ شوہر یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے حق پر دست درازی ہوگئی ہے۔ وہ جا کر سول کورٹ میں کیس کرے۔ اگر کسی کی بیوی اپنی مرضی سے کسی دوسرے شخص کے ساتھ تعلقات قائم کر لیتی ہے تو اس معاملے میں کوئی کریمنل کیس نہیں بنے گا۔ اب یہ آزادی کی انتہا ہے' جسے مادر پدر آزادی کہا جاتا ہے۔ مغربی معاشرہ اس انتہا کو نکل گیا ہے۔ اب فرد اور اجتماعیت میں کیا توازن ہو؟ یہ دوسرا نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔

انسانی معاشرے کا تیسرا پیچیدہ مسئلہ جو حال ہی میں پیدا ہوا ہے وہ مزدور اور سرمائے کے درمیان توازن کا ہے۔ یہ مسئلہ دراصل صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہوا ہے' اس سے پہلے یہ مسئلہ نہیں تھا۔ ایسے بڑے بڑے کارخانوں کا کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ جن میں بیس بیس' تیس تیس ہزار آدمی کام کر رہے ہوں۔ لہٰذا بڑا سادہ سا مبادلہ ہوتا تھا۔ جس نے کھیت میں کام کیا' ہل چلایا اور گندم اگائی' وہ گندم کی کچھ مقدار لے کر اُس جولاہے کے پاس چلا جاتا جو کرگھے یا کھڈی پر بیٹھا کھدر بن رہا ہوتا اور گندم کے عوض اس سے کھدر لے لیتا۔ اس طرح دونوں کی ضرورت پوری ہو جاتی۔ یہ مبادلہ (بارٹر سسٹم) پر مبنی سادہ ترین معیشت تھی۔ لیکن اس کے بعد پھر سرمایہ وجود میں آیا۔ اب سونے کو کرنسی کا

درجہ حاصل ہو گیا اور یہ طے کیا گیا کہ ایک تولہ سونا برابر ہے اتنے من گندم کے۔ چنانچہ جس نے اپنے پاس سونا جمع کر لیا اس کے پاس طاقت ہے' وہ جب چاہے گا مارکیٹ کو destabilize کر دے گا۔ وہ جب چاہے گا گیہوں کی بہت بڑی مقدار خرید لے گا اور قیمت بڑھا دے گا اور جب چاہے گا اسے منڈی میں لے آئے گا۔ پھر ذخیرہ اندوزی اور دولت کا ارتکاز اسی سے شروع ہوا۔ کوئی شخص اپنے پاس کتنی گندم جمع کر سکتا تھا اور اسے کتنی دیر رکھ سکتا تھا؟ لیکن سونا تو آپ جتنا چاہیں اور جب تک چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ سونا خراب نہیں ہوتا' اس کا کچھ بگڑتا نہیں۔ ایچ جی ویلز نے بڑی خوبصورت بات لکھی ہے کہ انسان کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ کرنسی کی ایجاد سے وہ کتنی بڑی لعنت کا طوق اپنی گردن میں ڈال رہا ہے۔ اس کے بعد پیپر کرنسی آئی تو اس سے مزید کئی لعنتوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ اس پیپر کرنسی کی بدولت آج پوری نوع انسانی کی معیشت کا حال شیش محل کی مانند ہے ۔

لو سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا!

پھر یہ کہ بڑے بڑے کارخانے ہیں' جن کے مالک سرمایہ دار ہیں۔ یہاں مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان ایک کشمکش چل رہی ہے۔ کارل مارکس کا سارا فلسفہ لیبر کی سرپلس ویلیو پر چلا ہے' جس کی بنیاد پر اتنا بڑا انقلاب آیا اور خون خرابہ ہوا۔ وہ سارا مسئلہ یہ ہے کہ مزدور اپنے حقوق کا اور سرمایہ دار اپنے سرمائے کا تحفظ چاہتا ہے۔ سرمایہ دار کارخانہ بند کر کے مزدور کو بے روزگار کر سکتا ہے۔ مزدور غریب کو معلوم ہے کہ اگر چار دن مجھے مزدوری نہیں ملی تو میرے گھر کے اندر فاقہ آ جائے گا' میرے بچے کے پینے کے لیے دودھ کہاں سے آئے گا؟ لہٰذا وہ کارخانے کے مالک کے رحم و کرم پر ہے کہ وہ اُسے جو اُجرت دے گا اس پر وہ کام کرنے پر مجبور ہے۔ یہ استحصال کی بدترین شکل ہے جو سرمایہ داری کی صورت میں مسلط ہے۔

تو یہ ہیں اصل میں تین مسائل جن میں حقوق وفرائض کے مابین توازن پر مبنی نظام سوائے اللہ کے کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ حقیقت ہے جس کو اگر لوگ سمجھ لیں تو شریعت کی عظمت اور اہمیت سامنے آئے گی۔ اسی لیے شریعت کو میزان کہا گیا۔ یہاں میزان سے ترازو مراد نہیں ہے کہ اللہ نے آسمان سے ترازو اتاری' بلکہ یہ کہ اُس نے کتاب اتاری۔ اور کتاب کے ساتھ شریعت کا جو نظام اتارا ہے وہ حقوق و فرائض کا ایک متوازن' balanced' منصفانہ اور عدل وقسط پر مبنی نظام ہے جو اُس نے عطا کیا ہے۔

ارسالِ رُسل کی غرض وغایت

اب اس آیت کو پڑھیے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ﴾ ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ''۔ یعنی معجزات اور براہین کے ساتھ۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ ''اور ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری اور میزان (شریعت) بھی''۔ ﴿لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔ یہ ہے اصل میں اس آیت کی جان جو اِن الفاظ میں ہے۔ ہم نے یہ سب کچھ کس لیے اتارا؟ رسول کس لیے بھیجے؟ کتاب کس لیے نازل کی؟ میزان کس لیے اتاری؟ تا کہ میزان نصب ہو! —— اس لیے نہیں کہ کتاب کی تلاوت کرتے رہو اور ثواب لیتے رہو۔ یہ کتاب اس لیے آئی تھی کہ اسے قائم کرو۔ یہ میزان اس لیے دی گئی تھی کہ میزان نصب ہو۔ جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق ﷛ نے بیعت خلافت کے موقع پر فرمایا تھا: ''لوگو! تم میں سے جو قوی ہے میرے نزدیک وہ ضعیف ہوگا جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں اور جو ضعیف ہے وہ قوی رہے گا جب تک کہ اسے اس کا حق دلا نہ دوں''۔ یہ ہے اصل میں وہ نظامِ عدل وقسط جسے قائم کرنے کے لیے حضور ﷺ مبعوث ہوئے۔ چنانچہ آپ ﷺ سے فرمایا گیا: اے نبی کہہ دیجیے! ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ﴾ (الشوریٰ: ۱۵) ''مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں!'' —— دیکھو' مجھے تم واعظ نہ سمجھنا جو ٹھنڈا ٹھنڈا وعظ کہتا ہے' میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ ایک گاؤں میں وعظ سنایا تو کچھ ہار گلے میں ڈلوائے' کچھ حلوے مانڈے کھائے اور اگلے گاؤں چلا گیا' پھر وہاں وعظ کیا۔ میں وہ نہیں ہوں (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ!) مجھے تو بھیجا گیا ہے اس لیے کہ میں عدل قائم کروں!

عدل کا مطلب کیا ہے؟ جو اپنے حق سے زائد لے رہا ہے اُس شیر کے منہ سے نوالہ نکالیں گے تو عدل ہوگا نا! اور کیا وہ اس کو پسند کرے گا؟ وہ تو مزاحمت کرے گا۔ چنانچہ عدل کو قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اسے عدالت والا عدل نہ سمجھئے۔ عدالت والا عدل تو یہ ہے کہ آپ کے ہاں جو بھی قانون رائج ہے اس کے تحت عدالت نے فیصلہ دے دینا ہے' اگرچہ وہ قانون ہی نامنصفانہ ہو۔ اگر اس نظام کی بنیاد ہی استحصال پر قائم ہے تو عدالت سے عدل کی کیا توقع ہوسکتی ہے؟ آپ نے تو چور کو سزا دے دی' کیونکہ آپ کے سول کوڈ میں لکھا ہوا ہے کہ جو چوری کرے گا اس کو یہ سزا ملے گی۔ لیکن آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ جس نے چوری کی ہے اس کا تعلق اُس طبقے سے تھا جس کا مسلسل استحصال ہو

رہا ہے اور اس نے جا کر کسی جاگیردار کے گھر کے اندر نقب لگائی ہے تو جاگیردار کے پاس جو دولت ہے وہ جائز طریقے سے آئی تھی یا ناجائز ذرائع سے؟ عدالت ان امور سے بحث نہیں کر سکتی۔ عدالت تو صرف ملکی نظام کے تحت رائج قانون کے تحت فیصلہ کرے گی کہ اس نے چوری کی ہے اور اس کی چوری کی سزا اسے مل رہی ہے —— جبکہ اصل شے نظام ہے۔ رسولوں کی بعثت عادلانہ و منصفانہ نظام (Politico-Socio-Economic System) قائم کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ اسی کے بارے میں یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔

اس نظامِ عدل و قسط کا قیام اللہ تعالیٰ کے ہاں کس قدر اہمیت رکھتا ہے اور اس پر قرآن حکیم میں کس قدر زور (emphasis) ہے اس کو سمجھانے کے لیے میں قرآن حکیم سے چند حوالے پیش کر رہا ہوں۔

ہمارے دین میں سب سے بنیادی حوالہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات ہیں۔ اس کے ضمن میں سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ (آیت ۱۸) ''اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف کا قائم کرنے والا ہے''۔ یہاں اللہ کی یہ شان اور یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ عدل و قسط قائم کرنے والا ہے۔ اُس نے روزِ جزا کا معاملہ رکھا ہی اس لیے ہے کہ عدل و قسط قائم ہو۔

دوسرا اہم معاملہ رسالت کا ہے۔ رسالت کی شان یہ بیان ہوئی ہے کہ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ اور یہ Generalised Statement ہے، تمام رسولوں کے بھیجنے کا مقصد یہی تھا۔ تمام کتابوں اور تمام شریعتوں کے نزول کا مقصد یہی تھا: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہوں''۔ نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ سے فرمایا گیا کہ اے نبیؐ! آپ ڈنکے کی چوٹ کہہ دیجیے کہ ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ ''میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں''۔

اس کے بعد اُمت کا معاملہ آتا ہے۔ اُمت کے لیے جو بات سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں کہی گئی ہے وہ ایک ہی ہے، صرف ترتیب بدل گئی ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ (آیت

۱۳۵)''اے ایمان کے دعوے دارو! (پوری قوت کے ساتھ) عدل وانصاف کو قائم کرنے والے اور اللہ کے حق میں گواہی دینے والے بن جاؤ! چاہے یہ بات تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف جارہی ہو''—— تمہیں عدل وانصاف کی بات کہنی ہے' یہ نہیں دیکھنا ہے کہ اس سے میری اپنی ذات کو یا میرے ماں باپ کو یا میرے خاندان اور رشتہ داروں کو نقصان پہنچ جائے گا۔ جو بات عدل کی ہے وہ ڈنکے کی چوٹ کرو۔

یہی بات ذرا ترتیب بدل کر سورۃ المائدۃ کے اندر آتی ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؗ﴾ (آیت ۸)''اے اہل ایمان! اللہ کی خاطر عدل وانصاف کی گواہی دینے والے بن کر کھڑے ہو جاؤ! اور دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے انحراف کرو۔ عدل کرو' یہ پرہیز گاری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے''۔ مقدم الذکر آیت میں فرمایا گیا ہے کہ حق کی بات کہو چاہے وہ تمہاری اپنی ذات' تمہارے والدین یا تمہارے اپنے کنبے قبیلے کے خلاف جارہی ہو۔ دوسری آیت میں وہی بات برعکس طور پر کہی کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے انحراف کرو۔ عدل سے کام لو' یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ یہ ہے عدل وقسط کی اہمیت جو قرآن حکیم میں بیان ہوئی ہے۔ اور مطلوب یہ ہے کہ یہ عدل وقسط اجتماعی نظام کی شکل میں ہو۔

سورۃ الحدید اور سورۃ الصّف کی دو آیات کا تقابلی مطالعہ

میں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے زیر درس آیہ مبارکہ کے اس حصے کا سورۃ الصّف کی آیت ۹ سے ایک تقابلی مطالعہ کر لیا جائے۔

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۠﴾

سورۃ الصّف کی یہ آیت اس سورت کی مرکزی آیت اور اس کا عمود ہے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون تین مرتبہ بالکل انہی الفاظ میں آیا ہے' سوائے اس کے کہ ایک مقام پر صرف آخری حصہ ذرا مختلف ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ یہ الفاظ قرآن حکیم میں تین دفعہ آئے ہیں۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳' سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصّف کی آیت ۹ انہی الفاظ پر مشتمل ہے۔ سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف میں آیت کے اختتام پر ﴿وَلَوْ كَرِهَ

الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ کے الفاظ ہیں' جبکہ سورۃ الفتح میں ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ کے الفاظ پر آیت ختم ہوتی ہے۔ تقابلی مطالعہ اس اعتبار سے کرنا ہے کہ سوۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں تمام رسولوں کے ساتھ تین چیزوں کا ذکر کیا گیا: ﴿اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ اور اس سے پہلے ﴿بِالْبَيِّنٰتِ﴾ جبکہ حضور ﷺ کے بیان میں صرف دو چیزوں کا ذکر ہوا: ﴿الْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾. اس لیے کہ حضور ﷺ کا اصل معجزہ قرآن حکیم ہے۔

الہدیٰ سے مراد قرآن ہے۔ یہ هُدًى لِّلنَّاسِ ہے' هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے' الْهُدٰى (The Guidance) ہے' جس میں ہدایتِ خداوندی مکمل ہو چکی' اپنے اتمام کو پہنچ چکی' درجۂ تکمیل کو پہنچ چکی اور حضور ﷺ کا معجزہ بھی یہی ہے۔ حضور ﷺ کا معجزہ ید بیضا نہیں ہے' عصائے موسیٰؑ کی شکل میں نہیں ہے' چٹان سے کسی اونٹنی کے برآمد ہو جانے کی صورت میں نہیں ہے' بلکہ حضور ﷺ کا معجزہ قرآن ہے۔ ﴿يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ ''قرآن حکیم کی قسم ہے (یہ حکمت بھرا قرآن گواہ ہے اس پر کہ) آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں''۔ ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝﴾ ''قرآن مجید کی قسم ہے۔'' یہ باعظمت قرآن گواہ ہے آپؐ کی رسالت پر۔ ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِى الذِّكْرِ ۝﴾ ''قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی''۔ یہ قرآن جو ذکر والا ہے' نصیحت والا ہے' یہی آپؐ کی رسالت کا ثبوت ہے۔ تو یہ جان لیجیے کہ قرآن حکیم صرف کتاب نہیں ہے' بلکہ یہ معجزہ + کتاب = الہدیٰ ہے۔ اور وہ جو میزانِ شریعت چلی آ رہی تھی وہ اپنی تکمیل کو پہنچ گئی ہے دینِ حق کی شکل میں۔

میری کتاب ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' تین مقالات پر مشتمل ہے' درمیانی مقالہ کا موضوع یہی ہے کہ حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا ہے؟ اور اس میں تفصیل بیان کی گئی ہے کہ جیسے انسانی ذہن ارتقائی منازل طے کرتا ہے اسی طرح نوعِ انسانی کا فکر اور ذہن بھی بحیثیتِ مجموعی ان ارتقائی مراحل سے گزرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان اپنے ذہنی ارتقاء کے اعتبار سے بلوغ کو پہنچ گیا تو محمد رسول اللہ ﷺ پر ''الہدیٰ'' کا اتمام ہو گیا۔ اسی طریقے سے تمدنِ انسانی کا بھی ارتقاء ہوا ہے۔ کبھی انسان غاروں میں رہتا تھا' کوئی اجتماعی نظام تھا ہی نہیں۔ پھر کوئی قبائلی نظام قائم ہوا' پھر کوئی ریاستی نظام قائم ہوا' پھر بڑی بڑی مملکتیں قائم ہو گئیں۔ اور اب آ کر پورا نظامِ زندگی جس طور سے اجتماعیت کی گرفت میں آ چکا ہے' تو اگر وہ نظام صحیح ہو تو تمام افراد کا معاملہ بھی بہتر ہو جائے گا' اور نظام ہی غلط ہو تو ظاہر بات ہے کہ معاشرہ تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ تو جب وہ تمدن اس سطح کو پہنچ گیا کہ روم اور فارس جیسی بڑی

بڑی عظیم مملکتیں (Empires) قائم ہو گئیں تو اس وقت حضور ﷺ کو عدل و قسط پر مبنی ایک کامل نظامِ اجتماعی (Politico-Socio-Economic system) دے کر بھیجا گیا' جسے آپ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب میں بالفعل قائم کر کے دکھایا اور اسے پوری دنیا میں قائم کرنے کی ذمہ داری اُمت کے سپرد فرمائی۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب تک اسے قائم کر کے نہ دکھا دیا جائے' یہ نظام دنیا پر حجت نہیں بن سکتا۔

شہادت علی الناس پر ان دروس میں بھی گفتگو ہوئی ہے کہ شہادت زبان سے بھی دی جاتی ہے' دل سے بھی اور عمل سے بھی۔

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق!

ہم گواہی دیتے ہیں: نَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـــهَ اِلَّا اللّٰهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰه ۔ ہمیں یہ گواہی اپنے عمل سے بھی دینی چاہیے کہ واقعۃً ہم اللہ کو اپنا الٰہ' معبود اور حاکمِ مطلق مانتے ہیں اور محمد ﷺ کو واقعۃً اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ پھر یہ گواہی انفرادی طور پر ہی نہیں' اجتماعی طور پر بھی مطلوب ہے' اور یہ گواہی اُس وقت قائم ہوگی جب کہ وہ نظام عملاً قائم کر کے دکھایا جائے۔ ورنہ کہا جائے گا کہ یہ محض خیالی جنت (Eutopia) ہے' باتیں تو بڑی اچھی ہیں' لیکن قابل عمل نہیں ہیں' انہونی سی باتیں ہیں۔ ''سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ'' کہنا تو بڑا آسان ہے' لیکن کیا واقعۃً کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟ جی ہاں! اس کا عملی نقشہ اگر دیکھنا ہو تو ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھ لیجیے۔ ایسا نہیں ہے کہ بس کوئی شاعری کی گئی ہو' معاذ اللہ ——— بلکہ وہ نظام عملاً قائم کر کے دکھایا جس میں ہر نوع سے توازن ہے۔ عورتوں کو حقوق دیئے گئے ہیں' لیکن وہ حقوق اس طرح کے نہیں ہیں کہ خاندانی نظام درہم برہم ہو جائے۔ عوام کو حقوق دیئے ہیں' وہ خلیفۃ المسلمین کو دورانِ خطبہ ٹوک کر پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کُرتا آپ نے کہاں سے بنایا ہے؟ لیکن وہ آزادی اس طرح کی بھی نہیں ہے کہ وہ نظام ہی بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اسی طرح جو صاحبِ مال ہے اس کے اپنے حقوق ہیں' لیکن مزدور کا اپنا حق ہے۔ صاحبِ مال کو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ سود کی بنیاد پر اپنے مال میں اضافہ کرنے لگے اور ارتکازِ زر کا مرتکب ہو۔ اسلام کے نزدیک یہ سب سے بڑی حرام شے ہے۔ یہ نظام ہے جو دینِ حق کی شکل میں محمد عربی ﷺ کو دیا گیا۔

ہم تقابل کر رہے تھے کہ جہاں عمومی قانون بیان ہوا' وہاں تین چیزیں مذکور ہوئیں: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا معاملہ خصوصی

ہے۔اس کے بارے میں فرمایا:﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ﴾ اس لیے کہ الہدیٰ قرآن ہے' قرآن ہی معجزہ بھی ہے اور قرآن ہی الکتاب بھی ہے۔اور وہ نظامِ عدلِ اجتماعی دینِ حق کی شکل میں کامل نظام کی حیثیت سے پیش کر دیا گیا۔تو کس لیے بھیجا حضور کو؟﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ''تا کہ اس کو کل جنسِ دین پر غالب کر دے''۔اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو غالب کر کے دکھائے۔ یہ نظام کسی اور نظام کے تابع رہے گا تو پھر ظاہر کیسے ہوگا؟ اگر یہ ملوکیت کے تابع ہو گیا' سرمایہ داری کے تابع ہو گیا یا کسی اور نظام کے تابع ہو گیا تو پھر وہ نظام نہیں' مذہب بن جائے گا' جو عقائد' مراسمِ عبودیت اور سماجی رسومات کا مجموعہ ہوگا۔جیسا کہ خلافت راشدہ کے بعد تدریجاً جب خلافت کا نظام ختم ہوا اور ملوکیت آئی' جاگیرداری آئی' سرمایہ داری آئی' تو دین سکڑ کر مذہب کی صورت اختیار کر گیا۔اب یہ صرف عقائد اور نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ تک محدود ہو گیا۔اس کے علاوہ کچھ ذکر اور مراقبوں کے حلقے اس میں راہ پا گئے۔ باقی رہا نظام' وہ تو بادشاہوں کا تھا۔محلات ان کے بننے لگے۔ بادشاہ کی محبوب بیوی کا انتقال ہوا تو کروڑوں روپے سے تاج محل بن گیا۔ بادشاہ کو محل چاہیے' الحمرا بن گیا۔ بادشاہ کے لیے تو بڑا شاندار توپ کاپی جیسا محل ہونا چاہیے۔استنبول میں جا کر دیکھئے کتنا عظیم الشان محل بنایا ہے۔کہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے جو حجرے میں رہتے تھے' لیکن ان کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کے اندر لرزہ طاری ہوتا تھا' کہاں یہ عالم کہ عیاشیاں ہیں' ایوان سجا رکھے ہیں' لیکن دنیا کے اندر ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔تو بہرحال اس چیز کو سمجھئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت یہ ہے:﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ تا کہ وہ اس دین کو غالب کریں' قائم کریں' نافذ کریں اور پورے نظامِ زندگی پر اسلام چھا جائے' اسلام غالب آ جائے' اسلام قائم ہو جائے۔زندگی کا کوئی جزو' کوئی پہلو' اس سے خارج اور آزاد نہ رہ جائے۔وہی بات یہاں کہی گئی:﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾

انزالِ حدید کی غرض و غایت

اب یہ مقصد پورا کیسے ہوگا؟ فرمایا:﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے''﴿فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ﴾ ''جس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے''۔''بأس'' کا ترجمہ بعض حضرات صرف قوت کر دیتے ہیں کہ ''اس میں بڑی طاقت ہے'' لیکن اس کا حقیقی ترجمہ ''اسلحہ کی قوت'' ہے۔اسی لوہے سے تلوار' نیزہ' ڈھال اور دیگر سامانِ جنگ تیار ہوتا ہے''بأساء'' جب جمع کی شکل میں آتا ہے تو اس

سے مراد فقر و فاقہ' بھوک اور تنگی ہوتا ہے لیکن جب ''البـــاس'' آتا ہے تو یہ جنگ ہی کے معنی میں آتا ہے۔ ہمارے منتخب نصاب کے درس دوم (آیۃ البر) میں یہ دونوں ہی الفاظ آئے ہیں—— فرمایا:

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

''اور صبر کرنے والے تنگی و مصیبت کے وقت میں اور (حق و باطل کی) جنگ میں۔''

چنانچہ ''اَلْبَاْسَاءِ'' سے تنگی' فاقہ' بھوک' زخم وغیرہ کی تکلیف یا کوئی مصیبت وغیرہ مراد ہے' جبکہ ''الباس'' جنگ ہے۔ انسان کا اصل امتحان تو ''حِيْـنَ الْبَـاْسِ'' یعنی جنگ کے وقت ہی ہوتا ہے جہاں جان کے لالے پڑ جائیں' جہاں جان کی بازی کھیلنی پڑے۔ جو وہاں پر صبر کا مظاہرہ کر سکیں وہ ہیں کہ جن کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّـذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُـمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو واقعتاً (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ جو واقعتاً متقی ہیں۔'' یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے ان الفاظ کا مطالعہ کیجیے: ﴿فِيْـهِ بَـاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ ''اس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے''۔ ﴿وَّمَـنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں''۔ آج کل تو اس اعتبار سے ہمارے نزدیک لوہے کی اہمیت کم ہو گئی ہے' ورنہ توا' پرات' چمٹا' پھونکنی سب لوہے سے ہی بنتی تھیں۔ اب ہمارے زیر استعمال اشیاء میں لوہا اس طرح سے نمایاں نظر نہیں آتا' لیکن بہر حال اس میں لوگوں کے لیے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَلِيَـعْلَـمَ اللّٰـهُ﴾ ''اور تا کہ اللہ یہ ظاہر کر دے''۔ ''لِيَـعْلَـمَ'' کا لفظی ترجمہ ہے ''تا کہ اللہ یہ جان لے'' لیکن ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں ''تا کہ اللہ دکھا دے' ظاہر کر دے''۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تو قدیم ہے' اللہ کو معلوم ہے کون کتنے پانی میں ہے' لیکن اللہ لوگوں کو دکھا دینا چاہتا ہے اور یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہے۔ ﴿مَنْ يَّـنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے''۔ دین اللہ کا ہے جس کے قیام کی جدوجہد کرنا ہے۔ حاکمیت اللہ کے لیے ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں ہم دو مرتبہ یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿لَـهٗ مُـلْكُ السَّـمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اسی کی بادشاہت ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی''۔ پھر ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿وَهُـوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''وہی غالب حکمت والا ہے''۔ وہ العزیز بھی ہے' الحکیم بھی ہے۔ بادشاہ حقیقی وہ ہے' حکم اس کا چلنا چاہیے۔ لہٰذا جو لوگ اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے حکم کو نافذ کرتے ہیں وہ اللہ کے مددگار ہیں۔ اور اللہ کے اس دین کو عملاً قائم کرنا فرضِ منصبی ہے محمد

رسول اللہ ﷺ کا اور تمام رسولوں کا' تا کہ دنیا میں عدل قائم کریں۔ اس کے لیے یہاں الفاظ آئے: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔ سورۃ الشوریٰ میں واحد کے صیغے میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے فرمایا گیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل کروں''۔ اور سورۃ التوبہ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف میں تین مرتبہ یہ الفاظ آ گئے: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تو گویا کہ جو بھی لوہے کی طاقت لے کر محمد رسول اللہ ﷺ کی نصرت کے لیے میدان میں آ گئے وہ ہیں اللہ کے بھی مددگار اور رسولؐ کے بھی مددگار۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقِ انقلاب

یہ وہ حقیقت ہے جس کے بارے میں میں نے کہا تھا کہ اسے قرآن نے عریاں انداز میں بیان کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو حق بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں' کوئی رکاوٹ نہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الاحزاب: ۵۳) ''اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا''۔ عام آدمی سمجھے گا یہ بات کہنے کی نہیں ہے' اگر ہے بھی تو دل میں رکھو' اس کو زبان پر نہ لاؤ۔ لیکن یہاں اچھی طرح بات سمجھا دی گئی ہے کہ دنیا میں نظامِ عدل اجتماعی کو قائم کرنے کا طریقِ کار کیا ہے؟ اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ آپؐ کو جو الہدیٰ دی گئی ہے' جو کتاب ہدایت بھی ہے اور معجزہ بھی' اس کے ذریعے سے لوگوں کو دعوت دیجیے۔ اسی ہدایت کی لوگوں میں تبلیغ کیجیے۔ اس پیغامِ ربانی کو عام کیجیے' لوگوں کو ذہناً اور قلباً اس پر مطمئن کیجیے' اس کے مضمرات کو کھول کر بیان کیجیے۔ ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ (النحل) ''(اے محمدؐ) ہم نے آپ پر یہ ذکر نازل فرمایا تا کہ آپ لوگوں کے لیے اس تعلیم کی تشریح اور وضاحت کریں جو ان کے لیے نازل کی گئی ہے''۔ یہ سارے کام کیجیے۔ جیسا کہ سورۃ الجمعہ میں ہم نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہجِ عمل کے عناصر چہارگانہ پڑھ چکے ہیں: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ —— یعنی لوگوں کو اللہ کی آیات سنانا' ان کا تزکیہ کرنا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دینا۔

ہمیں پانچویں جماعت میں سب سے پہلا سائنسی تجربہ غالباً یہ کرایا جاتا تھا کہ لوہ چون اور لکڑی کے برادے کو علیحدہ کیسے کیا جائے گا۔ ہاتھ میں مقناطیس لے کر اس مکسچر پر پھیریئے تو لوہ چون اس کے ساتھ چمٹتا چلا جائے گا اور برادہ باقی رہ جائے گا۔ بالکل یہی معاملہ اس ''الہدیٰ'' کا ہے۔ یہ ہدایت کی طرف کھینچنے والا مقناطیس ہے۔ اور یہ اسی کو اپنی طرف کھینچے گا جس کی اپنی فطرت کے اندر کسی نہ کسی

درجے میں ہدایت موجود ہے۔ اگر وہ موجود نہیں تو جیسے برادہ میگنٹ کے ساتھ نہیں چمٹتا اسی طرح اس الہدیٰ کے ساتھ وہ ابوجہل نہیں چمٹے گا جس کی فطرت مسخ ہو چکی۔ ابولہب نہیں چمٹے گا چاہے وہ حقیقی چچا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک دیوار بیچ کا پڑوسی ہے۔ اس کا حال تو یہ تھا کہ اگر حضورؐ کے گھر میں ہنڈیا پک رہی ہے تو اس کے اندر بھی اس کے گھر سے غلاظت پھینکی جا رہی ہے' اور یہ سگا چچا کر رہا تھا جو باپ کی جگہ پر ہوتا ہے' لیکن عناد' دشمنی' شقاق اور حسد کے جذبات کے زیر اثر وہ اندھا بہرا ہو چکا تھا۔ اس حوالے سے جان لیجیے کہ جس کے اندر صلاحیت ہے وہی اس مقناطیس کے ذریعے کھنچے گا۔ جو شے حرارت کے لیے اچھے موصل (کنڈکٹر) کا درجہ رکھتی ہے' اسی میں حرارت سرایت کرے گی۔ اسی طرح جو بجلی کے لیے اچھا موصل ہے' اسی میں سے الیکٹرک کرنٹ گزر سکے گا۔ لیکن بہرحال آپ اس میگنٹ کو پھیلائیں۔ جتنا بڑا معاشرہ ہے اسی پیمانے پر پھیلائیں گے' تب ہی اس میں جو بھی سلیم الفطرت لوگ ہیں وہ چمٹ کر آئیں گے۔ اگر آپ صرف اپنی کُلھیا میں گڑ پھوڑتے رہیں گے' تو آس پاس کے لوگوں کو کیا پتا چلے گا؟ لہٰذا آپ اپنے میدانِ کار کی وسعت کے مطابق اس قرآن کی دعوت کو پھیلایئے' عام کیجیے۔

پھر یہ کہ یہ دعوتِ قرآنی وقت کی ذہنی سطح کے مطابق ہو۔ یہ نہ ہو کہ آپ صرف وعظ کہہ رہے ہوں اور آپ کے معاشرے کا جو ذہین عنصر ہے وہ اس کی طرف توجہ ہی نہ دے۔ آپ جو دعوت دے رہے ہیں اس کے لیے دلائل اور براہین ہونے چاہئیں۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط﴾ (النحل:۱۲۵) ''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت و حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ' اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو''۔ قرآن معجزہ بھی ہے' قرآن برہان بھی ہے' قرآن میں حکمت بھی ہے' ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰی اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (بنی اسراءیل:۳۹) ''یہ ہیں وہ حکمت کی باتیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں''۔ آپ اپنے معاشرے کے ذہین عناصر کو متاثر کیجیے' تعلیم یافتہ طبقے میں اسے عام کیجیے۔ قرآن کے وعظ و نصیحت کے ذریعے سے عوام الناس کو کھینچیے۔

بہرحال جن کے اندر بھی خیر اور بھلائی ہے' صلاحیت ہے' وہ کھنچے چلے آئیں گے۔ لیکن جن کے اندر صلاحیت نہیں ہے' وہ نہیں آئیں گے۔ اور جن کے پیش نظر مفادات ہیں وہ بات کو حق سمجھ کر بھی نہیں آئیں گے' جیسے کہ میں پہلے مثال دے چکا ہوں کہ یہود کے علماء سے بڑھ کر کون تھا جو حضور ﷺ کو پہچان سکتا تھا؟ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے: ﴿یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ

هُمْ﴾(البقرۃ:۱۴۶) ''وہ انہیں اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں''۔لیکن انہوں نے آپؐ کو مانا کیوں نہیں؟ اس لیے کہ ان کی چودھراہٹیں تھیں' ان کی مسندیں تھیں' ان کی حیثیتیں تھیں' لوگ ان کے ہاتھ چومتے تھے۔ لوگ آ آ کر ان سے فتویٰ مانگتے تھے' ان سے مسئلے پوچھتے تھے۔ وہ کتابِ الٰہی کے عالم تھے۔ لہٰذا اب اگر وہ حضورﷺ کو مان لیتے' تو ان کی حیثیت ختم ہوتی تھی۔ چنانچہ نہیں مانا۔ اس حوالے سے جان لیجیے کہ مراعات یافتہ طبقے کا ایک بڑا حصہ' جس کے موجودہ نظامِ باطل کے ساتھ مفادات وابستہ ہیں' اس دعوت پر کان نہیں دھرے گا —— بلکہ ان کی تو کوشش یہ ہوگی کہ انقلابِ اسلامی کا راستہ روکو! نظامِ کہنہ کے پاسبانو' یہ معرضِ انقلاب میں ہے!! ان کی تو آپس میں جتھہ بندیاں بنیں گی کہ آؤ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

چنانچہ اب ایک ہی راستہ ہے کہ جو سلیم الفطرت لوگ آ گئے ہیں' ان کو جمع کیا جائے اور ان کا تزکیہ کیا جائے۔ ان کی نیتیں بھی خالص ہو جائیں' کوئی کھوٹ نہ رہے۔ ان کی شخصیتیں نکھر جائیں۔ لوگوں کو ان کے کردار کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ یہ آزمائشوں میں سے گزریں' امتحانوں میں سے نکلیں' اور کندن بن جائیں۔ پھر ان کو منظّم کرو' آرگنائز کرو اور ان کو بٹ کر کوڑا بناؤ۔ جیسے مختلف دھاگوں اور رسیوں کو بٹ دیں تو کوڑا بنتا ہے۔ علیحدہ علیحدہ دھاگا کمزور ہوتا ہے' اسے جو چاہے توڑ سکتا ہے۔ لیکن دھاگوں کو بٹ کر رسیاں اور رسیوں کو باہم بٹ کر جو کوڑا بنایا جاتا ہے یہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ نے یہ جو کوڑا بنایا ہے' اب یہ کوڑا باطل کے سر پر دے مارو۔ یہ ہے اصل میں فلسفہ انقلاب۔ اس کے لیے ظاہر بات ہے ٹکرانا پڑے گا۔ اور ٹکرانے کے لیے جب میدان میں آؤ گے تو يَقْتُلُوْنَ کے ساتھ يُقْتَلُوْنَ بھی ہوگا۔ جہاں قتل کرو گے وہاں خود بھی قتل ہو گے۔ تمہیں کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی کہ تم قتل نہیں ہو گے۔ یہ گارنٹی تو صحابہ کرام ؓ کو بھی نہیں دی گئی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کوئی لوہے کا جسم نہیں دیا گیا تھا کہ برچھا اس کے پار نہیں ہوگا۔ چنانچہ وحشی کی برچھی حضرت حمزہؓ کو ناف کے قریب لگی اور جسم کے آر پار ہوگئی۔ جب صحابہ کرام ؓ کو ایسی کوئی ضمانت نہیں دی گئی تھی تو پھر اور کون ہوگا جسے کوئی ضمانت حاصل ہو یا اللہ کی طرف سے انشورنس ہو؟ نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو دوٹوک الفاظ میں ارشاد فرما دیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ؕ﴾ (التوبۃ:۱۱۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو اہل ایمان سے ان کے مال اور ان کی جانیں جنت کے عوض خرید لی ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔''

غزوۂ بدر میں ستر قریشی مارے گئے اور صحابہ ؓ میں سے صرف تیرہ شہید ہوئے۔ ان کے علاوہ ایک زخمی تھے جو مدینہ واپسی پر راستے میں شہید ہو گئے۔ لیکن غزوۂ احد میں مسلمانوں کی ایک غلطی کی وجہ سے پانسہ بالکل پلٹ گیا اور ستر مسلمان شہید ہو گئے۔ تو ''یَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ'' کا معاملہ تو کرنا پڑے گا' انقلاب اس کے بغیر نہیں آتا۔ انقلاب کے لیے جان بھی دینی پڑے گی اور اس کے لیے طاقت کا استعمال بھی کرنا ہوگا۔

دین کے بعض حقائق کو علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ان کے یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

(۱) گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن!

''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا کہ یہ جو میری دنیا ہے کیا یہ تمہارے لیے سازگار ہے؟ (یعنی کیا اس کا موجودہ نظام تمہیں پسند ہے؟ تم اس پر مطمئن ہو؟) میں نے عرض کیا کہ نہیں' یہ میرے لیے سازگار نہیں ہے۔ اس پر اللہ نے فرمایا کہ پھر اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دو!''

اور اس ''برہم زن!'' کا طریق کار کیا ہے؟ اسے اقبال نے اگلے شعر میں واضح کر دیا ؎

(۲) با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

پہلا مرحلہ درویشی یعنی دعوت و تبلیغ کا ہوگا۔ گالیاں کھا کر بھی دعائیں دینی ہوں گی۔ پتھراؤ کے جواب میں بھی پھول پیش کرنے ہوں گے۔ جو لوگ خون کے پیاسے ہیں انہیں معاف کرنا ہوگا۔ جیسے کہ اہل طائف کی طرف سے شدید ترین اذیت رسانی کے بعد بھی نبی رحمت ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے:

﴿اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے۔ اس لیے کہ یہ جانتے نہیں ہیں''۔ دعوت کے مرحلے میں تو گویا بدھ مت کے بھکشوؤں والی روش اختیار کرنی پڑے گی۔ دعوت کے اندر تو التجا بھی ہوتی ہے' لجاجت بھی ہوتی ہے کہ اللہ کے بندو میری بات سنو! در در پر جا رہے ہیں۔ کسی نے کچھ کہہ دیا' کسی نے کچھ کہہ دیا۔

رسول اللہ ﷺ طائف میں وہاں کے تینوں سرداروں سے ملے ہیں۔ ایک نے کہا: اچھا جی آپ کے سوا کوئی نہیں ملا تھا اللہ کو رسول بنانے کے لیے؟ نکل جاؤ یہاں سے! ایک نے کہا: جاؤ چلے جاؤ' میں تم سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ایک نے کہا: یا تو تم جھوٹے ہو یا سچے ہو' اگر جھوٹے ہو تو جھوٹے کو میں منہ نہیں لگاتا اور اگر سچے ہو تو میں کہیں گستاخی کر بیٹھوں گا۔ لہٰذا بہتر ہے تم روانہ ہی ہو جاؤ۔ ایسے ایسے زہر میں بجھے ہوئے جملے محمد رسول اللہ ﷺ کو سننے پڑے۔ اور پھر جب وہاں سے واپس روانہ ہوئے تو انہوں نے وہاں کے اوباش لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا' جنہوں نے محبوبِ ربُّ العالمین ﷺ پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈی کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اور اُس وقت صرف ایک ساتھی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ ایک آدمی ایک طرف سے ہی ڈھال بن سکتا ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کو بچانے کے لیے' آپؐ کو cover کرنے کے لیے ایک طرف آتے تو اوباش دوسری اطراف سے پتھر مارتے۔ جسم اطہر لہولہان ہو رہا ہے۔ پاؤں میں آ کر خون جوتوں میں جم گیا ہے۔ پھر کچھ غشی سی طاری ہوگئی تو آپؐ بیٹھ گئے ہیں۔ اس پر ایک غنڈے نے ایک بغل میں ہاتھ ڈالا' دوسرے نے دوسری بغل میں' اور حضور ﷺ سے کہا کہ اٹھو' چلو! دعوت کے مرحلے میں۔ یہ نقشہ ہے اللہ کے رسول ﷺ کا۔ محبوبِ ربُّ العالمین ﷺ کا — سیّد الاوّلین والآخرین ﷺ کا —

رسول اللہ ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلاء اور امتحان کا یہ نقطۂ عروج (Climax) ہے۔ شہر سے باہر آ کر آپ ﷺ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر تشریف رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ دعا آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہے کہ جس کو پڑھتے' سنتے اور سناتے وقت کلیجہ شق ہوتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْكَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّةَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

''اے اللہ! کہاں جاؤں' کہاں فریاد کروں' تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں' اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی ــــ اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے' اس کی''۔

اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَ اَمْرِیْ؟

''اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟''

اِنْ لَمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُكَ فَلَا اُبَالِیْ!

''پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں' مجھے اس تشدد کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' (ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!)

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمٰتُ

''اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات منور ہو جاتے ہیں۔''

اُس وقت ملک الجبال حاضر ہوتا ہے کہ اللہ نے مجھے بھیجا ہے' میں پہاڑوں پر مامور فرشتہ ہوں۔ آپؐ اگر حکم دیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو ٹکرا دوں جس کے مابین طائف کی یہ بستی ہے جس میں آپؐ کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہے۔ فرمایا: نہیں' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے۔

اب بتایئے کون بدھ مت کا بھکشو درویشی میں اس سے آگے جائے گا؟ اور جبکہ اپنے ساتھی نگاہوں کے سامنے ذبح کیے جا رہے ہیں' حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا ذبح کی جا رہی ہیں' ان کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو ابوجہل نے جس برے طریقے سے سرعام ٹکڑے کر دیا' اس پر بھی آپؐ نے اہل ایمان کو مشتعل نہیں ہونے دیا۔ تشدد و تعذیب کے وقت حضور ﷺ ان کے پاس سے گزرتے تو یہ فرماتے: ((اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرَ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃَ)) ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو' تمہارے وعدے کی جگہ اللہ کے ہاں جنت ہے''۔—— لیکن ساتھیوں میں سے کسی کو اجازت نہیں دی کہ ابوجہل کی تکہ بوٹی کر دے۔ اس لیے کہ ابھی مرحلہ درویشی کا ہے۔

نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

ابھی ذرا اپنے جذباتِ انتقام کو تھامے رکھو! ابھی مرحلہ Passive Resistance کا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ تمہارے ہاتھ کھول دیئے جائیں گے۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ تمہیں اذنِ قتال ملے گا' تمہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اجازت ملے گی۔ لیکن ابھی اپنے ہاتھ باندھے رکھو! پھر وہ وقت آیا کہ اب تلواریں بھی ہیں' نیزے بھی ہیں' میدان میں آئے ہیں ﴿یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ﴾ کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس سارے process کو علامہ اقبال نے دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔

با نشۂ درویشی در ساز و دما دم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!!

پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ درویشی کی روش اختیار کرو' درویشی کی خو پختہ کرتے رہو۔ دعوت و تربیت

کے مرحلے میں دعوت دیتے رہو' محنت کرتے رہو' تربیت اور تزکیہ کرتے رہو اور اس دوران تمام تکلیفیں اور مصیبتیں پورے صبر کے ساتھ جھیلو اور برداشت کرو۔ ساتھ ساتھ اپنی تنظیم پر توجہ دو' ساتھیوں کو منظّم کرو ـــــ اور جب تعداد کے اعتبار سے اور کیفیت وکمیت دونوں اعتبارات سے تیار ہو جاؤ کہ سیرت بھی پختہ ہو چکی ہو' تربیت بھی ہو چکی ہو' تزکیہ بھی ہو چکا ہو' قول وفعل کا تضاد نہ رہا ہو' انسان کا ظاہر باطن ایک ہو چکا ہو' منظّم ہو چکے ہوں' ایک امیر کی دعوت پر کھڑے ہو کر لبیک کہیں اور اپنی جانوں کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں' اور اگر روکنے کا حکم دیا جائے تو رک جائیں' تو پھر نظامِ باطل سے ٹکرا جائیں ؏ چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن! جب خود کو پختہ کر لو تو اب اپنے آپ کو سلطنت جم پر دے مارو! یہ ہے دو مصرعوں میں پورا طریقِ انقلاب۔

سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں یہ پورا طریق انقلاب دوٹوک انداز میں بیان فرما دیا گیا ہے کہ ہم نے دلیل بھی اتار دی' بیّنہ بھی اتار دی' کتاب بھی نازل کر دی اور میزان بھی اتار دی۔ کتاب کی دعوت سے لوگ آپ کے قریب آ جائیں گے۔ لیکن اب ان کو منظّم کر کے ایک طاقت بنانا ہے تاکہ نظام باطل سے ٹکرایا جائے۔ ایسے سرفروش اور ایسے جان فروش تیار کرنے ہیں کہ جو اپنے سر کی اور جان کی بازی کھیلنے کو تیار ہوں۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں فرمایا:

﴿مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ رِجَالٌ صَدَقُوۡا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيۡهِ‌ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ ﴾

''اہل ایمان میں وہ جوان مرد ہیں کہ جو عہد انہوں نے اللہ سے کیا تھا وہ سچا کر دکھایا۔ پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے اور جو باقی ہیں وہ منتظر ہیں کہ کب باری آئے''۔

گویا ؎

وبالِ دوش ہے سر' جسمِ ناتواں پہ مگر
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے!

تو یہ ہے وہ آیت مبارکہ جس کے بارے میں میں کہا کرتا ہوں کہ دنیا بھر کے انقلابی لٹریچر میں اس سے زیادہ عریاں انقلابی الفاظ کہیں نہیں ملتے! فرمایا: ﴿وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ فِيۡهِ بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ﴾ ''اور ہم نے لوہا اتارا جس میں قوت ہے جنگ کی'' ﴿وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ ''اور لوگوں کے لیے کچھ اور فائدے بھی ہیں'' ﴿وَلِيَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَيۡبِ ﴾ ''اور تاکہ اللہ دیکھے کہ کون ہیں وہ (صادق الایمان وفادار بندے) جو غیب میں رہتے ہوئے' اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں؟'' ایمان

کا دعویٰ تو آسان ہے' مگر ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا!

محبوبیتِ الٰہی کا مقام

اس کے ساتھ سورۃ الصّف کی یہ آیت جوڑ لیجیے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ ''اللہ کو تو محبوب ہیں (اپنے وہ بندے) جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر' گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

سورۃ الحدید اس اعتبار سے عجیب سورت ہے کہ اس میں لفظِ جہاد آیا نہ قتال' لیکن دونوں کے مضامین موجود ہیں۔ لفظ ''الحدید'' (لوہا) میں اسلحہ کا ذکر آ گیا۔ یہ اُمّ المسبحات ہے اور کل مسبحات کے سارے مضامین اس میں جمع ہیں۔ ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ﴾ کے الفاظ میں گویا واضح کر دیا گیا کہ اللہ کو تو محبت ان اہل ایمان سے ہے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں' غیب میں ہونے کے باوجود''۔ ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

اللہ کو محبوب اپنے وہ بندے ہیں جو لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے میدان میں آتے ہیں۔ وہ نہیں کہ جو ع ''تو فقط اللہ ہو' اللہ ہو' اللہ ہو!'' کے مصداق اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ضربیں لگاتے جائیں اور ساری عمر ضربیں لگاتے ہوئے ہی گزار دیں۔ نہ زندگی میں باطل کے ساتھ کبھی پنجہ آزمائی کا موقع آئے نہ کبھی باطل کو للکارنے کا۔

اس طرزِ عمل کے بارے میں میں یہ حدیث بارہا سنا چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَوْحَی اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَئِیْلَ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَةَ کَذَا وَکَذَا بِاَهْلِهَا. ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت تلپٹ کر دو۔'' قَالَ : فَقَالَ : یَا رَبِّ اِنَّ فِیْهَا عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِكَ طَرْفَةَ عَیْنٍ حضور ﷺ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگار اس بستی میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے آج تک کبھی پلک جھپکنے جتنا وقت بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کیا''۔ قَالَ : فَقَالَ : اِقْلِبْهَا عَلَیْهِ وَعَلَیْهِمْ ' فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ

يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ ''حضورﷺ فرماتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الٹو اس بستی کو پہلے اس پر' پھر دوسروں پر۔ اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ میری غیرت کی وجہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا''۔ یہ بیٹھا اپنی ذاتی نیکی' ذاتی تقویٰ' ذاتی عبادت گزاری' تہجد گزاری اور مراقبوں میں منہمک رہا اور اس کے اردگرد باطل پروان چڑھتا رہا' پھیلتا رہا' اس کا بول بالا ہوتا رہا۔ شریعت کی دھجیاں بکھرتی رہیں اور یہ لگا رہا اپنے اسی کام میں' تو یہ دوسروں سے زیادہ بڑا مجرم ہے۔ لہٰذا الٹو اس بستی کو پہلے اس پر پھر دوسروں پر۔

دوسری طرف اگر اپنی تربیت اور اپنا تزکیہ کیے بغیر میدان میں آ جاؤ تو وہی کچھ ہوگا جو آج جہاد کے نام پر ہو رہا ہے۔ اس طرح جہاد بدنام بھی ہوگا اور فساد کی شکل اختیار کرے گا۔ کسی اجتماعیت میں نہ دعوت کا مرحلہ آیا' نہ تربیت اور تزکیہ کا' اور نہ ہی قول و فعل میں مطابقت پیدا کی گئی اور نکل کھڑے ہوئے کلاشنکوف لے کر جہاد کرنے کے لیے! چنانچہ اس جہاد کا دنیا میں مذاق اڑ رہا ہے اور جہاد بدنام ہو رہا ہے۔ اس طرح دین کی بنیادی اصطلاحات کو رسوا کیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں سوائے فساد کے کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔

موجودہ حالات میں مسلح تصادم کا متبادل

محمد رسول اللہﷺ کے طریقِ انقلاب پر میری پوری کتاب ''منہج انقلابِ نبویؐ'' موجود ہے اور اس موضوع پر میرے اردو اور انگریزی خطابات کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس بھی موجود ہیں۔ ان خطابات میں مَیں نے پوری تفصیل سے واضح کیا ہے کہ منہج انقلابِ نبوی یعنی محمد رسول اللہﷺ کا طریقِ انقلاب کیا ہے' اس کے مختلف مراحل کیا ہیں اور یہ کہ آج کے زمانے میں مسلح تصادم اور قتال کی متبادل کیا صورت ہے۔ آج کے دَور میں قتال یک طرفہ (one way) بھی ہوسکتا ہے۔ یک طرفہ جنگ یہ ہوگی کہ آپ منکرات کے خلاف مظاہروں اور picketing کے لیے میدان میں نکل کھڑے ہوں اور اعلان کر دیں کہ جب تک ان منکرات کا خاتمہ نہیں ہوتا' ہم ٹیکس اور لگان نہیں دیں گے۔ یہ سودی نظام جو چل رہا ہے یہ حرام ہے' ہم اسے چلنے نہیں دیں گے!! اس پر قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آئیں گے اور آپ پر لاٹھیاں برسیں گی' گولیاں چلیں گی۔ اب اگر یہ مظاہرین ثابت قدم رہیں' جوابی کارروائی نہ کریں اور گولیوں کے سامنے سینہ سپر رہیں تو بالآخر حکومت وقت کو ہار ماننا پڑے گی اور انقلاب آ جائے گا۔ ایران کی مثال آپ کے سامنے موجود ہے کہ ایرانیوں نے تیس چالیس ہزار جانوں کی قربانی دی تو وہاں انقلاب آ گیا۔ کشمیر میں بھی چالیس ہزار جانیں دی جا چکی ہیں'

لیکن وہاں ابھی اس کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ کہاں ایران جتنا بڑا ملک اور کہاں وہ کشمیر کا چھوٹا سا خطہ! اگرچہ اسے ”ایرانِ صغیر“ کہتے ہیں۔ بقول اقبال ؎

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

کشمیریوں کا جس طرح قتل عام ہو رہا ہے اس اعتبار سے یہ اعداد و شمار غلط نہیں ہو سکتے۔ لیکن چالیس ہزار جانیں جانے کے باوجود نتیجہ کچھ نہیں—— جبکہ ایران میں اتنی تعداد میں جانیں دی گئیں تو بادشاہ کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس لیے کہ ایرانیوں کی جنگ یک طرفہ (one way) تھی۔ انہوں نے مارا کسی کو نہیں، خود مرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود بادشاہ کو اپنی فوج کی طرف سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ یہ میرا تختہ اُلٹ دے گی۔ فوج بھی تو آخر عوام میں سے ہوتی ہے۔ یہ انہی کے بھائی بند اور بھانجے بھتیجے ہوتے ہیں۔ چنانچہ عوام کے خلاف ایک حد تک کارروائی کے بعد فوج جواب دے دیا کرتی ہے۔ یہاں پر بھی بھٹو صاحب کو فوج نے جواب دے دیا تھا کہ کب تک ہم لوگوں کو مارتے رہیں گے۔ یہ قابض فوج تو نہیں ہے، نیشنل آرمی ہے۔ کتنوں کو مارے گی اور کیوں مارے گی؟ میں نے ان کا ٹیلی ویژن انٹرویو دیکھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میری کرسی بہت مضبوط ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ کرسی تو بڑی کمزور ثابت ہوئی۔ کرسی تو فوج کے بل بوتے پر مضبوط تھی۔ جب فوج نے جواب دے دیا تو کرسی کہاں مضبوط رہی!

سیرتِ طیبہ کے مختلف مراحل میں حکمتِ ترتیب

منہج انقلابِ نبویؐ کے ضمن میں پہلے objectively سمجھ لیجیے کہ حضور ﷺ کی سیرت کے کیا مراحل تھے اور ان میں حکمتِ ترتیب کیا تھی۔ پہلے تیرہ برس تک یعنی پوری مکی زندگی میں یہ حکم تھا کہ چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیے جائیں، تم ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے۔ لیکن ہجرت کے بعد حکم آ گیا کہ ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ﴾ (البقرۃ: ۱۹۰) ”اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں“۔ اور ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: ۳۹) ”اور ان (کافروں) سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے“۔ ان دو طرح کے احکام میں بظاہر زمین و آسمان کا فرق ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک پراسیس کے دو مختلف مراحل ہیں۔ اسی طرح ایک وقت میں آنحضور ﷺ دب کر صلح

کرر ہے ہیں۔ صلح حدیبیہ کی شرائط یقیناً بڑی غیر مساوی (unequal) تھیں اور یہ معاہدہ ہونے کے بعد مسلمان بہت رنجیدہ و دل گرفتہ ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں وہیں قربانی کے جانور ذبح کر کے احرام کھولنے کا حکم دیا تو ان میں سے ایک آدمی بھی نہیں اٹھا۔ مسلمانوں کے دل اس درجے زخمی تھے کہ ہم کیوں دب کر صلح کر رہے ہیں —— لیکن ایک سال کے بعد قریش کا سردار ابوسفیان چل کر مدینہ منورہ آتا ہے اور وہ خوشامدیں کر رہا ہے' سفارشیں کروا رہا ہے کہ خدا کے لیے صلح کی تجدید کر لیجیے' لیکن حضور ﷺ نہیں کر رہے' کیوں؟ اس لیے کہ اب محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد دعوت کے مرحلے سے نکل کر جہاد و قتال کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے —— اسی کے بارے میں ٹوئن بی نے کہا تھا :

"Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman."

اس لیے کہ اس کی آنکھیں صرف ظاہر کو دیکھ رہی تھیں' آنحضور ﷺ کے منہج انقلاب کی حکمتِ ترتیب سے واقف نہیں تھیں' لہٰذا اسے حضور ﷺ کی زندگی میں تضاد نظر آیا اور اس نے اسے واضح کیا۔ ان مستشرقین کو مکہ والے محمد ﷺ تو نبی نظر آتے ہیں' جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ انہیں نظر آتا ہے کہ مکے والا محمدؐ یقیناً یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰؑ کی طرح دعوت دے رہا ہے' تبلیغ کر رہا ہے' ماریں کھا رہا ہے' گالیاں سن رہا ہے' لیکن وہی محمد رسول اللہ ﷺ مدینے میں آ کر ایک مدبر ہے' حکمران ہے' جنگجو ہے' سپہ سالار ہے۔ اور ڈاکٹر منٹگمری واٹ نے اسی فلسفے کے زیر اثر آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ''تضاد'' کو ظاہر کرنے کے لیے Mohammad at Mecca اور Mohammad at Medina دو کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ ان کی نظر میں مکے والا محمدؐ تو بالکل ہی کچھ اور تھا اور مدینے والا محمدؐ بالکل کچھ اور نظر آتا ہے۔ معاذ اللہ! وہ شخصیت ایک ہی ہے' ان کا انقلاب کا پراسیس ایک ہی ہے' لیکن اس پراسیس کے مختلف مراحل ہیں۔ اس انقلاب کا پہلا مرحلہ مکی دور پر مشتمل ہے' جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ؏

با نشۂ درویشی در ساز و دما دم زن!

اور دوسرا مرحلہ اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں یوں بیان کر دیا ؏

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!!

ظاہر ہے اس کے بغیر کوئی انقلاب آ ہی نہیں سکتا۔

یہ ہے اصل میں اسلامی انقلاب کا پراسیس جو اس آیت میں بڑے واشگاف الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرما دیا۔ رسولوں کے ساتھ بیّنات' کتاب اور میزان اتارے جانے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اتارا''۔ پنجابی میں کہا جاتا ہے: ''چار کتاباں عرشوں آئیاں' پنجواں آیا ڈنڈا''۔ اس ڈنڈے کی اپنی اہمیت وضرورت ہے۔ کیا قرآن حکیم صرف اس لیے نازل ہوا ہے کہ اس کی تلاوت کرتے رہئے' تراویح میں پڑھتے رہئے اور ثواب لیتے رہئے؟ جبکہ قرآن خود یہ کہتا ہے کہ

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (المائدۃ:٦٨)

''اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو (تمہاری کوئی حیثیت ہماری نگاہ میں نہیں ہے) جب تک کہ تم تورات اور انجیل اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے 'اس کو قائم نہیں کرتے۔''

قرآن پڑھتے رہو' قرآن سنتے رہو' قرآن یاد کرتے رہو' حسنِ قراءت کے مقابلے منعقد کرو' جشن نزولِ قرآن مناتے رہو —— لیکن اگر تم قرآن کو قائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر گویا قرآن تم سے بایں الفاظ مخاطب ہے: يٰٓـاَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا الْقُرْاٰنَ ''اے قرآن والو! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک تم قرآن کو قائم نہیں کرتے''۔ قرآن قائم کرو' یہ میزانِ عدل ہے' اسے نصب کرو۔ اس نے جو نظام دیا' وہ عدل وقسط پر مبنی ہے۔ جس کا جو حق ہے وہ اس کو دو اور جس کی جو ذمہ داری ہے اس کے اوپر عائد کرو۔ اگر یہ نہیں کرتے تو پھر صرف اس کی تلاوت کا جو ثواب لے رہے ہو' اس سے کہیں بڑھ کر اس کوتاہی کا گناہ ہو سکتا ہے جو تم اس کی طرف سے برت رہے ہو۔

''بِالْغَيْبِ'' کا مفہوم

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''اور تا کہ اللہ یہ ظاہر کر دے کہ کون غیب کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے''۔ ''بِـالْغَيْبِ'' کے بارے میں مجھے مولانا اصلاحی صاحب کی یہ بات پسند ہے کہ یہاں ''بِ'' ظرفیہ ہے۔ اصل میں یہ بڑی پیاری اور فلسفیانہ بات ہے کہ اللہ غیب میں نہیں ہے' غیب میں ہم ہیں۔ عربی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اَغِيْبُ وَذُو اللَّطَائِفِ لَا يَغِيْبُ
وَاَرْجُوْهُ رَجَاءً لَا يَخِيْبُ

''میں غائب ہو جاتا ہوں' وہ اللہ جو ذوالطائف ہے وہ تو غائب نہیں ہوتا (وہ تو ہر آن ہر جگہ موجود ہے) اور میں اس سے ایسی امید کا طلب گار ہوں جو نا امیدی میں نہیں بدلتی''۔

چنانچہ یہ تو ہماری آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم غیب میں ہیں' وہ غائب میں نہیں ہے۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے۔

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی؟

کہ او پیداست تو زیر نقابی!

''تم کس کو تلاش کر رہے ہو؟ کس لیے پیچ و تاب کھا رہے ہو؟ وہ تو سامنے بالکل ظاہر ہے' ہاں تم خود محجوب ہو' پردے کی اوٹ میں ہو''۔

غیب کا پردہ تو تم پر پڑا ہوا ہے۔ تو بالغیب کا مفہوم ہوگا ''غیب میں ہوتے ہوئے''۔ ہم اللہ کو دیکھ نہیں رہے' پھر بھی جو شخص اللہ کے لیے تن من دھن وقف کر دے اس کے لیے اللہ کی طرف سے بڑی شاباش ہے۔ بعض احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے مباہات کے انداز میں اپنے نیک بندوں کا ذکر کرتا ہے کہ میرے یہ بندے مجھ سے جنت مانگ رہے ہیں' حالانکہ انہوں نے جنت کو دیکھا نہیں ہے' اور یہ دوزخ سے پناہ مانگ رہے ہیں حالانکہ انہوں نے دوزخ دیکھی نہیں ہے۔ تو جو شخص غیب میں ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کے لیے تیار ہے اس نے جو دیکھا ہے دل کی آنکھ سے دیکھا ہے' عقل کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ظاہر کی آنکھ سے کچھ نہ دیکھنے کے باوجود وہ پکار اٹھتا ہے:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

غیب کے ضمن میں کسی کا یہ خیال ہوسکتا ہے کہ رسول تو غیب میں نہیں تھے یا صحابہ کرام ؓ تو رسول اللہ ﷺ سے غیب میں نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ بھی غیب میں تھے' اس لیے کہ اُن کے سامنے جو موجود تھے وہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب تھے' رسول اللہ ﷺ کی رسالت تو غیب ہی کا معاملہ ہے۔ کیا کسی نے اپنی آنکھوں سے جبرائیلؑ کو آتے ہوئے دیکھا تھا؟ جبرائیلؑ اگر کبھی انسانی شکل میں آئے بھی تھے تو وہ تو گویا ایک انسان تھا جو آیا اور مل کر چلا گیا۔ درحقیقت رسول کی رسالت بھی غیب کی بات ہی تھی اور اُس سے اس وقت وہ لوگ بھی غیب میں تھے جو سامنے نظر آتے تھے۔ اسی لیے تو ان کے درمیان منافقین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو کہتے تھے کہ ہم ان کی ہر بات کیوں مانیں؟ ان کے بھی دو ہاتھ ہیں' دو پاؤں ہیں' البتہ جو قرآن یہ کہتے ہیں کہ ان پر نازل ہوا' اس کو ہم مان لیں گے۔ ہمارے

ہاں بھی ’’حَسۡبُنا کتابُ اللّٰہ ‘‘ کے قائلین’ ’اہلِ قرآن‘‘ کا جو فتنہ ہے‘ درحقیقت اس کی جڑیں انہی منافقوں کے ساتھ ملتی ہیں۔

تو یہ جان لیجیے کہ اصل میں جو اللہ کی مدد کر رہا ہے وہ اللہ کے رسولﷺ کی مدد کر رہا ہے۔ وہ مدد درحقیقت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب کی نہیں کر رہا‘ محمد رسول اللہﷺ کی کر رہا ہے‘ اور ظاہر بات ہے ان کی رسالت کا معاملہ غیب کا ہے۔ ﴿وَلِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ﴾ ’’تاکہ اللہ دیکھے (یا اللہ ظاہر کر دے) کون ہیں (اس کے وفادار اور صادق الایمان بندے) جو غیب میں ہونے کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں‘‘۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر تلوار کی طاقت ہاتھ میں لے کر باطل نظام کا قلع قمع کرنے کے لیے میدان میں آتے ہیں‘ یا اگر تلوار ہاتھ میں نہیں بھی لیتے تو یک طرفہ جنگ کی صورت میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ اس دور میں ’’مسلح تصادم‘‘ کے متبادل کے لیے اجتہاد کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ ایک تو ہمارے حکمران جیسے بھی ہیں‘ بہرحال مسلمان ہیں۔ دوسرے یہ کہ اب حکومتوں کے پاس بہت بڑے پیمانے پر مسلح افواج (Armed Forces) ہیں جن کا مقابلہ ممکن نہیں۔ عرب کا حال یہ تھا کہ وہاں کوئی باقاعدہ حکومت قائم نہیں تھی اور کوئی سٹینڈنگ آرمیز بھی نہیں‘ لہٰذا تعداد اور اسلحہ کے اعتبار سے اتنا بڑا فرق نہیں تھا۔ بدر میں تین سو تیرہ مسلمانوں کے مقابلے میں ایک ہزار کفار آئے تھے۔ اس طرح ان میں ایک اور تین کی نسبت ہوئی۔ ہتھیاروں کا فرق لگا لیجیے تو ایک اور دس کی یا ایک اور بیس کی نسبت ہوسکتی ہے۔ چلیے ایک اور سو کی نسبت ہوگی‘ اس سے تو زیادہ نسبت نہیں تھی۔ لیکن یہاں جاگیرداری‘ سرمایہ داری اور ملوکیت کا جو نظام ہے اس کی طاقت کا تو اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ فہد کی حکومت کو تحفظ دینے والے ان کی فوج بھی ہے‘ پولیس بھی ہے‘ ایئر فورس بھی ہے۔ مصر میں الاخوان کا مضبوط گڑھ ’’حما‘‘ ایئر فورس کے ہاتھوں تہس نہس ہو گیا تھا۔ لہٰذا یہاں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ بہرحال جو بھی جس کا حق ہے وہ ادا کیا جانا چاہیے۔ میرے نزدیک اس دَور میں ایرانیوں نے اس کی ایک مثال پیش کی ہے کہ دوطرفہ جنگ کے بجائے یک طرفہ جنگ کا انداز اپنایا اور گولیاں کھانے کے لیے اپنے سینے کھول دیے۔ اس ضمن میں ایسے ایسے لرزہ خیز واقعات ہوئے ہیں کہ ایک جلوس صرف خواتین کا نکلا تھا جو بچوں کو گود میں لیے ہوئے تھیں۔ ان پر فائرنگ ہوئی تو یہ گولیاں کھا کر شیر خوار بچوں سمیت سڑک پر گر پڑیں۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچا تب شاہ کو وہاں سے تخت و تاج

چھوڑ کر اس طرح بھاگنا پڑا کہ ع

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں!

کیونکہ اب اسے اندیشہ تھا کہ کہیں فوج اچانک مجھ پر الٹ نہ پڑے۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنی جان سلامت لے کر بھاگ کھڑا ہو۔ تو یہ ہے اصل میں موجودہ حالات کے اعتبار سے اجتہاد کا معاملہ' جسے میں تفصیل سے اپنی کتاب میں درج کر چکا ہوں۔

اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ

آیت مبارکہ کے آخری الفاظ ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰـهَ قَوِیٌّ عَـزِیۡزٌ ﴿٢٥﴾﴾ ''یقیناً اللہ بڑی قوت والا' زبردست ہے''۔ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تم سے مدد مانگ رہا ہے تو اللہ کمزور ہے اور اس کو تمہاری مدد کی حاجت ہے۔ وہ تو القوی ہے' بڑی قوت والا ہے۔ العزیز ہے' زبردست ہے۔ اس کا ایک حرفِ کُن آنِ واحد میں یہ سارا نظام تلپٹ کر سکتا ہے' لیکن اصل میں پیش نظر تمہارا امتحان ہے:

﴿خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک:٢)

''اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہیں آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ تم اس امتحان میں پورے اترے ہو۔

اس ضمن میں آیت ١٠ اس کے ساتھ جوڑ لیجیے:

﴿لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ الۡفَتۡحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیۡنَ اَنۡفَقُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَقٰتَلُوۡا ؕ﴾

''تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد انفاق اور قتال کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق اور قتال کیا۔ ان کا درجہ بعد میں انفاق اور قتال کرنے والوں سے بہت بڑھ کر ہے''۔

کسی انقلاب کے جو ابتدائی مراحل ہوتے ہیں ان میں جنہوں نے اپنی جانیں کھپائیں' اپنے مال کھپائے' اپنی صلاحیتیں لگائیں' اپنا وقت لگایا' اپنی زندگی لگائی' ان کا جو رتبہ ہے وہ بعد والوں کو کبھی نہیں مل سکتا۔ ع ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!'' بعد میں جب حالات بدل جائیں تو ان قربانیوں کی وہ

قدر و قیمت نہیں رہے گی۔ نیک کام جب بھی کیا جائے گا بہر حال نیک ہے' اس کا ثواب ملے گا' لیکن قدر و قیمت میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ سب کچھ اس لیے کرنا ہے کہ اللہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے غیب کے باوجود ـــــ جبکہ اللہ خود بڑی طاقت والا' زبردست ہے۔ وہ جب چاہے آنِ واحد میں اپنا نظام برپا کر سکتا ہے۔ لیکن تمہاری ابتلاء و آزمائش کے لیے وہ تمہیں یہ موقع دے رہا ہے۔ آخر میں یہ شعر پھر آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں ؎

منّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی

منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!

''تم بادشاہ پر یہ احسان مت دھرو کہ تم اس کی خدمت میں مصروف ہو۔ بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع دیا ہے''۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

❁❁❁

درس 31

ترک دنیا اور رہبانیت
کی نفی اور
نجات اور فوز وفلاح
کی
واحد راہ اتباع محمد ﷺ

سُورَةُ الحَدِيد کی ۲۶ تا ۲۹ کی روشنی میں !

درس ۳۱

ترکِ دنیا اور رہبانیت کی نفی

اور

نجات اور فوز و فلاح کی واحد راہ: ''اتباعِ محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ''

سورۃ الحدید کی آیت ۲۶ تا ۲۹ کی روشنی میں!

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا وَّاِبۡرٰهِیۡمَ وَجَعَلۡنَا فِیۡ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالۡكِتٰبَ فَمِنۡهُمۡ مُّهۡتَدٍ ۚ وَكَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّیۡنَا عَلٰۤی اٰثَارِهِمۡ بِرُسُلِنَا وَقَفَّیۡنَا بِعِیۡسَی ابۡنِ مَرۡیَمَ وَاٰتَیۡنٰهُ الۡاِنۡجِیۡلَ ۙ وَجَعَلۡنَا فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ رَاۡفَةً وَّرَحۡمَةً ؕ وَرَهۡبَانِیَّةَ ۨ ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَیۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ۚ فَاٰتَیۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡهُمۡ اَجۡرَهُمۡ ۚ وَكَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۲۷﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوۡا بِرَسُوۡلِهٖ یُؤۡتِكُمۡ كِفۡلَیۡنِ مِنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَیَجۡعَلۡ لَّكُمۡ نُوۡرًا تَمۡشُوۡنَ بِهٖ وَیَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا یَعۡلَمَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَلَّا یَقۡدِرُوۡنَ عَلٰی شَیۡءٍ مِّنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۲۹﴾﴾

ہم سورۃ الحدید کے تین رکوعوں کا مطالعہ مکمل کر چکے ہیں اور اس کا آخری رکوع' جو چار آیات پر مشتمل ہے' ابھی اس کا مطالعہ باقی ہے۔ جس طرح کسی مضمون کی تکمیل کے بعد بعض اوقات اضافی وضاحت کی ضرورت پیش آتی ہے' سورۃ الحدید کے اس آخری رکوع کی نوعیت اس سورۂ مبارکہ کے باقی مضامین کے اعتبار سے قریباً وہی ہے۔ گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ سورۃ الحدید کا اصل مضمون ۲۵

آیات میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا' لیکن اس اندیشے کے پیش نظر کہ اس کا کوئی غلط نتیجہ نہ نکال لیا جائے' ایک تنبیہہ اور وارننگ کے طور پر ایک ضمیمے اور تکملے کی حیثیت سے یہ چار آیات بھی شامل کی گئیں۔ ''اینٹی کلائمکس'' کا لفظ اگرچہ قرآن حکیم کے لیے استعمال کیا جانا مناسب نہیں ہے' لیکن ہماری مجبوری ہے کہ افہام و تفہیم کے لیے ہمیں بعض ایسی اصطلاحات کا استعمال کرنا پڑتا ہے جن سے ہم عام طور پر متعارف ہیں۔ اس کو بلاتشبیہہ سمجھنا چاہیے کہ جیسے کسی مضمون کے کلائمکس کو پہنچ جانے کے بعد ایک اینٹی کلائمکس آتا ہے کچھ اسی طرح کا معاملہ سورۃ الحدید کے اس چوتھے رکوع کی چار آیات کا اس کے بقیہ تین رکوعوں کی پچیس آیات کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ پچیسویں آیت کے بارے میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ یہ نہ صرف قرآن حکیم کی اہم ترین آیات میں سے ہے' بلکہ پوری دنیا میں جتنا بھی انقلابی لٹریچر موجود ہے' اس میں جامع ترین اور عریاں ترین انقلابی نظریہ اس ایک آیت میں ہے۔

سابقہ مضامین پر نگاہِ بازگشت

سورۃ الحدید کی آخری چار آیات کا مطالعہ کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ہم تیزی کے ساتھ ایک طائرانہ نگاہ ان مضامین پر ڈال لیں جن کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔ ہم نے تفہیم کی غرض سے اس سورۂ مبارکہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اب میں ان حصوں کو کچھ ترمیم کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک حصے میں کوئی نہ کوئی آیت ایسی آئی ہے جس کی نظیر پورے قرآن حکیم میں نہیں ملتی۔ اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ جو چھ آیات پر مشتمل ہے' قرآن حکیم میں ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کے بیان پر جامع ترین مقام ہے' نیز یہ ذات و صفاتِ باری تعالیٰ سے متعلق مشکل ترین مسائل سے بلند ترین علمی سطح پر بحث کرتا ہے۔ اس حصے کی عظیم ترین آیت ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج﴾ اللہ تعالیٰ کے ان چار اسماء کے حوالے سے ہم نے فلسفۂ وجود' ماہیت وجود اور ربط الحادث بالقدیم جیسے مسائل پر گفتگو کی' جو فلسفے اور علم کلام کے اہم ترین اور مشکل ترین مسئلے ہیں۔

اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ بھی چھ آیات (۷۔۱۲) پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں باہمی ربط اور نظم اتنا نمایاں اور ظاہر و باہر ہے کہ کم از کم میرے نزدیک قرآن حکیم میں اس کی کوئی دوسری نظیر موجود نہیں۔ ان میں سے پہلی آیت (آیت ۷) میں دین کے تمام تقاضوں کو دو اصطلاحات (ایمان اور انفاق) میں بیان کر دیا گیا: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا﴾ ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں)۔'' پھر آیت ۸ اور ۱۰ میں ذرا زجر کا

انداز اختیار کیا گیا: ﴿وَمَالَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں رکھتے؟ (جیسا کہ ایمان کا حق ہے)۔'' اور ﴿وَمَالَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کیوں خرچ نہیں کرتے اور کھپاتے اللہ کی راہ میں؟ (جیسا کہ خرچ کرنے اور کھپانے کا حق ہے)۔'' جبکہ آیت ۹ اور ۱۱ میں ترغیب وتشویق اور حوصلہ افزائی کا انداز ہے۔ آیت ۹ کا مضمون یہ ہے کہ اگر اپنے باطن میں جھانکو اور محسوس کرو کہ واقعی اور حقیقی ایمان موجود نہیں ہے تو قرآن حکیم کی طرف رجوع کرو جو منبع ایمان ہے ﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ یہ قرآن موجود ہے' اس کی آیاتِ بینات سے اپنے سینے کو منور کرو' ایمانِ حقیقی کی نعمت تمہیں یہاں سے مل جائے گی۔ پھر یہ کہ انفاق کے لیے ترغیب کا جو بہت ہی مؤثر انداز ہو سکتا ہے وہ آیت ۱۱ میں اختیار کیا گیا' جس کے لیے میں نے غالب کا یہ مصرعہ آپ کو سنایا تھا ع ''کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق؟'' ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''کون ہے وہ جو قرض دے اللہ کو قرضِ حسنہ؟'' اب یہ پانچ آیتیں ہو گئیں۔ چھٹی آیت کو میں اس مرتبہ اسی دوسرے حصے میں شامل کر رہا ہوں۔ ان آیات میں دین کے جو تقاضے (ایمان اور انفاق) بیان ہوئے' جو شخص ان دونوں تقاضوں کو پورا کر دے گا تو اس کے لیے قیامت کے دن میدانِ حشر میں نور کا ظہور ہو گا۔ فرمایا: ﴿يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ''اُن کا نور اُن کے سامنے اور اُن کے دائیں طرف دوڑ رہا ہو گا۔ نورِ ایمان ان کے سامنے ہو گا اور نورِ انفاق ان کے دائیں طرف۔ اس لیے کہ انفاق دائیں ہاتھ سے کیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے کہ اللہ کی راہ میں اس طور سے مال خرچ کرو کہ تمہارا داہنا ہاتھ جو دے وہ تمہارے بائیں ہاتھ کے علم میں نہ آئے۔

تیسرا حصہ آیت ۱۳ سے آیت ۱۵ تک تین آیات پر مشتمل ہے۔ اس کے لیے عنوان ہے ''تفریق المسلمین بین المؤمنین والمنافقین''۔ دنیا میں جو لوگ مسلمان سمجھے جاتے تھے' قیامت کے روز ان کے مابین تمیز اور تفریق کی جائے گی۔ یہ وہی مرحلہ ہے جسے ہم عام طور پر ''پل صراط'' کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ میدانِ حشر کے مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے جب ایک چھلنی لگے گی کہ وہ مسلمان جو حقیقی ایمان سے بہرہ ور ہوں گے وہ اس راستے سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائیں گے' جبکہ وہ لوگ جو حقیقی ایمان سے محروم تھے' بلکہ ان کے دلوں میں نفاق کا روگ تھا' وہاں پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے جہنم میں جا گریں گے۔ آیت ۱۴ انفاق کی حقیقت اور اس کے مراحل و مدارج کے موضوع پر قرآن حکیم کی

جامع ترین آیت ہے۔ نفاق کا اصل سبب کیا ہے؟ یہ کہ انسان مال اور اولاد سے اس حد سے زیادہ محبت کرے جس حد تک محبت کرنا درست ہے۔ اگر مال اور اولاد کی یہ محبت انسان کے دل پر ضرورت سے زیادہ قابو پالے تو گویا اُس نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈال دیا۔ اب اس کے بعد مزید مراحل ہیں۔ فرمایا: ﴿وَلٰـكِـنَّـكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿١٤﴾﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا اور پھر تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے اور تم شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گئے اور تمہیں آرزوؤں نے دھوکے میں ڈالے رکھا' یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا اور وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دیتا رہا''۔ اور پھر اس کا جو انجام ہے وہ بیان فرما دیا: ﴿فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِـدْيَةٌ وَّلَا مِـنَ الَّـذِيْـنَ كَـفَـرُوْا ۭ﴾ ''پس آج نہ تو تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کافروں سے''۔ دنیا میں منافق اہلِ ایمان کے ساتھ گڈمڈ تھے' آخرت میں اُن کا حشر کافروں کے ساتھ ہوگا۔

چوتھا حصہ ۱۶ سے ۱۹ تک' چار آیات پر مشتمل ہے' جس کے لیے میں نے جامع عنوان ''سلوکِ قرآنی'' تجویز کیا تھا۔ آیت ۱۶ کا مضمون یہ ہے کہ دیکھو اگر تنبّہ ہو گیا ہے' اگر حقیقت کا انکشاف ہو گیا ہے' اگر اللہ نے اپنے اندر جھانکنے کی توفیق عطا کر دی ہے' اگر یہ احساس ہو گیا ہے کہ ایمانِ حقیقی سے محرومی ہے' تو اب کمرِ ہمت کسو اور اس وقت کو ہاتھ سے جانے نہ دو! کہیں تأخیر وتعویق کے فتنے میں مبتلا نہ ہو جانا! فرمایا: ﴿اَلَـمْ يَـاْنِ لِلَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْٓا اَنْ تَـخْشَـعَ قُـلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْـحَـقِّ ۙ﴾ ''کیا ابھی وقت نہیں آیا اہلِ ایمان کے لیے (ایمان کے دعوے داروں کے لیے) کہ ان کے دل واقعتاً جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے اور (وہ تسلیم کر لیں اس سب کو) جو حق میں سے نازل ہوا ہے''۔ گویا کہ جھنجھوڑنے کا انداز ہے کہ اب مزید تأخیر کا موقع نہیں ہے۔

دوسری طرف اگر تم اپنے اندر جھانک کر محسوس کر رہے ہو کہ دل میں سختی موجود ہے' تو گھبراؤ نہیں' مایوس نہ ہو' بددل نہ ہو۔ ﴿اِعْـلَـمُـوْٓا اَنَّ الـلّٰـهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ﴾ ''جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد از سرِ نو زندگی عطا فرما دیتا ہے''۔ دیکھو اللہ تعالیٰ مردہ زمین پر بارش برسا کر اسے از سرِ نو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ کیا عجب کہ وہ تمہارے دلوں کی زمین کو بھی ایمان کی لہلہاتی فصل سے دوبارہ زندہ کر دے۔ اس کے لیے جو شرط لازم ہے وہ اگلی آیت میں بیان کر دی گئی۔ نفاق کا اصل سبب حبِّ دنیا ہے' جس کی سب سے بڑی علامت حبِّ مال ہے۔ چنانچہ علاج

بِالضّد کے اصول پر نفاق کا علاج یہ ہوگا کہ خرچ کرو، لگاؤ، کھپاؤ اللہ کی راہ میں۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَھُمْ وَلَھُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ﴿۱۸﴾﴾ ''یقیناً کثرت کے ساتھ صدقہ کرنے والے مرد اور عورتیں اور جنہوں نے اللہ کو قرضِ حسن دیا ہے، ان کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور اُن کے لیے بہترین اجر ہے''۔ گویا مال کی محبت کو ہر دو طریقے پر دل سے نکالنا ہوگا، محتاجوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کر کے بھی اور اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لیے بھی۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ حبِّ مال ایک طرح کا بریک ہے۔ اگر بریک لگا ہوا ہو تو آپ ایکسیلیٹر کو خواہ کتنا ہی دبائیں گاڑی نہیں چلے گی۔ پہلے بریک کھولیے، پھر ایکسیلیٹر کو دبایئے تو گاڑی چلے گی۔ لہٰذا مال کی محبت کا یہ بریک کھول دو۔ اب اپنے ایمان کی تجدید کرو اور اپنی کشتِ قلب میں از سرِ نو بیج ڈالو اور اس کی آبیاری کرو۔ پھر تمہیں لہلہاتی ہوئی بہار نصیب ہوگی اور اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے بلند ترین مقامات میں سے صدیقیت یا شہادت کے رتبے تک فائز ہو جاؤ گے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ ؕ لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ ؕ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہی ہیں صدیق اور شہید اپنے رب کے پاس۔ ان کے لیے محفوظ ہے ان کا اجر بھی اور ان کا نور بھی''۔

سورۃ الحدید کا پانچواں حصہ آیات ۲۰ تا ۲۴، پانچ آیات پر مشتمل ہے۔ حیاتِ دُنیوی کی اصل حقیقت اور خاص طور پر اس کے مراحل و ادوار کے بیان کے ضمن میں آیت ۲۰ قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے اور اس کی کوئی نظیر قرآن میں موجود نہیں۔ فرمایا: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ﴾ اس ایک آیت میں انسانی زندگی کے پانچ ادوار گنوا دیے گئے ہیں: (i) بچپن کا کھیل کود۔ (ii) نوجوانی کا لہو اور تلذّذ (sensual gratification)۔ (iii) زینت و زیبائش اور آرائش۔ (iv) باہمی تفاخر۔ یعنی اپنی دولت، نسل، علم، عقل، ذہانت و فطانت یا کسی اور استعداد اور صلاحیت پر فخر۔ (v) اموال و اولاد میں کثرت کی خواہش۔ اسی کا تکملہ آخری پارے کی سورتوں میں سورۃ التکاثر ہے۔ پھر اس کے لیے ﴿کَمَثَلِ غَیْثٍ ......الخ﴾ کے الفاظ میں بہترین تشبیہہ دی گئی کہ جیسے بارش کے بعد زمین سے سبزہ اگتا ہے اور جب فصل اُپچتی ہے تو کاشتکار کو کس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اسی فصل پر زردی آتی ہے اور پھر وہ چُورا چُورا ہو کر بھس بن جاتی ہے۔ پھر وہی کھیت ویرانی کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ گویا حیات

کا ایک دور جو آیا تھا وہ ختم ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ اصل میں حیاتِ دنیوی کا نصب العین تو یہ ہونا چاہیے: ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے۔ یہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر''۔ یہ ہے مومن کا نصب العین۔ باقی تمام چیزیں فرائض کے درجے میں رہیں گی، نصب العین اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

اس حصے میں بیان ہونے والا تیسرا اہم مضمون یہ ہے کہ انسان پر آنے والی ہر مصیبت اللہ کی طرف سے پہلے سے طے ہوتی ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں انسان مختلف حوادث اور آفاتِ ارضی و سماوی سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ کبھی تکالیف آ گئیں، کوئی بیماری آ گئی، کوئی نقصان ہو گیا، کوئی عزیز فوت ہو گیا، یا یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں انسان مختلف خطرات سے دوچار ہوتا ہے اور اسے جان و مال کے ضیاع کا خوف لاحق ہو جاتا ہے۔ یہاں ان سب سے نجات دلانے والی بات فرما دی گئی:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ۭ﴾

''نہیں نازل ہوتی کوئی نازل ہونے والی زمین میں اور نہ تمہارے اپنے نفسوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں''۔ انسان اپنے فرائض سے گریز کے لیے اس کو بہانہ بنائے تو یہ گویا اس کی نادانی اور ناسمجھی ہے۔ وہ تو آ کر رہنے والی چیزیں ہیں اور ان کا اصل مقصد ابتلاء، آزمائش اور امتحان ہے جو حیاتِ دُنیوی کی اصل غرض و غایت ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ ''اس نے موت اور زندگی کی تخلیق فرمائی تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون اچھے اعمال کرتا ہے۔''

سورۃ الحدید کا چھٹا حصہ ایک آیت پر مشتمل ہے، جس کے بارے میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ یہ اس سورۂ مبارکہ کا کلائمکس ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح تعلیمات اور واضح نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ ہم نے کتاب اور میزان اتاری، تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔'' یعنی نبوت و رسالت اور کتاب و میزان کا اصل مقصد اور اصل ہدف قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی ہے۔ جہاں تک انفرادی سطح پر

ایک بندۂ مؤمن کے نصب العین کا تعلق ہے وہ آخرت کی فلاح و نجات‘ حصولِ مغفرت اور حصولِ جنت ہے۔ لیکن دنیا میں اس کی مساعی‘ اس کی جدوجہد‘ بھاگ دوڑ کا ہدف‘ بلکہ اس کے دوسرے فرائضِ دینی کا نقطۂ عروج نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام ہے۔ اس مقصد کے لیے جہاں دعوت و تبلیغ‘ تعلیم و نصیحت‘ تلقین و تشویق اور ترغیب و ترہیب کی ضرورت ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ قوت فراہم کرو اور وقت آنے پر قوت کا استعمال کرو۔ جو لوگ بھی اس نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کی راہ میں مزاحم ہوں اُن کے ساتھ مقابلہ کرو۔ یہاں تک کہ ضرورت ہو تو ان کی سرکوبی کرو۔ ہم نے لوہا اسی لیے اتارا ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾ ”اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے جس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں‘ اور تاکہ اللہ یہ ظاہر کر دے کہ کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے“۔ یہ اس سورۂ مبارکہ کا کلائمکس ہے۔

اعمالِ صالحہ کے نقطۂ عروج پر شیطان کا اِغوا و اِضلال

اب دیکھئے‘ یہاں ایک بات سامنے آ رہی ہے کہ دین کی شاہراہ پر چلتے ہوئے ایک بندۂ مؤمن تدریجاً نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ ظاہر بات ہے کہ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے لہٰذا اس نقطۂ عروج پر پہنچ کر بھی وہ شیطان کے اغوا و اضلال سے محفوظ و مامون نہیں ہو سکتا۔ اور شیطان کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ہی ہتھیار سے سب کو شکار کرنا چاہے۔ وہ مختلف ذہنی سطح اور مختلف افتادِ طبع کے لوگوں کو مختلف حربوں سے زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی شخص ایمان اور عملِ صالح کی منزلیں طے کرتا ہوا دین کی شاہراہ پر گامزن ہے تو اسے آخری منزل سے ہٹانے کے لیے شیطان کا اغوا اور اضلال یہ ہے کہ اس کی جدوجہد کو اقامتِ دین کے رخ سے موڑ کر تزکیہ کے خانقاہی تصور کی طرف منعطف کر دیا جائے کہ بس اپنی ہی ذات کو رگڑے جاؤ‘ اسی کو مانجھے جاؤ‘ اسی کو سنوارے جاؤ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

تاکہ یہ نظامِ باطل کو چیلنج نہ کرے اور میرے استبداد‘ میرے استیلاء‘ میری حکومت اور میرے غلبے کے لیے چیلنج نہ بن جائے۔ لگا رہے نمازوں میں‘ روزانہ روزے رکھے‘ پوری پوری رات کھڑا رہا کرے۔ اپنی دانست میں منکرات اور حرام سے بچنے کے لیے نہایت خوردہ گیری اور خوردہ بینی سے کام لے‘

لیکن میرے مقابلے میں نہ آئے' میرے نظام کو چیلنج نہ کرے' استحصالی واستبدادی نظام کے لیے خطرہ نہ بنے۔ ایک شخص یہاں تک آ گیا کہ اس نے اللہ کو پہچان لیا' آخرت کو جان لیا' اس نے طے بھی کر لیا کہ مجھے اللہ ہی کی رضا حاصل کرنی ہے۔ یعنی اس کا نصب العین بھی درست ہو گیا۔ پھر یہ کہ اپنے نفس کے حربوں اور ہتھکنڈوں سے بھی اس نے آزادی حاصل کر لی ہے' گناہوں سے بچ رہا ہے' حرام خوری سے اجتناب کر رہا ہے' فواحش ومنکرات سے بچ گیا ہے۔ یہ سارے ہفت خوان طے کر چکا ہے۔ لیکن آخری مرحلے پر شیطان جو داؤ اور اڑنگا لگاتا ہے وہ یہ ہے کہ اب اس کا رخ موڑ دو اور اسے اپنی ذاتی اصلاح ہی کے اندر لگائے رکھو' تاکہ یہ کہیں نظام کی اصلاح کے لیے میدان میں نہ آ جائے۔ یہ ہے درحقیقت شیطان کا آخری حربہ جو وہ نیک لوگوں پر آزماتا ہے اور ان کی نیکی کو بدی کے لیے چیلنج نہیں بننے دیتا' بلکہ انہیں ان کی انفرادی نیکی کے اندر محو کر کے رکھ دیتا ہے۔

اس آخری حصے میں شیطان کے اس حربے کے خلاف ایک تنبیہہ آ رہی ہے' اور چونکہ انبیاء و رُسل کی اُمتوں میں سے ایک اُمت کی ایسی مثال موجود ہے' لہٰذا اسے یہاں اُجاگر کیا جا رہا ہے' تاکہ ایک نشانِ عبرت سامنے موجود رہے کہ بالفعل ایسا ہوا ہے اور شیطان نے یہ داؤ آزما کر ایک بڑی عظیم اُمت کو ایک غلط رخ پر ڈال دیا ہے۔ یہ درحقیقت حضرت عیسٰی علیہ السلام کے پیروکاروں کی مثال ہے جنہوں نے اپنی اسی ذاتی انفرادی نیکی کے غلبے کے زیر اثر اور غیر معتدل تصور کے تحت رہبانیت کا نظام ایجاد کر لیا۔ جبکہ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے وفادار بندے لوہے کی طاقت ہاتھ میں لے کر میدان میں آئیں اور اللہ کی مدد بھی کریں اور اللہ کے رسولوں کی مدد بھی کریں۔ دین اللہ کا ہے۔ اسے قائم کرنے کی جدوجہد گویا اللہ کی مدد ہے اور چونکہ رسولؐ کو بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس دین کو غالب کرے' لہٰذا یہ گویا رسولؐ کی بھی مدد ہے۔ یہی بات سورۃ الصّف کی آخری آیت میں فرمائی گئی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوٰرِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوٰرِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾

''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بن جاؤ' جس طرح عیسٰیؑ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف؟ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!''

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم ان آیات کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ

وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾

''ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی' پھر ان کی اولاد میں سے کسی نے ہدایت اختیار کی اور بہت سے فاسق ہو گئے''۔

یہ ایک بڑی پُرشکوہ تمہید ہے آگے زیر بحث آنے والے اس مضمون کے لیے کہ حضرت عیسٰیؑ کے پیروکار جس غلط رخ پر پڑ گئے تھے تم بھی کہیں اس رخ پر نہ پڑ جانا۔ اس سے تمہیں پیشگی طور پر متنبہ کیا جا رہا ہے۔ تو گویا اصلاً مقصود حضرت عیسٰی علیہ السلام کا تذکرہ ہے' لیکن قرآن کا یہ اسلوب ہے کہ بات کا آغاز پُرشکوہ تمہید سے کیا جاتا ہے۔ اس اسلوب کی ایک مثال سورۂ آل عمران میں ہے کہ اصلاً تذکرہ تو حضرت عیسٰی اور حضرت مریم کا' اور حضرت زکریا اور حضرت یحیٰی (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کا کرنا ہے' لیکن اس کا آغاز آیت ۳۳ سے بایں الفاظ کیا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾﴾ اس اسلوب کا مفاد یہ ہے کہ جس موضوع پر گفتگو ہونی ہے اس کا اصل پس منظر اور سیاق وسباق (context) معین ہو جائے۔ تو یہاں پر بھی ایک پرشکوہ تمہید کے طور پر یہ مضمون آیا ہے۔

تاریخ نبوت ورسالت کا ایک تحقیق طلب پہلو

فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ﴾ ''اور ہم نے بھیجا نوحؑ کو اور ابراہیمؑ کو'' ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ''اور ہم نے رکھ دی انہی دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب''۔ یہ معاملہ تاریخ نبوت و رسالت کے اعتبار سے محققین کے لیے نہایت اہم رہنمائی کا حامل ہے۔ یہاں یہ مضمون ضمنی طور پر آیا ہے' اور میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ قرآن حکیم میں اہم ترین علمی مضامین اکثر و بیشتر ضمنی طور پر آتے ہیں۔ ایک ہے قرآن کی ہدایت' تذکرہ' ذکریٰ' یاددہانی' وہ تو قرآن مجید میں آپ کو سطح پر ملے گی' وضاحت سے ملے گی' بتکرار و اعادہ ملے گی' اور ایسی سطح پر ملے گی جس کو ایک عام انسان بھی بآسانی سمجھ لے۔ لیکن جو علمی نوادر اور اعلیٰ علمی وعقلی نکات ہیں وہ آپ کو ضمنی طور پر اس انداز سے ملیں گے کہ عام آدمی تو اس پر سے گزر جائے' یہاں رکے نہیں' اس کا ذہنی تسلسل ٹوٹنے نہ پائے اور وہ تذکرہ کے عمل میں کہیں کوئی رخنہ نہ پائے' لیکن جس شخص کے ذہن میں علمی اشکالات اور سوالات ہیں' جو کسی تحقیق میں سرگرداں ہے' وہ وہاں پر پہنچے تو رک جائے اور پھر وہ اپنا ہائی پاور لینز (lense) فوکس کر کے بیٹھ جائے کہ جا ایں جاست! اسے محسوس ہو کہ اس مقام سے تو مجھے بڑی رہنمائی مل رہی ہے۔

اس ضمن میں اب ہم تجزیہ کرتے ہیں۔ جہاں تک حضرت نوح علیہ السلام کا معاملہ ہے وہ تو بالکل واضح ہے۔اس لیے کہ آپؑ آدم ثانی ہیں، پوری موجودہ نسلِ انسانی حضرت نوحؑ کی اولاد سے ہے۔قرآن مجید سے بھی اس کی گواہی ملتی ہے۔از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَجَعَلۡنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الۡبٰقِیۡنَ ﴿۷۷﴾﴾ (الصّٰفّٰت) ''ہم نے صرف اسی کی نسل کو باقی رکھا''۔حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ زمانی فصل کتنا ہے۔لیکن بہرحال اس دور میں جتنی بھی نسلیں آدم علیہ السلام کی پھیلی ہیں وہ سب کی سب ہلاک کر دی گئیں، سوائے حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے۔گمان غالب یہ ہے کہ سوائے ان کے اپنے بیٹوں اور ان کی بیویوں کے اور کوئی بھی باقی نہیں بچا تھا۔ واللہ اعلم! لیکن اگر کوئی تھے بھی تو ان کی نسل آگے نہیں چلی۔نسل صرف حضرت نوح علیہ السلام کی چلی ہے۔ آج پوری نسلِ انسانی حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں حضرت سام، حضرت حام اور حضرت یافث کی اولاد سے ہے۔یعنی آج دنیا میں جتنی بھی اقوامِ عالم ہیں، سب کی سب انہی تینوں کی نسلوں سے ہیں۔لہٰذا اس میں تو کوئی اشکال اور اشتباہ نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نبوت حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہی میں رہی۔البتہ حضرت ابراہیمؑ کا معاملہ بہت اہم ہے۔ظاہر بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد جب ان کی نسل آگے چلی تو دُنیا میں اور اقوام بھی موجود تھیں۔حضرت سام کی اولاد کی بھی اور بہت سی شاخیں ہیں۔ان کے علاوہ حضرت حام اور حضرت یافث کی اولاد سے کئی نسلیں اور ان کی شاخیں ہیں۔لیکن قرآن معین طور پر کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد نبوت اور کتاب کا معاملہ صرف نسلِ ابراہیمی کے ساتھ مختص کر دیا گیا۔اور جیسا کہ میں نے بارہا عرض کیا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم سے کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔لہٰذا اس مضمون کا مثنیٰ سورۃ العنکبوت کی آیت ۲۷ ہے، جہاں تعین کے ساتھ واحد کے صیغے میں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یہ بات کہی گئی: ﴿وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ
اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَجَعَلۡنَا فِیۡ ذُرِّیَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالۡكِتٰبَ﴾ ''ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ (جیسا بیٹا) اور یعقوبؑ (جیسا پوتا) عنایت فرمایا اور ہم نے اس کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی''۔نوٹ کیجیے کہ یہاں ''فِیۡ ذُرِّیَّتِهِمۡ''، نہیں، بلکہ واحد کی ضمیر کے ساتھ ''فِیۡ ذُرِّیَّتِهٖ'' فرمایا۔﴿وَاٰتَیۡنٰهُ اَجۡرَهٗ فِی الدُّنۡیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور ہم نے اسے اس دنیا کی زندگی میں بھی اس کا اجر بھرپور طریقے پر عطا فرمایا اور آخرت میں تو وہ یقیناً ہمارے نیکوکار بندوں میں سے ہوگا''۔اب اس سے جو بات سامنے آ رہی ہے اس پر غور کیجیے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آج سے کم از کم چار ہزار برس قبل کی شخصیت ہیں۔ میرا اندازہ چار سے ساڑھے چار ہزار برس تک کا ہے۔ اس لیے کہ مصر سے بنی اسرائیل کا خروج (exodus) چودہ سو قبلِ مسیح سے لے کر تیرہ سو قبلِ مسیح تک کے درمیان کا زمانہ ہے۔ چنانچہ ۳۴۰۰ برس تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہو چکے ہیں۔ اب ان سے پہلے کئی سو برس حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مابین گزرے ہیں' جس کے دوران بنی اسرائیل کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ صرف ستر بہتر افراد کا قافلہ جو مصر میں داخل ہوا تھا وہ وہاں سے چھ لاکھ کی تعداد میں نکلا ہے۔ یعنی اس میں خاصا وقت لگا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کم از کم پانچ سو برس کا معاملہ ہے' جن میں سے ان کے دو اڑھائی سو برس تو بڑے عیش و آرام میں گزرے' جیسے کہ پیرزادے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے اُس وقت کے شہنشاہِ مصر کو جو عقیدت ہو گئی تھی اس کے نتیجے میں انہیں اور ان کے خاندان کو از حد عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور تاریخی عوامل بھی تھے۔ اُس دور کے شہنشاہانِ مصر ''چرواہے بادشاہ'' (Hyksos Kings) قبطی النسل لوگ نہیں تھے' بلکہ وہ عرب ہی کے کسی علاقے سے آئے تھے' لہٰذا سیاسی مصلحت کے تحت انہیں ضرورت تھی کہ کوئی ایسی قوت وہاں موجود رہے جسے وہاں کی مقامی آبادی قبطی نسل کے لیے کاؤنٹر ویٹ کی حیثیت حاصل رہے۔

دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام سے گرویدگی اور عقیدت مندی کا بھی یہ نتیجہ تھا کہ حضرت یوسفؑ کے خاندان کو ''جشن'' کے علاقے میں آباد کیا گیا جو مصر کا بہترین اور نہایت زرخیز علاقہ تھا۔ لیکن جب وہاں ایک قومی انقلاب آ گیا اور وطن کے سپوتوں (sons of the soil) یعنی قبطیوں نے چرواہے بادشاہوں کا تختہ اُلٹ دیا اور پھر وہاں پر فراعنہ کا دَور دوبارہ آ گیا تو اس کے بعد وہی لوگ جو کہ پہلے منظورِ نظر اور مراعات یافتہ تھے' وہی عتاب کا نشانہ بن گئے۔ بنی اسرائیل چونکہ دشمن کے منظورِ نظر تھے لہٰذا قبطیوں کی نظر میں دشمن ٹھہرے۔ بنی اسرائیل پر عتاب کا یہ دور بڑا طویل ہے' جس کے دوران نامعلوم کتنے ہزار افراد ہلاک کیے گئے۔ ان میں سے بہت سے اہرامِ مصر کی تعمیر کے دوران سرمہ بن گئے۔ ان کے اوپر بڑی بڑی چٹانیں گریں اور ان کا نام و نشان نہ رہا۔ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ ان پر کم از کم دو مرتبہ ایسا دَور بھی آیا جب فراعنہ مصر نے حکم دے دیا کہ ان کی نوزائیدہ اولاد میں سے بیٹوں کو قتل کر دو' صرف بیٹیوں کو زندہ رکھو۔ اس کے باوجود مصر سے خروج کے وقت ان کی تعداد چھ لاکھ تھی۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ جہاں تک ہماری تاریخی معلومات کا تعلق ہے وہ اس دور سے زائد ہیں ہی نہیں۔ انسان آج تک بس پانچ ہزار سال کی تاریخ کی تحقیق کر پایا ہے۔ پاکستان کے دو قصبوں موہنجو دڑو اور ہڑپہ کے علاوہ ہریانہ (مشرقی پنجاب) میں اسی دور کی تہذیب کے کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں۔ مصر اور عراق کے اندر بھی اسی دور کی انسانی تہذیب کے آثار ملتے ہیں۔ ہمارے عام تحقیق اور انکشافات کے ذرائع اس سے آگے نہیں پہنچ پائے۔ متذکرہ بالا دو آیات کی رو سے ان چار ساڑھے چار ہزار سال کے دوران نبوت کا معاملہ صرف نسلِ ابراہیمی میں ہوسکتا ہے۔

یہاں درحقیقت ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف قرآن یہ کہتا ہے: ﴿وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَـذِيۡرٌ ۝﴾ (فاطر) ''کوئی ایسی بستی نہیں ہے کہ جس میں کوئی نہ کوئی خبردار کرنے والا نہ گزرا ہو''۔ پھر سورۃ الرعد میں فرمایا: ﴿وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ۝﴾ یعنی ہر قوم کے لیے ہم نے ہادی بھیجے۔ تو اب ان دونوں باتوں کے درمیان مطابقت کیسے ہو؟ یہ ایک بڑا علمی مسئلہ ہے۔ اس اشکال کے حل کے لیے ہم پہلے دنیا کی باقی اقوام پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً چین کی تہذیب بڑی قدیم تہذیب ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ چین، روس، سینٹرل ایشیا میں وسطی سلسلۂ کوہ سے پرے آباد ہونے والی اقوام، پھر یورپ کے میدانی علاقے اور مغربی یورپ کے اندر اترنے والی نارو ی نسلیں (Nordic Races) یہ سب حضرت یافث کی نسل سے ہیں۔ اسی طرح اِدھر ایران، ہند اور سندھ اور اُدھر شمالی افریقہ کے علاقے قبط اور سوڈان میں حضرت حام کی اولاد آباد ہے۔ حضرت سام کی اولاد اس تکون میں نیچے اتر گئی ہے۔ آج کل جو علاقہ کردستان کہلاتا ہے یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا مسکن ہے، جس کو ''جزیرہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ فرات اور دجلہ کے درمیان شمال میں جا کر وہ علاقہ کافی چوڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں پر حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ وہاں سے نیچے جنوب کی طرف جزیرہ نمائے عرب تک جو قومیں اتر گئیں، وہ حضرت سام کی اولاد ہیں۔ اس میں عراق اور شام کے باشندوں کے علاوہ پورے جزیرہ نمائے عرب کے لوگ بھی آتے ہیں۔ اس سامی نسل کے اندر بھی بہت سے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے ہیں۔ قرآن مجید بار بار جن قوموں کا تذکرہ کرتا ہے ان میں قومِ عاد اور قومِ ثمود کا تعلق اس سامی نسل ہی سے تھا، جن کی طرف بالترتیب حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ یہ دونوں رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل کے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل حضرت حام اور حضرت یافث کی اولاد میں بھی انبیاء کا ہونا بالکل

قرین قیاس ہے' لیکن چونکہ ریکارڈ موجود نہیں لہٰذا ہم تعین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں کچھ حکماء کا تذکرہ تو ملتا ہے' مثلاً کنفیوشس کوئی بڑا حکیم و دانا انسان تھا' لیکن اس کا نبوت و رسالت کے ساتھ کوئی رشتہ وتعلق تھا یا نہیں' اس کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں۔ ہندوستان کے ایک عالم دین شمس نوید عثمانی صاحب نے اپنی ایک کتاب میں ایک نظریہ پیش کیا ہے جو بہت مدلل ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی پرانی کتابوں اور سنسکرت کے اشلوکوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی نسل ہندوستان میں بھی آ کر آباد ہوئی اور حضرت نوح علیہ السلام کے ماننے والے ہندوستان میں موجود رہے ہیں۔ مہانوح (The Great Noah) کا تذکرہ ان کے ہاں ''منو'' کے نام سے موجود ہے۔ عثمانی صاحب کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو جو صحیفے دیے تھے اور جو شریعت عطا کی تھی اس کے باقیات الصالحات ''منوسمرتی'' نامی کتاب کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ تمام چیزیں عین ممکن ہیں' قرینِ قیاس ہیں۔

اس کے علاوہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' عین قرینِ قیاس ہے کہ ان ساڑھے چار ہزار سال کے دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے کوئی شاخ ہندوستان آ کر آباد ہوئی ہو۔ اس لیے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے دو بیٹوں کا تذکرہ آتا ہے: حضرت عیس یا عیسوؑ اور حضرت یعقوبؑ۔ یہ دونوں توام یعنی جڑواں بھائی تھے۔ پہلے حضرت عیس یا عیسو کی ولادت ہوئی' ان کے عقب میں یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کا نام یعقوبؑ اسی لیے مشہور ہوا۔ ''اور یعقوب اپنے بھائی عیسو کی ایڑیاں پکڑے ہوئے تولد ہوا''۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل یعنی بنی اسرائیل کے انبیاء کی تاریخ تو ہمیں ''عہد نامہ قدیم'' کے ذریعے ملتی ہے' لیکن حضرت عیس یا عیسو کا کیا معاملہ ہوا' اس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ ان کی اولاد اَدوم کے علاقے کی نسبت سے اَدومی کہلاتی ہے' اور اُدمی کا لفظ ہندوستان کے ناموں میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے۔ تو کوئی عجب نہیں کہ حضرت عیس کی نسل اس علاقے میں آباد ہوئی ہو اور ان کی نسل کے اندر کوئی نبی یا رسول آیا ہو۔

پھر یہ کہ ۱۴۰۰ ق م میں بنی اسرائیل کا جو خروج ہوا اس کے نتیجے میں ان کے کچھ قبائل لاپتہ ہو گئے تھے' جنہیں ''The lost tribes of the house of Israel''
کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں بھی گمان موجود ہے کہ ان کے کچھ قبائل یہاں آ کر آباد ہو گئے ہوں۔ اور مجھے تو گمان غالب کی حد تک محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ''برہما'' اور ''برہمن'' کا جو تصور

ہے اس کا درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کوئی رشتہ ضرور ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی یہ بات میں نے کئی مرتبہ عرض کی ہے کہ ان کے نزدیک گوتم بدھ نبی تھے۔ قرآن مجید میں دو مرتبہ ''ذوالکفل'' کا تذکرہ آیا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ وہ کہاں پیدا ہوئے اور ان کی تاریخ کیا ہے۔ مولانا کا گمان یہ ہے کہ ''ذوالکفل'' دراصل کپل وستو کا شہزادہ ہے۔ یہ ریاست نیپال کے علاقہ میں تھی اور ذوالکفل وہاں کے شہزادے تھے۔ اگر ایسا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ یقیناً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی نصِ قطعی کی رو سے حضرت ابراہیمؑ کے بعد نبوت اور کتاب حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے باہر ممکن نہیں۔ آیت زیر مطالعہ ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ کو سامنے رکھیں گے تو تحقیق کے بہت سے دروازے کھل جائیں گے، بہت سے گوشے نمایاں ہو جائیں گے۔ ایک انسان جب آسمانی ہدایت کی روشنی اور راہنمائی میں تحقیق کا سفر طے کرتا ہے تو صحیح تر نتائج تک اس کی رسائی ممکن ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد ''نبوّت'' اور ''کتاب'' ذرّیت ابراہیمؑ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگرچہ دنیا میں اور علاقے بھی ہیں لیکن تاریخ یہودیت اور تاریخ عیسائیت کے حوالے سے ہمارے پاس ثبوت اسی علاقے کا ہے جسے ہم مشرقِ وسطیٰ (Middle East) کہتے ہیں۔ درحقیقت اسلام اور ان دونوں مذاہب (یہودیت اور عیسائیت) کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ قرآن مجید نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل کے جن رسولوں کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی اسی علاقے سے متعلق تھے، یعنی حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام۔ اس کے علاوہ پوری دنیا میں دوسرے علاقوں سے، خاص طور پر ہندوستان اور چین، جو تہذیب وتمدن کے بہت قدیم مراکز ہیں، قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ بحث نہیں کی ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح اور منطقی ہے، اس لیے کہ قرآن کریم کے اوّلین مخاطب یعنی اہل عرب کے پاس ان کے بارے میں واقفیت نہیں تھی۔ لہٰذا خواہ مخواہ ان کا تذکرہ کرنا ان کے لیے گویا ایک لایعنی سی بات ہوتی، کیونکہ اس کے لیے انہیں پہلے تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم دی جاتی، پھر اُن تمام علاقوں میں بھیجے گئے انبیاء ورُسل کا تذکرہ کیا جاتا، جبکہ اس کی قطعاً کوئی حاجت نہیں تھی۔ البتہ اس سے جو اشکال سامنے آ رہا ہے، جسے ہم نے حل کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن کہتا ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ﴾ ''اور ہر بستی میں ایک خبردار کرنے والا (نبی یا رسول) گزرا ہے'' اور: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ ''اور ہر قوم کے لیے ایک راہنما (گزرا) ہے''۔ جبکہ دوسری طرف یہ

حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ کم از کم گزشتہ ساڑھے چار ہزار برس کے دوران تو صرف ذریت ابراہیمؑ ہی میں کتاب اور نبوت رہی۔

ان دونوں الفاظ ''ہادی اور نذیر'' پر غور کرتے ہوئے یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ہر لفظ کے کچھ مضمرات ہوتے ہیں' اس کی اپنی ایک connotation ہوتی ہے۔ لفظ ''ھَادٍ'' یا ''ھادی'' (ہدایت دینے والا) ایک عام لفظ ہے۔ اسی طریقے سے ''نذیر'' (خبردار کرنے والا) بھی ایک عام لفظ ہے۔ یہ دونوں لفظ ایسے شخص کے لیے بھی استعمال ہو سکتے ہیں جو حقائق سے آشنا ہو جائے' چاہے وہ از خود ہی آشنا ہوا ہو۔ قرآن مجید میں اس کی ایک بڑی اہم مثال موجود ہے۔ اور وہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اگر اس کا تذکرہ اتنی وضاحت وصراحت کے ساتھ نہ ہوتا تو یہ اہم مضمون ہم پر منکشف ہی نہ ہو پاتا۔ اور وہ مثال ہے حضرت لقمان کی۔ آپ نہ نبی تھے' نہ رسول تھے اور نہ ہی ان کے بارے میں کسی نبی یا رسول کے اُمتی ہونے کا کوئی ثبوت ہے۔ وہ بس ایک سلیم الفطرت' سلیم العقل انسان تھے۔ اس سلیم الفطرت انسان نے اپنی عقلِ سلیم کی راہنمائی میں غور وفکر اور سوچ بچار کے ذریعے ان تعلیمات تک رسائی حاصل کر لی جو قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات ہیں' یعنی توحید اور معاد۔ اب تیسری چیز جو رہ جاتی ہے وہ نیکی اور بدی کا امتیاز ہے۔ اس کی تمیز اور اس کا شعور بھی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں ودیعت کر دیا ہے۔ نبوت اور کتاب درحقیقت ہدایتِ خداوندی کی معین شکلیں ہیں' لیکن ہدایتِ خداوندی اور انذار صرف نبوت اور کتاب کے ساتھ وابستہ نہیں ہے' بلکہ ایک حکیم اور دانا انسان بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے غور وفکر کے نتیجے میں ان حقائق تک پہنچا ہو اور اپنے ان حقائق اور اپنی علمی اور عقلی یافت کے حوالے سے لوگوں کو خبردار کر رہا ہو' انہیں نیکی کی تلقین کر رہا ہو۔ جیسے سورۃ لقمان میں حضرت لقمان کا قول نقل ہوا ہے: ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ط﴾ (آیت ۱۷) ''اے میرے بیٹے! نماز قائم کر' نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر' اور تجھ پر جو بھی مصیبت پڑے اس پر صبر کر۔'' تو یہاں انذارِ آخرت بھی ہے' توحید کی تلقین بھی ہے اور شرک کی مذمت بھی۔ اس سورۂ مبارکہ میں شرک کی مذمت میں حضرت لقمان کا قول ہے:

﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ط اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾

''اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا! یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

تو گویا یہ تمام بنیادی حقائق نبوت اور کتاب کے بغیر بھی نوعِ انسانی کی رسائی میں ہیں‘ بشرطیکہ اس حوالے سے صحیح فکر کے نتیجے میں مختلف حکماء کی توحید تک رسائی ہو جائے‘ وہ پہچان لیں کہ بس حیاتِ دُنیوی سے پوری تسکین نہیں ہو رہی‘ ذہن مطمئن نہیں ہو رہا‘ بلکہ کوئی اور زندگی ہونی چاہیے اور یہ ہو کر رہے گی۔ اور پھر اس حوالے سے انہوں نے انذارِ آخرت بھی کیا ہو۔ تو یہ ’’انذار‘‘ اور ’’ہدایت‘‘ عام الفاظ ہیں۔ پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے ہادی اور مُنذر اٹھائے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ نبی ہوں‘ لیکن کتاب درحقیقت شریعت سے عبارت ہے‘ یعنی ایک واضح ہدایت کہ یہ کرو‘ یہ نہ کرو‘ یہ حرام ہے اور یہ تمہارے لیے واجب اور فرض ہے۔ یہ چیز درحقیقت ذریت ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہے‘ جس کے لیے قرآن مجید میں ایک آیت بھی موجود ہے کہ ﴿اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ ’’یقیناً میں آپ کو لوگوں کے لیے امام بنانے لگا ہوں‘‘۔

امامت کا مقام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا ہے‘ درحقیقت اسی کا یہ ایک مظہر ہے کہ ’’نبوت‘‘ اور ’’کتاب‘‘ جو ہدایت خداوندی کی ایک معین شکل ہے‘ نسل ابراہیمیؑ کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ نسل ابراہیمی کی ایک شاخ وہ ہے جو حضراتِ اسحٰق اور یعقوب علیہما السلام سے چلی اور زیادہ تفاصیل ہمیں انہی کی معلوم ہیں۔ دوسری شاخ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے چلی اور ان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ تیسری شاخ حضرت قتورہ سے چلی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی ہیں۔ ان کے کئی بیٹے تھے۔ ہم ان میں سے صرف ایک سے واقف ہیں جن کی نسل قومِ مدین یا مدیان کہلائی ہے‘ جن میں حضرت شعیب علیہ السلام بھیجے گئے۔ لیکن ان کی اولاد کہاں کہاں پھیلی ہے‘ اس کا ہمیں کوئی پختہ علم نہیں۔ جیسے میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت عیس یا عیسو کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ وہ کہاں گئے۔ نسل تو وہ بھی ابراہیمؑ ہی کی ہوگی۔ اس نسل میں بھی کوئی نبی آئے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے وہ دور دراز کے علاقوں میں جا کر آباد ہو گئے ہوں۔ لیکن بہرحال نبوت اور کتاب کی شکل اگر ہے تو وہ صرف ذریتِ ابراہیمیؑ میں ہے۔ باقی عام اخلاقی ہدایات‘ عام اخلاقی تعلیمات‘ کم سے کم توحید کی تلقین اور شرکت کی مذمت‘ یہ وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے چونکہ عقل سلیم اور فطرتِ سلیمہ میں ودیعت کر دی ہیں لہٰذا اس حوالے سے ہر قوم کے اندر کسی نبی‘ یا کسی ہادی یا کسی نذیر کا آنا بالکل قرین قیاس ہے اور ان دونوں چیزوں میں کوئی تضاد نہیں۔

یہ آیت مبارکہ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ’’پس

ان میں ہدایت یافتہ بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے''۔ اس سے پہلے فرمایا گیا تھا: ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ''اور ہم نے ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی''۔ جب تک حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں آئے حضرت نوح علیہ السلام کی نسل میں نبوت و کتاب رہی۔ بعد ازاں حضرت ابراہیمؑ کے بعد اُن کی نسل میں نبوت و کتاب کو مخصوص کر دیا گیا۔ لیکن چاہے وہ ذریت نوحؑ ہو یا ذریت ابراہیمؑ' یہ سب کے سب نیک لوگ نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ وہ بھی ہوئے جنہوں نے ہدایت اختیار کی' ہدایت یافتہ ہوئے' جبکہ ان میں سے بہت سے وہ ہیں کہ جنہوں نے اس راستے کو چھوڑا' اس سے اعراض وانحراف کیا' بدعات اور طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے اور مشرکانہ اوہام میں مبتلا ہو گئے۔ بہرحال ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جو ہدایت پر تھے' لیکن ان میں سے بہت سے فاسق اور نافرمان ہیں' وہ اللہ کی ہدایت سے مُنہ موڑ کر فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد سلسلۂ ارسالِ رُسل

اس حصے کا اصل مضمون اس دوسری آیت میں آ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا﴾ ''پھر ہم نے ان کے نقوش قدم پر اپنے بہت سے رسولوں کو اٹھایا''۔ یعنی حضراتِ نوح' ابراہیم علیہما السلام اور اُن کے جو صالح پیرو تھے ان کے نقشِ قدم پر بہت سے رسولوں کو بھیجا گیا۔ ''قفی'' کا مطلب ہے کسی شے کے پیچھے لگنا' کسی کی پیروی کرنا۔ اس ''ق ف ی'' مادہ سے اردو میں بھی ایک لفظ بنتا ہے ''قافیہ'' (جمع قوافی)۔ یہ لفظ شعر کے پیچھے آتا ہے جس کے حوالے سے اشعار میں ایک ردھم قائم ہوتا ہے' یکسانیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ لفظ ''قَفَّیْنَا'' قرآن مجید میں چار مرتبہ آیا ہے جن میں سے دو مقامات تو یہی ہیں۔ اس مادے سے صرف ایک جگہ یہ لفظ اس طرح آیا ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''اور اس چیز کے پیچھے مت پڑو جس کے بارے میں تمہیں علم نہیں ہے۔ یقیناً سماعت' بصارت اور عقل ان تمام چیزوں کے بارے میں باز پُرس ہوگی''۔ ''وَلَا تَقْفُ'' کا مطلب ہے مت پیچھے لگو' مت پیچھے پڑو اُن چیزوں کے جن کے لیے تمہارے پاس کوئی واضح علم نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں سماعت' بصارت اور عقل کی جو صلاحیتیں دی ہیں اس لیے دی ہیں کہ ان کی رہنمائی کو اختیار کرو۔ غور و فکر کرو' سوچ بچار کرو۔ پھر دوسری چیز ہدایت ہے جس کے لیے یہ وحی کا سلسلہ ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر طرح طرح کے اوہام ہیں' جیسے ستارہ شناسی اور دست شناسی ہے۔ یہ چیزیں ہمارے ہاں

’’occult sciences‘‘ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں علم الاعداد (سائنس آف نمبرز) ہے۔ اگرچہ ان سب کو سائنس کا نام دے دیا گیا ہے لیکن ان کو occult sciences کہتے ہیں۔ قرآن کی راہنمائی یہ ہے کہ ان کے پیچھے نہ پڑو۔ درحقیقت سمع و بصر اور عقل کی جو صلاحیتیں دی گئی ہیں یہ اُن کی ناقدری ہے کہ انسان اِن چیزوں کی پیروی کرے‘ ان کے پیچھے پڑے۔

حضرت عیسیٰؑ اور ان کے متبعین کا تذکرہ

آگے فرمایا: ﴿وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ﴾ ’’اور پھر ہم نے ان کے پیچھے اُٹھایا مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو اور اسے ہم نے عطا کی انجیل‘‘۔ نبوت کے ساتھ کتاب کا ایک خاص ربط ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی‘ اور اُن کے بعد جو بہت سے انبیاء بنی اسرائیل ہیں ان کو بہت سے صحیفے دیے گئے۔ خاص طور پر ایک صحیفہ ’’زبور‘‘ کے نام سے مشہور ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کو دیا گیا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل کے ساتھ مبعوث کیا گیا۔ آگے فرمایا گیا: ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ﴾ ’’اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی) ان کے دلوں میں ہم نے رأفت اور رحمت پیدا کر دی‘‘۔ ’’رأفت‘‘ اور ’’رحمت‘‘ تقریباً مترادف الفاظ ہیں۔ بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ جو مترادفات کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں‘ لیکن ظاہر بات ہے کہ دو الگ الگ الفاظ کے دو مفہوم یقیناً ہوتے ہیں اور جب وہ بیک وقت سامنے آتے ہیں تو پھر غور کرنا پڑتا ہے کہ ان کے مابین فرق کیا ہے‘ ورنہ وہ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ’’ایمان‘‘ اور ’’اسلام‘‘ مترادف بھی ہیں (ہمارے منتخب نصاب میں یہ الفاظ بار بار استعمال ہوئے ہیں) لیکن ان کا اپنا علیحدہ مفہوم بھی ہے۔ اسی طرح جہاد و قتال‘ نبوت و رسالت اور نبی و رسول تقریباً مترادف بھی ہیں لیکن ان کا علیحدہ علیحدہ مفہوم اور مضمون بھی ہے۔ اس کے بارے میں اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ: ’’اِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا وَاِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا‘‘ کہ جب یہ جوڑوں کے الفاظ علیحدہ علیحدہ آتے ہیں تو مفہوم تقریباً ایک ہی ہوتا ہے‘ لیکن جہاں دونوں ایک ساتھ آ جائیں گے تو وہاں یقیناً کوئی نہ کوئی فرق ہوگا جس کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ یہاں پر بھی رأفت اور رحمت جوڑا بن کر آئے ہیں۔ ان دونوں میں نسبت یہ ہے کہ رأفت اس کیفیت کا نام ہے جس کے تحت کسی کے دکھ اور درد کو انسان اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اس کے لیے فارسی کا لفظ ’’ہمدردی‘‘ مستعمل ہے جو اِس مفہوم کو بہت خوبصورتی سے ادا کرتا ہے۔ جیسے ایک جماعت کے لوگ ہم جماعت اور ایک زمانے کے لوگ ہم عصر

کہلاتے ہیں اسی طرح ہمدرد کا مطلب ہے جن کا درد باہم مشترک ہے‘ یعنی ایک دوسرے کے درد کو محسوس کرنے والے لوگ ہمدرد ہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا: ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیؔر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

اس ہمدردی کے مادے کو ایک حدیث میں رِفق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهُ)) ’’جو شخص دل کی نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ کُل کے کُل خیر سے محروم ہو گیا۔‘‘ یعنی کٹھور دل‘ سخت دل انسان خیر سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رقیق القلب اور شفیق کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ آپ کا مشفق وہ ہے جسے آپ کے بارے میں اندیشے رہیں کہ آپ کو کہیں کوئی گزند نہ پہنچ جائے‘ کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے‘ کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ شفقت ہے۔ والدین کی شفقت یہی ہے کہ انہیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اولاد کو کہیں کوئی نقصان نہ ہو‘ کوئی گزند نہ پہنچے۔ ان تمام کیفیات کے لیے ’’رأفت‘‘ درحقیقت ایک جامع عنوان ہے۔ یہ دل کی وہ کیفیت ہے کہ جس میں کسی کے دکھ درد کو انسان خود اپنے باطن میں محسوس کر سکے۔ اس کا نتیجہ نکلتا ہے ’’رحمت‘‘ کی صورت میں۔ رحمت یہ ہے کہ اب آپ اس کے درد کو بانٹنے کی کوشش کریں‘ اس کے ازالے کی کوشش کریں‘ اس کی تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش کریں۔ تو رحمت گویا اس کا نتیجہ ہے۔ رأفت اور رحمت اب جوڑے کی شکل میں آئے ہیں اور بیک وقت دونوں الفاظ آئے ہیں تو ان میں یہ نسبت ہے۔ یہ الفاظ یا تو اللہ کے لیے آتے ہیں‘ جیسے رؤف اور رحیم‘ یعنی نہایت شفیق‘ نہایت مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا۔ یا پھر یہ حضور ﷺ کے لیے سورۃ التوبۃ کی آخری سے پہلی آیت میں آئے ہیں: ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢٨﴾﴾ ’’(آپ ﷺ) مؤمنوں کے حق میں نہایت شفیق اور نہایت رحیم ہیں‘‘۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں کے لیے بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ اس لیے کہ اُن کے دلوں میں ایک خاص رقتِ قلبی تھی۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مابین یہ وصف بہت ہی مشترک تھا۔ اس اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ حضور ﷺ کی شخصیت کا ایک کامل پرتو تھے۔ یہ ہے رأفت اور رحمت۔

رہبانیت کی اصل حقیقت

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ ’’اور رہبانیت کی بدعت خود

انہوں نے ایجاد کی تھی‘ ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا‘‘۔ اس رأفت اور رحمت کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جب یہ چیز حدِّ اعتدال سے تجاوز کر گئی تو اس نے رہبانیت کی شکل اختیار کر لی۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ لفظ ’’رَہبانیت‘‘ اصل میں کیا ہے۔ عام طور پر ہم رُہبانیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لفظ دونوں درست ہیں لیکن یہاں رَہبانیت ہے‘ رُہبانیت نہیں ہے۔ رَہب کہتے ہیں خوف کو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ۝﴾ (البقرۃ) ’’پس مجھ ہی سے ڈرو‘‘۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے: ﴿وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ﴾ (الانفال:۶۰) ’’(مسلمانو!) اپنے دشمنوں کے لیے اپنے پاس حتی الامکان طاقت اور بندھے ہوئے گھوڑے (یعنی وقت کے تقاضوں کے مطابق جدید ترین اسلحہ تیار رکھو) تاکہ تم ڈراؤ (خوف زدہ کرو) اپنے دشمنوں کو بھی اور اللہ کے دشمنوں کو بھی‘‘۔ تو ’’رَہب‘‘ کا مطلب ہے خوف۔ رَہب سے ’’ر‘‘ کے زبر کے ساتھ رَہبان بنتا ہے۔ جیسے رَحم سے رَحمان۔ یہ فَعلان کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے کہ جب کوئی وصف بہت ہی ہیجانی کیفیت میں ہو‘ طوفانی انداز کا ہو‘ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہو۔ اسی طرح کی رحمت ’’رحمان‘‘ کے لفظ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تو رَھبان سے مراد وہ شخص ہے جس کے اندر بہت ہی زیادہ خشیت الٰہی ہو‘ اللہ کا خوف‘ آخرت کی باز پُرس کا خوف انتہائی شدت اختیار کر جائے۔ یعنی بہت زیادہ خوف زدہ‘ بہت زیادہ ڈرنے والا۔ اور ’’رَہبانیت‘‘ اس کیفیت کا نام ہے۔ اور اس سے جو ایک نظام وجود میں آتا ہے اس کے لیے گویا کہ یہ بطور اسمِ علَم ہے۔ جبکہ رَہب سے اسم فاعل ’’راہب‘‘ ہے اور اس کی جمع ’’ر‘‘ کے پیش کے ساتھ ’’رُہبان‘‘ ہے۔ اس سے رُہبانیت بنا ہے جس کا مطلب ہے راہبوں کا طریقہ‘ راہبوں کا مسلک‘ راہبوں کا انداز۔ تو ’’رُہبانیت‘‘ اور ’’رَہبانیت‘‘ کے اس فرق کو نوٹ کر لیں۔ فرمایا گیا:

﴿وَرَهۡبَانِيَّةَ ۨ ابۡتَدَعُوۡهَا﴾ ’’اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود اختیار کر لی۔‘‘ اس سے مراد کیا ہے؟ درحقیقت دنیا میں یہ ایک نظام ہے کہ انسان جہاد اور قتال کے راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالے اور شیطان انسان کی تمام تر توجہ کو صرف ذاتی اصلاح کے اوپر مرکوز کر دے‘ اور اس میں اس درجے تشدد ہو جائے کہ انسان اپنی نفس کُشی پر آمادہ ہو جائے۔

دیکھئے ایک تو ہے ضبطِ نفس (self control)۔ یہ تو مطلوب ہے‘ اس کے بغیر تو ظاہر بات ہے کہ انسان بھلائی اور نیکی کا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ تقویٰ نام ہی اسی کا ہے کہ پہلے انسان کو اپنے نفس

کے اوپر کنٹرول حاصل ہو اور پھر وہ اسے اللہ کے سامنے جھکا دے۔ تو تقویٰ اور ضبطِ نفس گویا کہ تقریباً مترادف الفاظ ہیں۔ لیکن ایک لفظ ہے ''نفس کشی''۔ نفس کشی یہ ہے کہ انسان کے اندر جب یہ جذبہ ایک حداعتدال سے تجاوز کر جائے تو پھر وہ اپنے آپ کو اذیتیں پہنچاتا ہے' اپنے نفس کو اس کی کوئی بھی مرغوب شے فراہم نہیں کرتا' ہر طرح سے اس کے تقاضوں کو کچل ڈالتا ہے۔ انگریزی میں ''self annihilation'' کا لفظ اس کی بہترین تعبیر ہے۔ یعنی انسان نفس کشی میں اتنا مبالغہ کرے' اتنا تعمق کرے کہ جس کی نفی قرآن مجید میں بھی آئی ہے۔ فرمایا گیا ہے: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الاعراف:۳۲) ''(اے نبیؐ!) ان سے کہیے کہ کس نے حرام کی ہیں زینت کی وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں' اور پاکیزہ چیزیں رزق میں سے؟'' بلکہ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ان چیزوں کو جائز راستے سے حاصل کرو' جائز راستے سے اچھا کھاؤ' اچھا پہنو۔ اسی طرح ادائے حقوق کا معاملہ ہے۔ اللہ کا جو حق ہے وہ ادا کرو' اپنے پڑوسی کا حق ادا کرو' رشتہ داروں کا حق ادا کرو۔ اسی طرح سائلین اور محرومین کا حق ادا کرو۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝﴾ (الذّٰریٰت) ''اور ان کے مالوں میں سائلوں اور محروموں کا حق ہے''۔ حقوق کے معاملے میں دین کا تصور تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) ''اور یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔ اس کو بھی اس کا حق پہنچاؤ۔ اس کی جو بھی ضروریاتِ زندگی اور تقاضے ہیں' اللہ تعالیٰ نے جسم کے اندر جو داعیات رکھ دیے ہیں ان تمام تقاضوں اور داعیات کو جائز راستے سے پورا کرو۔

دراصل جب نیکی کا جذبہ حداعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے' اس میں مبالغہ' تعمق اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر یہ ایک عجیب شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر انسان اپنے نفس کو اُس کے جائز حقوق بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا' بلکہ اُس پر قدغنیں لگاتا ہے۔ ہر طرح کی معاشرتی آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم کر کے اور معاشرے سے کٹ کر دُور جنگلوں میں' پہاڑوں کی غاروں میں اور چوٹیوں پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص برفانی چوٹیوں پر ننگے بدن کھڑا سردی کو جھیل رہا ہے' تاکہ وہ اپنے نفس کو کچلے۔ یہ ہے درحقیقت وہ رَہبانیت کہ جس کی طرف کچھ لوگ مائل ہو گئے۔ یہ لوگ اپنی نیک نیتی اور نیک دلی سے اس راستے کی طرف گئے' لیکن شیطان نے اُن کے رخ کو موڑ دیا' انہیں divert کر دیا۔ شیطان نے انہیں غلط پٹی پڑھائی کہ بجائے اس کے کہ معاشرے میں رہ کر باطل

کے ساتھ مقابلہ کرو‘ ظلم کا استیصال کرو‘ بدی کو ختم کرنے کی کوشش کرو‘ تم معاشرے سے ہی کٹ جاؤ اور جا کر کہیں جنگلوں‘ غاروں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسیرا کرو اور بس اسی نفس کُشی (self annihilation) کے اندر اپنی پوری زندگی بِتا دو۔ یہ راستہ درحقیقت رَہبانیت ہے‘ جس کے بارے میں اسلام میں شدت سے نفی آئی ہے۔

ضبطِ نفس کا اسلامی تصور

مراسیل ابی داؤد میں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ)) ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں''۔ اسی طرح مسند احمد کی ایک روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لِكُلِّ اُمَّةٍ رَهْبَانِيَّةٌ وَرَهْبَانِيَّةُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) ''ہر اُمت کی کوئی رہبانیت ہوتی ہے اور اس اُمت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔ یہ حضور ﷺ کا نہایت حکیمانہ قول ہے۔ اس سے زیادہ حکیمانہ بات نہیں ہوسکتی‘ کہ تم اپنے نفس کو تکلیفیں پہنچانا چاہ رہے ہو‘ یہی تکلیفیں جہاد فی سبیل اللہ میں بھی تو ہیں۔ جب تم غاروں میں بیٹھ کر اپنے نفس کو تکلیفیں پہنچاؤ گے تو اس سے اگر کوئی فائدہ پہنچے گا بھی تو صرف تمہاری اپنی ذات کو پہنچے گا۔ اگرچہ اس میں بہت سے خطرات بھی ہیں جو بہت زیادہ خوفناک نتائج پیدا کر سکتے ہیں‘ لیکن بالفرض اگر مثبت پہلو ہی سامنے رکھا جائے تو اس سے صرف تمہاری ذات کو ہی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ یہی تکلیفیں تم اپنے نفس کو جہاد فی سبیل اللہ میں پہنچاؤ۔ وہاں جا کر بھوک بھی ستاتی ہے۔ ایسا وقت بھی آتا ہے‘ جیسا کہ غزوۂ تبوک میں ہوا ہے‘ کہ تین تین مجاہدین کے لیے چوبیس گھنٹے کا راشن صرف ایک کھجور ہے۔ اب اس سے زیادہ نفس کشی اور کیا ہوگی۔ لیکن یہ نفس کشی اس راستے میں ہے کہ جس سے دین کا غلبہ ہوگا‘ نظامِ عدل وقسط قائم ہوگا۔ اس سے بحیثیت مجموعی کروڑوں انسان ظلم‘ جبرواستبداد اور استحصال کے پھندوں سے نجات پائیں گے۔ ان کے لیے پھر ممکن ہوگا کہ وہ بھی اپنے پروردگار کی طرف کوئی توجہ کریں‘ اس سے لو لگائیں‘ اس کے ساتھ راتوں کو کھڑے ہوکر مکالمہ اور مخاطبہ کریں‘ اس کے ساتھ مناجات کریں۔ لیکن یہ تب ہوگا کہ انہیں ظلم کی چکیوں سے نکالا جائے۔ وہ جو کولہو کے بیل بنے ہوئے ہیں‘ جو بار برداری کے جانور بن کر رہ گئے ہیں‘ ان کے لیے کیا ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے لو لگائیں اور کہیں کوئی اعلیٰ خیال بھی ان کے ذہن میں آ سکے؟ تو نوعِ انسانی کو اِن بندھنوں سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کرو۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس جہاد فی سبیل اللہ میں بھوک بھی آجائے گی‘ بے آرامی بھی آجائے گی‘ تکلیفیں بھی آجائیں گی۔ بجائے اس کے کہ غاروں میں

جا کر اپنے نفس کو یہ تکلیفیں پہنچاؤ' وہ سارے مقاصد جہاد فی سبیل اللہ میں بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔تو حضورﷺ نے فرمایا: ((رَهْبَانِيَّةُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ''اِس اُمت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔اور یہی جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کا نقطۂ عروج (climax) یہ آیت ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ......﴾ (الحدید:۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اوران کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی' تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔اور ہم نے لوہا اتارا جس میں جنگ کی قوت ہے اور لوگوں کے لیے منافع بھی ہیں......''

اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ یہ بھی ہے کہ حرام سے اس کو بچا لو۔فرض کیجیے اندر سے کسی حرام کی خواہش جنم لے رہی ہے تو اپنے نفس کو اُس سے روکو۔جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ہے:﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝﴾ (النّٰزعٰت) ''اوراس نے اپنے نفس کو روکے رکھا (اوراس کی لگامیں کھینچ کر رکھیں) خواہش سے''۔بشرطیکہ وہ خواہش حرام کے راستے کی ہو۔لیکن اگر جائز کی خواہش ہے تو اس کے لیے تو فرمایا گیا ہے:((وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) ''یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔یعنی ادائے حقوق کے اندر یہ بھی شامل ہے کہ اپنے نفس کو اس کا حق ادا کرو۔رَہبانیت میں نہایت تشدد ہوتا ہے۔بلکہ میں اس کے لیے تعمق کا لفظ استعمال کرتا ہوں کہ بہت گہرائی میں جانا' چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں بھی' جن کو ہم صغائر کہتے ہیں' نہایت حساس ہو جانا اور اپنے اوپر بہت سختی کرنا۔

اس سلسلے میں سنن ابی داوٗد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نبویؐ ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا:((لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَيُشَدَّدَ عَلَيْكُمْ)) ''اپنے اوپر زیادہ تشدد نہ کرو (زیادہ سختی نہ کرو' اس نفس کو جائز چیزوں سے تو محروم نہ کرو) ورنہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تم پر سختی کرے گا (اور یہ سختی تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو جائے گی)((فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ)) ''اس لیے کہ تم سے پہلے بھی ایک قوم ایسی گزری ہے جس نے اپنے اوپر بہت تشدد کیا (نفس کشی کی انتہا کو پہنچ گئے) تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی''۔((فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ)) ''پس ان کلیساؤں' گرجوں اور راہب خانوں میں ان کے بقایا بیٹھے ہوئے ہیں''۔ان کا جو حشر ہے اس سے اللہ کی پناہ! خود مغربی مؤرخین نے Christian Monasticism کی جو تاریخ مرتب کی ہے اس میں جس طرح کی تفاصیل سامنے آتی ہیں اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے

ہیں۔ ابتدائی دور میں جن لوگوں نے اس کو ایجاد کیا یقیناً انہوں نے اپنے اوپر بہت تشدد اور سختی کی۔ دراصل کچھ لوگ تو باہمت ہوتے ہیں جو اُس سختی کو برداشت کر جاتے ہیں' اس کی پابندی کر جاتے ہیں' لیکن پھر اُن کے اکثر پیرو اُن چیزوں کی پابندی نہیں کر پاتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بظاہر راہب اور راہبائیں ہیں' غیر شادی شدہ ہیں' لیکن اندر خانے راہب خانوں کے اندر زنا کاری ہو رہی ہے' حرامی اولاد پیدا ہو رہی ہے' ان کے گلے گھونٹے جا رہے ہیں اور راہب خانوں کے تہہ خانوں میں ناجائز اولاد کے قبرستان بن گئے ہیں۔

دراصل انسان جب اپنی فطرت سے کشتی کرتا ہے تو کچھ لوگ تو باہمت ہوتے ہیں جو واقعتاً اپنے نفس پر قابو پا لیتے ہیں' اسے کچل دیتے ہیں' لیکن اکثریت کا معاملہ یہ نہیں ہوتا' بلکہ انسان کی فطرت' اس کی سرشت اسے پچھاڑ دیتی ہے' اور پھر انسان جس طرح گندگی کے اندر گرتا ہے اور جس انتہائی پستی تک پہنچتا ہے' واقعہ یہ ہے کہ اس کا تذکرہ کرنا بھی بڑا مشکل ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ مت کرو اپنے اوپر تشدد۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بار بار آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ قرآن مجید میں تین مقامات بہت اہم ہیں' جن میں کبائر سے بچنے کو کہا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾﴾ (النساء)

''اگر تم اُن بڑی چیزوں سے جن سے تمہیں روکا جا رہا ہے' اجتناب کر لو گے تو چھوٹی چیزیں ہم خود ہی تم سے دور کر دیں گے اور تمہیں عزت کی جگہ داخل کریں گے''۔

عام طور پر جب مذہبی مزاج اور مذہبی ذہنیت بنتی ہے اور ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تعمق شروع ہوتا ہے تو پھر بسا اوقات صورت وہ پیدا ہو جاتی ہے کہ مچھر چھانے جاتے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جاتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہود کے علماء پر تنقید کی تھی کہ تمہارا حال یہ ہے کہ مچھر چھانتے رہتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تعمق بھی ہے' تشدد بھی ہے' تکلف بھی ہے اور over emphasis بھی ہے' لیکن بڑی بڑی چیزیں نگلی جا رہی ہیں۔

اسی طرح سورۃ النجم میں فرمایا:

''جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں' الّا یہ کہ کچھ قصور اُن سے سرزد ہو جاتے ہیں''۔

معمولی چیزیں انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں زیادہ حساس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اصول یہ دیا گیا ہے کہ: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ﴾ (ہود:۱۱۴) ''یقیناً نیکیاں چھوٹی چھوٹی برائیوں کا ازالہ کرتی رہتی ہیں''۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ انسان وضو کرتے ہوئے اپنا چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہ صغائر ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے غیر ارادی طور پر کسی نامحرم پر نگاہ پڑ گئی ہے' اور اُس وقت انسان نے بلا ارادہ کوئی تلذذ (Gratification) بھی محسوس کیا ہے' تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے گا۔ وضو کرتے ہوئے جب آپ آنکھ دھوئیں گے تو اس کی جو کدورت اور کثافت ہے وہ دھل جائے گی۔ ہاں ارادے کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہو' ورنہ کبائر تک معاملہ چلا جائے گا۔

تیسرا مقام سورۃ الشوریٰ کا ہے جس میں فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾

''اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں' اور جب بھی وہ غضب ناک ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں''۔

تو حقیقی طرزِ عمل یہ ہے کہ ایک تو اپنی پوری توجہ کو اس جدوجہد پر مرکوز کیا جائے کہ دین غالب ہو' نظامِ عدل و قسط قائم ہو' ظلم' باطل' استحصال اور جبر کا استیصال کر دیا جائے' اور دوسرے خود انسان کبائر سے بچا ہوا ہو' تمام بڑے بڑے گناہوں سے اس نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ہو تو اللہ تعالیٰ صغائر کو دھوتے رہتے ہیں۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ﴾ ''ہم تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دیں گے''۔ اور: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ کہ انسان کی اچھائیاں اس کی چھوٹی چھوٹی برائیوں کا خود بخود ازالہ کرتی رہتی ہیں۔ وہ خود بخود دھلتی چلی جاتی ہیں۔

ضبطِ نفس اور اُسوۂ رسول ﷺ

عام طور پر ایک مذہبی مزاج کے اندر جو تشدد اور تعمق پیدا ہو جاتا ہے حدیث نبویؐ میں اس کی بہترین مثال موجود ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ اِلٰی بُیُوْتِ اَزْوَاجِ النَّبِیِّ ﷺ یَسْاَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِیِّ ﷺ ''تین اشخاص نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھروں میں آئے اور آپ ﷺ کی نفلی عبادت کے بارے میں سوال کیا''۔ ظاہر بات ہے فرض عبادت تو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے! پانچ نمازیں تو سب کو پڑھنی ہیں۔ انہوں

نے دریافت کیا کہ حضورﷺ اور کتنی نمازیں پڑھتے ہیں، یعنی رات کو کتنی دیر تک آپؐ نوافل ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح رمضانِ مبارک کے روزے تو سب نے رکھنے ہی ہیں، حضورﷺ نفلی روزے کتنے رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ تحقیق کی۔ ان کے اندر نیکی کا جذبہ بہت توانا اور طاقتور ہو کر اُبھر آیا تھا تو انہوں نے اندازہ کرنا چاہا کہ حضورﷺ کا معمول کیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں: فَلَمَّا اُخْبِرُوْا كَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا ''جب انہیں اس کی خبر دی گئی تو انہوں نے اس کو کم تصور کیا''۔ ظاہر بات ہے کہ نہ حضورﷺ کی زندگی میں کوئی تکلف و تصنع تھا اور نہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی طرف سے اس معاملے میں، معاذ اللہ، کوئی مبالغہ آرائی ہو سکتی تھی۔ جو صحیح صحیح صورتِ حال تھی انہوں نے بیان کر دی۔ لیکن ان تین صحابہ ؓ کے اندازے سے یہ بات بہت کم نکلی۔ وہ سمجھتے تھے حضورﷺ تو شاید ساری رات بستر سے اپنی کمر لگاتے ہی نہیں ہوں گے۔ لیکن انہیں معلوم ہوا کہ حضورﷺ تہجد اور نوافل پڑھتے ہیں لیکن رات کو استراحت بھی فرماتے ہیں۔ اسی طرح ان کا گمان تھا کہ حضورﷺ تو روزے کا کبھی ناغہ ہی نہیں کرتے ہوں گے، ہمیشہ روزے رکھتے ہوں گے۔ انہیں بتایا گیا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ حضورﷺ کے روزے رکھنے کا اتنا معمول ہے۔ یہ بات ان کی توقع سے کم تھی۔ راوی فرماتے ہیں: فَقَالُوْا وَاَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ قَدْ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ ''اب انہوں نے (اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے) کہا کہ ہمارا حضورﷺ سے کیا مقابلہ (ہم اپنے معاملے کو حضورﷺ کے معاملے پر کہاں قیاس کر سکتے ہیں!) جب کہ ان کے تمام اگلے پچھلے گناہ اللہ نے پہلے ہی معاف کر دیے ہیں''۔ قَالَ اَحَدُهُمْ اَمَّا اَنَا فَاِنِّيْ اُصَلِّي اللَّيْلَ اَبَدًا ''اب ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو اب ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا (قطعاً نہیں سوؤں گا)''۔ وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَصُوْمُ الدَّهْرَ وَلَا اُفْطِرُ ''دوسرے نے کہا میں تو ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا، کبھی افطار نہیں کروں گا (ناغہ نہیں کروں گا)''۔ وَقَالَ آخَرُ وَاَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا ''تیسرے نے کہا کہ میں تو عورتوں سے بالکل علیحدہ رہوں گا اور کبھی بھی شادی نہیں کروں گا۔''

فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلَيْهِمْ فَقَالَ: ''پس رسول اللہﷺ ان کے پاس گئے اور فرمایا''۔ یہاں سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضورﷺ کو جوں ہی یہ بات معلوم ہوئی آپؐ خود اُن کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: ((اَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟)) ''کیا آپ ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ یہ باتیں کہی ہیں؟'' ((اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ)) ''اللہ کی قسم! میرے اندر

تم میں سب سے بڑھ کر اللہ کی خشیت ہے اور میں تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہوں''۔ یہ حضور ﷺ کا بہت ہی غیر معمولی انداز ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ((لٰـكِنِّيْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ)) ''لیکن (میرا معمول تو یہ ہے کہ) میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی ناغہ بھی کرتا ہوں)'' ((وَاُصَلِّيْ وَاَرْقُدُ)) ''اور میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں'' ((وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ)) ''اور میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں (متعدد ازواج میرے گھر میں ہیں)'' ((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) ''تو (کان کھول کر سن لو!) جو میری سنت سے اِعراض کرے گا (جسے میری سنت پسند نہیں ہے) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ یعنی ہے تو یہ نیکی کا جذبہ جو بڑا مشتعل ہو گیا ہے' بہت ہی قوی ہو کر اُبھرا ہے' لیکن جان لو کہ اسے حدِ اعتدال میں اگر نہ رکھا تو حضور ﷺ کے اُسوہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ آپؐ کا اُسوہ اور سنت تو درحقیقت اس اعتدال پر مبنی ہے کہ نفس کا بھی حق ہے۔ جیسے ایک جگہ آپؐ نے فرمایا: ((وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) ''اور یقیناً تیرے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر بھی اسی طرح کا زہد کا غلبہ ہو گیا تھا۔ آپؓ پوری پوری رات نماز پڑھتے تھے اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھے بلا کر جواب طلبی فرمائی: ((يَا عَبْدَ اللّٰهِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّيْلَ)) ''اے عبداللہ! مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور پوری رات نماز پڑھتے ہو؟'' اب وہ حضور ﷺ کے سامنے کیسے چھپائیں۔ عرض کیا: بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ''حضورؐ! ایسا تو یقیناً ہے''۔ آپؐ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ' صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ' فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) ''ایسا مت کرو! روزہ بھی رکھو اور افطار (ناغہ) بھی کرو' رات کو قیام بھی کرو اور آرام بھی کرو۔ یقیناً تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتیوں کا بھی تم پر حق ہے''۔ تمہارے اوپر جو بھی حقوق ہیں ان سب کو ایک اعتدال اور توازن کے ساتھ ادا کرو۔

مندرجہ بالا طویل متفق علیہ حدیث کی ایک اور روایت (version) بھی ہے جو سنن النسائی میں ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تین اشخاص کی بات پر حضور ﷺ نے باقاعدہ اجتماع میں بھی خطاب فرمایا۔ یعنی ایک تو ان تینوں اشخاص کے پاس جا کر آپؐ نے ان کو تنبیہہ فرمائی کہ یہ میرا راستہ

اور طریقہ نہیں ہے، اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ ((مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) لیکن اس پر مستزاد یہ کہ آپ ﷺ نے باقاعدہ ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ روایت میں ہے: فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰی عَلَیْهِ ثُمَّ قَالَ: ((مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَقُوْلُوْنَ كَذَا وَكَذَا لٰكِنِّیْ اُصَلِّیْ وَاَنَامُ وَاَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) اس روایت سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ حضور ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ یہ صرف ان تین افراد کا معاملہ نہیں، بلکہ یہ ایک رجحان ہے، اور ممکن ہے یہ چیز مسلمانوں کی جماعت کے اندر زیادہ بڑے پیمانے پر سرایت کر جائے تو حضور ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے اللہ کی حمد و ثناء کی، اس کے بعد عمومی الفاظ کی شکل میں فرمایا: ''کیا ہو گیا ہے لوگوں کو کہ ایسی ایسی باتیں کر رہے ہیں؟'' کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ کوئی کہتا ہے کہ میں پوری پوری رات نماز پڑھا کروں گا اور کوئی کہتا ہے کہ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔ لیکن غور سے سن لو: ''(میرا طریقہ یہ ہے کہ) میں نوافل بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور روزہ رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں، اور میں نے عورتوں سے نکاح بھی کیے ہیں (میں تو ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں)، تو جو بھی میری سنت سے اعراض کرے گا (یا جسے بھی میری سنت پسند نہیں ہے) اس کا پھر مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔

اس سے دو باتیں اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ پہلی بات یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ﴾ (الروم: ۳۰) ''اللہ کی فطرت وہ ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے''۔ اس میں اعتدال اور توازن ہے۔ ضبطِ نفس (self control) درکار ہے لیکن نفس کشی (self annihilation) ہرگز پسندیدہ نہیں ہے، یہ رَہبانیت خلافِ فطرت ہے۔ اس کے خلافِ فطرت ہونے کے باعث بسا اوقات انسان اپنے آپ سے شکست کھا جاتا ہے۔ وہ نفس کشی کا فیصلہ تو کر لیتا ہے لیکن اس کی پابندی نہیں کر پاتا (اسی آیت مبارکہ کے آخر میں یہ مضمون آئے گا)۔ اور دوسری بات، جو اصل میں اس کلائمس اور اینٹی کلائمکس کے مابین ربط قائم کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ انسان کا رُخ اقامت دین کی طرف رہے۔ یعنی وہ انقلابی عمل میں مصروف ہو۔ اس کی اصل توجہ ظلم کے خاتمہ اور باطل کے استیصال کی طرف رہے۔ بدی کے ساتھ پنجہ آزمائی ہو۔ اس کے دوران بھی ظاہر بات ہے کہ تکالیف اور مصائب آئیں گے۔ فاقے بھی آئیں گے، پیٹوں پر پتھر بھی باندھنے پڑ جائیں گے، راتوں کو سونا نصیب نہیں ہو گا۔ مختصراً یہ کہ وہ ساری مشکلات

اور مصائب جو خواہ مخواہ ایک تکلف وتصنّع کی شکل میں اس نظامِ رہبانیت میں انسان اپنے اوپر طاری کرتا ہے‘ سب کے سب آئیں گے‘ لیکن وہ کارآمد (productive) ہوں گے‘ اس اعتبار سے کہ معاشرے میں عدل قائم ہو‘ انصاف کا دوردورہ ہو۔ اور یہ رَہبانیت کا نظام تو درحقیقت ایک اعتبار سے ظلم کو‘ باطل کو‘ بدی کو اور شر کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس لیے کہ جو نیک لوگ ہیں وہ میدان سے گویا ہٹ گئے‘ وہ معاشرے کو چھوڑ کر کہیں غاروں کے اندر بیٹھ گئے اور یہ دنیا اب ظالموں اور شریر لوگوں کے لیے خالی ہو گئی اور انہیں کھلی چھوٹ حاصل ہو گئی کہ اور کھل کھیلیں۔ ان کو کوئی چیلنج کرنے والا نہیں رہا۔ اس اعتبار سے میں کہتا ہوں کہ یہ شیطان کا اغوا اور اضلال ہے۔ علامہ اقبال نے ’’ابلیس کی مجلس شوریٰ‘‘ میں اس کی بہترین تعبیر کی ہے۔ ابلیس نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

لہٰذا اس نے اپنے چیلے چانٹوں کو ہدایات دیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

اپنی توجہ آیت زیر مطالعہ پر مرکوز کیجیے۔ فرمایا: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ ’’رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی‘ ہم نے اسے اُن پر لازم نہیں کیا تھا‘‘۔ یہاں اس لفظ ’’بدعت‘‘ کو سمجھ لیجیے۔ ایک ہے اجتہاد۔ یعنی کتاب وسنت میں جو اصول دیے گئے ہیں ان سے اجتہاد کرتے ہوئے نئی صورت حال میں شریعت کا حکم تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔ جبکہ بدعت سے مراد ہے ایک ایسی چیز جس کی کوئی اصل ہے ہی نہیں‘ یعنی بے بنیاد بات۔ اور یہاں پر اِس رَہبانیت کو بحیثیت ایک ادارے‘ نظام اور فلسفے کے قرآن مجید بدعت قرار دے رہا ہے۔ آگے ارشاد ہے: ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ ’’مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں‘‘۔ اس سے دو مفہوم مراد لیے گئے ہیں۔ یہ مقام مشکلاتِ قرآن میں سے ہے۔ یہ بھی جان لیجیے کہ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ جہاں کہیں اس طرح کا احتمال ہوتا ہے کہ دو مفہوم ہو سکتے ہیں‘ دو امکانات ہیں‘ تو وہاں پر دونوں ہی اپنی جگہ پر قیمتی ہوتے ہیں۔ لہٰذا ﴿مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ کی ایک ترجمانی یوں کی جاتی ہے کہ ’’ہم نے نہیں فرض کیا تھا اُن پر کچھ بھی سوائے اس کے کہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کریں‘‘۔ یعنی ہم

نے یہ تو فرض کیا تھا کہ اللہ کو راضی کرو' لیکن یہ رَہبانیت ہم نے فرض نہیں کی تھی۔ جبکہ ایک ترجمانی یوں کی گئی ہے کہ انہوں نے جو رَہبانیت کی بدعت ایجاد کی وہ اللہ کی رضا کے حصول کے لیے تھی۔ یعنی بدنیتی نہیں تھی۔ بسا اوقات نیکی کا جذبہ حدِّ اعتدال سے تجاوز کر کے بدی کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ معاذ اللہ کسی بدنیتی پر مبنی تو نہیں تھا۔ نیکی اور خیر کا جذبہ ہی تھا۔ اللہ سے لو لگانے کا جذبہ ہی تھا۔ لیکن بعض اوقات بدنیتی کے بغیر بھی کوئی شے کسی شر کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس کے لیے درحقیقت ہمارے پاس تحفظ کا ذریعہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ چنانچہ ہمارے اس منتخب نصاب کے درس نمبر۲ [آیۂ بر (البقرۃ:۱۷۷)] کا مضمون یہی ہے کہ نیکی کا ایک ماڈل سامنے ہونا چاہیے جس کے حوالے سے آپ مختلف چیزوں کے مابین نسبت و تناسب کو معین کر سکیں۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف تقاضوں کو کس خوبصورتی اور تناسب سے سمویا ہے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کے مابین جو امتزاج پیدا کیا ہے اس میں توازن کس درجے ہے! اعتدال کس درجے کا ہے! سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا حسن یہی جامعیت کبریٰ ہے۔

اس موضوع پر میں نے ایک مرتبہ مقالہ بھی لکھا تھا۔ صدر ضیاء الحق نے سیرت نبویؐ کی کانفرنسوں کا آغاز کیا تھا تو اس میں میرے مقالے کا موضوع یہی تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سب سے زیادہ نمایاں اور امتیازی وصف توازن اور اعتدال ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بلکہ متضاد تقاضوں کو اپنی شخصیت میں سمویا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین!

اُمت مسلمہ میں رہبانیت کا نفوذ اور اس کے اسباب

جیسے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ متبعین مسیح علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اگر رَہبانیت کا نظام آیا تو جہاں اس میں شیطان کے اغوا و اِضلال کا معاملہ ہوا کہ اس نے انہیں جہاد و قتال' انقلاب اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد سے ہٹا کر ان کی صلاحیتوں کو اس رخ پر موڑ دیا وہاں اس کے لیے کچھ اسباب بھی موجود تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اگر یہ معاملہ آیا ہے تو وہ میرے نزدیک اس کی نسبت سینکڑوں درجے زیادہ قابل مذمت ہے' اس لیے کہ ان اسباب میں سے کوئی سبب یہاں موجود نہیں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کا اُسوہ نہایت جامع اور نہایت متوازن ہے اور اس میں دین و دنیا کا مکمل اور خوبصورت امتزاج ہے۔ یہاں تک کہ تعدّدِ ازدواج اس ضمن میں سیرت کی سب سے نمایاں بات ہوسکتی ہے' لیکن یہ کڑوی گولی عیسائیوں کے حلق سے قطعاً نہیں اترتی۔ اس لیے کہ ان کا

آ ئیڈیل حضرات مسیح اور یحییٰ علیہما السلام ہیں اور انہوں نے ایک ایک شادی بھی نہیں کی' جبکہ حضور اکرم ﷺ نے گیارہ شادیاں کیں اور کنیزیں ان کے علاوہ تھیں۔ تو اس حوالے سے ان کے لیے تو کوئی نہ کوئی عذر موجود ہے' لیکن ہمارے ہاں اس کے باوجود اگر رَہبانیت کا نظام آیا ہے تو یہ بہر حال زیادہ قابل مذمت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں پر تو جہاد و قتال کا راستہ شروع ہی نہیں ہوا' جبکہ یہاں نہ صرف شروع ہوا بلکہ بھر پور طریقے پر اس کے سارے مراحل و مدارج طے ہوئے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ﷺ نے اس ضمن میں ہمارے لیے کس درجے واضح سنگ ہائے میل اور نشاناتِ راہ چھوڑے ہیں! اور پھر حضور ﷺ کی صریح احادیث بھی ہیں کہ جب تک پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا غلبہ نہیں ہو جاتا' جہاد و قتال کا یہ عمل جاری رہے گا۔ اس حوالے سے ہم نے اگر اس راستے سے انحراف کیا ہے تو یقیناً ہم زیادہ بڑے مجرم ہیں بہ نسبت حضرت مسیح علیہ السلام کے متبعین کے۔

البتہ ہمارے ہاں کچھ حضرات اس راستے پر چلے گئے ہیں تو میں اصولی طور پر یہ بات کہنے کے بعد ان کی طرف سے کچھ معذرت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اپنے دل میں کسی فرد کے ساتھ کوئی سوءِ ظن مت آنے دیجیے! حدیث نبویؐ ہے: ((اُذْکُرُوْا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْرِ)) ''اپنے فوت شدگان کو بھلے الفاظ میں یاد کیا کرو''۔ ہمیں نہیں معلوم کس کے ساتھ کیا مجبوری تھی' کس کے کیا ذاتی حالات تھے' کس کا کیا معاملہ تھا۔ ایسے اشخاص کی طرف سے میں دو معذرتیں (apologies) پیش کر رہا ہوں اور انہیں ریکارڈ پر لے آنا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کے حکمران جب فاسق و فاجر ہوں تو ان کے بارے میں اس بات کی بڑی تاکید آئی ہے کہ ان کے خلاف خروج میں حد درجہ احتیاط برتی جائے۔ ظاہر بات ہے کہ جب حکومت قائم ہوگئی ہے تو اب اس کا ایک نظم ہے' ایک سربراہ ہے' چاہے وہ ظالم اور فاسق و فاجر ہے' لیکن ہے تو مسلمان! اب اس کے زیر قیادت قتال کا معاملہ بھی ہوگا۔ کچھ عرصہ اس طرح ہوتا رہا کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی سرحدیں تھیں وہاں پر مسلمان جہاد و قتال کا معاملہ آگے بڑھاتے رہے۔ لیکن پھر ہوتے ہوتے ایک نظمِ مملکت کے اندر ساری چیزیں حکومت کے تابع ہو جاتی ہیں۔ اب عام آدمی اپنے طور پر اس قسم کا بڑا کام نہیں کر سکتا جب تک ان فساق و فجار حکمرانوں کو نہ ہٹایا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے علیحدہ سے کسی جماعت' کسی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کام کو لے کر اُٹھ کھڑی ہو۔ تو خروج پر حضور ﷺ کی طرف سے شدید بندشیں اور شرائط عائد کی گئی ہیں۔ میں اس وقت تفصیل میں نہیں جانا

چاہتا' اس بارے میں امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے ——— اور میں اسے صحیح سمجھتا ہوں۔ کہ ''فاسق و فاجر مسلمان حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت جائز ہے' بشرطیکہ اتنی قوت فراہم ہوچکی ہو کہ بظاہرِ احوال کم سے کم کامیابی یقینی ہو جائے''۔ اب ایسے ماحول میں اس قوت کا فراہم ہونا جبکہ ان کا ایک مستبد نظام قائم تھا' محالات کے درجے میں تھا۔ لہٰذا اُس دور میں جہاد و قتال ایک طرح کا Imperialist extension کا مرحلہ تو بن گیا لیکن اس کی نوعیت اُس جہاد و قتال کی نہیں رہی جو غلبۂ دین کے لیے تھا۔

اسی طرح سے ایک دوسرا عامل یہ تھا کہ ابھی تک انسان کا تمدنی اور عمرانی شعور اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ ''ریاست'' اور ''حکومت'' کے درمیان فرق ہو۔ حکومت کو بدلنے کے لیے بھی سوائے مسلح بغاوت کے کوئی چینلز ابھی موجود نہیں تھے' جیسے کہ آج ہمارے سامنے حکومت کو بدلنے کے لیے چینلز ہیں۔ آج کم از کم عالم اسلام کے وہ ممالک جہاں کسی درجے میں جمہوریت ہے اور وہاں حقوقِ انسانی اور شہری حقوق کا تصور موجود ہے وہاں کے عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ حکومت کو بدلیں' چاہے ووٹ کے ذریعے بدلیں' چاہے ایجی ٹیشن کے ذریعے بدلیں۔ ایجی ٹیشن بھی وہ جو پرامن ہو' منظّم ہو' جس سے کسی کی جان اور املاک کو نقصان نہ پہنچے' صرف یہ کہ گھیراؤ کر کے حکومت کی مشینری کو بلاک کیا جارہا ہو تو یہ بھی ان کا جائز اور دستوری حق ہے۔ چونکہ دورِ ملوکیت میں اس طرح کے حقوق کا تصور موجود نہیں تھا لہٰذا بہت سے حضرات نے تصوف اور رہبانیت کا راستہ اختیار کر لیا۔

اس حوالے سے آج کے دور میں ہمیں یہ سہولتیں حاصل ہوگئیں جو سابقہ ادوار میں نہیں تھیں۔ جہاں تک تمدنی حقوق کا تعلق ہے' بعض ممالک جیسے سعودی عرب اور عرب امارات میں تو ان کا تصور ہی سرے سے نہیں ہے اور کہیں صرف دکھاوا ہے' جیسے کہ مصر اور لیبیا وغیرہ۔ ان ممالک میں بڑی شدید آمریت ہے' یک جماعتی حکومت کا نظام چل رہا ہے۔ لہٰذا یہاں انتخاب اور ایجی ٹیشن کا کوئی امکان پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں کہیں بھی حقوق کا یہ تصور موجود ہے اُن ممالک میں سے ایک خوش قسمت ملک ''پاکستان'' بھی ہے جس میں ہمیں یہ حقوق آزادانہ طور پر حاصل ہیں۔ پھر اگر ہم ان حقوق کو استعمال نہ کریں اور رہبانیت کا راستہ اختیار کر جائیں اور اس پگڈنڈی کی طرف مڑ جائیں تو پھر ہمارے لیے کوئی دلیل' کوئی عذر نہیں ہے۔ جیسے قرآن مجید میں اہل کتاب سے کہا گیا: ﴿يٰۤـاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (المائدۃ:۶۸)

''اے اہل کتاب! تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے یہاں تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تم پر تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا اس کو قائم اور نافذ کرو''۔ اس آیت کو اگر ہم اپنے اوپر منطبق کریں تو یوں کہا جائے گا:"یا اھل القرآن لستم علی شی ء حتی تقیموا القرآن وما انزل الیکم من ربکم" ''اے اہل قرآن (اے مسلمانو!) تمہارا تو کوئی بھی مقام نہیں ہے (ہم سے بات کرنے کا منہ نہیں ہے) اگر تم قائم نہیں کرتے ہو قرآن کو اور جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے تمہاری جانب نازل کیا گیا ہے''۔ ہمارے ہاں جو دانش ور کہلانے والے حضرات ہیں وہ یہاں بھی گریز کا راستہ اختیار کرتے ہیں کہ یا تو صرف دعوت وتبلیغ ہوتی رہے یا کوئی علمی وتحقیقی کام ہوتا رہے' بس صرف قیل وقال ہوتا رہے' کسی جہاد' قتال' انقلاب کی طرف پیش رفت نہ ہو۔ تو میرے نزدیک ان کا کوئی عذر' سند' مقام' بنیاد نہیں ہے اور ''لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ'' والی بات ان پر بتمام وکمال منطبق ہوتی ہے۔

آیت ۲۸ کی تاویل خاص

آگے فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ﴾ (آیت ۲۸) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول (محمد ﷺ) پر ایمان لاؤ''۔ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے مفہوم کو معین کرنے سے آیت کی دو تاویلات ہوں گی۔ پچھلی آیت ان الفاظ پر ختم ہوئی تھی: ﴿فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْھُمْ اَجْرَھُمْ ۚ وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ یعنی متبعین مسیح علیہ السلام میں سے جو لوگ صاحبِ ایمان ہوئے' ہم نے انہیں ان کا بھرپور اجر عطا کر دیا' لیکن ان کی بھی کثیر تعداد فاسقین پر مشتمل ہے۔ متبعین مسیحؑ میں سے جو لوگ صاحب ایمان ہوئے ان سے مراد کیا ہے! ایک مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے صحیح دین پر رہے' ایمان پر قائم رہے' اب ان لوگوں کو درحقیقت ترغیب دی جارہی ہے کہ اب لاؤ ایمان محمد ﷺ پر۔ فرمایا جارہا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾: یعنی ''اے وہ لوگو جو (مسیح علیہ السلام پر صحیح معنی میں) ایمان رکھتے ہو'' —— اب اللہ کو چونکہ وہ پہلے سے مانتے ہیں' لہٰذا یہاں ''اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ'' کا لفظ نہیں آیا' بلکہ فرمایا: ﴿اتَّقُوا اللّٰہَ﴾ ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''۔ جس اللہ کو تم پہلے سے مانتے ہو تمہاری زندگی کے اندر بالفعل اس کا خوف اور اس کے محاسبے کا احساس برقرار نظر آنا چاہیے! ﴿وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ﴾ ''اور ایمان لاؤ اُس کے رسولؐ پر''۔ یہ گویا تمہارے لیے نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کا معاملہ ہوگا۔ تمہارے اس ایمان کا جو تم عیسیٰ علیہ السلام پر رکھتے ہو' اگر وہ سچا ایمان ہے' لازمی تقاضا بھی یہی ہے۔ اب اگر تم ایمان نہیں لا رہے محمد ﷺ پر تو گویا تمہارا حضرت مسیحؑ پر ایمان کا دعویٰ بھی باطل ہو

جائے گا۔ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے میں اب تمہیں کوئی عصبیت نہ روکے کہ یہ نیا نبی ہے' نئی قوم کے اندر آیا ہے' یہ اُمیین میں سے ہے۔ بلکہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور عصبیت' ضد' ہٹ دھرمی' مغائرت میں سے کسی چیز کو اپنے راستے میں رکاوٹ نہ بننے دو۔ تو اس تاویل کی رو سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے۔

اب اس تاویل کی رو سے آیت کا مفہوم مکمل کر لیجیے! فرمایا: ﴿يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ ''(اگر تم ایسا کرو گے تو) اللہ تمہیں عطا کرے گا اپنی رحمت میں سے دوگنا حصہ''۔ ''كِفْلٌ'' کہتے ہیں ترازو کے ایک پلڑے کو۔ تو كِفْلَيْن کا مطلب ہوگا ''دو پلڑے''۔ اب اس اعتبار سے مفہوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ ﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ﴾ ''اور تمہیں وہ نور عطا فرمائے گا جس کو لے کر چل سکو گے اور تمہیں بخش دے گا''۔ جو خطائیں اور غلطیاں ہوں گی' سابقہ زندگی کی بھی اور آگے کی بھی' اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۸﴾ ''اور اللہ غفورٌ رحیم ہے''۔ یہ تاویل بڑی مسلسل (continuous) تاویل بنتی ہے۔ پچھلی اور اگلی دونوں آیتوں کے ساتھ اس کا ربط بہت گہرا جڑ رہا ہے۔

اس تاویل کے حق میں ایک متفق علیہ حدیث بھی ہے:

عَنْ اَبِیْ بُرْدَۃَ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((ثَـلَاثَةٌ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ: رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاَدْرَكَ النَّبِيَّ ﷺ فَـآمَنَ بِهٖ وَاتَّبَعَهٗ وَصَدَّقَهٗ فَلَهٗ اَجْرَانِ' وَعَبْدٌ مَمْلُوْكٌ اَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ تَعَالٰى وَحَقَّ سَيِّدِهٖ فَلَهٗ اَجْرَانِ' وَرَجُلٌ كَانَتْ لَهٗ اَمَةٌ فَغَذَّاهَا فَاَحْسَنَ غِذَاءَ هَا ثُمَّ اَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ اَدَبَهَا' ثُمَّ اَعْتَقَهَا وَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ))

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے صاحب زادے حضرت ابو بردہؓ اپنے والد کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تین قسم کے لوگ وہ ہوں گے جنہیں (قیامت کے دن) دوہرا اجر ملے گا: ایک اہل کتاب میں سے وہ شخص جو ایمان رکھتا تھا اپنے نبی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) پر اور اس نے نبی آخر الزمان ﷺ کا زمانہ بھی پا لیا (یعنی حضور ﷺ کو پہچان لیا' چاہے وہ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں بھی تھا) اور وہ ان پر بھی ایمان لے آیا اور آپ ﷺ کا اتباع کیا اور آپ ﷺ کی تصدیق کی تو ایسے شخص کے لیے دوہرا اجر ہے۔ اور دوسرا وہ غلام جس نے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقا کا حق بھی ادا کیا (یعنی خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اپنے آقا کا حق بھی بحسن وخوبی ادا کیا) تو اس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے۔ اور ایک

ایسا شخص کہ جس کی کوئی کنیز (باندی) تھی‘ تو اُس نے اسے اچھی غذا دی (اس کو کھلایا‘ پلایا‘ پالا پوسا) اور اس کی عمدہ اخلاقی تربیت کی (اس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا) پھر (جب وہ جوان ہو گئی تو) اسے آزاد کر دیا اور اس سے باقاعدہ نکاح کیا (یعنی پہلے تو اس کی لونڈی کی حیثیت تھی‘ اب اسے آزاد کر کے اپنے عقد نکاح میں لا کر برابری کا درجہ عطا کر دیا) تو اس شخص کے لیے بھی دو اجر ہیں‘‘۔

بہرحال آخر الذکر باتیں ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہیں‘ جبکہ پہلی بات اس آیت کی مذکورہ بالا تاویل کی پوری طرح تائید کر رہی ہے۔ اس چوتھے رکوع کے مضمون کے ساتھ (یعنی ماقبل آیات سے) اس تاویل کی کامل مطابقت ہے۔ اس لیے کہ اس میں رہبانیت کا تذکرہ ہو رہا ہے‘ حضرت مسیح علیہ السلام کا تذکرہ ہو رہا ہے‘ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کا ذکر ہو رہا ہے اور اب ان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ تم جب اپنے نبی حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہو تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ پر بھی ایمان لاؤ اور اس کے بدلے میں تمہارے لیے دوہرا اجر ہوگا۔

تاویل عام کے اعتبار سے آیت کا مفہوم

اس آیت کی ایک تاویل عام بھی ہے اور وہ ہمارے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ اِس سورۂ مبارکہ کا یہ حصہ سورۃ الحدید کا نقطۂ عروج بھی ہے۔ اس اعتبار سے یہاں پر گویا مخاطب عام اہل ایمان ہیں‘ صرف متبعین مسیحؑ ہی نہیں ہیں‘ لہٰذا ﴿یٰٓـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا مطلب ہے: ’’اے اہل ایمان!‘‘ یعنی وہ تمام مسلمان جو حضور ﷺ پر ایمان لائے‘ چاہے وہ پہلے تھے‘ چاہے آج ہیں‘ چاہے ہمیشہ ہوں گے‘ سب اس خطاب میں شامل ہیں۔ فرمایا: ﴿یٰٓـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ﴾ ’’اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ایمان رکھو اس کے رسول (ﷺ) پر‘‘۔ یہاں ایمان بالرسولؐ پر جو emphasize کرنا پیش نظر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت ایمان بالرسول اور اطاعت رسول ﷺ ہی میں اصل ہدایت مضمر ہے۔ ہدایت عملی کا سارے کا سارا دارومدار اطاعت رسول اور ایمان بالرسول ﷺ پر ہے۔ ایمان بالرسول یہ ہے کہ انسان کو یہ یقین ہو کہ جو خیر ملے گا یہاں سے ملے گا‘ جو بھلائی ملے گی یہاں سے ملے گی۔ اب اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ حضور ﷺ کو اسوۂ کاملہ ماننے والا شخص کبھی بھی گھر گرہستی کی زندگی کو گھٹیا نہیں سمجھ سکتا‘ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر دل میں حضور ﷺ کی عظمت ہے‘ حضور ﷺ سے عقیدت اور محبت ہے‘ اور معلوم ہے کہ ’’جا ایں جا ست‘‘

ہدایت کا منبع اور سر چشمہ حضورﷺ کی سیرت ہے‘ تو کیسے ممکن ہے کہ مزاج کے اندر کہیں رہبانیت کا رُخ پیدا ہو سکے! ﴿وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ’’اور اللہ کے رسول (ﷺ) پر پورا ایمان رکھو‘‘ کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ یہ جو تمہارے اوپر انقلاب کا ایک فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ ہم نے تمہیں جو نظامِ عدل و قسط عطا کیا ہے اس کو قائم کرو‘ تو اس کے قیام کا طریق کار اور منہج جاننے کے لیے اپنی مائیکروسکوپ کو سیرتِ محمدﷺ پر مرتکز کر دو۔

میں اس سے پہلے بھی کئی مواقع پر عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید میں اقامتِ دین کی فرضیت‘ اعلاءِ کلمۃ اللہ کی اہمیت‘ تکبیر ربّ اور ’’اظهارُ دینِ الحقّ علی الدّین کُلّه‘‘ کے لیے جہاد و قتال کی فرضیت ’’یَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ‘‘ کے مقصد کے لیے جدوجہد کی اہمیت اور اس کی فرضیت‘ یہ چیز بہت ہی واضح اور اظہر من الشّمس ہے‘ بشرطیکہ کسی کے دل میں کھوٹ نہ ہو اور گریز اور فرار کی نیت نہ ہو۔ اب سوچنا یہ ہے کہ ان بدلے ہوئے حالات میں یہ کام کیسے کیا جائے؟ اس کے لیے درحقیقت قرآن مجید سے براہِ راست ہدایت نہیں ملتی۔ اس لیے کہ ترتیب مصحف ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ قرآن مجید میں وہ سورتیں بھی کہ جن کا تعلق سیرتِ محمدیﷺ سے ہے اور جن کا اکثر و بیشتر حصہ سیرت کے واقعات سے بحث کرتا ہے‘ زمانی ترتیب سے نہیں ہیں‘ مثلاً سورۃ التوبۃ دسویں گیارہویں پارے میں آ گئی ہے جس میں غزوۂ تبوک کا ذکر ہے جبکہ سورۃ محمدؐ چھبیسویں پارے میں ہے جو کہ غزوۂ بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح سورۃ الاحزاب اکیسویں پارے میں ہے جس کے اندر غزوۂ احزاب کا ذکر ہے جو ۵ھ میں ہوا ہے۔ جو سورتیں مکی دور کے بالکل ابتدائی ایام میں نازل ہوئی ہیں وہ مصحف میں اخیر میں ہیں۔ تو اس حوالے سے قرآن مجید میں وہ ترتیب نہیں ہے جو نزولی اعتبار سے ہے۔ یہ ترتیب ملے گی سیرت النبیﷺ سے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد میں سیرتِ نبویؐ سے راہنمائی

میں نے بعض مواقع پر مثال دی ہے کہ جس علاقے میں بھی امید ہو کہ یہاں سے تیل نکل آئے گا تو وہاں ارب ہا ارب ڈالر ڈرلنگ کے اوپر خرچ کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یقین بھی نہیں ہے‘ بس کچھ خیال اور امید ہے کہ یہاں سے ہمیں وہ سیال سونا مل جائے گا تو اسی امید پر وہاں بہت بڑی مہم چلائی جاتی ہے۔ تو اگر یہ یقین ہو جائے کہ یہ ہدایت کہ دین کیسے قائم ہو گا‘ ہم اپنے اس فریضۂ اقامت دین سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں‘ اس کی عملی شکل کیا ہو گی‘ صرف سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ملے گی تو پھر

آپ اپنی توجہ اسی پر مرکوز کریں گے‘ اس پر غور کریں گے‘ تدبر کریں گے۔ اقبال نے قرآن پر غور وتدبر کی دعوت دیتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں ع ’’قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!‘‘ اسی طرح سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں غوطہ زن ہوئے بغیر طریق انقلاب آپ کے سامنے واضح نہیں ہوگا۔

تو میرے نزدیک اس آیت مبارکہ کا تعلق زیر درس سورۃ کے اس عمود کے ساتھ جڑ جاتا ہے کہ:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾﴾

’’ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیاں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں‘ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ اللہ کو معلوم ہو جائے (اور وہ لوگوں پر واضح کر دے) کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے غیب میں رہتے ہوئے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے‘‘۔

اب اس کا عملی طریق کار تمہیں کہاں ملے گا؟ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ’’اے (تمام) اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسولوں پر ایمان پختہ رکھو!‘‘ سارا زور اطاعت و اتباعِ رسولؐ کے اوپر ہے۔ جیسے کہ آیۂ استخلاف (النور: ۵۵) سے ماقبل آیت (نمبر۵۴) میں بھی اطاعت رسول پر زور ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾﴾

’’کہہ دیجیے (اے محمد ﷺ) کہ اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابع فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسول پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو۔ اس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے‘ ورنہ رسولؐ کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔‘‘

اور مابعد آیت (نمبر۵۶) میں بھی اطاعتِ رسول ﷺ پر زور ہے: ﴿وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ’’اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے‘‘۔ درحقیقت اس طویل آیت آیۂ استخلاف کے اوّل و آخر سارا زور ہے اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت پر۔ تو اس حوالے سے منہج

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اہمیت سامنے رہے۔ اور اس کے لیے بہرحال ہمارے پاس فہم وادراک کا سرچشمہ اور ذریعہ سوائے سیرت النبی ﷺ کے اور کوئی نہیں ہے۔ اور اس کے لیے بھی یہ بات پیش نظر رہے کہ جیسے قرآن کو سمجھنے کے لیے کوئی ایک تفسیر کفایت نہیں کرتی اسی طرح اگر کسی ایک کتابِ سیرت پر اکتفا کر کے بیٹھ رہیں گے تو سیرت کے بہت سے پہلو اوجھل رہ جائیں گے۔ ہر سیرت نگار کا اپنا نقطۂ نظر ہے' جیسے ہر مفسر کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہے' ہر مفکر کا اپنا ایک زاویۂ نگاہ (angle of view) ہے۔ ایک ہی شے کو اِدھر والے دیکھ رہے ہیں تو ان کے پردۂ بصارت پر اس کی تصویر کچھ اور بن رہی ہے' جبکہ اُدھر والے دیکھ رہے ہیں تو ان کے retina پر اس کی تصویر کچھ اور بن رہی ہے۔ مختلف زاویۂ نگاہ سے زمین وآسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی قرآن ہے' اس کو ایک شخص پڑھ رہا ہے' تدبر کر رہا ہے' سمجھ رہا ہے' اور یہ سب کچھ نیک نیتی سے کر رہا ہے' لیکن اس کے سامنے کچھ اور پہلو زیادہ اجاگر ہو رہے ہیں۔ دوسرا شخص بھی نیک نیتی سے اپنی امکانی حد تک محنت کر رہا ہے' جہاد کر رہا ہے' اجتہاد کر رہا ہے' لیکن اس کے سامنے کچھ دوسرے پہلو نمایاں ہو رہے ہیں۔ تو کوئی ایک کتابِ تفسیر بھی کبھی کفایت نہیں کرے گی اور کوئی ایک کتابِ سیرت بھی کبھی کفایت نہیں کرے گی۔ اس کے لیے مختلف کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیے' لیکن یہ طے ہو جائے کہ ''جا ایں جا ست''' جو کچھ ملے گا یہیں سے ملے گا' لہٰذا اس کارِ عظیم کا طریق کار سیرتِ نبویؐ سے ماخوذ ہوگا' اور خاص طور پر طریق تنظیم۔

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طریقِ کار کے مختلف مراحل تو پھر بھی قرآن مجید میں مل جاتے ہیں' لیکن یہ کہ اس کے لیے جمعیت کس بنیاد پر فراہم ہوگی' اس کے بارے میں قرآن میں سوائے اشاروں کے کچھ ہے ہی نہیں' جبکہ اس کا پورا نقشہ آپ کو سیرتِ نبویہؐ سے ملے گا۔ اسی طرح سیرت میں بیعت کا ایک مکمل نظام ہے' حالانکہ حضور ﷺ کے لیے تو بیعت ضروری تھی ہی نہیں۔ آپ تو رسول تھے۔ جو ایمان لے آیا اسے تو ہر حال میں آپؐ کی اطاعت کرنی ہی کرنی تھی۔ کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی اطاعت نہ کرے۔ تو ایک علیحدہ سے قول وقرار اور اطاعت کا معاہدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' لیکن آپ ﷺ نے درحقیقت بعد میں آنے والوں کے لیے یہ اسوہ سے چھوڑا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ''تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں ایک بہترین (اور مکمل) نمونہ ہے''۔ اس اعتبار سے یہ بیعت کا نظام میرے' آپ کے لیے اور اِس

وقت کے تمام مسلمانوں کے لیے ہے' چاہے حضرت مسیح علیہ السلام کے متبعین میں سے کوئی ایمان لے آئے' چاہے یہودیوں میں سے کوئی ایمان لے آئے' جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں' چاہے مشرکین عرب میں سے کوئی ایمان لائے' وہ انصار میں سے ہو یا مہاجرین میں سے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر'' کِفۡلَیۡنِ '' کے کیا معنی ہوں گے؟ اس لیے کہ پچھلی تاویل کے اعتبار سے تو مذکورہ بالا حدیث نبویؐ کی رو سے'' کِفۡلَیۡنِ '' کے معنی معین ہو گئے کہ اہل کتاب میں سے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئیں گے انہیں دوہرا اجر ملے گا' اس لیے کہ وہ پہلے اپنے نبی پر بھی ایمان لائے ہوئے تھے' انہوں نے تعصب کی کسی پٹی کو اپنی آنکھوں پر بندھنے نہیں دیا اور حضور ﷺ پر بھی ایمان لے آئے۔ لیکن یہ کہ متبعین محمد ﷺ جو عام ہوں' ان کے لیے'' کِفلین '' کس اعتبار سے ہوگا؟ مثلاً ہم تو پیدا ہی ہوئے امت محمد ﷺ میں۔ یا کچھ لوگ وہ تھے جو پہلے کسی بھی نبی کے ماننے والے نہیں تھے' وہ حضور ﷺ پر ایمان لے آئے اور حضور ﷺ کا اتباع کرتے ہیں' آپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں تو اُن کے لیے'' کِفلین '' کس اعتبار سے ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے سورۂ سبا کی آیت ۳۷ کا مطالعہ کیجیے جو دیگر تمام مسلمانوں کے لیے بھی کِفلین کا مفہوم دے رہی ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَآ اَمۡوَالُکُمۡ وَلَآ اَوۡلَادُکُمۡ بِالَّتِیۡ تُقَرِّبُکُمۡ عِنۡدَنَا زُلۡفٰٓی اِلَّا مَنۡ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ﴾ ''(دیکھو مسلمانو!) وہ چیزیں جن کے ذریعے سے تم ہمارا تقرب حاصل کر سکتے ہو وہ تمہارے اموال اور اولاد نہیں ہیں' سوائے اُس کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کرے''۔ ایمان اور عمل صالح کے بعد تو مال بھی تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جائے گا' اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے' اولاد بھی ذریعۂ تقرب بن جائے گی' اسے اللہ کے دین کے لیے تیار کیا جائے' اس کے اندر وہی جذبہ پیدا کیا جائے اور ان کی تربیت کی جائے۔ لیکن ایمان اور عمل صالح کے بغیر اولاد سے اور مجرد مال سے تقرب حاصل نہیں ہوتا۔ آگے فرمایا: ﴿فَاُولٰٓئِکَ لَہُمۡ جَزَآءُ الضِّعۡفِ بِمَا عَمِلُوۡا﴾ ''تو ایسے لوگوں کے لیے ان کے اعمال کا دوہرا اجر ہوگا''۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دوہرا اجر کیوں ہوگا؟ یہ دوہرا اجر اس اعتبار سے ہے کہ ہر مسلمان جب دین پر عمل کرتا ہے تو وہ اپنے عمل کے ذریعے سے اپنے پیچھے والوں کے لیے بھی ایک اُسوہ چھوڑ رہا ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کوئی شخص رشوت لیتا تھا' اس کی زندگی میں اللے تللے تھے' عیش ہو رہی تھی۔ اب اس نے سمجھا کہ یہ حرام ہے اور اسے چھوڑ دیا تو اب یہ چیز کسی اور کے لیے بھی مثال بن جائے گی کہ اگر

اُس کا بغیر رشوت کے گزارا ہورہا ہے تو ہمیں بھی موت نہیں آ جائے گی‘ فاقہ نہیں آ جائے گا اگر میں اِس حرام سے رُک جاؤں۔ یا فرض کیجیے کوئی شخص کسی بینک کے اندر ملازم تھا‘ پندرہ بیس ہزار روپے تنخواہ لے رہا تھا‘ لیکن اب اس نے وہاں سے ملازمت چھوڑ دی ہے اور کہیں دوسری جگہ تین چار یا پانچ ہزار کی تنخواہ پر گزارا کر رہا ہے تو اس کے اس عمل سے کسی اور شخص کے اندر بھی عزیمت پیدا ہو سکتی ہے کہ اگر وہ ہمت کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے بھی ہمت دے سکتا ہے۔ تو یہ صاحب عزیمت انسان بعد والوں کے لیے یا خود اپنے زمانے کے لوگوں کے لیے چونکہ نمونہ بن جاتا ہے‘ ان کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کا ذریعہ بن جاتا ہے‘ لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے اجر دوہرا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال سورۃ الاحزاب میں حضرت محمد ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ضمن میں آئی ہے۔ ان سے فرمایا گیا کہ اگر تم نیک کام کرو گی تو تمہیں اجر بھی دوہرا ملے گا اور اگر کوئی غلط حرکت کرو گی تو سزا بھی دوہری ملے گی۔ اس لیے کہ تمہاری ایک خصوصی حیثیت ہے کہ تمہیں تمام اُمت مسلمہ کی خواتین کے لیے اُسوہ بننا ہے۔ عورتوں کی زندگیوں کا جو خالص نسوانی اور صنفی پہلو ہے اس اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ حضور ﷺ تو ان کے لیے مکمل نمونہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ آپؐ بہرحال مرد ہیں۔ تو وہ اسوہ اللہ نے ازواجِ مطہرات کے ذریعے سے فراہم کیا ہے۔ اس حوالے سے فرمایا کہ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو سزا دوہری ہو گی اور اگر نیکی پر چلو گی تو تمہارا اجر بھی دوہرا ہے۔ اس معنی میں ’’كِفْلَيْنِ‘‘ کا مفہوم بھی معین ہو گیا۔

اس تاویل سے آیت کا اگلا ٹکڑا بہت زیادہ نکھر رہا ہے کہ: ﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ﴾ ’’اور وہ تمہیں نور دے گا جس کو لے کر تم چل سکو گے‘‘۔ ’’تَمْشُوْنَ بِهٖ‘‘ کا ایک پہلو تو سورۃ الحدید کی آیت ۱۲ کے حوالے سے سمجھ لیجیے کہ قیامت کے دن میدانِ حشر میں جب اہل ایمان اور منافقوں کو علیحدہ کرنے کے لیے چھانی لگے گی تو اہل ایمان کو نور عطا ہو گا۔ وہ نور ان کے سامنے بھی ہو گا اور داہنے ہاتھ کی طرف بھی ہو گا۔ اس سے مراد ایک تو یہ نورِ ایمان ہے‘ اور خاص طور پر اللہ کے نبی ﷺ پر ایمان کا نور جس کو لے کر اہل ایمان چل سکیں گے۔ لیکن میرے نزدیک اس امکان کے باوجود یہ تاویل زیر درس آیت کے ساتھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتی۔ اب آپ اس کی اصل مناسبت سمجھ لیجیے! آپ دین کی انقلابی جدوجہد میں مصروف ہیں‘ اس راہ میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی پگڈنڈی اِدھر مڑ رہی ہے‘ کوئی اُدھر مڑ رہی ہے۔ اب قدم قدم پر سوال آئے گا کہ کہاں

جاؤں؟اب اگر رسول اللہ ﷺ پر گہرا ایمان ہے اور یقین ہے کہ ''جا ایں جا است'' کہ یہیں سے ملے گا جو کچھ ملے گا تو پھر یہ نور تمہارے ساتھ ہوگا' یہ قدم قدم پر تمہاری راہنمائی کرے گا اور کسی غلط موڑ پر مڑنے سے بچالے گا۔﴿ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ ﴾ سے مراد دراصل یہ ہے۔لہٰذا اِس وقت اُسوۂ رسول ﷺ کو سامنے رکھو! ذاتی زندگی کے معاملات ہوں یا تحریکی معاملات ہوں' اجتماعی اور انقلابی جدوجہد ہو' ہر جگہ اسوۂ رسولؐ سامنے رہنا چاہیے! البتہ جہاں کہیں معین طور پر بالکل نئی صورتِ حال ہو' وہ حالات نہ ہوں جو حضور ﷺ کے زمانے میں تھے تو نئے تبدیل شدہ حالات کے اندر پھر اجتہاد کیا جائے گا۔اور اجتہاد بھی کتاب وسنت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔وہیں سے استنباط کرنا ہوتا ہے۔ جیسے آپ کو راجباہ سے پانی لے کر آنا ہے تو وہاں سے نالی کھینچنا ہوگی' ورنہ اگر نالی کا تعلق راجباہ کے ساتھ ہی نہیں ہے تو پانی کہاں سے آجائے گا؟ تو اصل راہنمائی تو قرآن وسنت ہی سے ملے گی' وہیں سے اجتہاد کر کے راہنمائی حاصل کرنی ہے۔اور یہ اجتہاد بھی صرف اُسی جگہ ہوگا جہاں پر قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جائے کہ یہ بالکل نئی صورتِ حال ہے جو اُس وقت کے حالات سے بالکل مختلف ہو چکی ہے' اور پھر اس کا تعین بھی کرنا ہوگا کہ جتنی جگہ پر اجتہاد کی ضرورت ہے اس سے آگے تجاوز نہ ہو' ایسا نہ ہو کہ اس کو generalize کر کے پورے کے پورے منہج انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی بساط لپیٹ دی جائے' بلکہ صرف اُس Particular Issue کی حد تک اجتہاد کیا جائے۔بہرحال میرے نزدیک یہ مفہوم ہے اس آیۂ مبارکہ کا!

اس سورۂ مبارکہ کا عمود اس کی آیت ۲۵ ہے۔اس کا مفہوم ذہن میں رکھتے ہوئے براہ راست اس آیت پر آجایئے:﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''۔تمہارے اندر قوت وصلاحیت اور ایثار وقربانی کا مادہ تو اللہ کے تقویٰ سے پیدا ہوگا' یعنی اللہ کا خوف اور اس کی محبت۔تقویٰ کے اندر ایک پہلو محبت کا بھی تو ہے! یعنی کسی محبوب ہستی کے کسی حکم سے بھی سرتابی نہ کرنا کہ مبادا وہ ناراض ہو جائے' اس طرزِ عمل کی اصل بنیاد محبت ہے۔یہی تمہاری source of energy ہے۔تمہاری جدوجہد اور صلاحیتوں کے لیے ایک رخ متعین کرنے والی شے تو اللہ کا تقویٰ ہے' لیکن یہ نیت' جذبہ' جوش وخروش' جدوجہد' جہاد وقتال عملاً کس راستے پر direct ہوں؟ فرمایا:﴿ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ ﴾ ''اور ایمان لاؤ اس کے رسول ﷺ پر''۔اب اس کے لیے طریق کار اور منہج محمد رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ کاملہ اور آپؐ کی سیرتِ مطہرہ میں ہے۔اگر یہ کرو گے تو

اللہ کا وعدہ ہے کہ ﴿یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ﴾ ''وہ تمہیں اپنی رحمت کا دوہرا حصہ عطا فرمائے گا''۔ اس لیے کہ تم خود بھی دوسروں کے لیے اسوہ بن جاؤ گے' اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو transmit کرنے کا ذریعہ بن جاؤ گے۔ تم بھی گویا ایک لنک بن جاؤ گے اس اُسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو دوسرے لوگوں یا اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے۔ ﴿وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ﴾ ''اور وہ تمہیں نور عطا کرے گا جس میں تم چل سکو گے''۔ تمہاری اجتماعی جدوجہد کو قدم قدم پر راہنمائی فراہم کرنے کے لیے وہ نورِ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہر وقت تمہاری دستگیری کے لیے موجود ہوگا۔ ﴿وَیَغْفِرْ لَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور (اگر کوئی خطا ہو ہی گئی تو) اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے گا۔ اور اللہ غفور ہے' رحیم ہے''۔

آیت ۲۹ کا تفسیری اشکال اور اس کا حل

﴿لِئَلَّا یَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتٰبِ اَلَّا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾﴾

''(یہ اس لیے ہے) تاکہ اہل کتاب یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ کے فضل پر اب ان کا کوئی حق نہیں ہے' اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے' جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور وہ بڑے فضل والا ہے''۔

اس آیت کی تاویل میں بڑا قیل وقال ہے اور میرے نزدیک اس بحث کا اکثر و بیشتر حصہ بالکل بغیر کسی بنیاد کے ہے۔ بدقسمتی سے بعض مقامات پر ہمارے مفسرین خواہ مخواہ کی بحثوں میں بہت الجھ گئے ہیں۔ یہاں ''لِئَلَّا'' میں جو 'لا' ہے اس کے بارے میں اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ زائد ہے اور اصل میں مراد یہ ہے: ''لِکَیْ یَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتٰبِ اَنْ لَّا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ'' یعنی ''تاکہ یہ معلوم ہو جائے تمام اہل کتاب کو کہ ان کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے (کوئی ٹھیکے داری نہیں ہے) اللہ کے فضل پر''۔ یہود کا تصور تھا کہ نبوت و رسالت تو ہماری میراث تھی' دو ہزار برس تک تو یہ ہمارے پاس رہی' اب یہ آخری نبوت و رسالت کہاں چلی گئی! تو فرمایا کہ ان پر یہ بات کھل جائے' واضح ہو جائے کہ یہ کوئی تمہاری اجارہ داری نہیں تھی' نبوت و کتاب کا یہ معاملہ اب ہم نے بنی اسماعیل کے حوالے کیا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور سید المرسلین کی حیثیت سے مبعوث ہو گئے ہیں۔ تو یہ بات ان کے سامنے کھل جانی چاہیے اور کوئی اشتباہ نہیں رہنا چاہیے کہ نبوت و کتاب پر ان کا کوئی اختیار' کوئی

ٹھیکیداری‘ کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے جو اللہ ہی کے اختیار میں ہے‘ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ نبوت و کتاب کس کو دینی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ﴾ (الانعام:۱۲۵) ’’اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے‘‘۔ اللہ جو فیصلہ کرتا ہے اپنے علم کامل کی بنیاد پر کرتا ہے۔

﴿لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ﴾ اس کا ایک تو یہ مفہوم ہے‘ لیکن اس میں ’’لا‘‘ زائد ماننا پڑتا ہے۔ اس لائے زائدہ کے بارے میں مَیں مولانا اصلاحی صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں سے بالکل متفق ہوں کہ قرآن مجید میں کہیں کوئی لفظ زائد نہیں آیا۔ کتابت میں ضرور کچھ حرف زائد آ گئے ہیں۔ چنانچہ کسی جگہ پر آپ دیکھتے ہوں گے کہ ’’الف‘‘ لکھا ہوا ہے اور اوپر گول دائرہ بنا ہوا ہے اور یہ الف پڑھنے میں نہیں آتا۔ وہ کتابت کا مسئلہ ہے اور کتابت خالص انسانی معاملہ تھا۔ قرآن لکھا ہوا نازل نہیں ہوا۔ وہ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام سے حضور ﷺ نے سنا ہے اور حضور ﷺ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سنا ہے۔ کتابت ایک اگلا مرحلہ ہے جو انسانی ہاتھوں سے ہوا ہے۔ ہمارے ہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جو رسم عثمانی ہے‘ یہ سب سے زیادہ ثقہ (authentic) ہے‘ اس میں بھی بعض حروف اضافی ہیں‘ لیکن قرآن مجید کے ٹیکسٹ میں کوئی لفظ زائد از ضرورت نہیں ہے۔

ایک ’’لا‘‘ جو عام طور پر قسموں کے شروع میں آ جاتا ہے‘ جیسے ﴿لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝﴾ اور ﴿لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝﴾ بہت سے مفسرین اس کے بارے میں بھی کہہ دیتے ہیں کہ ’’لا‘‘ زائدہ ہے۔ حالانکہ اس کی صحیح ترین تاویل مولانا فراہی نے کی ہے جس کی مولانا اصلاحی نے وضاحت کی ہے کہ یہاں پر اصل میں مخاطب کے کسی خیال کی نفی سے بات شروع کی جا رہی ہے کہ تم جو کچھ سوچ رہے ہو حقیقت وہ نہیں ہے۔ چنانچہ: ﴿لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ کا ترجمہ ہوگا *Nay, I swear the day of Judgement* ’’نہیں‘ میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں‘‘۔ تمہارے خیالات‘ تمہارے شکوک پادر ہوا ہیں‘ بے بنیاد ہیں‘ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ مجھے قیامت کے دن پر اتنا یقین ہے کہ میں اس پر قسم کھا رہا ہوں۔ یہ بہت ہی بلیغ اسلوب ہے۔ تو جتنی بھی قسموں کے شروع میں ’’لا‘‘ آ گیا ہے وہ لاء زائد نہیں ہے بلکہ وہ اصل میں مخاطبین کے خیالات کی نفی ہے۔ اسی طرح بعض مقامات پر ’’لا‘‘ مجرد تاکید کے لیے آیا ہے۔ جیسے: ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ﴾ (الاعراف:۱۲) ’’تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟‘‘ جب شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا تو اس سے

فرمایا کہ ''کس چیز نے تجھے روکا کہ تو سجدہ نہیں کر رہا؟'' حالانکہ روکنے میں نہ کرنے کا مفہوم داخل ہے۔ اگر چہ ''مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ '' سے بھی بات پوری ہو جائے گی لیکن یہاں پر ''لا '' تاکیدِ مزید کے لیے ہے' بے کار و بے معنی نہیں ہے۔ ہر زبان کے اندر یہ اسلوب ہوتے ہیں کہ کسی چیز پر زور دینے کے لیے نفی کا اضافہ کرتے ہیں۔ جس طرح سورۃ الانبیاء کی آیت ۹۵ ہے: ﴿وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ ''اور حرام ہے ان بستیوں پر جن کو ہم نے ہلاک کیا کہ وہ اب لوٹیں گے نہیں''۔ حَرَامٌ کے بعد یہاں پر ''لا '' کی ضرورت نہیں ہے' لیکن یہ بھی اصل میں تاکیدِ مزید کے لیے ہے۔ چنانچہ یہاں پر بھی ہم ''لا '' کو ہرگز زائد اور بے معنی نہیں کہہ سکتے۔

ہمارے ایک کرم فرما ہندوستان کے عالم دین مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کی رائے اس قسم کے اشکالات میں سب سے زیادہ صائب ہوتی ہے۔ چنانچہ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی اور حیرانی ہوئی کہ انہوں نے صاف کہا ہے کہ یہاں پر ''لا '' قطعاً زائد نہیں ہے ''لا '' اپنی جگہ پر صحیح ہے اور اس سے اصلاً مراد یہ ہے کہ ''تاکہ نہ سمجھیں وہ لوگ جو اہل کتاب تھے کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے ہیں اللہ کے فضل سے''۔ یہاں پر ''لَا يَقْدِرُوْنَ '' اجارہ داری کی نفی کے لیے نہیں ہے' اس کا مفہوم یہ ہے کہ اب وہ یہ نہ سمجھیں کہ محروم ہو گئے ہیں بلکہ اب بھی ان کے لیے راستہ کھلا ہے۔ آئیں اور ایمان لے آئیں محمد ﷺ پر۔ اس کی مثال سورۂ بنی اسرائیل کے شروع میں آئی ہے جہاں بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ (آیت ۸) ''ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے! لیکن اگر تم نے پھر (اپنی سابق روش کا) اعادہ کیا تو ہم بھی پھر (اپنی سزا کا) اعادہ کریں گے''۔ یعنی اب بھی تمہارا ربّ تم پر رحم فرمانے کے لیے تیار اور آمادہ ہے' اس کی آغوشِ رحمت وا ہے' آؤ' ایمان لاؤ۔ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ﴾ ''یقیناً یہ قرآن ہدایت دے رہا ہے سیدھے راستے کی طرف''۔ تو وہی بات یہاں پر کہی جا رہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ تم اب راندۂ درگاہ ہو گئے ہو' محروم ہو گئے ہو' تمہارے لیے خیر کا کوئی راستہ کھلا رہ ہی نہیں گیا ہے' جیسے کہ اس سے پہلے اسی سورۃ الحدید کی آیت ۱۷ میں فرمایا گیا ہے کہ ''جان لو! اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے'' تو اگر تمہارے دلوں میں بھی مردنی ہے تو ہم تمہیں بھی دوبارہ زندگی عطا کر دیں گے۔ تو جیسے تشویق و ترغیب کا پہلو وہاں آیا ہے درحقیقت وہی تشویق و ترغیب یہاں اہل کتاب کے لیے ہے' چاہے وہ یہود ہوں یا نصاریٰ ہوں۔ لہٰذا فرمایا جا رہا

ہے کہ نہ سمجھیں وہ لوگ جو اہل کتاب میں سے ہیں کہ اب وہ اللہ کے فضل پر بالکل ہی کوئی قدرت نہیں رکھتے' اب اللہ کا فضل ان کی دسترس سے ہی باہر ہو چکا ہے' اب فضلِ خداوندی کے دروازے ان پر مستقلاً اور کلیتاً بند ہو گئے ہیں۔ نہیں' اللہ کے فضل کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے' اس کی رحمت کی آغوش وا ہے' آؤ اور اللہ کی رحمت سے ہمکنار ہو جاؤ' اور اس کا راستہ یہی ہے کہ قرآن پر ایمان لاؤ اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاؤ!

میں یہ تحقیق کر کے حیران ہوا کہ ''لَا یَـقْدِرُوْنَ '' کا لفظ قرآن مجید میں صرف تین جگہ آیا ہے۔ ایک تو یہی سورۃ الحدید کا مقام ہے' باقی دو مقامات وہ ہیں جہاں آخرت میں مسلمان ریاکاروں کی نیکیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک تو سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۴ ہے جہاں انفاق کا موضوع اپنی پوری تکمیلی شان کے ساتھ آیا ہے۔ فرمایا: ﴿لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا﴾ ''جو بھی کمائی انہوں نے کی ہو گی اس میں سے کچھ بھی ہاتھ پلے نہیں آئے گا''۔ دوسرا مقام سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۸ ہے جہاں الفاظ کی ترتیب میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ فرمایا گیا: ﴿لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ﴾ ''وہ کوئی بھی قدرت نہیں رکھتے اس پر انہوں نے جو بھی کمائی کی تھی۔'' اب یہاں اجارہ داری کا تو کوئی بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں پر جن لوگوں نے اجارہ داری اور ٹھیکے داری کا مفہوم شامل کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ نظائر قرآنی سے سرے سے استفادہ نہیں کرتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اکثر و بیشتر ایسے معاملات کے اندر شاہ عبدالقادرؒ سے صحیح رہنمائی ملتی ہے۔ یہاں پر میرا وہ اصول بھی پختہ ہو گیا کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم از کم دو جگہوں پر ضرور آتے ہیں اور اکثر و بیشتر ترتیب عکسی ہو جاتی ہے۔ تو منافقین سے فرمایا جا رہا ہے کہ جن کو وہ نیکیاں سمجھ رہے تھے وہ تو محض سراب ہے۔ جیسے سورۃ الفرقان میں فرمایا گیا: ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝۲۳﴾ اور سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوا: ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ کَرَمَادِ ۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ﴾ (آیت ۱۸) ''جو لوگ اپنے ربّ کے منکر ہوئے ان کا حال یہ ہے کہ ان کے اعمال اس راکھ کی مانند ہیں جس پر زور کی ہوا چلے آندھی کے دن۔'' جیسے کہ راکھ کا ایک ڈھیر تھا' ایک جھکڑ آیا اور وہ راکھ بکھر گئی' ایسے ہی ان کی نیکیاں اور اعمال ہوں گے۔ ''لَا یَقْدِرُوْنَ'' مذکورہ بالا دونوں جگہ پر انہی الفاظ میں تھوڑی سی لفظی تاخیر و تقدیم کے ساتھ آیا ہے اور دونوں جگہ اِس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز دسترس سے باہر ہو جائے' کسی کی قدرت میں نہ رہے' کسی کے لیے قابل حصول نہ رہے۔ وہی مفہوم یہاں آ رہا ہے

کہ نہ مایوس ہو جائیں' نہ بددل ہوں اہل کتاب کہ اب تو اللہ کے فضل میں سے کچھ بھی ان کی دسترس میں نہیں رہا' وہ تو محرومِ مطلق ہو گئے' وہ تو ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو گئے۔ نہیں' ابھی ان کے لیے دروازہ کھلا ہے' ایمان لاؤ محمد ﷺ پر اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے مستحق بن جاؤ۔ اور آیت ماقبل میں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے۔

اب آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ ﴾ ''اور فضل تو کُل کا کُل اللہ کے اختیار میں ہے' جس کو چاہتا ہے دیتا ہے''۔ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو اور اہل ثابت کرنے کے لیے نیت درست کرلو' تمہارے اندر واقعتاً طلب صادق ہو۔ واقعتاً اگر ہدایت' حق اور خیر کے خواہاں اور طالب ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت کی دولت عطا فرمائے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹﴾ ''اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔ اس کے فضل کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ ہم نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا ہے تو تم محروم ہو گئے ہو۔ ہمارے خزانے تو لامتناہی ہیں' لہٰذا آؤ اور اس فضل خداوندی سے فیض یاب ہو جاؤ!

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو پورے قرآن مجید پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں خاص طور پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ سورۃ الحدید کے درس کی تکمیل کے ساتھ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا جو درس ہم نے از سرِ نو شروع کیا تھا وہ آج اپنی تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم' ونفعنى وايّاكم بالآيات والذكر الحكيم

❁❁❁

مطالعہ قرآن حکیم کا

مُنتخب نِصاب

مَرکزی انجمنِ خُدّامُ القرآن لاھور